کی طرح سمجھا جاتا تھا اس کو وہی قیمت رکھنے لگے ہیں جو فن لوپیپ (؟) اور کرسیوں کی ہوتی ہے۔ آرٹ اور دوسری چیزوں کے امتیازی فرق کیساتھ، یہ چیزیں تو زندگی کی ضروریات میں شامل ہیں۔ آرٹ ضروریاتِ زندگی میں لازماً شامل نہیں۔"

ان الفاظ میں اُن لوگوں کی تقلید جھلکتی ہے جو سرمایہ داری کے پیدا کردہ جھمیلوں اور اس دور میں آرٹ کی مایوس کُن حالت پر بے رحمانہ تنقید کرنے کا عادی رہا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر آگے چل کر کہتے ہیں :-

شیلے کا یہ کہنا کہ :-

"دن اور رات سے اک مسرت گم ہوگئی ہے"

اس کا ماتم نہیں ہے۔ یہ ذاتی گھٹن اور غصہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت اہم اور سنجیدہ چیز ہے، یہ ایک بنیادی چیز ہے جو غائب ہوگئی ہے" صفحہ ۱۴

سرمایہ دار سماج پر جو گروہ ترقی پسندانہ تنقید کرتا ہے تاثیر صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر آپ ولیم ہیڈ لیٹ کے موید بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"یہ ممکن ہے کہ تمام قوم سے ترقی یافتہ طبقوں کی جدائی ۔۔۔۔ اور انسانی دماغوں کی دو جداگانہ طبقوں میں تقسیم (ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ) ایک تیاری ہو جسے میں آرٹ کی مختلف اصناف میں دیکھ رہا ہوں" صفحہ ۳۳ ولیم کے قول پر تاثیر صاحب کی رائے ہے کہ :-

"یہ ایک علم ہیئت کا سا اندازہ ہے لیکن ایک اُس دنیا میں جہاں وہ چیز جسے کبھی مستحکم اور حقیقی سمجھا جاتا تھا۔ غیر حقیقی اور ۔۔۔۔۔۔۔۔ معلوم ہوتی ہے، کس چیز پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ مستقبل پہلے کے مقابل اب کہیں زیادہ خداؤں کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے" صفحہ ۳۵

گویا آپ کے نزدیک سماج نامعلوم مدت تک دو تقسیم شدہ ٹکڑوں کے اُن جھگڑوں کو برداشت کرتا رہیگا جو انسانیت کی تمام تر تباہی کی اصل ہیں اور اگر آخر میں کوئی تبدیلی ہوتی تو وہ منطق کی راہ سے ہٹکر خدائی رہنمائی کی تلاش کریگا۔ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں نہ سوسائٹی غیر معینہ مدت کیلئے موجودہ نظام پر قائم رہ سکتی ہے اور نہ تاریخی و سماجی طاقتوں کی رفتار غیر منطقی ہوسکتی ہے۔

آگے چل کر تاثیر صاحب نے پھر اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے :-

"مستقبل کے بارے میں جو کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے کہ یہ دنیا بھی بڑا عہد پھر سے شروع ہوا چاہتا ہے" صفحہ ۳۶

لیکن بہر حال ان چند جزیات کو چھوڑ کر، ادب اور سماج، اور خاص کر سرمایہ داری ادب کے ساتھ سماج کے سلوک کا تعلق ہے تاثیر صاحب نئے اسکول ہی کے موئد ہیں :-

عہدِ سرمایہ داری میں جب عام پیداوار (Mass Production) میں عجلت کیساتھ ترقی ہو رہی ہے۔ یہ اُمید کرنا حقیقتوں سے مذاق کرنا ہوگا کہ سوسائٹی ان فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کو برداشت کرسکتی ہے جو غیر مادی قسم کے فلسفیانہ مسائل سے بحث کرتے ہیں اور جو اپنا مخاطب ایک محدود طبقۂ عقلاء (Intellectuals) کو فرض کئے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں اگر یہ ادیب سوسائٹی کو بُرا کہتے ہیں تو تعجب نہیں کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں سوسائٹی اسکو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اُن کے لئے صرف دو راستے ہیں یا تو وہ تاثیر صاحب کے الفاظ میں "رمباؔنڈ کا راستہ اختیار کریں اور بیسویں صدی کو اپنے پیچھے چھوڑ دیں اور غیر ترقی یافتہ مقامات میں رہن سہن اختیار کریں جس طرح رمبانڈ پیرس کو چھوڑ کر حبش چلا گیا تھا۔ اور یا ایکسل کی پیروی کریں، یعنی اپنے خیال میں مگن رہیں، ذاتی تصورات، جنون و خبط کی دنیا میں گھومتے رہیں اور بالآخر حقیقتوں پر اپنے توہمات کو ترجیح دیں بلکہ خود انھیں کو حقائق سمجھنے لگیں" صفحہ ۲۷

بلاشک سرمایہ دار ادیبوں کا انجام یہی ہے اور یہی ادب برائے ادب کے نظریہ کی حدِ آخر ہے۔

یہ رسالہ محض ۴۹ صفحات کا ہے لیکن اس مختصر سے رسالہ میں تاثیر صاحب نے موضوعات زیر بحث پر عالمانہ بحث کی ہے۔ ادب اور عوام کے موضوع پر یہ کتاب مفید اور بلند مسائل کے بلند اور مفید ترین حلوں پر مشتمل ہے۔ ادب اور اُس کے جدید تقاضوں سے روشناس ہونے کیلئے ہر اُس شخص پر اس کا مطالعہ فرض ہے جو تنقیدِ ادب کے نئے پہلوؤں سے آگہی چاہتا ہے۔ یقیناً اس کا مطالعہ زاویہ ہائے فکر پیدا کرے گا۔

کلیاتِ میر تقی

مرتبہ و مصححہ مولوی عبد الباری آسی اور مولوی سید جعفر علی مطبوعہ نولکشور پریس و بکڈپو لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں

نولکشور پریس لکھنؤ نے اردو زبان کی جتنی عظیم خدمت کی ہے، تاریخ اس سے انکار نہیں کرسکتی ۲۰۰ سال قبل اس کی طباعت و اشاعت کا سہا قدیم طباعتی

۱۹۳۹ء میں جاری ہوا

بی مرکز میرٹھ کا علمی وادبی ماہنا



منظور شدہ

محکمۂ تعلیماتِ حکومتِ صوبۂ متحدہ حکومت بہار

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

بچوں کی نفسی کیفیت کے لحاظ سے یہ مناسب ترین انتخاب ہے، روزانہ کی افسانوں کے مطالعہ سے جو خراب نتائج طفلی کے دماغ پر پڑ سکتے ہیں، ان نتائج سے کم از کم یہ مجموعہ بچوں کو محفوظ کر سکتے ہیں؛

مترجمین نے ترجمہ کی زبان ہلکی پھلکی اور دلچسپ رکھی ہے، زبان کی سادگی اور شیرینی نے کشش کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ ہاں اسالیب کی خصوصیات ترجموں میں نمایاں نہیں ہو سکیں، بعض جگہ ادبی خامیاں بھی ہیں، مثلاً ٹالسٹائے کے افسانے میں "اناج اگانے" کے بجائے "اناج اپجانے" استعمال کیا گیا ہے؛ یا مصطفیٰ لطفی کے افسانہ "گدہ" کے مترجم نے آہ کرنے کے بجائے "آہ بھاکنا" استعمال کیا ہے، کئی جگہ اسی قسم کی مثالیں ملتی ہیں؛

کوئی شک نہیں کہ بعض محاورے مقامی ہوتے ہیں اور زبان کی وسعت کے خیال سے ان کا استعمال ہرگز نامناسب اور غلط نہیں۔ مگر لسانی اور صوتی حسن ضائع نہیں ہونا چاہیئے، ملی جلی زبان، کے لئے اردو ہندی کے الفاظ اردو میں استعمال کرنے کیلئے صناعتی احتیاط و تناسب کی ضرورت ہے؛

شیطانی بوتل

قیمت ۱ر پستک بھنڈار لہریا سرائے
دربھنگہ (صوبہ بہار)

اب لفظ "بھنڈار" ہی کو لیجئے، زبان سے نکلتے ہی اس کی "ڈ" دماغ پر لٹھ سا رسید کرتی ہے، اگر مرکز، مخزن، اور اسی قسم کے مترادف الفاظ میں ایک قسم کی نزاکت صوتی اور زبان کی خوبصورتی ہے، "بھنڈار" والے کہہ سکتے ہیں کہ بکڈپو، میں بھی "ڈ" ہے، بجا، مگر وہ نہیں جانتے کہ "پ" کے ترنم نے بکڈپو کے "ڈ" کی سختی بہت کم کر دی ہے؛

اگر اردو ہندی کے ادیب اور کوئی اپنا صحیح صناعتی فرض محسوس کریں تو وہ تعصبات پیدا ہی نہیں ہو سکتے جو اصل میں الفاظ اور ان کے غلط استعمالات سے پیدا ہوتے ہیں۔

شیطانی بوتل آر۔ ایل اسٹیونسن کی کہانی (B[illegible]) سے ماخوذ ہے، اسٹیونسن انگریزی ادب کا اعلیٰ ترین صاحب طرز ادیب و افسانہ نگار ہے؛ افسانہ کی جزئیات کو نمایاں کرنا اسکی خصوصیت ہے، شیطانی بوتل میں یہ خصوصیت زیادہ نمایاں نہ سہی مگر اس کا اسٹائل اس کہانی کی ہر سطر سے نمایاں ہے۔ اس کتاب کے مؤلف و مترجم انیس الرحمن صاحب نے نہایت کامیاب ترجمہ کیا ہے، ترجمہ میں اصل کی شان ہے، دونوں غیر منقام [illegible]

کامیابی کیساتھ ایک جا نظر آتے ہیں؛

یہ ایک خاص، امتیازی نوعیت کی طویل کہانی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے؛

ننھوں کے دیس میں

قیمت ۸ر آنے، مولف انیس الرحمن
ناشر، پستک بھنڈار لہریا سرائے
دربھنگہ۔

یہ جان سوفٹ کے سفر نامہ گلیور سے ماخوذ ہے، اعجوبہ افسانے کی حیثیت سے خاص امتیاز حاصل ہے، قدیم عربی افسانہ نگاروں کی طرز کی تقلید کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مگر اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے۔ انیس صاحب نے اس کمال و لطافت سے اردو میں منتقل و اخذ کیا ہے کہ اصل کی اعجوبہ کاری اپنی کامل شان و دلنوازی سے جلوہ گر ہے۔ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو یہ ترجمہ بذاتہٖ ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے؛

ایجاد و موجد

قیمت ۶ر از شری رام برکش بینی پوری
سائز ۲۰×۲۷/۸ ۵۵ صفحات بالتصویر

آرٹ پیپر پر پوری کتاب چھپی ہے۔

بینی پوری بہار میں ہندی زبان کے مشہور اور مقبول ادیب ہیں، خاصکر ان کے مزاحی مضامین ہندی دنیا میں بہت پسند کئے جاتے ہیں؛ بینی نے میٹھی اور سادہ زبان میں ہمارے زمانے کی چند ایجادوں، ریل گاڑی، جہاز ڈوبکنی کشتی، ہوائی جہاز، بجلی تاربرقی، لاسلکی، ٹیلیفون، گراموفون، چھاپہ خانہ اور ان کے موجدوں کا حال بیان کیا ہے، بچوں کے لئے نہایت موزوں و مناسب کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی، تصویروں اور آرٹ پیپر کے لحاظ سے اس کی قیمت بہت ہی کم ہے؛

(باقی باقی)

نئی چرکھاری

مصنفہ آغا حیدر حسین صاحب حیدر
ایم، آر، اے۔ ایس سول اسسٹنٹ سشن جج
چرکھاری۔ ملنے کا پتہ:۔ لال برادرس اور صدیق بکڈپو لکھنؤ

چرکھاری سنٹرل انڈیا کی ایک چھوٹی ریاست ہے، لیکن اس کے مرحوم فرمانروا سے بہت بڑی خصوصیات تعلق رکھتی تھیں، ریاستوں کے دیسی دربار کے متعلق کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا جا سکتا، [illegible]

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)

قیمت فی نمبر آٹھ آنہ

ناظم:- آسد یار خان اعظم

فہرست

ماہنامہ ایشیا

نومبر ۱۹۴۲ء

ادبی مرکز میں [illegible]

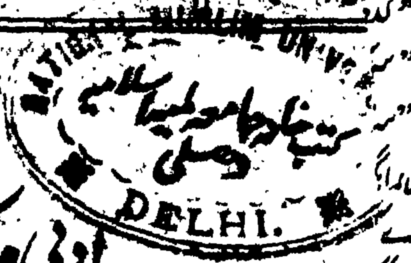
شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	فہرست اور	ساغر نظامی	۱ تا ۴
۲	دوسرے نوٹ	ساغر نظامی	
۳	ایک التجا	جاں نثار اختر	۸
	نئی صبح (ادبیات سیاسیات)		
۴	آزاد نظم (مقالہ)	ساغر نظامی	۱۰
۵	مآل محبت اور سپاہی	عزمی - بی اے (علیگ)	۱۷
۶	جمہوریت کی ایک نئی قسم	سیدہ یحیٰی میرٹھی	۱۸
۷	ٹیگور اور اُن کے کارہائے نمایاں	اقبال حسین شوقی - بی اے	۲۱
۸	[illegible] ادب کے بنتے ہوئے رجحانات	[illegible]	
۹	پہلی نظر	شیدا - ایم اے	۳۱
	نیا راگ (نظم و غزل)		
۱۰	ایک جان بہار کی سرکار میں	جوش ملیح آبادی	۳۴
۱۱	غزل	نواب جعفر علی خاں اثر بی اے	۳۵
۱۲	احساس و پیام	جمیل مظہری - ایم اے	۳۶
۱۳	یہ ہوتا ہی رہیگا	سلام مچھلی شہری	۳۷
۱۴	بے نام تقاضہ	ساغر نظامی	۳۹
	نئی کہانی (افسانے و ڈرامے)		
۱۵	مستقبل کی ایک تمثیل	مسعود چشتی	
۱۶	رُباعی	عزمی - بی اے (علیگ)	
۱۷	ادھوری چٹھی	رام پرتاپ بہادر ایم اے	
۱۸	کرموں کا پھل	ساغر نظامی	۵۳
۱۹	سلام	جالب مراد آبادی	۵۵
۲۰	تاریک دائرے	مشتاق جلیلی	۵۸
۲۱	شاعر اور چٹان	پرتھوی ناتھ شرما ایم اے	۶۶
	کسوٹی (تنقید و تبصرہ)		
۲۲	محشر خیال	تنہا بی اے ایل ایل بی علیگ	۷۰
۲۳	مضامین محمد علی حصہ دوم	ساغر نظامی	۷۳
۲۴	رفیق تنہائی	ادارہ	۷۴
۲۵	میرے نغمے	"	۷۵
۲۶	بقول زرتشت	"	۷۶
	تصویر کدہ (نظمی تنقید)		
۲۷	گلن	ساغر نظامی	
۲۸	اشک چکیدہ	ادا بدایونی	

[illegible] کی بعد ... نتیجہ پر پہنچنے کے خیالات کے

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

جلد (۷) | نومبر ۱۹۴۲ء | نمبر (۱۰)



نئی زندگی

ادبی مرکز "میرٹھ" سے پونہ میں

سے تندؔ میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے !؟

میں تقدیر کا قائل نہیں، مگر حادثات اور اتفاقات کو مانتا ہوں، حادثے اندھا دھند ہوتے ہیں، اتفاقات یونہی، مگر تقدیر مستقل ایک مسئلہ ہے، اِس مسئلہ کے معنی رشتہ دُور تک بکھرتے ہیں۔ زندگی میں پھیلی ہوئی حماقتوں، حیرتناک تضادوں، بدصورتی کی "قسمت" میں حسن، اور حسن سے عفونت کی وابستگی، دولت و حماقت کا ساتھ، سرمایہ داری و جہالت کی ہم آہنگی اور دنیا میں بکھری ہوئی بے اندازہ بھوک اور علالت، افلاس و گرسنگی، یہ تمام غیر متوازن کارخانہ ہے کہ چل رہا ہے اور انسان خیال کرتا ہے یہ اندھی مشینری کسی توازن اور شعور کے ماتحت کارفرما ہے !؟

عقل سوال کرتی ہے کہ شعور و توازن کا تقاضہ تو ترتیب و عدل ہونا چاہیے نہ کہ محسوس ناانصافی اور دل [illegible] !؟

غور کرنے کو بھی جی چاہتا ہے، ہنسی بھی آتی ہے، کل تک چالیس میل سرکنے کی ہمت نہ تھی اور آج ہزار میل کی جست کرنے کی جرأت ہے۔ !!

ایک مہینہ ہی کی تو بات ہے ادبی مرکز میرٹھ سے دہلی منتقل نہ ہو سکا مگر تازہ دلچسپ حادثہ یہ ہے کہ اس نمبر کے شائع ہونے کے بعد ادبی مرکز اپنے تمام متعلقات کے ساتھ "پونا" منتقل ہو جائے گا !

اس کی جملہ ادبی حیثیت بدستور بحالہٖ جاری رکھی جائے گی، مگر جولانگاہ میرٹھ نہیں پونا ہوگا !

دسمبر ۱۹۴۲ء و جنوری ۱۹۴۳ء کے نمبر جنوری کے آخر میں پونہ سے شائع کئے جائیں گے نئے انتظامات کی وجہ سے اگر دیر ہو جائے تو آپ ادارہ کو معاف فرمائیں گے

دنیا کا تو یہ اصول ہے کہ پرانی زندگی کے مقبرہ پر نئی زندگی کا رنگ محل چنتی ہے، مگر میں اپنے حقیقی فرض کو سمجھتا ہوں کہ میں نے نئی زندگی کی آرائش میں پرانی زندگی کی گھٹا ٹوپ رات کو قربان نہیں کیا !

پونہ منتقل ہونے کی اصل وجہ بھی کچھ دلچسپ نہیں، میرے قریبی نقاد اور دوست ہمیشہ مجھ سے کہتے رہے کہ تمہاری ادبی اہمیتیں اپنی گوناگوں حیثیتوں کے لحاظ سے متقاضی ہیں کہ میدانِ عمل فلمی دنیا ہونی چاہیے مجھے بھی اندازہ تھا کہ یہ حضرات کچھ درست فرما رہے ہیں مگر اپنی فطرت اپنے ارادوں، فلمی دنیا کے معاملات اور فلمی کیفیتوں کا بھی قریب و دُور سے اندازہ تھا، میرا فیصلہ تھا اور سچ بھی ہے کہ فلم انڈسٹری کی تباہی اور نقص کی اصل وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کی طرف زیادہ تر اہلِ علم توجہ نہیں کرتے بلکہ یہ بھی ہے کہ فلم انڈسٹری جن افراد کے ہاتھ میں ہے وہ ترقی کے حقیقی تصور سے عاری ہیں کسی آرٹ کی ترقی بغیر قربانی کے بغیر جنون ممکن نہیں، مجھے افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فلم انڈسٹری کا [illegible] آگے لیجا سکتے ہیں وہ ایثار و قربانی کو نوعیت کی اصل سمجھتے ہیں اور ملک بھی اسکو بہت کچھ سمجھتا ہے لیکن ان سب لوگوں نے تجارتی طور پر فلموں کی کامیابی کو حقیقی کامیابی قرار دے رکھا ہے

جس طرح ادب میں رجعت پسندی اور تجارتی ادارے کی تائید و ترویج کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اسی طرح فلم انڈسٹری [illegible]

[illegible]

ناچ، وہی شراب، وہی حُسن، وہی عشق، صدیوں کا تھکا ہوا دقیانوسی اور فرسودہ عشق، برسوں کا لٹا لٹایا سوتا ہوا حُسن، اُن کا عالم ہے کہ...

رجعت پسندوں نے جو راہ بنائی تھی اُسی پر آج بھی چلا جاتے ہیں۔

مگر اس جنگ کے بعد جو دُنیا بننے والی ہے اُس کے بعد فلم انڈسٹری کو جو لا ہے نئے تہذیبی ضرورت ہوگی، زندگی کی موجودہ اقدار اپنا خول...

اخلاق و اعمال کے درخت میں نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، اقتصادی اور سیاسی تقاضوں نے انسانی فطرت کو نئے ڈھنگ بنا دیا ہے، اس رات...

وہ اپنے ساتھ نئے مرد و عورت لائے گی، ان کے نفسیات جدا ہوں گے، سماجی اصول جدا ہوں گے، اخلاقی تقاضے جدا ہوں گے اور حُسن اور عشق بھی نئے...

نئی زندگی کی نئی تکنیک پر فلم انڈسٹری کیونکر اپنی جنس تیار کر سکے گی، اس کے پاس سوچ و بچار اور شاہراہِ عمل بنانے کیلئے اگر کوئی وقت...

یہی زمانہ جب زندگی آگ اور خون کے میدانوں میں سینہ بسینہ ہے، اس لئے اُسے چاہئے کہ وہ نئے تقاضوں کو محسوس کرے، اور انسانی فطرت کے مطابق...

یہ خیالات تھے، اور میں جانتا تھا کہ ان کا اظہار بھی فضول ہے، اس لئے جو دوست فلمی دُنیا میں کام کر رہے ہیں انھیں کو کام کرنے دینا چاہئے...

نے بھی کم خدمت نہیں کی، گو یہ فلمی خداؤں کے شکنجے میں کسے ہوئے کام کرتے ہیں، مگر پھر بھی اپنے فرائض کو فراموش نہیں کرتے۔

اس مرتبہ بنگلور و بمبئی کے سفر میں اک موڑ پر یکایک ایک سخت تصادم ہوا، اس کے بعد جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں۔

شالامار پکچرز پونہ سے معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں، سامنے ایک نئی دُنیا ہے، نئی زندگی ہے، اور گوناگوں نئی مصروفیتیں۔

”شالامار پکچرز“ بمبئی نے جن معزز اور پُروقار طریقوں سے میری اور حضرت جوش ملیح آبادی کی خدمات کو حاصل کیا اُس سے ہم اس نتیجے کو...

وہ دوسروں سے قدرے مختلف ہے، اس کے ذمہ دار افراد کے دل میں فلم انڈسٹری کی ترقی اور بہبودی کی بے تاب خواہش ہے، تجارتی...

ساتھ اس کے پروپرائٹر اور ڈائرکٹر صاحبان یہ آرزو رکھتے ہیں کہ آرٹ اور ادب کے لحاظ سے بھی فلم کا معیار بلند ہو۔

آرٹ، ادب اور فلم کے متعلق تبادلۂ خیالات کے دوران میں ہم نے بنیادی طور پر یہ اندازہ کیا کہ شالامار پکچرز کے ڈائرکٹر مسٹر احمد اور...

زندگی کو سمجھتے ہیں، اور .... وہ چاہتے ہیں کہ فلم کے ذریعہ ادب و زندگی کا ایک ایسا امتزاج پیش کیا جائے جو عوامی تقاضوں کو بھی پورا کرے

اور جس کے ذریعہ سماج کے ارتقائی مقاصد کی بھی تکمیل ہو۔

اس شعور کا یقین کرنے کے بعد میں نے ان کی پیشکش کو قبول کر لیا، جس کے قبول کرنے کے بعد میری زندگی کا رُخ قطعی طور پر تبدیل ہو رہا...

مگر اس زندگی میں داخل ہونے کے یہ معنی ہرگز نہ لئے جائیں کہ آپ نے جو فرائض میرے سپرد کئے تھے میں اُن سے دست کش ہو رہا ہوں، میں آپ کو یقین

دلاتا ہوں کہ ادب کے سلسلہ میں میرا جو فریضہ ہے اور جسے میں برسوں سے ادا کر رہا ہوں، وہ اسی توغل اور شغف کے ساتھ ادا کیا جاتا رہے گا، ا...

تمام حلقوں سے وہی روابط قائم رہیں گے جو اس وقت تک قائم ہیں۔

خوبصورت، پُرسکون، شریف اور مسافر نواز ”میرٹھ“ میں میں نے اگست ۱۹۳۲ء میں رہنا سہنا شروع کیا۔ گیارہ برس اس کی محبت کی

آغوش میں زندگی بسر کی، ادبی جدوجہد میں اس شہر نے حصّہ لیا یا نہیں لیا، اس تجزیہ کا موقع ہے نہ ضرورت، مگر یہ کچھ کم سلوک نہیں کہ اس کے

ہندو اور مسلمان باشندوں، عوام و خواص اور اہلِ قلم و شعراء نے مجھے خاک پر نہیں اپنے دل میں بٹھلایا، میں کسی ایک فرد کا نام نہیں لے سکتا جو میری

راہ میں حائل ہوا ہو، آج مسافر کارواں سے کٹ کر ایک دوسری طرف جا رہا ہے مگر اہلِ میرٹھ کی ابدی محبت اس کے سینہ میں درخشاں ہے

اسے ہمت شکن تاریکیوں میں بھی راہ دکھاتی رہے گی۔

حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں۔

پونہ کا پتہ:-

شالامار پکچرز اسٹیڈیو
پونہ

ساغر نظامی
ادبی مرکز میرٹھ
۲۳ر دسمبر ۱۹۴۲ء

شرم محسوس ہوتی تھی۔ اور اب ...... رانگا اور نینا دونوں مجرموں کی مانند وقت کاٹ رہے تھے معصوم بچہ کی طرح ان کے چہروں پر خوف و ہراس اور آنے والے واقعات کی پرچھائیاں ان کو حیران و پریشان کئے دیتی تھیں ان کی حالت اس وقت اُن چڑیوں کے مانند تھی جو باز کی شکل دیکھتے ہی گھبرا سی جاتی ہیں اور آس پاس کی کسی جھاڑی میں چھپ نہیں سکتیں۔ دو مضبوط ہاتھ، دو مضبوط ہاتھ اُن کو پکڑ سکتے تھے اور ...... راہگیر... کونسا راہگیر نہ ہوگا جو اُن کو بھاگنے کی اجازت دیدے۔

"کدھر ہے تمہارا گاؤں؟"

"سرکار۔ سرکار..."

"سرکار کے بچے۔ بتاؤ کدھر ہے تمہارا گاؤں..." تلیٹی میں کتنے ہی راہگیر اپنے کندھے پر لٹھ رکھے جا رہے تھے۔ رانگا اور نینا ڈر کے مارے گھبرا رہے تھے۔ گاؤں والوں کا انصاف۔ اُف کتنا سنگین ہوتا ہے اگر اُن لوگوں کو معلوم ہو گیا تو بلا تامل ان دونوں کی لاٹھیوں سے خبر لیں گے۔

"اِدھر سرکار"

"اچھا چلو" پھر تھوڑے توقف کے بعد، نینا کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے ونود نے کہا "لڑکی تجھے اُس سے محبت ہے۔ سچ بتانا۔ اس آدمی سے پیار کرتی ہے۔ کیوں۔ !؟"

"سرکار" نینا کے رخساروں میں شرم جھلک اٹھی۔ اُن کا رنگ ساون کے موسم میں پکے ہوئے آم کے مانند شباب آور بن چلا۔ اودے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی نمودار ہوئی۔ سر جھک سا گیا۔ دونوں ٹانگوں کی پائل آپس میں ٹکرا سی گئیں۔ اُن کی آواز ایک نغمہ میں گم ہو گئی۔ شاید اُس محبت کا اعتراف کر رہی تھی جس کا رانگا اور نینا کی آنکھیں پتہ دیتی ہیں۔ "سرکار" کنول کی ڈنڈی پھر لچک سی گئی۔

ونود جھکا۔ ڈالی سے ایک جنگلی گلاب کا پھول توڑا، اور اپنے ہاتھ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان مسلنے لگا۔ "اچھا تجھ کو اس سے محبت ہے ...... جنگلی پھول" تلیٹی کے سہارے سہارے میدانی علاقہ میں جگہ جگہ گلابی پھول ہوا میں ایک ہلکی ہلکی خوشبو پھیلا رہے تھے۔ رانگا اور نینا بیل کی مورتیوں کے مانند ونود کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ اندھیرا؟ اندھیرا تقریباً ہو سا چلا تھا۔ نئے چاند کی روشنی میں، اُن دو پیتل کی مورتیوں میں چمک اور زیادہ بڑھ چلی تھی۔ ونود نے پھر قدرے توقف کے بعد نینا سے کہا۔

"تو تجھ کو اس سے محبت ہے۔ ایں! ٹھیک ...... اور تو اس بات کا اقرار کرتا ہے، تجھ کو اس لڑکی سے محبت ہے؟"

رانگا مسکرا سا اٹھا۔ پیتل کی مورتی نکھر رہی تھی۔ "ہاں! ہاں سرکار......"

"بہت خوب ...... اور تم دونوں اتنے ڈرپوک ہو کہ جھوٹ بولنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اچھا! ...." شاعر کے سامنے ایک چٹان کھڑی تھی۔ نہایت مستحکم ..... اور ایک کند پھاوڑہ ..... وہ کس طرح اس چٹان کو توڑے۔ ونود سوچنے لگا۔ ان دو گاؤں کی ڈرپوک ہستیوں کے درمیان عجیب قسم کی محبت ہے۔ وہ ڈر کے مارے اپنے گاؤں چھوڑ جانے سے رہے۔ اور دوسرے گاؤں میں جاتے ہچکچائیں گے۔ بزدل ... کیا اس میں اتنی بہادری نہیں جو اس محبت کی کو پروان چڑھنے دے شاید گاؤں کے باغی شہر میں ایک نئی لہر پیدا کر دیں .... محض ایک جذباتی چٹان ...... بے عمل شاعر کا سپنا .... محبت، رومان، اور وہ خیالات کی چٹان کتنی مستحکم ہے۔ شہر محبت سے آشنا نہیں۔ اور گاؤں میں محبت پھوٹتی ہے، مگر نہایت بھونڈے طریقہ سے پرورش پاتی ہے۔ رانگا اور نینا نئے نکلے چاند کی روشنی میں نہایت خوبصورت نظر آتے ہیں۔ شاعر کی چٹان ...... ونود نے سوچا کتنی نرم پڑ چلی ہے۔ اُس نے اپنی عمر کے لمبے سالوں میں جذبات کے ٹیلوں کو پار کر کے رومان کے میدانوں میں ہنستے کھیلتے پھولوں کو ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے دیکھا تھا۔ شاعر۔ ایک تنہا ہستی ہے وہ ہر ایک جاندار کی روح میں پیوست ہو جانا چاہتا ہے اور اُس کا کند پھاوڑا اُس مستحکم چٹان کو توڑنے میں ہمیشہ کوشاں رہتا ہے جو ایک جذباتی اور خیالاتی سکون کی دُنیا کے قائم ہونے میں حائل ہے۔ رانگا اور نینا ڈرپوک لیکن محبت کے پروانے ...... ونود جذبات کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ وہ ان دونوں روحوں کو ملانے کی کوشش کرے گا۔ اس آسمان تلے چاند کی پھیکی روشنی میں۔ اس کے دل میں ایک سمندر موجیں مار رہا تھا۔ جذبات کا سمندر.....

"رانگا تجھے نینا سے پیار ہے۔ سچ بتانا....."

"ہاں!"

ونود کے ہاتھوں میں دو گلاب کے جنگلی پھول تھے جو اُس نے چلتے چلتے اُن پودوں کی ٹہنیوں سے جدا کر دیئے تھے جو اُس تلیٹی اور میدان میں پرورش پا رہے تھے۔

"دو جنگلی پھول" ونود نے دونوں گلاب کے جنگلی پھولوں کو یکجا کیا۔ "دو جنگلی پھول ......" تھوڑے توقف کے بعد... "رانگا اور نینا دیہات نے تم کو ڈرپوک بنا دیا ہے نا..... ایں!"

بیتل کی موتیاں ہنس دیں۔ پھیکے چاند کی روشنی میں کچھ آوازیں گونج گئیں۔ ونود چونکا۔ بیتل کی موتیوں پر اُداسی چھا گئی۔ بہت سے آدمی ایک دم بھاگے آرہے تھے۔

"آجاؤ بھائی......" ایک دیہاتی جس کے کندھے پر لٹھ تھا للکارا

تین انسان سہم گئے "آجاؤ چور پکڑا گیا"

"اچھا!....." آوازیں گونج گئیں۔ تینوں کو ایک گھیرے میں لے لیا گیا "بھاگ کر گئی تھی کلنکن" "عشق کرنے چلی تھی شہری"

......"ہیر رانجھا......"

"کیوں بے رانگا" ایک آدمی نے رانگا کے ہاتھ کو پکڑا......

"کیوں بے چھوکری کو بھگا کر لایا"

"بھیا مجھے کیوں پکڑتے ہو ناحق..... بھلا میں کیسے گاؤں کی لڑکیوں کو بھگا کر لیجاتا۔ یہ بابو صاحب..... یہ بابو صاحب.... اور میں اِدھر ایک گاؤں سے آرہا تھا۔ نینا ان بابو صاحب کے ساتھ بھاگی جارہی تھی......"

"اچھا! چلئے بابو صاحب....." اُجڈ اور گنوار ہاتھوں نے ونود کی گردن ناپی۔

"سنبھل کر۔ بابو صاحب کو گاؤں لے چلو۔ پنچایت فیصلہ کریگی چل ری چھوکری..... چل!"

نینا رو رہی تھی۔ اُسے رانگا سے اتنی اُمید نہیں تھی۔ انسان مجرم کے بھیس میں کتنا بزدل بن جاتا ہے۔ رانگا.... نینا نے محسوس کیا رانگا کی بانسری ٹوٹ گئی ہے، وہ اسے اَب بجا نہیں سکتی۔ ایک زبردست اور خوفناک مستقبل نے رانگا کے خیالات کو تبدیل کر دیا۔ نینا روئے جارہی تھی۔ اُس نے ایک نئی دُنیا کا خواب بسایا تھا، برگد اور دیودار کے درختوں کے سایہ میں بسنے والی دُنیا کا خواب۔ رانگا کو اپنے زانوؤں کا سہارا دیکر تھکن دور کرنے کا خواب..... جنگلی پھول..... جنگلی پھول ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے۔

ونود چپ تھا۔ وہ ان اُجڈ گنوار لوگوں سے کیا کہہ سکتا تھا۔ اُس کی عقل اُن پر کس طرح غالب آسکتی تھی۔ ونود۔ رانگا۔ نینا۔ ......عجیب مجموعہ......

گاؤں میں پنچایت لگی۔

صدر اپنی جائے نشست سے کھڑے ہوئے "بابو صاحب کو پنچایت کے سامنے پیش کرو"

ونود سر جھکائے پیشی میں کھڑا ہو گیا۔

"اچھا!" صدر نے حقہ کا ایک کش لگا کر فرمایا۔ "اچھا بابو صاحب! پہلے یہ بتاؤ کہ تم نینا کو کتنے دن سے جانتے ہو۔ سچ سچ بتانا۔ پرماتما کا انصاف سُنا ہے....."

"ہاں! میں نے پرماتما کا انصاف سُنا ہے پنچ مہاشے...... میں اس لڑکی سے تو کیا گاؤں تک سے واقف نہیں۔ رانگا نینا کو بھگا لے جارہا تھا۔ اُس نے میرے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کیا۔ رانگا نینا سے محبت کرتا ہے۔ یہ تم خود اُن کے دل سے ہاتھ لگا کر پوچھ سکتے ہو...."

"بابو صاحب آئے..... چھوکری کو پیش کرو۔ کیوں ری! تو رانگا کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ ایں! گاؤں کی لاج اتنی سستی...... سچ بتا......"

پنچایت میں ہلکی سی آوازیں بیدار ہو گئیں۔ رانگا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"پنچ مہاشے..... صرف دو بات....."

"کہو"

"کاکا شہر کے آدمی بہت چالاک ہوتے ہیں۔ اور گاؤں کی لڑکی ان بیچاروں کے دھوکہ میں آجاتی ہے۔ نینا پاگلوں کی طرح بابو صاحب کے پیچھے جارہی تھی قطعی پاگلوں کی طرح.... میں نے بابو صاحب کو روکا اور گاؤں کی طرف ہی لا رہا تھا......" رانگا ہانپ سا گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہو گیا، اُس کو پونچھا......" ہاں! تو یہ نادان لڑکی، پگلی سی بابو صاحب کے ساتھ دیوانی سی بھاگی جارہی تھی"

نینا خاموش تھی۔ وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اُس نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ساتھی پرندے نے اپنی محبوبہ کو تنہا پھڑپھڑانے کیلئے چھوڑ دیا ہے اور اُس پرندے کے پر ہوا کی تیزی سے کٹ سے گئے ہیں۔ اُف..... نیلا آسمان، رانگا، بانسری، اور ونود..... برگد اور دیودار کے درختوں کے سایوں میں ایک نئی دُنیا.... دماغ کے سامنے دھندلا دھندلا ماحول۔ چکر، دائرے.... نینا کو غش آ گیا۔

پنچایت میں کھلبلی سی مچ گئی..... لوگ نینا کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگے۔

"دیکھا پنچ مہاشے" رانگا نے کھڑے ہو کر کہا۔ "نینا کو اپنی کتنا غم ہے جنگلی پھول، بابو صاحب جنگلی پھول توڑ کر سونگھتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں لڑکی کا دل موہ لیا۔ بے چاری گاؤں کی لڑکی......"

نینا ہوش میں آگئی تھی۔

حقیقتاً سچ بتا کیا قصہ ہے۔ آدمی بعض دفعہ بہت چالاک بنتے ہیں۔"

"بنچ مہاشے..... پنچ مہاشے۔ پرماتما مجھ کو، تم کو سب کو دیکھ رہا ہے۔ گنگا جلی ہو تو میں قسم تک کھا سکتی ہوں۔ گنگا ماتا کی قسم بابو صاحب نردوش ہیں۔ نردوش..... رانگا!" نینا کی بھویں پلکوں پر جھک گئیں اُس کے رخساروں میں شفق کا شہابی رنگ اُتر آیا۔"میں رانگا کو چاہتی تھی اُس نے دریا پار بانسری بجائی اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چل دی۔"

"غلط..... جھوٹ۔" رانگا نے غصّہ کا اظہار کیا۔"سفید جھوٹ کاکا بالکل سفید جھوٹ۔"

"لڑکی کو اپنا بیان جاری رکھنے دو۔ خاموش....."

"کاکا....." نینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔"کاکا میں رانگا کو چاہتی تھی۔ وہ مجھ کو ایک نئی دُنیا میں لئے جا رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہم دونوں مل کر ایک نئی دُنیا بسائیں گے۔ برگد و دیودار کے سایوں تلے......"

آنسو، غم کے موتی۔"بابو صاحب نردوش ہیں۔"

"اُونہہ"۔ پنچ مہاشے نے اپنی ناک بھوں چڑھائی۔"نئی دُنیا۔ لڑکی تو کوئی بن گئی ہے۔ کتنی بھولی بن چلی ہے.... چل ہٹیہ..... بابو صاحب صاف قصہ بتا دیجیے۔ گاؤں کا انصاف شہر کے انصاف سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہ ہم سب انسانوں کا انصاف ہے۔"

ونود کھڑا ہو گیا۔ ایک عظیم مورت، اس کی آنکھیں اداس تھیں وہ ایک عجیب گروہ میں پھنس گیا تھا۔ ایک عجیب ماحول، اُس گروہ کی آنکھوں میں روایتی شبہ تھا۔ دیہات والوں کی آنکھیں شہر والوں میں صرف ریاکاری جعلسازی، فریب اور دغابازی کے اور کچھ دیکھ نہیں سکتی۔ ونود کا دل سسک رہا تھا۔ شاعر کا دل..... وہ اپنے جذبات کی دُنیا میں ایک نئی تصویر بیدار کرنا چاہتا تھا۔ ایکدم مختلف تصویر...... وہ پُرانے خداؤں کو نئے زمانہ میں نیا چولہ پہلوانا چاہتا تھا۔ اُس نے چٹان پر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھے بیٹھے رانگا اور نینا کے لئے ایک نئی دُنیا کی تشکیل کے بارے میں سوچا تھا۔ خواہ وہ برگد اور دیودار کے سایہ تلے ہو یا اُس کے کنج عزلت میں۔ شاعر کا خیال، نئی دُنیا..... اور وہ کند پھاوڑے سے اُس چٹان کو توڑنا چاہتا تھا جو شاعر کو "بے عمل" کے نام سے پکارتی ہے۔ شاعر بے عمل۔ اُف ..... ونود نے اپنی پیشانی پر تین اُنگلیوں کو پھیرا۔ پسینے کے قطرے زرد مٹی میں گر کر جذب ہو گئے۔ اُف! شاعر اور چٹان۔ اور اس کی ایک نئی دُنیا... جو وہ رانگا اور نینا کے واسطے برگد اور دیودار کے درختوں کے سایہ میں یا اپنے کنج عزلت میں بسانا چاہتا تھا۔ بھورے بادل آسمان میں تیرتے تھے۔ ہواؤں نے اُن بادلوں کا سارا رس چوس لیا تھا.....

"پنچ مہاشے۔ تمہاری آنکھ پتہ دے رہی ہے کہ تم کو شہری پر شک ہے ضرور اس بات سے انکار نہیں۔ میرا دل صاف ہے بالکل صاف ستھرا میں ایک چٹان پر جو کہ اُس ندیا سے جو تمہارے گاؤں کے نزدیک سے گزرتا ہے، شاید چھ یا سات میل دوری پر ہے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر رانگا آیا اور نینا کے ساتھ..... وہ دونوں ساتھ گاؤں سے بھاگ کر آئے تھے وہ دونوں ایک نئی دنیا بسانا چاہتے تھے..... پھر میں اُس چٹان سے اترا ان کو دھمکی دی۔ یہ گھبرائے۔ کچی پود تھہرے معصوم پروانے لیکن میں سمجھتا تھا کہ نینا اور رانگا دونوں کو چاہتے ہیں۔ ان دونوں میں راستہ میں اس بات کا اعتراف بھی کیا۔ اور پھر....." ونود کے چہرے پر ایک رومانی نور دوڑ گیا۔ بھورے بادل اَب بھی آسمان میں دوڑ رہے تھے "اور پھر..." اور پھر شاعر کا دل جاگ اُٹھا۔ اُس کے جذبات نے اس کے خیالات پر قابو پالیا۔ اور پھر میں نے سوچا یہ دونوں جہاں بھی جائینگے پکڑے جائیں گے، ان کا جرم.... نہیں ان کا جرم نہیں بلکہ گاؤں والوں کی نگاہوں میں ان کا جرم کھٹکے گا۔ اور گاؤں کا انصاف ان کو کہیں کا نہ رہنے دیگا۔ میں ان کے لئے وہ دُنیا مہیا کرنا چاہتا تھا جس کی ان دونوں کو ضرورت تھی۔ برگد اور دیودار کے درختوں کے سایہ تلے ایک نئی دُنیا......" ونود کا سانس اکھڑنے لگا۔ بس پنچ مہاشے اب آگے کیا کہوں۔"

رانگا پھر کھڑا ہوا۔"شہر والوں کی زبان کا اعتبار کیا۔ کاکا! کاکا سُنتے ہو۔ اُس گاؤں میں جہاں عزت کے نام پر نوجوان اپنی گردن تک کٹوا دیں بھلا ایسا کُکرم ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میرا الٹھ ہاتھ سے چھوٹ کر گھاٹی میں کھو گیا نہیں تو میں اس آدمی وہیں ختم کر دیتا۔"

"ٹھیک ہے۔ رانگا ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ رانگا نے ٹھیک کہا ہے۔ نینا نے اپنے گاؤں کی لاج کھو دی ہے..... شہری.... شاعر کے ساتھ عشق کر رہی تھی۔ ایک نئی دُنیا بسانے۔ برگد اور دیودار کے درختوں تلے..... ہا ہا ہو ہو....."

"خاموش! بھائیو خاموش....."

نینا رو رہی تھی۔ اُس کے دل پر ایک چٹان ٹوٹ پڑی تھی۔ ونود بے بس تھا۔ اُس کے شعور کے ہاتھوں میں ایک کند پھاوڑہ تھا جو اُس چٹان کو توڑ دینا چاہتا تھا جو انسانی ترقی کے ہر ایک کام میں مانع ہے اُف کتنی سخت ہے وہ چٹان، وہ محض جذبات کے کند پھاوڑے سے نہیں بکھیری جا سکتی۔ اس کے ہاتھوں نے محسوس کیا کہ وہ دو جنگلی

بھول جن کو اُس نے آپس میں ملانے کی کوشش کی تھی کا ثابنکر اس کی نازک ہتھیلیوں میں چُبھ رہے ہیں۔ اور وہ اس چٹان کو ہرگز نہیں توڑ سکتا وہ صدیوں سے قائم ہے اور قائم رہے گی۔ پُرانے خدا ایک دم مستقل ہیں۔ انھیں نئی بات بالکل نہیں بھاتی۔ شاعر کی دُنیا بے عمل انسان کی دُنیا ہے۔ اُس دور کا خیال جو صدیوں آگے ہے۔ صدیوں آگے.. .... صدیوں بیتنے پر بھی شاید رانگا اور ننیا برگد اور دیودار کے سایوں میں ایک نئی دُنیا بسانے میں کامیاب نہیں ہوں گے ....

..... اور ننیا وہ اس بھیڑ کی آنکھ بچاکر ایک درخت پر چڑھ رہی تھی۔

برگد کا درخت ....

پنچ مہاشے نے کہا ...... فیصلہ۔ پنچایت کا فیصلہ سُننے سے پہلے کچھ کہنا چاہتے ہیں بابو صاحب ..... "

"کچھ نہیں "

"بابو صاحب کی کمر پر سو کوڑے لگائے جائیں بس۔ اور پھر ان کو گاؤں کی طرف سے پیٹھ پھیر کر شہر کی طرف بھاگنے کی اجازت ......

"ہاہاہا ...... " رانگا ہنس دیا " ہاہاہا ....."

ایک! دو!! تین!!! ......

ایک شور " بھاگنا ۔ دوڑنا ...... غضب ہو گیا ۔ ظلم ہو گیا پرماتما! ...... " ایک عجیب ابتری ......

"کیا ہوا"

"کیا ہوا" پنچ مہاشے نے پوچھا۔

"ننیا نے درخت پر چڑھ اور پتھروں میں کود کر جان دیدی

"عجیب ...... بابو صاحب کو بہت سزا ملنی چاہیئے ......"

وِنّو ہنس دیا "خوب! ......"

گاؤں کے لوگ اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔ ایک غیر متوقع واقعہ نے ان کو سراسیمہ کر دیا تھا۔

وِنّو جلدی جلدی گاؤں سے باہر نکل کر بھاگا جا رہا تھا۔ خداؤں کے قہر سے دُور۔ اور وہ چٹان جس کو اس نے توڑنے کی کوشش کی تھی۔ اب کتنی مستحکم ہو گئی تھی۔

جاں نثار اختر

ایک التجا

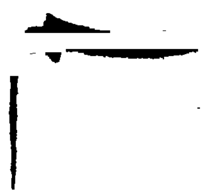
ایسی پاگل نہ ہو محبّت میں	میری دیوانگی کو پیار نہ کر
ایک میرے سکونِ دِل کے لئے	اس طرح خود کو بے قرار نہ کر
میرے ایّامِ غم کو رہنے دے	اپنی راتوں کو سوگوار نہ کر
دِل کسی اور ہی کا وحشی ہے	اپنے الطاف کا شکار نہ کر
یہ عنایت ، یہ مرحمت ، یہ کرم	اس قدر مجھ کو زیرِ بار نہ کر
اور کا غم اُٹھا رہا ہوں میں	تو مرے غم کو اختیار نہ کر
جو تجھے پیار کر نہ سکتا ہو	تو بھی اُس بے وفا کو پیار نہ کر

زندگی بے قرار ہے میری
تو اسے اور بے قرار نہ کر

ثنی ۔ ح

ساغر نظامی

آزاد نظم



اس مقالہ کی حیثیت استفہامیہ ہے، مسائل کو سمجھانے سے زیادہ سمجھنا میرا مقصد ہے، اس زمانہ میں غیر منطقی اختلاف کی گنجائش کہاں؟ ہم سب ایک ہی مقصد کے لئے مختلف گوشوں میں جدّ و جہد کر رہے ہیں۔ نئے شعور اور ترقی یافتہ مزاج نے اخلاق و عمل دونوں کا سانچہ بڑی حد تک تبدیل کر دیا ہے، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ادبی تنقید اور اس کا لہجہ حیرتناک طور پر بدلا ہے۔ اس عہد کے کسی دو بڑے شاعروں میں غالب و قتیل کا سا مجادلہ نہیں ہوا، شرر و چکبست کی طرح اب مشہور انشا پردازوں کو آویزش کی فرصت کہاں! آج ادیبوں اور شعرا کو اٹھانے اور گرانے کے نئے طریقے تو ایجاد ہوئے ہیں، مگر وہ مغربی سیاست کی طرح دقیق ہیں، مشرقی سادگی کی طرح نمایاں نہیں!

رہے ادیبوں کے گروہ، ان کے مفاد، پروپیگنڈہ، دوستانہ مدّاحیاں: اب پرانے ادیبوں میں بھی باقی نہیں، ایک دو تازہ دموں میں اس کی جھلک ہے، مگر صرف جھلک، کیونکہ وہ جانتے ہیں' یہ حربے اب کامیاب نہیں ہو سکتے!

اب تنقید ذمہ دارانہ طور پر ادب کے اجتماعی فرائض اختیار کر چکی ہے' انفرادی خواہشوں کو فرائض پر ترجیح نہیں دی جا سکتی!

میرا مطلب یہ ہے کہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اُسے نظم معرّیٰ کے دلدادہ محض میری استفادہ کوشی پر محمول کریں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں زندگی اور ادب کے کسی جزیہ میں رجعت پسند نہیں ہوں! ۲۳ء سے لیکر ۱۹۴۲ء تک میری تمام کوششیں بتاتی رہی ہیں کہ میں اجتہاد اور جدّت ہی کا حامی ہوں اور اُس پر عامل بھی' اس لئے اس مقالہ میں نظم معرّیٰ کی مخالفت محض اصولی مخالفت ہے' اور یہ محض ایک کوشش ہے اس فارم کو حقیقی طور پر سمجھنے سمجھانے کی!

کوئی ۱۷ برس ہوئے، مارچ ۱۹۲۶ء کی ایک رات تھی، فیروزپور (پنجاب) کے ایک عام جلسہ میں سب سے پہلے میں نے نظم معرّیٰ کے دو نمونے تصدق حسین خالدؔ کی زبانی سے سُنے' اس وقت یہ مسائل کہاں تھے جو اب پیدا ہوئے' ۱۷ برس کا طویل و عریض خلا اس مشاعرہ کے درمیان حائل ہے!

خالدؔ سے پہلے عظمت اللہ خاں دہلوی نے اسی قسم کے کئی تجربات کئے، عظمت اللہ خاں عروض اور موسیقی کے فن کو فنی طور پر جانتے تھے۔ خیال و آہنگ کے باہمی ربط اور اس کے فلسفہ سے خوب واقف تھے۔ عظمت اللہ خاں سے پہلے اُردو میں عبدالحلیم شررؔ اور اسمٰعیل میرٹھی کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان بزرگوں نے نظم غیر مقفّیٰ کا اک اسلوب جاری کیا۔ ان کے بعد موجودہ نئے فارم کا موجد تاریخی طور پر تصدق حسین خالدؔ ہے جس نے ۱۷ برس پہلے آزاد نظم کا موجودہ فارم شروع کیا! اصل میں خالدؔ کی ایجاد بھی بلینک ورس کی تقلید تھی، نہ جدید زاویہ ہائے فکر پیدا ہوئے تھے نہ ذہنی تسلسل، اور نہ نفسیاتی تحریک: آرٹ بناتے تو کیسے بناتے، لوگوں نے سُنا، زیرِ لب ہنسے، خالدؔ بھی سُنا سنو کر خاموش ہو گئے، مگر زندگی کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب کی پرورش کرتے رہے' رسائل میں اس کے نمونے چھپتے بھی رہے، لیکن خالدؔ کو کسی قسم کے دعویٰ کی جرأت نہیں ہوئی' اس کی شاید دو وجہیں تھیں!

ایک تو وہ جو اوپر بیان کی گئی' دوسرے اُن کی پشت پناہی کے لئے کوئی ایسی پارٹی موجود نہیں تھی جو ہیرو سازی کا فریضہ ادا کرتی -!؟

آج سے پہلے اگر عبدالحلیم شررؔ اور اسمٰعیل میرٹھی نے اس فارم کو ترک کر دیا تو اس کی کوئی اہم اور بنیادی وجوہ و اسباب ضرور ہوں گے، کیونکہ یہ اصحاب کسی چیز کو محض عوام کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی خاطر اختیار و ترک نہیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انھیں فکر و فن کے اصولوں ہی نے آگاہ کیا ہوگا کہ یہ اسلوب مقاصد کے اظہار و بیان کے لئے مناسب نہیں ہے، یقیناً انھیں یہ تجربہ ہوا ہوگا کہ نظم غیر مقفّیٰ اردو زبان میں خوش آہنگ معلوم نہیں ہوتی - اور

مطالب کامل جاذبیت و موزونیت کے ساتھ اس اسلوب میں
ادا نہیں ہو سکتے، یعنی با قافیہ نظموں ہی میں تاثیر و آہنگ اور لوچ
پیدا ہو سکتا ہے۔

قطع نظر عظمت اللہ خاں کے اُردو شاعری میں اجتہادی
قدم اٹھانے والوں کا نظم غیر مقفیٰ سے یہ اجتناب اس حقیقت کا
ثبوت ہے کہ وہ با قافیہ نظموں کے مقابلہ میں بے قافیہ نظم کے اثرات کے
قائل نہیں تھے۔

ہمارے عہد میں تقلید پرست مجددین اس باب میں کئی
نوعیت سے متاثر ہوئے۔

(۱) میرا خیال ہے کہ جاپانی شاعری کے ترجموں نے انھیں ضرور
متاثر کیا۔

(۲) بلینک ورس کی بنیاد پر ہونے والی کوششوں سے بھی
ان حضرات نے اثر لیا۔

لیکن ان اسباب کے علاوہ ایک دلچسپ سبب
اور بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی ابھی "ٹیگوری اُردو"
اور "شعر منثور" کو نہ بھولا ہوگا جس کی ایجاد ۱۵ سال قبل چند خوش فکر
رومانی انشا پردازوں نے کی تھی، اس بدعت کا کچھ مدت تک
اردو ادب میں چرچا رہا۔ کیا عجب ہے کہ نظم معریٰ کا تخیل "شعر منثور"
ہی سے پیدا ہوا ہو۔

اس پیرایۂ بیان کے اجزا و عناصر شعریت افروز تھے، الفاظ
کا ترتیب، تراش اور در و بست میں نظم کی سی غدویت و رنگینی تھی
یہ نظم معریٰ کی طرح صرف پڑھی جا سکتی تھی، مگر اس کے مقابلہ میں
شعر منثور کے اندر ایک خاص قسم کی دلکشی، قوت اور حسن پایا جاتا تھا،
میری رائے میں "شعر منثور" اُس زمانہ کے شعراء سے ذہن کا
ایک غیر شعوری مطالبہ تھا کہ وہ روایتی غزل کو ترک کر کے نظم میں وہ
رومانی عناصر جوش، شیرینی اور لوچ پیدا کریں جو "شعر منثور" میں پیدا
ملتا ہے۔ چنانچہ ذہنی ارتقا نے اُردو شاعری میں ایک نیا رومانی
دور شروع کیا، اظہار و بیان کے جدید طریقے ایجاد کئے گئے۔ اور
نظم پر رومانی اثرات چھا گئے۔

گو آپ بلینک ورس کی تاریخ سے واقف ہوں گے لیکن شاید
یہاں اس کی طرف اشارہ نامناسب نہ ہوگا۔

کلاسیکی (یونانی اور رومی) شاعری میں بہت سی ایسی خصوصیات
موجود تھیں جنھوں نے یورپ کے شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا
اطالوی شاعر ٹریسنو (Trissino) نے جو سولہویں
صدی کے اولین نصف حصہ میں موجود تھا اپنی ٹریجڈی (المیہ)
سوفونسبی اور رزمیہ نظم اٹیلیہ لیبریٹا ڈے گوٹی
(Italia Liberata dai Goti) کلاسیکی شعر
کی تقلید میں بلینک ورس میں لکھیں۔

ادھر انگریزی شاعر اَرل آف سرے (Earl of Surrey)
نے جس کا انتقال ۱۵۴۷ء میں ہوا، اس اطالوی شاعر کے اتباع
میں ای نیڈ (Aeneid) کا دوسرا اور چوتھا حصہ غیر مقفیٰ
نظم میں ترجمہ کیا جو ۱۵۵۷ء میں شائع ہوا۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا
ہے کہ اَرل آف سرے نے انگریزی زبان میں نظم غیر مقفیٰ کو پہلی
مرتبہ رواج دیا۔

اس کی اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ کاؤپر جیسے شعرائے
مابعد نے ترجمہ کے لئے نظم غیر مقفیٰ ہی کو اختیار کیا۔ چنانچہ کاؤپر
نے خود ہومر کا ترجمہ نظم کی اس جدید طرز میں کیا۔

اَرل آف سرے کے کچھ روز بعد سیکول (Sackville)
اور نارٹن (Norton) نے نظم غیر مقفیٰ کو درباری ڈرامہ نویسی
کے لئے پسند کیا۔ اور اپنی ٹریجڈی گاربوڈک (Gorboduc)
۱۵۶۱ء میں تصنیف کی لیکن مارلو (Marlowe) نے اپنا
مشہور ڈرامہ تیمور اعظم نظم غیر مقفیٰ میں لکھ کر عام ڈرامہ نگاری کے
لئے اس طرز جدید کو مروج کر دیا۔

سولہویں صدی کے اواخر سے نظم غیر مقفیٰ کا رواج ہو گیا اور
شیکسپیر نے اس کو مزید ترقی دی۔ اگرچہ یہ ترقی بتدریج ظہور میں
آئی۔ کیونکہ شروع شروع میں اس نے اپنے ڈراموں کے بعض اشعار
مثنوی کے انداز میں کہے۔ یعنی اس کے اشعار مثنوی کے طرز پر جداگانہ
قوافی رکھتے تھے۔ یا کبھی اس طرح پر کہ پہلے مصرعہ کا قافیہ تیسرے مصرعہ
سے ملتا تھا اور دوسرے مصرعہ کا قافیہ چوتھے مصرعہ سے۔ لیکن بعد
کے ڈراموں میں مقفیٰ اشعار کا طریقہ بالکل ترک کر دیا۔ چنانچہ
ٹمپسٹ (Tempest) میں جو (آخری عہد کا ڈرامہ ہے)
۱۴۵۸ مصرعہ غیر مقفیٰ ملتے ہیں اور محض دو مصرعہ مقفیٰ۔ اسی طرح
رومیو اینڈ جولیٹ (Romeo and Juliet) میں جو
(شروع کا ڈرامہ ہے) ۸۱ مصرعے مقفیٰ ہیں اور ۲۴۹ مصرعے
غیر مقفیٰ۔ لیکن مقفیٰ مصرعے لکھنے میں اکثر اوقات ڈرامے کے مناظر

اپنے کردار اور ان کی گفتگو کا بہت خیال رکھا ہے، چنانچہ جہاں جہاں اُسے غنائی شاعری سے اثر پیدا کرنا منظور تھا۔ مثلاً (Romeo & Juliet) میں اُس نے ہمیشہ مقفّیٰ مصرع لکھے ہیں۔ یہی حال مڈسمرز نائٹس ڈریم (Midsummer Nights Dream) کا ہے۔

سترہویں صدی میں ملٹن (Milton) نے اپنی رزمیہ نظم پیرے ڈائز لاسٹ اور پیرے ڈائز ری گینڈ بلینک ورس میں تصنیف کی، اٹھارہویں صدی میں ینگ (Young) اور ٹامسن (Thomson) اور دوسرے شعراء نے اخلاقی نظمیں بلینک ورس میں لکھنے کو رواج دیا، اور انیسویں صدی میں ہر قسم کی نظمیں اس صنف میں لکھی جانے لگیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام کوششوں میں بحر کا وجود ضرور باقی رہا۔ اس طرح قدیم انگریزی شاعری میں بلینک ورس اردو کی نظم معرّیٰ سے بالکل مختلف تھی، اور اسے انگریزی شعرائے

منظوم ڈرامہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اختیار کیا لیکن نظم معرّیٰ کے پیش نظر اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو اس کے سلسلہ میں بے قافیہ نظم کام آسکتی تھی، معرّیٰ نہیں۔

انگلستان کے علاوہ جہاں تک فرانس میں اس کا تعلق ہے یہ کامیاب ثابت نہ ہوسکی۔ اگر نظم معرّیٰ کا تعلق فنّی اور فکری تبدیلیوں سے ہوتا تو فرانسیسی ادب کے لئے اس سے گریز ناممکن ہو جاتا۔ کیونکہ فرانس کی سرزمین نے موپاسان، فلابیئر، والٹیئر اور روسو جیسی ہستیوں کی تمام فکری اور فنّی کوششوں کو قبول کیا۔

فنونِ لطیفہ میں نظم وتناسب کا تخیّل

آئیے اب ذرا اس مسئلہ کو اور گہری نظر سے دیکھیں اور جواز و عدم جواز کو تلاش کریں، آپ جانتے ہیں کہ زندگی میں نظم وتناسب کے اظہار کا دوسرا نام "تمدّن" ہے اور فنون لطیفہ اس نظم وتناسب کو عام کرنے کا ذریعہ، نسل انسانی نے کروڑوں برس میں حیوانی زندگی سے ترقی کر کے ایک تہذیبی تخیّل کو مکمل کیا، تعمیرات، شاعری، مصوّری، نقّاشی، سنگ تراشی، رقص اور موسیقی میں بتدریج ارتقائی شانیں پیدا ہوئیں۔ نینوا اور تاج محل کے طرز تعمیر کے درمیان قرنوں کا خلا ہے، اس خلا کو انسانی تمدّن کی پیہم کوششوں نے خون پانی ایک کر کے اس تعمیری جمالیاتی آئیڈیل کو نمو دی جس کا مجسمہ تاج محل ہے۔

انسان کی اس قسم کی کوششوں میں عظیم مقصد کی جھلک نظر آتی ہے، اس کا جمالیاتی احساس قرنوں سے حسن کاری میں مصروف ہے، انسانی روح کے اولین مقاصد یہی معلوم ہوتے ہیں کہ زندگی میں حسن وتناسب کو فروغ ہو۔

اہرام مصری کے تصویری نقوش اور مغل آرٹ کے مابین نقّاشی نے جتنے منازل طے کئے وہ تناسب کے ارتقاء اور رفعت کو پیش کرتے ہیں، زوال و ترک کو سامنے نہیں لاتے۔

اسی طرح سنگ تراشی، رقص اور موسیقی میں تمدّنی زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ نظم وتناسب پیدا ہوا نہ کہ انتشار اور بے تکاپن۔

انسانی زندگی خود تناسب پسند ہے، ہم ہر قدم پہ بکھراؤ کے نہیں نظم وتناسب کے آرزومند ہیں، اعلیٰ زندگی خود اک نظم کے ماتحت ہے۔

اگر کوئی عمارت نظم معرّیٰ کی تیکنک پر تعمیر کی جائے تو میرے خیال سے لوگ شہری زندگی ہی سے دست بردار ہو جائیں۔

فنون لطیفہ میں "شاعری" کا ایک مخصوص درجہ ہے، پہلے انسان کو شعر کا احساس ہوا یا ترنّم کا، اول اول انسانی روح میں جذبات کا طوفان اٹھا یا گنگناہٹ کا، بہرحال یہاں اس سے بحث نہیں مجھے اس سے بھی بحث نہیں کہ سب سے پہلے دنیا کے اوّلین شاعر نے نظم معرّیٰ قسم کی شاعری کی یا باقافیہ غزل کی لیکن بہرحال تمدّنی شعور کے بعد موسیقی کی بنیادوں پر فنّ عروض مدوّن ہوا۔

فن کی تاریخ دہرانا مقصود نہیں، مجھے یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ شاعری میں جو اصناف وضع ہوئیں ان کے فرائض اثرات اور مقاصد کے لحاظ سے جدا جدا تھے، یہ اصناف سخن امراء القیس ابو نواس سے لیکر ولی و جوش تک اپنے فرائض ادا کرتے رہے!

عربوں نے مقاصد کے لحاظ سے بحریں ایجاد کیں، رجزیہ بحور علیحدہ، بزمیہ الگ، حکیمانہ مسائل کو بیان کرنے کے لئے رباعی اور قطعات کی بحور جدا ہیں، غرضیکہ اظہار و بیان کے جتنے ذرائع انھیں درکار تھے اُن کے لحاظ سے فن کی ایک باقاعدہ تیکنک ہی پیش نہیں کی بلکہ اُسے مکمل بھی کر دیا۔

اصناف فن کی بنیادوں پر عربی و فارسی کی وہ عظیم الشان شاعری پیدا ہوئی جس کا پرتو مغربی زبانوں پر بھی پڑا۔ گوئٹے کا جیسے شاعرِ اعظم نے خواجہ حافظ سے اثر لیا، طامس مور نے بھی اپنی مثنوی "لالہ رخ" کی بنیاد اسی شاعری کے کلچر پر رکھی جس میں بحر بھی تھی اور قافیہ بھی۔

فارسی کے توسط سے اردو شاعری میں بھی عربی بحور و اوزان کو اختیار کیا گیا متقدمین چاہتے تو سنسکرت فن عروض کو بھی اختیار کر سکتے تھے، ماتراؤں سے بحریں بنانے کا طریقہ ہندی میں عربی طریقہ سے کہیں آسان ہے، لیکن عربی بحور کے اوزان موسیقی کے اصولوں پر قائم کئے گئے تھے اس لئے ان میں مقاصد کے اعتبار سے مخصوص جوش، اثر اور رس پیدا کرنے کی اہلیت زیادہ تھی۔

یہ تمام کوششیں متمدن انسانی سماج کو اور بھی آگے بڑھانے اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہوئیں یعنی شاعری اور انسانی معاشرہ میں مضبوط افادی روابط ہیں، خواہ وہ ماضی میں کسی دربارِ شاہی کے اندر قصیدہ خوانی سے تعلق رکھتے ہوں خواہ آج کسی سنیما میں نغمہ فشانی سے۔

شاہی دربار سے لیکر سنیما کے پردہ تک با قافیہ اور غیر مقفّیٰ نظم نے ان افادی روابط کو باقی رکھا۔ اور سماج کے تقاضات کو پورا کیا۔

سوال یہ ہے کہ نظم معرّیٰ کا کیا فن ہے؟ کیا فن کی تیکنک ہے؟؟ اور زندگی میں اس کی کیا افادی حیثیت ہے ــــ!؟

اس وقت تک ہر زبان میں موسیقی اور شاعری کی ربط ہم آہنگی انسانی مقاصد کو مکمل کرتی رہی، اصناف سخن میں مسدّس نے اخلاقی حِس کو بیدار کرنے کا فریضہ ادا کیا، مسدّس ملّی اور اجتماعی احساس کو جگانے والے جذبات کہنے کے لئے بہترین صنف ہے، مخمّس و مثلث تفسیر و تشریح مطالب کے لئے موزوں ترین فارم ہے

ترجیع بند اور ترکیب بند مسلسل مسائل اور موضوعات کو بیان کرنے کے لئے خاص اصناف ہیں۔

رباعی خاص طور پر اجمال کے ساتھ حکیمانہ احساسات جذبات کو نظم کرنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ اور غزل ہمارے صنفی جذبات کو چھیڑنے کے لئے دلدوز مضراب!

غزل کا اصلی مقصد بذاتِ خود حسن یا اس کے لوازمات نہیں، بلکہ اس کا فریضہ حسن سے تعلق رکھنے والے جذبات و کیفیات کا مطالعہ ہے، دکّنی سے لیکر حسرت و جگر تک غزل انسانی روح کی باطنی تڑپ کی آئینہ دار ہے۔

غزل کا تدریجی ارتقار یہ بھی بتاتا ہے کہ درجہ بدرجہ اظہار و بیان میں کس طرح شائستگی و ضبط پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور ماحول کے اثرات سے احساسات و جذبات نے نئے طریقہ ہائے اظہار کو کس طرح قبول کر لیا۔

حالی نے اُردو شاعری میں اصلاحی و افادی عناصر کو جگہ دی، اور وہ اقبال و جوش تک اسی رنگ میں بڑھتی گئی یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ وہ افادیت کی صحیح سمتیں اختیار کر سکی یا نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاعری میں زندگی کے نمایاں مسائل سیاست، مذہب کو جگہ دی گئی جو واردات حسن و عشق اور صنفی احساسات سے بالکل مختلف تھے، ان عناصر کی آمیزش نے یقیناً ایک نئی شاہراہ تیار کی جس پر اُردو شاعری مسلسل ترقی کا سفر کرتی رہی۔

مثنوی نے شاہنامہ سے لیکر "رموز و اسرار" تک انسانی تمدّن، کلچر اور تاریخ و تہذیب کی خدمت کی اور انسانی روح کے احساساتی اور جمالیاتی فرائض و مقاصد کو کامل طور پر پورا کیا۔

مثنوی کے ارتقار نے موجودہ نظم کی تخلیق کی، جدید ایرانی شاعری میں نئے وطنی اور قومی احساسات کی بنا پر نئے اسالیب اور طریقے ایجاد ہوئے، اقبال اور اُردو کے دوسرے شعرا نے انھیں اپنایا ــــ صرف اپنایا ہی نہیں بلکہ اپنی اپنی ذہانت سے کام لیکر خود بھی نئے فارم ایجاد کئے۔

ان سانچوں میں ہر قسم کے جذبات و احساسات ڈھال لینے کی کامل صلاحیت ہے۔ خاصکر مطلعاتی نظم کا رواج سب سے زیادہ ہوا، اور بیانیہ شاعری کے لئے اسی اسلوب کو مخصوص کر دیا گیا۔

اردو شاعری سے قطع نظر ہندی کا شاعری و ادب ٹھمری، کجری، خیال، لاؤنی، ہر صنف کا ایک جداگانہ مصرف ہے اور وہ اُسے پورا کرتی ہے لیکن ان تمام اصناف کے مقابلہ میں نظم معرّیٰ کے آئیڈل فارم کی اتنی بھی افادی حیثیت نہیں کہ کوئی اسکو جی ہی جی میں گنگنا بھی لے۔

تیکنک تو خیر کیا وضع ہوگی مگر واقعی یہ اہم سوال ہے کہ ہم اسے اگر گانا چاہیں تو کس طرح گائیں۔

بحری اور مقفیٰ شاعری گائی جاسکتی ہے، موسیقی میں غزل کو ایک درجہ اب بھی نصیب ہے جو اسے گیتوں سے ممیّز کرتا ہے گیتوں میں جنسی محرکات تو ہوتے ہیں اور ان کو سُنکر صنفی احساس کی پیاس بھی بُجھ جاتی ہے، لیکن کبھی کبھی روح ان مدارج سے آگے نکل جانا چاہتی ہے، یہاں اُسے غزل کے عناصر تسکین بخشتے ہیں۔

غزل میں اول تو جنسی محرکات گیتوں کے مقابلہ میں بلند اور پاکیزہ شکل میں ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی اس میں وہ چیز بھی مل جاتی ہے جو انسانی روح کو صنفی احساس سے بلند کرتی ہے۔

دیہاتی گیت ہمارے جذبات و احساسات میں تلاطم پیدا کر سکتے ہیں، ہمیں سینوں میں گم کر سکتے ہیں لیکن نظم معرّٰی تو سوسائٹی کو اس قسم کی ثانوی مسرت بھی نہیں دے سکتی۔ !؟

معاف کیجئے یہ تو ہماری حسِ موسیقی کو کچل دینے کا سامان بہم پہنچاتی ہے، میں بہ ادب جاننا چاہتا ہوں کہ آخر نظم معرّٰی کا زندگی میں کیا فریضہ ہے ——— !؟

اقبال کے بعد اُردو شاعری میں کچھ اور نئے مسائل کا اضافہ ہوا، اصل میں خود اس کے یہاں بھی ان مسائل کی ہلکی ہلکی علامتیں پائی جاتی ہیں۔

عالمگیر بحران، سیاسی نظریوں، سماجی تبدیلیوں اور سیاسی شعور و اقتصادی کشمکش نے انسانی ذہن و شعور کو اور بھی جگا دیا، زندگی کی قدریں بدلیں، محبت کا نظریہ تبدیل ہوا، آدمی کا ذہن نئی استفہامی کیفیت سے دوچار ہوا، مزدور، سرمایہ، سرمایہ دار، ملکی غلامی، کلچرل مساوات کا مطالبہ، غیر طبقاتی نظام حکومت کا تصور، ایک آزاد اور ملے جلے سماج کے ڈھانچے کا تخیل یعنی زندگی کو نئے روپ میں دیکھنے کا شوق انسان کو پیدا ہوا، اس سلسلہ میں گنگا اور جمنا کے ساحلوں سے شاعروں کی جو نوجوان نسل سوچ لیتی ہوئی اٹھی اُس کا ادب پر بڑا احسان ہے۔

اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، سلام مچھلی شہری، جذبی، جاں نثار اختر، شہاب، احسان جمال اور دوسرے شعراء نے اس نئی افادیت کا فریضہ ادا کیا جس کا مطالبہ اُردو شاعری سے وقت اور ماحول نے کیا تھا اس نئے تصور کو پروان چڑھانے میں ڈاکٹر اختر حسین کے مقالہ "زندگی و ادب" اور ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کی کوششوں نے نہ صرف اپنے ماحول کو متاثر کیا بلکہ دکن اور پنجاب کو بھی۔

پنجاب میں احمد ندیم قاسمی اور چند شعراء، دکن میں مخدوم محی الدین اور بعض دوسرے شاعروں پر بھی اثر ڈالا، ان تمام اصحاب نے اپنی شاعری میں اُن عناصر کو کم و بیش قبول کیا جو ماحول کا تقاضہ تھے، اور جن کی طرف "نئے ادب" کی تحریک نے اشارہ کیا تھا، لیکن ان تمام شعراء نے با قافیہ شاعری کو اپنا میدان منتخب کیا اور اسی میں نئے فارم بھی ایجاد کئے، اس طرح نئی دنیا کی ترجمانی کے لئے شاعری کے نئے دروازے کھل گئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عشقیہ، اخلاقی، انقلابی اور اشتراکی عناصر کے علاوہ اُردو شاعری میں وہ کون سے عناصر ہیں جو باقی رہ گئے، یعنی جدید نظم کے دائرہ سے باہر ایسے کون سے بنیادی تصورات یا فکری و تجرباتی احساسات کا وجود ثابت ہوتا ہے جن کے لئے سوائے نظم معرّٰی کے چارۂ کار نہ ہو۔

کیا نظم معرّٰی کے ماننے والوں کے پاس ایسا کوئی منفرد عنصر علیحدہ موجود ہے جیسا کہ غزل کے مقابلہ میں اصلاحی و قومی تخیل کی صورت میں حالی کے پاس موجود تھا ——— !؟

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نظم معرّٰی کا مقابلہ حالی سے پہلے کی غزل یا نظم سے مقصود نہیں ہے، بلکہ جدید نظم سے ہے، جس میں بحور و قوافی کی پابندی کی جاتی ہے، اور با قافیہ نظم کہنے والے نئے شعراء ان تمام مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں خود ہی کوشاں ہیں۔

نظم معرّٰی محض ایک فارم ہے، اور فارم محض اک ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے، اصل شئے احساسات و خیالات ہیں، اگر ان میں جدت پیدا کر لی جائے، ان کے لئے نئے الفاظ اور جدید استعارات بھی وضع کر لئے جائیں، اور پھر ان تمام عناصر کو بحور و قوافی سے ہم آہنگ بھی کر لیا جائے تو میرے نزدیک یہ ایک اعلیٰ اور مکمل اجتہاد ہوگا۔

عشقیہ شاعری، رزمیہ شاعری، مرثیہ، غزل، گیت، غرضیکہ تمام اصناف سخن اپنے اپنے موضوعات جداگانہ رکھتی ہیں، سوال یہ ہے کہ نظم معرّٰی کا کونسا ممیّز موضوع ہے؟! کیا صرف جنسیت!؟ یا صرف یاس پرستی !؟ اور کیا صرف منفیت !؟!

ہم سے کہا جاتا ہے کہ:۔

"ہمارے اکثر اوضاعِ سخن اب بھی جدید دنیا [illegible]

کا ساتھ نہیں دے سکتے۔"

لیجئے ان نئے خیالات کا سیلاب بھی دیکھ لیجئے جن کے لئے نظم معریٰ ایجاد کی گئی ہے:

اس کا چہرہ اُس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک شبستان یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
ان بتوں کی بے حسی پر خشمگیں
اُجلی اُجلی اونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ

فرش پر قالین، ایرانی اور ہندی تمدن کی نشانی ضرور ہے، لیکن قالینوں پہ سیج !؟!

اس کا چہرہ، اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

جدید خیالات کا تو ذکر ہی کیا، ان خیالات اور اعمال کا کوئی معیار نہیں معلوم ہوتا، مثبت اور تعمیری روح کا قطعی فقدان ہے، یہ ملور معاف کیجئے روحِ انسانی کے ابتذال کی کچھ اچھی مثال نہیں، مدنی زندگی سے بدوی خیالات کی طرف صریح رجعت ہے، کہ ذی قوم کے ظلم و ستم کا انتقام ایک عورت سے لیا جائے۔ اور اس سے زیادہ کھٹکنے والا شاعر کا ادراک و ایقان مشکوک جاتا ہے کہ اپنی اس حرکت کو جو قطعی ... وقتی و انفرادی ہو سکتی ہے اجتماعی اور اخلاقی حیثیت دیتا ہے، خود کشی، ہم شرابی، ... کے مستقبلے میں، رقص، شاعر و ساغر، یہ سب ... شعریت اور ... جنسیت سے لبریز ہیں۔

دوسرے اسی قسم کے شاعر صاحب کی نظم "امروز و فردا" کے عنوان سے سنئے:

ایک صحرائے عظیم
جس کی بے اندازہ پہنائی کے آگے سرنگوں
آسمانوں کی بلندی اور شکوہ
تند اور وحشی بگولوں کا خروش
بادِ تابستان کے سمّی نفس
ہانپتا ہو جیسے اگنی دیوتا
خشک اور بے برگ پیڑ
یا بہارِ رنگ و بو کی نوحہ خوانی کے نقوش؟

(پہلا بند)

سوکھے سوکھے سخت "ٹھنے"
شاید آپ ٹھنے کو نہیں سمجھے (ٹھنی کا شوہر)
اس میں جدید خیال پوشیدہ ہے یعنی یہ نظم معریٰ کی "جدید اشاریت" ہے۔

سوکھے سوکھے سخت ٹھنے ــــ ہاتھ پھیلائے ہوئے
جیسے عفریتوں کی آہیں منجمد
اور ان پہ سرنگوں
اور ٹھٹھکتے سہمے ہوئے بیمار گدھ

لیکن اس کے بعد
(یعنی یہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے بزدلی کی طرف اشارہ تھا جس میں "ٹھنی" کے شوہر بھی رہے تھے)

لیکن اس کے پار ــــ افق کی سطح پر
جاگ اٹھا جیسے گلستانوں کے جوبن کا نکھار
ناچتی پھرتی ہے رنگوں کی بہار
جگمگاتی ہے شفق
یعنی مستقبل کی تابندہ اُمیدوں کی شفق

ذہنی تسلسل اور زندگی کا مربوط زاویۂ حیات

نظم معریٰ کے حامی کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں نفسیاتی تخیل اور جذباتی تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور ان دونوں کے ہم آہنگ ہونے سے اک آزاد تسلسل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور شاعر نظم کو جذباتی تسلسل کے بہاؤ میں ہم آہنگی

پیدا کر کے ذہن بدشعوری سے آزاد تسلسل کو وجود میں لاتا ہے؛
لیکن شاعر اپنے شعری تخلیق کے عمل سے بھی ایک حد تک آگاہ رہتا ہے، خود نظم معرّیٰ والے یہ تسلیم کرتے ہیں، اس لئے جب تک یہ واقفیت صحیح حقائق سے رابطہ نہ رکھتی ہو، آزاد تسلسل اس قسم کے غلط تصوّرات پیدا کر دیتا ہے جیسے کہ راشد کی نظم انتقام سے خودکشی، رقص گاہ، شرابی وغیرہ میں پائے جاتے ہیں، اور ان جذبات کے سبلی میشن کے لئے نئی راہیں پیدا ہونے کے بجائے ڈی جنریشن اور گریز کی کیفیات اور بھی تیزی سے اُبھر آتی ہیں؛

زندگی میں ہر طرف خوفناک کہانیاں ہیں، جذبات کا اُتار چڑھاؤ ہے، روایات کی تاریکیاں ہیں، گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اگر شاعر صحیح نفسیاتی تجزیہ اور فکری حقائق سے آگاہ نہ ہوگا تو اسکی طرف سے طرح طرح کی بیماریوں کا اظہار ہوگا جو پورے سماج میں اپنا زہر پھیلا دیگا (جیسے کہ انتقام میں بدوی عہد کے جذبات کا اظہار ہے) ظاہر ہے کہ آزاد تسلسل نظم معرّیٰ کے ہاتھ میں زہر کی طرح ہے کیونکہ صحیح حقائق سے منسلک کر کے اسے صحت مند صورت اور مربوط زاویۂ حیات کے سانچے میں نہیں ڈھالا جاسکا

احتشام حسین کا خیال ہے کہ
ادب اور آرٹ کے اندر پیدا ہونے والی بیماریاں عام طور سے متعدل ہوتی ہیں، ان کا زہر بڑی تیزی سے پھیلتا ہے، ہوشیار ڈاکٹر سنکھیا دیتا ہے تو جانتا ہے کہ اس سے وہ کیا کام لینا چاہتا ہے، اور وہ زہر کو کس طرح تریاق بنا سکتا ہے لیکن ایک عطائی کے ہاتھ سے سنکھیا کھا لینے کا نتیجہ ظاہر ہے؛

جنسیت کوئی بیماری نہیں ہے، انسانی فطرت کا ایک صحت بخش فعل ہے، لیکن راشد کے یہاں یہ بیماری کی صورت میں نظر آتا ہے، کسی مثبت حقائق کے بغیر آزاد تسلسل انسانی جذبات کے لئے ایک مہلک آلہ ہے، جسے ہر کسی کو سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ جذباتی تسلسل کو مثبت آزاد تسلسل کی صورت میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، آج ذہن پر اس قدر وسیع گوناگوں اور تیز احساسات و جذبات کا عکس پڑ رہا ہے کہ ان کی وسعتیں تخیل کی دُنیا کی حدوں سے جا ملی ہیں، اس لئے جب تک صحیح تشکیل و تخلیق کے لئے یکسر نئی اقدار کامل نہ ہو جائیں، اور ایک متوازن تشکیل یافتہ ذہن نمودار نہ ہو جائے آزاد تسلسل طوفان، دہشت اور شکست و ریخت کی لاتناہی فضائیں پیدا کر دے گا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم معرّیٰ کی تیکنک میں آزاد تسلسل بالکل غلط رُخ سے پیش ہوا ہے، وقت کے تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں

اب میں آپ کو بتاؤں کہ آزاد تسلسل کی مثبت فضا پیدا ہونے کی وجہ سے کس قسم کے نتائج رونما ہوتے ہیں؛

اوّل تو تمام قوم کی "نجات" شاعر کو اسی میں نظر آتی کہ قومی غلامی کا بدلا، ایک یورپین عورت سے لیا جا رہا ہے، ایک جگہ ساتویں منزل کے دریچے سے کود رہے ہیں، ایک جگہ رقص گاہ میں زندگی سے بھاگ کر رقص کے دامن میں پناہ لی جا رہی ہے۔

اگر آزاد تسلسل کے معنی یہی ہیں کہ جذبات کی لہروں کو یوں بے مہار چھوڑ دیا جائے تو زندگی میں اس کے نتائج ظاہر ہیں؛

دیسی اور دیہاتی زبانوں کے بازاری گیت جن میں دیہاتی عورتوں اور مرد شعراء نے اپنی دیہی جبلّت کی بنا پر جذبات کو بالکل بے مہار انداز میں ظاہر کیا ہے آزاد تسلسل کے بہترین نمونہ ہیں، ان میں رسیلا ترنّم بھی ہے اور کلچرل خصوصیات بھی، اس لئے نظم معرّیٰ ان دلائل کے لحاظ سے بھی کوئی نئی چیز نہیں؛ البتہ وہ گیت زندگی میں ایک نشاط انگیزی ضرور پیدا کرتے ہیں لیکن نظم معرّیٰ یہ بھی نہیں کرتی؛

نظم معرّیٰ میں ملکی یا بین الاقوامی، قدیم یا جدید کوئی کلچر نہیں، بلکہ تقلیدی ٹکڑے ہیں، جو ایک کامل ماحول نہیں بنلاتے؛

تمام جائزہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مجدّد بننے کے شوق نے نظم معرّیٰ کی تخلیق کی؛ حالانکہ ہر باقی رہنے والی افادی تجدید کا محرک محض شخصی شہرت کا جذبہ ہی نہیں ہو سکتا بلکہ ٹھوس اور بنیادی اسباب ہوا کرتے ہیں، جو از خود ماحول سے اُبھرتے ہیں؛ لیکن نظم معرّیٰ ایک ایسی تقلید ہے جو نہ مشرق میں کھپ سکتی ہے نہ مغرب میں؛ اور اگر فارسی کے اثرات ہی سے بچنا تھا تو با قافیہ شاعری ہی میں تجدید کی راہیں کھل سکتی تھیں جیسی کہ کھل رہی تھیں مغرب کے دروازہ پر جانے کی کیا ضرورت تھی، دریوزہ گری بہر حال دریوزہ گری ہے، خواہ وہ ایران کے دروازہ پر ہو یا انگلستان کے گیٹ پر؛

آخر میں میں عرض کروں گا کہ قافیہ سے پیدا شدہ ترنّم کا جواب نظم معرّیٰ نہیں دے سکتی؛ نظم معرّیٰ کے مقابلہ میں نثر خود اور ادب لطیف کے ٹکڑوں میں کوئی [illegible]

آخر میں ہم پھر پورے خلوص سے اردو کے نظم معرّا کے حامی طبقہ سے [illegible] دل سے ان مسائل پر غور کریں گے اور ادبی طریقہ کے مشترکہ مقصد کے لئے اپنے نقطۂ نگاہ پر نظرثانی کریں گے۔
آج کل ادبی رسائل میں بہتات کے ساتھ ایسی نظمیں شائع ہو رہی ہیں جن کا معنی اور بیانی، زبان اور خیال کے لحاظ سے کوئی مفہوم نہیں۔
کیسی بدبختی ہے کہ اقبال اور جوش کے بعد اُردو شاعری اہمال اور تباہی کے غار میں اس طرح دھکیلی جا رہی ہے!

مآلِ محبّت

مجھے مآلِ محبت سے کیا ڈراتا ہے! — کہ مجھ پہ فاش ہے اے ہمنشیں یہ رازِ کہن!
سوادِ نجد دکھاتی ہے دِل کی تنہائی! — خرد ہو ساتھ تو کر سیرِ پیرس و لندن!

سِپاہی

(میرٹھ سے سندیلہ کے سفر میں)

شرعِ حرب و ضرب کا حافظ ہے سپاہی! — ملک و مدنیّت کا محافظ ہے سپاہی!
لشکر نہیں اک قافلۂ بے جگراں ہے — اقوام کی عزّت کا محافظ ہے سپاہی!
اپنوں میں جو ہو حربۂ تہذیب سے عاری — اُس فوج کی ہر جنگ میں قسمت ہے فراری!

عزمی۔ بی۔اے (علیگ)

[illegible] نومبر ۱۹۴۲ء

سیدہ یحییٰ میرٹھی

جمہوریت کی ایک نئی قسم

اگر ہم اپنے اقتصادی نظام کو سرمایہ داری سے اشتراکیت میں تبدیل کردیں تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنے سیاسی اداروں کو بھی بدلنا چاہیئے، کیونکہ موجودہ سیاسی ادارے ہمارے اقتصادی نظام کا جزو لاینفک ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اشتراکی اقتصادی نظام کا قائم کرنا جمہوریت کو ختم کرنا ہے؟ اس کا جواب اکثر اثبات میں دیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ سوشلزم یا کمیونزم کا نتیجہ (یہ الفاظ اس سلسلہ میں بغیر کسی امتیاز کے استعمال کئے جاتے ہیں) جمہوریت، ملکی اور مذہبی آزادی کی تباہی میں مرتب ہوگا اور یہ کہ کسی فرد یا افراد کے ایک گروہ کی غیر ذمہ دارانہ آمریت قائم ہو جائیگی یہ بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ خوشحالی اور تحفظ کے حصول کی خاطر بھی ایسی بڑی قیمت ادا کرنا بہت زیادہ ہے۔

اگر سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لئے یہ سیاسی حالات ضروری ہیں تو بلاشبہ خوشحالی کے حصول کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ لیکن دراصل یہ بات نہیں ہے، یہ ہرگز پیش نظر نہیں کہ ہم جمہوریت کو تباہ کردیں، شہری اور مذہبی آزادی کو ختم کردیں اور نہ یہ مقصد ہے کہ سوشلزم کے حصول کا کسی فرد یا افراد کی ایک جماعت کی غیر ذمہ دارانہ آمریت کو ذریعہ بنایا جائے۔ برخلاف اس کے پیش نظر یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول اور اس کی تعمیل کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر پھیلایا جائے۔

لیکن یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح یہ بات عمل میں لائی جائے۔ کیا برطانیہ اور امریکہ میں جمہوریت موجود نہیں ہے؟ اگر یہ تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ سیاسی نظام کو ختم کرنے کی تجویز ہے تو یہ کس طرح دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ جمہوریت ختم نہیں ہوگی؟ لیکن اس وقت جو چیز ہمیں حاصل ہے وہ محض جمہوریت کی ایک خاص شکل ہے۔ ہمارے موجودہ سیاسی ادارے مخصوص قسم کی سرمایہ دارانہ جمہوریت پر مشتمل ہیں۔ ان کو ذرائع پیداوار کے موجودہ مالکوں کے آبا و اجداد نے قائم کیا تھا۔ اور ان کو قائم کرنے کا یہ مقصد تھا کہ سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کے لئے ایک موزوں سیاسی ڈھانچہ مہیا ہو جائے۔ ابتدائی سوداگروں اور صناعوں کو ایک ایسا سیاسی نظام ملا تھا جس میں نفع رساں سرمایہ دارانہ پیداوار کی پوری ترقی ناممکن تھی، وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ انھیں ایسے قوانین سے بریت حاصل ہونی چاہئے جو ان کے تجارتی اور پیداوار کرنے والی جدوجہد کی راہ میں روڑے اٹکانے والے ہوں انھوں نے اس اصول کو نافذ کرنے کی کوشش کی کہ سرمایہ دار طبقہ گورنمنٹ کو منتخب کرے اور اسی طبقہ کو گورنمنٹ ذمہ دار ہو۔ گورنمنٹ پر اس قسم کا کنٹرول سرمایہ داروں کے لئے نہایت ضروری تھا تاکہ وہ اپنے تاریخی مشن کو پورا کرنے میں پوری توجہ دے سکیں۔ وہ تاریخی مشن یہ تھا کہ قوم کے جملہ ذرائع پیداوار کو زیادہ سے زیادہ تیزی اور سرعت کے ساتھ ترقی کی راہ پر لگایا جائے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ نفع رسانی کے لئے ان ذرائع کو استعمال کیا جاسکے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کرتے (اور ان لوگوں پر تلخ تجربہ نے یہ حقیقت واضح کردی) تو غیر ذمہ دار بادشاہوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے جنھیں امراء اور دوسرے سست و کاہل خوشہ چینوں کے نفع کے لئے روپیہ کی ضرورت پڑتی تھی۔

لیکن سرمایہ داروں کو معلوم ہوگیا کہ وہ عوام کی اکثریت کے بغیر حصول اقتدار کی جدوجہد میں کامیاب نہ ہوسکیں گے وہ حمایت حاصل کرنے میں تو ضرور کامیاب ہو گئے لیکن ایسا کرنے سے حکومت خود اختیاری کے لئے ان کی جدوجہد لازمی طور پر کسی حد تک ہر شخص کے لئے حکومت خود اختیاری کی جدوجہد میں تبدیل ہوگئی جمہوریت کے لئے سرمایہ داروں کا مطالبہ اس قدر وسیع ہوگیا کہ وہ کل عوام کا جمہوریت کا مطالبہ بن گیا۔ آخر میں جمہوریت کے

بلت سے حقوق مثلاً حق رائے دہندگی صرف سرمایہ داروں ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ تمام جنتا کے لئے ہو گیا۔ ان حقوق کو حاصل کرنے کے لئے صرف سرمایہ داروں ہی نے کوشش نہیں کی بلکہ مزدور پیشہ اور بیچ کے طبقوں نے بھی جدوجہد کو جاری رکھا۔ یہ وہ طبقے تھے جنھیں خود سرمایہ دار پہلے حرکت میں لا چکے تھے۔ دراصل اگر دیکھا جائے تو آخیر مرحلوں میں اکثر جدّوجہد خود سرمایہ دار جماعت کے خلاف کی گئی۔ مثال کے طور پر آزادیٔ پریس کا لبرل اصول برطانیہ میں کامیاب ہوا۔ اور اس کا سہرا اتنا سرمایہ داری کے لبرل نظریاتی لوگوں کے سر نہیں ہے جتنا کہ چارٹسٹ تحریک کے مزدور طبقہ کی دلیرانہ جدوجہد کے سر ہے۔ یہ اور دوسرے موجودہ جمہوری حقوق مزدور طبقہ کی طویل اور بہادرانہ جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔

باوجودیکہ جمہوری حقوق کی توسیع بتدریج اور خلاف منشا ہوئی لیکن مؤثر سیاسی طاقت اب تک برطانیہ اور امریکہ جیسی سلطنتوں میں سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ جمہوریت کی موجودہ ہیئت کی بنیادیں قائم کرنے میں اگر عوام بھی سرمایہ داروں کے ساتھ شامل تھے تو یہ انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اگرچہ تمام منافع کا $\frac{9}{15}$ حصہ سرمایہ داروں کے پاس رہا۔ نیز اس مشترکہ جدّوجہد میں سرمایہ داروں نے گو کہ باقی لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی، تاہم جس قسم کی جمہوریتوں میں آجکل ہم لوگ رہتے ہیں اُن کے قیام کے لئے مزدور سرمایہ داروں کی امداد کرنے میں راہ راست پر تھے۔ کیونکہ جمہوریت کی موجودہ شکل اپنے مخصوص اداروں کے ساتھ جیسے (ذمہ دار حکومت، پریس کی براہ راست حکومتی مداخلت سے آزادی، شخصی آزادی کے تحفظات، وقتاً فوقتاً عام انتخابات، پارلیمنٹیں یا کانگریسیں اور قانونی بادشاہتیں یا قانونی جمہوریتیں) ایک ایسا سیاسی نظام ہے جو سرمایہ داری کے لئے موزوں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جاگیرداری نظام کی تدریجی شکست پر سرمایہ داری ہی وہ واحد ممکن اقتصادی نظام تھا جو قائم کیا جا سکتا تھا۔ پیداواری طاقتیں اور نسل انسانی کا بلوغ ترقی کی جس منزل تک پہونچ چکے تھے ان دونوں کے لحاظ سے یہی نظام مناسب تھا۔ اس کا کوئی اور بدل نہیں تھا۔ موجودہ جمہوریتوں کا تاریخی آغاز اور ان کی موجودہ نوعیت یہ ہے، لہذا ہم بھی اسکی تعریف قدرے مختلف نقطۂ نظر سے اس طرح کر سکتے ہیں کہ ایک خاص ذریعہ جس کے ذریعہ برطانوی اور امریکی سرمایہ دار طبقوں نے اپنا

سوسائٹی پر اقتدار حاصل کیا اور اب اس اقتدار کو قائم رکھتے ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ سرمایہ داروں نے اپنے مفاد میں حکمرانی کی۔

لہذا انسانی تہذیب کی ترقی کے اس مخصوص مرحلے پر جس میں سے ہو کر ہم ابھی ابھی گزرے ہیں حکومت کی مناسب وضع پارلیمانی جمہوریت ہی تھی۔ بہرحال ہماری موجودہ ضروریات کے لئے موجودہ سرمایہ دارانہ قسم کی جمہوریت نہایت محدود اور غیر مکمل ہے۔ تنہا سرمایہ دار طبقہ کے لئے یہ حکومتی نظام جمہوریت سے قدرے زیادہ ہے، کیونکہ اس نظام میں آزادی کی وہ شرط اوّل یعنی ذرائع پیداوار تک بے روک ٹوک رسائی، بلا شرکت غیرے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ جبتک سماج کے زندہ رہنے کے ذرائع ہی محدود طبقہ کے قبضہ میں رہیں گے اُس وقت تک وہ حکومت کرتا رہیگا۔ اور دُنیا کا مکمل ترین جمہوری دستور بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ وہ اس محدود طبقہ کی آمریت پر نقاب ڈالے یا اس کی مطلق العنانی کو کچھ کم کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہمارے موجودہ سیاسی ادارے یک قلم منسوخ کر دئے جائیں اور ان کی جگہ ایسے دوسرے ادارے لائے جائیں جو جمہوریت کی زیادہ وسیع، زیادہ گہری، اور زیادہ اعلیٰ ترقی یافتہ شکل پیش کر سکیں۔

لیکن یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ نئے جمہوری ادارے کہاں سے آئیں گے؟ کیا یہ سیاسی علماء کے دماغوں میں مرتب ہونگے؟ اس کے برخلاف یہ ادارے محض ان مخصوص اور نئے ڈھنگ کے جمہوری اداروں سے اخذ کئے جا سکتے ہیں جن کی نشوونما سرمایہ داری نظام میں ہوئی ہے۔ ان اداروں کو ترقی یافتہ بنا کر صف اوّل میں کھڑا کیا جا سکتا ہے تاکہ اقتصادی نظام تبدیل کر کے یہ ادارے نئی شکل اختیار کر لیں جن کے ماتحت ہم حکومت خود اختیاری کی تنظیم کریں۔

بعض مخصوص ادارے اب بھی سرمایہ داری میں ایسے موجود ہیں جن کو سوشلزم کے ماتحت برقرار رکھا جا سکتا ہے، ترقی دی جا سکتی ہے، اور ان کو ممتاز بنایا جا سکتا ہے۔ یہ ادارے سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کے مخصوص اداروں سے مختلف قسم کے ہیں، جیسے کہ پارلیمنٹیں، کانگریسیں، عام انتخابات اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔ ان اداروں کو نہ سرمایہ دار طبقہ نے قائم کیا تھا اور نہ اس طبقہ نے ان سے اُنسیت ہی کا اظہار کیا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ

معروف مثال ٹریڈ یونینیں (انجمن اتحادِ مزدوران) پیش کرتی ہیں۔

ایک طرف تو مکمل طور پر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں (ٹریڈ یونینس) انجمن اتحاد مزدوران موجود ہیں، اور دوسری طرف سرمایہ دارانہ علم السیاست نے یا تو بالکل ہی ان کے وجود کا اقرار نہیں کیا ہے اور اگر کیا ہے تو نہایت مجبوری کے عالم میں۔ اس کے علاوہ عدالتوں کی نظیروں اور مالکان کے اعمال سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں کا غالب طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ اس قسم کے اداروں کی موثر جد و جہد کو روکنے کی کوشش کریں امریکہ میں بالخصوص کا غذ پر نہ سہی لیکن عملاً حق جماعت سازی کا مقابلہ امریکی سرمایہ داروں نے تشدد اور طاقت کے ساتھ کیا ہے۔

ٹریڈ یونینس (انجمن اتحاد مزدوران) وہ جمہوری ادارے ہیں جن کا قیام سرمایہ دارانہ نظام میں ہو سکتا ہے اور ہے، لیکن ان کو سرمایہ دارانہ جمہوری اداروں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں سرمایہ داروں نے قائم نہیں کیا۔ ان کے وجود کے خلاف ابتک سرمایہ دار اکثر و بیشتر جھگڑتے رہتے ہیں۔

۴ ان مخصوص جمہوری اداروں میں ٹریڈ یونین وہ پہلی مثال ہے، جو اگرچہ آجکل سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت قائم ہے، لیکن جسے بحال رکھا جا سکتا ہے اور ایک نئے اقتصادی نظام کے ماتحت ترقی دی جا سکتی ہے۔ ٹریڈ یونینس سوشلسٹ سوسائٹی میں حکومت خود اختیاری کی تنظیم کے لئے کافی کام کر سکتے ہیں۔ اگر ان ٹریڈ یونینس کو کافی وسیع کیا جائے اور ترقی دیکر اس قابل بنا دیا جائے کہ ان میں واقعی طور پر تمام مزدور شامل ہو جائیں تو امریکہ اور برطانیہ میں پیداوار برائے استعمال کے نئے اقتصادی نظام کی تنظیم میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔

سوویٹ کے تجربوں سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سوشلسٹ سوسائٹی میں ٹریڈ یونین اداروں کا کیا کام ہے، مگر بہت زیادہ جوشیلے خلاف پیداوار کے خلاف، مزدوروں کے مفاد کا یہ ادارے تحفظ کرتے ہیں۔ ہر صنعت میں جو مزدوری دی جاتی ہے اور ہر کارخانہ میں جو اسامیاں کھولی جاتی ہیں ان کا تعین کرنے میں یہ ادارے سب سے زیادہ حصہ لیتے ہیں اور اقتصادی ترتیب و انصرام کا جو مجموعی کام ہے اس کا یہ ایک ضروری جزو ہے کیونکہ مزدوری کا نسبتی معیار ہی پیداوار کی ہر مخصوص شاخ میں مزدوروں کی سپلائی کا تعین اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، دوسرے ٹریڈ یونینس ہی وہ موزوں ادارے ہیں جو سوشل ملازمتوں کے سسٹم کا انتظام کر سکتے ہیں مثلاً بڑھاپے میں پنشن وغیرہ جن کا وجود سوشلسٹ نظام میں باقی رہیگا اگرچہ کمیونسٹ سوسائٹی میں ان کی ضرورت نہ ہوگی۔ تیسرے یہ کہ ٹریڈ یونین تمام آبادی کی مشترکہ زندگی کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہر کارخانہ نہ صرف ایک ایسی جگہ ہوگی جہاں پیداوار کا کام جاری رکھا جائے بلکہ اپنے اپنے کلب گھروں تعلیمی اداروں ہوٹلوں اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے ہوتے ہوئے ہر کارخانہ متعدد باتوں کا مرکز بنجائیگا۔ جس میں اس کارخانہ کے جملہ اراکین (یعنی ملازمین کارخانہ) اچھی زندگی بسر کریں گے۔

تاہم سوشلسٹ سوسائٹی میں متذکرہ بالا چیزوں کے علاوہ حکمرانی کا زیادہ حصہ نہ ہوگا۔ مزدوروں کا ایک گروہ جنکو سنڈیکیلسٹ (Syndicalist) کہا جاتا ہے اور جو اب معدوم ہے، بسا اوقات یہ تجویز کیا کرتا تھا کہ ٹریڈ یونینس ہی وہ ادارے ہونے چاہئیں جو ملکی حکومت سرمایہ داروں سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ نیز یہ کہ مزدوروں کو چاہئے کہ وہ اسی طرح ٹریڈ یونینس کے ذریعہ حکمرانی کریں، جس طرح پارلیمنٹ اور کانگریس کے ذریعہ سرمایہ دار لوگ کرتے ہیں لیکن ٹریڈ یونینس اتنے کافی وسیع اور کل چیزوں پر حاوی نہیں اور نہ بنائے جا سکتے ہیں کہ حکمرانی کے عظیم فرض کو پورے طور پر انجام دے جا سکیں۔ یہ تو ایک حد تک جماعتی تنظیمیں ہیں۔ ان میں مزدور بحیثیت بڑھئی، کان کھودنے والے، آمد و رفت کے مزدور یا انجنیر کی حیثیت سے نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ خالص مزدور کی حیثیت سے۔ لہذا مزدور طبقہ کی سیاسی حکمرانی کے عظیم غرض کو ادا کرنے کے لئے یہ ادارے موزوں نہیں ہیں۔ مزید بر آں ٹریڈ یونینس آدھے سے زیادہ سرمایہ دارانہ ادارے ہیں۔ اگرچہ سرمایہ داروں کے لئے بسا اوقات مضر ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سرمایہ دارانہ نظام میں چلائے جا سکتے ہیں اور چل رہے ہیں چنانچہ اگر انھیں کبھی بھی اعتدال کیساتھ زندگی بسر کرنے کا موقعہ دیا جائے تو فی نفسہٖ وہ سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کے بنیادی مقدمات کو شکست دینے میں مزدوروں کی ضرورت کا کافی طور پر اظہار نہیں کر سکتے۔

"ترجمہ"

اقبال حسین شوقی۔ بی۔ اے

ٹیگور اور اُنکے کارہائے نمایاں

رابندرناتھ ٹیگور نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ شاعری اور موسیقیت سے معمور تھی۔ وہ جس خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ دینی اور دُنیاوی امتیازات سے مالامال تھا۔ اس خاندان والے جہاں بڑی بڑی جائدادوں اور زمینوں کے مالک تھے وہاں مذہب، ادب شاعری، مصوری اور موسیقی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ ٹیگور کے خاندان کا ہر فرد کسی نہ کسی خاص قابلیت کا مالک ہے۔ ٹیگور کے بڑے بھائی دوجندرا ناتھ بہت بڑے فلسفی ہیں، دوسرے بھائی جا یوتریندرا ناتھ بہت بڑے آرٹسٹ ہیں، ان کے دو بھتیجے ابندرا ناتھ اور گگنا ناتھ بنگالی آرٹ کے ممتاز ماہر ہیں۔ تیسرے بھائی بوندرا ناتھ موسیقی میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ ٹیگور کے والد مہارشی دوندرا ناتھ ٹیگور ادب، فنون لطیفہ فلسفہ اور فطرت کے شیدائی، صوفی طینت اور اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔ فارسی میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ مثنوی مولانا روم اور کلام حافظ اکثر ورد زبان رہتا تھا۔ عرفان حقیقی کے لئے اُنھوں نے ایک عرصہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر حافظ کی غزلیں گا گا کر گزارا ہے۔ ٹیگور کی شخصیت ورکلام میں ان کے والد کی پاک اور بے لوث روحانی زندگی کی جھلک ہے۔

ٹیگور کی غیر معمولی ذہانت، شخصیت اور کارہائے نمایاں اس قدر ممتاز اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کا پورا پورا اندازہ کرنا سخت مشکل ہے وہ بیک وقت شاعر، ادیب، فلسفی، مصور، انسانی ہمدرد، معلم الاخلاق، مصلح کل، صوفی طینت بزرگ، روشن ضمیر مفکر، سائنسداں اور ماہر تعلیم ہیں، ان کی شخصیت اور کارہائے نمایاں پر تفصیلی بحث اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، میرا مقصد یہاں ان کی زندگی کے ہر پہلو پر مجملاً کچھ تحریر کرنا ہے۔

ٹیگور جس زمانہ میں پیدا ہوئے وہ بنگال میں نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزی تعلیم عام ہونے اور راجہ رام موہن کی برہمو سماج کی تحریک سے بنگال میں تخلیقی ادب کی بنیاد پڑ چکی تھی، تارو دت، مائیکل دت اور بنکم نے بنگالی نظم و نثر میں رومانیت کی روح پھونکی جس کی تکمیل رابندرناتھ نے کی۔ ٹیگور سے قبل بنگالی شاعری اُردو شاعری کی طرح دوسری زبان کے قواعد کی پابند تھی، اس کی عروض سنسکرت سے لی گئی تھی۔ سنسکرتی عروض کا اصول ہے کہ خفیف اور ثقیل ماتراؤں سے بحر و وزن کی ترتیب ہوتی ہے، بنگالی زبان میں سرے سے خفیف ماترائیں ہی موجود نہ تھیں۔ ہر حرف ثقیل ماترا کا ہم وزن تھا۔ شاعر اس بنیادی اختلاف کو سنسکرت آمیز بنگالی میں شعر لکھ کر مٹاتے آئے تھے۔ ٹیگور نے اس سنسکرتی عروض کی زنگ خوردہ زنجیر کی کڑیوں کو کاٹا اور بنگالی ادب کو اس قید سے آزاد کیا جس میں مدتوں سے وہ جکڑا ہوا تھا۔

ٹیگور کی شاعری کی امتیازی خصوصیت سادگی اور بیساختہ پن ہے وہ کسی مسئلہ یا حکیمانہ معمہ کو سلجھانے کے لئے شعر نہیں کہتے، بلکہ دل پر جو کچھ گزرتا ہے وہ شعر ہو کر ادا ہو جاتا ہے، یہ شعر کسی بنیادی حقیقت اور کائنات کے سربستہ راز کو فاش کر دینے کی وجہ سے زبان پر نہیں آتا، نہ اس کا مقصد کوئی علمی حقیقت یا مفید مطلب اخلاقی نصیحت بیان کرنا ہوتا ہے۔ ایک بے تاب آنسو یا بے ساختہ مسکراہٹ کی طرح شعر دل کی کیفیت کی تصویر ہوتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ایک مختلف رنگوں کا پھول کھولتے ہیں، جس کی پتیاں طرح طرح کے رنگوں کی ہیں، تاہم وہ نہایت خوبصورت اور جاذب نظر پھول ہے، ان کا پیام فطری مختلف النوع، ہمہ گیر، رومانی، قدیمی، خوشگوار اور کڑوا بھی ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس قدر خوبصورت اور شیریں ہے کہ وہ مشرق و مغرب دونوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ان کی نظموں اور نثر کی سامع نواز موسیقیت ان کی داخلی اور بیرونی ہم آہنگی کی صدائے بازگشت ہے "فضا کا گیت" جو کہ کائنات میں موجود ہے اور جسے سنتے سب ہیں لیکن سمجھتے کم ہیں اسے ٹیگور

نے خوش نما سمجھا اور نغمۂ وصوت سے شعر و ادب میں منتقل کر دیا ان کا کلام زندگی کی سنہرے رنگوں سے بنائی ہوئی ایک ایسی تصویر ہے جس کی بوقلمونی میں جذبات کی مختلف النوعی، حیات کی مختلف منازل اور فطرت کی دلکشی و دلفریبی دیکھ کر انسان آئینہ کی طرح حیران رہ جاتا ہے۔

ٹیگور بہت ہی پُرگو شاعر اور زود نویس ادیب ہیں، ان کے صرف گیتوں ہی کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے اور ان کا کل منظوم کلام پندرہ ضخیم جلدوں میں سماتا ہے، بنگالی نثر منظوم کلام سے کچھ کم ہے، اور انگریزی تصنیفات بنگالی نثر کے نصف کے قریب ہیں، ان کے بہت سے گیتوں اور نظموں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں نہیں ہوا ہے، اور جن کا ترجمہ ہو چکا ہے ان میں شاعر کے کلام کی ظاہری خوبیاں اشعار کی آمد اور سلاست، خلوص بیان، سُروں کی دلنشیں آمیزش فنا ہو گئی ہے، اصل بنگالی میں ہر ایک گیت سادگی، تازگی، برجستگی، بے ساختہ پن، معانی کی نزاکت اور بلندی، بیان کی روانی، الفاظ کے حسن انتخاب، موزونیت، ترنم اور سُرتال کی ندرت اور دلکشی میں شاعری اور موسیقی کا لاجواب نمونہ ہے، ترجموں کو شاعر کے کلام کا خاکہ بھی نہیں کہا جا سکتا، ترجموں میں نہ وہ شعری محاسن ہیں، نہ وہ الفاظ کا ترنم، نہ وہ فصاحت و بلاغت، نہ وہ الہامی آمد و روانی، نہ ترکیبوں کی وہ حیرت انگیز برجستگی اور سادگی، جو کہ اصل زبان میں موجود ہے۔ اچھے سے اچھا ترجمہ شاعر کی شاعری کا صرف معنوی پنجر ہے، جس میں اصل زبان کا گوشت و پوست، زندگی، جوانی، اور حسن کی کمی نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہے۔

ٹیگور صرف شاعر ہی نہیں بلکہ موسیقی کے بھی بہت بڑے ماہر تھے، ان کی سماعت اس قدر حساس تھی کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دو دُنیاؤں میں رہتے تھے۔ ایک مرئی شکلوں اور رنگوں کی دُنیا، اور دوسری صوتی شکلوں اور رنگوں کی دُنیا۔ ان کی موسیقی میں غیر معمولی مہارت اور فطری مناسبت نے بڑے بڑے صاحب کمال موسیقاروں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ یہ صرف اُنکی لاتعداد مناجاتوں، وطنی نظموں اور گیتوں اور ان کے سروں کے متعلق جو انھوں نے خود بنائے ہیں، یا پُرجوش، سُریلے، دلنشیں اور وجد آفریں نغموں کے متعلق ہی (جو کہ انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف دوروں میں لکھے ہیں) نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کے متعلق بھی جو کچھ انھوں نے صرف موسیقی کے لئے کیا ہے، وہ صرف اپنے گیتوں کے معنی خیز اور وجدانی الفاظ کے ہی مصنف نہیں ہیں، بلکہ ان گیتوں کے سُر و تال کے بھی مصنف وہی ہیں۔

ٹیگور کی وطنی نظمیں امتیازی شان کی حامل ہیں وہ شائستہ اور منضبط ہیں۔ اور جھوٹی تعریف، نمائشی بہادری، خود ستائی اور دھمکیوں سے مبرّا ہیں، ان میں سے کچھ ہمارے دل کے ساز پر مضراب زنی کرتی ہیں، کچھ مادرِ وطن کو ہماری روحوں میں جانشیں کرتی ہیں، اور کچھ ہمارے مایوس دلوں کو ہمت اور اولوالعزمی کے جذبے سے بھر دیتی ہیں، لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی دو متضاد کی کشمکش، نسلوں کی باہمی جنگ یا پُرانی تاریخوں کی سی ناخوشگوار باہمی رنجشیں نہیں ہیں۔

اینڈریوز فلیچر (Andrews Fletcher) ایک اسکوچستانی محب وطن کے لئے یہ مشہور ہے کہ اس نے گیتوں کے متعلق کہا ہے کہ "اگر کسی انسان کو ہر قسم کے رزمیہ گیت بنانے کی اجازت ہو تو اس کو اس کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قومی قوانین کون بنائیگا"۔ کیونکہ گیتوں اور رزمیہ نظموں کا قوم کے بنانے میں بڑا حصّہ ہے۔ ٹیگور کے گیت اور رزمیہ نظمیں ایک حد تک بنگالیوں کے اخلاق و اطوار، عادات و خصائل (خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل، خواہ شہری ہوں یا دیہاتی) ڈھال رہے ہیں، اور ان میں ایک نئی تہذیب اور کلچر کی بنا ڈال رہے ہیں، لیکن ٹیگور نے صرف گیت بنانے والے کی حیثیت سے ہی سودیشی تحریک میں حصّہ نہیں لیا، بلکہ ان کے سماجی سیاسی خطبات Social Philosophical [illegible] اور سالانہ میلے جو انھوں نے تجویز کئے یا جن کے انعقاد کا انتظام کیا۔ اس قومی خدمت کا جزو ہیں، انھوں نے نہایت تندہی کے ساتھ [illegible] اور دیگر فنون کے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے کام کیا۔ (خصوصاً دیہاتی صنعت و حرفت کے لئے) اور کوشش کی کہ ہندوستان میں تعلیم ہندوستانی ہو، اور حفظانِ صحت، تعمیر و تنظیم دیہات وغیرہ کے لئے نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کیا، محکمانہ رپورٹوں میں بھی ان کی بہت تعریف کی گئی ہے اور زمینداروں میں (اپنی املاک میں اس قسم کی تدابیر اختیار کرنے کی وجہ سے) وہ بہترین زمیندار مانے گئے ہیں۔

ٹیگور کا کلام جس طرح عالمگیر ہے، اسی طرح وہ خود بھی عالمگیر

انسانی ہمدردی اور ہم آہنگی کے مالک تھے وہ اس نظریۂ قومیت کے جس نے یورپ میں جنم لیا ہے سخت مخالف تھے انھوں نے اپنی کتاب قومیت (Nationalism) میں قومیت پر بہت زیادہ ملامت کی ہے، وہ قومیت کا مفہوم لوگوں کی ایک ایسی منظم جماعت سمجھتے تھے جو اپنی ذاتی ترقی اور مفاد کی خاطر دوسروں کا مفاد ہر جائز و ناجائز اور ظالمانہ طریقوں سے قربان کرتی ہے، اور چونکہ وہ خود دور حاضر میں بین الاقوامیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے، اس لئے ان کی مادر گیتی کی گہری اور عمیق محبت ہر سطحی طور پر دیکھنے والے پر آشکار نہیں ہوتی، لیکن وہ لوگ جو انھیں جانتے ہیں اور ان کے کلام کو سمجھتے ہیں، اور جنھوں نے ان کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا ہے، وہ یہ جانتے ہیں کہ ٹیگور اپنے وطن سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ (وہ خود فرماتے ہیں)

"افسانہ شدہ ماضی سے لائی ہوئی محبت کے ساتھ۔ اور ایسی محبت کے ساتھ جو عہد حاضر میں جاری و ساری ہے اور جسے استقبال میں تخیل کی مدد سے منتقل کر دیا گیا ہے (اپنی مادر وطن کی پرستش کرتا ہوں)"

تاریخ ہندوستان کے عمیق مطالعہ نے ان کی محبت کو اور فروغ دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا نظریۂ بین الاقوامیت بھی محکم تر ہوتا گیا۔ بعض مرتبہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے بین الاقوامی اتحاد کے نظریہ کی بنا اس صدی کے پہلے دس سال ہیں، ان کے سودیشی اور عدم تقسیم بنگال کی (Anti partition) تحریکوں کے تلخ اور مایوس کن تجربوں سے ہوئی۔ اگرچہ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کل انسانیت کے مشغلوں کیساتھ محبت ان کی لڑکپن کی تصنیفات میں بھی موجود ہے، اور ان کی نظم پیرا ایسی ([illegible]) میں جو کہ انھوں نے پختہ عمر میں لکھی ہے یہ حقیقت بدرجہ اتم موجود ہے جس میں انھوں نے بتلایا ہے، کہ "ان کا گھر ہر سرزمین میں موجود ہے، ان کا وطن تمام ملکوں میں ہے اور ان کے قریبی رشتہ دار تمام گھروں میں ہیں" اور یہ کہ وہ مصمم ارادہ کر چکے ہیں کہ وہ ایسا وطن، ایسا گھر اور ایسے قریبی رشتہ دار حاصل کر کے رہیں گے۔

ٹیگور کی حب الوطنی میں دوسرے ممالک کے لوگوں کی سی تنگ نظری ہے، نہ جنگ جویانہ وطن پرستی، نہ نفرت ہے نہ حقارت، ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے پاس دنیا میں پھیلانے کیلئے قدرت کا عطا کردہ تبلیغی درس ہے، اس کے ساتھ انھوں نے کبھی اس سے بھی انکار نہیں کیا کہ دوسرے ملکوں کے پاس بھی ان کے خاص پیام اور تبلیغی درس ہیں، وہ مغرب کو حقارت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کی سائنس، اس کی قوت، آزادی، عدل اور انسانی بہبود کی تلاش میں اپنے آپ کو قربان کر دینے کے جذبے کی قدر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ مشرق مغرب سے حاصل کرے جو کچھ اسے حاصل کرنا چاہئے اور جو کچھ وہ حاصل کر سکتا ہے لیکن ایک فقیر کی طرح یا متبنی کی طرح تعبیر و براشت کے نہیں بلکہ ایک تندرست و توانا انسان کی طرح وہ عمدہ خوراک ہر جگہ سے حاصل کرے، اور اسے اپنے اندر جذب کرے، یہ مشرق کا مغرب سے حصول علم، سیکھنے، مستعار لینے، یا نقل کرنے سے زیادہ قوت محرکہ حاصل کرنا ہے۔

مغرب بھی مشرق کے ساتھ اختلاط سے لوٹنے اور بیجا فائدہ اُٹھانے کی بجائے حقیقی معنوں میں فائدہ اٹھا سکتا ہے، ان کا عقیدہ تھا کہ مشرق صرف اسی وقت مغرب کے پنجوں سے آزاد ہو سکتا ہے جبکہ مشرق اچھی طرح ہر چیز سے باخبر ہو جائے۔ خود کو جانے، خود پر قابو رکھے اور اپنی قدر کرے، اور اسے کوئی کام کرنے کے لئے کسی غیر شخص کے ہنٹر (تحریک) کی ضرورت نہ ہو، اور زندگی اور غور و فکر کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہو جو اس کے اپنے باشندوں سے بھرا ہوا نہ ہو۔

ٹیگور کے ہاتھ مغرب و مشرق بلکہ تمام انسانیت پر پھیلے ہوئے ہیں، رحم طلب کرنے کے لئے نہیں بلکہ مضبوطی سے پکڑنے اور سلامتی بھیجنے کے لئے، وہ نسلوں اور ملکوں میں اوّلین صلح کرانے اور اتحاد پیدا کرنے والوں میں سے تھے، انھوں نے ہندوستان کا تہذیبی رشتہ جاپان، چین، سیام، اور جزائر ہند سے ان ملکوں میں جا کر پھر سے قائم کر دیا۔ اور ہندوستان میں انگریزوں کے بیجا ظلم پر سختی سے ملامت کرنے کے باوجود انگریزوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں انھوں نے کبھی عدل اور بے تعصبی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ان کی سیاست قومی کاموں میں زبانی اظہار سے زیادہ سماج کو ڈھالنے اور کردار بنانے پر مبنی ہے، آزادی کو وہ دوسرے سیاستدانوں کی طرح بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں لیکن ان کا آزادی کا تصور زیادہ ہمہ گیر اور بنیادی ہے، ان کے لئے کاہلی، بزدلی، جہالت

خود غرضی، عشرت پسندی، توہمات اور بے جا رسموں کے بندھن مذہبی پیشواؤں کا اقتدار اور مذہبی کتابوں کی زنجیریں غیر ملکی حکومت سے زیادہ ہماری غلامی کا باعث ہیں۔ غیر ملکی حکومت صرف اُن چیزوں کا اثر اور نتیجہ ہے وہ غیر ملکی مداخلت کی عدم موجودگی کو نعمت سمجھتے ہیں اور اس کے خواہاں ہیں۔ لیکن صرف اسی پر ان کی آزادی کے تصور کا دارومدار نہیں ہے بلکہ ان کے خیال میں ایسی باطنی آزادی کا ہونا بھی ضروری ہے جو ایثار، روشن ضمیری تزکیۂ نفس اور انضباط سے پیدا ہوتی ہے، ان کے اس مطمح نظر کا ہندوستانی سیاست اور اس کے انجام دہی کے طریقوں پر بہت گہرا اثر ہوا ہے، وہ روح کو آزاد کر کے پرواز کے لئے پر دینا چاہتے ہیں تاکہ اس کا مشاہدہ وسیع ہو اور عمل کے لئے میدان لامحدود۔ ان کا دلی منشا ہے کہ خوف کو دل سے نکال دیا جائے، لہذا ان کی سیاست اور روحانی دستگیری ایک دوسرے میں ختم ہو جاتی ہے۔

ٹیگور کو پیری اور جسمانی ضعف نے لکیر کا فقیر اور دشمن تحقیق نہیں بنایا، ان کی روح ہمیشہ نئی روشنی کے استقبال کیلئے آمادہ رہی، وہ ترقی پسند مصلح سماج تھے، ان کی ذہنی قوتیں آخر عمر تک بہت بلند اور جوان رہیں، ان کی سب سے آخری شاعرانہ تخلیق ان کی بصیرت کے کسی طرح سے مدھم ہونے یا اس میں وجدان اور آمد کی کمی پر دلالت نہیں کرتی، اور نہ اس میں تکرار کی کوئی علامت پائی جاتی ہے، وہ اس عمر میں بھی ہم سے بہت زیادہ مستعد لکھنے والوں سے زیادہ لکھ سکتے تھے، ان کا یہ شوق تخلیق کی خوشی مافی الضمیر کو بیان کرنا اور برادرانہ پیشکش پر مبنی تھا، کیونکہ وہ اپنی نوع سے محبت کرتے تھے اور انسانی اختلاط و ارتباط ان کی روح کو بہت مرغوب تھا، ان کے مختلف النوع مضامین، لگاتار اور جامع مقالات بعد ان کے جو سائنس اور فنوں پر لکھے گئے اور ان کی بہت سے ملکوں کی سیاحت نے ان کو ہمیشہ نئے ذہنی اور روحانی ارتباط قائم کرنے اور معاصرانہ خیالات میں پہلو بہ پہلو ہونے اور انسانی ترقی اور غیر معلوم حکومت میں باخبر (آقا) شہنشاہ کا جھنڈا نسب کرنے کی کوشش میں ساتھ ساتھ قدم رکھنے میں مدد دی، کیونکہ وہ خود سب سے زیادہ زندہ دل اور بےخوف ذہنی اور روحانی بااُمید اور محققین میں سے تھے۔

لارڈ کرزن نے جب بنگال کے لوگوں کے احتجاج کے باوجود بنگال کو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ تو انھوں نے دل و جان کے ساتھ اس تحریک میں لوگوں کا حق منوانے اور ان کی شکایات کو ہر ممکن طریقہ سے عام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب جمہور کا غصہ اور ناامیدی تخریب پسندی کی حد تک پہنچ گئی تو وہ سب سے پہلے تنبیہ کرنے والے تھے کہ ہندوستانی قومیت کو تشدد پر عمل نہیں کرنا چاہیئے اور مایوس ہو کر اپنا مضحکہ نہیں اُڑوانا چاہیئے، اگرچہ ان کے لئے ہر حالت میں عدم تشدد مذہبی اصول نہیں تھا۔ وہ یکساں طور پر قوموں کے غارت گری کے جذبے اور کاموں پر ملامت کرتے تھے (خواہ وہ فوجی ہوں یا اقتصادی نوع کے) ان کا خیال تھا کہ جنگ رہزن قوموں کے معاہدات سے اُس وقت تک نہیں رک سکتی جب تک کہ وہ اپنے شر سے بھرے ہوئے طریقوں اور ان سے جو نقصان ہوتے ہیں ان پر پچھتائیں نہیں اور انھیں چھوڑ نہ دیں۔ (جنگ) اس کا علاج ان کے نزدیک طمع کو چھوڑ کر ہمسائیگی کے جذبات کو قوموں کے درمیان اس طرح ترقی دینا ہے جیسے کہ افراد کے درمیان ہوتے ہیں لہذا شاعر روشن ضمیر نے بار بار اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں پرانے اپنشدوں کے ان احکام کو بیان کیا ہے:۔

"اُن سب چیزوں میں جو کچھ کہ فطرت میں چلتی پھرتی ہیں، خدا جاگزیں ہے، تم اس سے لطف اٹھاؤ جو کچھ کہ اس کی طرف سے تمہیں دیا گیا ہے۔ کسی دوسرے کی دولت پر لالچ کی نظر مت ڈالو۔"

ٹیگور نے اس طرز خیال کی پیروی میں اگرچہ اپنے مافی الضمیر کو واضح طور پر روسی (نئی) حکومت کے تشدد کے استعمال کے خلاف ظاہر کیا ہے، اور اگرچہ ان کا ہمیشہ یہ یقین رہا کہ انفرادی ملکیت کے جائز استعمال پر انفرادی آزادی اور سماجی مفاد قیام اور ترقی کا دارومدار ہے، لیکن انھوں نے روسی نظریۂ اجتماعیت کو پرکھا اور اس کے فوائد بیان کئے، جیسا کہ ان کے مندرجۂ ذیل بحری تار سے ظاہر ہوتا ہے جو کہ انھوں نے وی۔ او۔ کے، ایس۔ ماسکو کے پرفیسر پیٹرو کے دریافت کرنے پر جواباً بھیجا تھا۔

"تمہاری کامیابی کا راز دولت کا رُخ انفرادیت سے اجتماعی انسانیت کی طرف پھیر دینے میں مضمر ہے۔"

[illegible] in turning the [illegible] from the individual to [illegible]

ٹیگور نے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے "وشوا بھارتی" کے
تصور (IDEAL) میں جو ایک بین الاقوامی درسگاہ ہے،
بنواؤں (جنگل میں رہنے والے ہندوستانی گرو) کے پرانے معیار
کو قائم رکھا ہے، اس کی سادگی، عیش و عشرت سے کنارہ کشی، اسکی
پاکیزگی و پاکدامنی پر اصرار، اس کی روحانیت، فطرت سے عملی ارتباط
اور آزاد تحریک، جو کہ جسمانی اور روحانی جوش و خروش پیدا کرتی ہے۔
اگرچہ ان سب چیزوں میں پرانی روح برقرار رکھی گئی ہے، لیکن اس
کھلی ہوا کے مدرسہ (شانتی نکیتن) میں صرف رسم ورواج کی پابندی
نہیں کی جاتی، خواہ وہ کتنے ہی پرانے کیوں نہ ہوں، شاعر کا ذہنی
نظریہ عالمگیر ہے، وہ اپنے شاگردوں کے لئے ہر قسم کا علم اور تہذیب
چاہتے ہیں (شعبہ کے لحاظ سے خواہ کچھ بھی اس کا ماخذ کیوں نہ ہو)
لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی دونوں جنسوں کے نوجوانوں
کے دلنشیں ہندوستان کا ماضی کردیں، اور ماضی سے ان کیلئے
روحانی غذا حاصل کریں۔ اگرچہ وہ کلی طور پر ہندوستان کے بڑے
بڑے مذاہب کے اصولوں کو جہاں تک اس درسگاہ کیلئے ممکن ہے
ترقی دے رہے تھے۔ انھوں نے دوسرے مذاہب کے (بانیوں)
پیشواؤں کو بھی دوستانہ دعوت دی، اور اس وجہ سے یہ ممکن
ہو گیا کہ شانتی نکیتن میں جو کوئی مذاہب کا مقابلتہً مطالعہ کرنا چاہے
وہ آسانی سے کرسکتا ہے، وہ چاہتے تھے کہ نسلیت، قومیت اور
رنگ و خون کا تعصب ان کے مدرسہ میں نہ پھیلے۔

وشوا بھارتی میں نہ صرف مذہبی تعلیم ہوتی تھی بلکہ مختلف پیشوں
کے متعلق بھی۔ ٹیگور ذہنی نشوونما کے ساتھ ہی ساتھ دستکاری کی بھی
تعلیم دینا چاہتے تھے، ان کا مقصد اپنے شاگردوں میں ذہنی، فنی اور
جمالیاتی تعلیم عام کرنا تھا، وہ ایک ایسی شخصیت بنانا چاہتے تھے
جو سماجی اور انفرادی دونوں طرح کی زندگی میں ممتاز ہو، شانتی
نکیتن میں ایک ابتدائی مدرسہ، ایک ہائی اسکول اور ایک کالج ہے،
ایک کالج فارغ شدہ طلبار کے لئے تحقیق و تدقیق کرنے کے لئے ہے
ایک مصوری، ڈھلائی اور صنعتی اسکول ہے، ایک موسیقی کا اسکول
ایک زراعتی اور دیہاتی فلاح وبہبود کے کام کا اسکول، ایک کوآپریٹیو
بنک مع شاخوں کے اور ایک حفظان صحت کا ادارہ ہے۔

دونوں جنسوں کے طلبا مختلف کھیل کھیلتے ہیں اور جسمانی ورزش کرتے
ہیں، وہ جیوجتسو ([illegible]) جو کہ ان کو بہت تجربہ کار جاپانی
ماہر نے سکھایا ہے اور دوسری قسم کی حفاظتی تدابیر بھی سیکھتے ہیں [illegible]

کا دیہات کا تصور (IDEAL) یہ ہے کہ اس میں تمام دیہاتی خوبصورتی
اور دلکش خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ شہری خوشگواری جو کہ زندہ دلی
اور کام کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے ہونی چاہئے
ان میں سے چند چیزیں ان کے اسکول میں موجود ہیں، یہاں پر ہر درجہ
میں مخلوط تعلیم ہے (Coeducation) یہ ٹیگور کی دلی تمنا ہے
کہ طالبات کو یونیورسٹی میں مکمل تعلیم سائنس کے اصولوں پر دی جائے
ان میں سے چند ان کی اپنی بصیرت اور پختہ کار تجربہ پر مبنی ہیں۔

ٹیگور کو وشوا بھارتی کا بانی صرف اس لئے نہیں کہا جاتا
کہ انھوں نے اسے ایک مقامی مسکن، نام، عمارت، اور مالی امداد
دی اور اس کا نصب العین قائم کیا، بیشک یہ چیزیں انھوں نے
دیں، مالی امداد دینے کے لئے اسکول کے ابتدائی سالوں میں بعض
اوقات انھیں کچھ اپنی کتابوں کا کاپی رائٹ (copyright)
فروخت کرنا پڑا، اور بعض اوقات اپنی زوجہ کے کچھ جڑاؤ زیورات
بھی عارضی طور پر گروی رکھنے یا فروخت کرنے پڑے، اور ایسے کے
ابتدائی دور میں انھوں نے بہت سے مضامین خود ہی پڑھائے اور
لڑکوں کے ساتھ ان کے کمروں میں رہے۔ اور ان کو شام کے وقت
کہانیاں اور اپنے گیت سنا سنا کر ان کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا
کیا۔ نئے نئے کھیل ایجاد کئے، اور ذہنی نشوونما اور تربیت کیلئے نئی نئی
تدابیر اختیار کیں۔ اب بھی تقریباً دس یا دہ سال پیشتر تک وہ کچھ
کلاسیں خود پڑھاتے رہے۔ اور مرتے دم تک ہمیشہ کسی نہ کسی طرح اس
ادارے سے وابستہ رہے۔

ٹیگور ابتدائی عمر سے اخبار نویس تھے، انھوں نے اکثر نہایت
ہی سچائی کے ساتھ لکھا ہے، رابندر ناتھ نے اوائل عمر میں نہایت
کامیابی کے ساتھ مختلف ماہانہ رسالوں کی ادارت کی، اور آخری
عمر تک بہت سے رسائل کو مضامین اور نظمیں بھیجتے رہے، انھوں
نے بہت سے ہفتہ وار رسائل کیلئے بھی مضامین لکھے، بنگال میں صرف
وہی ایک ایسے شخص تھے جو ایک رسالہ کو اول تا آخر ہر طرح کے
عمدہ عمدہ مضامین اور نظموں سے بھر سکتے تھے۔ وہ رسائل میں باقاعدگی
سے مضامین بھیجا کرتے تھے، مدیر کی حیثیت سے مضامین کی
باقاعدگی سے اصلاح کرکے انھوں نے بہت سے مضمون نگار بنائے جو
بعد میں بہت مشہور ہو گئے۔

ٹیگور کا خط بہت نفیس تھا، بنگال میں بہت سے لوگوں
نے اس طرز کو اختیار کر لیا، لیکن تمام خوشخط لوگ ضروری نہیں ہیں [illegible]

اگرچہ رابندر ناتھ کی شہرت مصور کی حیثیت سے اس وقت ہوئی جبکہ ان کی عمر ستر برس کی تھی، اگرچہ خوشنویسی سے مصوری کا راستہ بہت کچھ فطری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں نہ میرا مقصد ہے اور نہ میں اپنے اندر اس قدر اہلیت پاتا ہوں کہ ان کی مصوری پر کچھ لکھ سکوں ان کی مصوری نہ ہندوستانی مصوری سے مشابہ ہے اور نہ کسی نئی یا پرانی مصوری کی نقل ہے۔ ایک بات جو شاید ان کے سمجھنے اور قابلِ قدر ہونے میں یکساں ہے وہ یہ کہ ان سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا، کسی قصہ کا پتہ نہیں چلتا اور کسی قسم کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتیں، وہ خطوط اور رنگوں میں وہ چیز ظاہر کرتی ہیں جو ٹیگور کے لامحدود الفاظ اور ادب میں مہارت بھی نہیں بیان کرسکتی۔ وہ نہ کبھی مصوری سیکھنے کسی اسکول میں گئے اور نہ کبھی گھر پر کسی سے سیکھی، اور نہ انھوں نے کسی کی نقل کرنا چاہی۔ لہذا وہ حقیقی معنی میں پیدائشی مصور تھے، اگر ان کی مصوری میں کسی اور مصوری کے اسکول کی مشابہت ہے تو وہ بالکل اتفاقیہ اور غیر دانستہ طور پر ہے۔

جب ان کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی اس وقت ان کی یہ تمنا تھی کہ وہ فن شکل تراشی ([illegible]) شروع کریں اور شاید انھوں نے شروع بھی کردیا تھا، ایک بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ابندرا ناتھ ٹیگور جو کہ بہت مشہور مصور ہیں، بنگالی کے رسالہ "شانتنیکتیان" میں لکھتے ہیں کہ کس طرح ان کے چچا رابندر ناتھ نے ان کو فطری مصوری میں اپنا طریقہ ([illegible]) پیدا کرنا بتایا۔ مختصراً ابندرا ناتھ لکھتے ہیں۔

"بنگال کے شاعر نے مصوری کے خط بنائے، بنگال کے مصور (خود ابندرا ناتھ) نے ایک عرصہ تک ان خطوط پر مشق کی۔"

ٹیگور رات کو بہت دیر میں سویا کرتے تھے اور صبح بہت جلد اٹھ بیٹھتے تھے، دوپہر کے وقت بھی وہ اپنے کام میں مصروف رہتے اور تھوڑی سی دیر کے لئے بھی آرام نہیں کرتے تھے، سارے دن اور رات میں چند گھنٹہ سونے، نہانے دھونے، اور کھانا کھانے میں صرف کرتے تھے، اور باقی تمام وقت کام میں صرف کرتے تھے گرمی کے زمانہ میں نہ وہ خود پنکھا جھلتے تھے اور نہ دوسروں کو جھلنے دیتے تھے۔

اگرچہ آخر عمر میں وہ بیماری کی وجہ سے بہت تھوڑا کام کرتے تھے تاہم آجکل کے بہت سے نوجوانوں سے زیادہ۔ وہ ایک سچے گرو تھے لیکن جوگی نہ تھے، کیونکہ ان کا زندگی کا تصور بالکل مختلف تھا، ان کا قول تھا: "دُنیا سے علیحدہ رہکر نجات حاصل کرنا میرا اصول نہیں۔"

اس مضمون کو وضاحت کیساتھ وہ ایک اور نظم میں یوں بیان کرتے ہیں:

"خدا پر یقین رکھنے والوں کا عبادت (سادھنا) سے ایک مقصد یہ ہے کہ ان میں بھی کچھ خدائی صفات پیدا ہو جائیں، کیونکہ کل ممکنات خداوندی جو کہ اس کا (خدا کا) ملبوس بھی ہیں اور خود کو (خدا کو) ظاہر کرنے کا ذریعہ بھی، بے کیف صحرا نہیں ہیں، خدائی صفات کے حامل انسان کی زندگی اور ظاہر ایک صحرا کی سی لقل نہیں ہونی چاہئیں، اگرچہ اداس صحرا بھی خداوند تعالیٰ کی تخلیق کا ایک پہلو ہے، جوگیانہ زندگی بھی خدا کو تلاش کرنے اور خود کو پہچاننے کا ایک درجہ اور ایک پہلو ہوسکتی ہے، لیکن کل نہیں ہوسکتی، حقیقی جوگ خود شناسی، خدا شناسی اور انسانی فلاح و بہبود کیلئے قابلِ قدر ہے لیکن یکساں بلکہ زیادہ قابلِ قدر عبادت ان لوگوں کی ہے جو اس سے بھی زیادہ مشکل راستہ اختیار کرتے ہیں یعنی دُنیا میں رہتے ہوئے، دُنیا کے کاموں میں مشغول رہنے کے باوجود دُنیا ہی کے ہوکر نہیں رہ جاتے۔"

ٹیگور ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے اور ۱۲ اگست ۱۹۴۱ء کو اس دُنیا سے سدھار گئے۔ گویا اسّی برس سے کچھ زیادہ جئے۔ گو اسی برس کی طویل زندگی عام نہیں لیکن ایسی کمیاب بھی نہیں، دراصل درازیٔ عمر کوئی اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ اس کی اعلیٰ نوعیت اور وہ جس طریقہ پر گزاری جاتی ہے وہ اہم ہے، یوں تو بقول کسے۔

"پودے بھی زندہ رہتے ہیں اور چرند و پرند بھی (لیکن) دراصل زندہ تو وہ رہتا ہے، جس کا دماغ سوچتے ہوئے زندہ رہے۔"

ہم یہاں جوہن بوجر کے ہم آہنگ ہوکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اس کی تعلیم (دانشمندی) کے لئے کوئی زمانہ معین نہیں ہے، وہ اس قدر قدیم ہے جس قدر ہندوستان کے دریا، اور اس قدر نو عمر ہے جس قدر ایک کمسن بچہ، کیونکہ اس میں کسی فطری اور جبلی چیز کی جھلک نظر آتی ہے، جو کہ فرد اتک آشکار نہیں ہوسکتی، اس کی شاعری کسی اسکول سے تعلق نہیں رکھتی۔ بنگال کے پھول سورج کی شعاعوں اور بارش کی ننھی ننھی بوندوں سے پیدا ہوئے ہیں۔"

"اس کی ہمعصر انسانوں کیساتھ محبت ساحری محبت نہیں ہے (گمراہ کرنے والی) بلکہ کسی ایک گانے کی اور گانوں کے [illegible] (Song of Songs) وہ جانتا ہے کہ جس طرح کہ اس پر شبنم کا ایک قطرہ آسمان کا عکس دکھا سکتا ہے اسی طرح انسانی دماغ خدا کو منعکس کرسکتا ہے۔"

سید شفیق احمد

تخیل

تخیل ان ہی لفظوں میں سے ہے جن کی یا تو تعریف ہی نہیں کی گئی، اور اگر ایسا ہوا بھی ہے تو بہت ہی مبہم الفاظ میں۔ جو تعریفیں اس کی ادبا نے کی ہیں وہ خود محتاج تعریف معلوم ہوتی ہیں یوں تو کسی مبہم تعریف کا ہونا اور اس کا فقدان دونوں ہی پریشان کن صورتیں ہیں، لیکن موخر الذکر زیادہ شدید قسم کی ہے، یہ ضرور ہے کہ کسی جامع اور مکمل تعریف کا پیش کرنا ذرا امکان سے باہر ہے لیکن کسی تعریف کی کامل عدمیت تو اور زیادہ دشوار اس لئے ہو جاتی ہے کہ اس طریقہ سے تھوڑی بہت توجیہی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی، کسی چیز کی تعریف کا بے لاگ ہونا تقریباً ناممکن ہے، اس لئے اس مقالہ میں تخیل کی جو تعریف بھی کی جائے گی اُسے لاگ اور جانبداری سے جو اکثر نظریات کو گھیرے رہتی ہے، آزاد نہیں کہی جا سکتی، اس مقالہ کا مقصد صرف یہ بتانا ہوگا کہ تخیل اور شاعری میں کیا واسطہ ہے یا وہ ایک دوسرے سے کیسے مربوط ہیں؟

لفظ تخیل کے فنی استعمال کی تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں، تو سب سے پہلے ہمارے سامنے ورڈسورتھ اور کولرج کے نام آئیں گے ورڈسورتھ نے سب سے پہلے اس کا استعمال اپنے "دیباچہ" میں کیا ہے لیکن معنوی طریقہ سے اس کو تشنہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ کولرج کے یہاں لفظ ہم کو اسکی (Biographia Literaria) میں ملتا ہے، کولرج اور ورڈسورتھ کا زمانہ ایک ایسا دور تھا جس میں شعرا کی طرف سے شاعری پر تنقید کا بازار گرم تھا، ان دونوں سے پہلے لفظ تخیل کسی خاص معنوں میں استعمال نہ ہوتا تھا اور نہ کوئی اس کی معنوی تحدید تھی، کولرج اور ورڈسورتھ نے نہ صرف اس کی معنوی حدود کی تعیین کی بلکہ اس پر بھی زور دیا کہ قوت تخیلہ اور قیاس (Fancy) میں تمائز ضروری ہے، قیاس اور تخیل کو باہم مخلوط کر دینے کی غلطیاں ہمیں اُن ادیبوں تک کے یہاں ملتی ہیں جنھوں نے زبان کی صحت کا بہت لحاظ رکھا ہے، ڈاآردن جیسا محتاط آدمی بھی اپنی کتاب "فضل انسانی" میں لکھتا ہے "اس قوت کے ذریعہ سے آدمی غیر شعوری طور پر ان خیالات و تصورات کا امتزاج کر لیتا ہے جس سے نادر اور خوش آئند نتائج ظہور پذیر ہوں"۔ ڈاآردن کا پیش کردہ نظریہ ورڈسورتھ کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے، ڈاآردن کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تخیل کو ایک موہوم چیز سمجھتا ہے، اُس نے اس کا استعمال بالکل ایسے ہی کیا ہے جیسے ہم اکثر بغیر سوچے سمجھے سرسری طور پر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں بات میں تو تخیل کی رنگ آمیزی ہے، اس کی تعریف میں "خوش آئند نتائج" کی ترکیب ایسے استعمال ہوئی ہے کہ کسی خاص فیصلہ پر پہنچنا ناممکن ہے۔

اگر ہم تاریخی اعتبار سے اور زیادہ عتیق کی طرف قدم دکھیں جب ہر چیز کا سہرا یونان کے سر تھا تو ہم کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ یونانی مفکرین تخیل کو عقل کے مترادف جانتے تھے۔ پائرس پلومین (Piers Plowman) کے مصنف نے بھی اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ برنرس (Berners) نے بھی اپنی فرائیسوٹ (Froissart) میں اس کو اسی طرح جائز رکھا ہے، ڈانٹے بھی اس کے مروج استعمال سے منحرف نظر نہیں آتا۔ شاید شیکسپیئر کا مطالعہ ہمیں تخیل کے متعلق کچھ نئی باتیں بتا سکے، کیونکہ تمام انگریزی مصنفین کی صف میں وہی ایک واحد ہستی ہے جس کے لئے زبان ایک زندہ اور ذی حیات حقیقت ہے، حالانکہ شیکسپیئر کے کسی لفظ کے استعمال سے ہم کوئی تعریف اخذ نہیں کر سکیں گے، لیکن اُس سے اس لفظ کا نیا استعمال اور اُس کی وسعتوں کا اندازہ تو ہو جائیگا، اس نے اپنی (Midsummer Night's Dream) میں ایک تقریر تھیسس کی زبان سے ادا کرائی ہے، ذیل میں اس کا اقتباس درج ہے:...

اتنی عجیب اور صداقت سے اسقدر بعید کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہیں
یہ کہنہ روایات اور یہ اساطیر قدیم
عشاق اور دیوانے، ان کی وہ سرجوش عقل
اور ان کے وہ تشکیلی توہمات جو اُن خیالات تک کھینچا خوش کر دیتا

جن کو تنگ مایہ دلائل بھی قبول نہیں کر سکتے۔
دیوانے، عشاق اور شاعر
سب تخیل سے وابستہ ہیں۔
ایک کی فکر اتنے شیاطین تخلیق کر لیتی ہے جن پر دوزخ تنگ ہے۔
یہ دیوانہ کا فکر ہے۔ عشاق جو جنون سے بہرہ مند ہیں،
حسن ہیلن کو مصری پیشانی میں تاباں دیکھ لیتے ہیں۔
اور شاعر کی آنکھ لطیف جنون کے حریری پردوں سے گزرتی ہوئی
زمین و آسمان پیمائی کرتی ہے
اُس کے تخیل کی تحریک سے وہ اشیاء ظاہر ہوتی ہیں
جن کے خاکہ تلک قابل ادراک نہیں ہوتے۔ شاعر کا قلم
انہیں ان کی ہیئت بخشتا ہے لیکن جیسے بر دوش ہوا
ایک مانوس سا رنگ، ایک مانوس سا نام
یہ تخیل کی کارگزاریاں ہیں
کہ اگر وہ خوشی سے دوچار ہو جائے
تو اُس کا بانی بھی تکوین کر لیتا ہے
یا اگر اس کی نظر سے کوئی ہول آفریں شے گزرتی ہے
تو وہ جھاڑی کو بآسانی ریچھ بنا دیتا ہے

۲۸

اس اقتباس میں تھیسس نے محبت کے متعلق اظہار خیال کیا ہے جس کو وہ جنون اور سودائیت کہتا ہے۔ اُس کی نظر میں شاعری نیم عیاری اور نیم سودائیت ہے لیکن لطیف سودائیت، شاعر اس کے خیال میں سبھی اور لغلی جبلتوں کے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے، جس کو تخیل "جھاڑی" سے "ریچھ" کی تخلیق کرے۔ یوں تو یہ بیان تھیسس کا ہے لیکن پس پردہ اسمیں شیکسپیئر بول رہا ہے تھیسس جیسے "سرجوش عقل" کہتا ہے وہ خود آدمی کا نقص ہے جو اعلیٰ پیمانہ پر کام مزن ہے۔ وہ "تشکیل توہمات" کا ذکر کرتا ہے، یہ تمام ترکیب بہت ہی منتخب اور چیدہ ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ تخیل ایک تعمیری قوت ہے جس میں انسانی دماغ کی عمومی حالت کے خیالات کو وسعت دلیہ اصلیت میں تبدیلی کر دینے کا ذکر ہوتا ہے اور جس کا کام نامعلوم کو معلوم کر دکھانا ہے۔ شیکسپیئر کے یہاں ایسے پارے اکثر ملیں گے جو اس نظریہ کی تائید کریں کہ تخیل حقیقتاً ایک وسیع اور تعمیری چیز ہے تخیل کے لئے اُس نے (Tempest) میں بھی "محکم تخیل" کی ترکیب استعمال کی ہے (Timon) میں اُس نے تخیل کو "تخیل عظیم" کہا ہے، اسی طرح (Hamlet) میں اس کو "تشکیلیت" کہا ہے ہیملٹ میں ایک اور حوالہ بھی دیا ہے۔ ہیملٹ کہتا ہے کہ "تخیل خاک سکندر تک کا سراغ لگا سکتا ہے" یہ کوئی اتفاقیہ امور نہیں ہیں۔

تخیل پر ایک عقلی قوت کے نقطۂ نگاہ سے بعد میں بحث ہوگی، پہلے ورڈسورتھ اور کولرج کے زاویۂ نگاہ پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔

ورڈسورتھ اپنے "گیتوں" کے دیباچہ طبع دوم میں تخیل کے لفظ کو مروجہ معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ لکھتا ہے

"میرا مقصد ان نظموں سے زندگی کے روزانہ واقعات و حالات سے جزئیات کا انتخاب ہے اور ان کا ایسا نظم کرنا ہے جس پر تخیل کی رنگ آمیزی ہو اور جس کے ذریعہ معمولی چیزیں دماغ کے سامنے غیر معمولی اطوار میں آئیں"۔

ورڈسورتھ کے جملہ کا آخری حصہ بہت اہم ہے کیونکہ یہاں تخیل سے مراد ایک ایسی شے لی گئی ہے جس کا کام رنگ آمیزی ہے یا جو کسی چیز کو ایسے سانچے میں پیش کرتی ہے جس سے اُس کی ہیئت میں فرق آجائے۔ اب کولرج کے ریمارک پر بھی نظر ڈال لینی چاہئے وہ اپنی (Biographia Literaria) میں ورڈسورتھ کی ایک نظم کی تحسین میں لکھتا ہے۔

"ہمیں یہاں صداقت و اصلیت کا وہ توازن، تخئیلی قوت، کا مشاہدہ اور واقعات و حالات کا وہ رنگین انکشاف ملتا ہے جو ہماری علمی دُنیا پر محیط ہے"۔

یہاں رنگ آمیزی کی قوت کو تخئیلی قوت سے ممتاز کر دیا گیا ہے بلکہ تخیل کو صرف ترسیمی، تشکیلی اور اثراندازی کی قوت کہا گیا ہے۔ ورڈسورتھ نے بھی اواخر ایام میں یہی کہنا شروع کر دیا تھا جس کو کولرج شروع میں کہہ چکا تھا۔ ورڈسورتھ اسی نظریہ کو لیتے ہوئے ایک دیباچہ میں "تخلیق شعر" کے لوازم کو گناتا ہے مشاہدہ، احساس، تفکر، اجتہاد، محاکمہ وغیرہ کو تو وہ ضروری خیال کرتا ہی ہے لیکن سب سے زیادہ اہم وہ تخیل کو سمجھتا ہے جس کا کام اُس کے تئیں رنگ آمیزی، تخلیق، تلازم اور تشکیل ہے، ان ہی ضروریات شعری کے ماتحت اُس نے اپنے کلام کو ترتیب دیا ہے تخیل اور قیاس کی بحث جہاں اُس نے چھیڑی ہے بڑے معقول، اور دلچسپ نکات نکالے ہیں، لیکن قیاس اور تخیل کے مابین اُس نے اتنا باریک میکانکی تضاد رکھا ہے کہ ناظر کے لئے یہ طے کرنا

دشوار ہو جاتا ہے کہ کون سی نظم تخیل کے عنوان میں رہیگی اور کونسی قیاس کے تحت میں۔ ویسے بھی ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے کیلئے کیا معیار ہو سکتا ہے، اگر ذوق رہبری کرے تو تخیل اور قیاس کا فرق ممکن ہے ورنہ کوئی مقیاس ان کی تقسیم کیلئے ممکن نہیں۔ ورڈسورتھ کے مطالعہ کے وقت اس کا لحاظ ضروری ہے کہ ہم اس کی قافیہ آرائیوں سے بچتے رہیں، وہ عام ضوابط کے معاملہ میں بہت سیدھا اور صاف ہے لیکن ان کے اطلاق کے معاملہ میں وہ بہت ہی غیر پاک میں ہے اور انخنا سے کام لیتا ہے۔ حالانکہ وہ قیاس و تخیل کو بالکل متضاد خیال کرتا ہے لیکن پھر وہ تخیل کے متعلق کہتا ہے "تخیل اپنی ضروریات ہمیشہ قیاس کی کارگاہ سے پورا کرتا ہے"۔ وہ قیاس کو بھی ایک اختراعی قوت مانتا ہے لیکن پھر بھی کہتا ہے کہ جن قوتوں کے ماتحت قیاس کام کرتا ہے وہ خود توہم سے زیادہ کچھ نہیں جس کا اثر آنی اور غیر مستقل ہوتا ہے۔ اس سے دونوں میں تضاد پیدا ہونا ممکن ہے لیکن جب وہ کہتا ہے کہ "قیاس ہماری فطرت کے غیر مستقل اور آسانی سے بہل جانے والے حصّہ سے متعلق ہے اور تخیل ہمیشہ دوامی اور لافانی کو برانگیختہ کرتا ہے"۔ تو اُس وقت اس کا بیان کولرج سے زیادہ مشابہ ہو جاتا ہے۔ ورڈسورتھ نے اس جگہ لفاظی اور جذبات کے معنوی دھندلکے میں حقیقت کو گھمانا چاہا ہے اور اسی وجہ سے دیباچہ غیر متوقع طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ ورڈسورتھ نے تو اس فوری اختتام کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ناظرین اُس کی طوالت سے گھبرا نہ جائیں لیکن ہم جو کچھ اس سے اخذ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ورڈسورتھ کسی ایسے نتیجہ پر پہنچنے والا ہوگا جو کیفیت کے لحاظ سے کچھ نہ ہو اور محض کمیت ہی ہو۔ تخیل کے متعلق وہ کہتا ہے "تخیل سے میری مراد دماغ کا وہ تفاعل ہے جو اشیاء کے ظواہر سے زیادہ متعلق ہو یا وہ تخلیقی عمل مراد ہے جو مقررہ قوانین کا تابع ہو"۔ "تخیلی عمل ہمیشہ دوسری خارجی اشیاء کو انعکاسی قوت بخشنے یا ان سے اخذ کرنے پر متحرک ہوتا ہے"۔ بہرصورت دماغ کی ایک نئی عملی شکل کیو اسطے ظواہر کا انعکاس اور ان کا ردِّ عمل ضروری ہے۔

یہ دعویٰ کہ تخیل کا کام تشکیل و تخلیق ہے بہت ہی اہم ہے کولرج کا ارادہ تھا کہ وہ اس دعوی کی مزید وضاحت کرے لیکن عدم طباعت کی وجہ سے ہم اپنا صریح نقصان محسوس کرتے ہیں قیاس اور تخیل کے باریک فرق کو مشرح کر کے اس نے ورڈسورتھ کی انتشادیت کا خاتمہ کر دیا اور ہر لفظ کی حدود مقرر کر دیں تحدید کی رُو سے اُس نے قیاس و تخیل کو دو مختلف قوتیں ٹھیرایا ہے جو نہ تو ایک چیز سے مشتق ہیں اور نہ ایک دوسرے سے صریح قیاس حافظہ کی اُس وضع یا نہج کو کہا جا سکتا ہے جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر اپنا تمام مواد قانونِ تلازم سے حاصل کرتا ہے۔ گو تخیل فی نفسہٖ "اختراع یا تخلیق کے دوامی فعل کی تکرار ہے جس کے مقررہ حدود دماغ سے باہر نہیں، جس کا فعل تجزیہ و تحلیل ہے تاکہ تخلیقی نتائج برآمد ہوں"۔ گویا تخیل کو کولرج نے ایسی قوت کہا ہے جس پر انسان مقتدر ہے اور جو اختراعی ہے جو اُس الوہی اختراعی طاقت کے مشابہ کہی جا سکتی ہے، یا اس کی صدائے بازگشت جس کا فعل اس چیز کو مادی صورت بخشنا ہوتا ہے جو کسی ظاہری ہیئت سے عاری ہو یا تمام مواد کو ایک سانچہ میں تبدیل کر دینا چاہے، سانچے کی جدید تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ "وہ مکمل کا ایک عکس ہے جس کو کائنات کے کُہر سے مکشوف کر دیا گیا ہو"۔

کولرج زبان کی خوبیوں کا جہاں تک تعلق ہے اس قدر کھو جاتا ہے کہ اکثر حقیقت ایک بعید چیز معلوم ہونے لگتی ہے لیکن ذیل کے ایک پارہ میں جو اسکی (Biographia Literaria) میں سے نقل کیا گیا ہے وہ صاف اور مشرح ہے حالانکہ اس کے فوراً بعد وہ پھر زبان کی خوبیوں میں اُلجھکر تخیل کو ایک مسحور کر دینے والی طاقت بتا دیتا ہے۔ تخیل کا سحرکار ہونا ممکن ہے لیکن اگر کسی چیز کو سحرکار کہدینے کا مقصد یہ ہے کہ اُس پر عقلیت کے دروازے بند ہیں تو ہمیں اس سے اختلاف ہوگا (Dejection Ode) میں جو اس کی چھ سال کی بہترین نظموں میں سے ہے وہ تخیل کی تعریف یوں کرتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب میرا جادہ ہموار نہ تھا
میری شادی رنج سے ہم آغوش تھی
جب غم والم میرا سرمایہ تھا
جب میرا قیاس مجھے نشاط و عیش کے خواب دکھاتا تھا
لیکن اب میری امیدیں سرنگوں ہیں
مجھے پرواہ نہیں اگر وہ میری طبعی راحت کو چھین لیں
لیکن آہ ہر لحظہ وہ
بڑھ کر اُن فطری عطیات کو دبا لیتی ہے جو مجھے پیدائش کے وقت عطا ہوئے تھے
آہ میری تخیل کی تشکیلی قوت!

اس پارہ میں تخیل کو ایک محکم، قوی الافراد اور زبردست طاقت کہا گیا ہے، اُس آواز کی طرح جسنے "کن" کہا اور دُنیا وجود میں آگئی، ایک "محکم نغمہ" جس کے ترنم میں زندگی کے گزران نغمے چھپے ہوں، اور ایک تشکیلی طاقت جو خلا کو وجود بخشے اور غیر موجود میں تبدیل کرے، کولرج کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ تخیل وہ اشیا پیدا کر لیتا ہے جن کو حقیقت کہا جا سکے، تخیل پر زندگی کا انحصار ہے لیکن شادمانی اور تخیل ایک ہی چیز ہیں، یعنی شادمانی کا ہی دوسرا نام تخیل ہے۔ تخیل جو شعراء کو زندگی کے مکمل خاکے بنانے پر مجبور کرتا ہے صرف شعراء کے لئے ہی محدود و مخصوص نہیں، بلکہ مقدار کے لحاظ سے ہر ناظر میں ہوتا ہے جس سے وہ کسی چیز کی تنقیص و تحسین کرتا ہے، اسی تخیلی مقدار کی وجہ سے شاعری ہمیشہ زندہ رہتی ہے، نئی پیدا کی جاتی ہے اور نیا پن برقرار رکھتی ہے، تخیل کو بھی اور دوسری جسمانی قوتوں کی طرح بڑھایا جا سکتا ہے۔

ارسطو نے اپنی "شعریات" میں جو تعریف تخیل کی کی ہے اس سے کچھ مختلف نہیں، ہر چند اُس نے زاویہ ہائے نگاہ کو مختلف جگہ نصب کیا ہے لیکن کوئی اضافی چیز برآمد کر سکا، شاعری ارسطو کے خیال میں "ایک خاکہ یا ایک اقتدار ہے جس کا مادی ذریعہ اظہار زبان ہے"، جس کی دو خصوصیات ہیں یعنی یہ داخلی ہے اور انسانیت سے توام۔ دوسرے مسرت و انشاط اس کا ایک فطری ذریعہ ہے۔ ارسطو انسانی سرگرمی اور عمل کو تین طریقوں پر تقسیم کرتا ہے (۱) فکر یا قوتِ ذہنی (۲) عمل یا قوتِ کردار و اعتقاد (۳) تخلیق یا قوتِ اختراع۔ آخری قوت کا پھر دوہرا عمل ہے جس کو منطق و حقیقت دونوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ آدمی اختراع کرتا ہے ظاہری ضروریات کی تشنگی دور کرنے کے لئے یہ اختراع فن ہے، اور فن جس کے اظہار کا ذریعہ زبان ہے زندگی کے لئے ضروری ہے، ان دونوں نظریات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاعری زندگی کی خارجی ضروریات کی تکمیل کرنے والی چیز نہیں بلکہ حیات کل کی مفسر ہے جو زندگی کو اُس کی ماہیت و معنی سے روشناس کراتی ہے۔ شاعری زندگی کی تشکیل کرتی ہے اور تخیل شاعری کی تشکیل کرتا ہے۔ گویا شاعری کی تخلیق میں مرکزی حیثیت تخیل کو حاصل ہے۔ ورڈسورتھ شاعری کی تخلیق کرنے والی قوتوں میں مشاہدہ، عبورِ زبان، احساس، لطافتِ مشاہدہ، غور و فکر، ایجاد و محاکمہ وغیرہ کو سمجھتا ہے، یقیناً محاکمہ کو وہ بڑی زبردست قوت خیال کرتا ہے جو امتیاز کر کے نظم کرتی ہے لیکن ان سب سے بلند وہ تخیل کو سمجھتا ہے جو ایک تشکیلی قوت ہے اور جس کے بغیر شاعری ناممکن ہے، مشاہدہ صحیح ہو سکتا ہے، مناظر اور اُن کا بیان درست ہو سکتا ہے، احساس کے لطیف ہونے کا امکان ہے، تجربوں کا صحیح غور و فکر میسر الحصول ہے لیکن یہ سب وہاں تک رہبری کرتے ہیں جہاں سے شاعری اپنا آغاز کرتی ہے، یہ سب خارجی ہیں لیکن تخیل جس کا کام ترمیمی، تشکیلی اور ایک گونہ رنگ آمیزی ہے ناگزیر ہے جو منظوم زبان میں زندگی کا خاکہ پیش کرتا ہے جس کو غور و فکر نے درست کیا ہے، جس کو جدت مس کرتی ہے، جس کو صحیح احساس چھو کر گزرتا ہے، یقیناً شاعری کا جزو لاینفک ہے۔

شیدا۔ ایم۔ اے

اَدَب کے مِٹتے ہُوئے رُجحانات پر ایک نظر

پہلی جنگ عظیم کے بعد سے اب تک ادبی تنقید کے سلسلہ میں کس قدر خیال آرائیاں ہو چکی ہیں! جو نظریے پیش کئے گئے ہیں، اُن میں انتہا درجہ اصولی اور فروعی اختلافات ہیں، اس عہد میں جبکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز ترقی ہونے سے اور سائنس کی عجیب و غریب معلومات و ایجادات کے سبب زمانی اور مکانی بعد بہت کم ہو گیا ہے، دقتوں اور قوموں کی تہذیبوں اور تمدنوں میں تصادم ناگزیر تھا۔ شروع شروع میں یہ اختلاف ہمت شکن ضرور محسوس ہو سکتا ہے لیکن بغور دیکھنے سے یہی تمدن اور ادب کے لئے شاندار مستقبل کا پیش خیمہ نظر آئے گا۔ میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold) نے انیسویں صدی کے نصف ثانی میں کہا تھا کہ "ہماری دُنیا ایک نئے تمدن کی ولادت کا درد محسوس کر رہی ہے"! اگر اس زمانہ کے لئے یہ خیال صحیح تھا تو ہم آج بے خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ درمیانی زمانہ نے بیحد مصیبتیں برداشت کر کے اُس نوزائیدہ بچّہ کو پروان چڑھا دیا ہے ــــ یہاں تک کہ اب اس کے ذہنی ارتقا اور بلوغ کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں ہے۔

ہماری دیکھتی آنکھوں بڑی تیزی کے ساتھ کچھ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں اور کچھ فنا۔ سماج کے مٹتے ہوئے رجحانات میں سب سے زیادہ اہم اقلیت کا تمدن ہے، پروہتی سامنتی اور مہاجنی کالوں میں مخصوص طبقوں کو رائے عامہ کے متاثر کرنے کا پورا پورا موقع رہا ہے۔ حکومت اور اخلاق کی مدد سے انھوں نے ہر ممکن مادی اور روحانی حربے کا استعمال کر کے عوام کو مغلوب اور اپنے مفاد کو محفوظ رکھا ہے، اصولی حیثیت سے افراد کو دولت، اور طاقت جمع کرنے، ضرورت مندوں کو دست نگر رکھنے کا حق رہا ہے سرمایہ کی تقسیم میں تناسب اور ہم آہنگی قائم رکھنے کیلئے بخشش اور مفلس نوازی کی تلقین ہوس پرستی کی راہ میں کسی وقت مفید عملی

رکاوٹیں ثابت نہ ہوسکیں، ان افسانوں نے دُنیا کے سامنے کوئی بڑا کارنامہ پیش کیا بھی تو محض یہ کہ قسمت اور اتفاق کے خواب دیکھنے والی جنتا، اور وقتی خرابیوں سے فائدہ اُٹھانے والے برسرِ اقتدار طبقے کے معیار زندگی کے درمیان فرق بڑھتے بڑھتے ایسی خلا پیدا ہو گئی کہ ڈزرائلی (Disraeli) کے مرغوب تصوّر کے مطابق ہر ملک کی آبادی "دو مختلف قوموں" میں منقسم ہو گئی۔ اس سے معاشرتی گتھیاں زیادہ سے زیادہ اُلجھتی چلی گئیں!

طمع کیشی، عقلی ردِّ عمل اور بین الاقوامی معاملات اب منتہا پر پہنچ چکے ہیں، پیداوار میں حصّہ لینے والے عوام منظم ہو کر روز افزوں قوت بنتے جا رہے ہیں جس سے غالب اقلیتوں کے پیچ ڈھیلے پڑ گئے دُنیا کی جنتا مصروفِ پیکار حکومتوں سے مقاصدِ جنگ کے صاف صاف اظہار کا مطالبہ کر رہی ہے، فردوں کے حقوق و فرائض متعین کرنے کے لئے طرح طرح سے رائے زنی کی جا رہی ہے، ویلس (H. G. Wells) کی مشہور کتابیں "انسان کے حقوق" (Rights of Man) اور "نیا نظام عالم" (The New World Order) اور اسٹریچی (J. Strachey) کی تصنیف "ترقی کیلئے ایک دستور العمل" (A Programme of Progress) ہندوستان کے انگریزی داں طبقہ سے بہت اچھی طرح روشناس ہیں۔

رایوں کی اس کثرت، جانچ پڑتال اور قطع و برید کا مقصد بالکل صاف نظر آتا ہے، مجموعی حیثیت سے آج دُنیا مفلوک الحال انسانیت کے لئے، یا یوں کہئے کہ بیدار شدہ روحِ جمہور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ دیرپا امن کے وسائل سوچنے اور دستور العمل تیار کرنے میں مصروف ہے۔

جدید علم کی روشنی میں بے شمار ٹھوس سچائیاں بے مغز ثابت ہو گئیں۔ لہٰذا "حق و باطل" اور "خیر و شر" کے وہ تصورات اور

قدریں (Values) جو ایک زمانہ سے معیاری حیثیت رکھتی تھیں اس دور میں کس طرح اپنی پرانی اہمیت کو برقرار نہیں رکھ سکتیں جن نظریوں کو "فطرت انسانی" کہکر ہمہ گیر حقیقتوں کے نام سے مروج کیا جاتا تھا، وہ زیادہ تر یا تو صرف کمزور حسیات (weak instincts) تھے، جنھوں نے تاریخ کے بنانے میں بہت کم حصہ لیا، اور یا مقامی رنگ سے آلودہ نفسیات (local psychology) اب جبکہ ادیب کی نظر زمانوں اور ملکوں کی حدود سے گزر کر زیادہ وسیع کینوس (Canvas) پر پڑتی ہے تو وہ انسانی محرکات کے بدلے ہوئے تصورات کو پیش کرنے پر مجبور ہے یا اُن ذہنیات (mentalities) کو حقیقت پارے (Part - Truths) شمار کرنے پر۔ عہدِ حاضر کے ادب پر یہ امر کئی طرح اثر ڈالتا ہے، ہم شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہماری روزانہ زندگی میں اقتصادی ضروریات کو نظر انداز کرنے سے مشکلات دور ہونا کسی طرح ممکن نہیں بلکہ ضرورت زیادہ صحیح توازن قائم کرنے کی ہے۔ "مادیت" کی یہ لہر جسے اخلاق کی روح رواں سمجھنا چاہیئے، سماج کی رگ و پے میں سرایت کرتی جارہی ہے۔ اس وقت انسان کے ذہن کو مابعد الطبعی نکتہ آفرینیوں (metaphysical superficialities) کے لئے بہت کم فرصت ہے، وہ اس زمانہ میں دور از کار مضمونوں پر "قیاس آرائیوں" میں کوئی خاص "انسانی مفاد" بھی نہیں دیکھتا یہی وجہ ہے کہ آج ادب سے ایسے مباحث اور معاشرتی تحریروں سے نقلی دلیلیں یک قلم خارج ہوچکی ہیں۔

اب ادب زندگی سے زیادہ قریب آنے کی کوشش کر رہا ہے معمولی زندگی کے تجربات، رنج و راحت، اونچ نیچ، کمزوری اور مضبوطی اس کے دلچسپ موزوں ہیں، وہ حیات کی تلخ اصلیتوں کو "زلف و نظر" یا "ساقی و ساغر" کے رنگین افسانے کہکر بھلانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ان کی گہرائیوں میں جاکر حل تلاش کرنا چاہتا ہے، اُسے عجیب و غریب کرداروں اور نصب العین شخصیتوں میں اتنی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے کہ اوسط انسان قعرِ مذلت میں افتادہ نظر آئے، ماحول کی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں، جن کو صدیوں کی وہم پرستیوں اور تمدنوں کی گوناگوں پیچیدگیوں نے نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے اور جو زندگی پر طرح طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں، اس کی توجہ اور دلبستگی کے لئے کافی ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ موجودہ ادب رومان اور مذاقِ سلیم کے خلاف بدمزگی اور کور ذوقی کی چٹانیں کھڑی کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس کے خلاف وہ ثقافت (Culture) کو عوام تک پہنچا کر اور جنتا کو رومان اور فن سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنا کر، ان گنت نسلوں کے بے بہا اندوختے پر بقا کی مہر ثبت کرنا چاہتا ہے۔ البتہ تمدن اور فن کے وہ امتیازات جن کی جڑیں سطحِ ماحول میں الجھ کر نشوونما (growth) کی صلاحیت کھو بیٹھیں ضرور اس "خطرے" سے خالی نہیں۔

انفرادیت کا زمانہ ختم ہوچکا اب انسانیت کو محکوم رکھنے اور کچلنے کے خواہشمند طبقے پوری طرح منظم و مسلح ہوچکے ہیں، اس لئے ان کے خلاف انفرادی حیثیت سے آواز بلند کرنا "صدا بصحرا" سے ہرگز زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، اجتماعیت اور تنظیم کا میلان ادب میں کئی طرح رونما ہو رہا ہے، جس سے مظاہرۂ قوت مبارزت (challenge) اور خطابیت کی اسپرٹ پیدا ہوتی ہے، خاص خاص ادارے اور اشاعت کے مراکز مخصوص مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے نشر و اشاعت کے کام میں سرگرم ہیں، ہمارے تمام ادب کی رگوں میں کہیں نہ کہیں غرض (purpose) کے خون کی تیز رفتاری بہ آسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی نے ہم میں معاملاتی ذہنیت کو فروغ دیکر ہمارے ادب کے خمیر سے تفریحی عناصر (aesthetic elements) کم کرد‌ئے ہیں۔ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے بیشک سائنس نے اس تفریحیت کو فنا کر دیا جس کا تخاطب بے بنیاد تصورات کی پیدا کردہ عارضی نفسیات سے تھا اور جن سے ہم اپنے مخصوص ذہنیات کے سبب خواہ مخواہ لطف اندوز ہونے کے عادی ہوگئے تھے، سائنس نے جتنی تفریح فنا کی اُس سے کہیں زیادہ پیدا کردی ہے، شاید تفریحیت کے کم ہونے کی زیادہ سمجھ میں آنے والی وجہ بحرانی دور (transitional age) کی بے اطمینانی اور وقت کی عارضی ہنگامی فضا ہے اور جس سے گزرنا شاید ان حالات میں ناگزیر بھی ہے، سکون کے ساتھ ساتھ ادب میں یہ عنصر بھی برابر بڑھتا رہے گا۔

لگے ہاتھوں ادبی آماج (Range) کا ذکر کردینا بھی بے موقع نہ ہوگا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری اکثر قیمتی تصنیفات چند ہی سال میں اپنی تر و تازگی کھو بیٹھتی ہیں، یہ خیال اس لئے اور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے کہ گزرے ہوئے ادیب اپنی تصنیفات

(بقیہ مضمون دیکھئے صفحہ ۶۵ پر)

نیا راگ

جوشؔ ملیح آبادی

اِک جانِ بہا کی سرکار میں

اے بُرِخ مصحفِ گلزار و چراغِ حرمِ غنچگی و آیۂ گلباریؐ و قرآنِ بہار
اے بہ قد موجِ رواں، برقِ تپاں، سروِ سہی، شاخِ گُلِ تازہ و الہامِ خرامانِ بہار
پۓ گلگشت ذرا، اس قدِ بالائے فلک تاب و چمن ساز کو دے اذنِ خرام
کہ ترے ہجر میں بے کیف ہے، بے روح ہے، بے تاب ہے، بے خواب ہے، لیلائے گلستانِ بہار
بزم کی بزم ہے پژمردہ و افسردہ و دل بستہ و خاموش و ملول و غم ناک
کھول دے کاکلِ ژولیدہ و شب رنگ و جہاں صید و گہر بیز کہ ہے چشمۂ حیوانِ بہار
آبھی جنبش میں کہ ہیں گوش برآواز دیبان و حریفان و گل و لالہ و سرو!
اے لبِ لعلِ فسوں یار و دل آویز و شکر ریز کہ ہے تجھ پہ فدا لرزشِ دامانِ بہار
بربط و عود و شراب و دف و افسانہ و افسون و شب و ماہ و رباب و ساغر
آ کہ مشتاق ہیں اے جانِ چمن، زہرہ جبیں، ہوش رُبا، ماہ لقا، شمعِ شبستانِ بہار
دہر ہے خفتہ و آشفتہ و آزردہ و غم دیدہ و ناشاد و زبوں حال و تباہ
ہاں اُٹھا، نرگسِ مخمور گہر تاب و جنوں خیز کہ ہے محبسِ میخانہ و زندانِ بہار
آج ہے حافظِ شیرازی و خیّام و نظیری و فغانی و ظہوری کا جواب
یہ ترا جوشؔ کہ ہے مست و خراباتی و سر حلقۂ رندانِ جہاں قبلۂ خاصانِ بہار

ایشیا، نومبر ۱۹۴۲ء

نواب جعفر علی خاں اثر بی اے لکھنوی

غزل

بے کس کی طرف غصہ کی نظر، انساں کا دل تھا ٹوٹ گیا
جس ہاتھ میں دامن تھا، کانپا، اور ہاتھ سے دامن چھوٹ گیا

روداد محبت کیا کہیے، اک درد بھرا افسانہ ہے
پہلو میں نہ تھا دل، چھالا تھا، ابھرا، ٹپکا، پھوٹ گیا

دریا ہوں مگر ایسا دریا جو بحر کے نزدیک آپہنچا
وہ جوش و روانی ختم ہوئی، ہر شغل و علاقہ چھوٹ گیا

الفت کی نرالی رسمیں ہیں، دل ایک نظر میں ان کا تھا
شکووں کے عوض تھا شکر جفا، کس وقت میں پیچھا چھوٹ گیا

چھاتی جو نہ کوٹو اس پر بھی یہ حال دھڑکتے دل کا ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ اثرؔ جیسے کوئی چھاتی کوٹ گیا

جمیل مظہری ایم اے

احساس و پیام

پھنکتا ہے صور قیامت کا اُٹھی ہے بیدر مانے کی
باجوں کے شور میں دھرتی کی چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں
تلواریں میان سے باہر ہیں فطرت انسان کی ننگی ہے
بادل کی گرج بجلی کی چمک تلواروں کی جھنکاریں بھی
دُکھیا ماؤں کے نالے بھی بھوکے بچّوں کا شیون بھی
اک آگ لگی ہے دُنیا میں گرد اُڑتی ہے لُو چلتی ہے
اب وقت نہیں ہے سونے کا اے غفلت کے پالے اُٹھو
جس آگ کی لپٹوں نے بڑھ کر تہذیب کا دامن پکڑا ہے
اُس آگ کے شعلے تھام چکے بھارت ماتا کے آنچل کو
اے مردِ بصیرت کھول آنکھیں سب جاگ چکے تو سوتا ہے،
یہ عالمِ کیف و کم یعنی یہ سود و زیاں کی آبادی
سورج کا مُنہ کچھ اُترا ہے، فطرت کا دل کچھ بھاری ہے،
کچھ بھیگی بھیگی رہتی ہیں پیچھے سے ہوائیں صحرا کی
پھر شمع تمدّن نزع میں ہے بیمار کو ہچکی آتی ہے
اخلاق عمل کی تفسیریں افسونِ لبِ عیّاری سے
تھریں اللہ کی نعمت پر پہرے ذوقِ آزادی پر
صد چاک ہوس کے ہاتھوں سے روحانیت کا جامہ ہے
اس آگ کو گُل کرنے کیلئے رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم
ایک ایسا عزم دکھانا ہے تہذیب کے اس گہوارے کو
وہ عزم مزاج آہن خود جسکے سانچوں میں ڈھلتا ہے

مغرب سے صدائیں آتی ہیں جنگی باجوں کے ترانے کی
کرتوت پہ بیٹوں کی مائیں جس طرح دُہائی دیتی ہیں
اک گونج میں سو آوازیں ہیں آوازیں ہم آہنگی ہے
مجروحوں کی فریادیں بھی رن بیروں کی للکاریں بھی
ان ہنگاموں میں تیز ہے کچھ تہذیب کے دل کی دھڑکن بھی
مغرب سے لیکر مشرق تک آدم کی کھیتی جلتی ہے
اے ہند کے فرزندو اُٹھو، اے نیند کے متوالو اُٹھو
اخلاق کے خرمن پھونکے ہیں فطرت کا کلیجہ جھلسا ہے،
امید کی نظریں ڈھونڈتی ہیں رحمت کے برستے بادل کو
اُٹھ دیکھ تو تیری دُنیا میں کیا ہونا تھا کیا ہوتا ہے
یوں ماتم دوش و فردا ہے جس طرح خزاں کی آبادی
اندر کی خدائی میں ہر سو فرمانِ سیاہی جاری ہے
رحمت کا فرشتہ روتا ہے قسمت پہ ہماری دُنیا کی
یہ شمع نہیں انسانیت کی روح پگھلتی جاتی ہے
سو خواب کا عالم پیدا ہے ہنگامئہ بیداری سے
شیطان حکومت کرتا ہے انسانوں کی آبادی پہ
اک شورش ہے، اک ہلچل ہے، اک لوٹ ہے، اک ہنگامہ ہے
رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم، شاعر کی دعا بن جاؤ تم
جو موڑ دے اپنی طاقت سے سیلاب کے سرکش دھارے کو
وہ عزم کہ جس کی گرمی سے تلوار کا لوہا گلتا ہے

سلام مچھلی شہری

یہ ہوتا ہی رہیگا!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
دُنیا اک انگڑائی لے گی
چاند ستارے ٹوٹ پڑیں گے
آتش پارے ٹوٹ پڑیں گے!
انگاروں کی بزم سجے گی
جلتی سانسیں رقص کریں گی
مُردہ روحیں رنگ بھریں گی!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
نازک اور شرمیلی سڑکیں
زخمی، کوڑھی ہو جائیں گی
انسانوں سے گھبرائیں گی
ہم ان پر چلتے ہی رہیں گے
یہ گُل بوٹا بن جائیں گی
پھر اک شعلہ بن جائیں گی!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
پانی میں دوزخ گائے گا
لہریں سازِ بداماں ہوں گی
عرش کی پریاں رقصاں ہونگی!
سُرخ سمندر ٹھنڈا ہوگا
لہریں مدّھم ہو جائیں گی
زہرہ و پرویں سو جائیں گی!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہیگا!
اوپر طیّارے گرجیں گے
نیچے سُکھ کا گیت چھڑے گا
ہلکا ہلکا ساز بجے گا!
ساز کے تار بھی جل جائیں گے
گیت دھواں بن اُڑ جائے گا
ساز فضا میں تھرّائے گا

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا !
زرّیں کتبے اور مینارے
آگ کے شعلوں میں کانپیں گے
باپ کے سائے میں ہانپیں گے!
پھر کچھ پرچم لہرائیں گے
پھر کوئی تاریخ لکھیں گے
اپنی اپنی طرح پڑھیں گے!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!!
دُنیا اک انگڑائی لے گی
چاند ستارے ٹوٹ پڑیں گے
آتش پارے ٹوٹ پڑیں گے!
تم ان تاروں کے جھرمٹ سے
میرا ساز اُٹھا لاؤ گی
کوشش کر کے کچھ گاؤ گی!
اپنے ہی گیتوں سے تمہاری
آنکھیں رنگین ہو جائیں گی
پھر کچھ غمگین ہو جائیں گی!
تم یہ کہو گی آج تو خوش ہوں
دل یہ کہے گا روتی کیوں ہو
اپنی خوشی میں کھوتی کیوں ہو!!؟

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!!
جبتک دُنیا تھک نہ چکے گی
چاند ستارے مر نہ چکیں گے
یہ نظارے مر نہ چکیں گے!
دھندلی اور بے جان زمیں سے
جبتک ایک نیا سیارہ
پھر نہ حسیں بن کر اُبھرے گا

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!!
دُنیا اک انگڑائی لے گی!!!

ساغر نظامی

بے نام تقاضہ

میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

عید کے روز امیدوں کا جہاں ہے روشن
یہ جہاں ہاں یہ اندھیروں کا مکاں ہے روشن

جانے کس نورِ سے پنہاں و عیاں ہے روشن
آج کیوں میرا سیہ خانۂ جاں ہے روشن

مدتوں سے یہ دیا میں نے جلایا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

آئی بے روح مسرات میں لپٹی ہوئی عید
لاکھ فرسودہ حجابات میں لپٹی ہوئی عید

زیرِ لب نغمہ چکاں، رات میں لپٹی ہوئی عید
مسکراتی ہے روایات میں لپٹی ہوئی عید

دین کیا آج تو اندازۂ دنیا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

پھر بھی طوفان سا اٹھتا ہے مرے سینے میں
کوئی رہ رہ کے مچلتا ہے مرے سینے میں

تند شعلہ سا بھڑکتا ہے مرے سینے میں
ایک مبہم سا تقاضہ ہے مرے سینے میں

اور یہ طوفان محبت نے اٹھایا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

زندگی مقتلِ آدم ہے، جہاں بحرِ لہو
شہر کے شہر ہیں اجاڑ، اور چمن بے خوشبو

ارتقا شام و سحر خون سے کرتا ہے وضو
اسی عالم میں لنڈھاتا ہے کوئی جام و سبو

اور یہ ساقی کسی جانب نظر آتا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

پھر بھی کچھ نقش مرے ذہن میں ہیں مبہم سے
بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں کئی عالم سے

یوں میں انجان ہوں اس جذبۂ بیش و کم سے
جیسے مطرب سے رباب اور زباں سرگم سے

ء جب قوموں میں [illegible] تو الفاظ کی دنیا میں اس رسم کو کیوں نہ رائج کیا جائے جو میرے نزدیک صرف اسی میں اسقدر [illegible]

یہ حقیقت بھی نہیں ہے کوئی دھوکا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

اس طرح بنتے ہیں اک جال سا رومان و شباب
جیسے تخئیل کی اٹھتی ہوئی موجوں کے حباب
جیسے تخلیق سی کرتی ہوئی دنیائے سراب
جس طرح ترکی و ایران کے شبستانوں کے خواب
ہجر ان کا مری آنکھوں کو گوارا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

دل ہے اِک مبہم و ژولیدہ تصوّر کا شکار
روح ہے کشمکش جذبۂ پنہاں کا دیار
میرے نغمے ہیں کہ نابینا مغنّی کی پکار
میرا احساس بصارت ہے جہانِ اسرار
لاکھ پردے ہیں، مگر ظلم کا پردہ بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

ساحروں کے سے عجب سحر جگاتا ہے کوئی
نشّے کے جال رگ و پے میں بچھاتا ہے کوئی
گر جو جاتا ہوں تنفّس سے اٹھاتا ہے کوئی
میکدہ سا مرے دل میں لئے آتا ہے کوئی
اور ابھی تک مجھے اندازۂ صہبا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

میری فطرت ہے توہّم مرا جینا ابہام
واہموں کو میں سُناتا ہوں حقیقت کے کلام
ڈھالتا ہوں میں تصوّر میں ہزاروں اصنام
دل ہی دل میں تمہیں دیتا ہوں کسی شے کے پیام
سوچتا ہوں کہ یہ عالم کوئی سپنا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

ایک بپھرا ہوا طوفان ہے حیاتِ آدم
آ کہ بپھرے ہوئے طوفان میں کود یں باہم
جس طرح دورِ زمانہ ہے مسافر ہر دم
میرا جذبہ بھی ہے بہتا ہوا اک موجۂ یم
جانتا ہوں کہ قرار اس کا تقاضہ بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

پھر بھی یہ نذرِ محقّر تمہیں منظور ہے کیا
دل کا چھلکا ہوا ساغر تمہیں منظور ہے کیا
جذبۂ وحشتِ یکسر تمہیں منظور ہے کیا
میرے نغموں کا گُلِ تر تمہیں منظور ہے کیا
شوق کا تحفۂ احقر تمہیں منظور ہے کیا؟!

ایشیا۔ نومبر ۱۹۴۲ء

نئی کہانی

اسٹیفن لیکاک و مسعود چشتی

مستقبل کی ایک تمثیل

(اسٹیفن لیکاک کا ایک (Fantasia) خیالی منصوبہ)

یہ بات غیر مناسب معلوم ہوئی کہ بعض مصنف چار سو یا پانچ سو برس کی گہری نیند سوتے رہیں اور پھر مستقبل بعید میں اٹھ کر اس وقت کے عجوبات کا مشاہدہ کریں۔ میں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔

میں تمدنی مسائل کا بغور مطالعہ کرتا ہوں۔ جدید دُنیا معہ اپنی شور یدہ مشینوں، مزدوروں کی ان تھک محنت اور ان کے روزانہ کے جھگڑوں، غربت اور مظالم کا جب میں غائر مطالعہ کرتا ہوں تو بیحد متاثر ہوتا ہوں۔ مجھے اُس زمانہ کے دیکھنے کا بیحد اشتیاق ہے جب انسان نیچر کو فتح کر لے گا اور مصیبت زدہ تھکی ہوئی انسانی ہستیاں عدم کی دُنیا میں قدم رکھیں گی۔ پس میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔

میری خواہش یہ تھی کہ موجودہ فیشن کے مطابق میں کم سے کم تین یا چار سو برس کے لئے سو جاؤں اور پھر جاگنے پر مستقبل کی دُنیا کے عجائبات کو دیکھوں۔

میں نے سونے کی تیاری شروع کر دی

میں نے ہر قسم کے ظریفانہ و مصوّر رسالوں کو حاصل کیا اور انہیں اپنے ہوٹل کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اپنے ساتھ سور کا گوشت اور بہت سی کھانے کی چیزیں رکھ لی تھیں۔ گوشت اور دوسری چیزیں کھا لینے کے بعد بستر پر بیٹھ کر یکے بادیگرے رسالوں کا مطالعہ شروع کیا۔ ظریفانہ رسالوں کے پڑھنے کے دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر کچھ نہ کچھ کھایا کرتا۔ بالآخر جب میرے اوپر نیند کا بیحد غلبہ ہوا تو میں نے "لندن ٹائمز" کو ٹٹول کر اُٹھایا اور اسکے "اداریہ" کو اپنی نظر کے سامنے رکھا۔

ایک طریقے سے یہ خودکشی تھی لیکن پھر بھی میں باز نہ آیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے ہوش و حواس جواب دے رہے ہیں۔ ہمارے ہال کے سامنے والے کمرے میں ایک شخص سریلی آواز میں گا رہا تھا۔ اُسکی آواز جو ابتداءً بہت تیز تھی، لمحہ بہ لمحہ میرے کانوں میں مدھم ہوتی گئی۔

آخر میں ایک گہری اور لامتناہی نیند کے آغوش میں تھا خارجی دُنیا سے بے تعلق، موہوم طریقہ پر دن، مہینے، سال گزرتے گئے، صدیاں گزر گئیں، جس کا ایک مبہم نقش میرے ذہن میں اب بھی ہے۔

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے بتدریج نہیں بلکہ یکایک میں اُٹھ بیٹھا اور چاروں طرف حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔

میں کہاں تھا؟ میں خود سے سوال کر رہا تھا،

میں نے اپنے کو ایک بڑے صوفے پر بیٹھا پایا۔ کمرہ نہایت وسیع، دُھندلا، تاریک اور بظاہر اُجاڑ نظر آتا تھا۔ جو شیشے کی الماریوں اور دیگر محفوظ رکھی ہوئی چیزوں سے عجائب خانہ معلوم ہوتا تھا۔

میری بغل میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اس کے چہرے پر بال مطلق نہ تھے وہ نہ تو بہت بوڑھا تھا نہ بالکل جوان۔ اُس نے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے جو پیلے کاغذ سے مشابہ تھے جیسے وہ جل کر کپڑے کی صورت میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہ شخص خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن اُسکے چہرے پر حیرت یا دلچسپی کے کوئی آثار نہ تھے۔

"میں نے فوراً بے چینی میں اُس سے پوچھا" "میں کہاں ہوں"؟ تم کون ہو؟ یہ کون سال ہے؟ کیا یہ [illegible]

سال ہے؟ یا پھر آخر یہ کیا ہے؟

اس نے غصے کی حالت میں ایک لمبا سانس لیا۔

"تمہاری گفتگو کا انداز کتنا عجیب اور مضحکہ خیز ہے" اُس نے جواب دیا۔

مجھے بتاؤ کہ یہ تین ہزار والا سال ہے؟ میں نے پھر کہا۔

"میں تمہارے مفہوم کو خوب سمجھ رہا ہوں" اُس نے کہا "لیکن فی الحقیقت مجھے خود کوئی اندازہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں .....۳۰ کے سو برس ادھر یا اُدھر ہوگا۔ چونکہ عرصہ دراز سے ہم لوگوں نے تاریخ اور سال کا شمار ترک کر دیا ہے اس لئے اب ان کا شمار ناممکن ہے۔"

"کیا واقعی تم لوگ ماہ و سال کا شمار اسی وجہ سے نہیں کرتے" میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"کسی زمانے میں ہم لوگ بھی ماہ و سال کا شمار رکھتے تھے" وہ شخص بولا "مجھے خوب یاد ہے کہ سو یا دو سو سال ہوئے اس وقت کچھ لوگ موجود تھے جو تاریخوں اور سالوں کو گنتے تھے لیکن ایک زمانہ گزرا کہ یہ اور اس قسم کی بہت سی فرسودہ چیزیں مفقود ہو گئیں" اُس نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اور پھر اس کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ ہم لوگوں نے "موت" ہی کو ختم کر دیا"

"ہائیں! کیا تم نے موت کو ختم کر دیا؟ یا اللہ!" میں حیرت و استعجاب میں سیدھا اُٹھ بیٹھا۔ "تم نے کونسا لفظ ابھی ابھی استعمال کیا" اُس نے دریافت کیا۔

"یا خدا" میں نے دُہرایا۔

وہ شخص فوراً بولا "میں نے کبھی یہ فقرہ نہیں سُنا۔ ہاں میں کہہ رہا تھا کہ جب ہم لوگوں نے موت، 'غذا' اور تلون کو مفقود کر دیا پھر حالات و واقعات سے بھی یک قلم چھٹکارا مل گیا۔"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں نے کہا "میرے سوالوں کا باری باری جواب دو" اُس نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا "اچھا! اب مجھے معلوم ہوا۔ تم شاید بہت دیر تک سوتے رہے ہو۔ ہاں اب سوالات کرو! لیکن کم سے کم سوالات کرو۔ اور اس بات کی احتیاط رکھو کہ پریشانی یا مزید دلچسپی کے آثار تمہارے چہرے پر نمایاں ہوں۔"

اتفاق سے پہلا سوال جو میری زبان پر آیا وہ یہ تھا۔

یہ تمہارے کپڑے کس چیز کے بنے ہیں۔

اُس نے جواب دیا "یہ سینکڑوں سال تک کام دیتے ہیں ہر شخص کے پاس ایک سوٹ رہتا ہے اور پھر ایسے کروڑوں جوڑے سوٹ استعمال کیلئے پڑے ہوتے ہیں۔"

"شکریہ" میں نے کہا "ہاں یہ تو بتائیے میں کہاں ہوں؟"

"تم ایک عجائب گھر میں ہو۔ ان الماریوں میں تمہارے ہی جیسے چند نمونے رکھے ہوئے ہیں اگر تم اس وقت کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہو تو یہاں سے اُٹھو اور بڑی سڑک پر آ کر بینچ پر بیٹھ کر نظارہ کرو۔"

میں اُٹھ بیٹھا

میں اندھیری اور غبار آلود عمارت سے گزر رہا تھا اور الماریوں کے اندر جو مجسمے تھے اُن کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

ہاں! یہ شخص جو نیلی وردی پہنے ہوئے اور پیٹی لگائے ہوئے ہے ایک سپاہی ہے۔

میرا نیا ملاقاتی بول اُٹھا "کیا سپاہی اسی قسم کے ہوا کرتے تھے! وہ کس کام پر مامور ہوتے تھے؟"

"مامور" میں نے سخت پریشان ہو کر کہا "یہ سڑک کے ایک کنارے پر کھڑے رہتے تھے۔"

"تاکہ وہاں سے آدمیوں کو گولی مار سکیں۔ میری لاعلمی کو معاف کرنا" اجنبی نے کہا "حصولِ تعلیم کے دوران میں میں نے تاریخ تمدن کے لئے ایک آپریشن لیا، لیکن آپریشن میں گھٹیا دوائیں استعمال کی گئیں۔"

میں اجنبی کی باتوں کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ لیکن اُس وقت مزید سوالات کا موقع نہ تھا کیونکہ فوراً ہم لوگ ایک کشادہ سڑک پر آ نکلے۔ جہاں میں حیرت زدہ ہر چیز کو گھورا تک رہا تھا۔ کشادہ سڑک! کیا ممکن تھا! حیرت انگیز تبدیلیاں! سڑکوں کی چہل پہل کے بجائے اب ہر طرف سنسان اور ویرانی ہے۔ فلک بوس محلات صدیوں ..... کے بعد ویران اور مسمار ہو گئے ہیں۔ دیواروں پر کائی کی موٹی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ فضا بالکل خاموش تھی۔ سڑک سے ایک سواری بھی نہیں گزرتی تھی۔ سر کے اوپر تار بھی نہ تھے۔ زندگی یا قدموں کی چاپ بھی نہ سُنائی دیتی تھی۔ صرف چند انسانی مجسمے الیسٹاس کے کپڑے زیب تن کئے ہوئے آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر ٹہلتے نظر آ رہے تھے۔ چہروں سے حیات جاودانی نمایاں تھی۔

یا اللہ! کیا فتح کا یہی دور ہے جس کا میں اس قدر مشتاق
تھا! میرا یہ عقیدہ تھا کہ انسان ترقی کے منازل طے کرتا جا رہا ہے
اور ایک دن وہ اسکی ضرور تکمیل کریگا۔ لیکن تہذیب کی اس ویرانی
کو دیکھ کر میں سکتہ میں رہ گیا۔

سڑک پر تھوڑی دُور کے فاصلہ پر بنچیں پڑی
تھیں۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

"تہذیب میں کس قدر ترقی ہو گئی ہے" میرے اجنبی دوست
نے کس قدر فخر کے ساتھ بیان کیا۔ میں نے بدقت تمام ایک سوال
کیا۔

"موٹر اور کار کہاں ہیں؟" "او، وہ تو عرصہ ہوا نیست و
نابود ہو گئیں۔ اس نے جواب دیا" اور یہ چیزیں کتنی تکلیف دہ
تھیں، کس قدر تکلیف دہ تھیں، کس قدر شور آگیں!

"لیکن لوگ کیونکر ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے ہیں؟"

"آنا جانا بند" اُس نے تیزی سے جواب دیا" اور پھر سفر
کی ضرورت کیا ہے۔ یہاں رہنا ویسا ہی ہے جیسا دوسری جگہ۔"
اس وقت وہ تیز نظروں سے میرے چہرے کو گھور رہا تھا۔

دماغ میں سیکڑوں طرح کے سوالات پیدا ہوتے تھے
لیکن میں نے ایک نہایت سادہ سوال کیا۔ "لیکن لوگ اپنے
کاموں پر کیسے آتے جاتے ہیں؟"

"کام" اُس نے لرزتے ہوئے کہا "اب کوئی کام
نہیں رہا۔ سب ختم ہو گیا۔ اور آخری کام تو شاید صدیوں گزرے
ختم ہو گیا۔"

میرا مُنہ کھلا رہ گیا۔ میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر میری
نظر یکایک اُن افراد پر پڑی جو ایسے لباس میں ملبوس سڑکوں پر چل
پھر رہے تھے۔

میں نے اپنے حواس کو یکجا کیا۔ میں نے خیال کیا کہ اس
مستقبل کی تفصیل کا مطالعہ بتدریج و مسلسل کرنا چاہئے۔

. . . .

"اب میں سمجھا" میں نے قدرے وقفے کے بعد کہا "ہمارے
وقت سے عظیم الشان تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔ میری خواہش ہے
کہ تم مجھے چند سوالات کرنے کی اجازت دو" اور پھر باری باری تم
مجھے اسکے جوابات دو، "ہاں اس سے کیا مراد کہ تمہارے پاس
اب کوئی کام نہیں ہے؟"

"کیوں" میرے ساتھی نے جواب دیا "کام خود بخود ختم
ہو گیا۔ مشین نے اُسے ختم کر دیا۔ اگر میری یادداشت درست ہے
تو شاید تمہارے وقت میں بھی کچھ مشینیں تھیں تم نے بھاپ اور
بجلی سے بڑے بڑے کام لئے اگرچہ میرے خیال میں ریڈیائی قوت
سے زیادہ کام نہیں لیا گیا۔

میں نے سر ہلایا۔

"لیکن یہ تمہارے لئے مفید ثابت نہ ہوئی۔ جتنی زیادہ عمدہ
مشینیں استعمال ہوتیں اتنا ہی زیادہ سخت جانفشانی سے کام کرنا
ضروری ہوتا۔ چیزوں کی زیادتی سے تمہاری ضروریات بھی بڑھتی
گئیں۔ زندگی کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ تم چلایا کرتے لیکن رکنے
کا نام نہ لیتی۔ تم سب اپنے مشینوں کے چنگل میں پھنس کر رہ گئے
کسی نے انجام کو نہ سوچا۔"

"یہ بالکل درست ہے" میں نے کہا "تم نے یہ تمام باتیں
کیونکر معلوم کیں؟"

"او" اُس نے جواب دیا "میری تعلیم کے اُس حصہ کا
بہت کامیاب آپریشن ہوا تھا، اچھا! شاید تم میری ان باتوں
کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ خیر میں تمہیں آگے چل کر یہ
تمام باتیں بتاؤں گا۔ تمہارے دور کے دو سو برس کے بعد
ایک نیا دور آیا۔ یعنی نیچر پر فتح کا زمانہ جس میں انسان نے
قدرت اور مشین کے ذریعہ نیچر پر یہ پوری قدرت حاصل کر لی۔"

"کیا واقعی انہوں نے قدرت کو زیر کر لیا؟" میں نے اپنے
زمانے کے حالات کو سوچتے ہوئے پوچھا،

"فتح کر لیا" اس نے کہا۔ "آخیر تک جنگ کر کے زیر کر لیا۔
کام بتدریج ہوتا ہے پھر جلد جلد حاصل ہونے لگتا ہے تقریباً
سو برس میں سب کچھ ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب انسان نے اپنی قوت کو زیادہ کرنے کے
بجائے کم کرنے میں صرف کیا تو تمام باتیں آسان ہو گئیں۔
پہلے کیمیائی غذا [illegible] اس کھانے پر
کتنی سادگی ہے! تمہارے زمانے میں کروڑوں آدمی دن رات
کھیتوں میں محنت کرتے۔ یہ صرف کھانے کے لئے۔ اسکے نمونے
اب بھی عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ شاید انہیں کسان کہتے
تھے۔ ایک کسان کا مجسمہ اب بھی عجائب گھر میں رکھا ہوا

کیمیائی غذا [illegible] کے ایجاد ہونے کے بعد
ہزاروں سال کیلئے ایک ہی سال میں کھانا تیار کرلیا۔ زراعت
بالکل ختم ہوگئی۔ محنت مزدوری۔ گھر کا کام کاج سب کچھ اُٹھ گیا۔
آج کل صرف ایک گولی کھاتے ہیں جو سال بھر کیلئے کافی ہوتی ہے۔
غذا مہیا کرنے کے تمام آلات جو ہمارے زمانے میں تھے
بہت بھدّے تھے جو عدم استعمال کے باعث مثل ہوائی بان کے
غائب ہوگئے۔

مجھے مداخلت کی جرأت نہ ہوئی۔ پھر بھی میں بول اُٹھا
"کیا تم لوگوں کے پاس پیٹ اور معدہ نہیں ہے"
اُس نے جواب دیا "ضرور ہم لوگوں کے پاس پیٹ و معدہ
ہے۔ لیکن انہیں اب دوسرے امور کے لئے استعمال کرتے ہیں
ہمارا پیٹ اس وقت صرف تعلیم سے پُر ہے۔ میں پھر بھٹک گیا
میں جس طور سے بیان کررہا تھا۔ مجھے بیان کرنے دو۔
کیمیائی غذا . . . . کے ایجاد سے ایک
تہائی کام ختم ہوگیا اور اُسکے بعد ایسبٹاس . . . .
کے کپڑے ایجاد ہوئے اور یہ حیرت انگیز چیز تھی۔ ایک سال میں
ہم لوگوں نے ابد تک کے لئے کپڑے تیار کرلئے ہیں۔ یہ ہرگز ممکن
نہ تھا اگر عورتوں نے انقلاب کی آواز نہ بلند کی ہوتی اور فیشن
کا خاتمہ نہ ہوگیا تھا۔

"کیا اب فیشن باقی نہیں رہ گیا" میں نے دریافت کیا۔
میں اپنے معمول کے فیشن کی بے ثباتی اور ——— یہ گفتگو چھیڑنے ہی
والا تھا کہ یکایک ایسبٹاس میں ملبوس کچھ متحرک شکلیں نظر آئیں۔
میں نے اس گفتگو کا ارادہ ترک کردیا۔

"سب مفقود ہوگیا" اجنبی نے جواب دیا۔ اور بعد
ازاں ہم لوگوں نے تبدیلِ آب و ہوا کو بھی ختم کردیا۔ شاید تم
یہ نہ سمجھتے ہوگے کہ تمہارے زمانے میں تبدیل آب و ہوا کی وجہ
سے کس قدر کام بڑھ گئے تھے۔

میری مراد گوناگوں کپڑوں اور مکانوں سے تفریح گاہوں
اور کام کے گھنے جنگلات سے ہے۔ تمہارے وقت میں کتنی تکلیف دہ
اور خوفناک چیزیں تھیں۔ ہوا! طوفان! آسمان پر بڑے بڑے سپید
ٹکڑے! بادل شاید ہوا میں اُڑتے تھے۔ سمندر میں نمک!
بارش! اولے! کہرے!! کیا یہ چیزیں تمہارے وقت
میں نہیں تھیں؟

کس قدر خوفناک!
"کبھی کبھی یہ نہایت حسین و دلکش مناظر پیش کرتے تھے"
میں نے کہا "لیکن تم نے ان تمام چیزوں کو بیک وقت
کیونکر نیست و نابود کردیا؟"
اس نے کہا "تم نے موسم کو فنا کردیا۔ اس کا آسان طریقہ
یہ تھا کہ ایک طاقت کو دوسری طاقت سے بھڑا دیا جس سے
سمندر کے اجزاء کی ماہیت بالکل بدل گئی جس سے فضا بالکل
شفاف ہوگئی۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں اسے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں
کرسکتا کیونکہ میں نے اسکول میں کبھی اس کا اپریشن ہی نہیں لیا
لیکن ہاں آسمان بھورے رنگ کا ہوگیا اور سمندر گوندی رنگ
کا ہوگیا۔ اور ہر جگہ موسم یکساں ہوگیا۔ اس سے ایندھن اور
مکانات سب ختم ہوگئے" وہ یہ کہکر کچھ دیر تک خاموش رہا۔ اور
میں ان حیرت انگیز تبدیلیوں پر غور کررہا تھا۔
"گویا نیچر کو فتح کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کام کرنے کیلئے
باقی نہیں رہ گیا" میں نے کہا۔
اُس نے جواب دیا "بالکل یہی بات ہے۔ کوئی کام باقی
نہیں رہا"
"کیا ہر شخص کے لئے وافر کھانا موجود ہے"
"بہت زیادہ" اس نے جواب دیا۔
"مکانات اور کپڑے"
اجنبی نے ہاتھ کے اشارہ سے بتایا "تمہیں جن چیزوں کی
ضرورت ہو۔ وہاں رکھی ہوئی ہیں۔ تم وہاں سے انہیں لے سکتے
ہو۔ یہ ضرور ہے کہ چیزیں اب تعداد میں کم ہوتی جاتی ہیں لیکن
پھر بھی وہ ابھی صدیوں کام دینگی۔ ابھی اس کی طرف توجہ
کی ضرورت نہیں ہے"
اُس وقت میں یہ غور کررہا تھا کہ اُس پُرانی دُنیا میں زندگی کا
کس قدر بیشتر حصہ طرح طرح کے لایعنی کاموں میں ختم ہوجاتا تھا۔
فوراً ہی میری نظریں اوپر اُٹھیں۔ ایک مسمار اور خستہ
عمارت کے اوپر چند ٹوٹے پھوٹے تار لٹک رہے تھے جو بظاہر
ٹیلیفون کے تار معلوم ہوتے تھے۔
"ٹیلیفون۔ ٹیلیگراف۔ اور دیگر رسل و رسائل کے ذرائع
کیا ہوئے؟" میں نے دریافت کیا۔

حیرت زدہ اجنبی چلا اُٹھا۔" او! شاید وہ ٹیلیفون کہلاتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ یہ چیزیں تو سیکڑوں برس ہوئے ختم ہوگئیں۔ اور پھر ان کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"کیوں" میں جوش میں آکر بول اُٹھا۔ ٹیلیفون کے ذریعہ ہر شخص سے بآسانی گفتگو کر سکتے ہیں۔

اجنبی خوف زدہ ہوکر بولا" اور کوئی شخص تمہیں کسی وقت بلا سکتا تھا اور پھر بات چیت بھی کر سکتا تھا یہ کتنی فضول بات ہے! تمہارا دور یقیناً خوفناک تھا۔ اب ٹیلیفون۔ ٹیلیگراف اور سفر کرنے کے تمام ذریعے برباد کردیئے گئے۔ سفر کرنا بڑی بیوقوفی کی علامت تھی۔ شاید تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ تمہارے بعد لوگ زیادہ عقلمند ہو گئے۔ ریل روڈ ہی کو لو۔ آخر اس سے کیا فائدہ تھا.......... شاید اس کی وجہ سے ایک شہر سے بہت سے لوگ دوسرے شہر میں گھس آتے ہونگے اُنہیں دوسرے شہر میں جانے کی ضرورت کیا تھی۔ جب کام اور تجارت ختم ہوگئی۔ کھانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اور موسم ہر جگہ یکساں ہے۔ ایسی حالت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا صریحاً بیوقوفی ہوگی اس لئے سفر کے سب ذرائع ختم ہوگئے۔ بہرکیف یہ چیزیں بڑی خطرناک تھیں۔

"خطرناک"؟ میں نے کہا" خطرہ تو اب بھی ہے"۔

"ہاں کچھ حد تک اب بھی ہے اور وہ صرف منقطع ہونے کا خطرہ ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"تمہارا کیا مطلب" میں نے پوچھا۔

"یہ وہی ہے جسے تم موت کہتے ہو، اور ہاں کئی صدیوں سے کوئی موت واقع نہیں ہوئی ہے وہ بھی اب مفقود ہو گئی۔ بیماری اور موت صرف کیڑوں سے پیدا ہوتی تھی۔ یکے بعد دیگرے یہ چیزیں دریافت ہوتی گئیں۔ اور شاید تم لوگوں نے بھی اپنے زمانے میں کچھ معمولی بیماریوں کے علاج دریافت کر لئے تھے۔ تم نے شاید میعادی بخار۔ چیچک وغیرہ کے کیڑوں کو دریافت کر لیا تھا۔ لیکن اُسکے ایسے کیڑوں کو جنہیں تم دریافت کرنے اور سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔ ہم لوگوں نے دریافت کرکے ختم کر دیا۔ تعجب ہے کہ تم ابتک نہیں سمجھے کہ تمہارا بڑھاپا دور بھی کیڑوں کے مشابہ تھا۔ یہ بالکل معمولی بات تھی لیکن تقسیم کار اس طرح تھی کہ تم اس کا خیال نہیں کر سکتے تھے

"تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "کہ اب لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں" اجنبی دوست نے فوراً کہا" میں چاہتا تھا کہ تم خوف و ہراس اور حیرت و دلچسپی کا اظہار نہ کرتے۔ تم اس قدر متحیر ہو رہے ہو کہ شاید یہ تمام تبدیلیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ہاں ہم لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں تاوقتیکہ کسی وجہ سے فنا نہ ہوجائیں۔ فنا ہوجانے کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے لیکن یہ بہت شاذ و نادر ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز پر ہم زور سے گریں تو لکڑی کی طرح چور چور ہو جائیں۔ ہم میں ابھی تھوڑی نزاکت باقی ہے۔ اب صرف یہی تھوڑے سے پرانی بیماری کے کیڑے کی یادگار ہے جن سے اب بھی کچھ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ اس نے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔" مجھے تسلیم کرنے میں عار نہیں ہے کہ حادثات ہماری تہذیب پر بدنما دھبے تھے یہاں تک کہ ہم لوگوں نے کوشش کرکے حادثات کا خاتمہ کر دیا۔ تمہارے زمانے میں واردات کچل کے مرجانا ایک نہایت عام بات تھی لیکن اب سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ، موٹر ریل اور ہوائی جہاز سب ممنوعات قرار دیدیئے گئے۔ تمہارے دور کے خطرات ان سے بہت وحشت انگیز تھے۔ اس وقت اس نے کپڑے میں لرزتے ہوئے کہا...... میں نے اپنی تہذیب کی یاد سے متاثر ہوکر فخریہ انداز میں جس کو میں نے پہلے محسوس نہیں کیا تھا کہا ہمارے خیال میں یہ جوانمردوں کے فرائض میں تھا۔"

"ہاں! ہاں"! اجنبی دوست نے بے صبری سے کہا" تم مزید پریشانی کو راہ نہ دو۔ میں تمہاری باتوں کو خوب سمجھتا ہوں یہ سراسر نادانی تھی۔

عرصہ تک ہم لوگ خاموش بیٹھے رہے۔ میں منہدم عمارتوں ویران و سنسان سڑکوں اور آسمان اور فضا کی یکرنگی کو دیکھ رہا تھا۔ نیچر کو فتح کرنے کا یہ انجام تھا۔ کام۔ کھانا۔ بھوک سردی گرمی محنت سب کا اختتام، تبدیلی و موت کا زوال یعنی ابدی عیش و مسرت۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اس دوڑ میں بھی ضرور نقص تھا۔ میں نے غور کیا پھر فوراً تیزی سے جوابات پر بغیر غور و فکر کے دو تین سوالات کئے۔

"اس وقت جنگ ہوتی ہے"۔

"سیکڑوں برس ہوئے ختم ہو گئی طرح طرح کے بین الاقوامی

جھگڑوں کو طے کرنے کیلئے مشینوں سے شاید جنگ ہوا کرتی تھی لیکن اسکے بعد بین الاقوامی تعلقات یک لخت ختم کر دیے گئے۔ تجارت اور ایسے تعلقات کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہر شخص غیر ملک کے باشندو کو فقیر اور خوفناک تصوّر کرتا ہے۔"

"اخبارات شائع ہوتے ہیں یا نہیں؟"

"اخبار"! توبہ! نہیں اس کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟ اور اگر کسی کو پڑھنے کا شوق ہو تو ہزاروں پرانے اخبارات کے انبار لگے ہیں۔ اور پھر اُن میں ہے کیا؟ صرف اُن واقعات' واردات جنگ' اور موت کا ذکر ہے جس سے شاید تمہارے زمانے کو خصوصیت حاصل تھی۔ جب یہ سب چیزیں فنا ہوگئیں تو اخبارات بھی مفقود ہوگئے۔

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "سنو! باوجودیکہ تم شاید سوشل رفارمر (Reformers) تھے اس نئی زندگی کو تم تصوّر میں بھی نہ لا سکے۔ شاید تم اس بات کا پورے طور سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ کتنا وزنی بوجھ ہمارے سر سے اُتر گیا۔ اس کو اس نظر سے دیکھو کہ تمہارے دور کا ابتدائی حصّہ کتنی جانفشانی میں ختم ہو جاتا تھا۔

"کیوں" میں نے کہا "صرف پندرہ برس حصولِ تعلیم کے لئے کافی تھا۔"

"بہت درست" اُس نے کہا "لیکن ذرا غور کرو کہ اب کتنی ترقی ہوگئی ہے۔ اب تعلیم صرف آپریشن سے حاصل کی جاتی ہے مجھے حیرت ہے کہ تمہارے زمانے میں کسی نے یہ نہیں سمجھا کہ تعلیم صرف عملِ جرّاحی آپریشن (operation) ہے۔ تمہیں اتنی عقل بھی کہ تم یہ سمجھتے کہ فی الحقیقت تم جو کرتے تھے وہ دماغ کے اندرونی حصّہ کو نئی ساخت میں لاتا اور پیچ و خم د توڑ مروڑ کر کے تکلیف دہ طریقہ پر دماغی آپریشن کرتا تھا جو کچھ تم پڑھتے تھے وہ بھی طور پر دماغی حالت کے مخالف ہوتا تھا۔ تم نے سمجھا۔ تمہارے زمانہ میں کسی کو انجام کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اسکے بعد حصولِ تعلیم بذریعہ آپریشن ایجاد ہوا۔ نہایت آسانی سے کھوپڑی کے ایک حصّے کو کھول کر اس میں ایک بنا بنایا مغز نصب کر دیتے ہیں۔ پہلے شاید وہ مُردوں کے دماغ استعمال کرتے تھے مگر یہ بھیانک چیز تھی۔" یہ کہتے وقت وہ پتّے کی طرح لرز رہا تھا۔ "لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ خود مغز بنانا سیکھ گئے۔ پھر تو یہ ایک بہت معمولی بات تھی اور چند منٹ کے آپریشن میں منظومات۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب غرض انسان ہر چیز اپنے شوق کے مطابق حاصل کر سکتا ہے۔" اپنے سر کے بالوں کو ایک طرف کرتے ہوئے اس نے ایک داغ دکھایا اور پھر کلام کو جاری کیا "مثلاً اس جگہ میں نے ریاضیات کا آپریشن لیا تھا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ عمل تکلیف دہ تھا۔ لیکن انگریزی نظمیں اور تاریخ بغیر کسی تکلیف کے حاصل کر سکتے ہیں جب میں تمہارے دور کے تکلیف دہ اور وحشیانہ طریقے کو سوچتا ہوں جبکہ کانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کی جاتی تھی تو میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ یہ بات تعجب انگیز ہے لیکن اب تو معلوم ہوگیا ہے کہ سیکڑوں امور کے لئے دماغ کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے فلسفہ اور منطق کو تو ہم لوگ معدہ میں رکھ لیتے ہیں۔ پھر اُس میں وہ چیزیں بھرتے ہیں اور وہ خوب سمو جاتی ہیں۔" وہ کچھ دیر تک خاموش تھا۔ پھر بولا "تعلیم ختم کرنے کے بعد تم کرتے کیا تھے؟"

"کیوں" میں نے کہا۔ "تعلیم کے بعد کام کرنا ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وقت اور اس کا زیادہ حصّہ دوسری جنس کے ساتھ ختم ہوتا تھا رفیقِ حیات ڈھونڈھنے میں اور اسکے طلب کرنے میں' اجنبی سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے میں نے تم لوگوں کے عورتوں سے تعلقات کے بارہ میں کچھ سُنا ہے لیکن یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے بتاؤ۔ کیا تم کسی ایک عورت کو منتخب کر لیتے تھے؟

"ہاں"

"اور کیا وہ عورت تمہاری بیوی ہو جاتی تھی۔"

"ہاں! وہ رفیقِ حیات ہو جاتی تھی" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔ "اور کیا تم اسکے لئے محنت مزدوری کرتے؟"

"ہاں" "اور وہ مطلق کام نہیں کرتی تھی؟"

"نہیں۔ مطلق نہیں" میں نے جواب دیا۔

"اور شاید تمہاری تمام جائداد اور دولت کے آدھے کی وہ شریک بھی ہوتی تھی؟"

اور ہاں اسے تمہارے مکان ہی میں رہنے اور تمہاری چیزوں کو بھی استعمال کرنے کا حق حاصل تھا۔

"اور کیا" میں نے جواب دیا۔

"کیسی ڈراونی اور حیرت انگیز باتیں ہیں" وہ لرزتے ہوئے بولا۔ "سچ تو یہ ہے کہ ہم تمہارے دور کے عجوبات اور تعلقات سے پورے طور سے ابھی تک واقف نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کانپنے

بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔

یکایک مجھے خیال آیا کہ سڑک پر جتنے آدمی تھے سب یکساں تھے اُن کی صورت میں کوئی فرق نہ تھا۔

"مجھے بتاؤ" میں نے کہا۔ کیا اب عورتیں بھی نہیں ہیں؟ کیا وہ بھی ختم ہوگئیں۔

"نہیں نہیں" اجنبی نے جواب دیا۔ "عورتیں اب بھی ہیں لیکن اُن میں اور مردوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ دیکھو بات یہ ہے کہ اب ہر چیز میں تغیر اور تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ یہ اُن کی بغاوت کا نتیجہ تھا۔ اُن کو مرد بننے کا بڑا اشتیاق تھا۔ شاید یہ تمہارے ہی وقت میں شروع ہوگیا تھا۔

"ہاں کچھ کچھ" میں نے جواب دیا۔ انہوں نے ووٹ اور برابری کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔" ہاں ہاں میں سمجھا" میرے دوست نے کہا۔ مجھے الفاظ بھی نہیں ملتے لیکن میرے خیال میں تمہاری عورتیں خوفناک ہوتی ہونگی۔ کیا وہ طرح طرح کے پر اور کھال اور رنگین کپڑے جو مُردہ چیزوں سے بنی تھیں استعمال کرتی تھیں۔ شاید وہ ہنستی بھی تھیں اور دانتوں کو ہر وقت باہر نکالے رہتی تھیں اور وہ تمہیں ایسے معاہدوں میں قید کرلیتی تھیں۔ "اُف"! وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے غصہ میں اُسے مخاطب کیا۔ ایبشاس (مجھے سوائے اسکے اس کا دوسرا نام معلوم نہیں تھا) "کیا یہ بھدی بھدی شکلیں جو بڑے بڑے لبادوں کو پہنے ہوئے سڑکوں پر رینگ رہی ہیں بیسویں صدی کی عورتوں کے مقابلہ میں آسکتی ہیں۔

یکایک میرے دماغ میں ایک دوسرا خیال آیا۔ "لڑکے" میں نے کہا لڑکے کہاں ہیں؟ کیا اب لڑکے نہیں ہوتے؟"

"لڑکے! وہ بول اُٹھا "کم سے کم سو سال سے میں نے لڑکوں کا نام بھی نہیں سُنا۔ لڑکے بھی عجیب و غریب چیز ہوتے ہونگے بڑی بڑی شکلیں اور ہر وقت شور و غل، اور شاید وہ گھاس کی طرح بڑھتے بھی تھے میں سمجھتا ہوں وہ ہر سال سال گزشتہ سے زیادہ بڑھتے ہونگے"

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

ایبشاس! میں نے کہا" تو یہ تمہاری موجودہ تہذیب ہے۔ ابدی عیش و مسرت، زندگی کے ہر قسم کے کام اور بوجھ ختم ہونے کے بعد یہ دُنیا مُردہ سے بدتر ہے۔ اس کے ساتھ زندگی کی خوشیاں بھی ختم ہوگئیں۔ خطرات اور موت کے بجائے جاودانی عمر! مجھے پہلے زندگی واپس دو۔ خوفناک اور ڈراونی زندگی۔ زندگی کے تمام مصائب، خطرات ناامیدیاں واپس دو، مجھے اب اسکی قدر معلوم ہوئی۔ میں زور سے چلا اُٹھا "میں آرام نہیں چاہتا۔" فوراً ایک مہیب آواز میرے کانوں میں آئی۔ ہنگامہ

میری نیند ختم ہو چکی تھی۔ میں ہوٹل کے ایک کمرہ میں تھا۔ ایک شخص نیچے پکار رہا تھا۔ اور اسکے ساتھ زندگی کے تمام لوازمات اور میں بھی میں زینے سے نیچے اُتر آیا۔

رباعی

بلا وہ ہے پہ بلائے امکاں ہے!
یہاں فرصت نہیں ہے آہ و فغاں کی
سنوار و دل انجمن یہ پایہ کہ وہ نہ مرے
میں بار آیا نشاطِ دو جہاں سے!
ذرا جبریل! اتنا عرض کر دے
ہمیں آزاد کر دیں دو جہاں سے!

عزمی۔ بی اے (علیگ)

رام پرتاپ بہل - ایم - اے

ادھوری چٹھی

۔۔۔۔۔۔

آج صبح جب میں تھکا ہوا اُٹھا تو مجھے ہر چیز دھندلی لگنے لگی - چاروں طرف بادل سا چھایا معلوم ہو رہا تھا - دوا پیتے وقت ماں سے پوچھا "آج ابھی سے اتنا اندھیرا کیوں ہو رہا ہے؟" میں نے اُن کی اُداس آنکھوں کو خاموشی اختیار کرتے ہوئے دیکھا لیکن وہ دھندلاپن بڑھتا ہی جا رہا تھا - دھیرے دھیرے باہر کا دھندلاپن اپنے اندر بھی محسوس کرنے لگا - دوپہر کا کھانا سامنے لایا گیا ، لیکن کچھ کھا نہ سکا - یوں ہی سو رہا - ابھی نیند کھلنے پر تکیے کے نیچے ہاتھ گیا تو تمہاری چٹھی ملی - تمہاری چٹھی! آنکھیں چمک اُٹھیں - دُنیا پھر سے روشن ہو گئی - کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے لفافے کو چاک کیا - یہی خیال دماغ کو دُھن رہا تھا - میں نے تو سمجھا تھا کہانی ختم ہو چکی - ڈاکٹر کی رائے تمہیں بھی معلوم ہو گئی ہو گی - پھر تم نے مجھے خط کیوں لکھا! ۔۔۔۔

خیر، خط کے واسطے شکریہ ، اگر ایسے آدمی کا شکریہ بھی کوئی معنی رکھتا ہو تو - ہاں تو تم نے مجھے خط کا جواب دینے سے منع کیا ہے - تمہاری خواہش ہے کہ میں تمہارا خط آخری خط سمجھوں - مجھے اس پر اعتراض نہیں - تمہاری خواہش مجھے منظور - لیکن ۔۔۔ لیکن جس کا آغاز میں نے نہیں کیا تھا اُس کا آج انجام ہوتے ہوئے اندر ہی اندر ایک قسم کی دہشت سے کانپ اُٹھتا ہوں - خیر ایک ہی بات ہوئی - میرا خیال ہے میری آخری خواہش مان لینے میں تمہیں بھی زیادہ اعتراض نہیں ہو گا - آخری خط میں لکھ رہا ہوں ـــ

تم نے لکھا ہے - "تم نے میرے واسطے سب کچھ کرنے کی کوشش کی - مجھے خوش کرنے میں تم نے کچھ اُٹھا نہیں رکھا ۔۔۔۔ میری ہو کر رہنے کی میری خواہش کو کامیاب بنانے کے لئے تم نے سب کچھ کیا لیکن دُنیا اور زندگی نے تمہیں کامیاب ہونے سے روکا - اس کا مجھے دُکھ ہے ۔۔۔۔ اب ہمارے تمہارے راستے الگ ہو چکے ہیں ۔۔۔۔ میں تمہیں بھول جاؤں اور معاف کر دوں

وقت ہی نے مجھے اور تمہیں ملایا تھا ، اُسی نے الگ بھی کر دیا ، تمہاری یہ رائے ہے کہ وقت کے سامنے سر جھکا کر ہمیں تمہیں اُس کا فیصلہ خاموشی سے سُن لینا چاہئے - تم یہ بھی سوچتی ہو کہ اگر اس سے آگے تم میرے ساتھ اُس راستے پر چلنے کی کوشش کرتیں بھی تو وہ تمہاری ہماری خوشی اور سُکھ کا باعث نہ ہوتا -

لامحدود کمزوری کی حالت میں خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا - لیکن اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں - تم نے میرے لکھنے کے واسطے آخر چھوڑا ہی کیا ہے؟ جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ اتنا درست اور واجب ہے کہ بس جی یہی چاہتا ہے کہ تمہارے ہی لفظوں کو بار بار دوہرا کر خط تمام کر دوں - تم نے سب کچھ میرے واسطے کرنے کی کوشش کی ، کوشش ہی کیا بلکہ سب کچھ تم نے کیا بھی - مجھے سُکھی بنانے میں تم نے کچھ بھی اُٹھا نہیں رکھا - وہ تمہاری مہربانی تھی - اس کے علاوہ اور میں کیا کہہ سکتا ہوں ؟

میں نے تو سمجھا تھا جیل کی زندگی نے میری کمر ہی توڑ دی - باہر نکلنے پر میں اپنے کو آدمی نہیں سمجھتا تھا - زندگی سے مجھے اور اُمیدیں نہیں رہ گئی تھیں - جیل میں آدمیوں نے مجھے آدمی سے حیوان بنا دیا تھا - تمہارے گھر بھی جانے کو جی نہیں چاہتا تھا - اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے گھر والوں کا خیال میرے واسطے کسی قدر بدل گیا ہو - اسکے برعکس تمہارے گھر کی ایک ایک چیز تمہاری بہن کی یاد میرے دماغ میں لاتی اور میں بے چین ہو جاتا - اُن بیچاروں نے میرے ساتھ چاہے جو کچھ کیا یا کچھ بھی نہ کر سکی ہوں لیکن جہاں تک میرا سوال تھا میں یہ کیسے بھلا سکتا تھا کہ میرے بنانے یا بگاڑنے میں اُن کا کافی ہاتھ تھا - تمہیں تو سب معلوم ہی ہے -

وہ میری جوانی کی صبح تھی - میں ایک انجان اُلجھن کی طرح راستہ ہی ڈھونڈنے میں مصروف تھا - دوسرے جب اُس صبح میں زندگی کے باغ میں پھولوں سے کھیلنے اور پھول [illegible] بکھیرنے کے اپنے

سر پر بہت بڑا بوجھ اُٹھا لیا - میں ایسے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا جو زندگی کا بھلا اور آخری مقصد دوسروں کا بھلا ہی کرنا سمجھتے ہیں اُن کے ساتھ میں شہر میں نہیں بلکہ شہر کے باہر باہر جیسے ایک جنون میں پھرا کرتا تھا - راتوں کو چھُپ چھُپ کر ایسی کتابیں پڑھتا جن سے دوسرے دن دہاڑے ڈرتے تھے - میلوں چلتا اور دوڑتا تھا - اور اکثر گھر سے غائب رہتا - ایک شہر سے دوسرے شہر شب کی تاریکی میں سائیکل چلاتا چلا جاتا - اُن باتوں کو سوچ کر آج تھکاوٹ معلوم ہو رہی ہے - جن اُنگلیوں میں آج قلم نہیں سنبھلتا اُنہیں میں ایک روز اُن لوگوں نے ریوالور پکڑا کر کہا "جاؤ اپنا کام کرو"

لیکن پھر بھی زندگی اتنی سخت اور دشوار ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی اُس کی سخت بندشوں سے بدن کے جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگتے تھے - اکثر ایسا محسوس کرتا کہ اپنی زندگی کی کوئی بُنیاد نہیں رہی حقیقت سے دُور ہٹ کر صرف جذباتی ہو کر رہ گیا تھا - ہر چیز کو ایک خاص دماغی نظریہ سے دیکھتا اور غور کرتا جس راستے کو اپنی زندگی کا شاہراہ بنا لیا تھا اُس پر آفت مصیبت اور سختیاں جھیلتے ہوئے چلتا چلتا اکثر تھک جاتا - کبھی کبھی تو جی چاہتا کہ اُس بھاری بوجھ کو سر سے اُٹھا کر پھینک دوں - راستے کے کنارے کی چھاؤں اور سبزے میں ذرا بیٹھ کر دم لینے کو بھی جی چاہتا لیکن ایسا سوچتے وقت میں محسوس کرنے لگتا جیسے وہ ریوالور جو میری جیب میں تھا اُسے کسی نے میرے سر پر تان رکھا ہے - لاچار میں آگے کی طرف بڑھتا ہی جاتا جن فولادی زنجیروں میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اُنہیں کو توڑنے کے لئے!

اُسی وقت وہ لڑکی سڑک کے کنارے کھڑی ملی - اُسکی غریبی اور معصومیت نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح دیکھا کہ مجھے ذرا دیر ٹھہر کر اُس کا پیغام سُننا ہی پڑا - لیکن سر سے بوجھ اُتارا تھا کہ اُس کا جادو سر چڑھ گیا - اُسکی سادگی، معصومیت، غریبی اور پاک جوانی نے چھاپہ مار سپاہیوں کی طرح مجھے گھیر لیا -

تمہاری بہن میرے واسطے "پل اوور" بُن رہی تھیں اُنگلی اور سلائی میں اُون کے پھندے ڈال کر میرا سینہ ناپنے آئیں اُنہیں میرے واسطے اتنا تکلیف اُٹھاتے دیکھ کر جب میں نے اعتراض کیا تو جواب میں اُنہوں نے مسکرا کر کہا - کیوں جاڑا پڑنا تو شروع بھی ہو گیا! آخر وہ تو تم کو بن کر دے نہیں دے گی . . . . ؟" اُن کے مُنہ سے یہ سُن کر مجھے تعجب ہوا پھر پریشانی ہوئی اور آخر میں شرم سے آنکھیں زمین میں گڑ گئیں - وہ سمجھتا یعنی وہ بات اُنہیں کیسے معلوم ہوئی، میرے واسطے ایک علامت سوالیہ ہو کر رہ گیا - جب میں نے سوچا کہ آخر جاڑے سے میری حفاظت کرنے کی ذمّہ داری اُنہوں نے اپنے اوپر کیونکر لے لی -

ابھی اُن پہیلیوں کو سُلجھا ہی رہا تھا کہ شام کو تم اُن کا خط لیکر آئیں - خط کے مضمون سے تو تم ناواقف تھیں لیکن اپنی کسی کا احساس تو تمہیں تھا ہی - آٹھ نو سال کی عمر میں ایک نہایت ہی ذمّہ داری کے کام کو جس غیر ذمّہ دارانہ انداز سے تم نے انجام دینے کی کوشش کی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کام کو وہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا وہ تمہارے اُس بے وقت مسکرا دینے کی وجہ سے آج بھی ہمارے تمہارے سر پر ایک بوجھ ہی ہو کر رہ گیا ہے -

اُن سے جو کچھ مجھے ملا اُس کا ذکر آج مجھ سے نہیں ہو سکتا - حُسن اور عشق کا تخیل میرے دماغ سے بہت دور چھوٹ گیا ہے بیماری کے بستر پر صرف بدشکل اور تکلیف پہنچانے والی تصویریں میرے سامنے آتی ہیں - کسی چیز کی کمی اُسکی خوبی سے زیادہ ہوتی ہے یعنی کسی بھی چیز کی حدود اُس چیز سے زیادہ ہوتی ہیں یہ مجھے اُسی وقت معلوم ہوا - اُنہیں پانے پر چاہے مجھے ساری کائنات پا لینے کا احساس کیوں نہ ہوا ہو لیکن اس میں کیا شبہ کہ ایک سال سے کم ہی کی مدت میں میں نے اُنہیں مٹی میں ملا کر رکھ دیا میری وجہ سے جو الم و اذیت اُن کے حصّہ میں پڑی اُس کا اندازہ میں خود میں اپنی دماغی کوفت ہی سے لگا سکتا تھا - چھ مہینہ تک میں نے چین نہیں جانا - دن بھاگنے دوڑنے میں گزار دیتا، راتیں جاگتے جاگتے کٹ جاتیں - سر درد سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل رہتیں - اُن کے ساتھ میرا ایک ہی اور ساتھی تھا - یعنی خدا، اُن کا بھی ساتھ چھوٹ گیا یا چھوڑنا پڑا - میں نے شاید ٹھیک ہی سوچا کہ ایک کریم قادرِ مطلق کے ہوتے ہوئے دو بے گناہ روحوں کو اتنی ایذا کیسے پہنچ سکتی ہے -

معلوم نہیں وہ خوشی یا افسوس کا موقع تھا - جب میں اُسے رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھے ڈرتا ڈرتا تمہارے گھر سے روانہ ہوا - دو میل سے زیادہ کا راستہ اُسی تیزی سے کاٹا جس سے کوئی بہت بڑا گناہ کا مرتکب کاٹتا ہے - ندی کے کنارے پہنچ کر اپنی چھ مہینے کی مُردہ نشانی کا مُنہ ایک بار دیکھنے کے جذبہ کو دبا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے دریا میں پھینک دی

لہروں کے سپرد کر دیا۔ میری زندگی کا وہ دوسرا خون تھا۔ پہلا خون میں نے اور انہوں نے مل کر کیا تھا۔ جب اُس دیہاتی لڑکی کا خط ہم لوگوں کے سامنے جلایا گیا جسے اُس نے معلوم نہیں کس قیمت پر کسی پڑھے لکھے آدمی سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ خیر اُسی کے چھ مہینے بعد تمہیں تو یاد ہی ہوگا، مجھے آخری خط لکھ کر وہ اپنے شاملِ حیات کے ساتھ چلی گئیں۔ تمہارا خط دیکھ کر اُن کے خط کی یاد بُری طرح مجھے ستا رہی ہے۔ اب لکھا نہیں جاتا۔ لیکن لکھنا ہی پڑیگا۔

اُسکے بعد کی سب باتیں تمہیں معلوم ہیں اور کیسے نہیں معلوم! اُس طوائف کی چھوکری سے مجھے ملاقات ہی ہوئے کتنے دن ہوئے تھے۔ لیکن کس سہولیت سے اُس نے مجھے چھ سال کیلئے پولیس کے حوالے کر دیا۔ معلوم نہیں دراصل اُس نے ریوالور دیکھا تھا یا نہیں۔ بہرحال میرے لئے تو وہ چیز اتنی پُرانی ہو گئی تھی کہ رکھی رکھی اب وہ زنگ بھی کھانے لگ گئی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اُس وقت میں سڑک کے بیچ سے ہٹکر سڑک کے بائیں طرف سے چلنے لگا تھا لیکن سوال تو یہ تھا کہ میں سڑک کے کسی طرف سے چلوں اُس سے کیا مطلب۔ اُس کی ہمدردی تو مجھ سے سینما ہال میں ہوئی تھی جیساکہ اُس کا کہنا تھا وہ میرے ہی جیسے کی تلاش میں تھی جس کی آتما کی روشنی میں وہ بھی زندگی کی شاہراہ پر چل سکتی۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ مجھے بھی کسی ایسے کی تلاش تھی جو مجھے سمجھ سکتا اور میرے زخم پر مرہم لگاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جس کی محبت کا میں غلام ہو چکا تھا وہ دراصل کسی اور کی غلام تھی جس کی ترقی اور بہبودی کے واسطے کیا کچھ قربانی وہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو عدالت سے فیصلہ ہی میں چھ سال کی قید سخت کی سزا کے ساتھ ساتھ معلوم ہوا کہ چونکہ میرا سڑک کی بائیں پٹری پر چلنا اور بھی زیادہ خطرناک سرکار کی آنکھوں میں معلوم ہوا اس لئے طوائف کی چھوکری کو چاہنے والے سی، آئی، ڈی کے انسپکٹر نے مجھے سڑک کے بیچ میں چلنے کے پُرانے جُرم میں گرفتار کر کے اپنی ترقی اور سرکار اور سماج کو فائدہ پہنچانا چاہا۔ جو بات طوائف کے گھر میں پولیس سے گھرے گرفتار ہو کر بھی نہ جان سکا وہ عدالت میں سمجھ میں آئی لیکن عورت مرد سے کبھی محبت کر سکتی ہے سو یہ بات آج تمہارا خط پا کر بھی نہیں جان سکا ——

اُف! کھانسی آئی پھر شروع ہو گئی۔ شاید خط کو تمام نہ کر سکوں ——

حالانکہ جیل کے پھاٹک سے جب میں رہا ہو کر نکلا اُس وقت میری عمر ۲۴ سال سے زیادہ نہیں ہی ہوگی لیکن میں ایسا محسوس کرنے لگا تھا جیسے میری زندگی کے کم سے کم ۵۶ سال تو گزر ہی چکے تھے۔ جس محور پر میری زندگی گھومتی تھی جیسے اب وہ محور ہی نہیں رہا تھا جس پر کمہار کا پہیا گھومتا اور میری مٹی سے تخلیق ہوتا۔ خیر اُس قصّہ کو بھی چھوڑو اور اُس دن کو سوچو جب تمہیں مجھ سے ہمدردی ہوئی۔ یوں تو جیسا کہ تم کہتی رہی ہو تم نے پہلے پہل مجھ پر اُس وقت ترس کھایا جب تمہاری بہن مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو کر اپنے گھر چلی گئیں۔ یوں تو میری اور اُن کی باتیں تمہیں خط کے لانے لیجانے میں ہی معلوم ہو گئی تھیں لیکن در اصل مجھ سے محبت یا ہمدردی (عورتوں کے سامنے محبت پہلے ہمدردی کی شکل میں ایک وہم کا لباس پہن کر آتی ہے) تمہیں اُس وقت ہوئی جب میں جیل کی زندگی سے آزاد ہو کر نکلا۔ اب بڑے زور کی کھانسی آ رہی ہے لکھنا کچھ دیر کیلئے ملتوی ہی کرنا ہوگا ادھر کچھ دنوں سے مُنہ سے خون آنا بند تھا سو وہ اب پھر آنے لگا ہے ——

لیکن خط پورا ہی کرنا ہے۔ حالانکہ ماں آکر چارپائی پر لٹا گئیں اور خط نہ لکھنے کی تنبیہ کر گئیں لیکن چاہے پڑے ہی پڑے کیوں نہ لکھنا پڑے لکھنا ہے۔ جیوں جیوں خط پورا ہو رہا ہے ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے اندر ہی اندر ساری قوت ختم ہوئی جا رہی ہے یا جیسے کہیں کسی کونے میں وہ طاقت جذب ہوتی جاتی ہے۔ معلوم نہیں صرف سر ہی چکر کھا رہا ہے یا کمرے کی دیواریں بھی۔ لیکن خط پورا کرنا ہے —— یاد نہیں کیا لکھ رہا تھا۔ ہاں وہ تمہاری بات۔ تو جس وقت میں دُکھ درد کے لامحدود سمندر میں ڈوب رہا تھا اُس وقت تم نے میری زندگی کی پتوار کو سنبھالنے کی ذمّہ داری لی۔ اپنی بہن کی ادھوری کہانی کو پورا کرنے کیلئے تم نے قسم کھائی۔ لیکن میں تمہاری باتوں کا کوئی مطلب نہیں نکال پاتا تھا۔ تمہیں دیکھ کر جیسے اپنی آنکھوں کا یقین بھی نہ ہوا لیکن ایسا ضرور محسوس کرنے لگا جیسے اندھے کو کوئی راستہ بتانے کی کوشش کر رہا ہو۔ تمہیں اپنے ساتھ پا کر میری سوئی ہوئی آتما پھر سے جاگ اُٹھی۔ میں نے پھر ایک بار کمر سیدھی کر کے چلنے کی کوشش کی۔ میرے حوصلے پھر سے ایک بار لوٹ آئے میرے ارمان جاگ اُٹھے۔ میں پھر سے کسی سڑک کی

بائیں طرف سے ہوکر میرے ساتھ کے چلنے والے چھوٹے اور نیچے زمین پر گر کر جیسے موت کی نیند سو گئے تھے۔ میں نے اُنہیں پھر سے جگایا، ہمت بڑھائی۔ مگر ابھی کچھ ہی دور چل سکا تھا کہ اس بیماری نے ——— اُنگلیاں کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ لکھا نہیں جاتا۔ آنکھوں کے نیچے کاغذ پر سطریں کانپ رہی ہیں۔ کھانسی لکھنے نہیں دیتی۔ لیکن یہ خط ———

آج جوانی قصے بن کر یاد آرہی ہے۔ جیسے کسی نے زندگی کا پُتلا بنا کر جلا دیا ہو اور اب اُسکے جلے ہوئے ذرّے آنکھوں کے سامنے سیاہی کے بادل بن کر چھائے جارہے ہیں ——— ہاں تو میں پھر چلنے لگا تھا۔ میرے پیچھے وہ انگنت بھوکے اور ننگے مظلوم انسانی پُتلے تھے میرے آگے آگے تم چل رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے تم لگاتار کسی اونچی پہاڑی پر چڑھتی جارہی ہو۔ پہاڑ کی ٹھنڈی نرم ریشمی گھاس پر تمہارے پھول جیسے پیر برف کی گیندوں جیسے پڑتے تھے تمہاری سُرخ ایڑیوں کی جوت سے میری آنکھیں جلنے لگتیں پتلیوں میں وہ جوت شعلے بن کر اوپر کی طرف اُٹھتی۔ میں ایسا محسوس کرتا جیسے میرے سامنے چتا جل رہی ہے۔ وہ شعلے مجھے اپنی اور بُلاتے ——— مجھے چتا بُلا رہی ہے ——— شاید یہ خط پورا نہ ہو سکے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے طاقت دو۔ میری آخری مانگ ہے۔ لیکن شاید تم نہ ———

ہم تم کیسے ایک ہوئے مجھے معلوم نہیں۔ ہمارے تمہارے زندگی کے راستے کس طرح آکر مل گئے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ تمہارا لکھنا کہ ہمارے تمہارے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ یوں بھی سچ ہوگیا تھا۔ جب ڈاکٹر کا مُنہ دیکھ کر میں نے اپنے مستقبل کا اندازہ لگا لیا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ ہم تم ایک ہوئے ہی کب تھے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ابدیت کے دروازے سے برف کی گیند کی طرح ہم دونوں پھینک دئے گئے تھے۔ پہاڑی کے نشیب و فراز پر ڈھلکتے ڈھلکتے ہم دونوں ایک جگہ پر پہنچ کر ایک ہو گئے لیکن جب نیچی اونچی زمین پر سے ہو کر گزرنے لگے تو یہاں کی حرارت کی وجہ سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے۔ شاید گل کر ہم کبھی ایک بھی ہو جائیں لیکن وہ میری آخری خواہش نہیں ہے۔ میں یہاں سے اپنی مٹھیوں میں باندھ کر کوئی امید نہیں لیجانا چاہتا۔ اتنا میں جانتا بھی ہوں

کہ اگر ہم ملیں گے تو میں نہیں رہوں گا اور تم تم نہیں ——— یہ دیکھو پھر وہی اندھیرا چھا رہا ہے۔ پھر وہی سیاہ بادل گھرے آرہے ہیں۔ آنکھوں کے نیچے دھندلا پن پھیلا جاتا ہے۔ لیکن خط کو تو ختم ہونا ہی ہے۔

میں کیا نہیں کرسکتا تھا۔ کیا کیا میرے ارمان نہیں تھے۔ میری زندگی کا بھی کوئی مقصد تھا۔ لیکن افسوس! شروع ہی سے میری زندگی کے چراغ کی بتی دونوں سروں پر جل رہی تھی۔ اُس وقت میں نے اُس کی پرواہ نہ کی۔ لیکن میں نے جو سب سے بڑی غلطی کی وہ یہ تھی کہ میں نے ہمیشہ کسی کے سہارے کو بُنیاد بنا کر اپنی زندگی کو تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں اُس برگد یا پیپل کے پودے کی طرح ہو کر رہ گیا جو کسی درخت کے ٹھونٹھ میں اُگ کر پنپ ہی نہیں سکتا۔ زندگی خود ہی ایک بہت بڑی طاقت ہے اور اُسی طاقت سے مجھے شکست کھانی پڑی۔ ہر بُری چیز کو بگاڑنے اور اچھی کو بنانے کے منصوبے رکھتا تھا لیکن نہ کچھ بنا سکا اور نہ بگاڑ سکا۔ اسکے عوض میں اُن کے ہاتھوں لُٹ گیا۔ جو میرا ہاتھ بٹانے آئے۔ اُف، اب تو بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ اب کیا لکھوں؟ اچھا ایک خوراک دوا پی کر دیکھوں۔ اس خط کو پورا کرنا ہے ———

لیکن یہ کڑوی دوا میں نے پی ہی کیوں جو زندگی بڑھانے کے بجائے گھٹا رہی ہے ——— شاید اس زندگی کی کوئی صبح اور شام نہیں اسکی صبح ہی شام بھی ہو سکتی ہے۔ مگر میں یہ لکھ کیا رہا ہوں۔ تو کیا خط تمام نہ ہو سکے گا؟ ہوگا!

تم لال سیندور سے سُہاگ رچا کر اپنی ایڑیاں رنگ کر کسی اور کے گھر جارہی ہو۔ یہی تمہاری بہن نے بھی لکھا۔ لیکن یہ کیا! میری آنکھوں میں پھر وہی سُرخ لپٹ!! چتا کے شعلے بُلا رہے ہیں مجھے۔ خون! اس خط کو چھونا مت، اگر پڑھنا تو دور رکھ کر پڑھنا۔ لیکن میرا گلا سوکھ رہا ہے۔ جیسے کوئی میرے پھیپھڑے دبا رہا ہے۔ اب مجھے جانا ہی چاہئے اگر میں تم چاروں کے کندھوں پر سوار ہو کر جاتا! لیکن تم تو جارہی ہو وہ کبھی کی جاچکی۔ اور وہ کبھی آئی نہیں۔ اور اُسے آنے ہی نہیں دیا کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن یہ کیا ہو رہا ہے۔ دم گھٹا جاتا ہے میں دُنیا میں کیا نہیں کر سکتا تھا لیکن ——— لیکن ——— تو کیا یہ غلطی پوری۔

ساغر نظامی

کرموں کا پھل

جنوبی ہندوستان کی ایک خوبصورت اور عظیم الشان ریاست میں ایک بڑا خاندان تھا جس کے مورث اعلیٰ کو "راجہ" کا خطاب تھا۔ یہ راجہ اپنے زمانے کا ایک فیاض، بہادر اور منتظم انسان تھا اپنی زندگی میں اُس نے وزارت کے فرائض نہایت کامیابی اور تدبر کے ساتھ ادا کئے اور ایک طویل عمر پاکر دُنیا سے چل بسا، اسکے بعد اُس گھرانے میں راجہ کا مثیل کوئی پیدا نہ ہو سکا۔ اسکے رہنے کا محل اور اس محل کی مٹی ہوئی بہار اسکے بلند اور لطیف ذوق کی یادگار تھی۔

یہ محل یونانی طرزِ تعمیر کا ایک نہایت حسین نمونہ تھا، جسے ایک اونچے مقام پر چٹانوں کو ہموار کر کے تعمیر کیا گیا تھا۔ بڑے دروازے سے ایک وسیع احاطے میں داخل ہونا پڑتا تھا، اور ایک بیضاوی دائرے میں مرکزی چمن کو گھیر کر آنے جانے کیلئے چوڑا راستہ بنایا گیا تھا۔ دروازے کے بعد ۵۰ قدم کے فاصلے پر محل کا وہ حصہ تھا جس میں راجہ خود رہتا تھا اور جس پر پہنچنے کے لئے ۳۰ سیڑھیاں طے کرنی پڑتی تھیں۔ اسکے سامنے سے گزر کر بائیں ہاتھ پر محل کا وہ دوسرا وسیع حصہ تھا جس میں اس کا رانی خاندان رہتا تھا جس کا برآمدہ طویل یونانی ستونوں پر قائم تھا اسکے دونوں کناروں پر دو برج اندا گول کمرے تھے جن کی کھڑکیوں سے باہر کا تمام منظر اور چمن کے مرتفع صحن کا ایک ایک پھول مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔

گردشِ ایام نے ایک شاعر کو اس محل میں پہنچا دیا اور وہ اسکے مغربی گول کمرہ میں دو ہفتے مقیم رہا۔ کمرہ سے بالکل ملحق ستونوں کے بالکل نیچے، مہندی کی اونچی باڑ کی گود میں ایک چاندنی کا پیڑ تھا جو صبح و شام دوسرے پودوں سے زیادہ پھولوں سے لدا نظر آتا اور رات کو چاندنی میں اسکی بہار دونی ہو کر چند کو شرما دیتی تھی

(۲)

راجہ کے کسن پوتے جن کے ماتھوں سے خاندانی بڑائی ظاہر ہوتی تھی۔ آنکھوں سے ماضی کے احتشام کی چمک اور جن کے چہروں سے وجاہت اور حُسن برستا تھا، شاعر کے گیتوں سے مست ہو کر سو جاتے اور شاعر اس وسیع محل کی ویران و پُر اسرار خاموشی کے گیت اور سرو کے درختوں کی ان سُنی گفتگو کو حیرت اور عبادت کے طور پر سُنتا رہتا، محل فضا کی گود میں اس طرح خاموش اور ساکت معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ویراگی شدید تپسیا میں مصروف و محو کھڑا ہو ہر طرف ایک سنّاٹا اور اس سنّاٹے میں باغ کی مرتب روشوں اور روشوں میں رنگا رنگ پھول اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ایسا دھوکہ دیتا تھا کہ کسی بیوہ کنیا کا سہاگ اپنے پریتم کا انتظار کر رہا ہے۔

اس تمام منظر سے جب شاعر کی نگاہیں سمٹ کر واپس آتیں تو چاندنی کے پھولوں پر دم لیتی تھیں جو ستونوں کے سائے میں شبنم کے آنسو بہاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے لیکن جب خلّاق اور ہزار داستاں رات تھک کر سو جاتی اور دیوتا سورج کے رتھ پر سوار ہو کر اس سنسار میں دھرتی کو اپنی جوت سے جگمگا دیتی۔ شاعر کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ کمرہ اور برآمدہ کا تمام کوڑا چاندنی کے درخت پر پڑا ہوا ہے اس کے پھولوں کی کٹوریاں پاک شبنم کی بجائے گندے پانی اور تھوک کی بارش سے لت پت ہیں۔ سیاہ فام اور سفید چشم ملازم جس قدر ممکن غلاظت ڈال سکتے تھے، چاندنی کے پودے پر ڈالنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔

(۳)

... اوتار ہوں یا دیوتا، شاعر ہوں یا پیغمبر، ان کی وہ آتما جو انہیں اوتار دیوتا، شاعر اور پیغمبر بناتی ہے ہر وقت ساتھ نہیں رہا کرتی، وہ نامسعد طور پر کبھی تو محض ایک آدمی ہوتے ہیں۔ خصوصاً شاعر اگر ہر دم شاعر رہے تو اس کا دم پیٹ سے نکل جائے پھر آدمی خود نہیں چاہتے کہ شاعر ہر دم شاعر رہے، آدمی سے زیادہ شاعری جو شاعر کی سطح میں کارفرما ہوتی ہے سے یہ موثر وں میں چلنے والے انسانوں کے

اُڑنے والے، سڑکوں پر پھرنے والے، کوٹھیوں میں بسنے والے، تاش کھیلنے والے اور شب و روز بچے پیدا کرنے والے بزعمِ خود "آدمی" لوٹ لیتے ہیں۔

ایک دن شاعر انہیں آدمیوں کے ایک انبوہ سے واپس محل میں لوٹا اور بھول میں چاندنی کے پھولوں پر تھوکتا ہوا (کیونکہ اس وقت وہ شاعر نہیں آدمی تھا) تیزی سے گزر جانا چاہتا تھا کہ اُس نے ایک عورت کی چیخ سی سُنی اور اسکے ساتھ یہ الفاظ :-

"تم سے تو یہ آشا نہ تھی ــــ اے کوی مہاراج"!

شاعر کی روح کو اس چیخ نے جو اپنی درد ناکی میں انجھوتہ تھی کپکپا دیا۔ اسکی تمام ہستی کانپ گئی۔ وہ یکایک آدمی سے شاعر ہو گیا اس نے برآمدے میں اوپر نیچے، ادھر اُدھر، دور و نزدیک چاروں طرف دیکھا، مگر وہاں کوئی عورت نظر نہ آئی۔ ہر طرف ایک سناٹا سا تھا، پُراسرار سناٹا ــــ

"تمہارے پان کی پیک میرے چمپا کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نازک لبوں اور کمل کی طرح بڑی بڑی سُندر آنکھوں ہی پر نہیں، میرے تلک تک پر پڑی ہے"!

شاعر نے محسوس کیا کہ آواز چاندنی کے درخت کی طرف سے آرہی ہے، وہ آگے بڑھا، شاید کوئی دُکھیا برآمدے کے نیچے مہندی کی باڑ میں چاندنی کے درخت کے نیچے زخمی پڑی ہے، ہر طرف ایک افسانہ خواں سناٹا تھا اور فضا ساکت!

شاعر برآمدے سے اُترا، مہندی کی باڑ میں پہنچا، ادھر دیکھا اُدھر دیکھا مگر کوڑے کے انبار، پھٹے ہوئے کاغذ کے پُرزوں اور پان کی پیکوں کے سوائے وہاں کچھ بھی نہ تھا، وہ گردن جھکائے برآمدے سے گزر کر کمرہ کی طرف بڑھا۔ مگر معلوم ہوا کہ کسی بے گوشت و پوست کے ہاتھ نے اس کا دامن پکڑ لیا۔

"مہاراج اس بھرے سنسار میں کوئی نہیں ہے جو میری کہانی سُن سکے، اس اندھی دُنیا میں کوئی نہیں ہے جو دیکھ سکے، تم سُنتے جاؤ میری دُکھ بھری کہانی اے کوی مہاراج!!"

شاعر حیران ہو کر مڑا اور رُک گیا ــــ چاندنی کے درخت سے پھر صدا سی آئی:-

"اے سنسار کی شوبھا اور فطرت کے حُسن کو جِلا دینے والے شاعر سُنو میری بپتا بھری کہانی میں بولتی ہوں "رانی چاندنی" میرا نام ہے میں دکن کے پُرانے راجاؤں کے خاندان سے ہوں۔ اس ہیروں کی جنم بھومی کا میں ایک ایسا انمول ہیرہ تھی جس کی جوت نے دکن ہی نہیں سارے آریہ ورت کو روشن کر دیا تھا۔ میرا باپ جو اُس زمانہ کا مہاراجہ تھا اپنی شکتی میں دھرتی پر اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ لاکھوں سورما اس کی چوکھٹ کو بوسہ دیتے تھے، ہزاروں ویر اسکی تلوار کا لوہا مانتے تھے۔ دھرتی سے لیکر آکاش تک اس کی عظمت کا ڈنکا بجتا تھا۔ تم جانو، مہاراج ایسی باپ کی اکلوتی سپتری کیا کچھ لاڈ لاڈ میں نہ پلی ہوگی!؟ اس زمانے کے مشہور اور مہاکوی میرے لئے لوریاں اور گیت لکھتے تھے، میں سرسوتی کے شالوں پر گیتوں کی پنکھیا کی ہواؤں سے سوتی تھی اور مدھم اور لطیف راگنیوں کی ٹھیس سے جاگتی تھی، اور جب جاگتی تھی تو اوشا مجھے اپنی کرنوں کے جھولے میں جھولا جھلاتی تھی۔ یہ تھا میرا بال پن لیکن جونہی جوانی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا کہ دیوتا اور اوتار، انسان اور سنسار، تمام فطرت میرے پریم کے جال میں ہنس کی طرح پھنسی ہوئی پھڑ پھڑا رہی ہے!؟

مہاراج! میں اپنے باپ کی اکلوتی راجکماری تھی۔ میرا کوئی بھائی نہ تھا۔ میرا باپ مجھے کنیا کو بیٹوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ میری تربیت ایک راجکمار کی طرح کی گئی۔ باپ کے پریم اور ماں کی ممتا نے مجھے گھمنڈ کی پُتلی بنا دیا۔ مہاراج میرے غرور کی انتہا نہ تھی اور میری بہادری نے اس غرور کو صفت سے بدل کر پرجا کے دلوں پر میرا سکہ بٹھا دیا تھا۔

تم جانتے ہو مہاراج، یہ سنسار، دُکھ، رنج اور موت سے بھرا ہوا ہے، تمام ذی روح جو پیدا ہوتے ہیں ٹک ٹک سب کچھ دیکھتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کیا دیکھتے ہیں اور کس کو دیکھتے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کیوں ہنستے ہیں، بچے پیدا ہوتے ہیں تو معصوم ہوتے ہیں، پھر مہاراج! اس سنسار میں سارے دُکھ، رنج اور موتیں کہاں سے آتی ہیں، موت کا باعث پیدائش ہے اگر پیدائش نہ ہو تو کوئی مصیبت اور موت بھی نہ ہو۔

سو ایک دن ایسا آیا کہ میرا باپ جسکی شکتی سنسار سے اپنا خراج وصول کرتی تھی اور دھرتی و آکاش جس سے کانپتے تھے موت اسے اپنے پنجوں میں ایک بوڑھے پرند کی طرح دبا کر ایشور جانے کہاں لے گئی، اسکے بعد پرجا نے سارے راج پاٹ کا بوجھ میرے سپرد کر دیا۔ جس کا روپ تتلیوں کا اور آتما عقابوں کی سی تھی شکتی کی اس ٹروہتی کے بعد [illegible]

چمکا کہ تم کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوگئی۔ پریم پہاڑوں کی تاریک گپھاؤں میں مُنہ چھپانے لگا اور محبت خوف زدہ ہو کر جنگلوں میں بھاگ گئی۔ سُندر اور دیر راجکماروں کے پریم کا جواب مجھ ابھاگی کے پاس صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ان کے سُندر چہرے ان کے شریروں سے جدا کر کے میرے سامنے چُنے جاتے۔ میں ان کے چہروں کو دیوار تھوکتی تھی اور پھر اُن کو مدھ میں ڈبو کر اس جگہ رکھوا دیا جاتا تھا جہاں رنگ محل کا کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا۔

میں کرموں کی ماری نہیں جانتی تھی کہ مصیبتیں کہ مصیبتیں اور رنج گناہوں سے پیدا ہوتے ہیں اور خوشی نیکی سے، میں اندھی نہیں سمجھتی تھی یہ قانون اٹل اور مقررہ قانون ہے کہ آم، پیپل کے درخت سے نہیں آم ہی کے درخت سے پیدا ہوتے ہیں، میں گھمنڈ میں ڈوبی ہوئی ناری نہیں جانتی تھی۔ مہاراج کہ گیہوں سے بس گیہوں ہی پیدا ہوتا ہے جنا یا جو نہیں اور چنے کے پودے میں گنا نہیں چنا ہی پھوٹتا ہے۔ گو میں ان پڑھ نہیں تھی، ودیاوتی تھی پر میں اس وقت یہ سمجھنے کے قابل نہیں تھی کہ اسی طرح یہ بھی ایک قانون ہے کہ نیکی سے نیکی پیدا ہوتی ہے نہ کہ بدی، اور بدی سے بدی پیدا ہوتی ہے نہ کہ نیکی، میں نہیں جانتی تھی مہاراج! کہ بُرے خیالوں اور بُرے کاموں سے مصیبت پیدا ہوتی ہے، اے ایشور! میں کب جانتی تھی کہ منش جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے اور سب اپنے کرموں کا پھل بھوگتے ہیں!!

مہاراج اب میں اپنی کہانی کے اس حصے پر آگئی ہوں، جہاں آکر مجھے خوف ہے کہ تم مجھے کہانی کہتے ہوئے چھوڑ جاؤ گے اور میں اس "پُنر جنم" کے چکر میں اُلجھی رہ جاؤں گی۔

(۴)

ایک دن کا ذکر ہے کہ میری داسیوں نے جن میں سے ہر ایک حُسن کی دیوی تھی آکر کہا، مہارانی جی! راج محل کے دروازے پر ایک نوجوان کوی آیا ہے اور وہ مہارانی کو اپنی کوتا سُنانا چاہتا ہے وہ گیروا رنگ کا ایک گودڑی بانا پہنے ہوئے ہے۔ اس کا قد سرو کی طرح ہے، آنکھیں رسیلی اور جوانی کے مدھ سے بھری ہوئی ہیں۔ شانوں پر گھونگریالے بال ہیں، ماتھے پر شاندار تلک نے اس کو دیوتا بنا دیا ہے مہارانی جی! ہم نے تو یہ آن بان کسی راجکمار میں بھی نہیں دیکھی وہ کہتا ہے کہ میں نے مہارانی کی شکتی اور حُسن کا گیت ساری عمر کی محنت سے تیار کیا ہے، اس میں جو لفظ استعمال کئے ہیں۔ وہ آج تک کسی کوی نے نہیں کئے۔ اس کی جو لے اس نے قائم کی ہے وہ کسی منش کو نصیب نہیں ہو سکی۔ اسکے اک تارے کی آواز دُنیا کے کسی باجے میں نہیں پائی جاتی۔ اور سچ سچ مہارانی! اس نے ساری پرجا، کُل فوج، اور تمام درباریوں کو اپنے سنگیت سے سکتے میں ڈال دیا ہے، اس کی جیون کی پہلی اور آخری آرزو یہ ہے کہ مہارانی اسکی کوتا کو سُن لیں۔

مہاراج دیکھو چلے نہ جانا۔ پُنر جنم کے اس چکر میں اُلجھا ہوا دیکھ کر مجھ پر دیا کرو۔ میں ایسی بات کہنے والی ہوں جو تمہاری آتما کو بیکل کر دے گی، مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہارا نازک دل میری سخت اور خوفناک بات سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے!؟ میرے کوی مہاراج! داسیوں کا یہ سندیش سُن کر میرے گندے اور پاپی دل میں یہ اُمنگ اُٹھی کہ ایسے سُندر اور باکمال شاعر کے مُنہ پر اگر میں تھوکوں گی تو میرے پاپی من کو چین نصیب ہو گا۔

مہاراج! تمہاری شاعری کا واسطہ، مجھ پاپن کو معاف کرو۔ پاپ کے آنکھ نہیں ہوتی، میں نے اس سُندر اور نوجوان کوی کو داسیوں اور اپنی سندر سہیلیوں کے بڑے مجمع میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

آہ! آج میں کہہ سکتی ہوں مہاراج! وہ کوی دیوتا کی طرح آیا، وہ کسی نشہ میں چور چور معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنا اک تارا چھیڑا، اور ایسا معلوم ہوا دھرتی و آکاش ناچنے لگے ہیں۔ ساری داسیوں اور سکھیوں کے جوڑے کھُل کھُل کر شانوں پر گر پڑے۔ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔ وہ بالکل بھول گئیں کہ میں ان کی مہارانی ہوں سب اس کوی کے گھونگریالے بالوں میں اُلجھ کر رہ گئیں، مگر کوی نے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور جیسے ہی اپنی کوتا ختم کی میرے چرنوں پر سر جھکانے کے لئے بڑھا، میرے غرور نے ایک حقارت سے پاؤں سکیڑ لئے اور اسکے مُنہ پر تھوک دیا۔ وہ مجھے ہرنے کیلئے آیا تھا مگر میری یہ کٹھورتا دیکھ کر ایک حقارت کے ساتھ میری طرف دیکھے بغیر میرے غرور کو روندتا ہوا رنگ محل سے چلا گیا اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ میری شکتی اور میری تمام طاقت پر تھوک کر کہیں چھپ گیا۔

مہاراج! ——— وہ چلا گیا مگر اُس دن سے میں چین سے نہ رہی، در و دیوار، داس اور داسیاں، پرجا اور درباری، دھرتی اور آکاش، سورج اور چندر سب میرے مُنہ پر تھوکتے معلوم ہوتے تھے۔ تمام جوتشیوں کو اک اشارہ میں راج محل کے اندر بُلایا گیا اور پوچھا گیا کہ مہارانی کا پاگل پن کیونکر دور ہو سکتا ہے۔ سب نے جواب دیا کہ کوی کے سراپ کو کسی کوی کی کوتا ہی ختم کر سکتی ہے۔ ... راشی

ہو سکتے ہیں مگر شاعر راضی نہیں ہو سکتا، مہارانی نے مہا پاپ کیا ہے اور انھیں ٹیڑ جنم کے چکر میں پڑ کر اپنے کرموں کا پھل بھوگنا پڑیگا۔ جوتش گیان بتاتا ہے کہ آج سے ایک ہزار سال بعد جب مہارانی محض اس رعایت کی بنا پر کہ وہ استری ہیں اور ان کا نام "رانی چاندنی" ہے۔ چاندنی کے پودے کے روپ میں اس سنسار میں جیون گزاریں گی اور پھر ان پر عام لوگ کوڑا کرکٹ ڈالیں اور تھوکیں گے، اس وقت پھر اک شاعر ان کے پاس سے گزرے گا جو اپنی شاعری سے انھیں ٹیڑ جنم کے چکر سے چھٹکارا دلائے گا۔"

مہاراج! یہ ہے میری کہانی! اگاؤ اپنی آتما کے اک تارہ پر اس پاک اور اس چاندنی میں اک ایسی کوتا جو مجھے اس حال سے رہا کر دے! جب سے تم آئے ہو، میں سمجھ گئی ہوں کہ تم میرے پاپ کی دوا ہو۔

دوسرے دن صبح سویرے راجہ کے تمام خاندان نے دیکھا کہ شاعر بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا ہے سب دوڑے، ضرور آج کوئی نظم نئی لکھی ہے، وہ ادب سے شاعر کی خدمت میں پہنچے۔ سب کے ہاتھوں میں خوشبو، پھول، صندل اور چندن تھا۔

۵۶

(پھول دیتے ہوئے)

ایک، مہاراج! کیا رات بھر نہیں سوئے!؟

شاعر، رات سونے کے لئے کب ہے، نیند انسانی زندگی میں ایک اضافی چیز ہے۔ اگر ہم جاگنے کی قوّت کو پا لیں تو ہم سو نہیں سکتے۔ پیارو! سو جانا، بیداری سے ہار جانے کا نام ہے!

دوسرا، مہاراج! کیا آپ اپنا نیا "الہام" اپنے سیوکوں کو نہیں سنائینگے؟ دیکھئے سورج دیوتا افق سے مکھڑا نکالے ہوئے گوش بر آواز ہیں۔

شاعر نے سر اٹھایا اور کہا:۔

"چاندنی رات میں، چاندنی کا پھول کاہی پتیوں سے اس طرح جھانکتا ہے جس طرح پاپ کے سینے سے نیکی کی آخری کرن! خالق کی عظمت اور پوجا میں گم ہو جانے والے زبردست ہوس ہیں کہ اس کو غیر محسوس حیثیت دے کر عظمت و بلندی کی آخری حد قائم کرتے ہیں، اور اس حد کو اپنی پرستش کا مرکز بنا کر اپنی بڑائی کا سامان کرنا چاہتے ہیں!؟ اس خالق کی پوجا کرنا جو لانہایت اور بعید ہے، ارفع ترین ہے، دور و بعید ہے جس کو شعور و ادراک نہیں چھو سکتے، کیا قریب، مسلّح، محدود، محسوس اور ذی شعور مخلوق کی پرستش کے مقابلے میں انسان کی بھول نہیں!؟

چاند میری دسترس سے دور سہی، مگر یہ چاندنی کا پھول جو رات کو سینکڑوں چاند اپنی گود میں روشن کرتا ہے کیا اس قابل نہیں کہ میری روح اس کا طواف کرے اور اسکے چاروں طرف بھونرا بن کر ناچے اور ابد تک ناچتی رہے۔ یہ پھول جو فطرت کے گوشۂ نازک کا کرن پھول ہے!؟ یہ چاندنی کا پھول!

جس باغ کی باغبانی، تیرے سپرد کی گئی تھی، تو نے اس کی بہار اور خزاں دونوں سے کیوں آنکھ بند کر لی ہے؟ پھولوں کی توہین، مالی کی توہین ہے، یہ چاندنی کا درخت اور اسکے پھول دھرتی کے سینے سے تیری شوبھا بڑھانے کیلئے نہیں کھلے ہیں۔ اگر تو رات بھر جاگتا تو صبح سویرے تجھے اندازہ ہو جاتا اے المظر اجکمار کہ یہ وہ گل ہے جس سے چمن کا تمام ماضی جھانک رہا ہے!؟ تمام!

یہ چاندنی کا پھول رات بھر مجھ سے جو کچھ کہتا رہا اے زندگی کے باغ کے نورس غنچو، وہی سب سے بڑا گیان ہے، پھولوں سے بے ادب ہوگے تو زمانہ تمہارے حسن سے با ادب نہیں رہے گا۔ یہ چاندنی کا پھول برسوں سے باغ میں اپنے کٹوروں میں شبنم کی صبوحی لئے ہوئے صبح سویرے اپنے ساقی کی نمائندگی کرتا ہے مگر تم نے دیکھا ہوگا جام! اسکے جام میں کبھی سرخ شراب نہیں دیکھی گئی۔ اسی طرح کس سادہ لوح نے تم کو یقین دلا دیا ہے "چاندنی کا پھول"، "گلاب" بن جائیگا۔ جو شخص تمہارے چاندنی کے پھول جیسے چہروں پر دھول اڑا لینے کی گستاخی کریگا اس کا چہرہ کبھی اوراقِ گل سے مس نہیں ہوگا۔"

کیا تم اس حقیقت کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ "چاندنی کا پھول" دنیا کے لئے صبح کی پوپھٹنے کا

بہتر بن تحفہ ہے، کیا تم اس سچائی سے انکار کر سکتے ہو کہ
یہ شبنم کا سب سے زیادہ مضبوط اور دیرپا پھول ہے، کیا تم
یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ادھر، دور بہت دور، اس سنسان
گوشہ میں جو "رات کی رانی" رات بھر اپنی مہک سے
فضا کو مہکاتی رہی ہے یہ اسکی بڑی بہن ہے جسکے سپرد
سورج کو نذرِ سحر کے طور پر چاندی کے تھال پیش کرنا
ہے؟ اور کچھ تسلیم نہیں کر سکتے تو کیا اس سے بھی انکار کر دو گے کہ یہ
شاعر کا دل ہے! یہ چاندی کا پھول!"

راجہ کے پڑپوتے ادب سے آنکھوں میں آنسوؤں کے پھول
لئے ہوئے اٹھے۔ چاندنی کے درخت پر ایک دھبہ باقی نہیں رہا۔ اسکی
شاخوں کے نیچے کی زمین ہیروں سے کچھ بڑھ چڑھ کر چمکدار ہو گئی۔

گردشِ ایام سے پھر کچھ دنوں کے بعد شاعر کا گزر اس محل میں
ہوا، مگر اب یہ محل، محل نہیں تھا، مندر تھا، جہاں چاندنی کے پھول
کی پوجا ہوتی تھی؟

(طبعزاد) (جملہ حقوق محفوظ) (سنہ ۱۹۳۷ء)

جالب مراد آبادی

سلام

تمہیں نسیمِ گلستاں سلام کہتی ہے
بہارِ حشر بداماں سلام کہتی ہے

گلوں کا سینۂ پرشوق چاک کر کے تمہیں
شمیمِ عطر بداماں سلام کہتی ہے

حسین تاروں کی بستی سے آن کر تم کو
غریبِ شبنمِ گریاں سلام کہتی ہے

حریمِ ناز میں جو باریاب ہو نہ سکی
وہی نگاہِ پریشاں سلام کہتی ہے

شفق کے روپ میں آ کے صبح و شام تمہیں
شعاعِ مہرِ درخشاں سلام کہتی ہے

نہ ہو سکی کبھی شبنم بھی جس کی محرمِ راز
وہ عصمتِ گلِ خنداں سلام کہتی ہے

حریمِ سینۂ پرشوق سے ہر اک لمحہ
ہنوز عظمتِ ایماں سلام کہتی ہے

صدائے قلبِ شکستہ نکل کے سینہ سے
بطرزِ مست غزلخواں سلام کہتی ہے

ہزار شوقِ فراواں سے آج گھبرا کر
ادب سے شامِ غریباں سلام کہتی ہے

مشتاق جلیلی حیدرآبادی

تاریک دائرے

پھر اُسے اگلی زندگی یاد آگئی اور وہ یاد نہ کرنے کی کوشش میں اُلجھا رہا پھر اسے اپنا چھوٹا سا جرمن ڈیزائن مکان یاد آگیا اور اسکے ساتھ ساتھ ہاسپٹل کے سب سے اوپر والی مریضوں کی قطار جنھیں وہ روز صبح دیکھتا تھا۔ پھر وارڈ نمبر ۳ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا وہ ریشمی بالوں والی ثریا اور بھورے بالوں کی آغوش میں دمکتا ہوا چہرہ...... اور وہ تو محض ڈاکٹر تھا۔ اور ڈاکٹر کی ڈیوٹی تھی مریضوں کی دیکھ بھال، پھر اگر دن میں کئی بار اس کے قدم وارڈ نمبر ۳ کی طرف اُٹھ جاتے تو کوئی بات نہ تھی، کیونکہ یہ تو اس کا فرض تھا پھر وہ کیسے نہ جاتا؟ پھر یہ دوسری چیز تھی کہ اسے کچھ خوف ہو گیا اور وہ اُدھر جانے سے خود کو روکنا چاہتا، پھر وہ ایسا نہ کر سکا اور وہ برابر جاتا رہا.... پھر اس کے ہاتھ میں نازک نازک کلائی سمٹ سمٹ گئی اور وہ اس کی نبض کی رفتار کو اپنے دل کی دھڑکن سمجھا، پھر اس کی نظریں نرگسی آنکھوں کی گہرائیوں میں گھوم گئیں اور وہ شراب جیسے سرور میں بہہ گیا، اور بہتے ہوئے اُسے زندگی کی تلاش ہو گئی، پھر وہ فریبی تخیلی وادیوں میں بھٹکتا رہا اور اس کے قدم کانٹوں بھری راہوں کی سمت بڑھتے گئے، مگر وہ کانٹوں کی نوکوں پر چلتا رہا، پھر وہ سمجھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا اس کی سانس سینے میں رُکنے لگی، اور اس نے اس پُراسرار ماحول سے نکل کر بھاگنا چاہا، پھر اس نے کوشش بھی کی، وہ رخصت لے گیا پورے ایک ماہ کی رخصت، وہ اب ہاسپٹل جائیگا ہی نہیں اور ہاسپٹل نہیں جائیگا تو گویا وہ کہیں بھی نہ جا سکے گا، اور جاتا کیسے؟ وہ تو رخصت پر تھا —— پھر تین دن اس نے گھر پر گزار دئے اور جس انتشاری حالت میں گزارے یہ وہ خود بھی نہ جان سکا وہ تو سمجھا کہ وہ ہاسپٹل میں ہے، وہ وارڈ نمبر ۳ میں سانس لے رہا ہے، اور اس کی نگاہیں مرمریں لبوں سے مس ہو رہی ہیں اور حالانکہ وہ تھا گھر ہی میں —— پھر تو اسے اپنے آپ پر بیحد غصّہ آیا اور اس نے "میتھالوجی" کی بڑی بڑی کتابیں اپنی نظروں کے سامنے کھول دیں، پھر اس کے کانوں میں چوڑیوں کی صدائیں شہنائی بنکر بجیں، وہ پڑھتا گیا، پھر اُسے سیمیں کلائیوں میں نبض کی رفتار یاد آگئی، وہ گھبرا اُٹھا اور اضطراب کے آغوش میں ٹہلنے لگا، پھر اُس نے سوچا، ان کتابوں میں کوئی جان نہیں، وہ شفاخانے یہاں سے نئی کتابیں کیوں نہ لائے؟ —— پھر وہ زینوں سے اترتا ہوا کار میں بیٹھ گیا اور وہ سڑکوں کے پیچ و خم پر دوڑ گئی، پھر کار رُکی، وہ اُتر پڑا، اور "شفنٹ" سے وہ بالائی حصّہ پر پہنچ گیا، اور سامنے وارڈ نمبر ۳..... وہ بے اختیار اس سمت بڑھ گیا اور اس کی نظریں چارٹ سے ملنے لگیں، ان دنوں ٹمپریچر زیادہ رہا، پھر اس کے ہاتھ میں حسین کلائی کسمسائی، اور اس کی نظریں گھڑی کی چھوٹی سوئی پر جم گئیں، پھر اُسے خیال ہوا کئی منٹ گزر گئے اور اس نے گھبرا کر کلائی چھوڑ دی ..... پھر اس سے شکایت کی گئی کہ تین دن سے کسی ڈاکٹر نے خبر نہ لی، وہ جھنجھلا اُٹھا، اور اس نے اپنی رخصت منسوخ کرالی۔

پھر ناتواں جسم اور ناتواں ہو گیا، کھانسی شدید ہو گئی آنکھوں میں کچھ ہلکے سیاہ دائرے پڑ گئے..... اور یہ اس سے نہ دیکھا گیا اور وہ دیکھتا بھی تو کیسے دیکھتا؟ پھر اس نے اس کے والدین کو بتایا کہ وہ یوں نہ جی سکے گی، میرج کے سنی ٹوریم کے ٹریٹمنٹ کا جواب نہیں، وہ وہاں ٹریننگ کے لئے بہت جلد جائیگا، اسے بھی وہیں بھیجدیا جائے —— پھر اسے بھیجدیا گیا، اور وہ سمجھا کہ اسے سچی خوشی حاصل ہو گئی..... پھر وہ اس کا تیماردار بن گیا اور اس نے کس کس طرح اس کی دلجوئی کی یہ وہ کیا جانے؟ کارڈ کی شعبدہ بازی، بیربل کے انتہائی دلچسپ لطائف، کوہ قاف کی پریوں کی کہانی، وہ گھنٹوں ان ہی لطیف مشغلوں میں اسے لئے رہتا، اور وہ ہنستی تو ہنستی ہی چلی جاتی، پھر وہ لبوں کی دلآویز

جنبشوں میں ڈوب کر اپنی ہستی کو بھول جاتا ——— اور دوسری طرف تمام ڈاکٹروں سے مشورے اور بڑے ڈاکٹر کے مکان کے دن بھر میں تین تین چکر کاٹنا، یہ تو اس کے روز کا معمول ہو گیا تھا ...... پھر ایسے ہی میں "فرینک" ہو گئی وہ بھی کامیاب فرینک ——— وہ گردن میں کئی دن تک درد محسوس کرتی رہی اور اس نے مسلسل کئی راتیں اس کے پاس بیٹھے بیٹھے گزار دیں پھر یہ اذیتیں اس کے لئے لذتیں بن گئیں، اور وہ دور افق کی گھاٹیوں پر زندگی کے خواب دیکھنے لگا ...... پھر یہاں اس نے اس کی فطرت کا عمیق عمیق نظروں سے مطالعہ کیا اور اس نے عجیب عجیب باتیں محسوس کیں، پھر اسے روحانی کوفت سے دوچار ہونا پڑا، اور اس کی چند حرکتیں اس کے لئے معمہ بن کر رہ گئیں اور وہ معمہ کیوں نہ بن جاتیں؟ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ وہ ہنستی ہنستی چپ ہو جاتی، اس کا چہرہ اُداس ہو جاتا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے، پھر وہ گھنٹوں خاموش رہتی ...... اور وہ گھبرا جاتا کہ ایسا کیوں ہو گیا؟ پھر یہ وحشت کن لمحات اس سے نہ دیکھے جاتے، اور وہ اپنی الجھنوں کو دور کرنے کے لئے کاٹج نمبر ۱۱ کی طرف بڑھ جاتا۔ اس میں نجمہ رہتی تھی اس کی دور کی ایک رشتہ دار، انتہائی سنجیدہ، انتہائی سادہ مزاج، یا پچھو کیسوں میں وہ صرف اسی کیس سے آشنا تھا، اور وہ گھنٹوں وہاں گزار دیتا، بھوتوں کی کہانیاں، مُردوں کے دلچسپ قصّے، روحوں کے تازہ تازہ حالات، وہ سب کہے جاتا، اور وہ ہنستی ہنستی تھک جاتی، پھر وہ اپنی دلی اذیتوں کو بھولنے میں کامیاب ہو جاتا، اور اس کے قدم اپنے کاٹج کی طرف اُٹھ جاتے، پھر اس کی نگاہیں اس کے متبسم چہرہ سے مل جاتیں، اور وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا، پھر وہ ہفتوں کاٹج نمبر ۱۱ کی سمت نہ جاتا۔

ایسے ہی میں عید آ گئی اور اس نے "سانگلی" سے واپسی میں ایک انتہائی قیمتی مالا خریدی، اور وہ اپنے دل میں کچھ انوکھی انوکھی تمنائیں لئے اس کے پاس آ گیا، پھر اس نے دور ہی سے مالا دکھائی اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، پھر وہ مالا اس کے گلے میں عجیب سا معلوم ہوا، اور اس کے حسن میں کتنا اضافہ کر دیا، یہ وہ کیا جانے؟ پھر وہ مسکرائی اور مسکراتی ہوئی نگاہیں اس کی نگاہوں میں ڈال دیں اور وہ لطیف بدوش بہار دل میں سمٹ سمٹ گیا ...... پھر وہ مسکراتے ہوئے لب سُکڑ گئے اور کلیوں کی طرح شگفتہ چہرہ کُملا گیا، پھر نیلگوں آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ بھیگ گئیں ...... پھر وہ اس معنی خیز تغیر کو دیکھتا رہا، اور اس کی عید کی ساری خوشی برباد ہو کر رہ گئی، پھر اس کے گلے میں سانس پھنس پھنس گئی، وہ گھبرایا ہوا اٹھا اور اس کے لرزیدہ قدم کاٹج نمبر ۱۱ کی طرف اُٹھ گئے۔

ایک تو اس کا مزاج شروع ہی سے چڑ چڑا تھا اور بیماری نے اور بھی چڑچڑا بنا دیا، اور ان چیزوں کا اثر سیدھا اس کی غذا پر پڑتا تھا۔ کہدیا آج ٹماٹے کا عرق نہیں پیا جائیگا، اور دودھ انڈے سے تو جی اُکتا گیا، اور موسمبی کے نام پر تو اسے سچ مچ غصہ آ جاتا ——— پھر اس کی اسے کتنی خوشامدیں کرنی پڑتیں؟ اور اُسے ڈاکٹری کے لکچر دئے جاتے، اور خون کی پیداوار کے بارے میں سمجھایا جاتا کہ زندگی کا دوسرا نام غذا ہے پھر اس کی ضد اس کے لئے خطرناک ثابت ہو گی، اور وہ سوچے تو کہ اسے کتنی صحت ہو گئی، پھر اس کی یہ ذرا سی لغزشیں حاصل شدہ قوت کو ضائع کر دیں گی، اور اُسے ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے پھر یہ کوئی عقلمندی بھی تو نہیں کہ اپنے باپ کو تباہ کر دیا جائے، اور وہ سوچے تو اسے کتنی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا، کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور وہ ان سب کا مقابلہ کرتی گئی، اور اسے یہی کرنا چاہئے تھا، پھر اس نے ایسا ہی کیا، مگر اب اسے اور قوی ارادوں سے کام لینا ہو گا، اور اس کی کٹھن گھڑیاں رہ ہی کتنی گئیں، یہی دو چار مہینہ، وہ برابر پہلے کی طرح مضبوط رہے گی ......

پھر اس کی ضد زیادہ دیر نہ رہ سکتی اور ٹماٹے کے رس کا گلاس اس کے ہاتھوں میں آ جاتا، پھر روز کے پروگرام پر وہ عمل کرنے پر مجبور ہو جاتی، اور وہ محبت پاش نظروں سے اُسے دیکھتا ہوا خوش ہو جاتا کہ وہ اس کے کچھ تو کام آ سکا۔

اے بی کے کورس کو ختم ہونے میں صرف چھ مہینہ رہ گئے پھر اس کے وزن میں ہر ہفتہ دو پونڈ کا اضافہ ہوتا رہا، اور اس کے گالوں کی زردی شفق شام جیسی سُرخیوں میں تبدیل ہو گئی ——— آنکھوں کے حلقے دُور ہو کر اُبھر گئے، پھر اس کا چہرہ جوانی کی نئی بہاروں سے تمتما اٹھا اور اس کے سارے جسم میں خون کی دوگنی تیزی سے دوڑ گئی، پھر اس کی آنکھیں آسمان کے تاروں جیسی چمک سے معمور ہو گئیں اور مقناطیسی ذرات اس کی آنکھوں میں اور گھل مل گئے، پھر کلائیوں میں چوڑیاں پھنس پھنس گئیں اور

اسے دوسری چوڑیاں پہننی پڑیں، پھر اس کی باہیں گداز گداز باہیں بن گئیں، اور شوخ دھانیاں یاقوتی ہونٹوں سے لپٹ لپٹ گئیں، اور اس کے ناتواں قدم قوی ہو گئے، پھر اسے اجازت مل گئی اور وہ سنی ٹورنیم کی حدود میں گھومنے لگی، پھر وہ مریضہ کے بجائے حسینہ ہی حسینہ بنکر رہ گئی ——— یہ سب کس کی محنتوں کا نتیجہ تھا؟ یہ وہ خوب جانتا تھا، پھر اودی اودی شلوار اور دھانی دھانی آنچل میں سموئے ہوئے غیر فانی حُسن کے بے پناہ جلووں میں وہ گم ہو گیا، اور نرم و ملائم زلفوں کی جھنڈ میں کھوتا ہوا نہ جانے وہ کہاں سے کہاں پہونچ گیا، پھر اُسے محسوس ہوا وہ ایک ایسی دُنیا میں سانس لے رہا ہے جہاں زندگی محبّت کیلئے سجدہ ریز تھی، جہاں کا ذرّہ ذرّہ مسرّتوں سے ہم آغوش تھا.... پھر وہ ان ہی خواب جیسی کیفیتوں میں ڈوبا رہا، اور گھنٹوں ڈوبا رہا، پھر اُسے دُنیا کی ہر چیز معمّہ معلوم ہوئی، اور وہ ہر معمّہ کو حل کرنے میں خود ایک معمّہ بن کر رہ گیا۔

ہوا مریضوں کے سانسوں کی طرح سرسرائی اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں سورج کی ناتواں کرنیں ڈوب گئیں...... وہ کالج نمبر ۱۱ کی طرف سے مُڑتا ہوا سنی ٹورنیم کی حدود سے دُور ہو گیا اور وہ ناہموار سی زمین اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان دیر تک چلتا رہا، پھر وہ ایک بلند سی جگہ بیٹھ گیا ——— اور دُور سے کاٹجوں کی قطاریں سیاہ لکیریں بن گئیں، پھر اُن میں کی مدھم روشنی قبروں پر جلتے ہوئے چراغ کی طرح معلوم ہوئی، پھر وہ سوچا، یہ اس کا یہاں دوسرا سال شروع ہو گیا، مگر وہ اس طویل عرصہ میں کچھ بھی تو نہ کر سکا، دیکھا جائے تو اسے کیسے کیسے مواقع حاصل ہوئے اور اس نے ضائع کر دئے، اسے کہدینا چاہئے تھا مگر وہ کہتا تو کیا کہتا، آج تک اسے مناسب الفاظ ہی نہ ملے جن میں وہ اظہارِ تمنّا کرتا، اور یہ تو کہنے کی باتیں نہ تھیں، سمجھنے کی باتیں تھیں۔ ... پھر اس نے تو اس کے لئے اپنی زندگی برباد کر دی نوکری چھوڑ دی، سارے دلچسپ مشغلے تباہ کر دئے، اور وہ ایسا کر کے بھی خوش تھا، کیونکہ اسے بے پناہ محبّت تھی، اور وہ خود اس کا اندازہ مشکل سے کر سکتا تھا، پھر اس کی سمجھ میں گھنٹوں نہ آسکا کہ وہ کرے تو کیا کرے، وہ اتنی بھولی نہ تھی، ناسمجھ نہ تھی، پھر اسکی محبّت بھری نظروں کو نہ سمجھنا کیا معنی؟ آجتک اس کے ساتھ وہ سیر کو نہیں گئی، آخر کیوں؟ ——— پھر اُسے خیال ہوا کہ

بغیر اس کے جی تو نہ سکے گا، اور اگر اس کو اس کی محبّت نہ حاصل ہو سکی تو گویا اس کی زندگی تاریک ہو گئی، مگر کیا اسکی ہمدردیوں کا اس کے دل پر کوئی اثر نہ ہو گا؟ یہ کس طرح ممکن تھا ——— پھر اسے اس میں ایک دم تغیّرات کے اکثر پیدا ہو جانے کا بُری طرح احساس ہوا، اور وہ سمجھا اس کی آڑ میں یقیناً کوئی راز ضرور مضمر ہو گا، مگر وہ اس راز کو حل کرے تو کیسے کرے، یہ وہ کسی طرح نہ جان سکا ——— پھر وہ جتنا سوچتا گیا اُتنا ہی اُلجھتا گیا، پھر وہ زندگی کے نشیب و فراز کے بھنور میں گھر گیا اور دیر تک گھرا رہا، پھر ایسے ہی میں اس نے تصفیہ کر لیا کہ وہ اپنی بزدلی کو چھوڑ دیگا، اور وہ اس سے زندگی کی بھیک مانگے گا اور برابر مانگے گا، پھر اس کی گھڑیاں روح پرسکونوں کی زد میں گزرنے لگیں گی، اور اس کے کانوں میں نغمۂ حیات کی جدکناتانیں ٹکرائیں گی، پھر وہ محض شُبک شُبک سے شرین کر رہ جائے گا ——— پھر ہواؤں کی موجیں اس کی ریشمی قمیص کو کپکپاتی ہوئی گزر گئیں، اور اس کی نظر افقی وادیوں میں اُبھرتے ہوئے تاروں پر پڑی پھر اِن کی نوکوں سے ٹکراتی ہوئی تاریک دائروں میں دھندلا گئی، پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا....... دفعتاً کسی کی آہٹ کی صدا اس کے کانوں میں گونجی، اور اس نے ایک سمت نظریں گاڑ دیں، پھر تاریکی میں ایک دھبّہ بتدریج اس کے قریب ہوتا گیا، اور وہ بے اختیار پوچھ اُٹھا۔

"تم کہاں نجمہ؟"

"بس یوں ہی چلی آئی، اب تو مجھے تفریح کی اجازت مل گئی۔"

وہ بولا "اتنی دور چلے آنے کی کیا ضرورت تھی، چلو واپس چلیں۔"

"اب آگئی ہوں تو کچھ دم لیکر ہی چلوں گی۔"

وہ ایک پتھر پر بیٹھتی ہوئی بولی، پھر اس کی تنفّس کی موجیں تیز تیز ہوائیں ملتی گئیں، وہ کافی تھک گئی تھی، پھر گلابی رنگ کا پلّو بالوں کے گرد لپٹا ہوا چہرے کی رنگت کی طرح نکھر گیا تھا۔ اور آنکھوں میں برق جیسی قوتیں مچلی جا رہی تھیں ——— پھر وہ اس سے کہنے لگا "یہ تم چھوٹے چھوٹے ناہموار سے ٹیلے جو دیکھ رہی ہو یہ محض ٹیلے ہی نہیں، ان کے نیچے تو ایک ڈ

آباد ہے، بالکل ہماری ہی طرح دُنیا، ہماری طرح مکانات، اور یہ بستی جنوں کی بستی کہلاتی ہے، ان میں بھی بادشاہ ہوتا ہے، ان میں بھی رعایا ہوتی ہے، مگر جیسے ہمارے یہاں جنگ ہوتی ہے وہاں نہیں ہوتی اور نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کسی کی کوئی آرزو ہی نہیں، پھر وہاں لڑائی کیا معنی؟ مگر ہاں اب تو سُنا ہے وہ ہوائی جہاز بھی بنانے لگے ہیں، کوئی تعجب کی بات نہیں وہ برابر بنا سکتے ہیں .... مگر اُن کی اصلی شکلیں خدا دشمن کو نہ دکھائے، یہ لانبے لانبے دانت، اور سر چار گز کا اوپر کی سمت، اور اسی کی مناسبت سے اتنے ہی دُگنے ہاتھ، اور اتنے دُگنے پیر، بالکل مُردوں کے ڈھانچوں کی طرح پتلے پتلے، اُف اس خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے ہیں ـــــ"

"بس بس تمہیں ان بے پر کی باتوں کے سوا آتا ہی کیا ہے۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "سنجیدہ گفتگو تم کیا جانو۔"

ـــــ وہ پھر مُسکراتے ہوئے اُٹھا اور دونوں کے قدم ایک ساتھ اُٹھتے گئے، پھر گہرے ہوئے تاروں کے کمپونڈ سے وہ ملے ہوئے چلتے رہے ـــــ پھر وہ خاموش دُنیا میں چلنے لگے، ـــــ ہر طرف مہیب سکوت بکھرا ہوا، اور اسی سکوت میں مریضوں کی ہزاروں سانسیں گھلی ہوئی، اور اسی کثیف خاموشی میں انسانوں کی نحیف اور کمزور کھانسی کی بھیانک صدائیں اور کبھی کبھی ایک دلدوز چیخ سینۂ سکوت کو توڑتی ہوئی چاروں سمت موت کا ڈراؤنا اور وسیع آغوش کھلا ہوا اور اس میں سہمی ہوئی نوجوانیاں، زندگی کی انتہائی وحشتناک تصویریں، بے بسی اور بے چارگی کی عجیب عبرت انگیز دُنیا، جہاں انسانوں کا وجود ہوتے ہوئے بھی ایک مستقل سناٹا وہ بھی گھبرایا ہوا، پھر وہی ایک ہی ڈیزائن کے تین کمروں والے مکانات اور بالکل ایک سمت مسہریوں کا رُخ اور ویسی ہی ساری مسہریاں، اور ان میں ایک ہی طرح بیٹھے ہوئے مریض، پھر سامنے ویسی ہی چھوٹی سی ٹیبل اور اس میں ویسے ہی رکھے ہوئے تام چینی کے ڈھکن دار اُگالدان، جیسے ایک ہی بیمار سارے ناچ میں سانس لے رہا ہو ـــــ پھر ہوا کی لہروں میں پیروں کی چاپ میں لرزتی گئیں، اور وہ اس کے کاٹج میں اسے چھوڑتا ہوا اپنے کاٹج کی سمت بڑھ گیا، یہ تو طے تھا ہی کہ وہ آج سب کچھ کہہ دیگا، اور اس خیال کے تحت اس کے قدم تیز ہو گئے

پھر جیسے ہی وہ کمرے کے اندر داخل ہوا، اُس نے کاغذ کے ایک پُرزے کو تیزی سے تکیہ کے نیچے چھُپا لیا، اور وہ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا، اس کے چہرے پر آج ایک خاص رنگت دوڑی ہوئی تھی، اور وہ اُسے مصوّر کی ایک دلکش تصویر کی طرح نظر آئی، پھر وہ اس سے گھنٹوں باتیں کرتی رہی، اور وہ ہر سیکنڈ ارادہ کرتا رہا کہ وہ اب سب کچھ کہہ دیگا، پھر وہ سوچتا کا سوچتا رہ گیا...... پھر اس کی نگاہیں مرمریں جسم سے ٹکرائیں اور رنگین لبوں کے حسین زیر و بم کو روندتی ہوئی پھول جیسے چہرہ کے گرد جم گئیں، پھر مدہوش کن لمحوں نے اسے اپنے آغوش میں چھپا لیا اور وہ بھول گیا اسے کیا کہنا تھا؟

پھر ایسے ہی میں کرسمس آگئی اور دُنیائے "سنی ٹوریَم" رنگا رنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ ہو گیا، پھر دواخانہ کے ہر ملازم کو نئے نئے کپڑے تقسیم کئے گئے، اور نرسوں کا لباس آج بجائے سفید رنگ کے رنگ برنگ کے رنگوں میں نہا گیا، پھر ان کی ٹولیوں کی ٹولیاں چاروں طرف بکھر گئیں، پھر حدِ نظر تک خلافِ معمول زندگی دکھائی دینے لگی، اور ایک مسرت کی لہر تھی کہ ہر سمت دوڑی ہوئی تھی، پھر بینڈ کی ہلکی ہلکی تانوں نے مریضوں کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی، اور ان کی نگاہیں دریچوں میں سے ہوتی ہوئی سامنے والے میدان کے چھوٹے سے مجمع پر جم گئیں، اور یہ دُنیا سے علیحدہ گوشہ بھی دُنیا کی شورشوں میں گم ہو گیا ـــــ پھر ہوا کی زد میں جھنڈیوں کی قطاریں لرزتی گئیں، اور شام کا دھندلکا پھیلتا گیا، پھر مخصوص حصار میں گول دائرے کی طرح بجلی کے چھوٹے چھوٹے لال اودے بلب روشن ہو گئے، اور اس کے عین درمیان ایک بڑا ہال روشنیوں کے طوفان میں جگمگا اُٹھا، اور دوسرے ہی منظر ایک حیات افروز منظر بن گیا ـــــ پھر صبح کے گجر کے ساتھ ساتھ نغموں کی لطیف صدائیں ہوا کے دوش پر بہہ گئیں اور شعریت انگیز سکوت ہر سمت چھا گیا، پھر سارے سنی ٹوریَم پر ایک مدہوشی سی چھا گئی...... پھر قریب ہی سے "کرسمس مبارک" کی صدا گونجی اور ایک نرس اس کی ٹیبل پر کچھ رکھ گئی، یہ بڑے ڈاکٹر کی طرف سے کرسمس کا تحفہ تھا، پھر نازک نازک اُنگلیوں میں وہ "پیکٹ" گھومنے لگا، اور اس میں جا کلیٹ نظر آئے پھر قرص کی گولیاں اس میں سے نکلیں، اور ایک چھوٹا سا آئینہ،

پھراس کے ساتھ ساتھ ایک ڈبیا جس میں معمولی مگر انتہائی خوبصورت انگوٹھی، پھراس نے ٹیبل پر اسٹیچو رکھتے ہوئے اپنی چھوٹی سی انگلی میں انگوٹھی پہن لی، اور دیر تک اسے دیکھتی رہی، پھر نہ جانے کیا جی میں آیا، اس نے وہ انگوٹھی اُتاری اور اس کی سمت بڑھادی، اور وہ اپنی انگلی میں انگوٹھی پہنتے ہوئے ایک نامعلوم کیف میں ڈوب گیا، پھراس کی نظر انگوٹھی کے کناروں سے مس ہوتی ہوئی اُس کی نگاہوں سے مل گئی اور اس کے لبوں سے نکلنے کے لئے چند جملے بے تابانہ تڑپ اُٹھے، پھراس نے گھبراکر اپنی نگاہیں ہوا سے لہلہاتی ہوئی جھنڈیوں پر گاڑدیں۔

پھر صبح کی دھڑکنیں گوشۂ مشرق میں پھیل گئیں، اس کا دل نہ جانے کیوں گھبرا اٹھا، پھر وہ چمن کے پھولوں کی، نکہت پاش پھولوں کی فضاؤں میں سانس لیتا ہوا میرج کے شہر کی سمت بڑھ گیا، کچھ نہیں، صرف چند بڑی دوکانیں اور تنگ و تاریک گلیوں کے سوا کچھ نہ تھا، پھراس کے قدم سرکاری ہاسپٹل کی طرف اُٹھ گئے اور اسے اپنا ہاسپٹل یاد آگیا، بالکل وہی مریضوں کی قطاریں اور وہی مسہری پر نمبر ا و نمبر ۲ کے نشانات، کسی کے کراہنے کی آواز اور کوئی موت سے ہم آغوش ——— پھر وہ ہر مریض کے چہرے کو بغور دیکھتا ہوا گزرنے لگا، پھراس کا جی اکتا گیا، اور وہ لوکل کی طرف لپکا، پھر "سانگلی" میں وہ اُتر پڑا، اور اسٹیشن کی حدوں سے دُور ہوکر وہ ایک شاہراہ پر چلنے لگا، کشادہ کشادہ سڑکوں پر کبھی ایک آدھ موٹر گزرجاتی تو گزرجاتی، ورنہ وہی سائیکلوں کی بھیڑ ——— پھراسے لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی نظر آئیں، کسی کے ہاتھ میں کتابیں کسی کے ہاتھ میں بستہ اور کسی کے ہاتھ خالی، ان میں سے بعض انتہائی حسین شکلیں نوشگفتہ کلی کی طرح نظر آئیں، اور اس کے ساتھ ساتھ چند ایسی صورتیں بھی نظر آئیں جنھوں نے اُن نوخیز بہاروں کو بھی پژمردہ بنادیا، اور وہ سرسری نظر ڈالتا ہوا گزرگیا پھر وہ ایک دوکان کی طرف بڑھا، اُسے ایک ٹانک اس کے لئے خریدنی تھی، اور وہ بوتل کو جیب میں رکھتا ہوا چل دیا ———

پھر وہ ایک سنیما کے بوٹ کے پاس رُک گیا، اور اُسے یاد آیا کہ "دشمن" اس کا دیکھا ہوا تھا، اور اس نے اس کھیل کو بے حد پسند کیا تھا، اور واقعی میں تھا بھی بڑا پاکیزہ فلم، مگر تھا دق کا، .... پھر وہ ان ہی الجھنوں میں آگے بڑھتا گیا، اور

اسی طرح اس نے کئی گلیاں اور طے کیں، پھر وہ راجہ صاحب کی پُرانی وضع کی کوٹھی پر سے گزرتا ہوا بہتے ہوئے کرشنا گھاٹ پر سانس لینے لگا، پھر ہوا کے پانی میں سوتے ہوئے جھونکوں نے اس کی ساری تھکن فوراً دور کردی، پھراس نے کوٹ کے بٹن کھولدئے اور پانی کی سطح کے قریب بیٹھ گیا ——— اور وہ کاندھوں پر گھڑے لئے سیڑھیوں سے بل کھاتی ہوئی دوشیزاؤں کی ٹکڑیاں اتریں، اور ساڑیوں کو سمیٹتی ہوئی پانی میں کچھ دور چلی گئیں، پھر جسمِ سیمیں کا عریاں حصّہ پانی میں چاندی کی کرنوں کے عکس کی طرح معلوم ہوا، اور نازک نازک شانے گھڑوں کے بوجھ سے جُھک جُھک گئے، پھر ماتھے پر لال لال ٹیکا آسمان کی پیشانی پر تنہا تارے کی طرح نظر آیا، اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر قدم رکھتی ہوئی وہ نظروں سے اوجھل ہوگئیں ——— پھر وہ پانی کی موجوں کو دیکھنے لگا، اور وہ سوچا، عجیب اضطراب ؟ سینۂ آب کو سکون ہی نہیں ؟ ہمیشہ لرزیدہ زندگی ؟ پھراسے دہیں کہیں ایک کشتی دکھائی دی، اور اسے خیال ہوا کہ وہ اس کو ایک دن ضرور سیر کرائے گا، اور دونوں دور تک نکل جائیں گے، دریا کے بیچ و بیچ میں کشتی رنگیتی چلی جائے گی، پھر اگر ایسے ہی میں طوفان آگیا اور کشتی ڈوب گئی تب ؟ پھراس نے گھبراکر آنکھیں موند لیں ——— پھر جھاڑ کی ٹہنیاں آپس میں ٹکرائیں، اور اسے احساس ہوا یہ اس کا تیسرا گھنٹہ گزرنے لگا، پھر بھی اس ماحول سے اس کا جی نہ بھرا، اور وہ چاہتا تھا وہ ایسے ہی بیٹھا رہے پھر مغربی کناروں میں سورج سُرخ ہونے لگا، اور بڑے بڑے پہاڑوں کی چوٹیوں پہ زرد زرد کرنیں ناچتی ہوئی ڈوب گئیں، پھراسے اِکبارگی محسوس ہوا کہ آج اس نے صبح سے نہیں دیکھا اور اتنا وقت وہ کیونکر گزار سکا ؟ یہ اس کی سمجھ میں نہ آسکا... .... پھر ہوا سرسرائی اور وہ اس کی آغوش میں چل دیا،

پھر وہ ایک لاری میں سوار ہوگیا، اور لاری شہر کے ممتاز لوگوں کے مکانوں سے گزرتی ہوئی "سنی ٹوریم" کے پاس رُک گئی، پھر وہ دُنیا کے ایک علیحدہ گوشے میں چلنے لگا، اور اس کے قدم تیز ہوتے گئے، پھراس کے کانوں میں "رضوی، رضوی" کی دوبارہ جیسے صدائیں گونج گئیں، مگر وہ رُکا نہیں چلتا گیا، پھر اس کی نظریں دور ہی سے اپنے کاٹج کی طرف اُٹھ گئیں، پھراسے کوئی نئی شبیہ نظر آئی، اور وہ حیران حیران سا وہاں پہنچا، پھراسے معلوم ہوا کہ

نووارد کا نام زیدی تھا، اُس کا کوئی رشتہ دار، نوجوان سا تھا جس کی بائیس سال عمر ہوگی، سیدھے علی گڑھ سے یہاں آتا ہوا ——

پھر اس کی سہمی ہوئی نظر ارغوانی چہرے پر پڑی، اور اس کا چہرہ اسے پھول کی طرح شاداب نظر آیا، اور لبوں پر اک بہکی ہوئی مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، پھر اُسے خیال ہوا وہ اتنی حسین اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئی، پھر ان دونوں کی نگاہوں کے ایک ہلکے سے تصادم نے اسے نجانے کیا بنا دیا، پھر اس کی آنکھوں میں ایک دم تاریکیاں سما گئیں —— اور اس کے قدم کاٹج نمبر ۱۱ کی سمت تیزی سے اُٹھ گئے۔

پھر وہ چمن کی بنچ پر بیٹھا ہوا کچھ کھا سا، اور پسینہ کے قطرے اس کی پیشانی پر کچھ ناچنے لگے، پھر دستی سے اس نے اپنی بھیگی ہوئی پیشانی پونچھ لی، اور اس کی نگاہیں دُور دُور شام کے دھوئیں میں گھومتی ہوئی سامنے چھوٹے سے اسٹیشن پر جم گئیں، پھر سبز ساڑی کے آغوش میں گلابی گلابی چہرہ بالکل پتوں کی آڑ میں چھپے ہوئے پھول کی طرح معلوم ہوا، زلفیں سنوری ہوئی اور پلّو سر سے ڈھلکا ہوا .... پھر وہ بہکی ہوئی چال چلنے لگی اس کے بازو سے ایک بازو اور مل گیا، پھر دونوں دوش بدوش چلتے ہوئے صدر دروازے میں داخل ہوئے، اور وہ ہاتھوں میں ہاتھ ملائے ہوئے ایک سمت بڑھ گئے، پھر کچھ دور چل کر وہ اس کے شانے کا سہارا لئے چلتی رہی، اور دونوں کے قدم ایک ساتھ اُٹھتے گئے .... وہ اس طرف دیکھتا رہا اور دیکھتا گیا، پھر اس کی نظر دُھندلا گئی، اور پلکوں تلے کالی راتیں اُمنڈ اُمنڈ گئیں، پھر وہ تلخیوں کے تیز و تند دھارے پر بہنے لگا اور بجلی کی تیزی کی طرح بہنے لگا، پھر زندگی کے کئی المناک نقشے اُس کی آنکھوں کے سامنے کھنچ گئے، اور وہ ان نقشوں کی بھیانک لکیروں میں بسا بس گیا، پھر اسے دُنیا کی تمام رعنائیاں حوادثات کے غضبناک طوفان میں گھرتی ہوئی نظر آئیں، اور آن کی آن میں برباد ہو کر رہ گئیں، پھر اُس نے دُنیا کی حدوں سے ہٹ کر چلنا چاہا، مگر اسے معلوم ہوا تاریکی کے سوا کچھ نہیں، پھر اس کی نظریں ایک کملائے ہوئے پھول پر پڑیں، جس کی گلابی پتیاں زرد پڑ چکی تھیں اور وہ مارے ندامت کے تھنی سمت زمین کی طرف جُھک گیا تھا، پھر وہ گھبرا کر اُٹھا، اور اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم بڑھ لئے، پھر اس نے اپنے آپ کو کاٹج نمبر ۱۱ میں سانس لیتے ہوئے محسوس کیا۔

پھر ہوا پتوں سے ٹکرائی اور رات ظلمتوں کے چشموں میں بہتی گئی، پھر بادلوں کے بھورے اور سیاہ تودے چاند تاروں کا آسمان بنے ہوئے دُور تک پھیل گئے، اور ہلکی سی گرج کیساتھ ہی بجلی تڑپ تڑپ گئی .... پھر وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، مگر نیند اس سے کوسوں دُور تھی، اور وہ کچھ نہ سوچنے کی کوشش میں سوچتا گیا، پھر اس نے سوچا کیا؟ یہ وہ خود نہ جان سکا —— دفعتاً کچھ باتوں کی آوازیں سامنے والے کمرے سے آتی ہوئی سُنائی دیں، اور اس نے ساری توجہ سے اُس طرف کان لگا دئے، وہ بولی ”تم کیا جانو؟ تمہارے بغیر اتنے دن ہم نے کیسے گزار دئے، اگر یقین نہ آئے تو ڈاکٹر سے پوچھ لو ——“ پھر اس نے زور سے اپنے کانوں میں اُنگلی دھر لی، اور اس کی سانس لمحہ بھر کے لئے رُکی اور چلنے لگی، پھر اسے رات کے سینے میں بڑے بڑے گھاؤ پڑتے ہوئے نظر آئے جس میں موت کی بھیانک شکلیں اور بھیانک ہو گئیں اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس طرف دیکھا کیا، اور اس کے جسم کا رواں رواں کسی نامعلوم خوف کی لرزش میں کانپ کانپ گیا، پھر جلیبیوں کی یورشوں میں اس کی جوانی کی بہاریں جُھلس جُھلس گئیں، اور وہ اپنی خوابیدہ تمنّاؤں کے جلے ہوئے ڈھیر کو دیکھ کر مسکرا اُٹھا، پھر اسے محسوس ہوا، اسے تاریکیوں کے وسیع ترین غار میں دھکیل دیا گیا، اور وہ اس میں چل پڑا، پھر نکیلے پتھروں کی مسلسل رگڑ نے اس کے جسم کو چھلنی کر دیا، اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا ——

—— پھر ہوا کے تیز تیز جھونکے کھڑکیوں کے پٹوں سے ٹکرا کر وحشتناک آوازیں پیدا کرنے لگے، اور خاموشیوں میں تمام درختوں کی بیک وقت شورشیں آواز کی ایک دُنیا بن گئیں۔

—— پھر اسے اس کے بائیں بازو کے ہلکے ہلکے درد کی آغوش میں دل کی ملبوس دھڑکنیں سُنائی دینے لگیں، اور وہ بے مائیگی اور بے چارگی میں لانبی لانبی سانس لینے لگا ....

پھر اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے گئے، اور وہ سمجھا اُس کے سارے جسم پر زہریلے جراثیم رینگنے لگے، پھر وہ پسینہ میں نہا اٹھا، اور اس کا تنفس تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔

پھر تاریکیاں چھٹیں، اور ۳۰ نومبر کی صبح بتدریج پھیلنے لگی، پھر اُسے یاد آیا، انجکشن لئے ہوئے پورا ایک مہینہ ہو گیا، پھر

آج اس کے انجکشن لگے گا۔ یہ تو سنی ٹوریم کا قانون تھا کہ ہر بیمار کو ایک ایک مہینہ بعد یہ جاننے کے لئے انجکشن دیا جاتا کہ وہ متاثر تو نہیں ہوا؟ اور اسی اصول کے تحت آج اسے انجکشن لینا تھا، پھر اس نے اپنا نیا سوٹ نکالا اور آئینہ میں گھنٹوں ٹائی لگائی گئی، پھر اس کی نظر کسی تبسم لب کو ڈھونڈتی ہوئی کسی سمت دوڑ گئی، پھر وہ وارڈلوں کے گردو پیش میں چھپا ہوا صدر ہال پہنچ گیا، پھر انجکشن سوئی اس کے بدن میں، اور پھر لمحہ بھر کے لئے چبھی اور الگ ہو گئی، پھر سارے ڈاکٹروں کی نگاہیں اس کے بازو سے لپٹی رہیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بازو سوج گیا اور ڈاکٹر کرچین چیخ اٹھا "اسے کاٹیج نمبر ۷ میں لٹا دو"۔

——— پھر اسے لٹا دیا گیا، مگر اس کے لبوں پر بدستور مسکراہٹ کھیل رہی تھی، یہ خبر بجلی کی طرح تمام میں دوڑ گئی، پھر وہ بھاگی بھاگی اس کے پاس آئی اور آکر بولی۔

"یہ کیسے ہو گیا ڈاکٹر؟" وہ یہ کہکر دیر تک روتی رہی، پھر وہ آنچل میں آنسوؤں کو جذب کرتی ہوئی بولی "میرے اچھے ہونے کی تمام خوشی برباد ہو گئی" وہ پھر رو پڑی ———

——— اور وہ آنسوؤں کی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں دیکھتا ہوا خوش ہو گیا کہ محبت کی انتہائی معراج اس سے زیادہ اور کیا ہو سکے گی؟

"میں جا رہی ہوں ڈاکٹر" اس کی رگوں میں زندگی کی لہریں دیکھ کر اس کے لبوں پر تبسم پھیل گیا، پھر اس نے لیٹے ہی لیٹے "اچھا" کہا ——— پھر ہوا مریضوں کی اکھڑی ہوئی سانسوں کی طرح گزری، اور پیپل کے درخت کے پیچھے سورج کی کرنیں لرزیں اور دم توڑ دیا۔ . . . .

پھر اس کی کار کاٹیج نمبر ۱۱ کی طرف سے مڑتی ہوئی "سنی ٹوریم" کی حدوں سے دور ہو گئی ——— اور وہ سوچتا رہ گیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا، پھر اس کا ذہن زندگی کے مختلف گوشوں میں دوڑ گیا، اور دیر تک دوڑتا رہا، پھر آنکھوں میں تاریکی کے مہیب پردے سما گئے اور وہ گم صم بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا، پھر اسے قلب و روح کی راہیں مسدود ہوتی ہوئی نظر آئیں اور وہ گھنٹوں ان ہی راہوں پر چلتا رہا . . . . پھر ایسے ہی میں پانی کی تیز تیز بوندیں طوفانی ہواؤں کو چیرتی ہوئی برسنے لگیں، اور ساری کائنات ایک مسلسل شور میں نہا اٹھی، پھر اس

کاٹیج سے اس کاٹیج کی نظر آنے والی روشنی مدھم ہو گئی اور ہر طرف ایک خوفناک سناٹا چھا گیا، پھر بجلیوں کی چشمک زنی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی ——— پھر کھڑکی سے ہلکی ہلکی پھوار چھن چھن کر اس کے بستر کی شکنوں میں جذب ہوتی گئی، اور وہ اس طرف توجہ نہ کرتا ہوا کسی الجھن میں ڈوب گیا، پھر طرح طرح کے پریشان کن خیالات اس کے دل کی گہرائیوں میں بیدار ہوتے گئے، اور وہ اپنے وجود سے خوف زدہ ہوتا گیا، پھر سامنے دیوار پر کچھ نقوش بننے لگے، اور کسی کے لبوں کی حسین حرکتیں اسے یاد آ گئیں، پھر ایک دلآویز چہرہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا، اور جیسے "میں جا رہی ہوں ڈاکٹر" کی دلدوز صدا اسے سنائی دینے لگی، اور اس کے ساتھ ہی کچھ قدموں کی آہٹ اس کے کانوں میں آئی، وہ پکار اٹھا "ثریا ثریا" ——— مگر اس کی نظریں کسی اداس چہرے سے مل گئیں، اور وہ گھبرا کر پوچھ اٹھا "تم کہاں نجمہ!" اور وہ زبردستی لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتی ہوئی بولی "یوں ہی آ گئی رضوی" پھر وہ وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی، وہ بری طرح تھک گئی تھی۔

"اتنی رات کو"

"ہاں ڈاکٹروں نے چلنے سے روک دیا ہے، چھپ کر آئی ہوں"

"پھر تم کیوں آ گئی نجمہ، دیکھو تو سنبھل کر گر رہی ہو"

پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور نہ جانے وہ کیوں دیر تک روتی رہی، پھر اس کی سانس رکتی ہوئی چلی اور وہ اس کا بھیگا ہوا جسم سرد سرد جھونکوں سے کپکپا گیا۔

——— وہ اسے دیکھتا رہا مگر اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ ایسا کیوں، پھر وہ عالم مبہوتیت میں سانس لینے لگا، اور اس کے دل و دماغ کی ساری قوتیں سلب ہو کر رہ گئیں، پھر ایک نامعلوم بے ہوشی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ———

پھر وہ چونکا، مگر وہ جا چکی تھی۔

پھر اس کی خواہش پر اسے کاٹیج نمبر ۵ میں منتقل کر دیا گیا، اور وہ وہاں پہنچ کر اور بھی اداس کر دیا گیا، پھر اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ لیٹی ہوئی ہے، وہ بیٹھا ہوا ہے، اور اسے دنیا بھر کی باتیں یاد آ گئیں، اور وہ شروع سے ایک ایک

یاد کر تا گیا ——— اور اس کی نبض کی رفتار سست پڑتی گئی۔

پھر ایک شب وہ سوچتا رہا کہ اس کے اتنے تار آئے مگر اس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا، اور یہ اس نے برا کیا، پھر اس نے سوچا خیر کل وہ کئی تار ایک ساتھ بھیج دیگا، اور ابھی اس نے اچھی طرح تصفیہ بھی نہ کیا تھا کہ بچھمن کی آواز اُسے سُنائی دی' پھر اُس نے سُنا، وہ کلّو کی ماں سے کہہ رہا تھا "کمار بابو نے رات سانس توڑ دی" ——— پھر اسے کھانسی کے ایک شدید دورے نے بے جان کر دیا، اور وہ بمشکل مسہری کے سہارے بیٹھ سکا، پھر اس کی نظریں کاٹج نمبر ۴ پر پڑیں .... وہ خاموشیوں کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔

پھر دن بھر کاٹج نمبر ۵ میں ڈاکٹروں کی بھیڑ لگی رہی، اور کرچین ڈاکٹر کوئی دو دفعہ آیا، پھر پورا دواخانہ اس چھوٹی سی جگہ میں سمٹ سمٹ گیا، اور نرسیں گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر سے ادھر دوڑتی رہیں، پھر بڑے بڑے آلات وہاں دکھائی دینے لگے، اور نلیوں کے ذریعہ "آکسیجن" پھیپھڑوں میں پہنچائی گئی، پھر دُور سے لمحہ بہ لمحہ انجکشنوں کی سوئی چمکتی ہوئی نظر آئی ——— مگر شام ہوتے ہوتے بھیڑ چھٹ گئی، اور سکوت چھا گیا۔

پھر نجمہ کے سیاہ حلقوں میں دو زرد زرد آنکھیں چمکیں، اور ان کی ناتواں نظریں کاٹج نمبر ۵ سے لپٹ لپٹ گئیں .... وہ تاریکیوں کا ڈھیر بن گیا تھا۔ .... پھر تیزی سے اس کا وزن گھٹ گیا۔

(صفحہ ۳۲ کا بقیہ مضمون)

کے سبب صدیوں تک نوک زباں رہے، اس میں ادب کا اتنا تصور نہیں ہے جتنا وقت کا، ہمارا عہد بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے، اس لئے چیزوں کی قدروں میں بہت جلد فرق پیدا ہو جاتا ہے، اگر پہلے ادب کو بھی اس کی تاریخی اہمیت اور نسلوں کی پسندیدگی کے اثرات کو ذہن سے دور رکھ کے تحلیل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کس قدر کم ادب ایسا ہے جس پر ہماری نسل بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

قدیم جکڑبندیوں اور رسمیات سے آزاد ہو کر جدید ادب کے کھل کھیلنے کی تمنا اپنے لئے نئی نئی شاہراہیں بنا رہی ہے، یہاں تک کہ کبھی کبھی اپنے انقلابی نشے میں انتہا پسند (extremism) محسوس ہونے لگتی ہے، ادب میں اس اثر موضوعات سے گزر کر اصناف کی قطع و برید اور ترک و انتخاب پر پڑ رہا ہے، اب فارم (Form) کی اہمیت ثانوی رہ گئی ہے اور اسے موضوع کا ہر صورت میں تابع رہنا پڑتا ہے ادیب، اگر کسی طرح بھی صنف اس کے راستہ میں حائل ہوتی ہے، تو اس کو ٹھکرا کر ایک جداگانہ روش اختیار کر لیتا ہے، اس رجحان سے لاتعداد نئی صنفیں ظہور پذیر ہو رہی ہیں جو رسمی پابندیوں سے قطعی بے پروا معلوم ہوتی ہیں۔

ابھی ادب کے ہر عنصر پر علیحدہ علیحدہ حکم لگانا قبل از وقت ہوگا، اس میں شک نہیں کہ موجودہ عہد کے ادب میں بھی کچھ چیزیں وقتی اور کچھ رطب و یابس ہوں گی، لیکن مجموعی طور پر اس کی افادیت سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے، اسی طرح ہر عہد کے ادب اور خصوصاً ادب عالیہ (classical literature) میں یقیناً کچھ پودے ایسے ہیں، جن کی جڑیں رہتی دُنیا تک سوکھنی دشوار ہیں، مگر اس کے معنی یہ کسی طرح نہیں ہوتے کہ ہم حیات کی جدلیاتی (dialectical) حقیقت سے انکار کر دیں اور ترقی کہتے ہوئے سماج کے راستہ میں روڑے اٹکائیں۔

پرتھوی ناتھ شرما ایم۔اے

شاعر اور چٹان

کتنی مستحکم چٹان !

صدیوں کی بنیادوں پر کھڑی وہ چٹان ہر روز مستحکم سے مستحکم تر ہوئے جا رہی تھی۔ سنگ خارا والی چٹان، ونود نے ان پتھروں کو اپنے ہاتھوں سے مس کیا، کتنی سخت اور مضبوط چٹان ...... اتنی سخت کہ ہزاروں ٹن وزنی ہتھوڑے بھاپ اور بجلی کی مدد سے اُسے نہ توڑ سکیں۔ ونود کا خیال، شاعر مسکرا دیا، اُس کے خیالات بھی اس چٹان کے مانند مستحکم بننا چاہتے ہیں۔ بننے کی کوشش کی ہے مگر.... ..... ونود اُس چٹان کو محسوس کر رہا تھا، اتنی سخت چیز کا وہ خیال تک بھی نہیں کر سکتا۔ کتنی سخت، اُس کے خیالات سختی کا اندازہ لگانے کی خاطر مختلف شاہراہوں پر بکھر گئے۔ مگر وہ شاہراہیں پھیکی پڑ چکی تھیں، سختی کا خیال ونود کو تڑپانے لگا۔ آخر کتنی سخت، وہ چٹان کتنی مستحکم ہو سکتی ہے۔ شاعر کے عزم سے زیادہ مضبوط۔ ایں! ہرگز نہیں شاعر کا خیال چٹان سے زیادہ مستحکم ہے۔ نہایت ہی مستحکم ..... ونود نے پھر چٹان کو محسوس کیا۔ ہرگز نہیں، چٹان کبھی مستحکم نہیں ہوتی خیال چٹان کو سخت تر بنا دیتا ہے۔ ہا ہا ہو ہو .... ونود ہنس دیا چٹان اس کے خیال میں گھلتے گھلتے بکھر سی گئی، ریزہ ریزہ ..... ذرّات، گرد، مٹی ..... ہرگز نہیں! شاعر کا عزم چٹان سے زیادہ سخت ہے۔ ونود کے خیالات نے اُس کی پیشانی پر پسینے کے موتیوں کو بیدار کر دیا۔

"اُف" ونود نے پیشانی سے پسینہ کی بوندوں کو پونچھا۔ "اُف" کبھی کبھی خیالات بھی ہمیں ایسی ایسی غلط شاہراہوں میں بھٹکنے دیتے ہیں کہ ہماری ان دو آنکھوں کے سامنے مایوسیوں کے سوتے پھوٹ اُٹھتے ہیں ان سوتوں کے سامنے عقلِ انسانی سوائے بے بسی کے ہاتھ پیر مارنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی۔

چٹان کا خیال ونود کو خیرباد کہہ رہا تھا، خیالات نے اُسے کتنا مضمحل کر دیا تھا، اور وہ زندگی کے اس پُر آشوب زمانے میں کچھ سہارا ڈھونڈنے اور تھکاوٹ رفع کرنے کے خیال سے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی تھکان اُتارنے کے خیال سے پیشانی کو ہاتھ کی ہتھیلی پر سہارا اور گری ہوئی نگاہوں سے نیچے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس ابدی خاک کی طرف جس میں صدیوں کے طوفان کی نشانیاں ہیں جو بہرصورت قائم رہنے کی کوشش کرتی ہے خون کے دریا میں نہا نہا کر پھر سورج کی نکھری کرنوں اور نیلے آسمان کے احساس میں اپنی پرانی خصوصیتوں کو حاصل کر لیتی ہے۔ ابدی خاک.... ..... ونود کی پیشانی پر سلوٹیں سی نمودار ہوئیں وہ بھی تو اس میں پیدا ہوا ہے، اور اسی میں مل جانے کے لئے۔ اور ابدی خاک، وہ ہنستی رہتی ہے، دُنیا کی ہر ایک عجیب و غریب بات اُسے ہنسنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ وہ دو فقروں کے سوائے اور کچھ نہیں جانتی۔ "مجھ سے اُٹھو" اور "مجھ میں ہی غائب ہو جاؤ"۔ دُرست، درست، ابدی خاک .... تجھ سے اُٹھیں، اور تجھ میں غائب ہو جائیں۔ نہیں! شاعر کا خیال کہنے لگا۔ ہرگز نہیں۔ آخر کیوں؟ ابدی خاک سے اُٹھ کر پھر ابدی خاک میں مل جانا، عجیب حماقت ہے، جسم۔ ونود پھر مسکرایا۔ صرف جسم، اور شاعر کی روح ...... وہ کبھی خاک میں نہیں مل سکتی۔ وہ تاروں بھری راتوں میں آسمان پر گاتی پھرتی ہے، افق کا آنچل اُٹھا اُٹھا کر اُس کے شرمیلے مگر خوبصورت چہرے کی زیارت کرتی ہے، درختوں کی ٹہنیوں کے ساتھ ناچتی ہے، اور گم کردہ راہ مسافر کی المناک نگاہوں میں جذب ہو کر اُس شاہراہ پر کھڑے ہو کر نسلِ آدم کو تلقین کرتی رہتی ہے۔ محض چند لمحے، خوشی کے چند لمحے، اور اُن لمحوں میں ہم المناک نگاہوں سے ہر کس و ناکس کے دل پر غم کی پرچھائیاں ڈالتے رہتے ہیں، اصل زندگی خوشی کا خیال ہے، محض خیال ......'

"رانگا" کچھ سُریلی سی آواز۔ کوئی چٹان تلے گھوسلے کی بیلوں کو چھیڑتا چلا جا رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ' اور ..... گھوسلے مسکرا سی اٹھی ...."رانگا" ونود اُس آواز میں گم ہو گیا۔ شاید یہ اُس کے کھوئے ہوئے زمانہ کی صدائے بازگشت ہو۔ جو اُس کے کانوں میں بار بار گونج رہی تھی۔

"رانگا ٹھیر!" ونود جھکا۔ چٹان تلے رانگا اور اس کا ساتھی اُس ساتھی کے چہرے پر گم شدہ خوشی کی پرچھائیاں، ایک [illegible] کا نور جو برسات کے بعد نیلے آسمان کی طرح نکھرا ہوا تھا۔

"رانگا" دوشیزہ نے اپنے [illegible] ہونٹوں کو [illegible] سار دں

پر خون دوڑاتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "رانگا تو پیٹھ سے میرے لئے کوئی چیز نہیں لایا۔ یہ بات ٹھیک نہیں رانگا۔" وہ تو دچٹان کے پتھر کی آڑ میں یہ سب باتیں سننے لگا۔

"کیا چیز۔ صرف بانسری کے لئے پیسے پاس تھے۔ لے آیا۔ دیکھ اور جب میں اسے بجاتا ہوں تو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" رانگا مسکرایا۔ اُس نے بانسری کو منہ سے لگایا۔ "سن نینا۔ سن !"

دو مورتیاں اُس چٹان تلے بیٹھ گئیں۔ رانگا نے بانسری بجانی شروع کردی۔ بانسری کا پھندنا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ رانگا کی نگاہ دُور اُفق کی لکیروں میں کسی چیز کو کھوج رہی تھی، اُن تاروں کو جو کبھی کبھی خود بجنے لگتے ہیں، اور جب اُن پر اُنگلیاں پھیری جاتی ہیں تو وہ خاموش رہتے ہیں۔

"رانگا" نینا نے رانگا کی طرف دیکھا۔ رانگا تیری بانسری بہت اچھی ہے۔

"ہاں!" رانگا نے گردن ہلائی۔ "یہ کبھی کبھی دل کی بات کہدیتی ہے نینا! جب چشموں کا پانی سوکھ جاتا ہے، برسات کا موسم ختم ہوجاتا ہے، اور جب یہ دُنیا بالکل خشک ہوجاتی ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو!"

"تو یہ بانسری ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بانسری ہی، نینا! ہمارے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔" رانگا پھر بانسری کے نغموں میں گم ہوگیا۔ وہ خشک دُنیا میں موسیقی کے دریا بہا دینا چاہتا تھا۔ دُنیا بالکل خشک ہے۔ سب دریا کے پانیوں کو پوجتے ہیں، سوتوں کو نہیں پوجتا۔ آخر پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ غم کے سوتوں سے جو دریا اُبلتا ہے وہ مدت دراز تک بہت سی غمگین روحوں کو خوشی کے پانیوں سے سرسبز و شاداب بناتا رہتا ہے، اور سرچشمہ، اس کی زندگی میں سوائے رونے کے کیا رکھا ہے؟ محض رونا ہی رونا، زندگی کی صبح سے موت کی شام تک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مایوسیاں، المناک لمحے، گھٹی گھٹی تاریکیاں ۔ ۔ ۔ ۔

"رانگا" نینا نے اپنے سُرخ ہونٹوں کو بانسری سے چپکا دیا۔ "رانگا مجھے بانسری بہت پیاری لگتی ہے۔ یہ میرے دل کی آواز کو باہر کھینچ لیتی ہے۔ رانگا،

میں! میں! میں! بکری اور اُس کے بچے، نرم ملائم ملائم کھال، نینا آگے بڑھی، اس نے ایک بکری کے بچے کو گود میں اُٹھایا اور پچکارنے لگی، بکری مبہوت رانگا کی بانسری کو سن رہی تھی۔ رانگا نرم نغمہ چھیڑ رہا تھا، مستی کے راگ، وہ دریا پار سے نینا کو بھگا لایا تھا۔ اس نے چشمے سے واپسی کے وقت چشمے پر کھڑے ہو کر بانسری کا راگ چھیڑ دیا تھا اور نینا نے اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑے کھڑے ان راگوں کو سُنا۔ وہ بھاگی چلی آئی، لیکن دریا کا پانی، نینا کانپ اُٹھی دریا کا پانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رانگا کے چہرے پر کچھ کچھ صبر تھا، اُس نے چپکے چپکے نینا سے کہا۔

"مجھے ایک پُل معلوم ہے، وہاں دریا بہت کم گہرا ہے، اور ایک بڑ کا بہت بڑا درخت ایک سرے سے دوسرے سرے تک، آندھی اور طوفان سے گر کر پھیل گیا ہے، بس وہ ہی ہمارا پل ہے۔"

اور وہ دونوں اُس پُل کو پار کر بھاگم بھاگ یہاں تک آن پہنچے تھے۔ نینا نے رانگا سے تحفہ مانگا تھا، کہا تھا کہ پینٹھ میں سے کچھ تحفہ لانا، لیکن رانگا کی جیب میں صرف ایک بانسری خریدنے کیلئے پیسے تھے اور وہ بانسری لے آیا، صرف ایک ذریعہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک آواز جس کے تار نینا کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھدیتے ہیں، اور نینا مصنوعی پُل کو پار کر کے رانگا کے ساتھ چٹان تلے بھاگ آئی تھی۔

دوپہر ڈھل رہی تھی، آسمان کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا، وادی کی آوازیں خاموش تھیں، چند ایک بکریاں اِدھر اُدھر گلوٹے کے بیلوں کے پاس، یا گوگل کے سایوں میں جھاڑیاں چبا رہی تھیں، دُور گہرائی میں تلیٹی کے سہارے سہارے گائے بھینس چر رہی تھیں، اور چرواہے آرام کی تان سو رہے تھے، درختوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر شکرے اور باز شام کے وقت ننھی ننھی چڑیوں کا شکار کرنے کی تاک میں چاروں طرف نگاہ ڈال رہے تھے، وادی میں دھوپ اور سایوں کے سبب سے ایک چوسری بن گئی تھی، خشکی کے موسم کے سبب جھرنوں میں سے پانی مر مر کر بہہ رہا تھا۔ چشمے تقریباً خشک کے برابر تھے۔ رانگا اپنی بانسری کو منہ سے لگائے لگائے نینا کے زانوؤں پر سو رہا تھا، شاید وہ بانسری اب بھی خاموش راگ الاپ رہی تھی، نینا کے ہونٹوں پر قناعت جاگ رہی تھی، اُس کی کچھ کچھ نیلی آنکھوں میں آسمان کا سایہ نکھر رہا تھا، پاس ہی جھاڑیوں کو چبانے والی بکریاں تھوتھڑیاں اوپر اُٹھا اُٹھا کر رانگا اور نینا کی طرف دیکھ رہی تھیں، پھر نینا کے لب کھلے اور وہ بڑبڑانے لگی۔

"تو تھک گیا ہے رانگا۔ لیکن شام سے پہلے"

"بھاگ چلو نینا۔ چلو۔ گاؤں والے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ بھاگ چلو نینا۔" رانگا نیند میں بڑبڑا اُٹھا، اس کی آنکھ ایک دم کھل گئی اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں ہوگئے۔

"کوئی نہیں رانگا۔ کچھ نہیں۔" نینا نے رانگا کی پیشانی سے پسینے کی بوندوں کو پونچھا۔ اس ذہنی کشمکش کے چند لمحوں میں جب رانگا کا خواب

بھی خیالات سے بھرپور تھا، رانگا گھبرا سا گیا۔ وہ نینا کو گاؤں سے دُور بھگا لایا تھا۔ ایک نئی دُنیا بسانے .... برگد اور بڑ کے سایوں تلے ...... جب اس نے دریا کو پار کیا تھا تو وہ بہت خوش تھا، اُس نے نینا سے کہا تھا "نینا۔ بس اب ہم تم دُور کسی گاؤں میں جاکر دم لیں گے تو اور ہیں!"

"ہوں" نینا مُسکرا دی تھی۔

"میں اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کروں گا۔ مزدوری ..... اور پھر ہم دونوں اپنا گھر بسالیں گے" لیکن مجرم کا خیال رانگا کو خواب میں بھی پریشان کر رہا تھا۔ اُسے گاؤں کے آدمی سر پر لٹھ رکھے ہلّہ بولتے دکھائی دے رہے تھے۔ ماریو، پکڑیو، دوڑیو، بھاگیو۔ اور جب وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو اُسے وہ خیال پھر ستانے لگا۔ بانسری الگ پڑی تھی۔ نینا کے اودے ہونٹوں پر مایوسی جھلک اُٹھی۔

"اب" نینا نے رانگا کی آنکھوں میں آنکھ ڈالتے ہوئے کہا

"اب!"

"اب" رانگا نے نینا کے بالوں میں اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھوں کو پھیرا۔ "اب" رانگا کپڑے جھاڑتا اُٹھا۔

"تو چلو آگے۔ چھ میل پرے گاؤں ہے اُس میں بسیرا مل جائے تو اچھا ہے، کوئی پوچھیگا کہ میرے ساتھ کون ہے۔ تو کہدوں گا میری بیوی ....." رانگا نے نینا کے شہابی رخساروں پر اپنی اُنگلی کو نچایا۔

"میری بیوی ....." دوپہر ڈھل رہی تھی، شفق کا رنگ نینا کے رُخساروں پر سُرخی بکھیر رہا تھا۔ "اور" رانگا نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "رات کے وقت سب حفاظت ہو جاتی ہے۔ بھلا رات کو کون ہمیں دیکھ سکتا ہے۔"

احساس۔ اطمینان۔ اور وہ بھی قطعی غلط ...... ونود نامعلوم کتنی دیر سے وہاں چٹان کی آڑ میں بیٹھا بیٹھا رانگا اور نینا کی باتیں سُن رہا تھا۔ رانگا کے دلاسہ دینے والی باتوں کو سُنکر ہنس دیا۔ ایک دم زبردست قہقہہ ..... ہا ہا ہا! ہو ہو ..... وہ پھرتی سے چٹان سے اُترا رانگا اور نینا گھبرائے سے بھاگنے کی تیاریوں میں بھونچکے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

"ٹھیرو" ونود نے نہایت ملائم انداز میں اُن دونوں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"حضور" رانگا نے التماس بھرے الفاظ میں کہا۔ "حضور یہ میرے ساتھ زبردستی بھاگ آئی ہے۔ حضور میں پرماتما کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ سرکار ....."

"رانگا" نینا کے ہونٹ تھرتھر کانپ رہے تھے۔ مجرم کتنا کمزور دل انسان ہوتا ہے۔ نینا کے چہرے پر خجالت کی سُرخی دوڑ رہی تھی، اور اس کے جسم کا نچلا حصہ اُس مچھلی کی مانند لرز رہا تھا جو ابھی پانی سے نکال کر زمین پر ڈالدی گئی ہو۔

"حضور" رانگا نے پھر دوہرایا "حضور" اور رانگا نے ونود کے پاؤں پکڑ لئے۔

"حضور کے بچے ..... الگ کھڑا ہو جا" ونود ایک نئے ڈرامہ کا ایکٹر بننا چاہتا تھا۔ "اچھا صاحب ذرا چپ چاپ ادھر بیٹھ جائیے۔ پہلے لڑکی کو بھگا کر لایا اور اب اس سے منکر ہوتا ہے۔ ایں!"

جرم ایک کمزور انسان کے سامنے کانپ رہا تھا۔ رانگا کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ اَب کیا کرے۔ وہ ایک دم نڈھال سا ہو گیا۔ اس کی لاٹھی ہاتھ سے چھوٹ کر دُور گڈھے میں جا گری تھی۔ اور ایک نہتا مجرم بہت ہی کمزور انسان بن جاتا ہے۔

"اور تو" ونود لڑکی کی طرف مخاطب ہوا۔ "تو اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہے"

"نہیں سرکار۔ نہیں۔ پرماتما کی قسم! سرکار! پرماتما کی قسم۔" نینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس کا آنچل آنسوؤں میں بھیگ گیا، ایک غیر متناہی آنسوؤں کا سلسلہ ...... اور ہر ایک آنسو نوحہ پڑھ رہا تھا۔ "سرکار! یہ مجھے زبردستی بھگا لایا ہے۔ زبردستی ....."

"سچ کہتی ہے" ونود نے ذرا اور اکڑ کر کہا۔

"سرکار۔ بالکل سچ" نینا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی لڑیاں پرو رہے تھے۔ اُس کو غم تھا اس بات کا کہ رانگا کی محبت کتنی ناپائیدار ہے، پانی پر لکھے ہوئے حرفوں کی مانند، قطعی غیر مستحکم ..... اور اب اُسے ایک ڈر اور ستا رہا تھا۔ مجرم کا خیال۔ مجرم کتنا کمزور ہوتا ہے، اُسے ہر ایک اجنبی انسان انصاف کا ناخدا نظر آتا ہے رانگا کے ہاتھ شل سے پڑ گئے تھے۔ نینا کی نگاہوں میں اس دریا کا پُل گھوم گیا جب کو وہ گرے ہوئے بڑ کے درخت کے ذریعہ پار کرکے آئے تھے جس وقت رانگا اُس کے زانو پر سر رکھکر سو گیا تھا تو وہ رانگا کے کتنی قریب آگئی تھی بالکل نزدیک جتنی کہ پھول اور اس کی پتیاں ...... اور اُس نے نہ معلوم کون سے جذبہ کے زیر اثر رانگا کے بالوں کو چوم لیا تھا، اُس وقت اُس کا چہرہ کیسا بھیگ سا گیا تھا شرم کے مارے۔ اسکی نگاہیں جھک سی گئی تھیں اور اُسے اس خلوت کی جگہ ادبی کی ..... [illegible]

(بقیہ مضمون صفحہ ... پر ملاحظہ کیجئے)

کسوٹی

محمد یحییٰ تنہا بی۔اے

کسوٹی

نئی کتابیں

محشرِ خیال اس نام کی ایک کتاب جناب الیاس احمد مجیبی نے قرول باغ نئی دہلی سے شائع کی ہے، جس کو پروفیسر خواجہ منظور حسین ایم۔اے (علیگ) بی۔اے (آکسن) نے ترتیب دیا ہے۔ سجاد علی انصاری مرحوم بی۔اے ایل ایل بی (علیگ) کے مضامین اور اشعار کا یہ مجموعہ بہ اضافۂ «دزِ جزا» (ڈرامہ) نہایت آب و تاب کے ساتھ دوسری بار زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا ہے، اور ناشر سے احمد منزل، کلاں محل دہلی کے پتہ پر دستیاب ہو سکتا ہے۔

سجاد علی مرحوم کا یہ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا کہ خود آپ کے مضمون "حقیقت" کے الفاظ میں "احتیاطاً اس کی مقتضی (ہوئی) کہ اُسے کسی دوسری دُنیا میں بھیج دیا جائے"...... "تاکہ (اُس) کی حوصلہ مندیاں وقارِ خداوندی کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں"۔ یہ ضعیف البنیان انسان اپنے خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں بہہ جاتا ہے۔ ع

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

کچھ بھی ہو آسکر وائلڈ کی تحریرات نے سجاد علی مرحوم کو اپنی سحر طرازیوں سے مسخر کر لیا اور انھوں نے اپنے مضامین میں وہ شگوفہ کاری کی ہے کہ اُردو نثر میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، مختصر الفاظ میں وسیع معانی پنہاں ہیں اور ایک ایک لفظ ان کی مرصع کاری پہ شاہدِ عادل ہے۔ مثلاً (۱) "فرشتہ کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے"

(۲) "ایک حقیقت جب پلٹتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی ہے"

(۳) "ارتقاءِ انسانی کی آخری منزل عورت ہے"

(۴) "یعنی انبساطِ شباب کا ایک مجسمہ جس کی ہر کشش اپنے دامن میں کائنات کے لئے ہزاروں برکتیں رکھتی ہے"

(۵) "سنجیدہ فلسفہ چاہتا ہے کہ ہر واقعہ اور انسان کا ہر خیال عالمِ طلسم سے نکل کر واقعیت کی خشک فضا میں آجائے، اگر یہ ممکن ہوتا تو خدا کے اس جلوہ گاہ میں زندگی کا ایک ایک لمحہ ناقابلِ برداشت ہو جاتا، محبت کی لطیف حماقتیں اور حسن کا لطیف تر تلوّن، انھیں دونوں قوتوں نے زندگی کی مشکلات کو حل کر دیا ہے ورنہ اس عجیب دُنیا میں اگر صحیح معنوں میں دو ایک طلسم شکن فلسفی پیدا ہو جائیں انسان کی بے بسی تو مسلّمہ ہے خود فرشتوں کو بھی دُنیا میں آنا ناگوار ہو"

(۶) "مروّجہ تصوّف نے مذاقِ سلیم کو یہاں تک برباد کر دیا ہے، کہ خیالات کے ساتھ الفاظ بھی انتہائی غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں"

(۷) "مجاز و حقیقت صرف ایک دامِ فریب ہے جیسے تصوّف کی معصوم خیالی نے تیار کیا تھا، پیشہ ور صوفیوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا"

(۸) "گروہِ عشاق اس قدر برخود غلط نہ ہوتا، اگر ذمّہ دار شعراء اُسے غلط فہمیوں میں نہ ڈال دیتے" وغیرہ وغیرہ

یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سجاد علی مرحوم کے خیالات زیادہ تر صحیح یا متوازن ہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ کہا گیا ہے زوردار الفاظ میں کہا گیا ہے۔ انھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی خوب نمائندگی کی ہے، اور قدامت کی مخالفت کو محض اس بنا پر کہ قدیم ہے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ زُہد و پرہیزگاری بجائے خود بُری شے نہیں ہے لیکن جس میں ریاکاری شامل ہو وہ رندی و مستی سے بھی بدتر ہے۔ آخر الذکر کو بُرا کہنا راہِ صواب ہے، لیکن اوّل الذکر کی مذمت کرنا داخلِ ثواب نہیں ہے۔

سجاد علی مرحوم نے رعنائیِ خیال کے ماتحت کفر و الحاد کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے میں دریغ نہیں کیا اور اپنے لئے ایک نئی دُنیا بنا لی، جہاں ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

محشرِ خیال کے مضامین پڑھ کر واقعی یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ شیطنت

طفولیت سے بے خطر ہے اور حسن پرستی و رنگینی تمام گناہوں کا کفارہ ہے۔ سمجھ لو آجکل شکست کی انتہا یہ ہے کہ فتح ہوجائے اور فتح کی انتہا یہ ہے کہ شکست ہوجائے۔ بچپن میں جب یہ سنا تھا کہ قیامت آنے سے پہلے تمام دُنیا لامذہب ہوجائے گی اور خدا کا کوئی نام لیوا نہ رہیگا تو اپنے سے چھوٹے سے دماغ میں یہ بات نہیں سماتی تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہوگا لیکن آجکل کے نوجوانوں کی رفتار و گفتار اور وضع قطع نے ثابت کردیا کہ وہ زمانہ کچھ دُور نہیں بلکہ شاید آگیا ہے۔

سجاد صاحب کے فلسفۂ مذہب سے قطع نظر آپ کے بیش بہا خیالات دیگر عنوانات پر قابلِ غور ہیں۔

(۱) "حقیقی عورت ایک ناقابلِ فہم معمّہ ہے، وہ کبھی اپنی نسوانیت کو منکشف نہیں کرتی، اُس کا ہر انداز اُس کے حقائق کو پوشیدہ رکھتا ہے، وہ ایک طلسم ہے جسے اُس کا ظاہر اور پُرطلسم بنا دیتا ہے، جس راز کو وہ دراصل افشا کرنا چاہتی ہے اُس کو بظاہر پوشیدہ رکھتی ہے اور جس حقیقت کو وہ ہمیشہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے اُس کو کبھی کبھی افشا کر دینے میں بھی اُسے تامل نہیں ہوتا، غرضیکہ اُس کا باطن وہ نہیں ہوتا جو پوشیدہ رہتا ہے اور نہ ظاہر وہ ہے جو افشا ہوتا رہتا ہے، اس طلسم سے اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرد اس کی فطرت کو نہ سمجھ سکے، کسی چیز سے متاثر رہنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ انسان اُس سے پورے طور پر باخبر نہ ہونے پائے، عورت یہ راز جانتی ہے اس لئے وہ اپنی ہستی کو کبھی کھُلنے نہیں دیتی۔"

(۲) "احساساتِ عامّہ پر جس تحریک کا انحصار ہو، اُس کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ طبقہ اس کی صحت کی تصدیق کرے جس سے عوام کے احساسات وابستہ ہیں، مسلمانوں کی سیاست جس کی بنا حق و صداقت پر رکھی گئی ہے خاص طور پر اُس گروہ کی دست نگر ہے جو ایک طرف خدا اور اس کے احکام سے باخبر ہو اور دوسری انسان اور اس کے حقوق سے۔"

سیاسی جد و جہد کا ہر دور اُسی گروہ کی صحیح فہیموں کا پابند رہا۔ اگر کبھی عوام نے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کیا، لیکن مذہبی گروہ نے اُس کی تائید سے انکار کردیا، عوام کی جد و جہد قطعاً رائیگاں ہوگئی کوئی نتیجہ نکلا بھی تو یہ کہ طبقۂ جہلا اور طبقۂ علما میں وہ مخالفت پیدا ہوگئی جس کے اثرات کبھی مٹ نہیں سکتے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ طبقۂ علما نے آواز بلند کی لیکن عوام نے صدا بصحرا سمجھ کر اُس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ غرض کبھی جہلا گمراہ ہوئے کبھی علما۔ کوئی متفقہ قوت ایسی مجتمع نہ ہوسکی جو حق و صداقت کو کذب و باطل پر غالب کرسکتی۔"

(۳) "اس سلسلہ میں ایک برگزیدہ شخصیت اور بھی ہے جو بظاہر گو دُنیا سے اُٹھ گئی لیکن حیاتِ جاوید نے اُسے ہمیشہ کیلئے نمایاں کردیا ہے، قرونِ اولیٰ کا اسلام اگر کسی نے عملاً دُنیا کے سامنے اس صدی میں پیش کیا تو وہ محمود الحسن کی محترم ہستی تھی، آج جب کعبہ سے کفر کا دریا اُمنڈتا چلا آرہا ہے، دیارِ ہند کے ایک مسلمان نے خیرالقرون کی یاد تازہ کردی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے مولانا مرحوم نے علما کو نئے سر سے ہندوستان میں زندہ کردیا، اور یہ انھیں کا فیض اور انھیں کی برکات تھیں کہ موجودہ کشمکش میں علما اور جہلا نے متحد ہو کر کذب و باطل کے مقابلے میں حق و صداقت کا عَلَم بلند کیا گروہِ علما جو ایک زمانہ سے دورِ جدید کے مسلمانوں سے بیگانہ تھا، اُن سے آکر مل گیا، اور وہ خدا ناشناس مغرب پرست جو مذہب کو ناقابلِ برداشت اور شعارِ اسلامی کو ناقابلِ عمل سمجھتے تھے خدا سے بھی مانوس ہوگئے، اور اُس کے قوانین سے بھی۔"

بیوی

(۴) "بعض ناعاقبت اندیش بیوی میں بھی غیر معمولی حُسن چاہتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ حُسن اُس وقت تک حُسن رہتا ہے جبتک وہ ایک لطیف معمّہ ہے، بیوی کی زندگی واقعات کی کشمکش میں اس طرح الجھتی ہے کہ حُسن کی افسانویت قطعاً فنا ہوجاتی ہے، اس لئے یہ تمنا کہ بیوی حسین ہو، درحقیقت حُسن کی توہین ہے، اس تمنا کا مفہوم دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ حُسن کی عظمت روزمرّہ کی زندگی سے ٹکرا کر برباد ہوجائے۔ حسین بیوی محض محبوب بنکر رہنا چاہتی ہے وہ زندگی کی کشمکش میں نیازمندانہ شرکت نہیں کرسکتی، اُس کے حُسن کی رنگینیاں فرائضِ زوجیت کی قباحتوں سے بغاوت کرتی ہیں، یہ صورت ہر حیثیت سے خطرناک ہے۔"

وفا

(۵) "وفا فنا ہے، احساسِ حیات، اور جذبۂ حُسن پرستی کے اضمحلال کا نام ہے، البتہ اگر حُسن محبت نواز ہے، وفا جائز ہوسکتی ہے، لیکن محبوب کی بے نیازیوں اور بے پروائیوں پر اپنی زندگی کو قربان کردینا خودکشی کرنی ہے، محبت کا سب سے بڑا جرم ارتکابِ وفا ہے۔ غالب نے اسی بنا پر "وفا کیسی، کہاں کا عشق" کہا تھا۔"

جھوٹ

(۶) "ایک لطیف جھوٹ حُسنِ خیال اور لطافت اظہار پیدا کردیتا ہے، لیکن وہ جھوٹ کبھی لطیف نہیں ہوسکتا جو ضرورتاً بولا جائے، راست گوئی گفتگو کو دلآویز نہیں بناسکتی۔ اس لئے کہ ہر اخلاقی فرض دل فریبیوں کا دشمن ہوتا ہے، دروغ گوئی اس لئے اور بھی دلفریب ہوتی ہے کہ بیج کی طرح اُسے واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

دُعا

(۷) "سعیِ ناکام دُعائے مقبول سے برگزیدہ تر ہے، کوششوں میں عظمتِ انسانی مضمر ہے، لیکن دُعا انسانیت کا اعلانِ شکست ہے، جس کے ذریعہ سے انسانی مجبوریوں کا راز اُن فرشتوں پر بھی منکشف ہوجاتا ہے جو کسی طرح اس انکشاف کے اہل نہیں، دستِ بدعا ہونا کارکنانِ قضا و قدر کے سامنے اپنی بےبسی اور ناچارگی کا اعتراف کرنا ہے۔"

محبّت

(۸) "محبّت نام ہے چند احمقانہ اعتبار اور چند طفلانہ بے اعتباریوں کا۔"

فلسفی اور شاعر

(۹) "فلسفی دُنیا کے ہر واقعہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے، یہی اُس کی ناکامیوں کا حقیقی راز ہے، وہ ہر ظاہر کا ایک باطن تلاش کرتا ہے، حالانکہ دُنیا میں ہزاروں پردے ایسے ہیں، جن کے اندر کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں، فطرت کا یہ محض فریب ہے کہ انسان کو اُن رموز کا متلاشی بنا دے جن کا وجود ہی نہیں، جو سب سے زیادہ اس فریب میں مبتلا ہوجاتا ہے وہ فلسفی کہلاتا ہے اور اُس کی متجسسانہ حماقتیں، فلسفہ۔ صحیح فلسفہ وہ ہے جو انسان کو اپنی اُن افسوسناک حماقتوں کا معترف بنادے۔"

"شاعر اس لطیف نکتہ سے واقف ہے کہ کائنات کی اگر کوئی حقیقت ہے، وہ محض پردہ کی رنگینیوں میں مضمر ہے، وہ انہیں دلفریبیوں میں محو ہوجاتا ہے، لیکن کبھی پردہ کو اُلٹنا نہیں چاہتا وہ جانتا ہے کہ نقاب خود ہی حُسنِ کائنات ہے، زیرِ نقاب کچھ نہیں۔"

آپ اُس کے خیالات سے خوش ہوں یا ناخوش، متفق ہوں یا مخالف، لیکن آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور رہوں گے کہ اندازِ بیان میں وہ لکھی ہے اور اسلوب نگارش [illegible] ہے کہ یہ مختصر مضامین کا مجموعہ اپنے مصنف کا نام مدت تک فراموش نہ ہونے دیگا۔

مرزا غالب مرحوم نے اُردو لٹریچر میں سب سے پہلے جدّت طرازی کی، وہی ایک ساز تھا جو سب سے کانوں میں گونج رہا ہے، سرسید نے بھی مختلف پیرایۂ بیان اختیار کئے، آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی، شرر اور سرشار نے بھی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور مہدی الافادی نے بھی، چکبست نے بھی، سجاد حیدر نے بھی، لیکن سجاد علی انصاری جہاں اکثر الفاظ اور رعنائی خیال کیلئے مرزا غالب مرحوم کا منت کش ہے اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن کا متبع، وہاں اُس کا طرزِ تحریر اور جدّتِ خیال منفرد بھی ہے، مختصر اور جامع فقرات دونوں کے یہاں بکثرت ہیں، دونوں کے یہاں وہی شان اور آن ہے، رکاکت دونوں کے یہاں مفقود ہے، لیکن شدّت و غلو موجود ہے، عبدالرحمٰن اور سجاد علی انصاری دونوں ماں جائے بھائی معلوم ہوتے ہیں، فرق صرف وہی ہے جتنا حقیقی بھائیوں میں ہوتا ہے، مگر دونوں ابوالکلام آزاد کے "الہلال" سے متاثر ہیں۔

یہاں یہ کہنا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ سجاد علی مرحوم کا اسلوبِ بیان جہاں ممتنع الجواب ہے وہاں اس میں یہ خرابی بھی ہے کہ یہ صرف مضامین نگاری کے کام آسکتا ہے، کتابیں اس طرز میں تصنیف و تالیف نہیں کی جاسکتیں، یا یہ طریقہ کتابوں کے لئے موزوں نہیں، کتاب نویسی کیلئے حالی، شبلی اور شرر ہی کے انداز کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا ورنہ سب کیا کرایا اکارت جائیگا، دیگر اصحاب جو طرزِ نو کے مالک ہیں اپنی شرر فشانی سے آنکھوں کو منور و خیرہ کردیتے ہیں لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ چراغ کی جگمگاہٹ ہی راستہ چلنے والوں کو نشانِ راہ کا پتہ دے سکتی ہے۔

سجاد علی مرحوم کے دماغ جدّت طراز سے کچھ اشعار نے بھی تراوش کی ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اگر مرحوم اور زندہ رہتے تو شاعری میں بھی ایک خاص درجہ حاصل کر لیتے۔ مثلاً

ہر پھول سے تراوشِ حسنِ بہار ہے — اے حسرتِ نگاہ فضائے چمن سے دور
تم کھو گئے تو مجھ کو ملی منزلِ حیات — میں انتہائے یاس میں بھی کامیاب ہوں
دل ٹوٹتے ہی رازِ محبت بھی کھل گیا — اللہ رے بے خودیٔ پیامِ آرزو
بہارِ حسن کو بیگانہ وار دیکھا تھا — نگہ نے چھیڑ دیا [illegible] محبت کا

ابھی اور بہت بہتر نظمیں لکھیں گے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ سلام نے اپنی نظموں کا مجموعہ شائع کرنے سے پہلے یہ کتاب محض اپنے تعارف یا مزید تعارف کیلئے شائع کی ہے۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ اس مجموعہ میں تمام نظمیں ہی بیکار ہیں۔ نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو ایک آدمی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ اگرچہ سلام کا یہ دعویٰ درست ہے کہ وہ کسی پابندی کا قائل نہیں اور یہ کہ وہ جو محسوس کرتا ہے اس کو نظم کی صورت میں پیش کرتا ہے، لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہا جائیگا کہ احساسات کے ساتھ اس کتاب میں طرزِ ادا کچھ معمولی سا ہے۔

نظمیں بری نہیں، موضوعات بد رنگ نہیں لیکن محسوس ایسا ہوتا ہے کہ سلام نے جتنی نظمیں مشق کے طور پر آجتک کہی تھیں وہ سب اس کتاب میں شائع کر دی ہیں۔ سلام

بقول زرتشت

یہ فریڈرش نیتشے کی کتاب "بقول زرتشت" کا ترجمہ ہے جسے انجمن ترقی اُردو دہلی نے شائع کیا ہے۔ اور ڈاکٹر ابوالحسن منصور پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے جرمنی سے اُردو زبان میں ڈھالا ہے۔

جن خیالات کے زیرسایہ آج تمام جرمن قوم جی رہی ہے وہی نیتشے کا فلسفہ ہے۔ نیتشے صرف قوّت کا قائل ہے، اس کے علاوہ اس کے ذہن میں اور کوئی چیز نہیں۔ قوّت کے علاوہ اُسے ہر چیز بیکار اور بے مصرف نظر آتی ہے۔

"زرتشت کو تلاش ہے مل کر تخلیق کرنے والوں کی، زرتشت کو تلاش ہے مل کر فصل کاٹنے والوں کی، اور مل کر خوشی منانے والوں کی۔ اسے گلّوں اور چرواہوں اور لاشوں سے کیا واسطہ"

"بے شمار تعداد اُن کی ہے جو زندہ رہتے ہیں اور بے حد دیر تک ان ہی شاخوں میں لٹکتے رہتے ہیں، کاش آندھی آئے اور ان تمام گلے سڑے اور کرم خوردہ سیبوں کو درخت سے جھاڑ دے"

"بڑی مہربانیاں شکر گزار نہیں بناتیں بلکہ کینہ پرور۔ اور اگر چھوٹی بھلائی فراموش نہ ہو جایا کرے تو وہ کرنے والا کیڑا بنجائے"

"لیکن بھیک منگوں کا قلع قمع کر دینا چاہیئے۔ واقعی ان کو دینا بھی تکلیف دہ ہے اور نہ دینا بھی تکلیف دہ۔"

یہ ہے نیتشے کا فلسفہ، اس کے نزدیک صرف اُن ہی چند افراد کو جینے کا حق ہے جو قوّت ور ہوں، تنومند ہوں اور کمزور نہ ہوں یا بقول نیتشے کے محض لاشے نہ ہوں۔ اسے یہ چلتے پھرتے لاشے پسند نہیں، وہ ان سے نفرت کرتا ہے، سوچتا ہے کوئی تیز ہوا آئے اور یہ سڑے گلے سیب گل کر نیچے آپڑیں۔

انسان کی کمزوری اور بے بسی اس کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے آج یورپ کی زمین میں سے ایسے گلے سڑے سیبوں والے درخت اکھاڑے جا رہے ہیں، جو نیتشے نے کہا، نا تسی وہی کر رہے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس تند آندھی میں محض سڑے گلے پھل ہی گریں گے یا درخت بھی ساتھ ہی جڑ سے اکھڑ کر جا پڑیں گے۔

نیتشے کے نزدیک ہر وہ فعل جو آدمی کو جفاکش اور طاقتور بنائے مبارک ہے، اس کے نزدیک خود غرضی بھی بُری نہیں بلکہ خود غرضی کا دھارا اس کے نزدیک پھوٹتا ہی ایک بلند و برتر روح سے ہے اور بلند روح سے تعلق ہے طاقتور جسم کا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وہ ایسا کیوں کہتا ہے، کہتا ہے تو یہی کیوں کہ پورا ایک ملک اس کے اصولوں پہ لبیک کہے۔ بہت ممکن ہے وہ اتنا حساس ہو گیا ہو کہ اُسے کبھی اپنی کمزوری پہ غصہ آ گیا ہو یا انسانی نسل کی ذلّت سے اس کا دل کڑھا ہو، اور واقعہ بھی یہی ہے اسے یہ رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑے اچھے نہیں لگتے، وہ انسانی فطرت کی انتہائی گہرائیوں میں دبی ہوئی آواز کو اٹھا کر اوپر پھینکتا ہے، کمزوری گناہ ہے، جرم!

ہم میں سے ہر شخص یہی سوچتا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جتنے بھی حفاظت، ہمدردی اور محبّت کے اصول مرتب کئے گئے ہیں وہ سب انسانی کمزوریوں کی آوازیں ہیں، وہ سب ایک خوف کے تحت میں ترتیب دئے گئے ہیں۔

انسانی سماج، انسانی برادری، ہمدردی، [illegible] علم و دانش، یہ سب چیزیں انسان کی کمزور آوازیں ہیں، اور سب سے زیادہ کمزور آواز ہے عدل و انصاف۔ نیتشے ان ہی کمزور آوازوں کے خلاف چیختا ہے، ان ہی آوازوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ اسے انسانی جسم میں بیکار اعضا پسند نہیں، اور یہی وہ دوسروں کو تلقین کرتا ہے کہ ان تمام اعضا کو کاٹ ڈالو، انکی کوئی ضرورت نہیں۔

نیتشے کی ذات ایسی نہیں جس کے لئے کسی مزید تعارف کی ضرورت ہو۔ یہ کتاب اُردو فلسفہ اور ادب میں ایک بہت بڑا اضافہ ہے۔





بہ نسخۂ کلاں

عرق مقوّی زعفرانی

(میں نے اس عرق کی چند خوراکیں پیں، حیرتناک قوت حاصل ہوئی، اور زیادہ دیر تک دماغی کاموں میں منہمک رہا مگر تکان نہیں ہوئی، معدہ کی ساری شکایات کالعدم ہوگئیں، اس تغیر پر مجھے بڑی حیرت ہے!!) "ساغر"

یہ دُنیا کی بے بہا دوا عام طور سے مشہور و مقبول ہے جس کو ہندوستان کے باشندے موسم سرما میں بہت ہی شوق اور ایک خاص دلچسپی سے پیتے ہیں بلکہ تمام ممالک کے امیر طبقہ کے لوگ اس کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، یہ حقیقت میں موسم سرما کا ایک خاص تحفہ ہے اور ملک کے راجہ مہاراجہ اور نواب تو سوائے اس دوا کے کوئی دوسری چیز طاقت پیدا کرنے کیلئے پیتے ہی نہیں، کیونکہ اس دوا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے پینے کے بعد انسان کو کسی اور مقوی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے کہ یہ جتنی مقدار میں پی جاتی ہے وہ تمام خون بنجاتی ہے، چنانچہ اسی قوت پر انسان کی ہر قوت باقی اور قائم رہتی ہے، یوں تو دُنیا میں بہت سی نئی نئی ایجادیں ہوتی رہتی ہیں مگر یہ دوا اطباء کی ایک محیر العقول اور کثیر النفع ایجاد ہے، اس کے چند یوم پینے سے انسان کا خون کافی مقدار میں بڑھ جاتا ہے جس سے جسم کا وزن بڑھ کر دائمی قوت اور طاقت پیدا ہوجاتی ہے، یہ بدیہی امر ہے کہ جب خون بڑھتا ہے تو سب طاقتیں بڑھتی ہیں، جسم میں بجلی سی کوندنے لگتی ہے، انگڑائیاں نہایت طاقت کیساتھ آتی ہیں، چہرہ سُرخ مثل گلاب ہوجاتا ہے، کمزوری جسم سے قطعاً مفقود ہوکر جسم سڈول اور خوبصورت ہوجاتا ہے، اور تمام قسم کے داغ دھبے جاتے رہتے ہیں، خوشنمائی کا تمام جسم پر ایک عام دور ہوجاتا ہے، کتنا ہی کمزور و ناتواں آدمی اس مقوی عرق کو پیئے اور دیکھے کہ کیسی کیفیت طاری ہوتی ہے، نہایت درجہ طاقت بخش مقوی باہ مولد جوہر ہے، اصل میں قوائے ثلاثہ کو پُرجوش اور برانگیختہ کرنے کے واسطے یہ عرق سردی میں پیا جاتا ہے، ہر انسان اس کے جملہ اوصاف اور خوبیوں سے خوب واقف ہے، ہمیں اطباء اور حکماء کی اس جادو اثر دوا کی ایجاد کی دل سے داد دینی چاہئے، اس کے سامنے سب طاقت کی ادویات ہیچ ثابت ہوئی ہیں، اس کے پینے سے بھوک بڑھتی ہے اور کھانا خوب ہضم ہوتا ہے۔ دل، دماغ، جگر یعنی اعضاء رئیسہ و شریفہ، معدہ، آنتیں، گردے غرضکہ تمام اعضاء اس عرق کے پینے سے اپنی پوری پوری قوت حاصل کرتے ہیں جس سے جسم کی ہر کمزوری دائمی طور پر دور ہوجاتی ہے اور کمزوری باہ کی شکایات جیسے کثرت احتلام، جریان وغیرہ ہمیشہ کیلئے نیست و نابود ہوجاتی ہیں، لہٰذا اس موسم سرما کو ضائع نہ کیجئے اور ایک مرتبہ ضرور پی کر دیکھئے کہ قدرت کاملہ نے اس دوا میں کیا خاصیت رکھی ہے، عورتوں، مردوں، نیز بوڑھوں و جوانوں کے لئے یکساں مفید اور کارآمد شے ہے، بچے تھوڑی تھوڑی مقدار میں شوق سے پیتے ہیں، یہ دوا بڑھاپے کیلئے خاص ہے، اور عورتوں کی نسوانی بیماریوں کا ایک احد علاج ہے، ضروری بات ہے کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے، مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں، میں بہت حیران ہوں کہ جب آپ صاحبان زندگی چاہتے ہیں تو پھر کیوں نہ زندگی کو ہر وقت ہر طرح درست رکھنے کی کوشش کریں، آخر اور بھی تو دُنیا کی ضروریات آپ لوگ اپنے اہل و عیال کیلئے پوری کرتے ہیں، کیا آپ کا یہ فرض نہیں ہے کہ سب سے مقدم صحت کو سمجھیں، اور اس کے بعد پھر تو آپ دُنیا کی ہر جدّ و جہد میں حصہ لینے کے قابل بن سکتے ہیں، صحت کی خرابی تمام آپ کے گھر کی خرابی کی وجہ ہے، ورنہ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں ناکام رہیں، مذہباً، اصولاً انسانی فرض کو ادا کرتے ہوئے تندرستی کا ہمیشہ خیال رکھئے، یہ عرق ہمیشہ موسم سرما میں بہت سے بیش قیمت اجزاء سے تیار کیا جاتا ہے اس کی آمیزش میں سب قسم کے میوہ جات دیگر طیور و قیمتی ادویات شامل ہیں۔ قیمت پانچ روپیہ چار آنہ (؏) فی بوتل۔ اکٹھا تین دیجیئے پورا ایک روپیہ نو آنہ (؏) علاوہ محصولڈاک۔ خوراک پانچ تولہ بڑوں کیلئے۔ بچوں کیلئے ایک تولہ مصری یا شہد ملا کر صبح کو استعمال کریں۔

المشتہر ڈاکٹر حکیم نعیم اللہ نعیم (مستند طبیہ کالج لاہور، شاگرد رشید شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی بالقابہ)

(رجسٹرڈ اینڈ لائسنس میڈیکل پریکٹیشنر کلاس اے گورنمنٹ یو۔پی مالک مشہور عالم آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ دہلی والا جہانگیر آباد ضلع بلند شہر)

— ایشیا۔ نومبر ۱۹۴۲ء

تصویرکده

ساغر نظامی

"لگن"

(فلمی تنقید)

نیو تھیٹرز ہندوستان کی تصویر ساز کمپنیوں میں اپنی چند اہم خصوصیات کے لئے خاص طور پر ممتاز تھی، چنانچہ یہ صرف نیو تھیٹرز ہی کا امتیاز تھا کہ اُس نے ہالی ووڈ کے نئے تخئیلی رجحانات کو ہندوستان کے قدیم وجدانِ شعری کے ساتھ اس قدر کامیاب طریقہ پر ملایا۔ اب نئے فنی تقاضوں کی جھلک ہندوستان کے لطیف و دقیق جمالیاتی مطالبات میں نمایاں نظر آتی ہے۔ لگن انہیں دو متضاد میلانات کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش تھی۔ اس میں ایک موسیقی کالج کی ایک ترقی یافتہ طالبہ کی لگن اپنے شاعر پروفیسر کے ساتھ اور سماج کے ٹھوسے ہوئے شوہر کے لئے اُس طالبہ کی فرمانبرداری کے درمیان کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔ اس طرح تصویر میں اُن گہرے اور پیچیدہ نفسیاتی دقائق (Subtleties Psychology) پر بحث کی گئی ہے جو محبت اور سماجی فرض کے مربیانہ تقابل کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں۔ گو انجام کے طور پر تصویر کے ڈائرکٹر نتن بوس نے سماجی فرض کو کامیاب ثابت کیا ہے جس سے ہم تصویر کو من حیث المجموع رجعت پسندانہ کہہ سکتے ہیں۔

افسانہ

لگن کی کہانی صرف اتنی ہے کہ کلکتہ کے ایک میوزک کالج کی طالبہ کسم (کانن بالا) اپنے کالج کے پروفیسر (سہگل) سے محبت کرنے لگتی ہے۔ پروفیسر شاعر ہے کسم اس کی شاعری سے متاثر ہے (اسی تاثیر کو "لگن" کہا گیا ہے) اسکول کی ایک تقریب میں حسین طالبہ کو کلکتہ کا ایک مشہور مالک اخبار دیکھ لیتا ہے۔ جوان و موقرم مالک اخبار کو متاثر کر دیتی ہے سرمایہ دار نے شادی کی خواہش کی جس کا منظور ہونا یقینی تھا کسم مالک اخبار (نواب) کو بیاہ دی گئی ہے، شادی محبت پر فتح پا گئی کسم کے دل میں شاعر کی یاد چٹکیاں لیتی رہی، شوہر نے اس کی اُلجھن کو اپنے ملاحظہ کے بعد دل کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے جذبہ کو وہ نہ نکال سکا عاشق شوہر نے بیوی کو خوش کرنے کیلئے رقیب کو گھر بلا لیا شاعر نازل

تھا کہ کسم اُس کا بے بس شکار ہے وہ جب چاہے گا سماج کے نمائندے (شوہر) سے اُسے چھین لے گا۔ بہادر شاعر نے کانن سے صاف کہدیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے محبت کرتی ہو، میں بھی تمہیں چاہتا ہوں، میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا"

کہانی نے اچانک پلٹا کھایا، سوسائٹی کے مقدس قوانین آڑے آ گئے فرض نے فتح پائی، محبت ناکام ہوئی، اور شاعر کو شوہر کے سامنے شکست تسلیم کرنی پڑی۔

اس طرح افسانہ کی بنیادی چیزیں وہ نفسیاتی دقائق ہیں جو محبت اور فرض کی باہمی پیچیدگیوں کے درمیان پیش آتے ہیں۔

مقصد

لیکن جہاں تک مقصد کا تعلق ہے لگن قطعی رجعت پسندانہ تصویر ہے، اس لئے کہ صرف شوہر پرستی کی اہمیت کو ثابت کرنا کسی طرح بھی قابلِ پسندیدگی نہیں۔

نفسیاتی ٹکڑے

جب شاعر کی دماغی محنتوں سے دوسرے فائدہ اُٹھائیں تو اس کے احساسات کس قدر مجروح ہوتے ہیں۔ جب بیوی اپنے شوہر کی فرمانبردار ہونے کے باوجود کسی دوسرے کی قدر کرتی ہو، اور جب شوہر اپنی بیوی کی محبت میں اُس کے اُستاد کو گھر بلا کر محسوس کرے کہ وہ اس کا رقیب ہے۔ اور اپنی محبوبہ بیوی کی خواہش کے احترام میں خود اُسے چھوڑنے کیلئے تیار ہو جائے تو ان حالات میں کتنی دقیق اور لطیف نفسیاتی اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں، اس کو لگن کے کامیاب ڈائرکٹر نتن بوس نے اپنے مخصوص طرز میں واضح کیا ہے اور یہی وہ مقامات ہیں جہاں "لگن" اور نتن بوس کی فنی بلندی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن [illegible]

مکالمات

نیو تھیٹرز کی تمام تصویروں [illegible] من حیث ہندوستانی [illegible] کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، البتہ [illegible]

جب ہم ہ سکرین پر آتی ہے تو اس کا باپ جگہ جگہ اس قسم کا فقرہ
تین بار ادا کرتا ہے — "میں نے تو کہا تھا" — اس میں "مجھے"
مفعولی لفظ کی جگہ "میں نے" فاعلی لفظ استعمال کیا گیا ہے جو بلا شبہ
ایک تکلیف دہ نحوی غلطی ہے۔

گیت

گیت ہندی طرز کے ہیں لیکن ان کی زبان چند ایک کو
چھوڑ کر سخت اور ناقابل فہم ہے، بہتر ہوتا کہ گیت
لکھتے وقت شمالی ہند کے مذاق کا اندازہ لگا لیا جاتا۔

موسیقی

عام طور پر بنگالی گانے سینما بینوں کی اکثریت کو متاثر
نہیں کرتے لیکن نیو تھیٹرز کے ماہر موسیقاروں کا یہ
کمال تھا کہ وہ سخت اور بکھری ہوئی موسیقی کو عوامی ذوق سے اس قدر
ملا دیتے تھے کہ عام گانے کی جاذبیت اس کے سامنے ماند پڑ جاتی تھی
اس فلم میں بھی ہلکی موسیقی کو استعمال کیا گیا ہے مگر لطیف مقدار کے ساتھ۔

پس منظر موسیقی

پس منظر موسیقی (Back-ground music)

تمثیلی دنیا میں بیحد اہمیت رکھتی ہے۔ پس منظر موسیقی ہی صرف اس
ماحول کو پیدا کر سکتی ہے جس پر منظر، مکالمے، احساسات اور کردار کی بنیاد
رکھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے جب تک صحیح ماحول ہی تصویر کے منظر سے میل
نہ کھائے اس کی تاثیر کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی۔ مگر تعجب ہے کہ نتن بوس
جیسا صاحب طرز ڈائرکٹر اسی کی طرف سے بے توجہ رہا۔ ڈائرکٹر کی
بے توجہی اس وقت اور بھی اجاگر ہو جاتی ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ
کہانی شروع سے آخر تک پیچیدہ نفسیاتی مسائل سے تعلق رکھتی ہے
اس لئے اس تصویر کے ہر ایک (Tragedian comedian)
کردار اور المیہ منظر میں ایک رو کھا پن نمایاں ہے۔ جو رومانی چھوڑوں
(Touches) کو خشک فلسفیانہ رنگ دے دیتا ہے۔

لباس

لگن میں کلکتہ کی معاشرت کو پیش کیا گیا ہے لیکن تصویر
میں اداکار جس معاشرت میں بستے ہیں وہ بنگالی ہونے
کے باوجود شمالی ہند کے دوسرے علاقوں کی معاشرت سے بھی ملتی جلتی
ہے۔ [illegible] ڈائرکٹر و نگران لباس کی سطحی ذہانت
دکھاتی ہے۔ [illegible] کا لباس اور وضع قطع کلکتہ کے مدیروں
سے بھی ملتی ہے اور دہلی و لاہور کے مدیروں کی وضع سے بھی
دکھتی ہے۔

[illegible]

[illegible]
[illegible]

گو یہ امید کرنا بالکل حق بجانب تھا کہ اس آسانی کے ہوتے ہوئے
ترتیب میں کوئی ندرت (Novelty) ہوگی مگر اس ندرت
کا کہیں پتہ نہیں۔

تشکیل

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نگران تشکیل (سیٹنگ) نے بھی
اپنی ذمہ داریاں باحسن اسلوب ادا نہیں کیں۔ چھوٹے سے
کلرک کے گھر اور کسم کی قیام گاہ میں گھر ستی کا ضروری سامان مہیا
نہیں کیا گیا۔ البتہ نگران تشکیل کی مہارت فن کا اندازہ اس منظر سے ضرور
ہوتا ہے جس میں شاعر کے خالی گھر کو پیش کیا گیا ہے، اسے دیکھنے سے
فوراً خیال ہوتا ہے کہ یہاں کوئی مقیم تھا جو اسے خالی کر کے چلا گیا ہے۔

اداکاروں کی تعداد

لگن میں بعض اداکار بالکل غیر
ضروری ہیں۔ اگر انہیں ہٹا دیا
جائے تو تصویر کی عام رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً مالک اخبار (نواب)
کا سکریٹری جو دودھ کا گلاس پیش کرتا ہے۔ اس کی تصویر کیلئے ضرورت
نہیں۔ اچھا ہوتا کہ چند ضروری مکالمے جو اس کی زبان سے ادا کرائے
گئے ہیں کسی دوسرے کی زبان سے ادا کرا دئے جاتے۔

اداکاری

لگن میں فلمی دنیا کے مشہور اداکار نواب، سہگل، جگدیش،
نیمو اور بنگال کی مخصوص اداکارہ کانن بالا نے فرائض
اداکاری انجام دئے ہیں۔

نواب درد و اثر کو ظاہر کرنے کے لئے بہترین اداکار ہے
مگر چونکہ ان احساسات کا اظہار ہر مقام پر یکساں نہیں ہو سکتا، اس لئے
حسیات کی تبدیلی کے ساتھ اداکاری میں بھی تبدیلی ہونا چاہئے لیکن
نواب کے یہاں یہ تبدیلی ناپید ہے۔ اس لئے بعض مقامات پر تو وہ
اس قدر ناہموار نقص پیدا کرتا ہے کہ دیکھنے والا بے ساختہ ہو کر رہ جاتا ہے
جبکہ ٹھیک ذرا سے بدلے ہوئے حالات میں اس کی مہارت کی صرف
نمود رہ جاتی ہے، صحیح میلانات کی تشریح مفقود ہو جاتی ہے۔

سہگل — طنزیہ اداکاری (Satirical Action of)
میں سہگل ایک خاص اور انفرادی فلسفیانہ انداز رکھتا ہے وہ اس کا مظاہر
جگہ جگہ بے تکلف ہو کر کرتا ہے اور لگن کی اداکاری میں بھی اس خصوصیت کو
اس نے خوبی سے قائم رکھا ہے۔

نیمو — [illegible] (Serious Action of) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

پجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

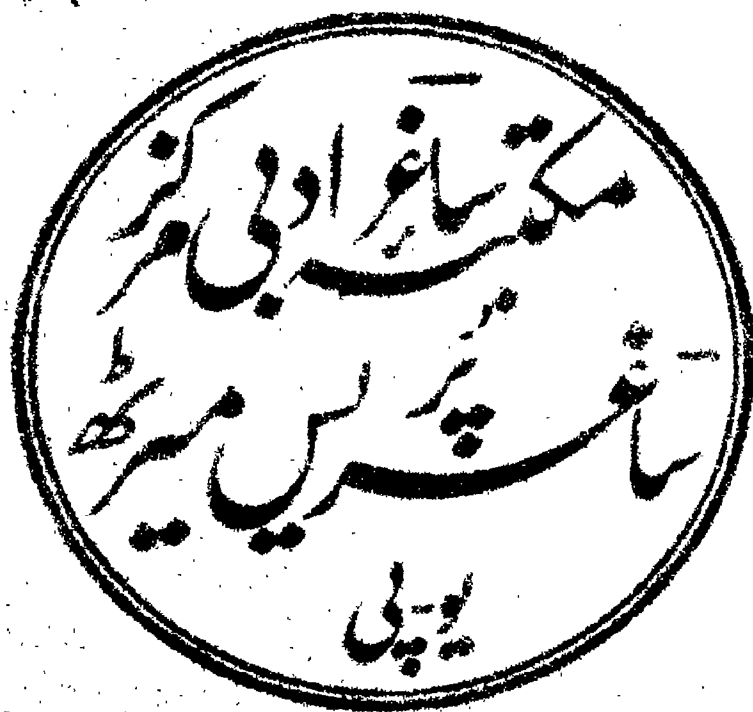
حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہمیں بالکل نوکھی چیز پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک چھوٹا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اسکی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی جو اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے سبب ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلچسپ ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب نظم کو سنتے ہی رہیں واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے [illegible]

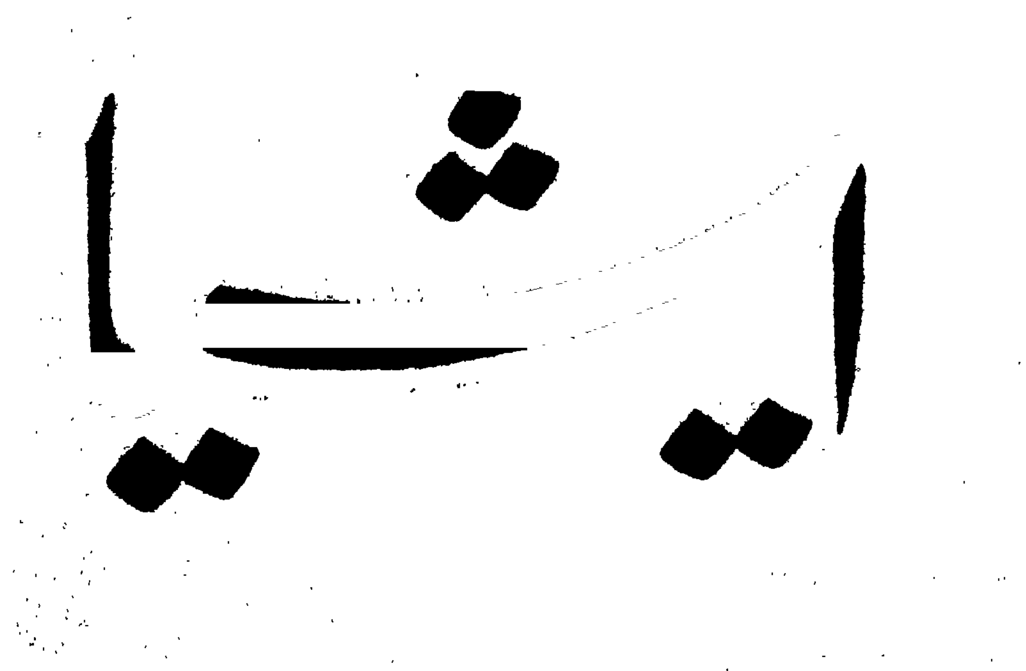
"ہز ماسٹرس وائس"

ایشیا



PUBLISHED BY :—

The ADBI MARKAZ Sagar Press, (India).
MEERUT



پُجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

حضرت ساغرؔ نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہمیں ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اسکی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغرؔ نظامی جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے سبب ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغرؔ نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پُجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرس وائس"

([illegible] میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات، حکومت صوبہ متحدہ، حکومت بہار

حکومت سی پی اور حکومت صوبہ پنجاب

مرتبہ

ساغر نظامی

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے) — جملہ حقوق محفوظ — قیمت سالانہ آٹھ روپیہ ([illegible])

قیمت فی نمبر ۸ آنے — [illegible] — [illegible]

ایشیا

جلد ۷	اگست سنہ ۱۹۴۲	نمبر ۷

فہرست مضامین

نئی صبح
(ادبیات وسیاسیات)

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اشارات	ساغر نظامی	۱۰
۲	آنیوالی دُنیا کی جھلک	مرزا ارشاد بیگ	۱۱
۳	روسو کا نظریۂ مشیت عامہ	اکرام قمر ایم-اے	۲۰
۴	قطعات	راحت سعید	۲۳
۵	سنگہائے سیل	عرش تیموری	۲۴
۶	اٹھارویں صدی کے دوڑانی کی	قاضی عبدالغفار	۲۹
۷	صحافت اور اسکے چند نمونے		

نیا راگ
(نظم وغزل)

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۸	نیا راگ	ساغر نظامی	۳۴
۹	ارباب شکستہ	عندلیب شادانی	۳۵
۱۰	آدمی	جوش	۳۶
۱۱	مھلکے	اختر الایمان	۳۸
۱۲	قلوبطرہ کا جلوس	م-ش حقی دہلوی	۳۹
۱۳	ایک حسین منظر	شاہد صدیقی	۴۱
۱۴	تخریب کا ترانہ	حسن یحییٰ عندلیب ایم-اے	۴۲
۱۵	در وصف امینہ خانم	حسرت موہانی	۴۳
۱۶	انعکاسات	ساغر نظامی	۴۵
۱۷	(دو غزلیں)		۴۶
۱۸	آخری آنسو	حسرت ترمذی	۴۶
	فکر عالی	جمیل الدین عالی	۴۶
۱۹	ستارے	مخدوم محی الدین حیدرآبادی	۴۷
۲۰	شکست	خورشید الاسلام بی اے علیگ	۴۸

نئی کہانی (افسانے وڈرامے)

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۲۱	نئی کہانی	ساغر نظامی	۵۰
۲۲	جذباتی کیڑے	سودھو سودن	۵۱
۲۳	سڑک	پرتھوی ناتھ شرما	۵۷
۲۴	شام	رام پرتاپ بہادر ایم-اے	۶۳
۲۵	بیگم	مسعود زاہدی	۶۹

کسوٹی (تنقید وتبصرہ)

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۲۶	کیا گوری کیا سانولی	میراجی	۷۴

نئی کتابیں

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۲۷	جگ بیتی	ادارہ	۷۸
۲۸	ادب کثیف	〃	
۲۹	جوانی دنیا کے عجائبات	〃	۷۹
۳۰	نغمۂ زندگی	〃	
۳۱	دیوان جوشش	〃	
۳۲	تمہیدی خطبے	〃	
۳۳	ہماری غذا	〃	
۳۴	تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ	〃	
۳۵			
۳۶	محمد رسول اللہ	〃	۸۱
۳۷	گورکی کی آپ بیتی	〃	۸۲
۳۸	تراشکی کا بیان	〃	۸۳
۳۹	شان خدا	〃	۸۳
۴۰	ناتستیت	〃	۸۴
۴۱	ہندوستانی کھیل	〃	۸۵

نئی صبح

اشارات

موجودہ مشکلوں سے بھری دنیا میں اشیا کی قدریں خود ہی اہم اور بلند ہو گئی ہیں۔ "کاغذ و سیاہی" سونے چاندی کی قیمت رکھتے ہیں۔ اس گراں قدر زمانہ میں ہر ادارہ کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ محض کاغذ سیاہ کرنے کی جد و جہد وقت اور قوت کا ضائع کرنا۔ اگر آج کوئی کتاب یا رسالہ اپنا معیار قائم نہیں رکھ سکتا تو اس کا فنا ہو جانا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ بد ذوقی کی اشاعت میں کمی ہو جائے گی اور اس اعتبار سے بھی کہ اس کے حصہ کا کاغذ دوسرے مستحقین کو مل سکے گا!

ایشیا کا جون و جولائی مشترک نمبر میری عدم موجودگی میں شائع ہوا۔ دکن میں میری نگاہ سے گزرا، پہلی نظر ہی میں میرے ضمیر نے مجھے حکم دیا۔ "تم دونوں میں سے ایک کی فنا فرض ہو گئی ہے'!؟ یہاں مجھے نہ ذمہ دار اراکین پر نکتہ چینی کرنی ہے، نہ کسی اور پر، مگر یہ ضرور اعتراف کرنا ہے کہ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوا، اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایشیا کا بند کر دینا پسند کروں گا مگر اس کی یہ حالت نہ ہونے دوں گا جو مشترک نمبر کی ہوئی۔ اس حالت کا واحد ذمہ دار صرف "ساغر" ہے، جسے آپ چاہیں معاف کر دیں مگر میں معاف نہیں کر سکتا۔!؟

تازہ نمبر صحتِ کتابت اور اپنے مقالات، مضامین، افسانوں، نظموں اور تنقیدی جزو کے اعتبار سے اپنے معینہ اور مقررہ معیار پر شائع کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ ممکن طور پر بلند ہوں، اور ایشیا جو کچھ پیش کرے اس کی حیثیت اِک آئیڈل کی حیثیت ہو، مگر بعض اوقات ایسی فروگزاشتیں ہو جاتی ہیں کہ ان کی تلافی ممکن نہیں ہوتی!

ارشاد بیگ صاحب نے "آنے والی دنیا کی جھلک" اس مرتبہ بھی دکھائی ہے، حیاتیاتی مسائل پر ڈارون ہربرٹ اسپنسر اور لزلی اسٹیفن نے ایک خاص مرکز تک غور و فکر کے بعد کچھ اخلاقی نظریے مرتب کئے۔ اسپنسر اور اسٹیفن نے غور و فکر کی بنیاد ڈارون کے نظریات پر قائم کی۔ ارشاد بیگ نے اِن سب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسپنسر اور اسٹیفن سے بھی آگے جانا چاہتے ہیں! پہلے مقالہ کی بہت کچھ تصریح اِن کے تازہ مقالہ میں پائی جاتی ہے، تیسرے مقالہ میں وہ اپنے مطالب کو اور بھی واضح کریں گے!

"روسو کا نظریۂ مشیّتِ عامّہ"، مختصر مضمون ہے۔ اس میں اکرام قمر نے ایک بڑی بحث کو چھیڑ کر، جلد ختم کر دیا ہے۔ ٹامس ہوبز، لوک اور روسو کے مقابلہ میں ملوکیت پسند تھا وہ مشیّتِ عامّہ کا قائل نہیں تھا، فرد کی اطاعت اور شخصی جابریت کو مانتا تھا۔ لوک نے ہوبز کے نظریوں میں ترمیمات کیں، اور انہیں عملی سیاسیات سے ہم دوش کیا۔ روسو نے لوک کی تعلیمات کی روشنی میں حاکمیت اور آزادیٔ رعایا کے مابین ایک معاہدۂ سیاسی کا نظریہ پیش کیا!

روسو کے پیش کردہ ان مسائل اور نظریات پر بہت کچھ وضاحت سے لکھا جا سکتا ہے، تاہم اس مختصر مضمون میں ان تمام مسائل پر طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، جو افادیت سے خالی نہیں!

"اٹھارویں صدی کے دورِ ثانی کی صحافت اور اس کے چند نمونے" قاضی عبدالغفار کا مضمون ہے جو یہ اندازہ کرنے کے لئے نہایت دلچسپ چیز ہے کہ اردو کتنے چولے بدل کر ہم تک پہنچی ہے!

ساغر

ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

ارشاد بیگ

آنے والی دنیا کی جھلک

غیر شعوری ارتقاء میں قباحتیں

غیر شعوری ارتقاء کے زمانہ میں نہ مرنا اچھا ہے نہ جینا کیونکہ زندگی میں تخریب و تباہی کے علاوہ تعمیر و تسکین کے پہلو مفقود ہیں۔ اصل میں اس وقت تک ہماری قوتِ حیات ترتیب و تشکیل اور اضافہ (ADDITION) و تغیر (ALTERATION) کے عمل سے گزر رہی تھی۔ زندگی تو تھی ہی نہیں بلکہ قوتِ حیات کی شعوری منزل حاصل کرنے کے لئے محض ایک جد و جہد تھی۔ ادراک آگے بڑھتا تھا مگر ماحول اور سماجی نظام سابقہ معیار پر قائم رہتا تھا۔ اس طرح زندگی اور ماحول میں تطابق قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس عدم تطابق کا لازمی نتیجہ تباہی اور جمود کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اور ہمارے جذبات اور آرزوئیں تشنہ رہ جاتی تھیں۔ مگر اب ترتیب و تشکیل کا یہ عمل ختم ہو رہا ہے۔ یہ تمام عمل تو صرف اس لئے تھا کہ ہم ایک اعلیٰ شعوری ارتقاء کے مرتبہ پر پہنچ جائیں۔ اب قوتِ حیات شعوری حیثیت اختیار کرے گی اور ایک ایسا درجہ معرضِ شہود میں آجائے گا جہاں ذہن اور ماحول ایک ساتھ شعوری حیثیت میں ترقی کریں گے۔ زندگی شعوری سمت میں آگے بڑھے گی۔ شعوری درجہ قائم ہونے کے بعد زندگی کا صحیح نظام قائم ہو جائے گا۔ قوتِ حیات کی پامالی اور غیر شعوری رفتار کے بجائے ایسی زندگی وجود میں آئے گی جو ادراک کے شعوری خاکوں کا نتیجہ ہوگی۔ اور آئندہ تمام ارتقاء انہی شعوری خاکوں میں اضافہ کی صورت میں ہوگا۔ آئندہ زندگی میں "ریاست" "وطن" "مذہبی خدا اور سچائی" کے نام پر ہر فرد کو اپنی خواہشات اور مسرتوں کی قربانی نہیں کرنی پڑے گی نہ اعلیٰ صداقت اور اقتدار کے تصورات اور بلند آدرشوں کو کامیاب بنانے کے لئے جذبات و احساسات کی زندگی کو کچلنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ باتیں تو صرف اس لئے تھیں کہ دوسرے کم درجہ کے تصورات اور میلانات ہماری قوتِ حیات کے نشوو ارتقاء کو نہ روک سکیں۔ لیکن شعوری مرتبہ کے بعد ارتقاء میں غیر شعوری غلط اور کم درجہ کے میلانات کے حارج ہونے کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوگا۔ غیر شعوری ارتقاء کے زمانہ میں انسانوں کو گھر بار۔ بیوی بچے۔ مال و دولت۔ سماجی جذبہ، محبت اور اپنی دلچسپیوں وغیرہ کو اکثر قوتِ حیات کے ارتقاء کے لئے (سچائی۔ وطن۔ اخلاق یا فرض کے نام سے یا اعلیٰ مقصد بنا کر) کچل دینا پڑتا تھا۔ آئندہ زندگی میں خود یہ تمام چیزیں انسان پر چھا رہی ہوں گی یعنی انسانی زندگی میں تشنگی اور کرختگی کا نشان بھی باقی نہیں رہیگا۔

مستقبل کی تاریخ

آئندہ تاریخ میں زوال کا کہیں ذکر نہ ہوگا۔ "زوال" اُس قوتِ حیات کے گرنے کا نام تھا جو آگے بڑھنے کی صلاحیت اور اپنا فائدہ زائل کر چکی تھی اور اس کے بجائے دوسری تازہ قوت اُبھرتی تھی۔ ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج کی اصل وجہ یہ تھی کہ قوتِ حیات سب کو شیرازہ بند کر کے ایک (UNIT) کی طرح ترقی نہیں کرتی تھی۔ نوع انسان کی جد و جہد قوتِ حیات کی شیرازہ بند اور شعوری جد و جہد نہیں تھی۔ آئندہ تاریخ میں نوع انسان ایک ہی مرکز اور ایک ہی مقصد کیلئے شعوری جد و جہد کرے گی۔ اس لئے زوال کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا زوال اور عروج دو چیزوں کا وجود چاہتا ہے یعنی ایک گرنے کے لئے موجود ہو اور دوسری ابھرنے کے لئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کی قوتِ حیات دو سمتوں میں کام کرے۔ آئندہ

تاریخ میں ایسا نہیں ہوگا۔ جنگ بھی ایک مشترکہ مقصد کی عدم موجودگی اور صحیح شعور سے دوری کا نتیجہ تھی۔ اور یہ ارتقار کی ایک گزر جانے والی حالت تھی۔ مختلف گروہ۔ مخالف جماعتیں رجعت پسند ادارے۔ مساجد۔ مندر۔ گرجے۔ محض قیاسی مسائل پر تحقیقات کرنے والی سوسائٹیاں۔ دماغی قوتوں کو زائل کرنے والی بیکار یونیورسٹیاں۔ ان سب کے ذکر سے نئی تاریخ کے اوراق آلودہ نہیں ہوں گے۔ آج کہیں پان ہندو ازم ہے کہیں پان اسلام ازم۔ کہیں یورپین جمہوریتوں کے اتحاد کی تجاویز ہیں۔ کہیں ایشیائی نظام نو۔ کہیں نازیوں کا نیا نظام ہے۔ کہیں قادیانیوں اور بہائیوں کی نئی دنیا ہے۔ "ہر ایک ہاتھ میں ایک جام ہے مگر خالی"۔ غرض اذہان دنیا کے ہر گوشہ میں ایک دوسرے سے متضاد۔ باطل اور غیر حقیقی تصورات میں ضائع ہو رہے ہیں۔ آئندہ دنیا میں ایک صحیح جانا بوجھا آئیڈیل ہوگا جس پر جدوجہد کی بنیاد رکھنے کے بعد نوع انسان کا ذہن ضائع نہیں ہوگا۔ زندگی شانت اور مالا مال ہو جائے گی۔ پادری مولوی۔ پنڈت۔ اور سیاہی سماج کے کارفرما عوامل میں سے نہیں ہوں گے۔ آئندہ دنیا میں نقصان (WASTE.) کے امکانات کبھی باقی نہیں رہیں گے۔

۱۲

۱۔ نقصاناتِ جنگ کا ازالہ ہو جائے گا۔

۲۔ علم برداران مذاہب کا کوئی مقام اور عمل باقی نہیں رہیگا پادری۔ مولوی۔ پنڈت۔ سماج پر بوجھ بن کر نہیں رہیں گے۔

۳۔ تبلیغی مراکز۔ قیاسی مسائل پر تحقیقات کرنے والی سوسائٹیاں۔ نوجوانوں کی زندگی کو بیکار کرنے والی یونیورسٹیاں یہ تمام ادارے معدوم ہو جائیں گے۔

۴۔ مخالف جماعتیں۔ غلط تصورات اور "ازم" وغیرہ میں ذہنوں کا ضائع ہونا ختم ہو جائے گا۔

۵۔ نسل اور مذہب کے تعصب کی وجہ سے پیدا شدہ تمام نقصانات کے امکانات مٹ جائیں گے۔

۶۔ جیل خانے نہیں رہیں گے۔

آئندہ تاریخ میں قوموں کی غلامی اور نسل انسانی کی پامالی کی داستانیں کالعدم ہو جائیں گی۔ کیونکہ ماحول اور نظام کی ہیئت یکسر مختلف ہوگی۔

حیاتیاتی طاقت کا طلوع

حیاتیات کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ عمرانیات کے مسائل کسی معاہدہ کی بنا پر طے و حل نہیں ہوتے بلکہ طاقت کی بنا پر فیصل ہوتے ہیں۔ عمرانی مسائل کو طے و حل کرنے کیلئے یہ طاقت قوتِ حیات سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ قوتِ حیات ازخود ذہن انسانی میں نہیں ابھرتی تھی۔ بلکہ غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کی وجہ سے جو نئے طریقے اور ذرائع انسان معلوم کرتا تھا وہی طاقت کی بنیاد ثابت ہوتے تھے جس میں زیادہ جان ہوتی تھی وہی زیادہ نئے طریقے اور ذرائع معلوم کر سکتا تھا۔ اور اس طرح خود کو زیادہ قوی بناتا تھا میکانی ذرائع کے پس پشت دراصل ذہنی اور قوتِ حیات کی صلاحیت ہی کام کرتی رہی ہے دوسرے الفاظ میں حیاتیاتی صلاحیت ہی میکانی صلاحیت کا سرچشمہ ہے آج وہی حیاتیاتی قوتِ حیات ترقی پاکر نئی شکل میں ابھر رہی ہے اس لئے اس کے سامنے میکانی طاقت بیکار ہو جائے گی کیونکہ میکانی طاقت اسی قوتِ حیات کی غیر ترقی یافتہ صورت تھی۔ فرد میں قوتِ حیات کا ہونے والا نشو و ارتقا اجتماعیات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کی حاکمی و محکومی کا مسئلہ کسی معاہدہ سے طے نہیں ہوا تھا۔ مغرب کا مشرق پر قبضہ اور غلبہ کسی معاہدہ کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ قوتِ حیات کے نشو و ارتقا نے جو اجتماعی اثر ڈالا اس کی بنا پر تاریخ نے یہ شکل اختیار کی۔ آئندہ نظام میں مسائل کسی معاہدہ کی بنا پر طے نہیں ہوں گے۔ بلکہ نئی حیاتیاتی قوتِ حیات ہی حکم بنکر مسائل کا فیصلہ کرے گی۔ اور چونکہ یہ نئی حیاتیاتی طاقت صحیح شعور کی حیثیت اختیار کرے گی اس لئے لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی پر مبنی نتائج ظہور پذیر نہیں ہونگے جیسے معاہدہ ورسیلز کے وقت ہوئے تھے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ نظام کی بنیاد حیاتیاتی حقائق پر ہوگی اور تاریخ میں شعوری ارتقار کا ایک نیا آغاز ہوگا۔

تاریخ کا حیاتیاتی نظریہ

حیاتیاتی عناصر تاریخ انسان کی تشکیل میں جو اہم اور بنیادی پارٹ ادا کرتے ہیں اُن کا اندازہ ذیل کے حالات سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ تاریخ کا ارتقا حیاتیاتی ارتقا ہے۔

۲۔ [illegible] حیاتیاتی عمل کے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے تھے۔

۳۔ آنے والا نظام اچانک صورت میں ظاہر ہوگا۔ کیونکہ حیاتیاتی ارتقا غیر مرئی ہوتا ہے۔

۴۔ تمام نوعِ انسان کے ادراک کو نئی قوتِ حیات مقید کرے گی۔ اور نظامِ عالم معطل حالت میں رک جائیگا۔

۵۔ حیاتیاتی قوتِ حیات میکانی قوت کی بجائے خود عمرانی مسائل کے حل کے لئے ایک قوت بن جائے گی۔

۶۔ شعوری ارتقار کا زمانہ شروع ہو جائیگا۔ نوعِ انسان کا ذہن آزادانہ ترقی کرے گا۔ غیر شعوری میلانات کی غلط مزاحمت اور ان دیکھی قوتوں کی مخالفت کا خدشہ نہیں رہیگا۔

۷۔ نوعِ انسان کی پامالی کا پہلو ختم ہو جائیگا۔ کیونکہ اب قوتِ حیات غیر شعوری اور اندھے ارتقاء کے عمل سے گزر چکی ہوگی۔

عمرانی صلاحیت

آئندہ زمانہ میں عمرانی صلاحیت منتشر اور اندھی حالت میں کام نہیں کرے گی بلکہ ایک منضبط اور شعوری حیثیت اختیار کرے گی۔ یہی نہیں بلکہ ارتقار کی ایک اعلیٰ ہیئت بھی اختیار کرے گی۔

یہ یاد رکھئے کہ ارتقاء قوتِ حیات میں رونما ہوتا ہے اور قوتِ حیات کی لطافت ہی انسان میں الوہیت کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ انسان میں ترقی اسی لطیف کیف و ہیجان کی مرہونِ منت ہے۔ تخلیق اور نئے طریق کا تعلق اسی لطیف قوتِ حیات سے ہے۔ خدا کا تعلق بھی عملی قوتِ محرکہ تخلیق اور عمرانی صلاحیت سے ہے۔ چونکہ خدا کا تعلق اس قوت سے ہے جو نوعِ انسان کی جدوجہد کی محرک اور رہنما ہے۔ اس لئے خدا زندگی پر قادر قرار پاتا ہے۔ لیکن آج مذہب کا خدا زندگی پر سے اپنا کنٹرول اور اقتدار کھو چکا ہے۔ اسے زندگی کی دھڑکن اور حرکت سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ قوتِ حیات حیاتیاتی [illegible] سے ہر انسان میں جاری و ساری ہے اس لئے خدا مضمر کہ خدا ہے اور چونکہ انسان ابھی تک ایسے مقام پر نہیں پہنچا ہے جہاں لطیف قوتِ حیات ہمارے ذہن پر منکشف ہو جائے اس لئے خدا بھی ابھی تک ایک راز ہے۔ لیکن نئی ہیئت ذہنی میں خدا کا عرفان حاصل ہوگا۔ کیونکہ انسان حیوانی سطح سے بلند ہو جائے گا اور اس کے حواس و ذہن ایک اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جائیں گے۔ اتنا ہی نہیں ہوگا بلکہ دُنیاوی جدوجہد سے بھی بہیمیت اور حیوانیت کی بو نہیں آئے گی۔ خدا ایک حیاتیاتی قوت، علم اور تخلیق کا سرچشمہ ہے اور عملی جدوجہد سے انسلاک رکھتا ہے۔ مگر مذہب کا خدا اعتقاد کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔

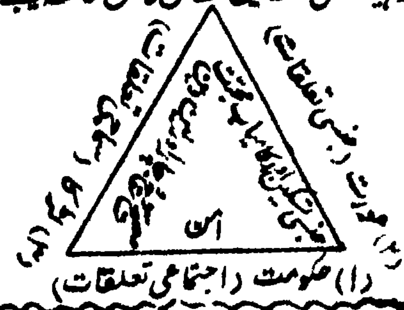
جب قوتِ حیات ایک اعلیٰ شکل میں ارتقاپذیر ہونا چاہتی ہے۔ اس کا تموّج انسان کے ذہن پر نہایت تیز پڑتا ہے اس تموّج کے پرتو سے خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں اگر انسان گفتگو کرنا چاہے تو الفاظ اس کے منہ سے ادا نہیں ہو سکتے کیونکہ گفتگو ادراک سے وابستہ ہے۔ یعنی بولنا ہماری سمجھ کا حیاتیاتی اظہار اور پرتو ہے۔ لیکن ادراک ایک خیرہ کن حیثیت میں ہونے کی وجہ سے اپنا حیاتیاتی اظہار کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ جب قوتِ حیات کے اس خیرہ کن تموّج کو ذہن برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے تو اس کے بعد شعوری ارتقار کے درجات شروع ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے ادراک ایک خیرگی میں اسیر ہوتا ہے۔ جب تک حواس قوتِ حیات کی اُبھرتی ہوئی لہروں کو قبول کرنے کے قابل نہ ہو جائیں قوتِ حیات مردہ حیثیت میں رہیگی۔ یعنی جب تک نوعِ انسان کے جسم میں قوتِ حیات کی لہریں ذی ہوش طریقے سے کام کرنے کے قابل نہیں ہوں گی ایک موت کی سی حالت نوعِ انسان کی حیات پر طاری رہے گی۔ آج ہر شخص پر موت طاری ہے۔ یعنی قوتِ حیات ایک ایسی اندھی گلی کے موڑ پر آ گئی ہے کہ اس سے آگے قدم رکھنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ حواس قوتِ حیات کی اتنی اونچی لہروں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ذہن اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکے گا۔ اس لئے ہر فرد کو اندھی گلی اور موت کی حالت سے بچنے کے لئے خود شعوری ہیئت ذہنی اور نئی قوتِ حیات کے سہارے چلنا ہوگا۔ یہ ہی نوعِ انسان کے وجود کے باقی رہنے کا واحد حیاتیاتی طریقہ ہے۔

نئی قوتِ حیات کو مزید ارتقا حاصل کرنے کیلئے نہایت دشوار مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے ذہن کو کئی سال تک غشی

کی حالت سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب دماغ اور احساسات اتنی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں کہ نئی قوت حیات کی لہروں کو جذب کر سکیں۔ تو تین مدارج اور طے کرنے ہوتے ہیں۔ یعنی غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کی ان تین نوعیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو وہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں اختیار کرتی ہے۔ پہلی نوعیت سیاسی قوت اور حکومت ہے دوسری نوعیت مسئلہ جنسی ہے۔ اور قوتِ حیات کی تیسری نوعیت اُنس بالمثل یعنی مرد کا مرد سے محبت کرنا ہے۔ جب تک نئے ارتقا کی دعویدار قوتِ حیات' غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کی ان شکلوں کو کنٹرول نہ کرے۔ صحیح نظام شروع نہیں ہو سکتا کیونکہ قوتِ حیات کی یہ تین نوعیتیں غیر ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے حیوانی حیثیت سے اونچی نہیں اُٹھ سکتیں۔ یہ تین نوعیتیں حیوانی حیثیت میں (۱) قتل و خونریزی۔ حرص و آز۔ (۲) حرام و حیوانیت اور (۳) آوارگی۔ کی فضا پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ اس لئے ان تین نوعیتوں کی جو قوتِ حیات کا ہیجان زندگی میں اختیار کرتا ہے حقیقی مدارج ارتقا کے ذریعہ ہی کنٹرول کیا جا سکتا ہے محض مذہبی اپیل یا اخلاق یا وعظ سے دُنیا میں کبھی ان تین نوعیتوں کو صحیح راہ پر نہیں پر دیا جا سکتا۔ جب ایک ایسی

۱۴

بلند حیاتیاتی سطح ذہنی دُنیا میں قائم ہو جائے گی جو ان تین غیر ترقی یافتہ نوعیتوں سے حیاتیاتی کشمکشوں کو طے کرنے کے بعد صحیح اور تکمیل یافتہ حیثیت میں ظہور پذیر ہو گی تو ان تین نوعیتوں کی حیوانی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ یہ نئی قوتِ حیات کے کنٹرول میں آ جائیں گی۔ اور لوٹ کھسوٹ اور حیوانی طور و طریق کا مظاہرہ کرنے کے لئے آزاد نہیں ہوں گی۔ اس لئے جنگ اور غلامی بھی دم توڑ دے گی۔ امن تسکین اور آزادی کی راہیں کھل جائیں گی۔ جنسی تعلقات میں او باغی، جاتی رہیگی کیونکہ جنسی تعلقات کا صحیح نظم پیدا ہو جائے گا۔ اولاد کی سرکشی اور آوارگی بھی ختم ہو جائے گی اور اولاد کی ذہنیت غلط سمت میں پرواز نہیں کریگی۔ جب یہ سب کچھ ہوگا تو دُنیا کی جد و جہد میں انتشار باقی نہیں رہیگا۔ اس مثلث میں مسائل کا حل ملاحظہ کیجئے۔



پہلے مقالہ میں سرسری طور پر ان مسائل کا [illegible] تا حال حکومت اور سیاسی و اجتماعی تعلقات خود غرضی، لوٹ کھسوٹ اور اسی قسم کے دوسرے عناصر سے پاک نہیں تھے۔ اس لئے دُنیا کی فضا بد امنی۔ تباہ حالی۔ ناانصافی اور خونریزی سے گھری ہوئی تھی۔ لیکن خود شعوری پر مبنی نظام میں اجتماعی تعلقات صحیح بنیاد پر قائم ہوں گے اور امن اس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔

اس وقت تک جنسی معاملات میں مرد ہمیشہ عورت سے دریہ بیکاری ثابت ہوتا رہا ہے اور اس کی ساری توجہات عورت کی طرف راجع رہی ہیں۔ ہماری دُنیا میں ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ مرد ہر قسم کی عورت سے ملتفت ہوتا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ عورت بھی اسی طرح ہر قسم کے مردوں سے ملتفت ہوتی ہو۔ اس وقت تک عورت کی فطرت ایک مجہول محبوبیت کے دائرہ میں ڈانواڈول رہی ہے۔ جس کی وجہ سے نسل انسانی میں عمیق جنسی لگاؤ۔ تناسب اور گہری جنسی وابستگی نہیں پیدا ہو سکی۔ مرد کی بڑھتی ہوئی طالبیت کے قدم بقدم عورت نے بھی مقابلہ کی طالبیت نہیں دکھائی۔ اگر عورت بھی خود محبوبہ نہیں۔ عاشق بنتی تو سماج کے جنسی دھارے کا رُخ زیادہ صحت بخش ہوتا۔ مگر اب عورت مرد کی طرف رجوع ہو گی۔ اور مرد سے زیادہ دلچسپی اور لگاؤ کا اظہار کرے گی۔ نوعِ انسان میں صحیح شعور بھی پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے مرد کبھی عورت سے ناانصافی پر مبنی اور غلط برتاؤ نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں آئندہ قوتِ حیات کے منتشر نہ ہونے اور ارتقا کے بلند مقام پر پہنچنے کی وجہ سے مرد مطمئن ہو کر عورت کی جنسی تسکین کے سامان مہیا کر سکے گا۔
بچہ ہی بڑھ کر آدمی بنتا ہے۔ لڑکے کے ذہن پر کنٹرول گویا مرد کے ذہن پر کنٹرول ہو جاتا ہے۔ اولاد نہ صرف یہ کہ فرمانبردار ہو گی بلکہ ہر لڑکا خود ایک صحیح باپ بھی ثابت ہوگا۔

قوتِ حیات کے یہ تین پہلو جب منضبط اور صحیح حالت میں اعلیٰ حیاتیاتی سطح ذہنی سے منسلک ہو جائیں گے تو زندگی کے لئے ایک نعمت' ایک عظمت اور ایک برکت ثابت ہوں گے ان کا انتشار ہی دُنیا کی پراگندہ فضا کا باعث ہے اور اس انتشار' ہی کی وجہ سے عمرانی صلاحیت ضائع ہوتی ہے اور یہ ضائع ہونا ایک دوسرے کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ لیکن قوتِ حیات سے متعلق ان حقیقی اور عملی مسائل کو وہی نظام حل کر سکتا ہے جو

قوتِ حیات کے سا تھ مختلف حیاتیاتی مدارج سے گزر کر ایک اعلیٰ ہیئت اور بلند ارتقائی صورت میں خود کو دُنیا کے سامنے ظاہر کرے کوئی مذہبی دستور یا فزکس یا کیمسٹری کی قوتوں سے تعلق رکھنے والا نظام ان مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا۔

قوتِ حیات کی برتر ہیئت اُسی وقت ایک صحیح نظام کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے جب قوتِ حیات ان تمین بکھری ہوئی حالتوں کو غیر مرئی طور پر کنٹرول کرے۔ غیر محسوس طور پر دُنیا اور نوعِ انسان اسی عمل سے گزر رہی ہے۔

جب دُنیا میں ایک حیاتیاتی خود شعوری سطح ذہنی قائم ہو جائے گی اور ایک نئے نظام کی صورت میں ظاہر ہو گی تو چونکہ ہمارے تمام افعال احساسات کے اشارے پر صادر ہوتے ہیں۔ .... اعلیٰ نمونہ کے انسان میں وہ جذبات و احساسات ایک کڑی ہوتے ہیں لہٰذا یہ ذہن کے سوچ و چار اور خیالات کو صحیح سلسلۂ حیات اور عالم پر محیط روحِ مطلق سے ملا دینے میں کامیاب اس طرح نئے نظام کا خاکہ صحیح ترین فطری خاکہ بن جاتا ہے جس میں غلط شعور کا دخل نہیں ہو گا۔ دوسرے یہ کہ روح کی تمام دبی ہوئی طاقتیں اُبھر آئیں گی۔ اصل اور مرکزی چیز ایک برتر اور اعلیٰ سطح ذہنی ہے۔ اسی سے تمام حیاتیاتی تبدیلیوں اور ذہن کی نئی ہیئت اور نئے نظام کے قیام کے مسائل کا تعلق ہے۔ یہی بنیادی اور مرکزی نکتہ ہے جو نئے نظام کے خاکہ کو سنبھالے ہوئے ہے اور یہی تمام حیاتیاتی اور ذہنی ترقی و تبدیلیوں کا سرچشمہ ہے اس لئے ہمارا نصب العین اسی سے وابستہ ہے۔

ہمارے افعال کی باگ قوتِ حیات کا ہیجان ہی سنبھالے ہوئے ہے۔ ادراک اسی قوتِ حیات کا ذہنی فعل ہے۔ تخیّل اور ادراک کے فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ تخیّل کے پس پُشت قوتِ حیات کا تموّج نہیں ہوتا بلکہ تخیّل دماغ کی پرواز ہوتا ہے اس لئے اگر انسان تخیل میں وہ کچھ بننا چاہے جس کا اس کی قوتِ حیات کا ہیجان ادراک کی صورت میں خود کو اہل نہیں پاتا تو اسے ناکامی ہو گی۔ انسان کی قوتِ حیات کا ہیجان اس کے تخیل کا ساتھ نہیں دیگا۔ انسان خود کو اور اپنے تخیل کو کھوکھلا محسوس کرنے لگا۔ انسان کا ہیجان ہی اسے بتاتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یہ ہیجان انسان کی قوتِ حیات کے تموّج ہی پر تو ہے۔ اس لئے انسان کی جدوجہد اس کی قوتِ حیات کی ہمت کش ہے۔ انسان کا خارجی ماحول انسان کی قوتِ حیات کے ہیجان کو چھوتا ہوا چلتا ہے۔ قوتِ حیات کا یہ ہیجان انسان پر چھایا ہوا ہے وہ اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ بیشک یہ ہیجان اب تک منتشر حالت میں ہے۔ اور غیر شعوری رو میں بہہ رہا ہے لیکن انسان کو اس سے مفر کہاں؟ انسان کے مزاج اور نفسی کیفیات کو یہی ہیجان تبدیل کرتا ہے۔ انسان اس کے اشارے پر ہر کام سر انجام دیتا ہے۔ قوتِ حیات کے اس ہیجان کے اصول محکم ہیں۔ یہ انسان میں ایسے تناؤ اور لہریں پیدا کرتا ہے کہ انسان کی جدّوجہد ان کی پابند ہو کر سفر کرتی ہے۔ لیکن تاحال یہ تمام عمل غیر شعوری، منتشر اور بے ترتیب حالت میں ہے۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان خاموش ہو جاتا ہے تو انسان کا خیال باوجود کوشش کے خود کو جدوجہد پر آمادہ نہیں کر سکتا اور جب انسان میں یہ ہیجان پوری قوت سے کروٹیں لیتا ہے وہ ایک شدید جدوجہد کے لئے مستعد ہو جاتا ہے۔ خارجی جدوجہد انسان کی قوتِ حیات کے ہیجان کے خلاف نہیں جا سکتی۔ اس لئے موجودہ خارجی جدوجہد قوتِ حیات کے ہیجان کے نئے ارتقاء اور اعلیٰ مقام کے لئے فضا پیدا کر رہی ہے اور دُنیا کو اسی سمت میں لے جا رہی ہے۔ کیونکہ خارجی جدوجہد قوتِ حیات کے ہیجان کے ارتقا سے الگ کسی اور شے کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ پس اب خارجی جدوجہد بھی مکمل طور پر ہمیں ایک تبدیلی کے ساحل پر پہنچا دیگی کیونکہ قوتِ حیات کا ہیجان اب مکمل طور پر ایک نئی ہیئت حاصل کر رہا ہے اور قوت کے نئی ہیئت میں آ جانے سے ہماری خارجی جدوجہد کا نقشہ بھی قطعی تبدیل ہو جائے گا۔

حیاتیاتی اصولِ اصلح

آج کی صحبت میں یہ سوال اہم ترین سوال ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو انسان کو .... زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے قابل بناتی ہے۔ بدقسمتی سے اس سوال کا جواب آج تک صحیح نہیں دیا گیا اور اس مسئلہ پر جس قدر روشنی ڈالی گئی وہ نہایت غلط طور پر ڈالی گئی۔ میری کوشش ہو گی کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ قوتِ حیات کا ہیجان اور نفسی جولانگاہ ہی وہ چیز ہے جو حیات کے قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں حصّہ لیتی ہے۔ قوتِ حیات کا ہیجان اور تموّج ہمارے ذہنی اور جسمانی قوتوں پر

ایک لدح پھونک دیتا ہے۔ دماغ کو نئے نئے طریقے معلوم ہو جاتے ہیں۔ نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں۔ یہی قوتِ حیات کا تموّج نئے نئے ذرائع کی صورت میں ہمیں ماحول پر قابو پانے کی قوت عطا کرتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس فرد میں قوتِ حیات کا ہیجان دب جاتا ہے وہ فرد جامد و ساکت اور بے دست و پا ہو جاتا ہے وہ تخریبی قوتوں پر جوابی وار نہیں کر سکتا۔ نہ اسے نئی نئی راہیں سوجھ سکتی ہیں اور نہ اسے اپنے وجود میں قوت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے فرد میں بڑھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ فرد کے زندہ اور باصلاحیت ہونے کا معیار یہ ہے کہ اسکی نفسی جولانگاہ نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کے لئے متحرک ہے۔ زندہ فرد میں ہیجان اور تموّج شدّت کے ساتھ پایا جائیگا اس کے برخلاف مردہ فرد میں سکون اور موت کی سی خاموشی ہوگی وہ عاجز نگاہوں سے انتہائی درد کے ساتھ خود کو مٹتا اور کچلتا ہوا دیکھتا رہیگا۔ لیکن اس کے وجود میں قوتِ حیات کا ہیجان کوئی طاقت بنکر نمودار نہیں ہوگا۔ وہ اپنے دماغ۔ اعضاء اور قوٰی کو استعمال کرنے کی راہیں نہیں پائے گا۔ بلکہ وہ ایسا محسوس کریگا کہ اس کے پر کاٹ دئے گئے ہیں۔ اس کی قوت سلب کر لی گئی ہے۔ (ADAPTABILITY)...... مطابقت کا لفظ نہایت ہی مہلک تصوّر پیدا کرتا ہے۔ پنپنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی قوتِ حیات کے ہیجان کی راہ میں رُکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ اسے دبایا نہ جائے بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ بڑھتی ہوئی قوتِ حیات کے تموّج کو صحیح طور پر آشکارا کرنا ہی زندگی کی کنجی ہے۔ ماحول نتیجۃً مٹتا چلا جائے گا۔ ایک اہم چیز غور کے قابل یہ بھی ہے کہ عبوری دور میں کوئی ماحول نہیں ہوتا جس سے تطابق کیا جائے۔ بلکہ ایک تخریبی کیفیت ہوتی ہے۔ تخریبی حالتوں میں سے وہی آگے بڑھتے ہیں اور وہی نیا ماحول بناتے ہیں جو قوتِ حیات کے ہیجان کی رو کو معطل نہیں ہونے دیتے۔ ماحول سے تطابق کا اصول نہایت ہی مُبہم اور بیکار سا ہے صحیح چیز قوتِ حیات کے ہیجان کو کامل قوتِ اظہار بخشنا ہے قوتِ حیات کے تموّج کو نہ روکنا اور اک کے اشارے پر آگے بڑھنا ہی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

ایک اور بھی غلط اصول ہے۔ اعضاء کے استعمال اور عدم استعمال کا۔ یعنی یہ کہ جس عضو کو استعمال نہیں کیا جائے گا وہ بیکار ہو جائے گا۔ اور جس کو استعمال کیا جائیگا وہ نشوونما پائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ قوتِ محرکہ کونسی ہے جو ایک عضو کے استعمال اور دوسرے کے عدمِ استعمال کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اگر غور و فکر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو قوتِ حیات کا تموّج ہی ایک عضو کے استعمال پر اکساتا ہے اور دوسرے کے استعمال میں تساہل برتنے والا میلان پیدا کرتا ہے۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان اعضاء میں تھپیڑے مارنے لگتا ہے تو اعضا اپنے اندر ایک جوش محسوس کرتے ہیں۔ جو انہیں اپنے استعمال کی طرف راغب کرتا ہے اور اعضا نشوونما پاتے ہیں۔ لیکن ان کی نشوونما اسی حد تک ہوگی جس حد تک قوتِ حیات کا تموّج انہیں نشوونما دے سکتا ہے۔ قوتِ حیات کے تموّج کی پشت پناہی کے بغیر محض استعمال نشوونما کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اور نہ اس کے بغیر استعمال کرنے کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر قوتِ حیات کے ہیجان کے بغیر استعمال جاری رکھنے کی کوشش بھی کی جائے۔ تو یہ ایک ٹہنی کو درخت سے توڑ کر الگ نشوونما دینے کے مترادف ہوگا۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان اعضاء میں جاری نہیں ہوتا تو اعضاء استعمال کی قوت سلب ہوتی ہوئی محسوس کرتے ہیں اور بالآخر ساکن و ساکت ہو جاتے ہیں۔ فرد میں اس تموّج کے خاموش ہو جانے پر اگر ذہن کو استعمال کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو یہ ایسا ہے جیسے پانی کے بغیر درخت کا پھیلاؤ بڑھانا۔ شاخ خود بخود سوکھ جائے گا۔

اس کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے طبعی انتخاب (NATURAL SELECTION) کہا جاتا ہے طبعی انتخاب بھی دراصل قوتِ حیات کے ہیجان یا تموّج کے سلسلہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے لیکن اصلیت سے واقف نہ ہونے کی بنا پر اسے بھی ایک خارجی اصول بنا کر پیش کیا گیا۔ ہوتا یہ ہے کہ جس نوع میں قوتِ حیات کا تموّج قوی اور شدید نہیں ہوتا وہ نوع خود کو قدرت کی خارجی طاقتوں سے بچانے کے طریقے اخذ نہیں کر سکتی اور ان کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی نفسی جولانگاہ ماحول کو نت نئے طریقوں اور قوتوں سے بھر دیتی ہے۔ جیسے سائنس کی ایجادیں۔ مشین۔ ذرائع آمدورفت اور جدوجہد کے مختلف نفسی اور ذہنی طریقے۔ تو پھر وہ نوع جو اپنی نفسی جولانگاہ سے محروم ہوتی ہے کہ ایسے ہی طریقے خود بھی معلوم کرسکے یا ان سے آگے بڑھ سکے وہ ان کا شکار بننا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے

آجکل کی دنیا آلاتِ جنگ کا شکار ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہمارا ذہن علاوہ آگے ترقی کرنے اور ماحول پر قابو کرنے کے طریقوں سے نابلد ہے۔

آپس میں نوع کا مقابلہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص کا ذہن بندوق ایجاد کرتا ہے لیکن دوسرے کا ذہن اتنا اہل نہیں ہے اس کے پاس محض تلوار اور بھالہ ہی ہے تو قدرتی طور پر وہ بندوق والے کے مقابلہ میں دب جائے گا۔ مشرق مغرب سے اسی طرح ارتقاء میں پیچھے رہ گیا تھا . . . . بھی کام کرتا ہے لیکن طبعی انتخاب بھی قوتِ حیات کی صلاحیت اور اہلیت سے الگ کوئی قطعاً خارجی اصول نہیں ہے۔ آج نفسی جولانگاہ اور قوتِ حیات کا تموج ہمارے ذہن اور اعضا کو زیادہ اہل اور قوی بنا رہے ہیں۔ اور ان کی نشو و ارتقا نفسی جولانگاہ اور قوتِ حیات کے تموّج کی ہی مرہونِ منت ہے۔

حیاتیات اور موجودہ بحران کے اسباب

حیاتیات موجودہ بحران کے متعلق جو نقطۂ نظر قائم کرتے ہیں وہ زیادہ گہرا اور عملی حقائق سے نزدیک ہے۔ حیاتیات کے نزدیک یہ بحران اس لئے نہیں بر پا ہے کہ انسان خدا سے دور ہو گیا ہے یا سرمایہ کی تقسیم غلط ہونے کی وجہ سے شدید حالتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے بلکہ حیاتیاتی قوتیں ترتیب و تشکیل کے دور سے گزر رہی ہیں اور ایک نیا انسان ابھر رہا ہے۔ سرمایہ داری کی وجہ سے یہ بحران پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ خود اس بحران کا نتیجہ سرمایہ داری ہے۔ اصل میں بحران تعمیری اور مثبت قوتوں کے فقدان کا نام ہے۔ بحران کو دُور کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ اس تخریبی فضا اور ان ہی طریقوں کی بنا پر ایک معتدل حالت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ نئی حیاتیاتی قوتوں کو معلوم کیا جائے جو اس انتشار میں انضباط پیدا کر دیں۔ ہماری ترقی نے ایک مشینی ماحول قائم کیا۔ اسی مشینی ماحول نے بہت سے لوگوں کو بیکار کر دیا۔ یہ چیز نئی مصروفیتوں اور نئے مقاصد کی مقتضی بنکر سامنے آئی ہے۔ غلط تقسیم کے نتیجہ کے طور پر سامنے نہیں آئی زندگی کی ترقی کا اصول یہی ہے کہ اس خلا کو نئی قوتوں کے ذریعہ پُر کیا جائے نہ کہ اسے بند کرنے کی کوشش کی جائے یعنی بحران میں ہی تعمیری فضا پیدا کرنے کی سعی کو مقصد بنا لیا جائے۔

اصل میں سرمایہ داری اُن ذہنی قوتوں کے فقدان کی وجہ سے ہے جو نئے صنعتی نظام اور میکانی طریقوں پر قابو پا کر ایک عہد

نظام سے بھی بلند سماجی نظام قائم کریں۔ اس طرح نوعِ انسان حیوانیت کے دور سے انسانیت کے دور میں ایک ارتقائی قدم بڑھا سکتی ہے۔ اور صحیح حیاتیاتی خاکوں کے ماتحت یہ بحرانی حالت جو چاروں طرف محیط ہے زیادہ مطمئن طور پر حل ہو جائے گی۔

ایک وقت تھا کہ ارتقائی قوتوں نے دُنیا میں نیا ماحول پیدا کیا۔ آج وہی ماحول صلاحیت واصلح کے اصول پر نوعِ انسان پر حملہ کرنے لگا۔ اور نئی قوتوں اور نئے طریقوں کا اقتضا پیدا ہوا۔ آج آلاتِ حرب نوعِ انسان کو فنا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب نوعِ انسان اسی صورت میں خود کو زندہ رکھ سکتی ہے کہ ایسے طریقے معلوم ہوں اور ایسا نظام قائم ہو جو موجودہ ماحول اور آلاتِ حرب پر قابو پا سکے۔ یہ انتظام وہی نظام کر سکتا ہے جسے افعالِ انسانی پر پوری طرح قابو ہو تاکہ انسان کا ارادہ و شعور اس کی گرفت سے گریز کر سکیں۔ اس کے لئے نئی ہیئت ذہنی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نوعِ انسان اور معاشرہ کی زندگی تباہی اور عذاب کے چنگل سے نجات نہیں پا سکتی۔ موجودہ سوشلزم کا نظریہ اس بلند ارتقاء کا حامل نہیں ہے۔ موجودہ سوشلزم کا فلسفہ حیاتیات سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ بغیر تخلیقی قوتوں، صلاحیتوں کے اضافہ کے سرمایہ کی تقسیم بدلنے کی کوشش کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو کسی بلند ارتقائی نظام یا ذہنی سطح کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف سرمایہ کی تقسیم بدلنے سے ہی مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ اس طرح انسانیت کی توجہ ان نئی قوتوں۔ انکشافات اور راہوں سے ہٹ جاتی ہے جو اس کی سرزمین ذہن میں دبی ہوئی ہیں۔ سرمایہ کی تقسیم کو مقصد بنا نا خود کو اس تخلیقی ذریعہ سے غافل رکھنا ہے جو انسانی سماج کو صحیح بنیادیں عطا کرنا یعنی خود شعوری ارتقاء کا حصول۔ اور اس طرح نوعِ انسان کی زندگی کا معیار اس معیار سے کہیں زیادہ بلند ہو سکتا ہے جس کا سوشلزم وعدہ کرتا ہے کیونکہ خود شعوری ارتقاء کے دور میں ہمارا ذہن آزادانہ ترقی کرے گا۔ آج کی طرح غلط تصوّرات اور مقاصد کا غلام نہ ہو گا بہت سے نقصانات مع جنگ کے دُنیا سے مٹ جائیں گے۔ اس بلند ارتقائی منزل کے بغیر اگر ہم مصنوعی تناسب یا خوشحالی پیدا کرنا چاہیں تو زندگی اتنی خوش آیند نہیں ہو سکے گی جتنی شعوری ارتقاء کے دور میں ہو سکتی ہے۔ لہذا اوّلین مسئلہ انقلاب کے حیاتیاتی عمل کی تکمیل اور شعوری ارتقاء کا حصول ہے۔ موجودہ حالت میں سوشلزم قائم کرنا دُنیا کو عبوری حالت میں روک دینے کے مترادف

ہے۔ اور ہونے والا انقلاب کبھی روکا نہیں جا سکتا۔ میں پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ سرمایہ داری اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ عبوری مسئلہ ہے جو صحیح حیاتیاتی نظام قائم ہونے پر باقی نہیں رہیگا۔ غلط تقسیم تباہی اور جمود اور نوع انسان کے مصائب کی ذمہ دار نہیں بلکہ جمود کے قائم رہنے اور بلند ارتقا کے حاصل نہ ہو سکنے کا نتیجہ سرمایہ داری ہے۔ انسان کو ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو ذہن کے جدید شعور و ارتقاء پر مبنی ہو۔

آج مشین ایک قوت ہے۔ مزدور کو اس سے بڑھ کر ایسی تخلیقی اور انکشافاتی قوتیں پیدا کرنی چاہئیں جن کی وجہ سے وہ اپنے وجود کو معاشرہ کے لئے زیادہ سود مند ثابت کر سکے۔ اگر وہ زندگی میں ارتقائی قدم اُٹھائے بغیر ماحول سے چمٹنا چاہے گا تو وہ سماج پر ایک مردہ بوجھ ہوگا اور یہ عمل ارتقاء کے سراسر خلاف ہوگا۔ آج ماحول میں صحیح نظم پیدا کرنے اور زندگی کو خوش حال بنانے کے لئے نئی حیاتیاتی قوتوں کی ضرورت ہے جن سے کام لیکر رجعت پسند رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔ ہمارا ذہن اتنا بلند نہیں ہے جتنا ماحول کا تقاضا ہے۔ اور ہمیں اس خامی کو دور کرنا ہے آج ماحول کے تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے انسان میں نئے حواس اور نئی ذہنی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔

موجودہ بحران ایسے بلند حیاتیاتی اور شوشل طریقوں اور ذہنی ترقیوں کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہے جو اس میکانی ماحول کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ حیاتیاتی عمل ہمیں اس طرف لیجا رہا ہے ہمارا کام ایک بلند فطری اور طبعی نظام حاصل کرنا ہے جس میں سرمایہ داری اور دیگر مسائل کا حل زیادہ مطمئن کن اور حیاتیاتی سائنٹفک حقائق کی بنا پر موجود ہو۔ موجودہ تخریبی قوتوں کو ہی تعمیری نہیں بنایا جا سکتا بلکہ ان سے بلند تعمیری قوتوں کی ضرورت ہے۔

تعمیر

انسان کا عمل اور حرکت تحت الشعوری ذہن پر منحصر ہے آج ہماری زندگی میں تحت الشعور ترقی کرتے کرتے بہت بلند درجہ پر کارفرما ہے لیکن ہم سوچنے اور کام کرتے وقت پرانے اور انتہائی کم درجہ کے شعور سے کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا شعور ہمارے عمل اور موجودہ ماحول پر قابو پانے سے عاجز رہتا ہے کیونکہ تحت الشعور بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ہمارا عمل تحت الشعور کا نتیجہ ہے تحت الشعور کے آگے بڑھنے کی وجہ سے ہماری عملی قوتیں بہت آگے بڑھ چکی ہیں جو موجودہ تعمیر کو گرا رہی ہیں۔ ہمارا تحت الشعور اتنے بلند درجہ پر کام کر رہا ہے کہ پہلا شعور نہ اس پر قابو پا سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے کیونکہ شعور کی جد و جہد خیال پر مبنی ہوتی ہے اور عمل اور تعمیر تحت الشعوری احساسات پر۔ اکثر مفکر آئندہ زمانہ اور دُنیا کا اندازہ لگاتے وقت پُرانے شعور کے خیال سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے دُنیا کو ان پر یہ اعتراض کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ یہ تعمیر سب خیالی ہے اور ابھی عمل کی دُنیا سے دور ہے لیکن ان اوراق میں بیان کردہ مسائل کی بنیاد تحت الشعور پر قائم ہے اور تحت الشعوری احساسات کے عمل کا اندازہ پُرانا شعور اپنے درجہ کے مطابق کرتا ہے۔ اس لئے مسئلہ اُلٹ کر یہ ہو جاتا ہے کہ اعتراض کرنے والوں کی بنیاد خیال پر اور ان مسائل کی بنیاد بلند اور حقیقی تحت الشعوری عمل پر ہے جس کا اندازہ پُرانے شعور کی رکاوٹوں کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے

آج تحت الشعوری ارتقار کا خاکہ تبدیلی کی طرف مائل ہے۔ اور کل تحت الشعور شعور کا درجہ حاصل کرنے والا ہے پہلے ہمارا شعور تحت الشعور کا صرف نامکمل جزو تھا۔ اب شعور اور تحت الشعور دونوں ایک سطح پر آنے والے ہیں۔ اس طرح ارتقار کا مرکز قائم ہو جائیگا اور آنے والا ارتقا شعوری ارتقا ہوگا۔ یعنی آجتک کا ارتقا غیر شعوری تھا۔ آئندہ ہماری زندگی کو عبوری دور اور جمود سے واسطہ نہیں پڑیگا انسانی ترقی ایک "لامتناہی اور حقیقی صبح" کی گود میں بیدار ہو گی۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تمام سائنس کا تعلق تحت الشعور سے ہے اور تمام سائنس کے انکشافات تحت الشعور سے کروٹیں لیکر اٹھتے ہیں۔ جن کو ماحول اور حواس کے ذریعہ پرکھنے سے درست پایا جاتا ہے۔ حواس اور تجربات کا کام پرکھنا اور تصدیق کرنا ہے۔ تمام اصول اور نظریات تحت الشعور کے منت کش ہیں۔

اسی طرح تمام کلچرل ترقی تحت الشعور سے ہی ہوتی ہے روحانی اقتدار (روحانی سے مراد کلیسائی یا مذہبی اقتدار نہیں ہے) کا تعلق بھی تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر سے ہے۔ اس کے علاوہ اس بات میں ذرہ بھر شک نہیں ہے کہ اصل میں عملی قوت اور طاقت بھی تحت الشعور کے علاوہ کہیں اور نہیں۔

جب انسانیت ایک ایسے مقام پر آجائے گی جہاں وہ کا تحت الشعوری حصہ ارتقاء کے ذریعہ شعور کا درجہ حاصل کر لیگا ۳۱

وقت تحت الشعور کے تمام پوشیدہ خزانے۔ بہترین کلچر۔ صحیح اور مکمل سائنس۔ صحیح روحانی اقدار۔ انسانیت کی آغوش میں آکر نوعِ انسان کو مالامال کردیں گی۔ اور خیالی نہیں بلکہ تمام عملی قوتیں انسان کے ساتھ ہوں گی۔ اس طرح انسان کی امیری عملی پشت پناہی سے وابستہ ہوگی۔ یہ ایک واضح حقیقت ہوگی۔ کوئی خواب اور خیال کی دُنیا نہیں۔

انسان فطری طور پر انتہائی سائنٹفک۔ انتہائی مقدس انتہائی افادہ طلب۔ اور انتہائی عملی ہے۔

جب تحت الشعور اور شعور ایک سطح پر آجائیں گے تو انسانیت کے حیوانی دور کے بجائے صحیح انسانی دور شروع ہو جائے گا۔ انسان کی فطرت جذبات و احساسات کی پیچیدگیوں اور نظام سے بنی ہے۔ نئے دور میں اس نفسی و جسمانی نظام میں ایک مکمل تبدیلی رُونما ہو گی۔ انسان کی کیفیت ہی دوسری ہو جائے گی۔ تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر کے ارتقا کی وجہ سے دماغی قوت میں اضافہ ہوگا اور چونکہ دماغ کے ساتھ تمام رگوں کا بھی تعلق ہے اس لئے انسان کی صحت بھی موجودہ صحت سے بہتر ہو جائے گی۔ انسانی اعضائے تناسل کا تعلق بھی دماغ سے ہے اس لئے دماغی ترقی اور نفسی ترقی کی وجہ سے انسان کی جنسی طاقتوں میں بھی ترقی ہو گی۔ نسل انسانی کو بہترین حظ حاصل ہوگا۔ مرد اور عورت کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہوجائیں گے۔ عورتوں کی اوباشی دُنیا سے مٹ جائے گی۔ انسان کا عمل تحت الشعوری ارتقاء کے ماتحت ہونے کی وجہ سے شعوری گرفت سے آزاد رہا ہے اور نامکمل شعور اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنا چاہتا ہے۔ تحت الشعوری طاقت دوسری نوعیت سے کارفرما ہوتی ہے۔ اس لئے قدرت انسان کو ہمیشہ اپنے خلاف چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عبوری دور میں تو مکمل طور پر قدرت انسان کو اپنے خلاف ہی نظر آتی ہے۔ لیکن تحت الشعور کے تمام حصّوں کے شعور میں آجانے کی وجہ سے انسان کا خیال اندھیرے میں نہیں رہیگا وہ اپنے عمل کو سمجھ سکے گا اس طرح تمام چیزیں اور واقعات حتیٰ کہ ہوا تک بھی انسان کے موافق چلے گی۔ کیونکہ انسانی حشیزی کائنات اور دُنیا میں اس طرح فٹ ہے کہ قوانین کے مطابق صحیح نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ انسان کی زندگی سے اَسرار بالکل مٹ جائیں گے کیونکہ اسرار شعور کے اندھیرے میں رہنے اور عدم تکمیل کا نتیجہ ہیں۔ تحت الشعور اور شعور کے ایک سطح پر آجانے کے بعد اسرار کا وجود ختم ہو ہی جانا چاہئے۔

غرض انسانی زندگی بلند ترین۔ نعمتوں سے لبریز۔ انسانیت پر مبنی۔ اوجھل قوتوں سے محفوظ۔ عبوری دور اور خطرات سے پاک زیادہ صحت مند اور عورت مرد کے تعلقات کے لحاظ سے زیادہ پائیدار ہوگی۔

خدا کا تعلق تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر سے ہے جس میں ارتقا ہوتا رہتا ہے اور جس کے ماتحت عمل بھی ہوتا ہے اس لطیف ترین تحت الشعوری عنصر کا شعور خدا کا عرفان ہے اس طرح خدا ایک اعتقاد نہیں بلکہ ایک ادراک۔ ایک قوّت اور ایک عملی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ مشرق کا خدا تخیئلی، ماوراء اور بیکار ہے لیکن آئندہ دُنیا میں انسان خدا کی تمیز کا شرف حاصل کر سکے گا۔

19

"اہنسا" کا فلسفہ ایک اپیل اور مضحکہ انگیز چیز ہے جو عملی حیوانی قوتوں پر کنٹرول نہیں کرسکتا۔ حیوانی قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ لیکن آئندہ دُنیا میں تحت الشعور کی عملی قوّت جنگ کو ختم کردے گی کیونکہ حیوانی ارتقا اور عبوری دور ختم ہو چکے ہوں گے اور انسانی ارتقا خود شعوری حیثیت اختیار کرلیگا۔

احساسات ہی ہمیں پرورش دیتے اور متحّدر کھتے ہیں۔ مگر خود ترقی کرجاتے ہیں اور ماحول کو سکونیاتی و جامد چھوڑ جاتے ہیں اس کے بعد ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان ماحولات کو ہمارے احساسات۔ جذبات اور خواہشات کا کوئی پاس ہی نہیں ہے یہی حال ہمارے آج کے احساسات و جذبات کا ہے جو اس جامد و سکونیاتی نظام میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں پاتے یعنی ایک بلند نظام ہی میں ہماری آرزوؤں اور ماحول کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ اس طرح انسانی سوسائٹی بن سکتی ہے اور شیرازہ بند ہو سکتی ہے۔

اکرام قمر، ایم اے

رُوسو کا نظریۂ مشیّتِ عامّہ

یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت اور کلیسا کا نزاع اہمیّت اختیار کر گیا تھا۔ سلطنت کے حامی بادشاہ کو اور کلیسا کے مویّد اسقفِ اعظم کو کلی اختیارات تفویض کر رہے تھے، اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دے رہے تھے۔

اصلاحِ مذہب (ریفارمیشن) کی تحریک نے دین اور دُنیا کو الگ الگ کر دیا۔ ریاست اور مذہب دو علیحدہ علیحدہ ادارے قرار دئے گئے۔ اب ملوکیت پرستوں نے ایک اور طرح ڈالی۔ اور بادشاہ کو خدا کا خلیفہ قرار دیکر اس کی اطاعت لازمی کر دی۔ ریاست کو خدا کی بنائی ہوئی کہا اور بادشاہ کو خدا کا نمائندہ ٹھیرایا لیکن تمام ملوکیت پسند اشخاص بادشاہ کے نائب خدا ہونے کے نظریّہ کو مکمل طور پر اپنا نہ سکے۔ ان میں طامس ہوبز (۱۵۸۸ – ۱۶۷۹ء) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ لیکن وہ ریاست کی حاکمیت کا زبردست حامی، قانونِ موضوعہ کی قطعیت کا زبردست مویّد، اور رعایا کے حقِ بغاوت کا زبردست مخالف تھا چنانچہ اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "عفریت" (لیوائتھن) میں ریاستی حاکمیت کے نظریہ پر زور دیا ہے۔ اس کے نزدیک ریاست کی بنیاد ایک ناقابلِ تنسیخ معاہدۂ عمرانی پر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ دورِ جاہلیت کے انسان اکٹھے ہو کر ایک ریاست بناتے ہیں۔ اس ریاست اور ریاست کے فرمانروا کی اطاعت لازمی اور غیر مشروط ہے اور فرمانروا کلّی اختیارات کا مالک ہے۔ جان لوک (۱۶۳۲ – ۱۷۰۴ء) نے اس کے نظریّات میں چند ترامیم پیش کر کے انھیں عملی سیاست کے موافق بنانے کی کوشش کی۔

جان لوک ۱۶۸۸ء کے انقلابِ انگلستان کا مویّد تھا۔ اس نے مشروط بادشاہت کا نظریّہ پیش کیا۔ موثر پیرایہ میں ہوبز کے نظریّہ میں اعتدال پیدا کیا اور حاکمیت کی سختیوں کو کم کیا۔ اس کا خیال ہے کہ ریاست کی حقیقی بنیاد دورِ جاہلیت کے افراد کے درمیان معاہدۂ عمرانی پر ہے اور اس معاہدہ کے بعد ایک قابلِ تنسیخ حکومتی معاہدہ ہوا جس میں ایک فریق تو تمام قوم کی ہیئتِ اجتماعی ہے اور دوسرا فریق وہ فرمانروا ہے جسے قوم اپنا سردار چنتی ہے۔ لوک کہتا ہے کہ قوم اپنے تمام قدرتی حقوق اپنی بنا کردہ حکومت کے سپرد نہیں کرتی بلکہ صرف وہ حقوق اس کے سپرد کرتی ہے جو قومی وجود کے لئے لازمی ہیں اور ریاست کا مقصدِ وحید فرد کے بقیہ قدرتی حقوق بالخصوص زندگی، آزادی اور ملکیت کے قدرتی حقوق کا تحفظ ہے۔

لوک کی تعلیمات کے زیرِ اثر روسو (۱۷۱۲ – ۱۷۷۸ء) معاشری و سیاسی انقلاب کے خواب دیکھنے لگا۔ اس نے شخصی آزادی کا جذبہ لوک سے بھی زیادہ ظاہر کیا۔ ریاستی حاکمیت اور آزادیٔ رعایا کو کس طرح اکٹھا کیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جسے حل کرنے کی روسو نے کوشش کی ہے۔ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یہ تصوّر کرتا ہے کہ دورِ جاہلیت کی آزادی کے مالک انسان رضاکارانہ طور پر ایک معاہدہ کرتے ہیں جس سے خود بخود ایک قوم وجود میں آ جاتی ہے جس میں فرد چونکہ قوم کا ایک جزو ہے قوم کے بالکل مترادف ہے اور فرد کی شخصی رائے اور قوم کی مشیّتِ عامہ (GENERAL WILL) میں کوئی اختلاف و تضاد نہیں۔

روسو کے مشیّتِ عامہ کے نظریہ کو علمِ سیاست میں ایک اہم جگہ حاصل ہے۔ سادہ الفاظ میں مشیتِ عامّہ کا مطلب قوم کی رائے ہے بشرطیکہ اس میں سب کا فائدہ ہو۔ اس نظریّہ کا مدعا و منشا حاکمیت کا جواز، اور ریاست اور شخصی آزادی کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے۔

روسو کہتا ہے کہ ہر کوئی مشیتِ عامہ کی اطاعتِ کلّی کر کے اپنی ہی رائے کی اطاعت کرتا ہے اور ظلم و استبداد سے اپنے آپ کو بچاتا ہے کیونکہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ سماجی شرائط کڑی ہوں اور مشیتِ عامّہ کے ذریعہ انسان ہیئتِ اجتماعی کی اطاعت کرتا ہے کسی فرد کی نہیں۔ جو حقوق وہ دوسرے کو دیتا ہے وہی وہ دوسرے سے حاصل بھی کر لیتا ہے۔ اس طرح کوئی شخص گھاٹے میں نہیں رہتا۔ جو کچھ وہ دیتا ہے وہ اُسے مل بھی جاتا ہے، جو کچھ وہ کھوتا ہے، وہ پا لیتا ہے۔ اور اپنی ملکیتوں کے

بقا کے لئے اُسے زیادہ قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

چونکہ سماج کی ہیئت ملک کی تشکیل جب ہر فرد کی رضا سے عمل میں آئی ہے اس لئے سماج کے فیصلوں کی مخالفت فرد کی طرف سے خود اپنی مخالفت ہے۔ لیکن آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہو مگر مشیت عامہ کے نظریہ کی رو سے باغی خود اپنے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ روسو کا خیال ہے کہ ایسے موقعوں پر آزادی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فرد اپنی اس رائے کی متابعت کرے جس میں مفاد عامہ مضمر ہو۔ سماج کے قیام کا مقصد فرد کی بہبود ہے اور فرد نے سماج کے قیام میں حصہ لیا ہے اس لئے جب فرد اپنی اس رائے کی پیروی کرتا ہے جو سماجی احکام میں شامل ہے تو درحقیقت وہ کسی کی تابعداری نہیں کرتا، بلکہ آزاد ہوتا ہے۔ روسو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اگر ایک شخص سماج کی مشیت عامہ کی تعمیل سے انکار کرے تو اسے اس تعمیل پر مجبور کر دینا چاہئے۔ بالفاظ دیگر اسے جبراً آزادی دی جائے۔

روسو مشیتِ عامہ کے متعلق مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے:۔

"اوّل۔ چونکہ مشیتِ عامہ مشترکہ مفاد کے لئے ہوتی ہے۔ اور اس کا تعلق کسی گروہ یا طبقہ کے مفاد سے نہیں ہوتا، اس لئے یہ ہمیشہ راستی پر اور ہمیشہ غیر جانبدار ہوا کرتی ہے۔ اس کا ماخذ سماج کے تمام افراد ہیں اور یہ سب پر عائد ہوتی ہے۔ مشیت جتنی عام ہوگی اتنی ہی منصفانہ ہوگی۔ درحقیقت یہ آوازِ خلق نقارۂ خدا ہوا کرتی ہے۔

دوم۔ ہر مسئلہ کا ایک پہلو بہبود عامہ سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور کسی گروہ یا فرد کے مفاد سے وابستہ نہیں ہوتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی شخص مشیت عامہ کی اطاعت نہ کرے لیکن یہ امر مشیتِ عامہ کے عدم وجود پر دلالت نہیں کرتا۔ چنانچہ مشیت عامہ ہمیشہ مستقل، ناقابل تغیر اور خالص ہوتی ہے۔

سوم۔ مشیتِ عامہ اور تمام کی رائے کی میں نمایاں امتیاز ہے۔ خواہ تمام متفق ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی رائے خود غرضی یا ذاتی مقاصد پر مبنی ہوتی ہے لیکن مشیت عامہ کی بنیاد مشترکہ مفاد پر ہوتی ہے۔

چہارم۔ مشیت عامہ کا اظہار سماج کی رائے کی صورت میں ہوتا ہے۔ روسو کہتا ہے کہ ریاست ایک اخلاقی وجود اور ایک ایسی مشیت رکھتی ہے جو ہمیشہ ہر جزو و کل کے مفاد و بقا پر مبنی ہوتی ہے اسی مشیت پر قانون کی بنیاد ہے اور یہی مشیت حق و انصاف کا معیار ہے"۔

روسو کے ان خیالات کے سرسری مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کے نزدیک فرد اور ریاست علیحدہ علیحدہ شخصیتیں ہیں، قوم کا اپنا ضمیر ہوتا ہے اور قوم مشیت عامہ کی حامل ہے سیاسی ادارے اور قوانین کے ذریعہ مشیت عامہ کو عملی جامہ پہناتی ہے چنانچہ قوانین آزادی عطا کرتے ہیں، کیونکہ یہ سب پر برابر عاید ہوتے ہیں اور مشترکہ مفاد کے لئے سب کی رضامندی پر استوار کئے جاتے ہیں۔

روسو یہ سوال کرتا ہے کہ اگر انسانی فطرت کی خود سری کے باعث فرد اپنی مخصوص رائے کا اظہار کرتا ہے جو مشیت عامہ سے برعکس یا مختلف ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ روسو کہتا ہے کہ اسے جبراً منا لیا جائے گا۔ مگر اس صورت میں فرد کی تعلیم و غیرہ کی آزادی کا کیا بنے گا؟ روسو لکھتا ہے کہ اس طرح آزادی میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ روسو کا خیال ہے کہ بعض اوقات فرد صداقت کو نہیں جان سکتا اس لئے قومی مفاد کا یہ تقاضا ہے کہ اسے کسی خاص فعل کے لئے مجبور کیا جائے۔ چونکہ اس قسم کے افعال مشیت عامہ پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے یہ لازمی ہے کہ اگر فرد کو حقیقت کا علم ہو تو وہ انہیں افعال کو از خود سر انجام دے۔ روسو کہتا ہے کہ انسان کی خود سری صرف یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی حقیقی رائے سے ناآشنا ہے۔ جبر اس کی حقیقی رائے کے مترادف ہے، قوم اس پر صرف اس لئے جبر کرتی ہے تاکہ اسے آزاد ہونے پر مجبور کر دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کو آزاد ہونے پر مجبور کرنا اسے اطاعت گزاری پر مجبور کرتا ہے اس طرح سے روسو کا مندرجۂ بالا سوال لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔

۲۱

جب ہم روسو کے نظریہ مشیت عامہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ چیز کھٹکتی ہے کہ یہ نظریہ روسو کے فلسفۂ خود غرضی سے ہم آہنگ نہیں ہے وہ انسان کو خود رائے اور خود غرض قرار دیتا ہے اس لئے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہی انسان اپنی خود غرضی کو کس طرح بالائے طاق رکھ کر مشترکہ مفاد کے لئے رضامند ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ مشیت عامہ کا نظریہ خود روسو کے فلسفہ سے ٹکراتا ہے۔

مشیت عامہ کی غلطی سے پابندی حکومتوں کے خلاف اکثر بغاوتوں پر منتج ہوگی۔ روسو یہیں یہ غیر مبہم طور پر بتاتا ہے کہ اکثر حکومتوں کی بنیاد مشیت عامہ پر نہیں بلکہ مخصوص مفادات پر ہے لیکن فرد پر مشیت عامہ کی اطاعت فرض ہے۔ اس لئے اسے اکثر ظلم بغاوت

بلند کرنا ہوگا۔ اس طرح اس امن و نظم کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی جو سیاسی ادارہ کے قیام کا مقصد تھے۔

مشیت عامہ کی تحقیق و دریافت نہیں ہو سکتی۔ یہ جاننا محال ہے کہ کون مشیت عامہ کا ترجمان ہے اور کون سی چیز مشیت عامہ کے مطابق ہے یہ متفقہ فیصلہ کسی فیصلہ کی اچھائی کا ثبوت نہیں۔

روسو کہتا ہے کہ اگر انسان یہ جان جائے کہ اس کا ہر فیصلہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے تو ہر انسان مشترکہ بہبود کیلئے سوچنا شروع کر دے گا۔ ہر فرد یہ کہے گا کہ "میرے نزدیک فلاں فعل مشترکہ فلاح پر منتج ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ دوسروں کی بھی یہی رائے ہے"۔

لیکن روسو کے اس سوال کے خلاف دو اعتراض ہیں:۔

(الف) اگر کوئی شخص کسی فعل کا قائل نہ ہو اور وہ اپنی رائے کا اظہار کرے، تو اس اظہار رائے کے لئے روسو کا نظریہ کوئی تحفظ پیش نہیں کرتا۔

(ب) تمام انسان شاذونادر ہی ایک سا سوچتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دو مخلص اشخاص کی رائیں آپس میں بالکل متضاد ہوں۔ ان حالات میں کوئی خدا کا فرستادہ قانون ساز ہی مشیتِ عامہ کا ترجمان ہو سکتا ہے لیکن خدا کے اس فرستادہ کی بعثت کی کوئی امید نہیں۔ مجلس عامہ ہی مشیت عامہ کو ظاہر کر سکتی ہے۔ اس طرح روسو کا سر بفلک نظریہ جمہوریت محض ہو کر رہ جاتا ہے لیکن اب یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ اقلیت کیوں اکثریت کے فیصلوں کی پابندی کرے۔ روسو اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ اکثریت کو مشیت عامہ کی مظہر نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اقلیت کی رائے مشترکہ بہبود کی حامل ہو۔ گویا کہ مشیت عامہ کی تلاش بالکل بے سود ثابت ہوتی ہے۔ حکومت کے پاس کوئی ایسا واضح ادارہ نہیں جو مشیتِ عامہ کو بیان کرے۔

اندریں حالات یہ امر از حد حیران کن ہے کہ اس قسم کا اضداد سے لبریز نظریہ سیاسی فلسفہ میں اس قدر اہمیت اختیار کر گیا ہے اور اس کا علمبردار روسو ایسا مفکر اعظم ہے۔ روسو اس نظریہ کی حمایت میں جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی اپنی مخصوص نفسیاتی حالت کا نتیجہ ہے اسے اپنے گناہوں کا احساس تھا اور وہ ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اخلاقی نجات کے لئے اس نے جو ذریعہ سوچا وہ نہ مذہب تھا اور نہ کلیسا۔ بلکہ اس نے سماج کی دنیوی طاقت کو نجات کا ذریعہ سمجھا۔ لوگوں میں مدنیت کا جذبہ موجود ہے جس کا نتیجہ عقلیت ہے۔ عقلیت مشترکہ بہبود اور مقصد انسانوں کا مطالبہ و تقاضا کرتی ہے۔ مشیت عامہ ذریعہ اتحاد بھی ہے اور سماج کی اخلاقی ہیئت حاکمہ بھی جو سماج کے ارکان کی اخلاقی نجات کی اہلیت رکھتی ہے کیونکہ سماج کی مشیت فرد کی بھی رضا ہے۔ اور فرد سماج کی اطاعت سے اپنی ہی اخلاقی مشیت کی پیروی کرتا ہے۔ اور نجات حاصل کر لیتا ہے۔

اس نظریہ میں بعض بنیادی سچائیاں بھی موجود ہیں، اور یہ انسان، سماج اور ہیئت حاکمہ کے متعلق بعض صحیح خیالات پیش کرتا ہے۔

یہ نظریہ ہیئت حاکمہ اور قانون کی اطاعت کا جواز پیش کرتا ہے۔ ریاست قانون کے ذریعہ لوگوں کی رائے کو پیش کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر قانون "معقول مدنی الطبع قلب" .... (SOCIAL MIND RATIONAL) کا اظہار ہے۔ اس طرح یہ نظریہ قانون کی اطاعت کی ضرورت و جواز بتاتا ہے۔ قانون کے سامنے ہر شخص کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ فرد کو کسی قسم کی طبقاتی یا شخصی مراعات عطا نہیں کی جاتیں۔ ہر شخص قانون کی ایک سی اطاعت کرے گا۔ درحقیقت روسو کے جنون مساوات نے اس کے جنون آزادی کو تحریک دی ہے۔

یہ بالکل بجا ہے کہ ہر مسئلہ کا ایک پہلو راستی پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے اس پہلو کو سمجھنے اور عملی جامہ پہنانے کی کوشش لازمی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مجلس عامہ میں طبقاتی مفادات آپس میں ٹکرا کر مشیت عامہ کے لئے راستہ صاف کر دیں گے۔

روسو سے پہلے قوم کے ایجابی عمل کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا قوم کو آہستہ آہستہ اور غیر مرئی ترقی کرنے والی سمجھا جاتا تھا۔ قانون صرف قانون قدرت تھا۔ جو حالات کے مطابق ڈھال لیا جاتا تھا، لیکن روسو یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ قوم مشیت عامہ کے ذریعہ ایجابی عمل کرتی ہے۔

المختصر، مشیت عامہ قائم و دائم ہے، ہم سب میں موجود ہے، ہمیشہ حق پر ہوتی ہے اور اطاعت کی بنیاد ہے۔ لیکن کوئی ایسا واضح ادارہ موجود نہیں ہے جسے مشیت عامہ کا ترجمان سمجھا جا سکے۔

روسو نے بادشاہ کی بجائے قوم کو حاکمیت کا مالک قرار دیا۔ لیکن وہ قوم کے خلاف فرد کو کوئی تحفظ نہ دے سکا۔

اگرچہ روسو فرد اور قوم کے تعلق کے مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مگر اپنی بحث و نظر کے دوران میں اس نے علم سیاسیات میں مستقل اور گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر ہیرن شا اپنی کتاب "ارتقائے نظریاتِ سیاسی" کے باب "دورِ عقلیت" میں رقمطراز ہے:-

"روسو کہتا ہے کہ سیاسی طاقت کی بنیاد عوام پر ہے مشترکہ مفاد حکومت کا اصلی مقصد ہے۔ اس کے نزدیک ریاست ایک عمرانی تنظیم ہے اور ایک تنظیم ہونے کی حیثیت سے اس میں قومی احساس بھی ہے، اور مشیتِ عامہ کا وجود بھی۔ وہ اس جمہوری نظریہ کا حامی ہے کہ سیاسی فریضہ کا حقیقی معیار رضامندی ہے۔ وہ آزادی اور حاکمیت کے اتحاد کو ممکن قرار دیتا ہے......... اس کے نظریات انقلابِ فرانس میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ جس طرح مانٹسکیو نے بوربونز کے سیاسی استبداد کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ اور والٹیئر نے رجعت پسند و بد اطوار کلیسائے گال کی طاقت کو کمزور کر دیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح روسو نے فرانس کے غیر منصفانہ معاشرتی نظام کی اخلاقی و ذہنی بنیادوں کو اکھیڑ کر رکھ دیا۔

راحت سعید

قطعات

"خط کے جواب میں!"

تُو نہ مجھے بھلا سکی اِس کا خیال ہے مجھے — میں نے تجھے بھلا دیا اس کا ملال کچھ نہیں

جب بھی تری تلاش تھی، اب بھی تری تلاش ہے — عشق کی صبح و شام میں ماضی و حال کچھ نہیں!

"یاد"

شام سے کچھ دیر پہلے دامنِ کہسار میں — سُن رہا تھا گوشِ دل سے نغمہ ہائے آبشار

اِس طرح آتی تھی تیری یاد رہ رہ کر مجھے — جس طرح سوتے میں کوئی گدگدائے بار بار!

"ماضی و حال"

یک بیک اِک نرم جھونکے سے ہوا کے اِس طرح — ابر کے ٹکڑوں سے باہر آ گیا ہے ماہتاب

میری کیفِ شوق میں ڈوبی نگاہوں سے کبھی — دفعتاً جیسے ہُوا تھا تجھ کو احساسِ شباب!

عرش تیموری

سنگ ہائے میل!

نوشادی شدہ چاند!

تاریک سایوں میں —— اس طرح لرز رہا ہے جیسے کسی کے شدتِ جذبات میں ہونٹ! اور کوئی یہ سوچ رہا ہے کہ وہ دلہا کا ہے نہ خوشی کا پرستار، —— چنگیزی زندگی، دو رُخی زندگانی یا پُرشور مگر بے شعری تہذیب اس کے لئے کوئی دلبستگی نہیں رکھتی ہر چند کہ اسی گرد و پیش میں گرفتار ہے لیکن یک رنگ زندگی، یک سوز زندگانی یا حقیقی انسانی تہذیب کی جستجو اس کے دل کو پریشان بھی رکھتی ہے اور اسی دھن میں مست و سرشار بھی رہتا ہے۔

کوئی سوچتا ہے کہ جس ادیب کی فکر و عمل کی کاوشیں غرض و مقصد سے عاری ہوں وہ دو حال سے خالی نہیں، اگر مجنوں ہے تو مرفوع القلم ہے اور اگر شاعر و ادیب ہے تو اسے کبھی کبھی اپنی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے! اپنی منزل کی مسافت کا اندازہ کرتے رہنا چاہئے۔

کسی کی ادبی زندگی کم سہی، کسی کے ادبی کاموں کا حجم چھوٹا سہی، دیکھنا تو یہ ہے کہ گزشتہ تین چار برس میں کسی نو عمر ادیب کی سرگرمیوں میں کوئی ارتقا بھی ہوا ہے یا نہیں؟

اس سے پہلے کہ کسی کی ادبی زندگی سے چند اقتباسات پیش کئے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے بارے میں زاویۂ نظر بیان کر دیا جائے۔

اعلیٰ ادب وہی ہے جو ایک شاہراہ کی مانند ہو۔ جس پر سے مختلف الحیثیت مخلوق معمولی حالات اور روز مرہ کے لباسوں میں بے تکلف گزر رہی ہو —— ایسا ادب عبرت انگیز بھی ہوتا ہے اور جنوں خیز بھی!

باوجودیکہ یہاں نہ تو رسیلے جذبات کی موجیں ہوتی ہیں نہ چٹپٹے خیالات کے طوفان، بلکہ بالکل سادہ زندگی اور اصلی زندگانی کی سچی تصویریں! —— تاہم ایسا ادب قوتِ تمیز کو اُبھارنے والی عبرت اور خلاق عمل جنون پیدا کرتا ہے! —— یہی عقل اور عشق مل کر شخصی تہذیب اور قومی تعمیر کے لئے بنیاد کا کام دیتے ہیں!۔

زندگی میں نہ کوئی رس ہے نہ مزا۔ نہ چشک ہے نہ مہک، وہ تو ایک بے طوفان سمندر، ایک بے نشیب و فراز میدان ہے۔ البتہ زندگانی حرکت و سکون کا چھلکتا ہوا کٹورا ہے۔ اسے چاہے طوفان کہہ لیا جائے اور چاہے نشیب و فراز!۔

ادیب یا شاعر کی نظر زندگی پر ہوتی ہے اس کا ادب زندگی کی لازوال ہمیشگی سے بھرپور ہوتا ہے زندگانی کے طوفان یا نشیب و فراز تو پڑھنے والوں کو سوجھتے ہیں۔

اداکار کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو درونِ پردہ ہوتی ہے دوسری وہ جو بیرونِ پردہ۔ ادیب و شاعر کی بھی ایسی ہی دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں اُلجھ کر ادیب گیٹے کے کردار فاؤسٹ کی طرح مسلسل کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی ایک ادا بن کر رہ جاتی ہے۔

کسی کی رائے میں ادیب و شاعر کو چاہئے کہ وہ اپنی دونوں شخصیتوں کو ایک دوسری میں سمو دے اور اس طرح اپنے میں ایک تیسری شخصیت پیدا کرے جو مذکورہ دونوں شخصیتوں سے بالاتر ہو۔ جو ان کی نگرانی بھی کرے اور نگہبانی بھی۔ یہی وہ تیسری شخصیت ہے جو ادیب و شاعر کو پیغمبرانہ اوصاف سے قریب کر دیتی ہے۔

کسی کے خیال میں ادیب و شاعر اپنے اصولِ نظر و فکر کو ایک چوک کے رُخ کھلتا ہوا دریچہ بنائے اور جو کچھ اس دریچہ میں سے دیکھے ہو بہو الفاظ و عبارات کا جامہ پہنا کر سلیقے کے ساتھ پیش کر دے!

اگر کہیں ضرورتاً ع گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

بھی واقع ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ پیش کرنے کا سلیقہ خیالات کی ترتیب، بیان کی دلنشینی، ادیب و شاعر کی استعداد و قابلیت پر منحصر ہے

اور یہی قابلیت ادب کو ہر دا مجاز کا مرتبہ بخشتی ہے ۔

ادیب و شاعر کو چاہئے کہ تیر سے زیادہ ہدف کو اہمیت دے اور یہی جذبہ اس کے آرٹ کی ایک کشش سے نمایاں ہونا چاہئے۔

انسان کو آدمی سے مفر نہیں اور آدمی کو انسان کے بغیر چارہ نہیں، بالکل اسی طرح جیسے جسم کو سایہ سے گریز نہیں اور سایہ کو جسم کے بغیر وجود نہیں۔ لیکن عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ جسم اور سایہ کو الگ الگ دو مستقل ہستیاں قرار دیدیا جاتا ہے۔ یہ غیریت و دوئی کا نظریہ ہے اس سے آرٹ تباہ اور مختلف ہنگاموں میں گم ہو جاتا ہے۔

آجکل کے شعر و ادب میں کوئی نیا زاویۂ نظر نہیں پیدا کیا جارہا ہے، انہی پرانے طریقہائے نظر و فکر کی تشریح و توضیح کی جارہی ہے اور سب سے زیادہ تنقید کے نام سے تمدید و تقبیح پر ہر ادیب قلم داشتہ لکھتا جارہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادب و شعر فوج کی طرح قواعد کر رہا ہے ـــــ
ں موجودہ شعر و ادب نہ کوئی قدم حکم (مقررہ قواعد و ضوابط) کے
ف اٹھا سکتا ہے نہ رکھ سکتا ہے۔

مختصراً ادیب کو نہ تو "ادب برائے ادب" کے اصول پہ
بند ہونا چاہئے اور نہ "ادب برائے مقصد" کے اصول کا معتقد!
، نہ پروانہ کی طرح شعر و ادب میں فنا اور نہ بلبل کی طرح شعر و
ب کا دکیل یا دلال!

لہذا کوئی چاہتا ہے کہ ایک ادبی نمائش گاہ کھولے اور اپنی اپنی
ند کے نوادر انتخاب کرنے کی دعوت دے۔

نمائش گاہ تو بہت وقت، انتظام اور اہتمام چاہتی ہے بالفعل
، ور بطور (ریہرسل) کے طور پہ چند نمونے پیش کئے جائیں۔

اقتباسات

حُسن و شباب:۔ "ہر عطر ایک خوشبودار تیل یا عرق پر کشید
تا ہے جسے زمین کہتے ہیں۔ حُسن کی زمین بھی شباب ہے۔ جس
چھا عطر اپنی زمین پہ غالب رہتا ہے اسی طرح حُسن کامل بھی اپنے
شباب کو نمایاں نہیں ہونے دیتا۔"

حُسن کے قوی مظاہر:۔ "بعض حُسن نظر فریب ہوتے ہیں
ں سامعہ نواز۔ حُسن نظر فریب ہوش و حواس کے پرچے اڑا دیتا
س لئے اس کا منکر نا پید ہے۔ لیکن حُسن سامعہ نواز ایک طویل
ان ہے جس کا آغاز ازل سے ہوا اور انجام ابد پہ ہوگا۔ یہ
داستان سوتوں کو گدگدا کر جگاتی اور جاگتوں کو تھپک تھپک کر سلاتی ہے۔ عالم امکان میں حُسن سامعہ نواز کے منکر بہت ہیں لیکن انکار خود اس کے ہونے کی دلیل ہے۔"

حُسن سے ہستی کی شناخت:۔ "ہستی کی تعریف فلسفی کے پاس کچھ نہیں۔ وہ اس کو حیات، علم اور ارادے کی دلیل سے پہچانتا ہے درانحالیکہ حیات، علم اور ارادے سے بھی ویسی ہی ناواقف ہے۔ اسی طرح فلسفی اور اس کی ذریات ایک مجہول سے دوسرے مجہول کا قیاس کر لیتے ہیں۔ لیکن ادیب یا شاعر ہستی کو حُسن سے پہچانتا ہے۔ وہ صریحاً دیکھتا ہے کہ حُسن فریبندہ نے عقل کے قدم ڈگمگا دئے اور جنوں کا بول بالا کر دیا۔"

بُت پرست حُسن پرست ہے اور خدا پرست عبد حُسن ہے: "تمام کائنات خدا پرست ہے۔ ایک آدم ہی بُت پرست ہے کہ اس نے انواع و اقسام حُسن کی پرستش کی دھن میں کروڑوں بُت بنا ڈالے لاکھوں صنم خانے تعمیر کر دئے، پھر بھی جی نہ بھرا تو مسجدوں میں غیر مرئی حُسن کی پرستش پہ کمر بستہ ہو گیا۔ یہاں سے بھی جی اکتا گیا تو خانقاہوں کے تاریک گوشوں میں دل کی گرمی کو پھونک پھونک کر روشن کیا اور اسی کو حُسن کا مظہر بنا کر پوجا پاٹ کرنے لگا۔"

دل اور حُسن:۔ "دل حُسن کا آئینہ اور حُسن تمام دلوں کا آئینہ خانہ ہے۔ لہذا عالم دل اور عالم حُسن دو آئینہ خانے ایک دوسرے کے مقابل ہیں ؎

دریائے فراواں خود اک آئینہ خانہ ہے
ہر قطرے کو اپنے میں دریا نظر آتا ہے

حُسن سیرت

آدمی:۔ "وہ گوشت کا لوتھڑا جو آدمی کی صورت لیکر دُنیا میں آتا ہے مدت دراز تک اعلیٰ صفات انسانی سے محروم رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ سیرت کی تخلیق ہوتی ہے اور کوئی چابکدست نقاش اس مرقع کی قلمکاری میں ہمہ تن منہمک رہتا ہے۔

آفات ارضی و سماوی کے علاوہ ذاتی خواہشوں اور ترغیبوں کے فوارے اس مرقع کو تر دامن کرتے رہتے ہیں اور گرد و پیش کے شیاطین الانس و الجن اس کے خد و خال کو بگاڑنے کی تاک میں لگے رہتے ہیں لیکن وہی نقاش صیاد کی طرح اپنی کمین گاہ سے مرقع پر ٹکٹکی لگائے سیرت کی بہتر سے بہتر تجویز اور دلکش سے دلکش تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔"

صورت و سیرت: "حُسن سیرت وہ خوش رنگ ٹھنڈی روشنی ہے جو صورت کے فانوس سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آتی ہے اور دور دور تک فضاؤں کو منور کر دیتی ہے"

حُسن سیرت کا تفوق: "حُسن سیرت بدصورتی کے تمام عیوب کو چھپا لیتا ہے۔ وہی بھدّے ناک نقشے حسن سیرت کی چمک دمک سے لشکارے، گرمیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں"

آدم زاد اور دوام زندگی: "آدم زاد دوام زندگی کے لئے ہمیشہ سے ماہیٔ بے آب کی طرح بے تاب ہے لیکن جن کی خواہشوں میں لذت کی طلب غالب ہوتی ہے وہ غارت کر دی جاتی ہیں غارتگر بھی آدمی ہی ہوتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ خدا کے ہاتھ اور ان کے دل و دماغ بے دردی یا ہمدردی کی بجائے عدل و انصاف کے تقاضوں سے بھرپور ہوتے ہیں ——— اور جن کی خواہشوں میں محبت و ادب غالب ہوتا ہے ان کے جسم بھی ڈوبتے ہیں مگر لطیف روحیں مرغابی کی طرح دُنیا کے سمندر سے خشک نکلتی اور دوام زندگی کی مالک ہو جاتی ہیں"

زوال پذیر قومیں: "سُنتے آئے ہیں کہ زوال پذیر قوموں میں سیرتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ ہمیں اپنی سیرتوں میں حُسن پیدا کرنے کیلئے کیسی تربیت درکار ہے۔ کیونکہ ہمارا تقاضائے فطری زندگی دوام کا طالب ہے۔" (اقتباس ۔ مضمون "حسن")

گفتگو سے دل کی شناخت: "باتیں بھی دل کا دھواں ہوتی ہیں ——— کسی دل میں عود دان روشن ہے اور کسی میں یادِ جہاد گیم ——— دھنواں دھنواں ایک مگر اثر و کیفیت میں فرق ہے! ——— ابھی ہندوستان سونگھنے کی قوت سے محروم ہے! ——— خیر وقت آئے گا" (خیال آفریں دماغ)

گمراہ دل: "گمراہ دل غبی بچے کی طرح دماغ کا آموختہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکامی (غافلانہ عادتیں) رُلائے دیتی ہیں" (تجزیاتی تمثیل ——— بستر کی گداز بانہوں میں)

احساس اور شاعر: "ہر چیز کا تعلق احساسات سے ہے کسی ویران قبرستان میں گراموفون بجائیے تو آپ کو لطف نہ آئیگا اور اگر وہی گراموفون کسی رسیلی چاندنی رات میں جھیل ڈل میں چلتی ہوئی کشتی پر بجائیے تو آپ بےخود ہو جائیں گے ——— یہی حال شاعروں کا ہے کہ بہاراں میں حُسن کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے خزاں کی کوئل کا نغمہ شاعروں کے نزدیک نغمہ نہیں۔ ان کیلئے تو بہاری کوئل کی اور بہار کا نغمہ نغمہ ہے" (ٹیگور کے ساتھ دو سال ——— رسالہ ایشیا)

علم بیماری ہے: "دوست عزیز! علم و فضل کی طرف مطلق توجہ نہ دو۔ اس لئے کہ علم بیماریاں پیدا کر رہا ہے۔ دماغی بھی اور قلبی و روحانی بھی۔ لوگ جتنے ذی علم ہیں اتنے ہی زیادہ بیمار" (خیال آفریں دماغ)

زندگی حماقت آفریں ہے: "زندگی کے متعلق کیا پوچھتے ہو! ——— عمر کے مسافر کے گمراہ نقوش پا کے تسلسل سے ایک پگڈنڈی سی بن رہی ہے جس میں ہر قدم پر حماقتوں کی تجدید ہوتی رہتی ہے" (خیال آفریں دماغ)

خدا کا بُت: "یہ حمد! ——— یہ کیا ہے؟ سراسر توہین [illegible] انسان نے الفاظ کا بُت تیار کیا۔ اور لوگوں نے اس لفظی بت کی پرستش شروع کر دی، بعینہ اسی طرح جیسے کہ سامری نے سونے کا بچھڑا بنا ڈالا اور قوم بنی اسرائیل سربسجود ہو گئی!

ڈنلپ موٹر ٹائر کمپنی کے مالک کو خوب سوجھی کہ اس نے اپنے کارخانہ کے اشتہار میں ایک آدمی کی تصویر پر ٹائر ہی ٹائر پہنا دیئے ——— ہاتوں اور پیٹ کے ہلکے آدمی نے خدا کے تصور کو لفظوں کا اس قدر لباس پہنائے کہ کثرتِ لباس اصل تصور کا مزار بن گئی [illegible] یہ اندھی مخلوق اسی مزار یا تصور یا لفظی بُت کے آگے سربسجود ہے"

انقلاب کے علمبردار اور ہندوستان: "انقلاب کے علمبردار [illegible] ——— یہ انقلاب کے علمبردار ادیب جو خیالات کے گھوڑے دوڑاتے [illegible] میں ان سے خوب واقف ہوں! ...... میں پوچھنا چاہتا ہوں [illegible] ہاں! ان انقلابیوں سے! ...... تمہیں ایسی بے شرمی [illegible] کا کیا حق ہے؟ ——— تم نے ہندوستان کے آلام و مصائب کو [illegible] لفظوں اور عبارتوں سے جانا ہے! ...... اور انہیں کو الٹ کر تم نے پھر چھپوا دیا۔

تم نے ہندوستان کی بھوک! ——— جسمانی، دماغی اور [illegible] بھوک کو کتابوں سے دریافت کیا ...... تم نے ہندوستان دل کے متصل کھڑے ہو کر کبھی اس کی وحشیانہ اور تیز دھڑکن نہیں سُنی! ——— اگر سُنی ہوتی، اگر تم نے غریب زندگی دیکھی ہوتی تو قلم توڑ کر پھینک دیتے! جس طرح عالم نزع کے احساسات قلمبند نہیں کئے جا سکتے۔ اسی طرح ایک خزاں رسیدہ، ایک سسکتی ہوئی، [illegible] ٹھٹھری ہوئی زندگی کا عکس بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے [illegible] زندگی کی ہلکی سی جھلک دیکھی اور اس دن سے خاموش ہوں! بالکل خاموش!!"

ڈاکخانہ لاوارث مہری لفافہ: "ارے دیوانے! اس سوچ بچار، اس فکر و تردد نے ہی تو مجھے کہیں کا نہ رکھا، تو دنیا کا ظرف معلوم ہوتا ہے، تو نے کبھی آئینہ میں صورت بھی دیکھی ہے؟ ..... بالکل ڈاکخانہ خطوطِ لاوارث (DEAD LETTER OFFICE) کا مہری لفافہ۔"

آپس میں بے خبری: "یہ دنیا جہاں ہم دل بہلانے کے لئے آتے ہیں، ایک سرائے ہے جس میں قطار در قطار بستر لگے ہیں، مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں!"

پامال کردہ: "بعض آدمی اور پامالی توام پیدا ہوتے ہیں بعضوں کو زبردستی پامالوں میں درج کر لیا جاتا ہے۔ اور بعض پامالی کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں۔"

زندگی اور میں: "آہ! میری زندگی کسی اڑتے ہوئے پرندے کا سایہ ہے جو سطح زمین پر دوڑ رہا ہے! ---- نہ معلوم میں اس کے پیچھے دوڑ رہا ہوں یا وہ میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے!"

کتاب زندگی: "یہ زندگی ایک کتاب ہے ---- میری غفلت و بیداری کے حالات کی۔ میرے قول و فعل کے اثرات کی۔ میرے عیش و طیش کی کیفیات کی ---- کہیں کہیں صفحوں کے بیچ میں ترکیں رکھی ہیں، یہ میری وہ یادیں ہیں جو ایک فراموش کار کی کتاب زندگی میں بے ارادہ محفوظ رہ سکیں! ---- جب میں اپنی زندگی کی کتاب کو دہراتا ہوں تو صرف یہ ترکوں والے صفحے ہی سامنے آتے ہیں۔"

دوگونہ زندگی: "انسان زندگی کا عجائب خانہ ہے مگر حقیقی زندگی عقل و اخلاص کا کاشانہ۔"

میں اور بجلی کا تازیانہ: "کیا میں کسی مغلوب الجذبات شاعر کا وزن سے گرا ہوا مصرعہ ہوں جو ردیف و قافیہ سے بالکل بے پروا ہے! ---- ہاں، ہاں ..... ایسا مصرعہ جو تڑپنے تو یا بجلی کا تازیانہ اور ایسا تازیانہ جیسے تازیانہ ساز بھڑک چڑھانے آواز پیدا کرنے کے لئے جگہ جگہ سے توڑ مروڑ کر رکھ دیتا ہے۔ لہٰذا تازیانہ اپنی ذات سے شکستہ اور یہی شکستگی اس کا کمال ہے کیونکہ جس قدر شکستگی بڑھتی ہے اسی قدر چمک اور آواز میں اضافہ ہوتا ہے ؎

بلبل تری آواز کے ہر بول کے اندر
میں ایک تڑپتا ہوا دل دیکھ رہا ہوں

انسان اور آدمی: "بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان اپنی قسمت آپ بناتا ہے، ---- آہ! دنیا میں کوئی انسان ہی نہیں، سب آدمی ہیں۔"

ناموافق گردو پیش: "غالب نے بھی کیا کیا شاہکار پیش کئے ہیں، ---- میں بھی اپنا شاہکار پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب ارادہ کرتا ہوں تو ہونٹ ہلنے لگتے ہیں لیکن آواز نہیں نکلتی بعینہ اسی طرح جیسے کسی بھیانک خواب کے گرفتار کی گھگی بندھ جائے۔"

دماغ: "انسانیت کے سر پر تاج شاہی ہے، نہیں نہیں یہی ساری دنیا میں آباد ہے یعنی یہی حاکم اور یہی محکوم۔!"

فکر و نظر: "آنکھوں کی خاک نے میرے قلم کی آندھیوں کے سوا کچھ نہیں۔ مگر دل خون کے آنسوؤں کا لبریز کٹورا ہے! یہ میری قمیص اسی خونِ دل کو جذب کرتی رہتی ہے جو کبھی کبھی کٹورے سے چھلک جاتا ہے! ---- کیا میرا خونِ دل فکر و نظر کا افشردہ ہے کہ بجلی کی طرح جسم سے پار ہو کر قمیص کو رنگین کر دیتا ہے؟ ---- اگر اس قمیص کی رنگینیاں دنیا کو دکھا دوں تو اسے رنگ آمیزی سمجھے گی!"

۲۷

شاعر اور مداری: "آہ ہندوستان! ---- ہندوستان کے بوالہوس شاعر اور مداری میں کیا فرق ہے؟ ..... ان کے حالات کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں ---- یعنی شاعر بھی ڈھونگ رچا کر سوانگ بناتا ہے۔ سارے ایسی خرافی بنگر، جھوٹے تعریفوں کے پل باندھتے ہیں، مگر عقلمند آدمی دانتوں میں انگلی رکھتا اور منہ پھیر لیتا ہے۔"

معطر خار و خس اور پژمردہ پھول: "اگر خار و خس پر بھی عطر چھڑک دیا جائے تو لوگ دور ہی سے خوشبو سونگھ کر مست ہو جاتے ہیں لیکن بیچ بیچ کے پھول اگر دھوپ سے مرجھائیں یا ہاتھ لگنے سے کمہلائیں تو ان کی طرف کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا۔"

اردو کی گالیاں: "اف اردو میں کس قدر گالیاں ہیں! لوگ کہتے ہیں کہ زبان قوم کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔"

زندگی اور قیامت: "جیون کیا ہے؟ قیامتوں کا سلسلہ ناشناسی جو اولادِ آدم کی مسرتوں اور پیار آرزوؤں کی شاہراہ پر گھسٹتا لڑکھڑاتا چلا جا رہا ہے۔"

ہندوستانی شاعروں کا معشوق: "ہندوستان کے شاعروں نے چاند کو معشوق کے چہرے سے تشبیہ دی ہے لیکن ملحاق

سے چہرے میں تو کوئی حُسن نہیں، ویسے بھی گول چہرے عوام کالانعام اور ایسے لوگوں کے ہوتے ہیں جن کے دماغ نازک خیالی سے معرّا، جن کی نگاہیں نکتہ رسی سے مبرّا اور جن کے دل قصائی کے گندہ سے کچھ زیادہ باوقعت نہیں ہوتے۔"

آوارہ حُسن: "وہ آوارہ حُسن ہے! خودی کی لہروں پر تیرتی ہوئی کشتی! ـــــ کاش میں اپنے آپ میں ڈوب کر ایک چیخ کھینچتا جو اس کے کانوں کے پردے پھاڑ دیتی اور ترکِ غفلت کا آغاز ہوتا! ـــــ کاش میرے گرما گرم دل کی بھاپ اس سے سرگوشی کرتی۔ اور کہہ دیتی کہ اری نادان، تن کی سُندرتا تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے! ہاں، اگر حُسنِ لازوال کی طالب ہے تو اپنے دماغ، من، آتما اور سیرت میں حُسن پیدا کر! ـــــ مگر وہ تو باغِ عام ہے، اس کے چھوٹے سے دماغ میں تحش کے مسائل و تجربات کے سوا اور کسی چیز کے سمانے کی گنجائش ہی نہیں، اسی عینک کا رنگ جذباتی ہے۔"

ہندوستان کا تخش اور سماج: "جب ان کے ساغرِ دل میں بال آیا تو وہ ایک جھنکار، ایک شعلہ بداماں شکست سے پسپا ہو کر اس مارکیٹ کی طرف دوڑ گئیں جہاں جوانیوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے، جہاں قوموں کی زندگی اپنا مزار تعمیر کرتی ہے۔ جہاں صبح کا ستارا کبھی نہیں نکلتا، ـــــ میں عزت کرتا ہوں میں اُن آوارہ عورتوں کے سامنے احترام کے ساتھ سر جھکاتا ہوں، کہ انھوں نے اپنی خودی کو پا لیا ـــــ اس عزم و استوار میں بڑے بڑے رہبروں اور سورماؤں سے بھی بڑھ گئیں۔"

ہندوستانی رہنما: "آہ، ہندوستان پر ایسے بڑے بڑے رہنما مینڈکوں کی طرح برس رہے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی سماج کے خلاف علمِ بغاوت بلند نہیں کرتا۔"

رونا اور ہنسنا: "سارا انانیت کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے جب میں اپنے اوپر ہنستا ہوں، ـــــ اور جب اپنے آپ پر ہنستا ہوں تو رونا آجاتا ہے۔" (اقتباس ـــ خیال آفریں دماغ)

"دیوانے! سارے دُکھ اس لئے ہیں کہ لوگ اس پتھروں سے پٹی ہوئی سڑک پر کھڑاؤں پہن کر "کھٹ کھٹ" کرتے ہوئے چلنا چاہتے ہیں، جو دبے پاؤں گزر جاتے ہیں انھیں کوئی غم نہیں ہوتا۔" (اقتباس ـــ "وقت گزر رہا ہے")

"پاس پرست ناتواں میں ہوتا ہے! عیب جیب ہوتا ہے اگل چین نہیں! ـــــ یہ دُنیا دھوکے کی ٹٹی نہیں! یہ سرائے فانی نہیں، یہ ناٹک نہیں، یہاں فنا کا نام و نشان نہیں، یہاں حُسن ہی حُسن ہے۔"

"ہا! اس جگہ کو کون چھوڑے جہاں مائیں ہوں، غریب ہوں، بچے ہوں، گزشتہ زندگی کا پچھتاوا اور آئندہ زندگی کا اندیشہ ہو۔"

"ارے یہ گنگا جمنی زندگی بسر کرنے والے انسان، بند گلیاں ہیں! بند گلیاں!! ان میں نالیاں بہتی ہیں، کوڑے کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، ابابیلیں گھونسلے بناتی ہیں اور کبوتر "غٹر غوں" کرتے ہیں۔ انھیں ـــــ انھیں چلگیری زندگی بسر کرنے والوں کی کیا خبر! انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ ان کی بستی میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو زندگی کے سرکش دنوں کو دھکیلتا ہے؟ یہ لڑھکتے ہوئے پتھر سب کچھ جانتے ہیں!" (اقتباس ـــ "وقت گزر رہا ہے")

"کسی کا دل نہیں بھرا ـــ کوئی اپنے بستر میں پڑا ہوا سوچتا ہے کہ یہ پیلنے ناکافی ہیں ـــ مگر ـــ گمر نوشادی شدہ چاند نافِ آسماں میں اس طرح لرز رہا ہے جیسے کسی کے شدتِ جذبات میں ہونٹ۔"

قاضی عبدالغفار

اٹھارویں صدی کے دورِ ثانی کی صحافت اور اُس کے چند نمونے

گزشتہ سال میں نے اُردو صحافت کے ابتدائی زمانہ کے متعلق حیدرآباد کے ریڈیو اسٹیشن سے تین تقریریں کی تھیں۔ بسلسلہ چند روز اور جاری رہنے والا تھا لیکن جنگ یورپ کا ہنگامہ اس قدر زیادہ گرم ہو گیا کہ علمی، ادبی یا فنی گفتگو کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ اور حالات حاضرہ پر میری تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت اُردو صحافت پر میری تقریروں کے سلسلہ کی چند کڑیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اُن میں سے ایک آج پھر پیش کرتا ہوں۔ ۱۸۵۰ء تک اُردو صحافت کی داستان بیان کر چکا ہوں لیکن اس دور کے بعض قدیم جرائد کی انشا پردازی کے چند نمونے بہت دلچسپی کے ساتھ سُنے جائیں گے۔ اس لئے اٹھارویں صدی کی اُردو صحافت کے دورِ آخر کا ذکر کرنے سے پہلے دورِ ثانی کی صحافت کے چند نمونے آپ کو سُنا دوں۔

مثلاً "دہلی اردو اخبار" اپنی ۲۴ مارچ ۱۸۵۰ء کی اشاعت میں سیاحت اور سفرِ حج کے متعلق اپنے ناظرین کو اُس زمانہ کا ایک آسان راستہ ان الفاظ میں بتاتا ہے:۔

"مشتاقان تفریحِ دیار و امصار اور سیاحان بحر و بر کو مژدہ ہو کہ بشرط شوق و ہمت اب عرب و عجم اور روس و شام و انگلستان کے جانے کیلئے بہت سہولت و آرام کا راستہ نکلا ہے یعنی فیروزپور یا لاہور سے کشتی پر سوار ہو کر بہ آرام تمام سندھ بمبئی تک آدمی پہنچ سکتا ہے اور کچھ خوف چوری چکاری کا اثنائے راہ متصور نہیں ہے۔ اگر لاہور سے سوار ہو تو از راہ دریائے راوی بارہ دن میں ملتان پہنچ سکتا ہے" وغیرہ

یا مثلاً "دہلی اردو اخبار" اپنی ۱۹ نومبر ۱۸۵۴ء کی اشاعت میں اُستاد ذوق کے انتقال کی خبر اس طرح درج کرتا ہے:۔

"خیر و افسوس ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق اُستادِ خاص حضورِ اقدس ظلِ سبحانی افسوس صد افسوس کہ شہنشاہ ملک سخنوری خسرو اقلیم معنی گستری ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم خاں ذوق استادِ خاص حضورِ والا نے شب ۲۴ صفر شب آخری چہار شنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء عالم فانی سے بسوئے عالم جاودانی رحلت کی۔ الحق یہ وہ مصیبت عظیم ہے کہ اگر صاحب زبان محاورہ فرس و ریختہ اردو بلکہ تمام اہل سخن ہند لباس ماتمی پہن لیں تو روا ہے۔ حضورِ والا کو جب اطلاع اس واقعہ جانکاہ کی ہوئی باوجودیکہ دربار عام بتقریب آخری چہار شنبہ مہیا تھا اور سب ارکین سلطنت باریابی و مجرے کو حاضر تھے لیکن سب کو برخاست کر دیا اور حکم دیا کہ شاہزادگان والا تبار معہ جمیع اہل دربار استاد مرحوم کی مشایعت جنازہ میں شریک ہوں۔"

یہ گویا تقریباً ایک صدی پہلے کی اردو زبان کا صحافتی انداز تحریر ہے لیکن یہ رنگ رفتہ رفتہ بدلتا گیا اور صحافتی زبان میں بالآخر جو سنجیدگی اور سلاست پیدا ہوئی اُس کے ایک داعی تو مرزا غالب تھے اور ان کے بعد سب سے بڑے داعی سر سید احمد خاں ہوئے جنھوں نے خود اپنے قلم سے مضامین نگاری کا ایک نیا نمونہ ملک کے سامنے پیش کیا چنانچہ تہذیب الاخلاق کے مسلک کی جتنی مخالفت اُس زمانہ میں کی گئی اس سے زیادہ اس کے طرزِ تحریر کی تقلید بھی شروع ہو گئی۔ اور اس بنیاد پر اُردو صحافت کے ارتقاء کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس زمانہ میں "اخبار پنجابی" نے اپنے شمارہ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۸۷۵ء میں سر سید کے اسلوب تحریر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"انگریز اس امر کو اپنے ادب کا کمال سمجھتے ہیں کہ اُس میں آئے دن نت نئے خیالات کا اضافہ ہوتا رہے

ہندوستانیوں کو ہرگز یقین نہ آئیگا اگر اُن سے کہا جائے کہ ان جدتوں میں فصاحت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی مگر ہندوستانی تو مسلسل تقلید کے قابل ہیں اور کسی اسلوب بیان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں اب یہ چاہئے کہ تقلید ترک کر دیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے خاص انداز تحریر کے مطابق لکھے"۔

علی گڑھ اخبار نے تو اُس زمانہ میں قدیم طرز تحریر کی مذمت کرتے ہوئے یہاں تک لکھا تھا کہ بعض اوقات ایسے مضامین کا مطالب سمجھنے کے لئے صحاح اور قاموس کی ضرورت ہوتی ہے ۱۸۵۷ء کے بعد سے تقریباً ۱۸۶۸ء تک اُردو صحافت کا سیاسی رنگ بھی بہت پھیکا تھا مگر رفتہ رفتہ اُس میں بھی گرمی پیدا ہو گئی اور ان کے صفحات پر سیاسی مباحث جس قدر زیادہ اہمیت حاصل کرتے گئے اُسی قدر اُن کی طرز تحریر اور اُس کا اسلوب بیان بھی بدلتا گیا۔ حتیٰ کہ اس دور کے آخری شعرا بھی اپنی نظموں میں قومی رنگ اختیار کرنے لگے اور اُنیسویں صدی کے آخر میں اُردو صحافت اور ادب نے بالکل ہی اپنی کروٹ بدل لی۔

یہیں سے اُردو صحافت کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ اس

۴۰ دور کے پہلے سال یعنی ۱۸۸۹ء میں ۹۴ نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سے دو حیدر آباد کے تھے۔ ایک "جوہر سخن" جو کوچہ جلال سے شائع ہوتا تھا اور ایک "گلدستہ" جس کے مالک عبد اللہ خان ضیغم داماد نواب شرف الامرا تھے۔ یہ پرچہ مطبع آصفی محازی پُرانی حویلی میں چھپتا تھا اور اس کے سرپرست حسام الملک نواب خان خانان تھے۔ ۱۸۸۶ء میں ۹۵ نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر "زمیندار" ہے۔ جو گوجرانوالہ سے پہلے ماہوار اور پھر ہفتہ وار منشی محبوب عالم نے جاری کیا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد سے پانچ نئے پرچے جاری ہوئے جن میں سے چار "گلدستے" تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حیدر آباد میں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا۔ ان چار میں سے ایک "گلزار سخن" تھا جس کے مالک نور الدین تھے اور یہ مطبع نور میں طبع ہوتا تھا اس گلدستہ کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

مزہ نہیں ہے خموشی کا خوش بیاں کیلئے
زباں سخن کیلئے ہے سخن زباں کے لئے

دوسرے گلدستہ کا نام "گل و بلبل" تھا۔ اس کے مالک الطاف حسین کسبل تھے اس کے سرورق پر یہ شعر نمایاں تھا۔

وہ بہار آئی وہ غنچے ہنس کے شرمانے لگے
گوش گل تک نغمۂ بلبل بھی اب جانے لگے

تیسرا گلدستہ "خیال محبوب" تھا۔ اس کے مالک مولوی عبد السلام عرش تھے اور وہ نظام پریس سے شائع ہوا کرتا تھا۔ چوتھا مزاحیہ گلدستہ "دکن پنچ" تھا جس کا دفتر بازار صدر عنبر گولیگوڑہ میں تھا۔ اس کے مالک کشن داؤ تھے مہتمم عبد الکریم ظریف اور ایڈیٹر غریب الدین۔

پانچواں اخبار جو اس زمانہ میں حیدر آباد سے جاری ہوا "افسر الاخبار" تھا جو قلعہ گولکنڈہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک مشتاق احمد تھے۔

اس سال کا ایک ممتاز پرچہ جو عورتوں کیلئے جاری کیا گیا تھا دہلی کا "اخبار النساء" تھا جس کے ایڈیٹر مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ تھے۔

اس سال کے آخری حصہ میں لاہور سے "پیسہ اخبار" جاری ہوا جو آجتک مختلف صورتوں میں جاری ہے۔ اس اخبار کے مالک مولوی محبوب عالم کا نام شمالی ہندوستان بلکہ تمام ہندوستان کی صحافت میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ شاید سب سے پہلے تعلیم یافتہ پنجابی تھے جنھوں نے صحیح تجارتی اصولوں کو مدنظر رکھ کر صحافت کا فن اختیار کیا۔ اور وہ اُردو صحافت کے اُن چند خوش قسمت اہل قلم میں تھے جنھوں نے اس پیشہ میں شہرت بھی حاصل کی اور دولت بھی۔

۱۸۸۸ء کے بعد اُردو صحافت کا ایک ایسا دور آیا جس میں نئے پرچوں کی تعداد سال بسال کم ہوتی رہی۔ اس سال کے ۲۱ نئے پرچوں میں زیادہ قابل ذکر لکھنؤ کا "وکیل قومی" ہے جس کو اُس زمانہ کے ایک مشہور واعظ مقرر اور صاحب قلم "عبد اللہ حسرتی" نے جاری کیا تھا لیکن یہ پرچہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۸۸۹ء میں صرف ایک نیا ہفتہ وار "بھارت سدھار" لاہور سے جاری ہوا۔ یہ ہندو انتہا پسندوں کا پرچہ تھا۔ اس کا سیاسی رنگ بہت نمایاں تھا۔

۱۸۹۰ء میں صرف تین پرچے جاری ہوئے۔

۱۸۹۲ء میں صرف چار نئے پرچے جاری ہوئے جن میں پٹیالہ کا "مخبر صادق" کسی قدر مشہور ہوا۔ اس کے ایڈیٹر شیخ

ضیاء الحق تھے جو مختلف ریاستوں کے متعلق پمفلٹ شائع کرنے کے سلسلہ میں اچھی طرح جانے پہچانے گئے تھے۔

۱۸۹۴ء میں جو پرچے جاری ہوئے جن میں کوئی بھی قابل ذکر نہیں ۱۸۹۵ء میں لاہور سے "انتخاب لاجواب" جاری ہوا جو ابھی تک جاری ہے۔ یہ اپنی قسم کا پہلا پرچہ تھا جس کو انگلستان کے اخبار "ٹٹ بٹس" کے اصول پر جاری کیا گیا تھا۔ منشی محبوب عالم کے بھائی منشی عبدالعزیز اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ پرچہ ایک زمانہ میں بہت کامیاب ہوا۔ اور اب تک جاری ہے۔

۱۸۹۶ء، ۹۷ء و ۹۸ء میں کوئی نیا پرچہ جاری نہیں ہوا۔ البتہ ۱۸۹۹ء میں لاہور سے صرف ایک پرچہ "پیشوا" جاری ہوا جس کو شیخ ضیاء الحق نے جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ ایک طرف تو اُس زمانہ کی انتہا پسند سیاست کا ترجمان تھا۔ اور دوسری طرف ہندوستانی ریاستوں کے مسائل پر بہت زیادہ لکھتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں بیس نئے پرچے جاری ہوئے مگر اُن میں قابل ذکر ایک تو مرزا حیرت کا "کرزن گزٹ" تھا جس نے مذہبی مباحث میں اور خصوصاً حادثۂ کربلا کی اصلیت سے انکار کر کے بہت شہرت حاصل کی۔ اور دوسرا "شمشیر قلم" لاہور تھا جس کے ایڈیٹر اس زمانہ کے ایک مشہور صحیفہ نگار نثار علی شہرت تھے۔ اس سال مدراس سے مولوی عبداللطیف قادری کا "جریدۂ روزگار" شروع ہوا جو عرصہ تک جاری رہا۔ اور ایک زمانہ میں جنوبی ہند کا ایک ممتاز پرچہ سمجھا جاتا تھا۔

نصف صدی سے زیادہ کی ایک مختصر داستان ہے جو بیان کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد ہم اب اردو صحافت کے دورِ جدید کے دروازہ پر آ گئے ہیں۔ اور یہ وہ منزل ہے جہاں اردو صحافت نے ایک انقلاب انگیز کروٹ لی۔ گزشتہ نصف صدی میں عام طور پر اُردو زبان کے صحیفہ نگاروں کے قلم کی جولانی کا میدان سیاسی مسائل کی سرحد پر ختم ہو جاتا تھا۔ خبروں یا افسانوں یا غیر سیاسی مضامین کے ترجموں کے علاوہ اُس زمانہ تک اردو صحافت کا ایک بدنما پہلو ذاتیات کا وہ رجحان تھا جس نے بہت سے جرائد کو استحصال بالجبر۔ تخویف مجرمانہ یا بھیک مانگنے اور بڑے آدمیوں کی قصیدہ خوانی کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اس زمانہ کے بیسیوں جرائد کا سرمایہ تجارت یہی تھا کہ وہ رؤسا اور امراء سے کسی نہ کسی طرح روپیہ وصول کریں۔ ایسے اخباروں کی عام اشاعت محض برائے نام ہوتی تھی اور ان کا کوئی تعلق رائے عامہ سے نہ ہوتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد سے یہ رنگ بدل گیا اور ایسے صحیفہ نگاروں کی تعداد بہت کم ہو گئی۔ اُن کے بجائے اب سیاسی ماحول نے ایسے اہل قلم پیدا کرنے شروع کئے جو "شجر ممنوعہ" کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے۔ بنگال میں سب سے پہلے یہ حرارت پیدا ہوئی اور اس کے بعد پنجاب میں تقسیم بنگالہ کے ہنگامہ سے کچھ پہلے اور اُس کے بعد اُردو صحافت اپنے قدیم مسلک سے جدا ہوئی اور اُس نے مطالبہ حقوق اور سیاسی تنقید کے ایک ایسے میدان میں قدم رکھا جہاں نئی آوازوں سے اُس کے کان اور نئے الفاظ سے اُس کا قلم آشنا ہوا۔ اُس زمانہ کے بعض پرچے تو اس قدر گرم تھے کہ شاید آج بھی اُن کے الفاظ کو دُہرانا آسان نہیں صحافت سے یہ آگ پیدا ہوئی اور آگ سے وہ شعلے بھڑکے جنھوں نے ملک کے لاکھوں آدمیوں کی ذہنی فضا کو بدل دیا۔ اُن اعتدال پسند اور کمزور آباؤ اجداد کی یہ وہ نئی اور حجرد المزاج نسل ہے جو اس نئے دور میں اپنے بلوغ کی طرف قدم اُٹھاتی جا رہی ہے۔ اور کہتی جا رہی ہے۔ کہ

با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

چند قابلِ دید کتابیں

سیرِ کائنات
یہ کتاب انگلستان کے مشہور سائنسداں جی جینس کی آٹھ تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو موصوف نے رائل انسٹیٹیوٹ آف لندن میں زمین، ہوا، اور چاند ستاروں پر کی تھیں۔ قیمت مجلد ؏ہر

سلطنتِ خداداد
میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اُس کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ۔ قیمت للعہ

تاریخ جنوبی ہند
جنوبی ہند کی مکمل تاریخ، بڑی چھان بین کی گئی ہے اور داخلی و خارجی ہر ممکن سند پیش کی گئی ہے۔ قیمت تین روپیہ (سے)

معلّم کی زندگی
یہ مؤلف کی محض آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ۔ نیز اکیس سالہ تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ قیمت ہر دو حصص پانچ روپیہ (صہ)

محشرِ خیال
سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعۂ مضامین کا دوسرا ایڈیشن۔ اس میں مرتبہ مرحوم کا ہنگامہ خیز ڈرامہ "روزِ جزا" بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپیہ ۸ر سے ؏ غیر مجلد ؏ہم

مبادی سیاسیات
مصنفہ پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی۔ اس میں تفصیل سے علم سیاست کی ابتدائی معلومات اور عہد حاضر کی سیاسی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد صہ

جگ بیتی
پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب Glimpses of World History کا اُردو ترجمہ۔ قیمت جلد اوّل تین روپیہ (سے)

روحِ اقبال
یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے تین مقالوں اقبال اور آرٹ، اقبال کا فلسفۂ تمدن، اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات پر مشتمل ہے۔ قیمت غیر مجلد ہے

ذکرِ حسین
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ کی "ذکرِ حسینی" پر معرکۃ الآرا تقریر جسے پبلک کے مطالبہ پر کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت تین آنہ (۳ر)

مکتبہ جامعہ دہلی

نئی دہلی ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی ۳

نیارا

نیا راگ

اس نمبر کی نظموں میں کافی دوام وثبات ہے۔ "رباب شکستہ" عندلیب شادانی کی گاتی ہوئی غزل ہے۔ عندلیب لطیف نفسیاتِ محبت اور باریک محاکات نگاری میں مشاق ہے، رومان میں ڈوبی ہوئی سنجیدہ شوخی اس کی فطرت ہے۔ "آدمی" جوش کی تازہ فکر ہے، زندگی کے تضادوں کا آئینہ، سماجی اور قدرتی جبر و اختیار پر ایک ماہرانہ طنز، شاید اردو زبان کے تمام شاعروں میں جوش ہی سب سے پہلا شاعر ہے جس نے طنزیات نگاری کو رومان کی آمیزش سے ایک خاص رنگ دیا، یہ رنگ اکبر کے رنگ سے مقابلے میں زیادہ گہرا اور ذی ثبات ہے۔ "قلوپطرہ کا جلوس" شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے "کلیوپیٹرا اور انطونی" کے ایک حصّہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ اور اس میں اوریجنل نظم کی سی روانی و تکمیل پائی جاتی ہے۔ اردو ادب میں حقّی کی یہ کامیاب کوشش اس کے امیر ہونے کی دلیل ہے۔

شاہد کا 'ایک حسین منظر'، عندلیب کا 'ترانۂ تخریب'، خورشید الاسلام کی 'شکست'، تینوں نظمیں اپنی ایک سطح رکھتی ہیں۔ شاہد اجتماعی طور پر فکر کرنے کا عادی ہے۔ اس کی نظم کی ترتیب، روایت قدیم سے ذرا الگ ہے، مگر حسین منظر میں گم ہوگیا۔ عندلیب کی 'تخریب' اک نغمۂ تعمیر ہے۔ اک گرج سی ترانہ کی جان ہے۔ 'شکست' میں نادر استعارے ہیں، اشیا کی تعبیر عام انداز کی نہیں، مگر نظم کے اختتام پر خورشید کا جذبہ ناتمامی کی نذر ہوگیا ہے۔

مخدوم محی الدین کے 'ستارے' اور اختر الایمان کے "محلکے" دونوں قنوطیت کے دھوئیں میں اَٹے ہوئے اس ہجوم میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اختر الایمان کا تصور ایک پیچ در پیچ قنوطی رومان میں پرواز کرنے کا عادی ہے۔ جس طرح مجبور اور مقید شباب کی خودرو اور خود زائیدہ تمنائیں، مگر جو کچھ ہے فطری ہے، اور ہمارے ماحول کا پرتو ہے، مخدوم کی نظم میں بھی یہی کیفیت ہے، مگر اختر کے مقابلے میں ایک دوسری قسم کی شگفت مخدوم کی خصوصیت ہے۔ اک دلنواز و جوان یاس انگیز مگر شوخ ترنم ان دونوں کی جان ہے۔

حسرت ترمذی اور جمیل الدین اپنے ترانے الگ گا رہے ہیں۔ راگ قدیم سہی، مگر اک رنگا رنگی کا ہجوم ہے، ترمذی کی غزل کی سطح کافی بلند ہے، عمومیت سے معرّا اور جذباتی شوخی سے محفوظ۔ جمیل الدین، ترمذی کے مقابلے میں واضح طور پر زیادہ پُرشباب ہے۔ حسرت موہانی اپنی تازہ نوائی میں اک نئی تاریخ بنا رہے ہیں۔ غزل میں تلمیح نگاری بذاتِ خود ایک شعبہ تھا مگر حسرت نے اپنی ان ارتقائی غزلوں میں واقعیت نگاری سے نئی روح پھونک دی ہے۔ اور اپنے موضوع کو جو آج تک غیر مرئی نظر آتا تھا 'مرئی' کردیا ہے۔

نظم کا یہ تمام حصّہ محض کسی رسالے کا رسمی حصّہ نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'درِ وصفِ امینہ خانم' اور 'قلوپطرہ کا جلوس' اس نمبر کو تاریخی مرتبہ بخش رہے ہیں۔

ساغر

رباب شکستہ

رشک ہے تجھ کو ہمنشیں، کچھ بھی اگر نہ تھا تو پھر
میری ہی سمت دیکھ کر، کیوں کوئی مسکرا دیا

ترکِ وفا کے ساتھ ساتھ عذرِ جفا نہ کیجئے
بھولے ہوؤں کی یاد کیا، بھول گئے بھلا دیا

یاد کرو وہ دن کہ تم بت بھی نہ تھے خدا تو کیا
میری پرستشوں نے آج تم کو خدا بنا دیا

تجھ کو خدا کا واسطہ، یوں مرا امتحاں نہ لے
مجھ کو نہ اس گماں میں ڈال تو نے مجھے بھلا دیا

وقف ہیں کیوں مرے لئے آج یہ نامرادیاں
پہلے ہی نوشِ لب کے ساتھ زہر نہ کیوں ملا دیا

ہاں وہیں جا رہا ہے چاند، مجھ کو بلا رہا ہے چاند
ہائے اسے خبر نہیں اُس نے مجھے بھلا دیا

مجھ کو بھی کچھ ملال تھا اُن کو بھی انفعال تھا
لب تو خموش ہی رہے دل نے حجاب اٹھا دیا

ایشیا۔ اگست ۱۹۳۲ء

جوش ملیح آبادی

آدمی

خوشیاں منانے پر بھی ہے مجبور آدمی
آنسو بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اور مُسکرانے پر بھی ہے مجبور آدمی
دُنیا میں آنے پر بھی ہے مجبور آدمی
دُنیا سے جانے پر بھی ہے مجبور آدمی

کیا آدمی کی بات کہوں تجھ سے ہمنشیں
اس ناتواں کے قبضۂ قدرت میں کچھ نہیں
رہتا ہے قصرِ حرمت و اعزاز میں مکیں
اور زندگی اُلٹتی ہے جس وقت آستیں
عزت گنوانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انسان کو ہوس ہے جئے صورتِ خضر
ایسا کوئی جتن ہو کہ بن جائے بس امر
تا روزِ حشر موت نہ پھٹکے اِدھر اُدھر
حالات جب بدلتے ہیں کروٹ کراہ کر
تو سر کٹانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انسان بہر صدق ہے سرچشمۂ صفا
انسان حق پرست ہے، حق جو، حق آشنا
انسان راست باز ہے مانند انبیا
پر اس کو آنے لگتا ہے جب جھوٹ میں مزا
ڈینگیں اُڑانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انساں معاملت میں بھی رہتا ہے حق پناہ
ہر عذرِ لنگ اس کی شریعت میں ہے گناہ
رکھتا ہے خوش معاملگی ہی سے رسم و راہ
لیکن جب آ کے آنکھ دکھاتا ہے قرضخواہ
حیلے بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انساں ہے جود و بذل و قناعت کی کائنات
لالچ کو اور ہوس کو سمجھتا ہے واہیات
قارون کے خزانے پہ بھی مارتا ہے لات
لیکن جب اسکے ساتھ بگڑتی ہے اسکی بات
جوتے چرانے پر بھی ہے مجبور آدمی

دل کو بہت ہے ہنسنے ہنسانے کی آرزو
ہر صبح شام جشن منانے کی آرزو
گانے کی اور ڈھول بجانے کی آرزو
پینے کی آرزو ہے پلانے کی آرزو
اور زہر کھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

ایشیا، اگست ۱۹۴۲ء

ہر دل میں ہے نشاط و محبت کی تشنگی
دیکھو جسے وہ بیچ رہا ہے خوشی خوشی
اس کارگاہِ دہر میں لیکن کبھی کبھی
فرزندِ نوجوان و عروسِ جمیل کی
میّت اُٹھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

رفعت پسند ہے بہت انسان کا مزاج
پرچم اُڑا کے شان سے رکھتا ہے سر پہ تاج
گردوں پہ مہر و ماہ سے لیتا ہے گو خراج
لیکن ہر اک گلی میں بہ فرمانِ احتیاج
بندر نچانے پر بھی ہے مجبور آدمی

ہر دل کا حکم ہے کہ رفاقت کا دم بھرو
احباب کو ہنساؤ میاں آپ بھی ہنسو
چھوٹے نہ دوستوں کا تعلق جو ہو سو ہو
لیکن ذرا سی بات میں یارانِ خاص کو
ٹھوکر لگانے پر بھی ہے مجبور آدمی

دل ہاتھ سے نکلتا ہے جس بُت کی چال سے
دم ہی نکلنے لگتا ہے جس کے ملال سے
موجیں لہو میں اُٹھتی ہیں جس کے خیال سے
یارو کبھی کبھی اسی رنگیں جمال سے
آنکھیں چُرانے پر بھی ہے مجبور آدمی

غصّہ سے ہلنے لگتا ہے مردانگی کا سر
مکھی بھی بیٹھ جائے کبھی ناک پر اگر
عزّت پہ حرف آئے تو دیتا ہے بڑھ کے سر
ہر شب کو تازہ مرد کے آغوش میں مگر
جورو سُلانے پر بھی ہے مجبور آدمی

جب کوئی دیکھتا ہے کسی خوش خرام کو
جپتا ہے صبح و شام اُسی بُت کے نام کو
جی چاہتا ہے جائیے ہر شب سلام کو
اَن بَن جو ہو گئی تو اُسی لالہ فام کو
ٹھینگا دکھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

رہتا ہے عطر و عود میں کیا کیا بسا ہوا
پھرتا ہے رنگِ نرگس و نسریں سے کھیلتا
رکھتا ہے بوئے زلفِ دوتا سے معاملہ
پر مفلسی دباتی ہے جب آن کر گلا
کوڑا اُٹھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

خوددار و خودشناس و خودآگاہ ہے بشر
سنجیدہ و متین و خوش آداب و حق نگر
پر دل میں احتیاج کا بجتا ہے جب گجر
تو سر ہلا ہلا کے طوائف کی پُشت پر
طبلہ بجانے پر بھی ہے مجبور آدمی

اختر الایمان

محلکہ

تصوّرات کی شمعیں جلا کے دیکھ تو لوں
سیاہ خانۂ ہستی سجا کے دیکھ تو لوں
غمِ حیات پہ آنسو بہا کے دیکھ تو لوں
تری نظر سے ذرا دور جا کے دیکھ تو لوں

ابھی تو پی ہے مئے غم سنبھل نہیں سکتا
ابھی تو ہوش میں دو گام چل نہیں سکتا
ابھی تو زیست کا عنواں بدل نہیں سکتا
محبّتوں کو فسانہ بنا کے دیکھ تو لوں

یہ گھر بنا کے گرا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
دیئے جلا کے بجھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
یہ ساری بزم اُٹھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
خیال و خواب کی دُنیا بسا کے دیکھ تو لوں

سیاہ و سُرخ محلکوں[1] سے اس طرف کوئی
گھنی دبی ہوئی پلکوں سے اس طرف کوئی
پکارتا ہے دُھندلکوں سے اس طرف کوئی
یہ دو قدم ہیں انہیں بھی اُٹھا کے دیکھ تو لوں

غبارِ رہ کے اشارے سنبھال لیتے ہیں
افق کے دھندلے کنارے سنبھال لیتے ہیں
سُنا ہے ٹوٹتے تارے سنبھال لیتے ہیں
بس ایک بار سہی ڈگمگا کے دیکھ تو لوں

---

[1] محل کا اسم تصغیر محلکہ۔ جمع محلکے۔

م۔ش۔ حقی دہلوی

قلو پطرہ کا جلوس

ذیل کے اشعار شیکسپیر کے ڈرامے "انطنی و قلوپطرہ" کا ایک منظوم اقتباس ہیں۔ انطنی کا مصاحب اِنوبار بس اپنے رومی دوستوں کے سامنے قلوپطرہ کی شان و شوکت کا مرقع کھینچتا ہے۔ ڈرامے کا یہ ٹکڑا شیکسپیر کی بہت مشہور اور دلآویز نگارش میں سے ہے۔

اِنوباربس:۔
کیا پوچھتے ہو اُسکے سفینے کی تم بہار — رکھا تھا دوشِ موج پہ اک تختِ زرنگار
کیا اُسکی آب و تاب کا عالم کہے کوئی — دریا میں ایک آگ تھی گویا لگی ہوئی
کشتی نہیں سریرِ مطلا تھا سر بسر — اک شعلہ وسطِ آب بھڑکتا تھا سر بسر
فردوسِ آرزو تھا عروسِ نظارہ تھا — آغوشِ رودِ نیل میں اک مہرپارہ تھا
وہ عطر میں بسے ہوئے خوش رنگ بادباں — رنگت پہ جن کی قوسِ قزح کا سا تھا گماں
اُن کی مہک پہ صدقے ہوئی جاتی تھی ہوا — ایک ایک بل پہ سینکڑوں بل کھاتی تھی ہوا
دُنبالہ تک ڈھلے ہوئے سونے کا تھا تمام — کرتی شعاعِ مہر بھی جھک جھک کے تھی سلام
چپّو سڈول، نقرئی، زرکار و آبدار — گویا حسین آنکھوں پہ پلکوں کی تھی قطار
ہر دم غضب کی خوبی سے پڑتا تھا اُن کا ہاتھ — شہنائی کی سُریلی صداؤں کے ساتھ ساتھ
کچھ اس ادا سے کرتے تھے دریا کے دل پہ وار — اس ناز سے تھپکتے تھے موجوں کو بار بار
ہوتی تھی تیز پانی کی رفتار اور بھی — اور دوڑتا تھا پیچھے کہ اک بار اور بھی!
لیکن بیان محال ہے خود اُسکے حُسن کا — نطق اُس کے سامنے نظر آتا ہے بینوا
اک سر پہ شامیانہ تھا زرکار، مخملی — اور اُس میں وہ بہارِ تماشا دراز تھی
وینس کا وہ مرقع، تخیّل کا شاہکار — صنعت سے جس کی ہوتی ہے فطرت بھی شرمسار
دیکھو تو یہ کہو وہ مرقع بھی کچھ نہیں — کچھ اس ادا سے جلوہ نما تھی وہ مہ جبیں
دو طفل خوبرو تھے دو طرفہ چنور لئے — تھے ٹھوڑیوں میں جن کی غضب کے بھنور پڑے
یوں دونوں مسکراتے تھے کیوپڈ کی شان سے — اُترے ہیں جیسے آ کے ابھی آسمان سے!
طرفہ تھا کچھ چنور کے ہلانے کا طور بھی — دہکا رہے تھے شعلۂ عارض کو اور بھی

اگریپا:۔ واہ رے انطنی تری قسمت!

انوباربس:۔ اب سُنئے آپ اُسکی خواصوں کی آن بان — جل پریاں تھیں کہ اُس پہ فدا کرتی تھیں جان۔

یوں چل رہی تھیں اُسکے اشاروں پہ ناز سے
سو سو ادا نکلتی تھی اک اک پتار سے

پتوار پر کھڑی تھی کوئی جل پری سی نار
تھی کوئی بنت بحر طنابوں کی نگہدار

وہ ہلکے ہلکے ہاتھ وہ نازک کلائیاں
انگڑائیاں سی لیتے تھے مستی میں بادباں!

کشتی میں تھی عجیب و غریب ایسی کچھ مہک
لپٹیں سی اُٹھ کے آتی تھیں دریا کے پار تک

اُس وقت انطنی کا بھلا کس کو ہوش تھا
دربارِ عام شہر میں سوتا ہی رہ گیا

خلقت تمام ٹوٹ پڑی اس نظارے پہ
سیٹی بجا رہے تھے ہوا میں خیال اُدھر

جاتی ہوا بھی سیر کو اُس دم عجب ہے کیا
فطرت میں یہ کہو کہ خلا ہی محال تھا

اگریپا:۔ کیا کہنا ملکۂ مصر کا!

انوباربس:۔
اُتری ہے جب کنارے تو یہ عرض کی گئی
کھانے پہ یاد شام کو کرتے ہیں انطنی

بولی کہ جا کے دو مری جانب سے یہ پیام
بہتر ہے آپ ہی مرے مہماں ہوں آج شام

اب کس طرح بھلا کریں انکار انطنی
عورت نے اُن سے "نا" تو سُنا ہی نہیں کبھی

جکڑے گئے خیال وہیں قصہ مختصر
دعوت میں پہنچے ملکۂ عالم کے محل پہ

اور نقدِ دل بدل میں ضیافت کے دیدیا
جس کا فقط نگاہ نے اُن کی مزا لیا

۴۰

اگریپا:۔ واہ رے میری ملکہ جان! [1]

انوباربس:
اک روز سیر کرنے جو بازار میں گئی
اٹھلا کے تھوڑی دور عجب ناز سے چلی

دم اس خرامِ شوخ سے کچھ پھول سا گیا
بولی تو جیسے بات کوئی بھول سا گیا!

بے حال ہونے میں بھی عجب حال اُس کا تھا
ناطاقتی میں اور سوا زور آگیا!

میکناس:۔ پر اب تو چھوڑ دیں گے اُسے شاید انطنی؟

انوباربس:۔ جی اُن کی کیا مجال جو چھوڑیں اُسے کبھی!

کُمہلائے اُس کو گردشِ دوراں محال ہے
برگشتہ اُس سے ہو دلِ انساں محال ہے

جادو نہ جس پہ گردشِ دوراں کا چل سکے
افسوں سے اُسکے کیا کوئی انساں نکل سکے

ہر آن میں نئی ہے وہ ہر حال میں عجیب
یہ طرفگی و تازگی ہوگی کسے نصیب

وہ عورتیں جو جی سے اُتر جائیں اور ہیں
تسکین میں بھی یاں تو طلب ہی کے طور ہیں

کیا سیر اُس کے وصل سے ہوگا کسی کا جی
ظالم بُجھا بُجھا کے لگاتی ہے اور بھی!

بدمستیاں بھی اُس کی ہیں اس درجہ دلنشیں
کرتے ہیں زاہدانِ مقدس تک آفریں!

[1] Royal wench، اس جملے کے لئے ان سے زیادہ مناسب الفاظ نہیں ملے! (مترجم)

شاہد صدیقی اکبرآبادی

اک حسین منظر

فضائے دشت پہ شادابیاں سی چھائی ہوئی
درخت دھوئے ہوئے پتیاں نہائی ہوئی

لطیف و سرد ہوا، وادیوں میں گرم خرام
شبابِ عشق کی آبادیوں میں گرم خرام

ہوائے سرد میں شامل طیور کی آواز
کہ جیسے خواب میں آتی ہو دور کی آواز

فرازِ کوہ سے شفاف آبشار رواں
سوئے نشیب، تماشائی بہار رواں

افق پہ ابر کے ٹکڑے ہیں جھاڑیوں پہ دھواں
زمیں پہ سبزۂ تازہ، پہاڑیوں پہ دھواں

ہر ایک بوند سے پیدا ہے اک ترنم سا
کہ جیسے رقص میں آتی ہے گھنگروؤں کی صدا

کہیں نشیب میں شاداب کھیت دھانوں کے
ہرے لباس میں کچھ حوصلے کسانوں کے

کہیں سکوت، کہیں طائروں کی آوازیں
خموش و صاحبِ دل شاعروں کی آوازیں

کسان مست ہیں، پھولے نہیں سماتے ہیں
بڑے غرور سے کھیتوں کی سمت جاتے ہیں

کسی نے پھینکے ہیں قطرے کچھ اس قرینے سے
کہ ہیں گلوں پہ چمکتے ہوئے نگینے سے

لچک رہی ہے زمیں، گنگنا رہی ہے بہار
عروسِ وقت کو جھولا جھلا رہی ہے بہار

ہوا میں ایک مہک سی ہے جس کا نام نہیں
یہی مہک تو کہیں حاصلِ مشام نہیں؟

بہارِ سادہ، طبیعت کو گمرہی کا پیام
دلِ خراب کو، ہر چیز بیخودی کا پیام

مری نگاہ سے فطرت کو اجتناب سا ہے
کہ ان حسین مناظر پہ اک حجاب سا ہے

تاثرات کی حد سے گزر رہا ہوں میں
یہ بات ہے کہ تجھے یاد کر رہا ہوں میں

فضائے گل میں بھٹکتا ہوں کھو نہ جاؤں کہیں
میں اس بہار میں تحلیل ہو نہ جاؤں کہیں

حسن یحییٰ عندلیب ایم۔ اے

تخریب کا ترانہ

ہر شے پہ جہاں کی طاری ہے اک خوف سا صبح و شام مرا
دیکھو گے جسے پاؤ گے اسیرِ خطرۂ زیرِ دام مرا
اک تہلکہ سا اک زلزلہ سا ہوتا ہے ہر ہر گام مرا
مشرق میں قدم پہنچا تا ہے یہ مغرب تک پیغام مرا
بیدردی و خوں ریزی و تخریبِ جہاں ہے کام مرا

آہٹ سے مری مچ جاتی ہے، ہلچل محلوں، ایوانوں میں
شعلوں کے سمندر بہتے ہیں، صحراؤں میں، کاشانوں میں
شورش میری وحشت افزا حیوانوں میں، انسانوں میں
جو زور ہے میرا زور کہاں، وہ آندھی میں، طوفانوں میں
مست و بیخود ہو جاتے ہیں، جو پی لیتے ہیں جام مرا

آبادیوں میں، ویرانوں میں، دریا کی طرح میں بہتی ہوں
ملکوں کی سیاحت کرتی ہوں، قوموں کو مٹاتی رہتی ہوں
میں طعن و ملامت، ظلم و ستم، دنیا میں سبھی کچھ سہتی ہوں
خوابیدۂ غفلت قوموں سے، پر بات کھری میں کہتی ہوں
قوموں کو جگانے آتی ہوں، ہے گرچہ تباہی نام مرا

صدیوں کے خمار آلودہ بھی ٹھوکر سے مری اٹھ جاتے ہیں
ہر چند مچلتے، روتے ہیں، گھبراتے ہیں، چلاتے ہیں
مسدود مگر راہیں سب، جب اپنے لئے وہ پاتے ہیں
میدانِ وغا میں تیغ بکف ناچار چلے ہی آتے ہیں
بازاروں میں گلیوں میں برپا ہر جا ہے کہرام مرا

مہمل ہیں سب حال و ماضی، رہتی ہے نظر مستقبل پر
رکھتا ہے سفینہ کب میرا کاشانۂ موج ساحل پر؟
سب جور و جفا سہہ جاتے ہیں، جو کچھ بھی گذرتی ہے دل پر
ڈھاتی ہیں شکستہ تعمیروں کو، جا لگتی ہوں منزل پر
پیغام نظامِ نو کا ہے تخریب کا یہ ابرام مرا

تاریک اندھیری راتوں کو، تنویرِ سحر میں دیتی ہوں
ہاں تشنہ لبِ اسکندر کو بھی، آبِ خضر میں دیتی ہوں
عصفور کے نازک سینے کو، شاہین کا جگر میں دیتی ہوں
یخ پاروں کو بادل کی گرج، بجلی کا اثر میں دیتی ہوں

آغاز مرا تخریب سہی، تعمیر ہے پر انجام مرا
صیاد کے رخشاں خنجر سے اب مرغِ بسمل پھڑکے کیوں؟
لو شمعِ بزمِ عشرت کی اب خوفِ سحر سے بھڑکے کیوں؟
گلزارِ جہاں میں موجِ صبا سے، پتہ کوئی کھڑکے کیوں؟
پیکانِ شعاعِ مہر سے آخر سینۂ شبنم دھڑکے کیوں؟
سایہ افگن سب پر یکساں ہوتا ہے لطفِ عام مرا

دیوانۂ راحت ڈرتا ہے، کلفت کے فسانے باقی ہیں
پنہاں ہے نظر سے آبِ بقا، ظلمت کے فسانے باقی ہیں
پر ہے یہ حقیقت میرے سبب، بہجت کے فسانے باقی ہیں
عشرت کے ترانے قائم ہیں، جرأت کے فسانے باقی ہیں
مخمورِ طرب کر دیتا ہے اک جامِ مئے آلام مرا

ہر قطرۂ اشکِ رنگیں میں، اک موجِ تبسم لرزاں ہے
ہر کرب و بلا کے دامن میں، اک روحِ مسرت خنداں ہے
ہر ضرب میں طبلِ جنگ کی مضمر نغمۂ سازِ شبستاں ہے
ہر سلسلۂ تخریب میں بس؟ تعمیر کا شعلہ رقصاں ہے
ہاں جوئے شیر بھی لاتا ہے، یہ تیشۂ خوں آشام مرا

تسکینِ قلوبِ مضطر ہوں، خوں ناب مری تصویر سہی
ہوں موجِ سحر، پروردۂ صد اظلام مری تنویر سہی
پیغامِ حیاتِ نو ہوں میں، آلودۂ خوں شمشیر سہی
چاؤش ہوں میں آزادی کی، آوردۂ صد زنجیر سہی
تحریرِ مسرت ہے نقشِ پائے فرخ فرجام مرا

مایوسیوں کو، محرومیوں کو امید سے ٹکر لینے دو
ضحاکِ فرومایہ کو بھی جمشید سے ٹکر لینے دو
مریخ اجل پیغام کو بھی ناہید سے ٹکر لینے دو
اب عہد ہے میرا ذرّہ کو خورشید سے ٹکر لینے دو
اک سیلِ گرم ہو جائے گا، غم پرور یہ ادغام مرا

در وصفِ امینہ خانم

(مولانا حسرت موہانی کی جدید غزلیں)

(ایشیا پر مولانا حسرت کا یہ کرم ان کی شاعری کی طرح یادگار و جاوداں رہیگا۔ ساغر)

(جہاز رحمانی مورخہ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۱ء)

(جملہ حقوق محفوظ)

دل ہے نازاں کہ تری صورتِ زیبا دیکھی　　آنکھ حیران کہ اک حسن کی دنیا دیکھی
پہلے آنکھیں ہوئیں گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح　　چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی
بدگماں مجھ سے بھی کیوں غیر کے مانند ہوئے　　مجھ کو دیکھا نہ مرے دل کی تمنا دیکھی
فطرتِ حسن ہے بیباک مگر ہم نے یہاں　　تیری شوخی میں بھی اک شان محابا دیکھی
زلفِ شب رنگ پہ گلنار لباسی کی بہار
آج حسرت نے رخِ یار میں کیا کیا دیکھی

(۲)

(یکم فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

گر حسن دولتے است، نہ گنجش امینہ　　ور ناز خاتمے است، بہ زیبش نگینہ
شبہاسے بہ عیش بسر برُدی و ہنوز　　مخمور آں خیالِ لطیف و شبینہ
حسرت بہ عرضِ شوق زکو شد کہ فی المثل
شایانِ سنگِ ہرزہ نہ آبگینہ

(۳)

(۲ر فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

عجب ہم کو آیا نظر ایک آج　　طرحدار معشوق عاشق مزاج
دل اس کا محبت کے غم سے بری　　نظر اس کی سوزِ دروں کی امیں
توجہ کا لے جو تغافل سے کام　　کرم جس کی بے اعتنائی کا نام
بچے اس سے کیونکر دلِ عاشقاں　　جسے خود ہو سودائے حسنِ بتاں
وہ حسرت نہ کیوں دل نوازی کرے　　جو چھپ چھپ کے خود عشق بازی کرے

ہر دم نہیں یاد ہے کسی کی　　چھپتی نہیں بات عاشقی کی
دل شاہدِ حسن کا طرفدار　　آنکھیں غم آرزو سے خونبار
شوق اس کا بری عود التجا سے　　بیگانہ ہے عرضِ مدعا سے
کردار ہیں سب اسکے ستور　　معشوقی و عاشقی کے دستور
حسرت ایسوں کی پائے بوسی
کچھ عیب نہیں قسم خدا کی

(۴ر فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

کس درجہ دلپذیر ہے پر نقش یہ خواب کی　　آئینہ دار آپ کے حسن و شباب کی
کرتی ہے دل کو اور بھی آمادۂ ہوس　　تیری یہ بے رخی یہ ادا اجتناب کی
اہلِ نظر سے آپ کو لازم نہیں عذر　　ہوتی ہے اہلِ فسق سے حاجت حجاب کی
کچھ ان کو قدرِ شوق نہیں ورنہ آرزو　　امیدوار بھی کرم بے حساب کی
حسرت وہ بے نیاز محبت ہیں کچھ انہیں
اب تک خبر نہیں ترے حالِ خراب کی

(۴ر فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

پھر کہاں دل رہے کہاں نہ رہے　　جب تمہیں اس پہ مہرباں نہ رہے
خود غرض عشق، رعبِ حسن کو بھی　　چاہتا ہے کہ درمیاں نہ رہے
دل شکن کیوں بنو ہمارے لئے　　تم یہ مانا کہ دلستاں نہ رہے
یاس بہتر ہے، دیکھو اے بے مہر　　آرزو کوئی نیم جاں نہ رہے
ہم بھی کہدینگے پیرِ حسرت کو
عشقِ حسرت اگر جواں نہ رہے

(۵ر فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

ہمنے ہر ہر بات اپنے حق میں جانی آپکی　　مہربانی ہو کہ نامہربانی آپ کی
ہے نرالی سبز کی بھی رنگ روشن پہ بہار　　اوڑھنی بہتر تھی لیکن ارغوانی آپکی
خود غرض ہم کو بھی ٹھہرایا جو غیروں کی طرح　　دیکھئے اچھی نہیں یہ بدگمانی آپکی
آپکے معشوق ہو کر عاشقی کی داستاں　　کاش ہم بھی ایک دن سنتے زبانی آپکی
اس گلِ رعنا کا حسرت یہ لب کیا تھا
ہو گئی ہے طرفہ جب سے خوش بیانی آپکی

۲۰ر فروری ۱۹۴۱ء

نہ پوچھو خاطرِ بسمل میں کیا ہے
یہ خود سوچو تمہارے دل میں کیا ہے

پناہِ جہدِ پیہم ہو تو خطرہ
فریبِ دوریِ منزل میں کیا ہے

سزا دوگے ہمیں کب تک کہاں تک
خدا جانے تمہارے دل میں کیا ہے

نظر مجرم ہے، پرلوثِ ہوس کے
تمہارے دعوئ باطل میں کیا ہے

دعا کرو وہ ملیں خود، ورنہ حسرت
تری اس سعئ بے حاصل میں کیا ہے

۹ر فروری ۱۹۴۱ء جہازِ رحمانی

ہر سمت مری چشمِ تمنا نگراں ہے
معلوم نہیں جلوۂ جانانہ کہاں ہے

شاید یہ وہی ہے جو مرے شوقِ نظر کے
باطن میں تو موجود ہے ظاہر میں نہاں ہے

۴۴ عاشق جسے کہتا ہے محبت کا فریضہ
بدعت کا اُسی چیز پہ زاہد کو گماں ہے

کونین کی راحت سے بھی زنہار جو بدلے
دل دردِ محبت کا ترے مرتبہ داں ہے

حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورتِ حق کا
گو اس کی نظر شیفتۂ حسنِ بتاں ہے

۱۹ر ستمبر ۱۹۴۱ء (کانپور)

جب سوا میرے نہ تھا کوئی نشانہ تیرا
یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ زمانہ تیرا

پا کے وہ گرم نظر مجھ کو سرِ عرشِ جہاز
کبھی چھپنا تو کبھی پھر نظر آنا تیرا

میرے اصرار پہ وہ ہاتھ چھڑا کے آخر
دستخط آپ سے اُردو میں بنانا تیرا

کج ادائی کے لئے شوق کو ٹھہرانہ ہوس
مجھ سے کچھ خوب نہیں ہے یہ بہانہ تیرا

رامِ اخلاص نہ ہو جن کی مروت حسرت
کیا قیامت ہے دل ایسوں سے لگانا تیرا

۲۲ر نومبر ۱۹۴۱ء (کانپور)

قیمت مے کہ بہ پیمانۂ جاں ہے ساقی
کون کہتا ہے کہ یہ نرخ گراں ہے ساقی

للہ الحمد، کہ رندوں میں علی الرغم حسود
سکۂ فیض ترا اب بھی رواں ہے ساقی

تشنہ کامانِ مے ناب ہیں، جاں برلبِ شوق
کرم اب بھی نہیں دشوار، کہاں ہے ساقی

تو نے رکھ دی تھی، جہاں چھین کے ہم سے بوتل
روحِ مستی اُسی جانب نگراں ہے ساقی

دل ہے کس مے کا طلبگار خدا ہی جانے
کیا ہمیں مے ہے کہ بے نام و نشاں ہے ساقی

محتسب کی دشمنی ہے نہ سنے گا حسرت
کہ وہ میخوار ترا مرتبہ داں ہے، ساقی

لے بسکٹ Upper deck (جہازِ رحمانی)

ساغر نظامی

انعکاسات

غرقابیٔ تقدیر ہے جب، پھر دل کو ہراساں کون کرے
کشتی کشتی کون پکارے، طوفاں طوفاں کون کرے

وحشت میں اک وقفے کے اسرارِ نمایاں کون کرے
داماں ٹکڑے ٹکڑے کرکے داماں داماں کون کرے

کون جگائے کلیوں کو پھولوں کو پریشاں کون کرے
صبح سویرے گلشن میں توہینِ بہاراں کون کرے

الفت کی مجبوری کو اس درجہ ارزاں کون کرے
لے دے کر اک مشکل ہے اب اسکو آساں کون کرے

مشکل مشکل سب کہتے ہیں، جیسے اُن کی مشکل ہو
دیکھیں ان تن آسانوں میں مشکل آساں کون کرے

۴۵

طوفاں ہے اور اس کا تکبّر، دریا ہے اور اس کا غرور
سب کچھ بے اندازہ ہے، اندازۂ طوفاں کون کرے

چار گرہ کپڑے کی خاطر، سترِ وحشت کیوں کھولیں
چاک ہوا، سو چاک ہوا، اب ذکرِ گریباں کون کرے

پہلے زباں کہتی ہے اُن سے دل کی بپتا یا نظریں
دیکھیں اُن کی محفل میں یہ کارِ نمایاں کون کرے

جان سی پڑ جائیگی ابھی ان مردہ مردہ پھولوں میں
صبح سویرے نکہتِ گل پرّان کو خراماں کون کرے

لے گیا کوئی چھین کے وہ شئے جس سے تن من گاتے تھے
تو ہی بتا اے تلخیٔ غم، ساغر کو غزلخواں کون کرے

(اٹارسی سے حیدرآباد تک ریل میں۔ ۸ رجون ۱۹۴۲ء)

دو غزلیں

آخری آنسو

تم جو جاتے ہو تو حسرت کو مٹاتے جاؤ
خاک میں عہدِ تمنا کو ملاتے جاؤ

روشنی یہ بھی رہے کیوں مرے غم خانے میں؟
شمعِ امید جو باقی ہے بجھاتے جاؤ

بھول جاؤ کہ کوئی عہد کیا تھا تم نے
اب مروّت کی ہر اک رسم اٹھاتے جاؤ

ہم بھی خود حال نہ اب دیکھ سکیں گے دل کا
جا رہے ہو تو ذرا شمع بجھاتے جاؤ

ہوش بھی ساتھ لئے جاؤ جو تم جاتے ہو
آج اک جام مجھے اور پلاتے جاؤ

تم نے جس نغمہ سے بیدار کیا تھا غم کو
پھر وہی نغمۂ غم آج سناتے جاؤ

دل تڑپنے کا تو ساماں کئے جاتے ہو
دل کی تسکین کی صورت بھی بتاتے جاؤ

یہ بھی اک داغ رہے گا دلِ ویراں کیلئے
میری حالت پہ نہ تم اشک بہاتے جاؤ

جاؤ جاؤ کہ یہی تھا صلۂ عہدِ وفا
جاؤ جاؤ مجھے رو رو کے رلاتے جاؤ

جا کے آنے کا یہ وعدہ جو کیا ہے تم نے
جانِ حسرت کی قسم آج بھی کھاتے جاؤ

حسرت ترمذی۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی

فکرِ عالی

عطا جب اس نے مجھے دردِ ہجر فرمایا
الم نے رقص کیا عشق وجد میں آیا

ترے فراق میں ایسا بھی ایک وقت آیا
کہ دل نے بارِ مصائب پہ ناز فرمایا

ترا بذاتِ خود آنا تو اور ہی شے ہے
ترا خیال بھی آیا تو کیف بار آیا

ہمیں نے راہِ محبت کو طے کیا ورنہ
قدم قدم پہ تمہارے کرم نے بہکایا

جہاں نہ قدرِ محبت نہ احترامِ وفا
وفورِ شوق مجھے کس جہاں میں لے آیا

الٰہی خیر وہ ہے التفات پر مائل
نشیب آئے تو آئے فراز بھی آیا

برا کیا کہ سنی آپ نے نہ عرضِ عدو
کہاں کہاں سے تو الفاظ ڈھونڈ کر لایا

وہ تیرے غم کو بھلا کیسے جان لیں عالی
ابھی تک ان کو کوئی سانحہ بھی پیش آیا

جمیل الدین احمد عالی

ستارے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو

جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

رات رات بھر جاگ جاگ کر کس کو گیت سناتے ہو

چپ چپ رہ کر جھل مل جھل مل کس بھاشا میں گاتے ہو

جاؤ جاؤ ——————

رات اندھیری کالی کالی، کس سج دھج سے آئی ہے

میرا کیا ہے، میں سودائی، تاروں کی رسوائی ہے

جاؤ جاؤ ——————

ہم جس نگری میں رہتے ہیں، وہ نگری کیا دیکھو گے

ہم جس بستی میں بستے ہیں، وہ بستی کیا دیکھو گے

جاؤ جاؤ ——————

آپ تو آسمان راج دلارے، میں وحشی طوفان بدوش

میری دنیا، میلِ مسلسل، آپ کی دنیا سیلِ خموش

جاؤ جاؤ - چھپ جاؤ ستارو

جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

ایشیا۔ اگست ۱۹۳۶ء

خورشید الاسلام بی۔ اے (علیگ)

شکست

شگوفے کھل رہے تھے، وقت بھی دم لیکے چلتا تھا
سپیدہ آسماں کی مُہرِ پستاں سے اُبلتا تھا

ستارے سے رواں تھے، طائروں کی نغمہ کاری میں
چھپی بیٹھی تھی خوشبو لالہ و گل کی عماری میں

فلک پر کچھ لجائی سی کہیں، ابرک کی نیّا تھی
کنول کے پھول میں بہتی ہوئی بزمِ ثریّا تھی

خیالوں میں مجھے یاقوت کی مینا نظر آئی
بہت کرنیں لئے تصویرِ آئینہ نظر آئی

شعاعِ اوّلیں نے بڑھ کے چوما عشقِ پیچاں کو
شراب رنگ لے کر بہ گئی تختِ سلیماں کو

مری تخئیل کی اک جست نے پرویں کو شرمایا
فضا نے بادۂ انگور ہو کر، کیف برسایا

عجب آئینہ خانہ تھا عجب جلوہ گری دیکھی
غبارِ گردشِ فانوس میں بھی ساحری دیکھی

جبیں میں ذوقِ سجدہ اس طرح جھوما بہار آئی
اُدھر اک زمزمہ اُٹھا، ادھر صوتِ ہزار آئی

معاً، بلقیس کے رُخ سے نقابِ یاسمن اُٹھا
لئے فردوس پلکوں پر، ہر اک نقشِ چمن اُٹھا

یہ جی چاہا کہ میں بھی حُسن کے قدموں پہ جھک جاؤں
فلک کی آسیا بھی رُک گئی ہے میں بھی رُک جاؤں

ندا آئی کہ اے حُسنِ مجازی کے تمنّائی
نہ تجھ میں اُوس کی ٹھنڈک، نہ تجھ میں گُل کی رعنائی

تجھے ہے نقص کا احساس، یاں ہر نقش آبی ہے
نہیں قربِ جمال اچھا کہ یہ عالم سرابی ہے

پشیماں ہوں میں اپنے شوق کی پرواز سے اب بھی
لرز جاتا ہے دل گو حُسن کی آواز سے اب بھی

نئی کہانی

نئی کہانی

جذباتی کیڑے — سڑک — شام — بیگم

انسانی زندگی نفسیاتی الجھنوں کی ایک نہ بوجھی جانے والی پہیلی نہیں تو کیا ہے'۔!؟ ورنہ فطرت کہیں تو محدود ہوتی'!؟ کیسی نیرنگیوں' اسرار اور تضادوں سے معمور ہے یہ ہماری دُنیا' اور اس دُنیا کے بسنے والے اور ان بسنے والوں کے گوشت و پوست کے اندر چھپا ہوا' اک لامتناہی جہان!! اس اسرار اور طلسم پر قابو پانے کیلئے انسانی عقل و خرد نے سر توڑ کوشش کی مگر اس کے معمولی سے بھید کو بھی نہ پا سکے۔

پُرانے داستان گو انھیں اپنی کہکر فسانہ ہو گئے' اب "نئی کہانی" کہنے والوں کی باری ہے' یہ کہانی سُنانا چاہتے ہیں' گزرے ہوؤں سے آزاد ہو کر ان کے الفاظ میں تکلفات و شکوہ نہیں' طنطنہ نہیں' مگر سادگی ہے' صداقت ہے اور جستجو کی چنگاری ہے' بیباک چنگاری جو سُننے والوں سے ٹکراتی اور روشنی بکھیرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتی۔

یہ زندگی کی اوڑھنی میں جو ابھر تا ٹلک کر اس کو وزنی اور تیرہ و تار نہیں کرتے کھلی فضا اور نسیمی ماحول میں لا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کا بھید پا جانا چاہتے ہیں۔

سچ ہے' قدیم اطالوی بُت تراشوں کی طرح' ان نئے حسن کاروں کا مقصد بھی اک آزاد مشاہدہ ہے' یہ کائنات بھر کو پس منظر بنا کر زندگی کے ہارنے اور عریاں ہونے کا منظر پیش کرنا چاہتے ہیں' مگر باندو کی طرح یہ بے حیائیت نہیں لکھتے۔ آزاد اور متجسس فضا میں یہ زندگی کو اس کے حقیقی خدوخال میں دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں۔

کیسے نظر باز ہیں یہ نئے لوگ!۔ ان نئی کہانی کہنے والوں میں سب ہی نئے ہیں' مدھوسودن' پرتھوی ناتھ شرما اور رام پرتاپ۔

ہر کہانی کہنے والا زندگی سے بہت قریب ہے' اتنا قریب کہ وہ اس کے چہرے پر آتے جاتے ہوئے مختلف رنگ بھی دیکھ سکتا ہے اور اس کے دل کی دھڑکن بھی سُن سکتا ہے' مدھوسودن کی کہانی کا پلاٹ پریوں کی داستان یا چین سے لیا ہوا نہیں بلکہ ہمارے ہی روزمرہ کے مشاغل کا ایک پہلو ہے' اس کے کردار بھی چلتے پھرتے سائے ہیں جو صبح و شام ہمارے گرد گھومتے رہتے ہیں اور ان کا اسلوب بیان سادہ اور اچھوتا ہے

مدھوسودن کی کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا نفسیاتی تجزیہ ہے' وہ انسان کی نفسیات میں اتنا گہرا جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھاتیں اور جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اس پر مُسکراتا ہوا ایک ہلکے سے طنز کے پردہ میں لپیٹ کر اپنے خیال کی دُنیا سے باہر پھینک دیتا ہے' کچھ دیکھنے والے اس پر کڑھتے ہیں' کچھ دانت پیستے ہیں اور کچھ محض دل مسوس کر رہ جاتے ہیں' ہمارے گرد اس سماج کے گندے نالے میں اکثر جذباتی کیڑے کلبلاتے رہتے ہیں'۔ پرتھوی ناتھ شرما کی بول چال کنول کی طرح شگفتہ' خوشبو کی طرح فرحت زا اور شاخوں کی طرح لچکیلی ہے "سڑک" پر زندگی کی اتنی بڑی حقیقت بیان کرنے میں بیباک ہیں' جنسی بھوک مطلق بھوک سے مغلوب ہے' زندگی کی تھکان کو حسن و محبت کی لوری بھی نہیں اُتار سکتی' ترغیبات دل پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں مگر ہمارا سفر برابر جاری رہتا ہے۔۔

رام پرتاپ کی شام انوکھی ہوتی ہے' ان کی عادت ہے' ریت میں سے چاندی اور مٹی میں سے ہیرا نکالنے کی۔ زندگی کے عمومی مناظر میں سماجی و سیاسی مسائل اور مخصوص نفسی نتائج کی تخم ریزی کرتے ہیں' نفسیات کی رفتار' اور تاثرات کی پیہم دھڑکنوں میں انکی کہانی کا نقطۂ عروج شروع ہوتا ہے اور ہمیں سوچ وچار کی دُنیا میں تنہا چھوڑ کر دھندلا پڑ جاتا ہے' جابجا طنز کے گہرے چھینٹے رنگ اور بھی گہرا کر دیتے ہیں'۔ ان کی شکنتلا جیتی کے آگے ہیچ ہے' شرما کی چھائی ہوئی تصوریت جیتی کی طالق ہے' وہ بلاخوف ایک جہاں سوز ہستی کو سرائے جیسی عام جگہ بھیج دیتے ہیں' جیتی کا مصنف شکنتلا کے مصنف کے مقابلہ میں زیادہ شاعر ہے' اور عجیب بات یہ ہے کہ زیادہ اخلاقی بھی ہے' اس کے مسافر کا شیشہ چٹان سے ٹکرا کر بھی شیشہ ہی رہتا ہے' لیکن اس کی زبان اور بیان کی نکھری ہوئی کامل افسانویت مشکل ہی سے ان باتوں کی طرف توجہ کرنے دیتی ہے!

رام پرتاپ زندگی کی جزئیات میں اس قدر مگن ہوتا ہے کہ وہ ہماری محسوس اور دیکھی ہوئی چیزوں کا (جن میں ہمارے لئے کوئی وضاحت نہیں مثلاً گاندھی جی' جواہر لال' کانگریس' وغیرہ) ذکر ضرور کرتا ہے! اس کی کہانی میں ایک سوچنے والا دماغ اور بہنے والا دل دھڑکتا ہے' رہی زبان' سو مجبوری ہے' ہندی کے افسانہ نگار اُردو کی بندش' ترتیب اور الفاظ کے جانے بوجھے محلات کو لکھتے ہی لکھتے لکھیں گے۔

جیتی اور شکنتلا کے ساتھ "بیگم" بھی کچھ کم نہیں' یہ چیخوف کی ایک مختصر کہانی ہے' جسے مسعود زاہدی نے ترجمہ کیا ہے۔

ساغر

[illegible] کے لائق نہایت مناسب ترین انتخاب ہے، [illegible] افسانوں کے
[illegible] سے بخوبی نتائج عمل کے ذہن پر پڑ سکتے ہیں، ان نتائج سے کم از کم
[illegible] کو محفوظ کر سکتے ہیں؛

مترجمین نے ترجمہ کی زبان ہلکی پھلکی اور دلچسپ رکھی ہے، زبان کی سادگی
اور شیرینی نے کشش کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ ہاں اسالیب کی خصوصیات ترجموں
میں نمایاں نہیں ہو سکیں، بعض جگہ ادبی خامیاں بھی ہیں، مثلاً ٹالسٹائے کے
افسانے میں "اناج اگانے" کے بجائے "اناج اپجانے" استعمال کیا گیا ہے؛
یا مصطفیٰ لطفی کے افسانہ "گدہ" کے مترجم نے آہ کرنے کے بجائے "آہ بھاکنا"
استعمال کیا ہے، کئی جگہ اسی قسم کی مثالیں ملتی ہیں؛

کوئی شک نہیں کہ بعض محاورے مقامی ہوتے ہیں اور زبان کی وسعت
کے خیال سے ان کا استعمال ہرگز نامناسب اور غلط نہیں۔ مگر لسانی اور صوتی
حسن ضائع نہیں ہونا چاہیئے، ملی جلی زبان، کے لئے اردو ہندی کے الفاظ
اردو میں استعمال کرنے کیلئے صناعتی احتیاط و تناسب کی ضرورت ہے؛

شیطانی بوتل

قیمت ۱ر پستک بھنڈار لہریا سرائے
دربھنگہ (صوبہ بہار)

اب لفظ "بھنڈار" ہی کو لیجیے، زبان سے نکلتے ہی اس کی "ڈ" دماغ
پر لٹھ سا رسید کرتی ہے، اگر مرکز، مخزن، اور اسی قسم کے مترادف الفاظ میں ایک
قسم کی نزاکت صوتی اور زبان کی خوبصورتی ہے، "بھنڈار" والے کہہ سکتے
ہیں کہ "بکڈپو" میں بھی "ڈ" ہے، بجا، مگر وہ نہیں جانتے کہ "پ" کے ترنم نے
بکڈپو کے "ڈ" کی سختی بہت کم کر دی ہے!

اگر اردو ہندی کے ادیب اور کوی اپنا صحیح صناعتی فرض محسوس
کریں تو وہ تعصبات پیدا ہی نہیں ہو سکتے جو اصل میں الفاظ اور ان کے
غلط استعمالات سے پیدا ہوتے ہیں۔

شیطانی بوتل آر۔ ایل اسٹیونسن کی کہانی (Bottle Imp [illegible])
سے ماخوذ ہے، اسٹیونسن انگریزی ادب کا اعلیٰ ترین صاحب طرز ادیب و
افسانہ نگار ہے؛ افسانہ کی جزئیات کو نمایاں کرنا انکی خصوصیت ہے، شیطانی
بوتل میں یہ خصوصیت زیادہ نمایاں نہ سہی مگر اس کا اسٹائل اس کہانی کی ہر
سطر سے نمایاں ہے۔ اس کتاب کے مؤلف و مترجم انیس الرحمٰن صاحب نے نہایت
کامیاب ترجمہ کیا ہے، ترجمہ میں اصل کی شان ہے، وہ [illegible]

[illegible]

کامیابی کیساتھ ایک جا [illegible]
یہ ایک خاص [illegible] نوعیت کی [illegible] ہے اور [illegible] سے
تعلق رکھتی ہے؛

ننھوں کے دیس میں

قیمت ۸ر آنے، مولف انیس الرحمٰن
ناشر، پستک بھنڈار لہریا سرائے
دربھنگہ۔

یہ جان سوفٹ کے سفرنامہ گلیور سے ماخوذ ہے، اعجوبہ افسانے کی حیثیت
سے خاص امتیاز حاصل ہے، قدیم عربی افسانہ نگاروں کی طرز کی تقلید کی
جھلک پائی جاتی ہے۔ مگر اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے۔ انیس صاحب نے
اس کمال و لطافت سے اردو میں منتقل و اخذ کیا ہے کہ اصل کی اعجوبہ کاری
اپنی کامل شان و دلنوازی سے جلوہ گر ہے۔ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو
یہ ترجمہ نما ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے؛

ایجاد و موجد

قیمت ۶ر از شری رام برکش بینی پوری
سائز ۲۰×۲۶/۸ ۵۰ صفحات با تصویر

آرٹ پیپر پر پوری کتاب چھپی ہے۔

بینی پوری بہار میں ہندی زبان کے مشہور اور مقبول ادیب ہیں، خاصکر
ان کے مزاحی مضامین ہندی دنیا میں بہت پسند کئے جاتے ہیں؛ بینی نے
میٹھی اور سادہ زبان میں ہمارے زمانے کی چند ایجادوں، ریل گاڑی، جہاز
ڈوبکنی کشتی، ہوائی جہاز، بجلی، تار برقی، اسکی، ٹیلیفون، گراموفون، چھاپہ خانہ
اور ان کے موجدوں کا حال بیان کیا ہے، بچوں کے لئے نہایت موزوں
و مناسب کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی، تصویروں اور آرٹ پیپر کے لحاظ سے
اس کی قیمت بہت ہی کم ہے؛

(باقی باقی)

نئی چرکھاری

مصنفہ آغا حیدر حسن صاحب حیدر
ایم۔ آر۔ اے۔ ایس سول اسسٹنٹ سرجن
چرکھاری۔ ملنے کا پتہ۔ ان برادرس اور صدیقی بکڈپو لکھنؤ

چرکھاری سنٹرل انڈیا کی ایک چھوٹی ریاست ہے لیکن [illegible]
زمانہ سے بہت سی خصوصیات تعلق رکھتی ہیں [illegible]
[illegible]

خواہش ہوئی کہ اوپر دیکھے، لیکن ہر بار اُس نے اس خواہش کو اپنے سینہ میں دبا دیا تھا ایسا نہ ہو کہ اُسے اوپر دیکھتا ہوا دیکھ کر وہ پھر منہ نہ پھیر لے۔ اس سے اچھا تو یہی ہے کہ وہ ہی اُسے دیکھتی رہے۔

اور رات وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا کہ آخر وہ اُسے کیوں دیکھ رہی تھی اور پھر اس کے اوپر دیکھ لینے پر اُس نے منہ کیوں پھیر لیا۔ کئی بار اُسے خیال آیا بھی کہ شاید وہ مجھے نہ دیکھ رہی ہو لیکن اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ اور وہ سوچتا کہ وہ ضرور مجھے دیکھ رہی تھی ورنہ...... ورنہ وہ منہ کیوں پھیر لیتی۔ ضرور وہ میرے اچانک اوپر دیکھ لینے پر گھبرا گئی ہوگی، بچاری شکنتلا! اور اُس کی آنکھوں میں شکنتلا کا چہرہ پھر گیا اور اُسے یاد آیا کہ اُس کی آنکھیں نیلی ہیں جن میں آسمان کی لامحدود نیلاہٹوں کی وسعت ہے اور سمندر کے وسیع پانیوں کی سی گہرائی شکنتلا اگر پھنس گئی تو؟ آخر وہ اس کی طرف کیوں دیکھ رہی تھی۔ ضرور پھنس جائیگی اور اُس نے سوچا کہ کس طرح وہ سکول جاتے وقت اُس سے بات کرے گا لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟ اُس کے بھائی نے یا کسی اور محلہ والے نے...... لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ اُس نے سکول جانا چھوڑ دیا ہے اور شاید وہ اب کے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے رہی ہے اچھا تو وہ اُس سے اُس اندھیارے چھتے میں ہی بات کرلیگا۔ اگر اس کا سکول جانا چھڑا دیا گیا ہے تو کیا گھر سے باہر نکلنا بھی بند کر دیا گیا ہوگا لیکن بات کوئی ایک سیکنڈ میں تو ہو ہی نہیں جاتی، اس نے سوچا اور زیادہ دیر تک بات کرنے میں کیا پتہ کوئی دیکھ لے! اچھا تو وہ اُسے ایک محبت بھرا خط لکھ دیگا اور وہ خط وہ خود ہی اُسے دیگا۔ کیونکہ کسی دوسری طرح پہنچانے میں کیا معلوم کوئی پڑھ لے اور یہ بھید کھل جائے...... یہ بھید!...... وہ بہت دیر تک یوں ہی سوچتا رہا تھا اور آنے والے عشق کی تفصیلات میں ڈوبا رہا تھا۔ نیند آتی ہی نہ تھی شکنتلا، شکنتلا، شکنتلا! وہ مختلف شکلوں میں اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی، بند آنکھوں کے آگے تیرتے ہوئے سُرخ، نیلے، پیلے، دھارئے بار بار شکنتلا کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ اور شکنتلا کی مبہم سی تصویروں میں اُس کی آنکھیں ہی واضح ہوتیں، نیلی آنکھیں...... اور یہی سوچتے سوچتے خواب اور بیداری کی حدوں کے درمیان لیٹے ہوئے اُس نے محسوس کیا تھا، وہ شکنتلا سے محبت کرتا ہے!

وہ شکنتلا سے محبت کرنے لگا تھا کیونکہ شکنتلا کل اُسے دیکھ رہی تھی! لیکن آج کھڑکی سُنسان تھی۔ ہوا بند تھی اور جیپل کے پتے خاموش کھڑکی کو سُنسان دیکھ کر نریندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا دل اچانک دھڑکتے دھڑکتے رک گیا ہے اور آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے لیکن اُس کی یہ اُمید کہ شکنتلا ہر وقت کھڑکی میں بیٹھی رہے محض ایک آرزوئے خام تھی۔ کیونکہ آخر وہ ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی۔ اور اُسے گھر کے بہتیرے کام تھے، کبھی کبھی کھانا بنانا، اپنے چھوٹے بھائی کا سوئٹر بُننا، شاید اپنے جہیز کے لئے کچھ سینا پرونا، کاڑھنا یونہی ایک فضول سی بات کے لئے وہ آخر کب تک کھڑکی میں بیٹھی رہتی۔ چاہتی بھی جب بھی یہ ناممکن تھا۔ لیکن نریندر بچارا کیا کرتا، وہ ان تمام باتوں کو کیسے سوچتا، وہ تو مجبور تھا۔ بچارہ۔ خدا خدا کرکے تو ایک لڑکی نے نگاہ کرم کی تھی، وہ بھی دوسرے ہی دن سے یوں بے پرواہی برتنے لگے تو اس کے دل کو کیسے دھکا نہ لگتا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے۔ وہ شانتی جو کل تک اُس نے محسوس نہ کی تھی آج اس کھڑکی کو سنسان دیکھکر اس کی رُوح میں پھیل گئی تھی۔

بہت دیر تک وہ وہاں ٹہلتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ شاید وہ ذرا ٹھہر کر آجائے۔ وہ پانچ منٹ گزر گئے پھر دس منٹ اور اب اس طرح یہاں اکیلے ٹہلتا رہنا بظاہر بالکل بے معنی تھا اور اُس کے دل کے کسی نامعلوم گوشہ میں چھپا ہوا کوئی چور، بار بار اُس سے کہتا تھا کہ اس طرح یہاں دیکھکر ہر شخص یہی سوچیگا کہ تم آخر اس کھڑکی کے نیچے اکیلے کیوں ٹہل رہے ہو۔ اور کیا پتہ اسے اس بات کا شبہ ہو جائے۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو بنی بنائی متعلق شک بھی ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی کو معلوم ہوگیا تو بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔ کیا معلوم کوئی اس کی ہی شکایت کر دے یا اور اگر شکنتلا کے گھر کسی کو معلوم ہوگیا تو کیا جانے اُسے سخت سُست کہنے کے بعد اس کھڑکی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دئے جائیں اُمید کی یہ جھلملاتی ہوئی کرن پھر اسے تاریکی میں کھو جائے!۔

اُسے بات بات میں اس راز کے فاش ہو جانے کا ڈر تھا۔ وہ اس کے نتیجہ سے خوفزدہ تھا جس ماحول میں وہ رہتا تھا وہاں محبت کو ہمیشہ ایک عیب خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں نوجوانی میں ہی اپنے لڑکے کو پیا ملن کی خواہش کے غیر شعوری اظہار پر بدمعاش اور آوارہ کہا کرتے تھے۔ یہ ایک کلرکوں کا محلہ تھا یوں تو اس میں دو کاندار بھی شامل تھے اور اسی قسم کے دوسرے لوگ بھی اور شکنتلا کے والد بزرگوار تو ایک وکیل تھے لیکن کلرکوں اور دوکانداروں وغیرہ کی طرح کچھ ایک سی ہوتی ہے' یہ سب اپنی عورتوں کو تاسنے ڈھب

۵۲

سمجھتے ہیں اور اپنی لڑکیوں کا تیرہ سال کی ہونے پر سکول جانا چھڑا دیتے ہیں۔ خود شکنتلا بھی اب میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے رہی تھی اور اُسے کھڑکی میں سے اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر نریندر کو اُس سے محبت ہو گئی تھی۔ اس تمام ڈر کے باوجود کہ کوئی اس محبت کے بارے میں جان نہ لے وہ شکنتلا سے محبت کرنے سے باز نہ رہ سکا بلکہ اس ڈر کی وجہ سے اُسکی محبت شدید ہوتی گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا اور وہ محبت اُسکے دل میں اُس زہریلے دھوئیں کی طرح پھیلتی جا رہی تھی جسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اس زہر نے اُس کی خوشی کو تحلیل کر دیا لیکن اس محبت نے اُسے مضمحل کر دیا۔ ایک بوجھ سا ہر وقت اُسکے دل پر موجود رہتا اور اس بار کے زیر اثر اُس کا اونچی آواز میں بولنے کو بھی جی نہ چاہتا اُسکے دل میں ہر وقت ایک سنسنی سی رہتی جیسے اُسکی تمام رگیں ایک اداس اور بوجھل نغمے سے جھنجھنا رہی ہوں۔ لیکن جب وہ شکنتلا کو دیکھتا تو وہ نغمہ رک سا جاتا اور جب شکنتلا کے چہرے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ آتی اور وہ اپنا سر جھکا لیتی یا پیپل کے پتوں میں شور مچاتی ہوئی چڑیوں کو دیکھنے لگتی تو اُسے محسوس ہوتا کہ کھڑکی کی سلاخیں غائب ہو گئی ہیں اور شکنتلا اُسکے بہت قریب ہے اور وہ اُسے چھونے کیلئے بیتاب ہو جاتا لیکن یہ محض اُس کا وہم ہوتا۔ سلاخیں کھڑکی میں اُسی طرح جڑی ہوتیں اور اب شکنتلا ایک ٹک اُسکی طرف دیکھتی ہوتی۔ اُسکی آنکھوں میں ایک حسین سی چمک ہوتی جیسے نیلی جھیل پر صبح کاذب کا عکس۔

اور وہ سوچتا کہ ایسا کیوں ہے کہ شکنتلا کی جوان روح کو زنگ آلود سلاخوں میں بند کر دیا گیا ہے اور ایسا کیوں ہے کہ وہ اُس سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی زندگی میں ایک ایسا نسوانی پیکر چاہتا تھا جس میں ایک عورت کی روح ہو۔ جو اُسکے دل کی بے چین خلش کو مٹا دے اور اُسے سکون، شانتی اور مسکراتی زندگی بخش دے۔ شکنتلا میں اُسے امید کی ایک شعاع نظر آتی تھی جیسے تاریکی میں بھٹکے ہوئے مسافر کو ایک جھلملاتا ہوا چراغ۔ وہ اس چراغ کی طرف جا رہا تھا، چاہتا تھا کہ وہ چراغ اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ وہ اُس کھڑکی کے قریب رہنے کے بہانے ڈھونڈتا، شکنتلا بازار جاتی تو وہ اُسکے انتظار میں دو راستوں کے سنگم پر کھڑا رہتا تاکہ وہ اُسے قریب سے صرف دیکھ ہی سکے۔ وہ شکنتلا سے بات تو نہ کر سکتا تھا۔ اُس سے کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا لیکن وہ ہر اُس جگہ موجود ہونے کی کوشش کرتا جہاں وہ شکنتلا کو اور شکنتلا اُسے دیکھ سکے۔ وہ ایک بیکار آدمی کی طرح ہر وقت شکنتلا ہی کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن یہ ناممکن تھا، شکنتلا اپنے 'قید خانے' سے باہر بھی جاتی تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتا تھا کہ راستے پر اُس کا انتظار کرتا رہے کیونکہ دوسری حالت میں لوگ سوچتے کہ آخر اس طرح ساتھ ساتھ گھومنے کا مطلب کیا ہے؟ آخر بات کیا ۔ آ ۔ ہے؟ اگر شکنتلا مندر جاتی مندر جاتی تب تو وہ وہاں جا سکتا تھا، کیونکہ مندر پرماتما کا گھر ہے۔ وہاں ہری جنوں کے علاوہ ہر شخص جا سکتا ہے، چاہے شکنتلا کو دیکھنے ہی کیوں نہ جائے لیکن شکنتلا مندر نہ جاتی تھی بلکہ وہ اپنی ماں کے ساتھ اور اُسکی ماں چند اور عورتوں کے ساتھ کبھی کبھی ایک مہاتما کی کٹیا میں جاتی تھی کیونکہ پرماتما سے زیادہ مہاتماؤں کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بے اولادوں کو اولاد اور سٹے بازوں کو 'کامیاب ہندسے' دیتے ہیں۔

اُس روز مہاتما کی کٹیا میں کوئی خاص جشن تھا، اور نریندر کو معلوم تھا کہ آج وہ لوگ آئیں گے اور وہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔

شام سے آسمان پر مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ستارے غائب تھے اور غلیظ بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔ وہ لوگ ابھی آئے نہ تھے۔ اب تو مہاتما کے چیلوں نے گھنٹے بھی بجانا شروع کر دئے تھے۔ شاید آرتی کر رہے تھے اور باغ کے وسیع سناٹے میں گھنٹوں اور سنکھوں کی آواز فصیل کی رنگین دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھی۔ آج کٹیا میں زیادہ آدمی موجود تھے، آج مہاتما کے گھر ایک خاص جشن تھا لیکن وہ لوگ ابھی تک نہ آئے تھے۔ نریندر راستے کی طرف دیکھ رہا تھا مٹیالے بادل باغ کی جھاڑیوں والی دیوار سے پرے بورڈنگ ہاؤس پر جھکے ہوئے تھے اور بورڈنگ ہاؤس اندھیرے میں ایک پُراسرار محل کی طرح نظر آ رہا تھا، سنسان، تاریک۔ جھاڑیوں کی دیوار کے درمیان سے سڑک کی اکا دُکا مدھم بتیاں نظر آ جاتی تھیں، اداس، خاموش، کہرے میں پھنسی ہوئی۔ ٹہلتا ٹہلتا وہ کٹیا سے دور نکل آیا۔ سنکھوں کی آواز اب مدھم ہو گئی تھی۔ دور سے آ رہی تھی اور دور سے آتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے وہ خود کوئی آواز نہ ہو، الگ گونج ہو۔ جو ختم ہونے میں نہ آتی ہو۔

وہ دیر تک گھاس پر ٹہلتا رہا۔ مہاتما کی کٹیا سے شکنتلا کے آنے کے راستے کی طرف ہوا میں گھاس اور نمی کی بو تھی۔ بورڈنگ ہاؤس کے طور پر ایک جگہ سے بادلوں کے کنارے روپہلی ہو گئے تھے، شاید چاند نکلنے کے قریب تھا۔ ایک ہلکی سی مبہم سفیدی باغ کے اندھیرے پر پھیل گئی تھی اور پیپل اور کھجور کے درخت واضح نظر آنے لگے تھے۔ اچانک اُس نے جھاڑیوں والی دیوار کے پیچھے عورتوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی، یہ شکنتلا ہی تھی" اور اُسکے دل کی حرکت جو

دیر سے ختم ہو چکی تھی اچانک بڑھ گئی اور غیر محسوس خوشی کی ایک مضطرب لہر اُس کے دل میں اُتر کر سارے جسم میں پھیل گئی۔ جھاڑیوں کے پار بورڈنگ ہاؤس کے اوپر چاند آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور باغ کے اندھیرے پر روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ پھر وہ لوگ جھاڑیوں کے درمیان بنے ہوئے راستہ پر نمودار ہوئے اور جب وہ اُس کے قریب سے گزرے تو چاند پورا نکل آیا تھا۔ اور شکنتلا کا چہرہ چاند کی کرنوں میں روشن ہو اٹھا تھا لیکن وہ قریب سے باتیں کرتی ہوئی گزر گئی۔ شاید اُس نے نریندر کو دیکھا نہیں یا شاید پہچان نہ سکی۔ اور شکنتلا کو آگے جاتا ہوا دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا کہ اُس کا یہاں آنا بالکل بیکار رہا، فضول، بے سود، اور اُس نے محسوس کیا کہ چاندنی پھیکی پڑ گئی ہے اور پیپل اور کھجور کے درخت تھک کر سو گئے ہیں۔ گھنٹوں اور سنکھوں کی آوازیں بند ہو چکی تھیں، آرتی ختم ہو گئی تھی۔ دیر تک کٹیا سے مبہم آوازیں آتی رہیں۔ جیسے سُنسان کھنڈروں میں بھوت بولتے ہوں۔ اور یہ احساس کہ شکنتلا وہاں موجود ہے اُسے کٹیا کے قریب لے گیا۔ گیس کی روشنی میں جٹادھاری سادھو اپنے جسموں پر راکھ ملے بیٹھے تھے۔ اور ان میں سے ایک جس کی جٹائیں زیادہ گھنی تھیں کچھ کہہ رہا تھا۔ روشنی میں شکنتلا اُسے ایک دور دراز شے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ لوگ سب کے بعد آئے تھے اور سب سے پیچھے بیٹھے تھے۔ شکنتلا باہر دیکھ رہی تھی جیسے اُسے مہاتما کے وعظ سے دلچسپی نہ ہو۔ باہر ایک موہوم سی سفیدی پھیلی ہوئی تھی اور درختوں کے سائے گہرے گہرے سیاہ دھبے معلوم ہوتے تھے سردی بڑھ گئی تھی لیکن نریندر نے اسے محسوس نہیں کیا۔ وہ کٹیا کے قریب نمدار گھاس پر ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے شکنتلا کو گیس کی روشنی میں جمائی لیتے دیکھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی ہو۔ پھر وہ اُٹھی، نریندر کا دل دھڑکا اور وہ باہر آ گئی۔ باہر وہی اندھیرا تھا، فصیل کے قریب، جھاڑیوں کے پار چماروں کی جھونپڑیاں تھیں لیکن ان میں جلتے ہوئے چراغ اندھیرے کو دور نہ کر سکے تھے۔ سرِ شام ہی سے سب جگہ اندھیرا چھا گیا تھا۔ چماروں کی جھونپڑیوں کے قریب کہیں کتے بھونکے، پیپل کے درخت پر کوئی پرند پھڑپھڑایا اور خاموشی چھا گئی۔ صرف اندر سے جٹادھاری سادھو کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور وہ پھر اندر چلی گئی۔

بہت دیر بعد مہاتما کا وعظ ختم ہوا اور لوگ اُٹھنے لگے۔ لوگوں کو اُٹھتا ہوا دیکھ کر نریندر چل پڑا۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ شکنتلا کے ساتھ والے لوگ اُسے باغ میں دیکھیں۔ وہ اُن سے پہلے ہی باغ میں آ جانا چاہتا تھا بازار میں تو ہزاروں آدمی چلتے ہیں، وہاں اگر وہ انھیں مل گیا تو کوئی بات نہ ہوگی۔ کسی کو شک بھی نہ ہوگا کہ یہ ہماری وجہ سے یہاں پھر رہا ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ بازار کے نکڑ پر کھڑا رہا۔ پان والے کی دکان میں لگے ہوئے آئینہ میں اُسے اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ یہ دیکھ کر شرمندہ بھی ہوا اور متعجب بھی کہ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کچھ چُرا کر بھاگا ہو یا چوری کرنا چاہتا ہو کچھ دیر بعد سامنے کی پگڈنڈی پر اُسے کچھ لوگ نظر آئے۔ شکنتلا سب سے آگے تھی۔ اس کے ساتھ اس کی کوئی سہیلی بھی تھی جسے وہ پہلی بار دیکھ نہ سکا تھا۔ شاید انھوں نے اب بھی اُسے نہیں دیکھا اور وہ جلدی جلدی چل کر چند گز آگے آ گیا اور دو آنے والے سنیما کے پاس پہنچ کر اُس پٹری پر ہو گیا جس پر وہ لوگ تھے۔ اور آہستہ آہستہ جیسے اُسے کچھ پتہ ہی نہیں، اُس طرف چلنے لگا جدھر سے وہ لوگ آ رہے تھے دُور سے اُس نے دیکھا کہ شکنتلا نے اُسے دیکھ لیا ہے۔ اُس نے اپنی سہیلی سے کچھ کہا اور پھر وہ دونوں ہنس پڑیں۔ اب وہ قریب آ گئی تھیں نریندر رُک گیا اور اُس نے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے رومال والے سے پوچھا — کیا سب رومال تین تین آنے کے ہیں؟ شکنتلا قریب سے گزری، اُس کے ہاتھ اُٹھے اور ایک تانیے کے پیچھے میان میں رُکتے ہوئے سر پر چلے گئے جیسے وہ بالوں کو ٹھیک کر رہی ہو۔ نریندر کو ایسا معلوم ہوا جیسے شکنتلا نے اُسے نمستے کی ہے!

اور وہ نمستے اُس کے دل میں ایک ہنگامہ بپا کر گئی جیسے آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ندی میں تیز تندی سے یکا یک طوفانی ہیجان پیدا ہو جائے جوں جوں وہ اُسے سوچتا رہا وہ نمستے اُس کے ذہن میں تیزی سے گردش کرنے لگی، یہ گردش تیز ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ اس نمستے نے اُس کے ذہن میں آواز اختیار کر لی — نمستے، نمستے، نمستے!

اور رات بستر پر لیٹتے ہوئے وہ جس طرف کروٹ لیتا وہ اُٹھتے ہوئے ہاتھ اس کے سامنے آ جاتے۔ نمستے نمستے........ کروٹ بدلتا اور وہ نمستے پھر سامنے آ جاتی ہے — اس نے شکنتلا کے لئے ایک خط لکھا وہ خط جو اُس نے پہلے ہی دن جب شکنتلا اس کی طرف دیکھ رہی تھی تو اُس کے نام لکھنے کو تھا۔ ایک خط ہی شکنتلا سے کچھ کہنے کا اکلوتا ذریعہ تھا! خط لکھنے کے بعد وہ بار بار اُسے دینے کا ارادہ کرتا، لیکن ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور اپنی اس کمزوری کے لئے وہ اپنے دل میں تاویلیں گھڑتا۔ کبھی خط دینے کا موقع کھو دینے کے بعد وہ سوچتا کہ اچھا ہی ہوا جو میں نے اس وقت کوشش نہ کی۔

دل کے بہلانے کو وہ تین دن تک ایسی ہی باتیں سوچتا رہا۔ آخر

تیسرے دن اُس نے وہ خط اُٹھا لیا۔ شاید وہ اُس وقت بھی نہ دیکھتا لیکن رات وہ بہت دیر تک یہی سوچتا رہا تھا۔ اُس نے بستر پر بار بار کروٹیں بدلتے ہوئے کئی بار خود کو ملامت کی تھی۔ اور اُس وقت گلی سنسان تھی۔ سناٹا، سکوت۔ بچے سکول گئے ہوئے تھے اور عورتیں چھتوں پر دھوپ لے رہی تھیں۔ گلی میں سے گزر کر وہ اپنے گھر جا رہی تھی جب وہ چھتے میں پہنچی جہاں دن کے وقت بھی سرِ شام کا سا اندھیرا تھا تو نریندر نے جذبات اور گھبراہٹ سے بھاری آواز میں آہستہ سے پکارا ــــ شکنتلا! شکنتلا نے گھوم کر دیکھا، اب وہ اُس کے قریب تھی، سناٹا گہرا ہو گیا تھا، اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، شکنتلا سہم گئی تھی، ایک لمحہ خاموش رہی، نریندر کچھ کہہ نہ سکا، اُس کی آواز حالات کی اجنبیت اور گھبراہٹ سے مغلوب ہو گئی۔ اُس نے وہ خط آگے بڑھا دیا سہمی ہوئی آواز میں شکنتلا نے پوچھا ــــ کس کا ہے؟ نریندر جواب نہ دے سکا، الفاظ اس کے دل میں گھوم کر رہ گئے۔ اُس کے سر پر کبوتر نے اپنے گھونسلے میں پر پھڑپھڑائے۔ اور اندھیرے چھتے سے باہر نکل کر پھر سے اُڑ گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ ایک طویل عرصے کے بعد اُس نے ایک بھدا سا جواب دیا ــــ پڑھ لینا! اور گھبراہٹ میں وہ باہر نکل آیا۔

جب دل کی دھڑکن اصلی حالت پر آئی تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کے اوپر سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا ہے لیکن یہ احساس صرف ایک لمحہ کیلئے تھا۔ دوسرے لمحہ اُس نے محسوس کیا کہ دل پر ایک فکر سا چھا گیا ہے ــــ سہمی ہوئی آواز میں...... سناٹا...... دل کی تیز دھڑکن...... کس کا ہے...... کس کا ہے...... پڑھ لینا ــــ اُس نے سوچا کہ پڑھنے کے بعد وہ کیا کرے گی اور اُس کے دل کی بے چینی بڑھ گئی، شاید وہ جواب دے، شاید وہ......

دن بھر اُسے بخار سا چڑھا رہا، رات نیند نہ آئی۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اتنی جسارت کی تھی اور اب وہ بے چین تھا، دل آہستہ آہستہ بیٹھا جاتا تھا، وہ تصویریں، وہ الفاظ اُس کے احساس کے گرد گھومتے جا رہے تھے گھومتے جا رہے تھے ــــ شکنتلا...... سہمی ہوئی آنکھیں...... سہمی ہوئی آواز...... کس کا ہے...... کس کا ہے...... کس کا ہے

...... پڑھ لینا!......

ایک دن گزر گیا۔

دو دن

تین دن۔

تین دن تک شکنتلا کھڑکی میں نہ آئی۔ نریندر حیران تھا، حیران اور پریشان ــــ چوتھے دن شکنتلا موجود تھی، لیکن نریندر کو دیکھ کر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ کھڑکی پر جھکی ہوئی بیل کی نوزائیدہ شاخ اب وہاں موجود نہ تھی۔ شاید تیز ہواؤں کے جھکڑ سے ٹوٹ گئی تھی۔ کھڑکی کی منڈیر پر ایک کبوتر پر پھیلائے ہوئے دھوپ لے رہا تھا۔ شکنتلا اُٹھ کر چلی گئی تھی اور آنے والے دنوں میں نریندر نے محسوس کیا کہ شکنتلا کا رویہ بدل گیا ہے، اب وہ کھڑکی میں کم آتی تھی، ہوتی بھی تو نریندر کو دیکھ کر واپس چلی جاتی یا نیچے صحن میں دیکھنے کی بجائے مُنہ پھیر کر اندر کی طرف دیکھنے لگتی اور نریندر بچارا سوچتا کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس نے شکنتلا کو ناراض کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کے سامنے آنے سے بھی کتراتی ہے۔ اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو اسے جاننے کی خواہش اُس کے دل میں اور بڑھ جاتی۔ اور آخر ایک دن اُس نے اپنی نامکمل محبت کی داستان اپنے ایک دوست کو سُنا ڈالی۔ اور سُن کر اس کی آواز چہک اُٹھی جیسے اس کی امیدوں پر پھر سے ملمع کر دیا گیا ہو، اُس نے کہا۔

"پہلے شکنتلا مجھ سے محبت کرتی تھی، پرکاش سے محبت کرتی تھی راجندر سے محبت کرتی تھی اور آجکل وہ پنڈت جی سے محبت کرتی ہے، تم نے بتایا نہیں کہ تم بھی اس حلقہ میں آ چکے ہو۔ اب تم باتیں چھپانے بہت لگے ہو۔ اس طرح تو نئی شادی شدہ لڑکیاں اپنے حمل کو بھی نہیں چھپاتیں۔"

"لیکن اب تو میں نے تمہیں بتا دیا، خدا کے لئے بتاؤ تو سہی تمہارے ساتھ کیا ہوا؟"

"ہوا کیا، کچھ بھی نہیں ہوا، دراصل کچھ ہونے سے پہلے ہی سب کچھ ہو گیا۔ تمہیں پچھلی ہولی کے دن یاد ہیں، ضرور ہوں گے، تم کہہ رہے تھے کہ پچھلی ہولی کو تم نے رجنی کے رخساروں کو ہاتھ لگایا تھا اور اس نے کچھ نہیں کہا تھا، ایسی باتیں تم بھول سکتے ہو بھلا، خیر تو اچھی طرح بھیگنے کے بعد میں اوپر دھوپ میں کپڑے سُکھا رہا تھا۔ نیچے صحن میں بہت شور و غل تھا، اوپر سورج بہت تنگ کر رہا تھا۔ بار بار چہرے کے سامنے آ جاتا تھا جیسے میرے چہرہ کا نشانہ باندھ رہا ہو۔ بہت دیر بعد میری سمجھ میں آیا کہ یہ چمک سورج کی نہ تھی بلکہ شکنتلا اپنی چھت پر شیشے کو اس طرح چمکا رہی تھی کہ اس کا عکس بار بار میرے چہرے پر پڑتا تھا۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ بلکہ سروجنی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اور جب میں نے اُن کی طرف دیکھا تو وہ مُنہ پھیر کر ہنسنے لگیں۔ مجھے یہاں میں تمہارے جیسا بدھو نہیں تھا کہ شکنتلا

کی شرارت کو نہ سمجھتا۔ اور پھر اُس کے بعد تو مجھے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ شکنتلا ما بدولت پہ عاشق ہوگئی ہے۔ اور کیا عاشق ہوگئی ہی سمجھو۔ میں ادم کے گھر جاکر آواز دیتا تو شکنتلا کھڑکی میں آجاتی اور جتنی دیر میں ادم کے کمرے میں بیٹھا رہتا وہ کھڑکی کے کواڑ کی آڑ میں کھڑی رہتی یا کھڑکی میں بیٹھ کر باتصویر رسالے پڑھتی، خود میں نے کئی بار اسے رسالے بھجوائے۔ اور جب وہ واپس آتے تو ان پہ کئی کئی جگہ شکنتلا کا نام لکھا ہوتا۔ سمجھتے ہو میاں، کسی دوسرے کی کتاب پہ اپنا نام لکھنا کیا معنے رکھتا ہے۔ خیر تو مطلب یہ کہ شکنتلا، شکنتلا ہوگئی تھی اور آخر ایک دن جیسا کہ تم نے کہا وہ گلی میں جا رہی تھی۔ تم تو بیوقوف ہو، میں نے تمہاری طرح عقب سے آواز نہیں دی، میرے تو وہ سامنے تھی، میں نے کہا شکنتلا ——— بس میں اتنا ہی کہہ سکا۔ نہ جانے کہاں سے وکیل صاحب نکل آئے تھے انھیں دیکھ کر میں نے کہا ——— شکنتلا سُنا ہے تمہارا تاریخ کا پرچہ آؤٹ ہوگیا ہے، کیا تمہیں معلوم ہے؟" شکنتلا نے جواب نہیں دیا۔ وہ تو بالکل سہم گئی تھی، وکیل صاحب بولے، "اسے کیا معلوم ہوگا، تم سے کس نے کہا ہے، اور آجکل تو امتحان بھی نہیں ہو رہے۔ واقعی مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ آجکل امتحان نہیں ہو رہے لیکن شکنتلا اس وقت تک آگے جا چکی تھی اور اس کے بعد میں نے دن میں بیس بیس مرتبہ ادم کو جاکر آواز دی لیکن شکنتلا کھڑکی میں نہ آئی، بیس دن میں دس دس گھنٹے ادم کے کمرہ میں بیٹھا رہا، شکنتلا اوّل تو آتی ہی نہ تھی اور اگر آتی بھی تو مجھے دیکھ کر واپس چلی جاتی تھی، جیسے غلطی سے ادھر آگئی ہو آخر میں نے صبر کر لیا اور سوچ لیا کہ لنگوٹی باندھوں گا، کھجوریں کھاؤں گا، بکری کا دودھ پیوں گا اور تکلی پھرایا کروں گا۔

ایسا ہی پرکاش کے ساتھ بھی ہوا، اُس بچارے نے بھی تمہاری طرح خط دیا تھا، یاد رکھو کبھی کسی کو اس طرح خط نہ دیا کرو، زبانی بات ہونی چاہئے، یہی زیادہ محفوظ ہے لیکن تم سب سے زیادہ ڈرپوک راجندر تھا بہت دن تک بچاری شکنتلا نیلی آنکھوں سے، چھپی چھپی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی، لیکن اس بیوقوف کا سر ہی نہ اُٹھا، وہ ہمیشہ عورتوں کی طرح شرماتا ہی رہا۔ پھر تم آگئے اور آجکل شکنتلا پنڈت جی سے محبت کرتی ہے۔"

"پنڈت جی کون، وروپ چند؟"

"ہاں وہی سُفید چوہا، تم نے آجکل دیکھا ہوگا کہ پنڈت جی صحن میں بہت نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ دوپہر کو کالج سے آنے کے بعد جب پنڈت جی اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہوتے ہیں تو پچھلے دروازہ میں آکر شکنتلا اپنی چھوٹی بہن کو آواز دیتی ہے ——— کُسُم! کُسُم!! اور کُسُم بیٹھک میں سے نکل آتی ہے، یعنی پنڈت جی اپنی بیٹھک کے دروازہ پر آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر شکنتلا کھڑی رہتی ہے پھر جب کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے تو واپس چلی جاتی ہے۔۔۔۔"

تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ کہنے لگا ——— "عجیب عادت ہے یہ اس کی کہ پہلے تو شروعات کرتی ہے اور پھر جب بات کچھ بننے لگتی ہے تو الگ ہو جاتی ہے، کیا چاہتی ہے آخر یہ، عجیب عادت ہے، ——— شاید ———"

لیکن اس نے بات پوری نہ کی اور بہت دیر خاموش رہا۔

پارک کی فضا پر سناٹا چھا گیا تھا، چاند گورنمنٹ کلرکوں کے کوارٹروں کے پیچھے ڈوب رہا تھا اور سڑک کے ایک طرف کی بتیاں بُجھ گئی تھیں نرمندر بہت دیر تک پچھلی باتوں کو سوچتا رہا اور اس کی آنکھوں میں پھر شکنتلا کا سلاخوں میں بند چہرہ پھرنے لگا، نیلی آنکھیں، سڈول بازو، حسین سینہ، شباب جاگا ہوا، سرکش۔

اچانک سناٹے میں حرکت پیدا ہوگئی۔ چارکول کی سخت اور سیاہ سڑک پہ ایک تانگہ خاموشی پہ ہتھوڑے مارتا ہوا گزر گیا، پھر نچلے طبقہ کے دو نوجوان "مچھلی پہ نچھر یا جائے" گاتے ہوئے گزر گئے اور ایک تلخ لہجے میں وہ کہنے لگا ——— وہ خود کو محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی، وہ محبت کرنا چاہتی ہے مگر کر نہیں سکتی، اس میں ہمت نہیں، وہ ڈرتی ہے کہ بات بڑھ جانے پہ کسی کو معلوم نہ ہو جائے ہم نہ محبت کر سکتے ہیں نہ عیاشی اور وہ محبت کرنا چاہتی ہے، سُنتے ہو، وہ محبت کرنا چاہتی ہے اور کر نہیں سکتی ———"

لیکن نرمندر نے شاید سُنا نہیں، کہنے لگا "لیکن کبھی کبھی کھڑکی کو بند دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اب بھی اُس سے محبت کرتا ہوں۔"

پرتھوی ناتھ شرما

سڑک

تھکا پیاسا، سوکھے ہونٹ، مرجھایا چہرہ۔ وہ چلتے چلتے ہار سا گیا۔ اُس کی دونوں پنڈلیاں درد کے مارے اکڑی جا رہی تھیں، وہ شیشم کے سایہ میں تھوڑی دیر کیلئے رُکا۔ زمین سے اُٹھی ہوئی جڑ پر بیٹھ گیا۔ ستنے کو گھٹنوں تک سرکایا اور دونوں ہاتھ سے پنڈلیوں کو دابنے لگا۔ ملا۔ سرا ہا لیکن درد ہر لحہ، ہر ساعت فزوں ہونے لگا۔ آٹھ دس میل صرف آج وہ اتنا ہی فاصلہ طے کر پایا تھا اور اس کی پنڈلیاں جواب دیتی معلوم ہوتی تھیں جب پنڈلیوں کو دبانے، مسلنے اور ملنے سے کچھ درد کی شدت میں کمی نہ ہوئی تو اُسے بہت غصہ آیا، وہ مٹھی بنا کر بے تحاشہ اُن تھکی ہوئی پنڈلیوں پر مارنے لگا۔ ایک، دو، تین نہ معلوم کتنی، لیکن پھر بھی پنڈلیاں تھکاوٹ کا احساس سنبھالے معلوم ہوتی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف بچھی پڑی تھی۔ پیلی پیلی ریت، اور کہیں کہیں کالی کالی مٹی کے ٹینس کے گیند کے برابر ڈھیلے، ہوا چلتی اور باریک ریت اُڑنے لگتی، بار بار مسافر نے اُن ریت کے باریک ذرات کو حملہ آور دیکھ کر اپنی آنکھ کو ڈھانپ ڈھانپ لیا، اور وہ ذرات اُس کی نیلی دھاری والی قمیص سے چپٹ چپٹ کر رہ جاتے یا کھلی ہوئی پنڈلیوں سے۔ پنڈلیوں کا درد، سڑک کی ویرانی اور تھکن سے مجبور ہو کر اُس نے اپنی مختصر سی پوٹلی کو کھولا، اور گاڑھے کی چادر بچھا کر لیٹ رہا۔ اُسے امید تھی کہ شاید نیند کی آغوش میں تھکن اور پنڈلیوں کا درد کافور ہو جائیں گے۔ نیند، اُس نے کئی دفعہ سونے کی کوشش کی ہے مگر نہ سو سکا سڑک کے کنارے شیشم کے سایوں میں لطیف ہوا چلتی ہے، امن اور آشتی کی سلطنت ہے، بار بار سونے کا ارادہ کر کے لیٹتا تھا مگر نہ سو سکا، اور آج پھر وہ اُسی تجربہ کو دُہرا رہا تھا۔ آنکھ جھپکی۔ بند ہوئی۔ لطافت، پاکیزگی، خواب اور میٹھے میٹھے خیالات، تمنائیں، آشائیں، اور زندگی کا غیر مرئی احساس بالکل لطیف احساس اور اُسے اُمید ہوئی کہ وہ ضرور سو سکیگا۔ آنکھ بند کئے لیٹا رہا۔ اُس نے کچھ قدموں کی چاپ سُنی، لیکن وہ ایکدم سُنائی دینی بند ہو گئی، بالکل ناممکن بات۔ راہگیر اتنی جلدی سڑک سے غائب تو نہ ہو جائیں گے۔ سونے کیلئے لیٹا تھا، پھر اُٹھ کھڑا ہوا، سایہ میں دو آدمی بیٹھے سستا رہے تھے۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی"

"کہیں نہیں۔ ذرا سستانے کیلئے بیٹھ گئے۔ تم سوتے سوتے کیوں اُٹھ بیٹھے۔ نیند نہیں آتی؟"

"یوں ہی۔ مجھے دن میں بالکل نیند نہیں آتی۔ کوشش البتہ ضرور کر لیتا ہوں۔ آس پاس میں کوئی سرائے ہو تو بتاؤ۔ دس بارہ میل کا سفر اور طے کرنا تھا۔۔۔۔۔ آٹھ دس میل پرے لاری مجھے چھوڑ گئی تھی، اس سڑک پر لاریاں نہیں چلتی، اس لئے سوچا چلو پیدل ہی چلا چلوں۔ بیس میل کا سفر۔"

"اِکا یا بیل گاڑی ہی کرایہ پہ لے لیتے؟"

"لے تو لیتا۔ مگر میں آج پیدل سفر کرنے کے ارادہ سے چلا تھا۔ بیس میل طے کرنے میں مشکل سے پانچ گھنٹہ لگتے ہیں، لیکن اب پاؤں جواب دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ بچپن میں تو خیر نہیں لیکن سکول کے زمانہ میں اپنے گاؤں سے روز چھ میل پرے پڑھنے جایا کرتا تھا اور واپس آتا تھا۔ پندرہ بیس میل کا سفر معمولی بات تھی۔۔۔"

نو واردوں نے تھوڑی دیر مسافر کی طرف دیکھا۔ ایک نے سر کھجایا، دوسرے نے ٹُٹیا ڈوری کی طرف دیکھا پھر اُن میں سے ایک بولا۔

"اس سڑک کے کنارے کنارے چلے جاؤ۔ ڈیڑھ کوس نہیں ایک کوس پرے ایک ٹوٹی پھوٹی سرائے ہے۔ بہت پُرانی سرائے ہے۔ اُس میں چلے جاؤ بھیا۔"

"اچھا۔" مسافر کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا۔ اپنی پوٹلی کو سنبھالا۔ اور چلنا شروع کر دیا۔ اُس کی پنڈلیاں شاید بغاوت کرتے کرتے تنگ آ چکی تھیں۔ لہذا مسافر اپنے آپ کو بہت ہلکا سا سمجھنے لگا۔ بالکل ہلکا۔ وہ تھکن سب کافور ہو چکی تھی۔ سرائے میں قیام کرنے کے بعد ہی سہی تھکن بھی اُتر جائیگی۔ سرائے والا لیگا ہی کیا۔ ایک وقت کھانے کی [illegible] ایک الگنی چارپائی کا کرایہ۔ اور ساری رات آرام سے کٹ جائے گی اور صبح وہ پھر اپنے سفر کی تیاری میں مشغول ہو جائیگا۔ اس کے سامنے سڑک، پختہ سڑک کا ایک کوس لمبا فاصلہ تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ پنڈلیاں اتنے سفر کو طے کر سکیں گی۔ دن [illegible] ہو گیا تھا۔ سڑک کے

دونوں طرف جوار باجرے کے کھیت تھے۔ جن کے اندر پکی ہوئی مٹھیاں
تھیں۔ باجرے کی چھ چھ انچ لمبی پکی ہوئی بالیاں اور پودے دن ڈھلتے
وقت چلنے والی مخمور ہوا میں جھونکے کھا رہے تھے۔ اور ذرا شدت کے
جھونکے کے چلنے سے لچک سے جاتے تھے۔ بالکل کسی نازک بدن دوشیزہ کی
لاغر کمر کی طرح۔ سایے بتدریج لمبے ہوئے جا رہے تھے اور دور زمین پر چھایا
ہوا نیلا آسمان رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ کچھ ہلکا سرخ یا پھر ارغوانی یا پھر ایسا
رنگ جو پیازی اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بن جایا کرتا ہے۔ اُس کی خواہش
ہوئی وہ آنے والی شفق کے سایہ میں پناہ لے کم از کم وہاں یہ سڑک، پہیلی
ریت، اور ریاضت، زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے مشقت کرنے کی ضرورت
پیش نہ آئے گی۔ اور اسی ریاضت کے پیچھے اُس کو یہ بیس میل سفر طے کرنا
تھا۔ اُسے سڑک کے بیچوں بیچ چلنے میں یک گونہ مسرت محسوس ہوئی، کیونکہ
سڑک کے بیچ میں سے وہ آنے والی شفق کی دلہن کے استقبال کی تیاریاں بخوبی
دیکھ سکتا تھا۔ پٹری پر درختوں کی آگے جھکی ہوئی ٹہنیاں اس کی حدِ نظر
کو کاٹتی معلوم پڑتی تھیں۔ لہٰذا وہ سڑک کے سہارے سہارے جھومتے ہوئے
شام کو بسیرا کرنے کے لئے اپنے گھونسلوں کو واپس ہونے والے
پرندوں کی موسیقی اور شفق کے انتظار میں گم ہو کر جھومتا سا مخمور قدم رکھنے لگا
۵۸ کیسے آسان قدم، وہ زندگی بھر اس طرح سڑک کے بیچوں بیچ چلے جائے گا۔
بے خوف و خطر کتنی سیدھی صاف، شفاف تھی وہ سڑک۔ اور مسافر کو نہایت
پسند تھی۔ آہستہ آہستہ ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت کے آثار نمایاں ہونے
لگے۔ ہو نہ ہو یہ وہی سرائے ہے۔ جہاں وہ آرام کرنے کیلئے ٹھیرے گا۔ اور اس
کے قدموں میں ایک دم تیزی آ گئی۔ وہ اُس شکستہ عمارت کے سامنے رُکا۔ سوچنے
لگا "کیا واقعی وہ سرائے کے سامنے کھڑا ہے۔ اجنبی کی جان کو سینکڑوں
جوکھیں۔"

"باجرے کے کھیتوں میں سے یکایک دو تین لڑکیاں ایک دیہاتی گیت
گاتی ہوئی نکلیں۔ اُن کے ہاتھوں میں باجرے کی بالیاں تھیں اور وہ اُن کو
بار بار نچا رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اُن باجرے کی بالیوں کو ایک دوسرے کے
گلابی رخساروں سے مس کر دیتیں۔ ایک چوٹ کھائی ہوئی لڑکی بلبلا اُٹھی۔
"اونہہ۔ بڑی آئی ہے بن کے۔ پرماتما کرے تجھے کسی موٹے کالے آدمی
کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ وہ تجھے بالکل ٹھیک کر دیگا۔"
"تو ایسی کونسی خوبصورت ہے۔ کیا چہرہ ہے۔ نخرے۔ چل اُتی دن بھر
تو کھیت میں مرتی ہے اور اب حور اور پری بنی جائے ہے......"
......" دانت نکالتے منہ مسکاتے دوسری لڑکی بولی۔
"بہنے دو بہنا۔ لڑتی کیوں ہو۔ اپنے اپنے بھاگ......" تیسری

ذرا سنجیدہ معلوم ہوتی تھی۔
مسافر نے اُن کی پُر لطف گفتگو کو سُنا۔ آگے بڑھا۔
"دیکھنا"
"کیا کہتے ہو مسافر"
"سرائے دیکھ رہا ہوں"
"تو کھڑا کہاں ہے۔ یہ دس پگ پرے سرائے ہے۔ اور کیا ہے"
پہلی نے دوسری کی طرف دیکھا، دوسری نے تیسری کی طرف اور پھر
تینوں ہنسنے لگیں۔ اور منہ میں اپنی اپنی اوڑھنی کے آنچل کو دبا کر انہوں
نے ہنسی کو بہت ضبط کیا مگر نہ کر سکیں۔ اور ایک نے دوسری اور دوسری
نے تیسری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بھاگنا شروع کر دیا۔ بے تحاشا، بے معنی
مسافر نے تعجب کی نگاہ سے دیکھا، اور پھر مسکرا اُٹھا لیکن لڑکیاں
بہت دور پہونچ چکی تھیں۔ جو اِس مسکراہٹ کا جواب دیتیں۔
آگے بڑھا۔ ٹوٹی پھوٹی مگر پکی عمارت کے دروازہ کو کھٹکھٹایا
اور پھر اُس عمارت کا معائنہ کرنے لگا۔ انیسوی صدی کی بنی ہوئی معلوم
ہوتی تھی۔
دروازہ کھلا۔ ایک سولہ سالہ لڑکی نے باہر جھانکا۔
مسافر سکتہ میں رہ گیا۔ معاملہ کیا ہے۔ وہ گھبرا کیوں رہا ہے
اُن لڑکیوں نے اس ہی عمارت کو تو سرائے بتایا تھا لیکن......
"کہاں چلے مسافر"
"کہیں نہیں۔ سرائے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کدھر ہے؟"
"یہی تو ہے۔ آؤ۔"
"اچھا" اس وقت اس کی پنڈلیاں پھر دوبارہ درد کرنے
لگی تھیں۔ وگرنہ وہ چاندنی رات میں ہی اپنے سفر کو جاری رکھتا۔ اُس نے
آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر لڑکی برابر دروازہ پر ڈٹی رہی۔
"آرہے ہو مسافر۔ یہ ہی سرائے ہے۔"
"اچھا آیا۔" ایک ایک قدم بھاری ہو رہا تھا۔ وہ چل نہیں رہا
تھا۔ بلکہ ایک قدم کے بعد دوسرے کو گھسیٹ رہا تھا۔ ان وزنی قدموں
کو کس طرح سنبھالے۔ خیر جوں توں کر کے دس بارہ قدم پورے کئے۔
"چلو مسافر"
"اس سرائے کی تم ہی مالک ہو۔" مسافر نے ہمت کر کے پوچھا
"اونہہ ہوں۔ میرا باپ اس سرائے کا مالک ہے۔ وہ اندر صحن
میں بیٹھا ہے۔ تم تھک گئے ہو مسافر"
"ہاں جب ہی تو میں سرائے میں آیا۔ نہیں تو اپنا سفر جاری

وہ اُس پرشباب شوخ و شنگ لڑکی کے ساتھ اندر گھستا چلا گیا'
کتنی خوبصورت' تمتماتے ہوئے رخسار' ٹیڑھی چتون' مسافر کو رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا کہ جنگل تو خیر نہیں مگر ویرانے میں بھی ایسا حُسن پھوٹتا ہے' پرورش پاتا ہے' اور کھلی ہوئی فضا میں ہوا اور مینہ کے طوفان' زندگی کی کش مکش کے باوجود اُس کی تروتازگی قائم رہتی ہے۔ وہ اُس حُسن سے کچھ مسحور ہو چلا تھا اور کھویا کھویا سا جا رہا تھا۔

"ابا! مسافر کو کونسی کوٹھری میں ٹھہراؤں۔"

بوڑھے نے ناریل کے حُقّے کو گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"ادھر تو مسافر۔ تم تھک گئے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ سرائے میں کمروں کی کمی نہیں۔ چنّی جا وہ سامنے والی کوٹھری ٹھیک کر دے۔"

"تمہاری سرائے میں مُسافر کبھی کبھی آتے ہیں نا۔ آج کوئی اور مُسافر نہیں ٹھہرا۔"

"بہت کم۔ پُرانی سرائے ہے۔ آجکل زمانہ میں لوگ سرائے میں کم ہی ٹھیرتے ہیں۔ مہینوں میں کبھی کوئی بھولا بھٹکا آجاتا ہے بزرگوں کی نشانی ہے۔ ویسے کھیتی باڑی کا کام کرتا ہوں۔"

"چنّی! چنّی!"

"ابا۔ ابھی آئی"

لڑکی اپنے باپ کے پاس آئی۔

"ابا کوٹھری ٹھیک کر دی"

"میں لیٹنا چاہتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔" اور بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مسافر سرائے کے بوڑھے مالک کے دُھندلے نقوش دیکھ رہا تھا اور یا ناریل کے حقہ کی گڑگڑاہٹ کو سُن رہا تھا۔

"کھانا کب کھاؤ گے"

"یہ ہی دو گھنٹہ کے بعد"

"اچھا"

لڑکی نے ہیچ لمبی ہتھیلی میں سرسوں کے تیل کا دیا سنبھالا۔ اور کوٹھری کی طرف بڑھی۔ تھکا ماندہ مسافر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکی نے کوٹھری کے آلے میں دیا رکھ دیا۔ مدھم روشنی پھیل گئی۔ مُسافر نے دیکھا کہ کوٹھری کی دیواریں پختہ ضرور ہیں مگر جگہ جگہ سے چونے نے کھسکنا شروع کر دیا ہے۔ کڑیوں میں مکڑیوں کے لاانتہا جالے اور ایک سوندھا سوندھا سا تعفّن۔ معلوم ہوتا تھا کہ مدت سے کوٹھری کو کھولا نہیں گیا۔
... دیے کے سایے میں بیٹھ رہی۔

"تم کہاں جاؤ گے مسافر"

"بارہ میل پرے' وہاں مجھے جا کر کچھ کام کرنا ہے۔ دو تین مہینہ کے بعد پھر اپنے وطن کو واپس چلا جاؤں گا۔"

مسافر کھاٹ پر لیٹ گیا۔ چنّی اُس دیئے کے سایہ میں بیٹھی رہی دیئے کی ہلکی پیلی روشنی میں چنّی کے رخسار سیب ایسی رنگت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ دُنبالہ دار آنکھیں' اور نازک کونپل ایسے ہونٹ۔ وہ اپنی پلکیں برابر جھپکے جا رہی تھی۔ مُسافر دزدیدہ نگاہوں سے اُس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ گدرایا ہوا حُسن' سادہ مگر پُر رُعب جو ہر انسان پر اپنا تسلط جما دے' خاموش بالکل خاموش چنّی بیٹھی بیٹھی تنکے سے کوٹھری کے فرش کو کریدنے لگی' اور اُس کی مرمریں کلائیاں' مُسافر کے دل میں کھبی جا رہی تھیں۔ مسافر کا دل نیچے اوپر ہونے لگا' کیوں نہ وہ زندگی بھر اس سرائے میں قیام کرے۔ جہاں چنّی ایسا زندگی کا اعلیٰ ترین نہیں خوبصورت ترین نمونہ پرورش پا رہا ہو۔ چنّی برابر نگاہ جھکائے تنکے سے کوٹھری کے فرش کو کریدے جا رہی تھی۔ اور اُس کی چوڑیاں' پاس والے گاؤں کے منھیار کے ہاں تیار کی ہوئی کانچ کی چوڑیاں آپس میں ٹکرا کر ایک نہایت لطیف مگر سُریلی موسیقی بیدا کر رہی تھیں۔ چنّی کی نگاہیں پتہ دیتی تھیں کہ وہ مسافر سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ مگر شاید اُس نے مُسافر کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر صرف ایک ہی سوال پر اکتفا کیا۔

"چنّی وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ مسافر کو آرام کر لینے دو۔ مسافر کو بھوکا مارنے کا ارادہ ہے کیا۔"

مُسافر کے پاس پوٹلی میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ مگر وہ سوچنے لگا کہ پھر کبھی کام آئے گا۔ کم از کم اِس بہانے چنّی پھر اُس کی کوٹھری میں آئیگی' چنّی کو دیکھنے کی تمنّا۔ معلوم کیوں اُس کے دماغ پر غلبہ پائے جا رہی تھی' اور شاید وہ اسی اُمید میں اُس کوٹھری میں لیٹا بھی رہا تھا۔ کیا مجال کوئی انسان وہاں ایک منٹ ٹھیر سکے۔ عجیب خوفبوسی کوٹھری کی فضا میں پھیلتی نظر آتی تھی۔ کچھ ابخرات جیسے اُٹھتے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس گھٹے گھٹے ماحول میں اُس نے سونا پسند کیا۔ اگر وہ چاہتا تو صحن میں اپنی کھاٹ بچھا کر سو رہتا۔ مگر کس طرح وہ اور چنّی سرائے کے مالک کی نگاہ سے بچ سکیں گے۔

گھنٹہ' دو گھنٹہ' نہ معلوم کتنے عرصہ تک مسافر سوتا رہا۔ کسی نے اُسے بُری طرح جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ وہ آنکھ ملتا ہوا اُٹھا۔ چنّی کھانا لئے کھڑی تھی۔

"اوہ! میں بہت تھک گیا تھا۔ اس لئے پڑ کر سو رہا۔ کھانا لائی ہو' رکھ دو۔"

مُسافر نے کھانا کھانا شروع کیا۔ چنّی دیئے کے سایے میں بیٹھ رہی

دو گھنٹے پہلے شگفتہ کلی اب کھلتی جا رہی تھی۔ چنتی کی جاذبیت لمحہ بلمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور دیے کی روشنی میں چنتی کے چہرے پر اندھیرے اور اُجالے کے تاثرات ایک عجیب حُسن کی تشکیل کرتے معلوم دیتے تھے، قدیم یونان کی کسی خوبصورت دیوی کے نقوش وہ اُس وقت قطعی ایک پری بن گئی تھی۔ ایک تالاب میں کھلا ہوا کنول جس کو جتنی دیر دیکھا جائے اتنی اُسکی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا جائے۔ ایک خوبصورت چیز کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا دیکھا جائے اتنی ہی اس کی آب و تاب بڑھے۔ مسافر نے سرائے کے دروازہ پر چنتی کو محض ایک لڑکی کے طور دیکھا۔ لیکن دروازہ والی وہ چنتی اب حسین سے حسین تر ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ دیئے کے سایہ میں کھڑی شرمائی، سمٹی سمٹائی، کچھ لجائی سی چنتی مسافر کے دل کے تاروں کو مضطرب کر رہی تھی۔ اور اُس کی نگاہ بار بار اُس حُسن ملیح کے جالے میں اٹک کر رہ جاتی۔

"مسافر! اور کچھ چاہئے"

"چاہئے کیا۔ سب کچھ موجود ہے یہاں چنتی۔ مجھے بہت آرام ہے یہاں۔ اور بھلا کس چیز کی ضرورت"

"ضرورت تو ہے۔ مگر......"

"مگر کیا؟"

"کچھ نہیں، مجھے سونے دو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ یہ دیا بجھاتی جانا!" مسافر نے کھاٹ پر پڑے پڑے اپنے آپ کو اینٹھا دیتے ہوئے کہا۔ اُسے چنتی کو دیکھتے دیکھتے نزاکت کا احساس ہونے لگا تھا، نازک چیز کو دیکھ کر نازک بننا ہی پڑتا ہے۔

چنتی چلی گئی۔ "ضرورت تو ہے"! مسافر سوچنے لگا۔ اُسے اور کس بات کی ضرورت ہے۔ کھاٹ ہے سونے کے لئے، مکان کا سایہ ہے۔ کھانا وہ کھا ہی چکا ہے۔ اور نیند وہ جلدی یا دیر میں اُس پر غلبہ پا جائیگی اُسے اطمینان ہے، اور وہ فراغت کے خوابوں میں جلد ڈوب جائیگا۔ لیکن اُس نے دیکھا کہ دیا متواتر جلے جا رہا ہے، اور چھوٹے چھوٹے پتنگے اُس پر بے شمار تعداد میں قربان ہو رہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے دیئے کے اتنے عاشق اور چنتی وہ بھی ایک دیا ہے۔ اور اس کے پروانے۔ جانے دو۔ بے مطلب باتوں کے چکر میں پڑنا فضول ہے۔ رات خاموش سے خاموش تر ہو چلی۔ صحن میں بیٹھے ہوئے سرائے کے مالک نے حقہ گڑگڑانا بند کر دیا۔ صرف کبھی کبھی بہت دور شاید اُن جوار اور باجرے کے کھیتوں سے پرے مجیرے کی مدھم مگر مست کن موسیقی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سنائی دے جاتی تھی۔ مسافر کو دیئے کے سایہ میں چنتی کی شبیہہ بنکر پھر ڈھلتی نظر آتی تھی۔ چنتی کے نقوش مسافر کی آنکھوں میں اس قدر منعکس ہو چلے تھے کہ دیئے کے سایہ میں اُس بیٹھی ہوئی چنتی اور اس کے دلکش چہرے کا احساس رہ رہ کر جاگ رہا تھا۔ اعضا درد کے مارے تڑپ رہے تھے۔ پنڈلیوں نے پھر درد کرنا شروع کر دیا۔ اور نیند، وہ جلد ہی مسافر کو اپنے مسکن کا باشندہ بنانا چاہتی تھی مسافر سویا، اور نہایت فراخدلی کے ساتھ، صبح جب بیدار ہوا تو مہرِ عالمتاب کافی نیفیلہ طے کر چکا تھا، مسافر کی معصوم نگاہیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ بالکل اس بات سے بے خبر ہے کہ چنتی رات کو دوبارہ مسافر کی کوٹھری میں آئی تھی اور چلی گئی تھی۔ شاید چنتی کے لئے مسافر میں کوئی کشش تھی۔

مسافر چارپائی کو چھوڑ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹھری کے دروازے پر چنتی نمودار ہوئی۔

"سو چکے مسافر۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ ذرا پہر ڈھلے سے پہلے منزل پر پہنچ جاؤں گا!"

"مسافر ایک دن تو اور ٹھہرتے۔ یہاں دیکھنے کیلئے بہت اچھی اچھی چیزیں ہیں" چنتی کی لس منس مسافر سے درخواست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

مسافر نے سوچا۔ اُسے جاتے ہی کام تھوڑے مل جائیگا۔ وہ تو وقت مقررہ سے دو تین دن پہلے سے چل دیا تھا تاکہ مالک خوش ہو جائے۔ سرائے کے آس پاس، سرائے کے اندر قابل دید چیزیں بہت زیادہ تعداد میں تھیں اس میں شبہ ہی کیا ہے۔ سب سے زیادہ قابل دید چیز تو اُس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ مسافر نے تھوڑی دیر سوچا۔ اور پھر

"اچھا کل چلے جائیں گے"

"تم بہت اچھے ہو مسافر" چنتی نے اپنے پتلے ہونٹوں کو نزاکت سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔

سڑک کی اُس سمت، سرائے کے گرد و نواح میں دن ڈھلنا شروع ہوا۔ مسافر سرائے کے مالک سے باتیں کرنے لگا۔ چنتی بار بار ادھر سے اُدھر پھرتی پھراتی مسافر کی نگاہ کے سامنے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرائے کا بوڑھا مالک بڑا باتونی واقع ہوا تھا۔ وہ معنی بے معنی گفتگو کئے جا رہا تھا۔ اور سامنے رکھے ہوئے تاریل کے حقہ میں کبھی کبھی کش بھی لگا لیتا۔ وہ کہتا تھا میری بیوی ایسی خوبصورت تھی، آس پاس کے دیہات میں اُس جیسی حسین عورت چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی نہ مل سکتی تھی لیکن اُسے مرے ہوئے بارہ سال ہو گئے۔ اور چنتی جب چار سال کی [illegible] مسافر ان باتوں

نہایت دلچسپی سے اور کان لگا کر سُن رہا تھا لیکن بوڑھا آدمی کسی کام کے لئے سرائے سے باہر نکلا اور گفتگو خاتمہ پر آئی۔

مسافر سرائے سے باہر نکلا۔ اور جوار باجرے کے کھیتوں کے سہارے سہارے چہل قدمی کرنے لگا۔ چنّی ایک باجرے کے کھیت میں سے نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں باجرے کی پکّی ہوئی دو بالیاں تھیں۔

"مسافر۔ یہ ہمارا ہی کھیت ہے۔ آگے چلو"

پکّی منڈیر تھی۔ اور آس پاس باجرے اور جوار کے کھیت، پانچ پانچ چھ چھ فٹ قد آدم پودوں نے اُس منڈیر کو کھیتوں کے سہارے سہارے چلنے والے راہگیروں کی نگاہوں سے چنّی اور مسافر کو اوجھل کر دیا۔ چنّی نے باجرے کی بالیوں کو اِدھر اُدھر لچکانا شروع کیا۔ اور پھر وہ اُس کچّی منڈیر پر بیٹھ رہی۔

"بیٹھ جاؤ مُسافر"

"اچھا"

"مسافر" چنّی نے ایک بالی سے دوسری بالی کو ٹکرایا۔ اور سر کا پلّہ نیچے آ رہا۔ چنّی نے سر ڈھانپنے کی کوشش بھی نہ کی۔

"مُسافر تم بہت اچھے ہو۔ دل چاہتا ہے کہ تم اسی سرائے میں ٹھیر جاؤ۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟ مُسافر تم کچھ نہیں سمجھتے۔ اتنے بڑے ہو چلے ......

اس ہوا کے چلنے سے میرے سر میں درد ہو جاتا ہے مُسافر"

ہوا میں برابر ہرے ہرے نازک پودے لہرا رہے تھے۔ اور مُسافر کے دیکھتے دیکھتے چنّی نے اپنے سر کو مسافر کے منڈیر کی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ جھکی ہوئی ٹانگوں پر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے چنّی"

"سر میں درد ہے۔ اُف" چنّی نے سر کو اوپر اٹھا لیا۔ اُس نے مسافر کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ مسافر کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک نمایاں طور سے نظر آ رہی تھی۔

سرائے کے بوڑھے مالک نے پکارا "چنّی او چنّی۔ کدھر گئی"

"آئی ابا۔ مُسافر تم آگے بڑھ کر اور کھیتوں کی سیر کر آؤ۔"

مسافر اُس منڈیر کے سہارے سہارے کھیتوں کی وسعت کو گھورنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر چنّی اُس سے کیا کہنا چاہتی تھی۔ خیر اس الجھن میں پڑنے سے کیا حاصل۔ اب کی بار وہ اُس سے ٹھیک طور سے دریافت کرے گا۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔

دوپہر کے وقت چنّی مسافر کی کوٹھری میں کھانا لائی۔ اور مُسافر کے سامنے رکھ کر بیٹھ رہی۔ اُسی رات والے آلہ کے عین نیچے۔

خواہ مخواہ اس مرتبہ بھی چنّی کا پلّہ سر سے نیچے آ رہا۔ اور مسافر نے دیکھا کہ اس کی باریک کرتی کے پیچھے چنّی کا سینہ نیچے سے اوپر ہو رہا ہے۔ چنّی پھر زمین پر تنکے سے بے معنی لکیریں کھینچنے میں مشغول ہو گئی۔

مُسافر تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگا۔ سرائے کی کوٹھری اُسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ چنّی اس قدر آگے بڑھ جائیگی۔

کھانا کھانے سے فراغت پا کر مُسافر سرائے کے مالک کے پاس گیا پیسے چکائے اور کوٹھری میں آ کر اپنا سامان درست کرنے لگا۔

چنّی پھر کسی بہانے کوٹھری میں نمودار ہوئی۔ اُس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ کرتی کے بٹن ڈھیلے پڑ چلے تھے۔ دھوتی کا پلّہ کوٹھری کے دروازے کے اندر گھستے ہی سر سے آ رہا تھا۔ وہ مسافر کے عین نزدیک جا کھڑی ہو گئی۔ مسافر کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ چنّی کے دل کی حرکت کی صدا تک کو سُن رہا ہے۔ اور خاموش بت کی طرح کھڑی ہوئی چنّی اُس سے پھر کچھ التجا کرنی چاہتی ہے۔

"مسافر" چنّی نے پوٹلی کو ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔ "آج کی رات اور ٹھیرو مُسافر" پوٹلی ہاتھ سے گر پڑی۔

اور مسافر نے دیکھا۔ کہ عین اُس کی نگاہ سے دو فٹ کی دُوری پر چنّی کا سینہ دھڑک رہا ہے۔ اور اُس کی گوری گوری کلائیاں مایوسی اور نا اُمیدی کی ایک کشمکش میں ہیں۔

"چلدئے مسافر۔ پھر کبھی اس سرائے میں آؤ گے"

"کیا پتا۔ اس دُنیا کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ آج کیا ہونے والا ہے، کل کیا ہوگا۔ اور مجھے تو اکثر یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کل کیا ہوا تھا اچھا اب ہم چلدے۔"

"مسافر تم جیسا بھولا آدمی اب تک اس سرائے میں نہیں آیا" چنّی نے کچھ غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

مسافر کے سامنے اب وہی پکّی سڑک تھی۔ بارہ میل کا سفر طے کرنا تھا۔ جتنے قدم آگے پڑتے تھے اتنے ہی قدم پیچھے سرائے بھاگی جا رہی تھی اور مسافر اُسے پیچھے چھوڑنا بھی چاہتا تھا۔ کبھی پٹری پر مٹی کے ڈھیلوں کو فٹ بال کے مانند لڑھکاتا، درختوں کی نیچے جھکی ہوئی ٹہنیوں کو توڑتا گیا۔ پتّھوں کو خواہ مخواہ اچھالتا اور دیکھتا وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ چھ میل کا سفر طے کرنے کے بعد پھر اُسے تھکن کا احساس۔ دم بدم کم ہمتی کی طرف

راغب کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا آیا وہ سستائے یا سفر کو جاری رکھے۔ جو بھی کیا ہے شیشم کے سایوں کی سڑک پر کمی نہیں۔ اور اپنی پوٹلی سے چادر نکالی۔ اور زمین پر بچھا کر پھر لیٹ رہا۔

ایک آدمی کے سر پر صافہ، پاؤں میں دھوڑی استرکا جوتا اور دوسرا ننگے سر، ننگے پیر، اُسی شیشم کے سائے میں آکر بیٹھ گئے۔

"کدھر جا رہے ہو جی؟"

"چھ میل پرے قصبہ میں جانا ہے۔ رات کو سرائے میں ٹھیر گیا تھا مگر سفر کی تھکن اب بھی نہیں اُتری۔"

سرائے کا نام سنتے ہی نو واردوں کے چہروں کی رنگت بدلی۔

"اُسی سرائے میں جہاں ایک بوڑھا آدمی رہتا ہے اور اُس کی خوبصورت لڑکی؟"

"ہاں ہاں!" مسافر اُن دونوں آدمیوں کی طرف زیادہ متوجہ ہو گیا۔

"لڑکی تو بہت خوبصورت ہے صاحب۔ مگر...."

"مگر کیا؟" مسافر نے حیرت سے پوچھا۔

"اجی اگلے سال وہ ایک مسافر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ بوڑھے کو پتہ لگا۔ اور اپنے واقف نمبردار کا گھوڑا لے وہ اپنی لڑکی کی تلاش میں نکلا۔ پاس والے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ دن نکلنے میں دو گھنٹہ کی دیر ہوگی۔" پھر متکلم اپنے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔ "اور پھر وہ چنی کو پکڑ کر لے آیا۔"

"اور مسافر کا کیا ہوا؟"

"اجی اُس کا کیا قصور۔ وہ کہنے لگا کہ چنی اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ آئی ہے۔ بوڑھے نے مسافر کو دو چار باتیں سُنا کر جانے دیا۔ بھیا جب اپنا پیسہ کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کا کیا قصور.... چنی سرائے کے سامنے ڈرتی سی آکر کھڑی ہو گئی۔ سرائے کے بوڑھے مالک نے سڑک پر شیشم کے درخت میں سے ایک بہت لچکیلی اور ہری ہری ڈنڈی کو توڑا۔ اور چنی کو اُس ٹہنی سے پیٹنا شروع کیا۔ سارا گاؤں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔"

"سرائے کے مالک نے اس کی شادی کیوں نہ کر دی؟"

مسافر کے اس سوال پر متکلم ہنسا۔

"بھیا شادی تو اس کی ہو چکی تھی مگر قسمت میں شادی کا سکھ بھوگنا بھی ہو.... بوڑھے سے لوگوں نے کہا دوسری شادی کر دے مگر وہ گردن ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ ہمارے خاندان میں بیوہ کی شادی کبھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا ہم چلے۔ قصبہ چھ میل پرے ہے نا؟"

"ہاں۔ اتنی ہی دور ہوگا۔"

چنی مسافر کے ساتھ بھی تو بھاگنا چاہتی تھی، نہیں اُس نے کبھی نہیں کہا۔ کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے چلے۔ مسافر کی خالی ہاتھ کی مٹھی غیر ارادی طور سے بھنچی سی جاتی تھی۔ اُسے سرائے کے بوڑھے مالک پر غصہ آ رہا تھا۔ اُسے چنی کی شادی کر دینی چاہئے ورنہ پھر کسی دوسرے مسافر کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کریگی۔ وہ مجبور تھا۔ اپنے گاؤں میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر چلا تھا۔ جب وہ کمائی کرکے اپنے گھر واپس لوٹے گا تو بچے اس کو دیکھ کر پھولے نہ سمائیں گے، اور اُس کی بیوی اُس کی طرف دیکھے گی تو وہ اُس سے کہدے گا کہ اُس نے اپنی بیوی کی امانت کو کسی کے حوالہ نہیں کیا۔ اگر کر دیتا تو اچھا تھا۔ خیر شام پھر سر پر آ رہی ہے سڑک بتدریج سایوں کے لپیٹ میں آکر اپنی چمک کو کھوئے دے رہی ہے وہ شفق کے نظارے کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس شوق نظارہ میں وہ پھر کبھی کسی سرائے میں گم نہ ہو جائے۔ وہ سوچنے لگا کہ سڑک کیوں اتنی خاموش رہتی ہے۔ یہ سڑک بھی عجیب ہے۔ اُس نے زندگی بھر ایسی سڑک نہیں دیکھی۔ چوبیس گھنٹہ متواتر مسلسل سوتی رہنے والی سڑک سرائے گیا، ۵ میل پرے رہ گئی، مسافر کو شام کے دھندلے میں قصبہ کی کچی عمارتوں کے کالے کالے مٹے مٹے نقوش دکھائی دینے لگے۔ چھوٹا قصبہ ہے۔ اُسے مطلوبہ جگہ کا پتہ لگانے میں کچھ دیر نہیں لگے گی۔

پچیس منٹ کے بعد وہ سڑک کے خاتمہ پر پہونچ گیا۔ دیہاتی نوجوان اپنی بیوی کے ساتھ قصبہ سے باہر نکلا۔ عورت نے ڈیڑھ کا گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ مسافر نے عورت کے سخت گورے ہاتھ کی طرف دیکھا جن میں سُرخ موٹی بھدی چوڑیاں کھنک رہی تھیں کہیں وہ نوجوان اُس عورت کو بھگا کر تو نہیں لیجا رہا؟

مسافر نے عجیب انداز سے گردن کو ہلایا، نہیں ایسا نہیں اور پھر سڑک کے عین خاتمہ پر پہونچکر مسافر نے بہت مدھم آواز اپنے آپ سے کہا۔

"کیا ہی اچھا ہو کہ چنی کسی مسافر کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب لیکن سڑک کے خاتمہ کے بعد قصبہ کی رتیلی اور بیرون تلے والی سڑک پر قدم رکھتے ہی، مسافر کے دماغ سے سرائے، چنی کے سائے اور شفق کے نظارے کا خیال محو ہوتا چلا گیا۔

رام پرتاپ بہادر ایم۔ اے

شام

چھٹی کا دن مجھے کچھ یوں بھی پسند نہیں، اور پھر آج تو صبح ہی سے جی کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ دوپہر کو جب پچھم سے ہوا دھول اُڑاتی ہوئی چلنے لگی تو میں ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اُس کے ساتھ میرا جی بھی اُڑ جائیگا۔ میں اس بات پہ غور کرنے لگا کہ بسنت کے موسم میں جس کی تعریف میں شاعروں نے الفاظ کے پُل باندھ دئے ہیں ایسی تیز ہوا کیوں چلتی ہے جو دل اور قلب دونوں کو ایک ساتھ چیر جاتی ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے میرے کمرے کی آمنے سامنے کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹوں میں سے سرسراتے ہوئے اور تیزی سے بجنے لگے، اور اس حالت میں بیٹھا بیٹھا میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بے رحم ہوا کے ساتھ میرے پھول جیسے دل کی پنکھڑیاں منتشر ہو کر ایک ایک کر کے اُڑ جائیں گی۔

سہ پہر کے بعد جیسے جیسے سورج پچھم کی جانب ڈھلنے لگا میرا دل بھی اس کے ساتھ ساتھ ڈوبنے لگا۔ شام ہوتے ہوتے میں اتنا بے چین ہو گیا کہ اپنے ہوا اور موسم کو دونوں کو کوس کر بھی تسکین نہ پا سکا۔ فضا پہ شام کی ہلکی ہلکی لکیریں دیکھ کر آتی ہوئی رات کا خیال آیا، اور پھر اس خیال سے کہ رات کی بے چین گھڑیاں کیسے کٹیں گی، میں بیقرار ہو گیا۔

کمرے سے باہر نکل کر کچھ دیر کھُلی چھت پر خالی الذہن ٹہلتا رہا لیکن جب وہاں بھی قلب کو سکون نہ ملا تو کمرے میں داخل ہوا اور ریڈیو چلا کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے خبریں آنے لگیں لیکن کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس خیال کے آتے ہی کہ دُنیا میں بھی کچھ نہیں ہو رہا ہے اور ہر جگہ ایسی ہی کیفیت ہے شام اپنے سیاہ پنکھوں کے نیچے میرا دل دبانے لگی۔ جب میری بے چینی قوتِ برداشت سے بڑھ گئی تو یوں ہی غیر ارادی طور پر میں مکان سے باہر نکل پڑا۔

باہر فٹ پاتھ پہ مکان کے سامنے ٹہلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سڑک کے دوسری طرف چوراہے کے پاس ایک آٹھ نو سال کا لڑکا ننگے بدن زمین پہ بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "بابو جی پیسہ"۔ بھیک مانگنے والے لڑکے کے ہنس مکھ چہرے [illegible]

فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ آیا یہ لڑکا مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ لیکن میں نے اُسے کبھی اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ پیٹ پھُلائے اپنی پتلی پتلی ٹانگیں سڑک کے کنارے کی دھول میں گاڑے ہوئے وہ خاک کی ڈھیر کے پاس بیخبر بیٹھا تھا۔ سامنے کچھ پھٹے پُرانے کپڑے اور چیتھڑے بھی پڑے تھے انہیں چیتھڑوں پر کچھ مونگ پھلیاں بھی پڑی تھیں۔ ناک اور مُنہ سے بہتے ہوئے نیٹے اور رال کو اُنہیں انگلیوں سے پونچھتا جاتا تھا جن سے مونگ پھلیاں چھیل رہا تھا۔ لگ بھگ اُسی کی عمر کے کئی لڑکے اُسے گھیرے کھڑے تھے جو اُسے چھیڑتے اور تنگ کرتے رہتے تھے۔

ٹہلتے ٹہلتے ایک بار پھر میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے اُسی طرح ہنستے ہوئے پیسہ مانگا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا، آخر اس بچہ میں کیا خرابی ہو سکتی ہے جو اس طرح سڑک پر بیٹھا بھیک مانگ رہا ہے اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تیز چمک تھی۔ بدن گورا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس گندگی کے ڈھیر پہ بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ میں پھر یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ آخر یہ لڑکا کیوں بھیک مانگ رہا ہے۔ اتنے میں ایک شریر لڑکے نے اُس بیچارے کے سر پہ ایک ٹیپ لگائی۔ بھیک مانگنے والا لڑکا رونے لگا۔ میری نظر اُس کی طرف گئی۔ اُس کی تیز چمکتی ہوئی آنکھیں آنسوؤں کی جھڑی کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہی مسکرا ئیں اور اُس نے ایک گندے چیتھڑے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اُسی برجستگی سے کہا۔ "بابو جی پیسہ"! کیا غضب کی شوخی اور شرارت تھی اُن آنکھوں میں! اُس کی طرف سے مُنہ پھیرتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ کیا اسے ابھی بھیک مانگنا نہیں آتا؟ لیکن ایسا ہونہار لڑکا بھیک ہی کیوں مانگے؟ جیسے مجھے کسی نے چپت مار کر بتایا۔ لیکن کیا بھیک مانگنے کے لئے بھی کسی خاص خارجی علامت کی ضرورت ہے! جب میں ان گتھیوں کو سُلجھا نہ سکا اور وہاں ٹہلتے ہوئے اُس کی طرف بار بار دیکھنا بھی ناقابل برداشت ہو گیا، تو فٹ پاتھ چھوڑ کر میں سڑک پہ چلنے لگا۔ جاتے جاتے ایک بار پھر میں نے اُس کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ مجھے [illegible] اُس نے اُسی طرح

اندازمیں تیز آواز سے چیسہ مانگا۔ اب میں اپنے قدموں کو روک دسکا اور اس سے جان بچاکر تیزی سے سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔ لیکن اب کی بار میں نے جو خاص بات اُس بچّہ میں دیکھی وہ اُس کے بدن کے نیچے کے حصہ میں ایک غیر معمولی قسم کی حرکت تھی۔ کمر سے نیچے کا حصّہ اس تیزی اور مقررہ طریقہ سے حرکت کر رہا تھا کہ مجھے شبہ ہوا کہ اُسے اندر ہی اندر جیسے کوئی خطرناک بیماری لاحق ہوگئی ہے۔

جب میں اپنے دوست کے مکان پر پہنچا تو وہ بھی کہیں جانے کے لئے تیار تھے، اُس کا نوکر تانگا لایا اور پھر ہم دونوں ساتھ ہی روانہ ہوئے معلوم نہیں ہم دونوں کہاں جا رہے تھے۔ میرے دوست نے تانگہ والے سے صرف یہی کہا کہ سیدھی سڑک سے چلو۔ رات ہو چلی تھی۔ لیکن اس شب کی تاریکی میں بھی اُس لڑکے کی مسکراتی ہوئی چمکدار آنکھیں اور چہرہ ایک منٹ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرف محلّوں میں سے ڈنکے کی آواز آ رہی تھی اور میں تانگہ پر چپ چاپ بیٹھا سوچ رہا تھا۔ محرّم ہے۔ اگر ڈنکے اور تاشے اتنے زور سے نہ پیٹے جائیں تو کیسے معلوم ہو کہ محرم کیا چیز ہے۔ بیچ شہر میں سے ہو کر میرا تانگہ گزر رہا تھا۔ بجلی کی روشنی ہوتے ہوئے بھی ہر طرف دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ آسمان کا سارا دھنواں اور دھول ہوا نہ چلنے کی وجہ سے نیچے اُتر آیا تھا۔ آنکھوں میں دھنواں بُری طرح بھرا جا رہا تھا۔ بار بار یہی خیال آتا کہ اس گھنی بستی میں رہنے والے کس طرح جیتے ہیں۔ کیا اس ہوا میں وہ خطرناک کیڑے نہیں موجود ہوں گے جو جیسا کہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے صحت کے واسطے مضر ثابت ہوتے ہیں؟ تو پھر اس گندی ہوا میں ملا ہوا دھواں اور دھول پھانک کر ان سڑکوں کے کنارے بسنے والے کس طرح جیتے ہیں!

یک بیک تانگہ چوراہے پر رُک گیا۔ تانگہ والے نے کہا "بابوجی تانگا آگے نہیں جا سکتا۔ اس طرف سے جلوس آنے والا ہے۔ بتائیے کہاں جانا ہے؟" میرے دوست نے جواب دیا "مفتی گنج" اُس نے وہیں سے تانگہ بائیں طرف کو موڑ لیا اور پھر اُسی تیز رفتار سے گھوڑا دوڑنے لگا۔ گھوڑے کے ساتھ میرے خیالات بھی دوڑنے لگے ——

کیا جلوس کے واسطے سڑک بند کر دینا ضروری ہے۔ رات کے وقت شہر کے بیچ سے جلوس نکالنے کی کیا ضرورت! ڈنکوں کی آواز سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اُنھیں مکانوں میں شاید کہیں کوئی بیمار ہوگا، کسی کے سر میں درد ہو رہا ہوگا، کوئی تپ دق میں مبتلا خون تھوکتا ہوگا اور کوئی اس دُنیا سے مُنہ موڑنے سے پہلے اپنی زندگی کا آخری پیغام ان ڈنکوں کی وجہ سے نہیں دے پا رہا ہوگا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہ ڈنکے!

میرا تانگہ دوسرے چوراہے پر پہنچ چکا تھا۔ تانگہ والے نے گھوڑے کی راس کھینچتے ہوئے کہا۔ "بابوجی ادھر سے بھی تانگہ نکالنا مشکل ہے۔ مفتی گنج میں کس طرف جانا ہے؟" میرے دوست نے جو تانگہ والے کی بغل ہی میں بیٹھے تھے کچھ کہا جو میں دھم دھڑا دھم کے شور و غل میں نہیں سُن سکا۔ میں اُس جلوس کو دیکھنے لگا تھا جو اس طرف سے گزر رہا تھا ایک کاغذ کے بنے ہوئے گھوڑے کو کالے رنگ کے کچھ مزدور اپنے کاندھوں پر لئے جا رہے تھے۔ اُس کے پیچھے سینکڑوں مختلف قسم کے عَلَم اور جھنڈے چل رہے تھے۔ سب سے پیچھے بہت سے جوان اور لونڈے ہاتھوں میں ڈنڈے اور لاٹھیاں لئے ایک دوسرے سے ٹھک ٹھک لڑاتے چل رہے تھے۔ میں یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ہندو مسلمان دنگوں کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ تانگے والے نے کہا "یہ لٹھیا سالا ہیں، دُلدُل کے ساتھ نکلے ہیں۔" میں سوچنے لگا —— "دُلدُل" حضرت علی کا نامی گھوڑا۔ اُس کی آج ایک کاغذی تصویر بنا کر اس دھوم دھام سے لئے جا رہے ہیں۔ تانگہ والے نے اپنے گھوڑے کو دو چابک مارے۔ گھوڑا تیز دوڑنے لگا۔ مجھے اپنے تانگہ کا گھوڑا زیادہ اصلی معلوم ہوا۔ ا

لامحدود اُمیدوں اور بڑے بڑے منصوبوں کی فضا میں میں پلا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے دُنیا کی ہر چیز پسند آتی ہے۔ اس کے برخلاف مجھے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کمی معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ میں فطرتاً رجائیت پسند رہا ہوں اس لئے دُنیا کی خرابیوں اور ناامیدیوں کے درمیان میری زندگی کا راستہ بند نہیں ہو جاتا۔ میں ہمیشہ اپنی دماغ دُنیا میں ہر چیز کی کمی کو دور کرتا رہتا ہوں۔ اور رکاوٹوں اور بندشوں کو توڑتا ہوا آگے بڑھنے کا طریق عمل ڈھونڈتا رہتا ہوں جس کسی میں مجھے کمی نظر آتی ہے اُسے فوراً دماغی طور پر توڑ مروڑ کر مستقبل میں اُس کی جو شکل ہوگی اُس کی بنا پر اُس کا نیا خاکہ بنا لیتا ہوں۔ لیکن اُس 'دلدل' علم' ڈنڈوں اور لاٹھیوں کو دیکھ کر اور اُن بے شمار ڈنکوں پر چوبوں کی چوٹیں سُن کر میری عقل کو جیسے لقوہ مار گیا۔ میرے سامنے یہ سوال کہ آیا ان سے بھی رہائی ہو سکتی ہے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا۔ کیا اپنے بدن کے کسی بیمار حصہ کی طرح ان کو بھی ہم آسانی سے بذریعہ آپریشن اپنے نظام سے الگ کر سکتے ہیں؟ لیکن کچھ سوچ نہ سکا۔ ڈنکے سوچنے نہیں دیتے تھے۔ صرف دُلدُل اُٹھانے والے وہ کالے کالے آدمی آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ یعنی سب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ شہر کے اُس حصہ میں سڑک کے کنارے روشنی بھی نہیں تھی۔ دوڑتا ہوا گھوڑا اچانک رُک گیا لیکن رُکتے رُکتے بھی گھوڑ۔

[illegible] کے سامنے تک دونوں پر سڑک پر [illegible]
[illegible] تانگہ رُک کر بولا۔ "[illegible] سے آگے تانگہ نہیں
جا سکتا۔ آگے سڑک کی مرمت ہو رہی ہے۔" مجبوراً ہم لوگوں کو
تانگہ پر سے اُترنا پڑا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ زندگی کے
ہر موڑ پر یہاں رُکاوٹ کیوں ہے۔ ہم دونوں تانگہ چھوڑ کر کچھ ہی دور
آگے بڑھے تھے کہ میرے سامنے دو عورتیں برقعہ پہنے آ گئیں۔ ایک
لمحہ کے لئے ہم لوگوں کے راستے ایک دوسرے سے رُک گئے۔ پھر
لمبی عورت میری بغل سے راستہ بنا کر آگے بڑھی۔ اس کے ساتھ کی
جوان لڑکی جو اپنے چہرے پر سے برقعہ ہٹائے ہوئے تھی میرے بالکل
سامنے آ گئی اور مجھے دیکھ کر ذرا ٹھٹکی اور مُسکرا کر میرے کندھے سے
کندھا رگڑتی ہوئی نکل گئی۔ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ اندھیری سڑک پر
قدم سنبھال کر رکھتے ہوئے میں مُسلسل اُسی کے بارے میں
سوچ رہا تھا۔ اُس کے چیچک سے داغی چہرے کا مُسکرانا اور اُس کی
ناک کی لمبی جھلنی کا اُس کے بُرقعہ سے ڈھکی ہوئی کمر کے ساتھ بَل
کھانا میں بھولا نہیں تھا۔ سڑک کے داہنی طرف ایک روشن برآمدے
کے سامنے بہت سے لڑکے خوشی میں شور و غل مچا رہے تھے۔ برآمدے
میں دیکھا ایک تعزیہ فرش پر رکھا تھا۔ اب جو اُس عورت کا خیال
آیا تو سوچا محرم ہے!

اوبڑ کھابڑ ناہموار سڑک پر چلتے چلتے میں نے اپنے دوست
سے پوچھا "کیوں بھائی کہاں تک چلنے کا ارادہ ہے؟" انھوں
نے ہنستے ہوئے جواب دیا "جہاں تم کہو" میں نے چُپ ہی رہنا
مناسب سمجھا۔ پھر انھوں نے ہی کہا "سوچا آج تمہیں شرما جی
کے وہاں لے چلوں" یوں تو میں شرما جی کے نام سے واقف
تھا لیکن اُن کا مکان کہاں ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اُن کی بیوی
کی تعریف میرے دوست نے اکثر مجھ سے کی تھی لیکن مجھے خود اُن
سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان کے بارے میں سوچ کر مجھے
ہمیشہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ کیسی حسینہ ہے جو لوگوں کو یہاں وہاں
سے کھینچ کر اپنے پاس بُلا لیتی ہے۔ لیکن اُس سے بھی زیادہ اُس کے
مبارک شوہر [illegible] شرما جی سے ملنے کی تمنا تھی۔ یہ اپنی آنکھوں سے
دیکھنا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ عجیب و غریب روزگار کرتے ہیں۔

میرے دوست نہایت ہی خوش مزاج آدمی ہیں۔ اور پھر ایسے
موقع پہ اُن [illegible] انگریزی کے [illegible] زبان ایسے
موقعوں پہ [illegible] سے

ایسے موضوع پہ وہ پہاڑی زبان میں باتیں کر سکتے ہیں! اور ایسے موقعوں
پر انھیں [illegible] ہنسانے والی کہانیاں اور روایتیں یاد آنے لگتی ہیں۔
وہ اُس اندھیری سڑک پر قصّے سُناتے اور ہنستے ہنساتے چلے جا رہے
تھے۔ میں ان کی بغل میں خاموش گونگوں کی طرح قدم سے قدم
ملائے چلا جا رہا تھا۔ ظاہری طور پر اُن کی باتیں سُن کر ہاں میں ہاں
ملاتا جاتا۔ لیکن خود میرے دماغ میں مختلف خیالوں کا ایک میلہ لگا
ہوا تھا۔ کبھی اُس لڑکے کا ہنس مکھ چہرہ اور کبھی اس کی چمکتی آنکھیں
بھیک مانگتی نظر آتیں۔ کبھی اُن ڈھولکوں اور جلوسوں سے میرے
خیالات کا بہاؤ رُک جاتا۔ پھر اُس خاموش اندھیری بستی کی طرف بھی
میرا خیال جاتا جس میں سے ہو کر ہم لوگ گزر رہے تھے۔ لیکن اُس وقت
شرما جی ہی مجھے زیادہ آ رہے تھے۔ میں یہی بار بار سوچتا کہ شرما جی کو
کیسے دیکھ سکوں گا۔

میرے دوست نے چلتے چلتے کہا "اب ذرا دھیرے دھیرے چلو
اُن کا مکان نزدیک ہے۔" ایک دم میرے قدم رُک گئے۔ پھر وہ
ایک طرف گلی میں مڑ گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے میں بھی ہو لیا۔ پتھر کی
اندھیری گلی میں وہ اپنی ایڑیاں اُٹھا کر آہستہ آہستہ چل رہے تھے
میں نے بھی اُن کی نقل کی۔ بائیں طرف وہ اونچا پختہ مکان کھڑا تھا۔
جس کی اونچائی اندھیرے دھندلے آسمان میں کھوئی جاتی تھی
بائیں طرف کے پست قامت کچے مکان کی کھپریل میں ہاتھ اُٹھا کر
چھو سکتا تھا۔ بیچ میں تنگ اندھیری پتھر کی گلی تھی جو اُن دو دُنیاؤں
کو الگ کرتی تھی۔ ایک دُنیا وہ تھی جس کی ہزاروں روپیہ کی اونچی
عالیشان عمارت کے ایک دس روپیہ کے کرایہ کے حصہ میں شرما جی اپنی
منکوحہ کے ساتھ رہتے تھے۔ دوسری دُنیا اُن کچی دیواروں کے مکان
کی تھی جس کی نامعلوم گرہستی سرِ شام ہی سے چراغ گُل کر کے سو گئی
تھی۔ ایک دُنیا میں متوسط طبقہ کی آتمائیں اُس پتھریلی سرمایہ داری
کی چار دیواری کے درمیان پِل کر اُوپر اُٹھنے کی کوشش میں مصروف
تھیں۔ اور دوسری طرف کچے مکان میں درمیانی طبقہ کے رہنے والے
نیچے اُتر کر بھوکوں اور مظلوموں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے
جا رہے تھے۔

گلی میں پہلا دروازہ ملا [illegible] ہم لوگ آگے بڑھ گئے
دوسرے دروازہ پر میرے دوست ٹھہرے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا
لیکن [illegible] سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
اس سے [illegible] میرے دوست

مجھے پیچھے آنے کی ہدایت کر کے خود اندر داخل ہوئے اور وہ چار سیڑھیاں اوپر چڑھ کر ایک اجنبی کی طرح پکارنے لگے۔ کچھ دیر بعد جواب میں اوپر سے آواز آئی اور کہیں پر دروازہ بھی کھلا۔ اپنے دوست کو اوپر چڑھتے دیکھ کر میں بھی پیروں سے سیڑھیاں ٹٹولتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ زینہ کے اوپر موڑ پر سے کوئی لالٹین دکھا کر ہم لوگوں کا تاریک راستہ روشن کر رہا تھا۔ میرے دوست تو چونکہ اس تاریک زینہ سے مانوس تھے اس لئے انہیں کچھ ایسی دقت پیش نہ آئی۔ رہا میں سو میرے لئے اس لالٹین کی روشنی بھی کافی ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ میرے اور اس کے درمیان میرے دوست کا سایہ حائل تھا۔ خیر ساری دشواریوں کا سامنا کرتا ہوا جب میں اوپر زینہ کے آخری موڑ پر پہنچا اور میری نظر اس چھوٹے کمرے میں پڑی جسے ڈیوڑھی بھی کہہ سکتے تھے۔ تو دروازہ کے ایک بے کھلے پٹ سے لگتی ہوئی مجھے جو پہلی چیز نظر آئی وہ کسی شخص کی کسی قدر غیر معمولی توند تھی۔ اس عجیب و غریب چیز کو اپنا استقبال کرتے دیکھ کر مجھے بے تحاشہ ہنسی آئی جسے میں نے جیب سے رومال نکال کر بمشکل تمام روکا۔ اس تنگ نے سے مستطیل کمرے میں پہونچکر میرے دوست نے شرما جی سے میرا تعارف کرایا۔ میرے ہنسنے کا جذبہ چونکہ مجھ پر اب بھی غالب تھا اس لئے میں نے تو اپنی اور شاید شرما جی کی بھی آبرو رکھنے کیلئے کچھ بولنا چالنا غیر مناسب سمجھ کر خاموش بیٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ ان دو دوستوں اور خاص کر اس قسم کے دوستوں کی دیرینہ ملاقات کے باوجود ملنے پر آپس میں کوئی سرگرمی نہیں پیدا ہوئی۔

میرے دوست نے پہلے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑیں لیکن میرے واسطے جو بات باعثِ پریشانی تھی وہ یہ کہ ہر بات کچھ آگے جاکر لڑکھڑانے لگتی تھی۔ میں اپنی ہنسی اور قلبی پریشانی دونوں کو چھپانے کے لئے شرما جی کی طرف دیکھ کر بقیہ ہر چیز پر نظریں دوڑانے لگا۔ چاروں طرف دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں۔ پہلے میری نظر پڑی گاندھی جی پر۔ ایک کیلنڈر کی تصویر میں وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ماتھے پر تلک لگائے اپنی بوڑھی آنکھوں سے مسکرا رہے تھے۔ ننگے بدن کی ایک ایک ہڈی گنکر مجھے غصہ آنے لگا آخر ان کی یہاں کیا ضرورت تھی؟ دوسری طرف دیکھا تو اس ملک کا سب سے زیادہ خود دار آدمی نظر آیا — جواہر لعل! اُس تصویر میں وہ کھڑے ایک خفیف خود پسندانہ ہنسی ہنس رہے تھے۔ مجھے اور بھی زیادہ جھنجھلاہٹ ہوئی۔ آخر یہاں ہر شخص کو ہنسنے کا کیا مذاق

سوجھا ہے۔ بائیں طرف نظر گئی تو ایک تصویر میں لیلا [illegible] ناچتی ہوئی فقیرانہ انداز میں زمین پر لہنگا پھیلا کر اکڑوں بیٹھی ہوئی بل فرش پر بیٹھ گئی تھیں۔ اور خلا میں اُن کی خوبصورت سڈول ہاتھ کی انگلیوں میں رقص کی موسیقی متحرک رہی تھی۔ مجھے ذرا تسکین ہوئی — ہاں، یہ ایک چیز کسی قدر اپنی جگہ پر ہے!

اس اثنا میں میرے دوست شرما جی کو ہر طرح کی باتوں سے ٹٹول چکے تھے۔ پھر انہوں نے مصلحتاً اُس بڈھے کالے آدمی کے بارے میں انگریزی میں دریافت کیا جو تخت پر بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا نوکر ہے پھر میرے دوست نے روزگار وغیرہ کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اب تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ اندر ہی اندر دم گھٹا جا رہا تھا میں نے اختلاج کے حملہ کو دبانے کے لئے سگریٹ جلا کر جلدی جلدی دھوئیں کا ایک بادل اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا لیکن اس دوران میں یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ روزگار سے میرے دوست کا مطلب السّعد (؟) تھا جو شرما جی کا اصلی پیشہ تھا۔ شرما جی نے منکسرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "معاف کیجئے گا اس وقت میرے پاس صرف بیڑی ہے۔" اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے میں نے انہیں ڈھارس بندھائی۔ "کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن وہ رکے نہیں۔" پہلے میں بھی سگریٹ ہی پیتا تھا لیکن بیڑی مجھے زیادہ پسند ہے۔" میرے دل نے بات جلدی دکھی —" ظاہر ہے سگریٹ پینا خود ہی کبھی کبھی بیڑی پینے کی تمہید ہوتی ہے۔" موقع پاکر میرے دوست نے اشارے میں شرما جی سے کچھ دریافت کیا۔ جواب میں شرما جی نے معافی چاہی اور مجبوری کا اظہار کیا۔

کچھ اور دیر ہم لوگ وہاں بیٹھے رہے۔ میرے دوست ایک عجب دماغی تردد میں پھنسے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ وہاں اُس حالت میں ہم لوگوں کی بُری گت بن رہی تھی۔ مجھے مخاطب کر کے انہوں نے کہا۔ "تو چلو بھائی کسی اور دن فرصت سے آئیں گے۔" وہ بات یوں ہی مصنوعی طریقہ پر کہی گئی تھی یا اس کے پیچھے کوئی مصلحت تھی۔ یہ سوچنے کے لئے میرے پاس وقت نہ تھا۔ میں جھٹ اُٹھا اور شرما جی سے مناسب طریقے سے الوداع کہے بغیر تیزی کے ساتھ زینہ سے اُترنے لگا۔ نیچے پہونچکر میں نے سانس لی۔ میرے دوست مجھ سے دو منٹ بعد آئے۔ ہم لوگ وہاں سے روانہ ہی ہو رہے تھے کہ اسی وقت دو حضرات زینہ کے باہر دروازہ پر آ پہونچے [illegible]

[illegible] جواب دیا۔ شرما جی بھی [illegible]
جب [illegible] تو میں نے اپنے دوست سے پوچھا "کیوں بھائی یہ کیا بات ہے؟" انھوں نے دبی ہوئی زبان میں جواب دیا "شرما جی نے بہت معافی مانگی ہے۔ اب انھوں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔" سامنے وہ حضرات سونی خاموش لمبی گلی میں قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ پتھر کی تنگ گلی میں اوپر سے آنے والی دھیمی روشنی میں ان کی سفید گاندھی ٹوپیاں چمکتی دیکھ کر مجھے بےحد ہنسی آ رہی تھی۔ شالوں اور چشموں سے آراستہ وہ لوگ دیکھنے میں کانگریسی معلوم ہو رہے تھے۔ جناب شرما جی نے اپنا خیال بدل دیا تھا اور یہ لوگ ایسے لگ رہے تھے جیسے "وزارت" سے استعفیٰ دیکر واپس لوٹ رہے ہوں۔ اوپر سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی اس کی طرف میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر دُمدار ستارہ چمک رہا تھا۔ میں ایک دم کانپ اٹھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ہم لوگ چپ چاپ پیدل ہی لوٹ رہے تھے جیسے لڑائی پر سے ہارے ہوئے سپاہی۔ میرے دوست تو حقیقت میں ہار ہی نہیں بلکہ زخمی ہو کر لوٹے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اب میں آگے آگے تھا اور وہ میرے پیچھے۔ داہنے ہاتھ اونچے بند پر ریل گاڑی بہت تیزی سے گزر رہی تھی۔ اندھیری دھنواں جیسی رات میں ٹرین کے روشن ڈبوں میں مسافر بھرے ہوئے تھے۔ فضا میں انجن اور ڈبوں نے ایک عجیب ہنگامہ اور شور برپا کر رکھا تھا۔ گاڑی میں مسافروں کا ہجوم دیکھ کر مجھے پھر درمیانی طبقہ کا خیال آیا اور اُسی کے ساتھ شرما جی کا خیال آیا۔ آخر شرما جی ایسا کرتے ہی کیوں تھے؟ تو کیا سچ مچ انھوں نے وہ گھریلو دوا کا بند کر دیا۔ میرے دوست نے کہا "ہرگز نہیں۔" شاید کوئی اور موٹی اور مستقل آسامی مل گئی ہے۔ میں سوچنے لگا۔ آخر اس کا فرائڈ کیا جواب دیتا ہے لیکن پھر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تو اقتصادیات کا مسئلہ ہے۔ ٹھیک ہی تو کسی نے کہا تھا کہ طبقاتی کشمکش میں متوسط طبقہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ ٹھیک یہی اس وقت ان دونوں بچے دیکھ کر مکانوں پر ہو رہا تھا۔ [illegible] زمانہ کے ساتھ اس کشمکش میں پڑ کر دونوں کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک رہی تھی لیکن یہاں ان میں سے ایک نے [illegible] ہاتھ سے [illegible] تیزی سے [illegible] جا رہا تھا۔ [illegible] آخری کوشش [illegible] تھا۔ اور [illegible]

جھتی کہ ایسی گندی اور بدصورت فضا میں خواہ مخواہ ایسے مشکل مسئلے کیوں دماغ میں چڑھے جاتے ہیں۔ پھر مجھے اُس آدمی کے سر، داڑھی اور مونچھوں کے لمبے اُلجھے اور بگڑے ہوئے بالوں کو سوچکر ہنسی آنے لگی جو میرے دماغ میں اس ساری خرافات کا ذمہ دار ہے۔ کچھ دور چل کر پھر ہم لوگ سڑک سے بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹے سے تاریک مکان میں گھس گئے۔

میں اندھیری کوٹھڑی میں کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ اندر آنگن میں جاکر میرے دوست نے بڑھیا سے باتیں کیں پھر آکر مجھے بھی بلا کر لے گئے۔ ہم دونوں کو بڑھیا نے ایک کمرے میں جہاں لالٹین کھڑکی پر رکھی جل رہی تھی لیجا کر بٹھا دیا اور بڑھیا خود کہیں باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اُس چھوٹے سے کمرہ میں دھوئیں کی کثرت سے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ جب سے ہم دونوں وہاں آکر بیٹھے تھے سگریٹ ہی پیتے رہے تھے۔ کمرے کی پوری فضا ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی میں دھنواں دھنواں ہو رہی تھی اور ہم دونوں اس میں دو بےجان چیزوں کی طرح بیٹھے تھے۔

کچھ دیر بعد بڑھیا لوٹ آئی۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گئی۔ مجھ سے ایک چارپائی پر بیٹھنے کو کہہ کر اُس نے باہر سے دروازے بند کر دئے۔ میں خاموش چارپائی پر بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں سے دل کی تیز دھڑکن کو کم کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں آہستہ سے دروازہ کا ایک پٹ کھلا۔ ایک چھوٹے قد اور گٹھیلے بدن کی تندرست لڑکی کمرے میں داخل ہو گئی۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں چونکہ میری آنکھیں جھک گئیں اس لئے میں اُسے دیکھ نہ سکا۔ وہ میری چارپائی کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ طاق پر رکھی ہوئی ڈھبری اُس کی پیٹھ کی طرف پڑ رہی تھی اس لئے اس کا لمبا چوڑا سایہ میرے اور کمرے پر چھا گیا۔ کمرے میں جو بری سی روشنی تھی وہ اس گندے دھندلے ماحول میں کھو چکی تھی۔ سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے سے دھوئیں کا آخری کش کھینچ کر اُسے ایک طرف پھینکتے ہوئے لڑکی کا آنچل پکڑ کر میں نے اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ اس سے قبل کہ میں اُسے اپنی گود میں بٹھاتا اُس نے شرم سے اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کر لیں۔ میں نے پیار سے اُس کے ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹا دئے۔ چراغ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی میں نے اسے دیکھا، اُس نے مجھے دیکھا۔ دونوں میں کس نے کس کو پہلے دیکھا معلوم نہیں۔ اُس کے اُن سِلے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی

اور وہ بجلی کی طرح اچھل کر میری گود سے نکل کر کمرے کے باہر چلی گئی تھی۔ اس کا چیخنا میرے دل اور کانوں کو ایک ساتھ چیر کر نکل گیا۔

میں تیزی سے کمرے سے نکلا۔ آنگن، ڈیوڑھی اور گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آ نکلا۔ سڑک پر کچھ دور دوڑتا تو کچھ دور چلتا تھا۔ لیکن لگا تار بغیر کچھ سوچے سمجھے چلتا ہی جاتا تھا۔ سوچنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ لیکن بدستور چلتا جاتا تھا۔

میرے بالکل پیچھے آکر تانگا رُکا۔ گھوڑے کی ناک کی گرم سانس پیچھے میرے گلے سے مس ہوئی۔ میرے دوست تانگے سے اتر کر میرے پاس آ چکے تھے۔ میرا کندھا پکڑ کر مجھے جنبش دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "کیوں، کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ آخر ہوا کیا؟ میرا انتظار تو کرتے۔ چلو، چلو تانگے پر بیٹھو!"

میں تانگے پر پیچھے کی طرف بیٹھا ہوا تھا اور وہ سامنے بیٹھے تھے۔ رات کافی جا چکی تھی، تیز ٹھنڈی ہوا میرے دھیرے مجھے جگا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے خیالوں کا سلسلہ پھر جاری ہوا۔ شکنتلا آج یہاں؟ اِس حالت میں؟؟ .... میں اس سے کبھی محبت کرتا تھا۔ اُس کے واسطے دیوانہ تھا۔ اُس کی شادی ہو گئی، اُسی نے مجھے لکھا تھا۔ "زندگی میں میرے اور تمہارے راستے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب ہم لوگوں کو مختلف سمتوں میں ...... چلنا ہے!" آج پھر راستے مل گئے کیوں؟ اور یہاں ...... یہاں اس خرابے میں!

تانگہ ٹھیک میرے مکان کے سامنے رُکا۔ تانگے سے اُترتے ہوئے میں نے چوراہے کے اُس طرف دیکھا۔ جہاں شام کو لڑکا سڑک کے کنارے بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھسک کر چیتھڑے اپنی گود میں سمیٹے بجلی کے کھمبے کے نیچے سو گیا تھا۔ اُس نے مجھے اب کی بار دیکھ کر پیسہ نہیں مانگا۔ لیکن اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ چیتھڑوں کی گندگی میں سگریٹ کی ڈبیہ اور پتّی اکٹھا کر کے سماج کے گھور پر پل کر پہنچنے والی انسانیت کا ایک دوسرا نمائندہ بجلی کے کھمبے کے نیچے آکر بیٹھ گیا تھا۔ بچے اور بوڑھے دونوں کندھے سے کندھا ملائے بجلی کے کھمبے سے لگ کر سو گئے تھے۔ اُن کے سروں پر بجلی کی روشنی سے مر کر گرنے والے پروانوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ بجلی اوپر جل رہی تھی۔ لیکن چراغ تلے اندھیرا تھا۔ تمام رات میں کھو گئی تھی۔ دُنیا سوئی ہوئی تھی۔ صرف ایک اُلّو بجلی کے کھمبے پر بیٹھا چیخ رہا تھا۔ !!

(صفحہ ۲۷ سے آگے)

اور وہ گیت بھی صادق نکلتا جنھیں وہ گایا کرتا تھا ــــ

جوانی تو برباد ہو ہی گئی ہے
مگر عمر کے خواب باقی ہیں اَب بھی
ابھی تو بہت دور ہے ایسی منزل
جہاں ٹھیر جائے گا، رومان کا پہیا!

اور اسی کشمکش و پیچ میں اس نے پھر اپنے آپ سے سوالات کرنے شروع کیے۔ "یہ کیونکر ہو سکتا ہے، وہ ایک دیہاتی پادری کا لڑکا جس کی آزاد خیالی کے ساتھ پرورش ہوئی ہو ایک سیدھا سادھا اکھڑ اور بیباک آدمی ایک چھوٹی، آوارہ اور ذلیل مخلوق کے پنجہ میں پھنس کر رہ گیا، جو اس سے اتنی مختلف ہے، اتنی مختلف!"

جب گیارہ بجے کے قریب وہ کپڑے پہن کر ہسپتال جانے لگا تو نوکر آیا۔

"کیا ہے؟" اس نے کہا۔

"سرکار بیگم کہہ رہی ہیں کہ آپ نے جو ۲۰ روپے کا وعدہ کیا تھا وہ دیدیجئے!"

چیخوف

مسعود زاہدی

بیگم

"میں نے تم سے کتنی بار کہا کہ میری میز صاف مت کیا کرو۔"
نکولی نے کہا۔

"جب بھی تم میز صاف کرتی ہو تو چیزیں اس طرح رکھ دیتی ہو کہ وقت پر نہیں ملتیں، وہ تار کہاں ہے؟ کہاں پھینک دیا اُسے؟ ڈھونڈو خدا کے لئے ڈھونڈو اُسے۔ قازان سے آیا ہوا ہے وہ اور کل کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔"

نوکرانی ـــــ ایک پتلی دُبلی زرد رُو اور بے نیاز سی لڑکی اس نے نیچے ٹوکری میں پڑے ہوئے تمام تار اکٹھے کر دئے۔ اور بغیر کچھ کہے سُنے ڈاکٹر کے ہاتھ میں دے دئے لیکن یہ تمام تار مریضوں کے تھے۔ تب اُس نے ڈرائنگ روم اور اولگا کے کمرے میں بھی تلاش کیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ نکولی جانتا تھا کہ اسکی بیوی جلد واپس لوٹنے والی نہیں۔ کم از کم صبح کے پانچ بجے سے پہلے تو نہیں لوٹے گی۔ بیوی پر سے اس کا اعتبار اُٹھ گیا تھا، اور جب وہ بہت دیر تک باہر رہتی تھی تو وہ سو بھی نہیں سکتا تھا۔ پریشان ہو جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس سے نفرت بھی کرتا تھا۔

اسے اس کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی تھی، اس کے بستر، اس کے آئینہ، مٹھائیوں کی پیٹیاں اس کی خوشبو کی شیشیاں، یہاں تک کہ ان نیلوفر کے پھولوں سے بھی جو اسے ہر روز کوئی نہ کوئی بھیجتا رہتا تھا۔ اور میلی کچیلی، دکان کی بیمار سی خوشبو سارے کمروں میں پھیلا دیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ زود رنج، بد مزاج، چڑچڑا اور زود احساس ہو جایا کرتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس وقت اس تار کا ملنا بہت ضروری ہے، اشد ضروری۔ اگرچہ اس میں اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا کہ وہ اس کے بھائی نے بھیجا تھا۔ اور کرسمس کی مبارکباد دی تھی۔

[illegible] میز کے نیچے سٹیشنری کے صندوق سے ڈھکا ہوا اُسے ایک تار ملا۔ اس نے اسے ایک اچٹتی سی نظر سے دیکھا۔ یہ تار اس کی خوشدامن کی معرفت اس کی بیوی کے نام تھا مانٹی کارلو کا پتہ تھا۔ اور نیچے مائیکل کے دستخط تھے۔ ڈاکٹر اس کا ایک نقطہ بھی نہ سمجھ سکا۔ یہ کسی غیر زبان میں تھا غالباً انگریزی میں۔

"یہ مائیکل کون ہے؟ مانٹی کارلو سے؟ اور پھر اس کی خوشدامن کی معرفت کیوں؟"

شادی کے بعد کی سات سالہ زندگی میں وہ کافی شکی ہو گیا تھا۔ چیزوں کو کرید کرید کر ان کی تہ میں پہنچنا اس کی عادت ہو گئی تھی اور اس دوران میں اسے کئی بار اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ اس شک نے اسے بہت اچھا سراغرساں بنا دیا ہے وہ اٹھ کر اپنے مطالعے کے کمرے میں گیا اور سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے گزشتہ واقعات اس کے ذہن میں اُجاگر ہو گئے!

تقریباً آج سے ڈیڑھ سال پہلے وہ اپنی بیوی کے ساتھ پیٹرزبرگ گیا تھا اور وہاں اپنے ایک پرانے سکول کے ساتھی کے پاس ٹھہرا تھا جو سول انجینئر تھا۔ واقعات اس کے ذہن میں صاف ہو گئے ـــ اسی انجینئر نے اسے اور اس کی بیوی کو ایک اور شخص سے متعارف کرایا تھا جس کی عمر کوئی بائیس تئیس کے لگ بھگ تھی، اور اس کا نام ماہیکل یا مائیکل کچھ ایسا ہی تھا لیکن لوگ اسے یونہی ایک عجیب طریقہ پر مرس کہنے لگے تھے۔

دو ہفتہ بعد ڈاکٹر نے اپنی بیوی کی تصویروں کے البم میں اس شخص کی تصویر دیکھی جس پر فرانسیسی میں لکھا ہوا تھا۔
"حال کی یاد اور مستقبل کی اُمید میں۔"

اس کے بعد پھر اس کی ملاقات اس شخص سے اپنے خسر [illegible] کے یہاں ہوئی تھی۔ اور اسی وقت سے اس کی بیوی باقاعدہ گھر سے غائب رہنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اور بعض بعض مرتبہ تو رات بھر غائب رہتی تھی اس کے بعد ہی سے وہ باہر جانے کے لئے [illegible]

کی ... کرنے لگی تھی جسے وہ ابھی تک برابر انکار کرتا چلا آیا تھا
جس کی وجہ سے گھر میں ایک اچھی خاصی جنگ شروع ہو گئی تھی، اس
حد تک کہ وہ نوکروں کے سامنے آتا ہوا بھی شرماتا تھا۔

چھ مہینہ سے اس کے ساتھی اسے برابر مشورہ دے رہے تھے کہ
اسے کہیں باہر چلا جانا چاہئے، اس کی صحت گر رہی ہے۔ تمام کام کو
پس پشت ڈال کر اسے چاہئے کہ کریمیا چلا جائے۔ جب اس کی بیوی
نے اس کے بارے میں سنا تو اس کا پیار خاوند سے بڑھتا ہوا نظر آنے
لگا۔ اور وہ اس سے برابر کہنے لگی کہ کریمیا میں سردی بہت ہو گی، اس
سے بہتر یہ ہے کہ نائس چلا جائے تاکہ وہ بھی تیمارداری کی غرض سے
اس کے ساتھ جا سکے۔ وہ وہاں اس کی نگہداشت رکھیگی۔ اور اسے
ہر طرح آرام پہنچائے گی۔

اب اس کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا کہ اس کی بیوی کیوں نائس
چلنے پر زور دے رہی تھی، اس لئے کہ مائیکل قریب ہی مانٹی کارلو
میں تھا۔

وہ ایک انگریزی کی لغت لیکر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ لفظوں
کا ترجمہ کرنے لگا۔

"میں اپنی محبوبہ کا جامِ صحت پیتا ہوں، اس کے ننھے پاؤں
پر ہزاروں بوسے قربان، میں اس کا بے چینی سے منتظر ہوں۔"

اُس نے اپنے اس مضحکہ خیز پارٹ کا تصور کیا جو اگر وہ
نائس چلا جاتا تو اُسے ادا کرنا پڑتا۔ اسے اپنی حالت اتنی قابلِ رحم
نظر آنے لگی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ بے چینی سے
کمرے کے فرش پر ٹہلنے لگا۔ اس کے مردانہ جذبات ابل کر بغاوت پر
آمادہ ہو گئے غصہ میں اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور گالیاں خود بخود
اس کے ہونٹوں پر لڑھکنے لگیں۔ اسے اپنے اوپر حیرت ہونے لگی کیونکر
ممکن ہے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک دیہاتی پادری کا لڑکا ایک
مذہبی سکول کا تعلیم یافتہ، زندگی میں بیباکانہ کردار کا مالک، پیشہ کے
لحاظ سے ایک ڈاکٹر، وہ کیونکر ایک عورت کا غلام ہو کر رہ گیا، ایک
کم حیثیت، کم مایہ اور کمزور عورت کا غلام! "ننھے پاؤں" وہ بڑبڑانے
لگا، تار اس کی چٹکیوں میں مسلا جا رہا تھا! "ننھے پاؤں"!

شادی کے بعد کے سات سال اور اس سے پہلے جب اسے
اس سے محبت ہوئی تھی اور اس نے شادی کی تجویز پیش کی تھی، یہ سب
اس کے ذہن میں محفوظ تھے اور اس تمام عرصہ میں اپنی بیوی کے
معطر بالوں اور اس کے ننھے ننھے پاؤں کے سوا اسے کچھ بھی
یاد نہ تھا، اور یقیناً اس کے پاؤں تھے بھی بہت چھوٹے ...
اور حسین، اور وہ انھیں ابھی تک چاہتا تھا اور اسے ایسا محسوس
ہونے لگا جیسے وہ اب بھی اس کی آغوش میں ہیں ــــ ان کے
سوا کچھ بھی یاد نہ تھا اسے، کچھ بھی نہیں، وہ خانہ جنگی، ہسٹریا کی سی
چیخیں، دھمکیاں، جھوٹ، خوفناک جھوٹ!

اسے اپنے باپ کا مکان جو دیہات میں تھا یاد آ گیا۔ کبھی کبھی
ایک پرندہ کھلی ہوا میں سے اڑ کر کمرہ میں آ جایا کرتا تھا اور کھڑکی سے
ٹکرا ٹکرا کر چیزوں کو بے ترتیب کر دیا کرتا تھا، اس طریقہ سے یہ
عورت بالکل ایک مختلف جماعت سے اُڑ کر اس کی زندگی میں در آئی
تھی، اُسے بالکل تتر بتر کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کے بہترین سال
ایسے گزرے تھے جیسے جہنم میں گزر رہے ہوں، اس کی امیدیں ٹوٹ
ٹوٹ کر اس کے لئے ایک تماشا بن گئی تھیں، اس کی صحت گر گئی تھی
اور اس کا گھر بھنگڑ خانہ معلوم ہوتا تھا، اس تمام عرصہ میں اس دس ہزار
کی آمدنی میں سے وہ کبھی دس روپیہ بچا کر بھی اپنی ماں کو نہ بھیج سکا تھا
جو دیہات میں رہتی تھی، اور اس کا قرضہ، وہ الگ پندرہ ہزار تک
پہنچ گیا تھا۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر اس کے گھر
میں لٹیروں کا ایک گروہ بھی آ کر رہتا تب بھی وہ اتنی بری طرح برباد
نہ ہوتا، جتنا اس عورت کی موجودگی سے ہو گیا تھا۔

وہ کھانسنے اور سانس کے لئے جدوجہد کرنے لگا، اسے اب
تک اپنے بستر میں چلا جانا چاہئے تھا، مگر وہ نہیں جا سکا۔ اور برابر
کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی میز پر بیٹھ جاتا اور قلم اٹھا کر یوں ہی
گھسیٹنے لگتا۔

"نازک پاؤں ..... ننھے پاؤں"

پانچ بجتے بجتے وہ بالکل کمزور ہو گیا، اور اسے سارا قصور اپنا ہی
نظر آنے لگا، وہ سوچنے لگا کہ اگر اولگا کسی اور سے شادی کرتی جو
اس پر پوری طرح قدغن رکھتا ـــــ کون کہہ سکتا ہے؟ کون
کہہ سکتا ہے؟ وہ بہت اچھی اور سگھڑ عورت ہوتی۔ وہ نفسیات میں
بہت کمزور ہے اور عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

.... "اب مجھے
بہت عرصہ زندہ بھی نہیں رہنا"

اس نے سوچا میں بالکل مردہ ہوں، مجھے زندوں کی راہ میں
نہیں آنا چاہئے۔ دوسروں کا حق غصب کرنا بڑی زیادتی ہے۔
میں اس سے کنارہ کشی کر لوں گا۔ بہتر ہے کہ [illegible]

...... سے محبت کرتی ہے ...... میں اسے طلاق دے دوں گا

استقامت کے دوران ہی اپنے سر لے لوں گا۔"

آخرکار رونا آگئی۔ وہ سیدھی مطالعہ کے کمرے میں گئی اور اُس لباس میں جس میں وہ تھی، سفید لبادہ، ہیٹ اور فل بوٹ، وہ صوفے کی تہ میں ڈوب گئی۔ "بدتمیز، موٹا" وہ سسکیاں لینے لگی۔ "بے ایمان، آوارہ، میں اسے برداشت نہیں کر سکتی، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"کیا بات ہے؟" نکولی نے اس کے پاس جاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ طالب علم، آزمدنیکن مجھے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے راستے میں کہیں میرا بٹوہ کھو دیا۔ اس میں پندرہ روپے تھے، میں نے وہ اماں سے اُدھار لئے تھے۔"

وہ ایک عجیب انداز میں رو رہی تھی، ایک بچی کی طرح اور نہ صرف اس کا رومال بلکہ اس کے دستانے بھی آنسوؤں میں تر تھے۔

"اب اس کا کیا علاج" ڈاکٹر نے کہا، "اگر اس نے کھو دئے تو کھو دئے، اب پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔ خاموش رہو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں اتنی مالدار نہیں ہوں جو روپیہ یوں کھوتی پھروں۔ وہ کہتا ہے میں واپس کر دوں گا۔ مگر مجھے یقین نہیں، وہ بہت غریب ہے۔"

اس کا خاوند منتیں کرتا رہا کہ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ مگر وہ برابر طالب علم اور اپنے روپیہ کا ذکر کرتی رہی۔

"اچھا خاموش ہو جاؤ میں تمہیں کل پچیس روپیہ دے دوں گا" اس نے غصہ سے کہا۔

"اچھا میں کپڑے تبدیل کر آؤں" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اپنے اس سمور میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتی، تم بھی کتنے عجیب معلوم ہو رہے ہو؟"

اس نے کوٹ اور کپڑے اتارنے میں اولگا کی مدد کی ...... وہ بہت پسند کرتی تھی اس کے منہ سے آ رہی تھی۔ اس کے ...... اپنے ...... لگا کر واپس آگئی ...... آنسو ...... اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ اس کے ...... اس کے ...... کے سوا اور کچھ نظر ...... سے ...... پہنچ ...... تھی۔ ...... اس نے ...... آپ کو

ایک چھوٹے دالان میں جھلاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ دیکھ چکا ہوں" اس نے تار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اُس نے اُسے پڑھا اور کندھے سکیڑ کر کہنے لگی۔

"پھر یہ تو نئے سال کی مبارکباد پر آیا تھا اس میں کوئی راز کی بات تو نہیں" وہ اور پہلے سے زیادہ زور زور سے جھولنے لگی۔

"تم مجھے انگریزی سے لاعلم ہونے کی وجہ سے اس طرح کہہ رہی ہو۔ ہاں مجھے انگریزی نہیں آتی، لیکن میرے پاس لغت ہے۔ یہ مرکس کا تار ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کا جام صحت پیتا ہے، ہزاروں بوسے اس کے نازک پاؤں پر قربان کرتا ہے، خیر اسے چھوڑو" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "میں کوئی اور نیا منظر نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ بہتر یہ ہے کہ اب ہم اس چیز کو ختم ہی کر دیں ...... یہی کچھ میں تم سے کہنا چاہتا تھا ـــــ تم اب آزاد ہو اور جہاں جی چاہے جا سکتی ہو۔"

اس پر خاموشی طاری ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔

"میں تمہیں اس لئے آزاد کرنا چاہتا ہوں کہ تم جھوٹ بولنے اور بہانے بنانے سے باز رہ سکو" نکولی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اگر تم اس جوان آدمی سے محبت کرتی ہو تو کرو، اگر تم اس کے پاس باہر جانا چاہتی ہو تو جاؤ، تم جوان ہو، تندرست ہو، اور میں ...... میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اور اب مجھے زیادہ دن ...... زندہ بھی نہیں رہنا، مختصراً یہ کہ ...... تم سمجھ گئیں نہ میرا مطلب۔"

وہ مضطرب سا ہو گیا اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اولگا روتی رہی ...... خود سے ہمدردی کرتی رہی ...... یہ مان لیا کہ وہ مرکس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے ساتھ شہر سے باہر بھی جایا کرتی تھی اور اکثر اس کے کمرے پر بھی اس سے ملاقات کے لئے جایا کرتی تھی اور یہ کہ اس نے باہر بھی اس کے ساتھ جانا چاہا تھا۔

"تم دیکھتے ہو میں کوئی چیز تم سے چھپاتی نہیں۔"

اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میری ساری زندگی تمہارے سامنے عریاں ہے۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے پاسپورٹ دلوا دو، دلوا دو نا پاسپورٹ!"

"میں پھر دہراتا ہوں کہ تم آزاد ہو۔"

وہ اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر آگئی، اور اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے لگی۔ ...... دا ...... اور وہ اس کا ...... تھا ...... کی ...... ہی ...... وہ ...... کسی ...... کرتی ...... ہے

ضرورت کی نیت کتنی ہی صاف کیوں نہ ہو۔ وہ سوچتی تھی کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی خودغرضی کا شائبہ چھپا ہوا ہے۔ جب اونگا نے پھر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بجلی کی سی چمک تھی۔
"کب بنواؤ گے پاسپورٹ"؟ اس نے پوچھا۔
ڈاکٹر کا جی چاہا کہدے "کبھی نہیں"، لیکن اس نے ضبط کیا۔
"تم کب چاہتی ہو؟"
"میں صرف ایک مہینہ کے لئے جاؤں گی۔"
"تم ہمیشہ کے لئے مرس کے پاس جاؤگی، میں تمہیں طلاق دیدوں گا، میں تمام ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہوں، تم اس سے شادی کرلینا۔"
"لیکن میں طلاق تو نہیں مانگتی۔" اونگا نے جلدی سے کہا میں تم سے طلاق کو تو نہیں کہہ رہی، میں تو صرف پاسپورٹ مانگ رہی ہوں۔"
"لیکن آخر تم طلاق چاہتی کیوں نہیں؟" ڈاکٹر نے غصہ سے پوچھا۔ تم عجیب عورت ہو، کتنی عجیب، اگر تم واقعی اس کی دلدادہ ہو، اور وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے تو اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ تم اس سے شادی کرلو۔ کیا تم شادی اور حرام کاری میں بھی تمیز نہیں کرسکتیں!"

۴۲

"میں سمجھ گئی تمہارا مطلب۔" وہ اس سے الگ ہٹکر کھڑی ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں کینہ جذبات جھلکنے لگے "میں سمجھ گئی تمہارا مطلب، تم مجھ سے اُکتا گئے ہو، اور اس لئے مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو، یہ طلاق میرے سرمنڈھ دینا چاہتے ہو، شکریہ! مگر میں اتنی بے وقوف نہیں جتنا تم سمجھتے ہو، نہ میں تمہیں چھوڑدوں گی، اور نہ طلاق قبول کروں گی، نہیں، کبھی نہیں! مدعا یہ ہے کہ میں اپنا مرتبہ نہیں گرانا چاہتی، میں اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں میں حقیر نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا، جیسے کوئی اسے بولنے سے روکنے والا ہے۔
"دوسری چیز یہ کہ میری عمر ستائیس سال ہے اور مرس کی عمر تیئیس سال، وہ ایک ہی سال میں مجھ سے اُکتا جائے گا۔ اور مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیگا اور اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو ایک وجہ یہ بھی ہے کہ......

بہت ممکن ہے...... بہت ممکن ہے میرے جذبات سرد پڑجائیں گے اور...... میں اُس سے اُکتا جاؤں! نہیں میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی!"
"میں تمہیں دھکے دیکر گھر سے نکال دوں گا!" نکولی نے چلّاکر کہا اور زور سے زمین پہ پاؤں مارا۔ "میں تمہیں گھر سے باہر نکال دوں گا، بدکار، چھنال!"
"دیکھا جائے گا" اس نے کہا اور باہر چلی گئی۔
باہر دن کی روشنی پھیل گئی تھی، لیکن ڈاکٹر ابھی تک اپنی میز پہ بیٹھا ہوا تھا، اور اس کی پنسل خود بخود کاغذ پہ چل رہی تھی۔
"میری جان...... ننھے پاؤں"
یا پھر وہ کمرے میں گھومنے لگتا تھا۔ اس تصویر کے سامنے جو آج سے سات سال پہلے اس کی شادی کے بعد لی گئی تھی اور اس کی طرف بہت عرصہ تک دیکھتا رہا۔ یہ پورے گھر بھر کی تصویر تھی۔ اس کے خسر، خوشدامن، اس کی بیوی اونگا جب وہ بیس سال کی تھی، اور وہ خود ایک خوش باش نوجوان خاوند کی شکل میں۔
اس کا خسر داڑھی مونچھ صاف، ایک بیمار سا، پرائیوی کونسلر تھا، دوست کا بے انتہا بھوکا۔ اس کی خوشدامن ایک گُھٹے ہوئے اور پتلے پتلے بھوکے سے نقوش کی عورت تھی کسی نیولے کی طرح۔ اپنی لڑکی سے بیحد محبت کرتی تھی یہاں تک کہ اگر وہ اس کو کسی غیر مرد سے ...... دیکھتی تو اپنے کرتے کے دامن سے پردہ پوشی کرتی۔ اونگا بھی نازک اور بھوکے سے نقوش کی لڑکی ہے، لیکن ماں سے زیادہ بیباک وہ نیولا نہیں بلکہ اس سے بھی بڑے قسم کی جانور ہے۔ اور نکولی خود تصویر میں ایک سیدھا سادھا، نرم فطرت اور صاف دل جوان نظر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک طالبعلم کی سی آزادروی مُسکرا رہی ہے۔ اور اس آزادروی میں اضطرار کی سی جھلک ہے، شاید یہ شکاری جانور جن کے پنجوں میں وہ گرفتار ہوگیا ہے اسے خوشی اور محبت کی دولت دے سکیں۔ اور شاید اس کے وہ خواب پورے ہوسکیں جنھیں وہ طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا کرتا تھا

(بقیہ مضمون صفحہ ۹۸ پر ملاحظہ کیجئے)

کسوٹی

کسوٹی

کیا گوری کیا سانولی

ایشیا کا یہ مسلک نہیں رہا ہے کہ وہ ماہانہ ہو کر ماہانہ رسائل سے اخذ و اقتباس کرے، کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ملک میں جو رسائل مقبول اور مشہور ہیں وہ اہلِ نظر کی نگاہوں سے گذرتے ہی ہیں، لیکن نگار اعجاز کا یہ مضمون اپنی حیثیت میں مفید و دلچسپ ہے اس لئے شائع کیا جاتا ہے۔ ساغر

پہلے انسان کو صرف عورت کی ضرورت تھی پھر زندگی پھیلتی گئی اور طبیعت رنگ بدلتی گئی یہاں تک کہ آج عورت کی مختلف قسمیں ذہنِ انسانی کا مرکز ہیں۔ دراز قد، بوٹا سا قد، بھرے بھرے سڈول اعضا، چھریرا جسم، حسن صبیح، حسن ملیح۔ غرضیکہ حقیقی آنکھیں ہیں اتنی باتیں ہیں اور اس میں کسی کا کیا بس، دل ہی تو ہے ــــ لیکن ڈانوا ڈول ہوتے رہنے کے باوجود کوئی نہ کوئی وجہ تو اپنے انتخاب کی رکھتا ہوگا۔ عظمت اللہ کہتے ہیں ؎

کیوں مجھے تیری چاہ ہے؟ اس کو کیوں پوچھئے
جس کی بوجھن کچھ نہیں اس کو کیوں بوجھئے

گو یا دل کوئی سبب پیش نہیں کر سکتا تو آیئے ہم دماغ سے کام لینے کی کوشش کریں۔

ابتدا ہی سے اندھیرے اُجالے کا ساتھ رہا ہے لیکن انسان نے ہمیشہ اُجالے کو اندھیرے پر ترجیح دی ہے۔ ممکن ہے اس پسند کی علت تاریکی سے خوف ہو، وہ خوف جو مذہب کی ایجاد کا باعث بنا۔ اور یونہی کتب میں دیوی دیوتا اور فرشتے اور حوریں ہمیں گورے ہی دکھائی دیتے ہیں اور شیطان تاریکی کا بادشاہ۔ پھر بھی تہذیب و تمدن کی ترقی یافتہ منزلوں میں ہمیں چارلس باڈلیئر ایسے شعرا یہ کہتے سنائی دیتے ہیں:-

"اسکی ہر بات کالے رنگ کی ہے، وہ تو روحِ شبانہ دکھائی دیتی ہے، روحِ تیرگی.... وہ ایک مہرِ آبنوسی ہے، ایک نجمِ سیاہ، اسکے باوجود نور و مسرت کی کرنیں اُس میں سے پھوٹ رہی ہیں.... وہ ستارہ نہیں جو لوگوں کے مطمئن خوابوں میں مسکراتا ہو، بلکہ ایک سانولی غضبناک دیوی (ہے)"

گو یا رنگ کا مسئلہ ایک ایسا بھید ہے جسے ہم ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ یہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ رنگوں کا اثر نہ صرف جسمانی لحاظ سے ہم پر ہوتا ہے بلکہ ذہنی یا نفسی لحاظ سے بھی ہمارے احساسات اور خیالات ان سے تحریک پاتے ہیں اور ہر رنگ انسانی ذہن پر مختلف حسیاتی یا تخیلی اثر پیدا کرتا ہے اور اس نسبت سے ہر جذبے یا خیال کا بھی مختلف رنگ ہے، مثلاً غصے کا سرخ، محبت کا گلابی، حسد کا سبز ــــ وغیرہ۔ مشرق میں مغرب کی بہ نسبت رنگوں کی اس گہری اہمیت کا احساس زیادہ پرانا ہے جسکی ایک مثال راگ راگنیوں کے رنگ ہیں اور یہ سلسلہ صرف آواز تک ہی نہیں ختم ہو گیا بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اس کا جال پھیلا ہوا ہے اور مختلف پہلو مختلف تشریحات کے حامل ہیں۔ سہاگن سرخ جوڑا کیوں پہنتی ہے، سادھو سنت جوگیا لباس کیوں پسند کرتے ہیں، بیوہ سفید ساڑھی ہی لپیٹے رکھتی ہے۔ سیاہ کپڑا سوگ کا نشان ہے، پھر بھڑکیلے اور رنگ برنگے کپڑے پہننے سے طبیعت میں ایک چلبلاپن ایک امنگ پیدا ہو جاتی ہے اور یونہی ایک سادہ طبیعت کے مقابلہ میں کوئی چلبلا یا امنگوں بھرا دل بھڑکیلے اور رنگ برنگ کپڑوں کو پسند کرتا ہے۔

لیکن اس وقت ہمیں رنگوں کے اتھاہ بھید کے گوناگوں پہلوؤں کی بجائے صرف گورے اور سانولے پہلو پر غور کرنا ہے اور اسکے ساتھ ہی سرسری طور پر دیکھنا ہے کہ ادب اور خصوصاً اردو ادب میں اس لحاظ سے شعرا کا کیا مسلک رہا ہے نیز اسکی وجوہ کیا تھیں۔ لیکن پہلے ہم انسان کے موجودہ علم کی روشنی میں جنسی انتخاب کے معیار کے اصولوں کو دیکھتے ہیں۔

ہیولاک ایلس کی تحقیق کے مطابق حُسن کا احساس کوئی اضطراری بات نہیں۔ اس احساس اور انتخاب کی بنیاد پانچ اصولوں پر ہے۔

اوّل۔ جمالیاتی خصوصیات کی داخلی بنیاد جس کی تمام متنوع صورتیں یکجا رہتی ہیں اور جسکے ذریعے سے نسائی حُسن کے اس آدرش تک پہنچا جا سکتا ہے جو اب تک تمام نسلوں کے ذہین انسانوں کا خاصہ رہا ہے۔

دوم۔ کسی نسل یا قوم کی معینہ اور امتیازی خصوصیات حسن کے آدرش میں اختلاف پیدا کر دیتی ہیں کیونکہ اکثر حُسن نسلی یا قومی لحاظ سے جسمانی خصوصیات

کی انتہائی نشو ونما کا دوسرا نام ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قوم یا نسل کی جسمانی خصوصیات کی انتہائی نشو ونما اس قوم یا نسل کی صحت اور زورِ طبیعت کی انتہائی نشو ونما کا اظہار بھی کرتی ہے۔

سوم ۔ اکثر ممالک میں حُسن کا ایک اہم اور عموماً لازمی عنصر ثانوی جنسی خصوصیات بھی ہیں، مثلاً عورت میں سر کے بال، چھاتیاں، کولھے اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں۔

چہارم ۔ انفرادی ذوقِ سلیم، جس کی بُنیاد اور نشو ونما مخصوص نظامِ جسمانی اور ذاتی تجربات پر ہوتی ہے اور اکثر یہ انفرادی اجزاء اجتماعی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور یوں حُسن کے بدلتے ہوئے فیشن رائج ہوا کرتے ہیں کیونکہ ایک فرد کی شخصیت کا اثر کسی خاص بات کو بہت سے افراد کے ذہنوں پر طاری کر دیتا ہے۔

پنجم ۔ جب تہذیب، تمدن ترقی کی انتہائی منازل پر پہنچ جاتی ہے تو بعض اوقات عصابی افراد حُسن کا ایک غیر معمولی آدرش قائم کر لیتے ہیں اور اسکی بجائے کہ وہ اپنی قوم یا نسل کے قریب تر حُسن سے متاثر ہوں انہیں ایسی صورتیں اور مورتیں پسند آنے لگتی ہیں جو اُن کیلئے مانوس نہ ہوں بلکہ اجنبی، اچھوتی اور دور کی چیز ہوں۔

بُنیادی طور پر جنسی انتخاب کے یہ پانچ اصول ہیں لیکن میرے خیال میں اسکے ساتھ ہی ہمیں محبت اور نفرت کے تعلق کو بھی نہ بھولنا چاہئیے۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی خوبصورت یا گوری عورت سے محبت میں ناکامی ہوئی ہے تو نفسی عمل نے نفرت کا احساس پیدا کر کے دوسری بار اُسے پہلی سے بالکل مختلف قسم کی عورت کی طرف راغب کیا ہے۔ چنانچہ فرانسیسی شاعر چارلس باڈلیئر کی سیاہ پسندی اسکی بہترین مثال ہے۔ اپنی نسل کی عورت سے بوجہ محبت میں غیر مطمئن ہونے کے بعد اسکے احساسات ایک حبشن پر مرکوز ہو گئے لیکن ایسی مثالیں استثنا کا درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسانی رجحان زیادہ تر گورے رنگ کی طرف ہے اور اسی سلسلے میں جب ہم مختلف اقوامِ عالم کے معیارِ حسن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ذیل کی وضاحت ملتی ہے۔

پہلا گروہ خالص سفید اقوام کا جو فطرتاً سفید رنگ کو پسند کرتی ہیں۔

ایران: ۔ سفید اور چہرے کا گلابی رنگ۔

یونان: ۔ سفید رنگ۔

فرانس: ۔ سفید اور گلگوں، دودھ سی سفید کھال۔

جرمنی: ۔ سفید اور گلگوں۔

آئرلینڈ: ۔ بہت سے زیادہ سفید کھال۔

ترکی: ۔ سفید رنگ۔

دوسرا گروہ غیر خالص سفید اقوام کا جو غیر خالص ہونیکے باوجود سفید رنگ کو پسند کرتی ہیں۔

جاپان: ۔ سفید کھلا ہوا رنگ۔

شام: ۔ بائبل میں لکھا ہے، تیری گردن ہاتھی دانت کا مینار ہے۔

عرب: ۔ اسکا چہرہ پورے چاند کا سا تھا اور رنگ (کالے) بالوں سے بالکل متضاد۔

اطالیہ: ۔ مشہور شاعر پیٹرارش کی محبوبہ برف سی سفید ہے۔

تیسرا گروہ غیر خالص گندمی رنگ والا جو گورے رنگ کو پسند کرتا ہے۔

ہندوستان: ۔ اور ہندوستان میں قدیم تصور کے لحاظ سے پدمنی کی مثال نمایاں ہے جس کا رنگ کنول کی طرح مانا گیا ہے۔ لیکن انتہائی مثال کے طور پر راجپوتانے کے ایک گیت کا مصرعہ بھی دیکھئے:۔

گورے مکھ پہ سہائے کالی چوندڑی

اُردو ادب کی طرف آنے سے پہلے ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہئیے۔ پہلے ہندوستان میں صرف سیاہی مائل اقوام بستی تھیں چنانچہ نہ صرف وہ خود بلکہ اُن کے دیوی دیوتا بھی سیاہ اور وحشتناک تھے اور کالی اور کرشن مہاراج کے تصور کی بُنیاد بھی انہی کے تصورات پر ہے۔ بعد ازاں آریہ لوگ اپنے سفید رنگ کو ہندوستان میں لائے، پھر یونانی آئے اور اپنے رنگ کی آمیزش کی، پھر مغل آئے اور انہوں نے رنگ کی غزل کا نہ صرف مطلع بلکہ مقطع بھی عرض کیا اور یوں ہندوستان مختلف رنگوں کا ایک کھولتا ہوا سمندر بن گیا۔

چونکہ ہمیں بُنیادی اقوام کا ادب حاصل نہیں ہے اس لئے ہم باہر سے آنے والوں ہی کے متعلق اندازہ لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آریہ رفتہ رفتہ یہاں کے لوگوں میں گھُلے ملے ہوں گے۔ چنانچہ ابتدا میں اُنکے دیوی دیوتاؤں کے جتنے تصورات ہیں اُن میں گورے رنگ کو ہی فوقیت حاصل ہے۔ برہما گورے، شو گورے، پاربتی کا ایک نام ہی گوری، وشنو گورے، اُن کی لکشمی بھی گوری اور بہت بعد میں جا کر وشنو کے (غالباً) نویں اوتار کرشن مہاراج سانولے نظر آتے ہیں، لیکن رادھا پھر بھی گوری ہی رہتی ہیں۔ اب ہم پہلے زمانے کے لحاظ سے سنسکرت کے شاعر امرو کو دیکھئے جس کا زمانہ ۸۲ء قبل مسیح اور ۳۸۰ بعد مسیح کے درمیان ہے۔

"تمہارے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں،
اور وشم آدیت کا جنگل مصر اگیشی کے رنگین مندر کو اپنی گود کے
گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔"

ظاہر ہے کہ رنگین جگمگاتا ہوا مندر سیاہی مائل نہیں ہو سکتا۔ امرو کی ایک اور نظم میں جو بدھ کی بیوہ کی پیار بھری ہے، مرد کو چندر مکھ کہا گیا ہے اور اُس کی جلد گلاب کا ایک پھول ہے۔"

ایک اور مصرع دیکھئے :۔

"میں تو اڑ کر اُس جگہ پہنچنے کو ہوں جہاں وہ میری راہ دیکھ رہا ہے
جوون سے کہیں سُندر ہے "

ایک اور نظم میں عورت کہتی ہے :۔

"جب وہ کالی جھیل میں سے نہا کر نکلتا ہے تو گویا چاند رات
میں نمودار ہوتا ہے "

اور جو ذرا سانولے ہیں وہ گورا بننے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ
سنگار کے سلسلے میں

"۔۔۔ بڑے بڑے کنول کے پھولوں سے برادہ لے کر اپنی
چھاتیوں پر چھڑک لیا "

امرو کے بعد سنسکرت ادب کو چھوڑ کر ہم صوبائی رجحانات کی طرف
آتے ہیں۔ بہار کے شاعر ودیاپتی نے سنسکرت ادب کی روایات کے سہارے
پر اپنے ذہنی عقیدے کو ذاتی محبت کے چھپانے کا ذریعہ بنایا اور
اس لئے اسکے گیتوں میں رادھا گوری ہے اگرچہ یوں بھی رادھا کو
گوری کہا جاتا ہے۔ چنانچہ

چہرہ جیسے بجلی چمکے ۔۔۔ اور کاندھے پر بال گھٹا سے

ایک اور شعر

"چاند کنول کو گود میں لے کر ۔۔۔ ڈوب گیا مستی میں یکسر"

اس شعر میں چاند کرشن مہاراج ہیں اور یہاں ودیاپتی نے سانولے سلونے
شام کی نسبت کا لحاظ بھی نہیں رکھا۔

اور سُنئے : ۔۔۔ رادھا چھپ کر ملنے جا رہی ہے ؎

انگ انگ رادھا کا ایسی سُندر جوت جگائے
چندر اُجالا جس کے اندر گھل مل کر کھو جائے
نین کسی کے دیکھ نہ پائیں دیکھیں تو کب جانیں
رادھا اور چندرماں ایک ہوں، کیسے مانیں ؟

ممکن ہے کہ رادھا کا گورا تصور کرشن کے سانولے پن کے مقابل ہر محض اضافی
حیثیت رکھتا ہو لیکن گورے رنگ سے رغبت بہرحال ظاہر ہے۔

ودیاپتی کا ہمعصر چنڈی داس ہے جو بنگالی تھا اور بنگالیوں کے متعلق
کچھ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں لیکن اسکے ہاں بھی رادھا اگرچہ اسکی اپنی محبوبہ
رامی دھوبن کا ایک عکس ہے پھر بھی گوری ہی دکھائی دیتی ہے۔

اُردو شعراء گورے اور سانولے رنگ کے لحاظ سے عجب ڈھلمل قسم
کے رہے ہیں اور ان کے ہاں اکثر دونوں رنگوں کا ذکر دکھائی دیتا ہے
بعض شعراء اس لحاظ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

ہندوستانی زندگی میں سانولے رنگ کی کثرت کے باوجود یہاں کے
گیتوں اور ٹھمریوں میں بھی جہاں کہیں تو

"سانولی صورت، میرا من"

دکھائی دیتا ہے وہاں

"گورے مکھ پہ سہائے جو بندی" بھی نظر آتا ہے اور یہی اُجنتا کے
علاقے میں جہاں کے ریگستان میں پانی کم ہے شاید مل جائے صحیح معنوں
میں گورا رنگ نادر معدوم ہی کا حکم رکھتا ہے کیونکہ پیلے رنگ کو گورا نہیں
کہا جا سکتا۔ لیکن یہ شاید مختلف نسلوں کے رنگا رنگ اجتماع کا اثر ہے، غالباً
قدیم ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے سفید رنگ مانوس ہونے
کے باوجود کچھ خاص رغبت کا باعث نہ تھا۔

ولی دکنی گجرات کے سانولے حُسن کے گُن گاتا ہے۔ میر تقی کا فرقت
کا غم اس قدر مارے ڈالتا ہے کہ معشوق کا حُسن ان کے کلام میں ایک
ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اسکے باوجود یہ شعر کہ

کیفیت اسکے لب کی کیا کہئے ۔۔۔ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

گورے ہی رنگ کی ترجمانی کرتا ہے۔

میر حسن کی مثنوی کے قریباً تمام کردار گورے ہیں۔ چنانچہ بدر منیر
کے متعلق کہتے ہیں ؎

۱۔ وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن ۔۔۔ وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
۲۔ وہ کھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے ۔۔۔ وہ نقشہ کہ تصویر حیرت کو آئے
۳۔ نہ بس مثلِ آئینہ تھا اُس کا تن ۔۔۔ کہے تو کہ تھی نافِ عکسِ دہن
۴۔ وہ ساقِ بلوریں وہ اندازِ پا ۔۔۔ پھرے ہے سرِ چشم و دل پہ صدا
۵۔ سماں اُس کی گردن کا کہوں کیا میں آہ ۔۔۔ ستاروں میں تھا جلوہ گر ایک ماہ

نجم النساء کو دیکھئے :۔

۱۔ بھبو کا سا تن اور منہ کی دمک ۔۔۔ کہ جوں شعلہ آتش سے اُٹھے بھڑک
۲۔ نہانے سے نکلا عجب اس کا روپ ۔۔۔ نکل آئے بدلی سے جس طرح دھوپ
۳۔ وہ مہتاب سا چہرہ ہو زرد زرد ۔۔۔ سراپا ہوا شکل مانند وہ درد

حیش بائی رقاصہ بھی گوری ہی ہے

۱۔ فقط کان میں ایک بالا پڑا ۔۔۔ کہے تو کہ تھا مہ کے ہالا پڑا
۲۔ لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئی سر بسر ۔۔۔ کہ بدلی ہو جوں مہ کے اِدھر اُدھر

یہ سب تو تیسرے کردار تھے لیکن بدر منیر کی سانولی سہیلی بھی دیکھئے :۔

۱۔ کوئی ہمدم اُس کی جو تھی ماہرو ۔۔۔ بچھائے ہوئے سنگ سیاں سو بہو

اسکے مقابل میں سلونے رنگ کی حمایت میں دلی کے [illegible]
انشاء کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انشاء [illegible]

کالحاظ اور اس زمانے کے شعراء پر خواہ جنسیت کے لحاظ سے اعتبار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اکثر ان کے کلام میں محبوب کا رنگ شعر کی فنی باتوں سے معین ہو جاتا ہے پھر بھی انشاء پہلا اُردو شاعر ہے جو سید اور ترکی فارسی کا عالم ہونے کے باوجود اکثر سانولے رنگ کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ

ہے نام خدا، واچھڑے کچھ زور تماشا — یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب، قہر بھبھن اور چمکڑا — اللہ کی قدرت

اور اس رنگت کی وضاحت اگلے ہی شعر میں ہے ؂

میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشقِ شیدا — اے کانِ ملاحت
فرمانے لگے ہنس کے سنو اور تماشا — یہ شکل یہ صورت

اور دیکھیے ؂

یہ نمک، یہ چھب، یہ سج دھج، یہ ادا کو دیکھ تری
بتلا طلسمِ تحیّر ہوئے غرق ہوشمنداں ——

ایک اور ؂ سانولے پن پہ غضب ہے دھج بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھئے جے اب کنہیا لال کی

غالب کے ہاں اگرچہ وہ داخلی ہوتے ہوئے بھی اپنی ہمہ گیری کی بنا پر غیر جانبدار شاعر ہے فطرتاً سفید رنگ ہی نمایاں ملتا ہے۔

مرزا رسوا عموماً ایک ناول نویس اور عالم کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شخصیت کے ساتھ ان کی شاعری بھی دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ زندگی بن ان کی محبوبہ ایک فرانسیسی عورت تھی لیکن جس طرح اپنے ناولوں میں انہوں نے آپ بیتی کے عنصر کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر پیش کیا ہے اسی طرح اپنی مثنوی امید و بیم کے ذریعے سے بھی اپنی محبوبہ کو

سانولا رنگ نشیلی آنکھیں — شوخ طرار رسیلی آنکھیں

لکھ کر بات پہ پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بحیثیت عموی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو شعراء کے محبوب کا رنگ گو جغرافیائی، نسلی اور روایتی اثرات سے نمایاں ہونے کے باوجود امتیازی حیثیت نہیں رکھتا لیکن غالب کے بعد کے زمانے میں دو مثالیں مجھے نہایت نمایاں اور پرکشش دکھائی دیتی ہیں یعنی عبدالرحمٰن بجنوری اور عظمت اللہ مرحوم۔ ان دونوں شاعروں کی ایک ایک نظم گورے اور سانولے حسن کی تعریف میں ہے اور اپنی مختلف خوبیوں کی بنا پر میں یہ دونوں نظمیں پیش کرتا ہوں۔

پہلے بجنوری کو سنئے

(۱) صنم فرنگ، قمر جبیں، بتِ سیم رنگ، غضب حسیں
وہ طرار، نازک و خشمگیں کہ رقیبِ ساغرِ آتشیں
وہ تمام تن کا کل معنبر کہ شہابِ ثاقبِ شب رواں

(۲) وہ رکاتِ غنچۂ گلاب گوں وہ لبِ گداز پُر از فسوں
مژۂ دراز و کج و نگوں میں نہاں وہ دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں

(۳) تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسلِ الم و بلا
مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں، تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں

بجنوری کی نظم میں ایک گوری عورت کو جس چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے وہ ایک سانولے حسن کے متوالے کو بھی للچا سکتا ہے اور یہی کیفیت عظمت اللہ کی نظم میں ہے سنئے:۔

سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی

انمعر ویس کی سندر پتری کالی کوئل سے کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور آداہٹ میں لالی

. . . .

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پتلی بھنورا سی کالی
خمار اک مستانا چھایا
وہ من موہنی مقناطیسی ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو لبھایا
اور سراپا گدرا گدرا، سانچے میں ڈھلا، لچکیلا
جوشِ جوانی، پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلا سا وہ ہلکا اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن
اک موج مچلتی مچلاتی چڑھتی اترتی تھراتی
اور گردن کا نفیس ڈھلاؤ
سینے کا جوالا مکھ، کمر لچکتی، بل کھاتی
ہوش ربا اتار چڑھاؤ
سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی
فطرت نے جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے لئے حسن ہی ہے سج دھج گرمانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی

مضمون تو ختم ہو گیا لیکن کوئی صاحب شاید یہ پوچھیں کہ عنوان پوری طرح چسپاں نہیں ہوتا لیکن میں کہوں گا کہ اپنے لئے سب برابر ہیں۔

کیا گوری، کیا سانولی

[illegible]

نئی کتابیں

جگ بیتی

پنڈت جواہرلال نہرو کے ان خطوط کا ترجمہ ہے جو انہوں نے مختلف جیلوں سے اندرا کے نام لکھے ہیں۔ یہ تمام خطوط انگریزی میں ہیں۔ محمود علی خاں نے ان کا ترجمہ کیا ہے۔ کتاب مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی ہے قیمت تین روپے مجلد

یہ تمام خطوط تاریخ عالم کا ایک ہلکا سا خاکہ ہیں یا یوں کہئے کہ تاریخ کے جس قدر ضروری جزو ہیں اس کتاب میں پیش کر دئے گئے ہیں۔

آج تک جس قدر تاریخیں اردو یا انگریزی میں لکھی گئیں ان تمام میں غلط واقعات کی اس قدر بھرمار ہے کہ ایک صحیح دل و دماغ کا آدمی انہیں پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے اور غصہ سے کہیں کہیں خود بخود اس کی مٹھیاں بھینچنے لگتی ہیں۔ جہاں تک خیال کیا جا سکتا ہے ان تمام تاریخوں کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سب تعصب کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ خصوصاً وہاں سے جہاں ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے شروع ہوتے ہیں۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک پر عربوں کے حملوں کو بربریت اور ظلم کی ایک داستان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن پنڈت جواہرلال کی یہ کاوش ایک صحیح اور سنجیدہ کاوش ہے انہوں نے چیزوں اور واقعات کو کہیں بھی غلط پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

پنڈت جی کی نگاہوں نے چیزوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھا ہے اس لئے ہمیشہ صحیح دیکھا ہے۔ اگر پرانی تاریخوں میں کچھ واقعات درست بھی ہیں تو ان پر غلط بیانی کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے اور لکھنے والوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں جو آج ہندو اور مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کا ذمہ دار ہے اور تمام تر منافرت پھیلائی گئی تاریخ کے ہی ذریعہ۔ جب ہم سکول کی بنچ پر تاریخ کی کتاب لے کر بیٹھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دراصل تاریخ نہیں بلکہ کچھ سوچنے سمجھنے والے جادوگروں کی کہانیاں پڑھ رہے ہیں جو اکثر اپنی کمینگاہوں میں چھپے رہتے ہیں اور موقع ملنے پر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ غرضیکہ پرانی تاریخوں کے کچھ اجزاء کے بارے میں بلاشک وشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غلط باتوں کی غلیظ پوٹ ہیں۔ پنڈت جی واقعات کو غلط بیانی کے رنگ میں نہیں رنگنا چاہتے اسکے علاوہ وہ ہندو مسلمانوں یا ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں منافرت پیدا کرنے کے بھی قائل نہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ دروغگوئی کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے واقعات کی غلط تاویلیں نہیں کر سکتے۔ ہم اس کتاب کو پڑھ کر ایک نشان لگا سکتے ہیں کہ یہاں سے تاریخیں اپنے صحیح رنگ میں پیش ہوتی ہیں۔ "مسلمانوں نے ہندوستان کے مندروں پر حملے کئے لیکن اسکی وجہ تعصب نہیں بلکہ مندروں کو تباہ کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پرانے مندر عموماً قلعے اور گڑھ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتے تھے۔ جنوب کے بہت سے مندر آج بھی قلعوں سے مشابہ ہیں جہاں حملوں کی صورت میں لوگ پناہ لے سکتے ہیں۔"

غرضیکہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے خصوصاً وہ جو انگریزی سے واقف نہیں ان کیلئے یہ کتاب تاریخ تک پہنچنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔

ادب کثیف

مصنفہ حاجی لق لق، شائع کردہ مکتبہ اردو لاہور قیمت ایک روپیہ۔

حاجی لق لق کا خیال ہے کہ غالب نے درست ہی کہا تھا ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتا

حاجی لق لق کی یہ کتاب طنزیات کا ایک مجموعہ ہے جس میں وہ کہیں کہیں بے سوچا باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن اکثر جگہ بڑے لطیف اور دلکش پیرایہ میں طنز کرتے ہیں۔ اردو میں ہمیں شعراء میں تو ایک دو معروف و غیر معروف طنز نگار نظر آتے ہیں۔ لیکن نثر میں ابھی تک بہت کمی ہے۔ اگر کچھ ہیں بھی تو چند مزاحیہ نگار ہیں۔ یہ تمام دور جدید کی پیداوار ہیں۔ لیکن لق لق کے یہاں مزاح اور طنز کا ایک اچھا خاصا امتزاج نظر آتا ہے۔

لق لق کا اسلوب پُر امید ہے، وہ اسے جدّت اور دلچسپی کی گہری شکل دے سکتے ہیں۔ لیکن جب وہ بے معنی باتیں کرنے لگتے ہیں تو ایک قسم کی کوفت سی ہونے لگتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ طنز نگاری کو بھی ادب کی ایک باقاعدہ صنف سمجھیں اور اسے ایک فن کار کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً ان کے "جاپانی مید آفتاب" کے عنوان سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے نقادوں پر ایک اچھا طنز کرینگے لیکن نہیں کرتے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں ہاں ان کی "آسمانی حور"، "آدھ جلیبی" وغیرہ قسم کی چیزیں اچھی ہیں۔

حیوانی دنیا کے عجائبات

مصنفہ عبدالبصیر خاں، شعبۂ حیوانیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی قیمت عه

اب ہماری زبان مضامین کے لحاظ سے اتنی امیر ہوتی چلی جا رہی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اس میں ہر موضوع پر اچھی اور عمدہ کتابیں دستیاب ہو سکیں گی۔ چونکہ ہمارے ملک کی فضائیں اس وقت تک محض حسن و عشق گشت کر رہے تھے، جتنی کتابیں بھی تھیں وہ سب اس قسم کے خیالات سے پُر تھیں مگر اب بہت سے ٹھوس مضامین اور خیالات اس میں آتے چلے جا رہے ہیں اور یہ سب اس بہت مختصر وقت میں ہوا ہے بلا شبہ اس دور کو ہم نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس کتاب میں عبدالبصیر خاں نے حیوانی دُنیا کے بہت سے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔ حیرت انگیز اس وجہ سے کہ ہماری توجہ کبھی جانوروں کی طرف مبذول نہیں ہوتی تھی۔ جب یہ چیزیں ہماری نظروں کے سامنے آتی ہیں تو ہم ایک قسم کی حیرانی کا اظہار کرتے ہیں۔

اب تک عام خیال یہ تھا کہ تمام جانور محض (INSTINCT) جبلت کے تحت میں کام کرتے ہیں لیکن اب معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ جانور کچھ عقل بھی رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں جانوروں کا بڑا حصہ اب بھی اپنی جبلت کے بھروسے پر زندگی بسر کر رہا ہے لیکن وہ جانور جن کا دماغ بڑا ہوتا ہے اس میں (COMPLEXITY) اُلجھاؤ بھی ہوتا ہے اور یہی اُلجھاؤ ان کی عقل کی دلیل ہے۔ اس معاملہ میں آدمی کا دماغ بہت (COMPLEX) ہے اسی لئے انسان تمام جانوروں میں سب سے بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

جانوروں میں اخلاق بھی ہوتا ہے، چیزوں اور واقعات کو پہلے سے جان لینے کی قوت بھی اور یہ کہ ان کا رنگ کہاں تک ان پر اثر انداز ہوتا ہے یہ تمام باتیں اس کتاب کی دلچسپی کا سبب ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو جانوروں سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اس علم سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اسکے علاوہ اگر یہ کتاب پڑھنے کی خاطر بھی خریدی جائے تو دلچسپی سے خالی نہیں اور معلوماتِ عامہ کا سبب ہوگی۔

نغمۂ زندگی

یہ فضل احمد کریم صاحب فضلی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ملنے کا پتہ دفتر انجمن ترقی اُردو دہلی اور فضل بھادران لمیٹڈ، کیپٹل ہاؤس، مشن روڈ ایکسٹنشن کلکتہ۔

فضلی پر "سادگی و پُرکاری" کا مقولہ بڑی حد تک صادق آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا اندازِ بیان اچھوتا اور نرالا نہیں بلکہ تقلیدی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مقلد تقلید میں کامیاب کہاں تک ہے۔ فضلی اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہے اسکے یہاں الفاظ اور تراکیب کے ساتھ ساتھ بیان کی سادگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اس نے پرانوں کے اسالیب سے کافی استفادہ کیا ہے۔

جہاں تک فضلی کی نظموں کا تعلق ہے وہ فن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں رکھتیں۔ نظم میں وہ اتنے کامیاب نہیں جس قدر غزل میں ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں محض غزل گوئی کیلئے پیدا کیا ہے۔ ہمارے شعراء میں ایک عام مرض یہ ہے کہ وہ ہر طرف پیر پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر آدمی صرف ایک ہی میدان میں تنوع پیدا کر سکتا ہے اور مزاج کی رو کسی ایک ہی شعبہ میں کوئی نئی چیز خلق کر سکتی ہے۔ یوں دوڑنے کو آدمی ہر طرف دوڑ سکتا ہے مگر وہ بات نہیں ہوا ہوتی جو اس چیز میں ہوتی ہے جس سے طبیعت کو ایک فطری لگاؤ ہو۔

غزل کے اچھے اشعار کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ ایک یا دو مرتبہ سُننے کے بعد فوراً یاد ہو جاتے ہیں۔ فضلی کے اکثر اشعار میں یہ بات پائی جاتی ہے۔

آپ نے ہم سے بے وفائی کی
اب کسی بات کا یقین نہیں رہا

آگ سا چہرہ پانی پانی
اف رے مرا شرمانے والا

ہمراز نہ تھا جب تک رہتی تھی گراں جانی
اب ہے یہ پریشانی ظالم نہ کہیں کہدے

پریشان ہونے سے اب فائدہ؟
کہ جو بات ہونی تھی وہ ہو چکی

دیوان جوشش

مرتبہ قاضی عبدالودود صاحب شائع کردہ انجمن ترقی اُردو، دہلی۔ قیمت عمہ

جوشش عظیم آباد کے اُن شعراء میں سے ہے جو میر و مرزا کے زمانے میں زندہ تھے۔ انکی زندگی کے کچھ زیادہ واقعات ہم تک نہیں پہنچتے۔ مثلاً یہ کہ بچپن اور جوانی کیونکر گذری۔ قاضی صاحب نے اس کتاب کی ترتیب میں بڑی کاوش کی ہے اور تقریباً ابتدا کے سوسے

زائد صفحات میں جوشش کے خاندانی حالات اور اسکی زندگی کے دوسرے واقعات معلوم کرکے محسن کے ساتھ لکھے ہیں۔ جہاں تک جوشش کی زبان کا تعلق ہے وہ وہی ہے جو اسکے ہمعصر شعراء کی زبان تھی لیکن اندازِ بیان میں کہیں کہیں میر کا انداز جھلکنے لگتا ہے۔

جوشش کی طرح اور نہ معلوم کتنے شعراء گذرے ہونگے جنہوں نے اُردو میں اچھے خیالات کا اضافہ کیا ہوگا مگر وہ منظر عام پر آسکے انجمن ترقی اُردو کی کوششیں اس سلسلہ میں قابل تحسین ہیں کہ اس نے بہت سی ایسی کتابوں سے جو بہت اچھی تھیں مگر عوام ان سے واقف نہ تھے واقف کرایا۔

جوشش کے رنگ اور زبان سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کرانے کے لئے نمونہ کے طور پر اُن کے چند شعر سُنئیے:۔

اس تغافل شعار کی باتیں — میں کوئی اعتبار کرتا ہوں
مرگیا ہوں پر اسکے آنے کا — اب تلک انتظار کرتا ہوں
زہر کے گھونٹ گھونٹ کر تجھ بن — صبح [illegible] کرتا ہوں
کیوں نہ مجھ پہ کرم کرے جوشش — جان اس پر نثار کرتا ہوں

تمہیدی خطبے

یہ گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے ہیں جو وہ اُردو زبان پر ہر سال کے آغاز میں دیا کرتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو دہلی سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں دتاسی کے صرف چھ خطبے شامل کئے گئے ہیں۔ قیمت درج نہیں۔

گارساں دتاسی ایشیا کے ایک بہت بڑے مستشرق گزرے ہیں وہ اُردو کے بڑے ہی خیر خواہ تھے۔ فرانس میں شعبۂ اُردو کے وہ پہلے پروفیسر تھے بلکہ شعبۂ اُردو کھلا ہی ان کی وجہ سے تھا۔ انہیں اُردو سے اتنا لگاؤ تھا کہ انہوں نے باغ وبہار، قصۂ گل بکاؤلی اور اسی قسم کی بہت سی کتابیں جو اُس زمانہ میں شائع ہو رہی تھیں ان کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں ان کے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۵ء تک کے خطبے شامل ہیں۔

دتاسی نے اپنی ساری زندگی مشرق کی زبانوں خصوصاً اُردو کی تحصیل اور ترویج میں گزاری۔ وہ ہر سال اپنے لکچر شروع کرنے سے پہلے اپنے طالب علموں کو جو نئے ہوں یا پُرانے ایک خطبہ دیا کرتے تھے جو اس ایک سال کی اُردو کی ترویج و ترقی پر ایک مکمل تبصرہ سا ہوتا تھا۔ انہیں میں سے چھ خطبوں کا ترجمہ اس کتاب میں ہے۔

ہماری غذا

یہ رابرٹ میکرسن کی تصنیف ہے جسے مبارز الدین احمد رفعت نے ترجمہ کیا ہے اور انجمن ترقی اُردو دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت [illegible]

ہمارے یہاں اس قسم کی کتابوں کی جن میں مخصوص مضامین ہوں بہت کمی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ہمیں بتایا ہے کہ غذا کا مقصد کیا ہے اور اس سے جسم کی تعمیر کیونکر ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے بتایا ہے کہ پروٹین اور حیاتین کیا ہے اور ان کی کتنی قسمیں ہیں اور کس جانور میں اور کس سبزی میں یا دالوں میں ان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے یا کس میں کتنی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے سامنے ایک ایسا گائڈ آجاتا ہے جو ہمیں ہماری خوراک اور اسکے اصول سے واقف کرادیتا ہے۔

ہر قسم کی سبزی، گوشت اور دالوں کے بارے میں حیات سے متعلق اس میں ہدایات اور ان کا تذکرہ ہے۔

وہ لوگ جو صحت کو ہزار نعمت سمجھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ

شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی قیمت [illegible]۔

ہمارے یہاں اُردو میں منظوم تاریخیں معدودے چند ہیں اور انہیں بھی عموماً وہ لوگ زیادہ دیکھتے ہیں جن میں تحقیق و تدقیق کا مادّہ ہوتا ہے ورنہ تاریخ کے اکثر طالب علم ان کی طرف سے بے نیاز ہیں۔

کسی چیز کو نظم کرنے کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی دلچسپی بڑھ جائے تاریخ ان لوگوں کیلئے جنہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ایک خشک مضمون ہے اسے دلکش بنانے کا شعر ایک اچھا ذریعہ ہے اسکے علاوہ نثر کی نسبت نظم زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ تاریخی حیثیت سے شعر کا وجود بھی نثر سے قدیم ہے۔ شعر کا تعلق دماغ کی ان لطیف کیفیتوں سے ہے جہاں آدمی پرواز کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن جب شعر پر پابندی لگ جاتی ہے اس وقت وہ جذبۂ لطیف اتنا آزادی کے ساتھ کام نہیں کرتا جتنا آزادی کے ساتھ بغیر کسی پابندی کے کام کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی دماغ کسی قید کے باوجود نہایت عمدگی اور سلیقہ کے ساتھ نظم کے اصل محاسن قائم رکھتے ہوئے شعری تخلیق کرے وہ یقیناً خلاق [illegible] ہے۔ یہ تاریخ بھی ایک پابندی کے ساتھ نظم کی گئی ہے۔ تاریخ کو نظم کرنے سے پہلے شاعر نے موضوع کے مآخذ اور اچھے [illegible]

[illegible]

[illegible] سلطنت [illegible] ... وہ ہے نثر میں اور ہے فارسی
کیا نظم اردو میں اس کو تمام ... کہ ہوں مستفیض اس سے سب خاص و عام

ان اشعار سے معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر نے ابو الفتح ضیاء الدین محمد کی تاریخ دکن کا ایک باب جو سلطنت بہمنیہ سے متعلق ہے اس کا ترجمہ فارسی نثر سے اردو نظم میں کیا ہے۔ سہیل دکن کا ایک شاعر ہے جس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں اسکے حالات زندگی کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں ملتا، ہاں اسکے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کام کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں شروع کیا ہے ؎

جوانی کا آتا ہے جس دم خیال ... تو ہوتا ہے [illegible] دل پر ملال
گئی عمر مانند آب رواں ... ہوا باغ تن پائمال خزاں
کہاں وہ طبیعت کا جوش و خروش ... قریں ہے کہ ہو شمع ہستی خموش
گزر وہ گیا میں پس کارواں

شاعر تا سن جوانی پر کچھ رسمی اور روایتی معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری واقفیت کے لئے بہت کافی ہے۔ سلاطین بہمنی کے بارے میں بھی تاریخ میں بہت رد و کد ہے۔ عام روایت ہے کہ حسن دہلی میں کسی منجم برہمن کا ملازم تھا۔ برہمن نے اس پر بہت مہربانی کی اور کچھ اراضی دہلی کے گرد و نواح میں کاشت کیلئے دے دی حسن کو ایک مرتبہ برہمن کے دئے ہوئے کھیت میں سے کچھ اشرفیاں ملیں تو وہ اس نے لیجا کر برہمن کی خدمت میں پیش کر دیں۔ برہمن بہت خوش ہوا اور دربار میں جا کر حسن کی ایمانداری کی تعریف کی پھر اس کا زائچہ دیکھا اور بزرگی کے آثار دیکھ کر اس سے کہا ؎

کہ درجات عالی پہ تجھ کو سعود ... سعادت ہے تیری جبیں سے نمود
فضل الٰہی ہے تو خوش نصیب ... ترا طالع چمکیگا اب عنقریب
میرے ساتھ یہ عہد و میثاق کر ... ترقی پہ ہو جبکہ تو جلوہ گر
مرا نام ہو جزو اسم کرام ... ترے ساتھ روشن ہو میرا بھی نام

اور اسی وجہ سے اس نے حسن گنگو بہمنی نام رکھا لیکن اسکے علاوہ ایک اور بھی روایت ہے جسے سہیل نے یہاں نقل بھی کر دیا ہے ؎

[illegible] کے جو مشہور ہے تا بہار ... کہ بہمن تھا ایک اور اسفندیار
[illegible] ہوا جس سے حسن ... یہ تھا نسل بہمن سے [illegible]
[illegible] ... حسن نام تھا [illegible]
[illegible] حسن سے [illegible]

کو قائم رکھنے کے لئے یہ لقب اختیار کیا۔ جہاں تک [illegible] نظم کا تعلق ہے نہایت خوب ہے۔ پڑھتے وقت کہیں کہیں مثنوی سحر البیان کا لطف آنے لگتا ہے مگر چونکہ سحر البیان جیسی چیزوں کی تفصیل نہیں اس لئے فوراً وہ لطف جاتا رہتا ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ پوری کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قسم کی چیزیں بہت نایاب ہوتی ہیں۔ یہ انجمن ترقی اردو کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمیں ایسی نایاب چیزیں اردو میں مل رہی ہیں۔ اہل ذوق کو چاہئے کہ اسے ضرور خریدیں۔

محمد رسول اللہ مترجمہ مولانا عبدالرحمٰن [illegible] رحمانی، پبلشرز، کتابستان پوسٹ بکس نمبر [illegible] بمبئی نمبر ۳۔ قیمت آٹھ آنے۔

یہ کتاب کارلائل کے ہیرو اور ہیرو ورشپ کے ایک جزو کا ترجمہ ہے جو بہت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے اور اصل مضمون کے محاسن اپنی جگہ قائم ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ نہیں ہو جاتی کہ اسے ایک انگریز نے لکھا ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کارلائل اپنے دور کا ایک بہت بڑا فاضل اور بہت بڑے دل و دماغ کا آدمی ہے اور اس کا قلم جس چیز پر بھی اٹھے گا بہت سوچ بچار کے بعد اٹھے گا۔ اس تمام مضمون میں کارلائل ہمیں کہیں بھی جذباتی نظر نہیں آتا بلکہ نہایت ٹھوس دلائل کے ساتھ تمام مضمون میں رسول اکرم کی زندگی کو لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ شخص جسے مسلمانوں کی کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ جب اس قسم کا موضوع لے کر بحث کرے گا تو بالکل ایک غیر جانبدارانہ حیثیت سے کرے گا۔ کارلائل کے قلم اور آواز کا بڑا وزن ہے اور اپنے دور میں بڑے عالم کا درجہ حاصل ہے۔ رسول اکرم کی زندگی اس انداز سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کا دماغ کسی غلط چیز کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس کے کانوں میں رسول اکرم کے بارے میں جو کلمات پڑتے تھے اسے اس نے ایک عرصہ تک سوچا، رسول اکرم کی زندگی کا مطالعہ کیا، اسلام سے واقفیت بہم پہنچائی، اسکے اصولوں کو ناقدانہ نظر سے دیکھا، عرب کے پہلے کے احوال کو نظروں کے سامنے رکھا، تاریخ سے انحراف نہیں کیا اور تب کہیں جاکر صحیح اندازہ ہو جس سے اس نے مضمون کیا وہ لکھ دیا۔

کتاب کسی خاص خوبصورت انداز میں نہیں چھپی ہوئی۔ کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ لیکن ہاں وہ موضوع جو کتاب کے اندر بند ہے بہت ضروری اور اہم ہے۔ بحث مباحثہ کے خیال سے اس کا مطالعہ کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن ہاں ایک صداقت کے متلاشی اور واقعات کو صحیح شکل میں دیکھنے والے کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے اس قسم کے لوگوں کیلئے گویا مذہب اسلام اور اسکی دعوت کے مطالعہ کیلئے ایک قدم ہے اور وہ لوگ جو محض انگریزی تحریر سے مرعوب ہو سکتے ہیں اسکے علاوہ کسی ہندی یا اعرابی کا قول ان کی نظر میں صادق نہیں ان لوگوں کے مرعوب کرنے کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے اس قسم کے لوگوں کیلئے کارلائل اور گوئٹے کا محمدؐ کو نبی مان لینا کافی دلیل ہے اس بات کی کہ وہ سچے اور برحق تھے۔

گورکی کی آپ بیتی

مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی

یہ گورکی کی آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے جس میں صرف اسکے بچپن کے واقعات ہیں۔ گورکی کا درجہ دور جدید کے افسانہ نویسوں اور ناول نویسوں کی فہرست میں بہت بڑا ہے لیکن اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوانح نگار کی حیثیت سے اس کا درجہ کسی سے کم نہیں۔

ہمارے موجودہ ادیب بڑی حد تک اُسی تحریک سے متاثر ہیں اور ہم آجکل جو اکثر کہانیوں اور افسانوں میں تیسرے طبقے کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اس کا علم بردار بھی صحیح معنوں میں گورکی ہی ہے ڈاکٹر صاحب جب مقدمہ میں گورکی کے ماحول سے ہمیں واقف کراتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ گورکی سے پہلے کا طرز تحریر صرف اونچے طبقے کے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔

ٹالسٹائی خود ایک بہت بڑا جاگیر دار تھا۔ ظاہر ہے کہ اسکی کہانیوں کے کردار اس اونچے طبقے کے لوگوں سے لئے گئے ہیں اسکے علاوہ چیخوف بھی اس گروہ سے متعلق ہے اور بقول اختر حسین کے کہ عوام ابھی تک ادب میں ایک...... محسوس کر رہے تھے۔ ایک اجنبیت اور کمی کا احساس ان کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ گورکی پہلا شخص ہے جس نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف بڑی شدت کے ساتھ کھینچا اور پہلی بار لوگوں نے محسوس کیا کہ کوئی انہیں میں سے بول رہا ہے اور ان کے دلوں میں جھانک کر اس آواز کو جو ایک گوشہ میں دبی ہوئی تھی باہر پھینک رہا ہے۔ انقلاب روس میں گورکی کا بڑا ہاتھ ہے۔

جو گورکی کی زندگی ہے وہی اس کا ادب ہے۔ اس کے ناول اور افسانہ پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر جگہ ایک کردار خود گورکی ہے کسی نہ کسی رنگ میں اسکی زندگی اور اس کا عمل اس کا ادب بھی مختلف چیزیں ہیں۔ وہ زندگی سے بے انتہا قریب اور زندگی سے یہ قربت ہی اس کی شہرت اور تکلیفوں کا باعث ہوئی۔

اس کی آپ بیتی بجائے خود ایک کہانی ہے "ایک امر کہانی" گورکی کی نانی، نانا اور ماموں اب بھی ہمارے گرد پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسکے باپ جیسے متوالے اور بے فکر جوان اب بھی ہمارے گرد پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسکے باپ جیسے متوالے اور بے فکر جوان اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں لیکن ہر شخص کے ہاتھ میں گورکی کا قلم نہیں۔ پھر آدمی کے پاس گورکی کی آنکھیں نہیں اور ہر انسان اتنا زود حس اور چیزوں کا متلاشی نہیں۔ ہر آدمی کو اپنی زندگی ایک شہد کی مکھیوں کا چھتہ نہیں معلوم ہوتا جہاں جاہل اور سیدھے سادے لوگ اپنے تجربات لے کر آئیں اور انہیں مالا مال کر کے لوٹ جائیں۔

یہ واقعہ ہے اس ہندوستان میں بھی ہزاروں انسان ایسے ہیں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں جنکی زندگی اگر گورکی کی قسم سے لکھی جائے تو اس کی داستان کو بھی ماند کر دے۔ مگر جیسا میں نے کہا ہر شخص گورکی نہیں۔ جب اس قسم کی گفتگو ہمارے نزدیک کی جاتی ہے جیسی گورکی کے ارد گرد ہوا کرتی تھی تو ہم گفتگو کرنیوالوں کو جھلا کر دھتکار دیتے ہیں۔ "کیا بکواس ہے"، "بیہودے وقت خراب کرتے ہیں"، "دماغ چاٹ لیا"۔ لیکن گورکی کا دماغ اس قدر موم نہیں جو اتنی آسانی سے چاٹا جا سکے بلکہ ایک لچکدار پتھر ہے جس پر یہ ساری چیزیں اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور تیس چالیس سال بعد بھی اتنی ہی تر و تازہ ہیں جتنی ابتداء میں تھیں۔

گورکی ایک لڑکا، ضدی اور ..... بچہ ہے۔ دن بھر دھما کے بچیں گروہ کا دی۔ کوئی عجیب کردار نہیں۔ ہمارے عام بچوں سے مختلف ہیں۔ دن بھر ہمارے معمولی گھرانوں میں ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ ہر جاہل اور غریب گھر میں گورکی پلتے ہیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ آخر میں جا کر گورکی ثابت نہیں ہوتے۔ وہی مزدور جو ہر روز کمانے والا، ایک میلی کچیلی عورت کا خاوند تلخ کے بچوں کی

ایک قطار ساتھ لئے ہوئے، روتے، بھٹکتے، مبتسمانے، اپنے
کا جیسے اور گورکی اپنے کثیف تعیش سے پیدا کرتا رہتا ہے
گورکی اپنے افسانوں کی طرح آپ بیتی میں بھی کردار کو پس منظر
میں رکھ کر ماحول کو اُبھارتا ہے۔ اس کا ماحول ہی انسانی کردار کا
ذمہ دار ہے۔ اس کا قلم ایک مصوّر کا قلم بن کر ماحول کی نقشہ کشی کرتا
ہے ایک جگہ ایک منظر یوں بیان کرتا ہے۔

"اسٹول پر کھڑے ہو کر میں بالائی ہیرو کے سے کارخانے
کے پھاٹک کو دیکھ سکتا تھا، جیسے کسی بوڑھے بھکاری کے کالے
اور پوپلے منہ کی طرح ادھ جلی لالٹینیں اُبالتی تھیں اور انسانوں کا گروہ
اسکے اندر آجاتا تھا۔ دوپہر کو پھاٹک کا سیاہ دہانہ دوبارہ کھلتا
اور کارخانہ ادھ جبا کے مزدوروں کو باہر اُگل دیتا۔ یہ لوگ کالی نالی
کی مانند سڑک پر بہتے جاتے تھے۔ حتّٰی کہ برفیلی ہوا کا جھونکا انہیں
مکانوں کے اندر دھکیل دیتا!"

یہ تمام واقعات اور ماحول وہ ہے جو چالیس سال بعد بھی
گورکی کے دماغ میں روزِ اوّل کی طرح محفوظ ہے۔ یادداشت اور
قوّتِ بیان ہی دو چیزیں گورکی کی میراث ہیں اور کہانیوں کے کردار
پلاٹ، کہانیاں گورکی کی زندگی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین نے ترجمہ بھی نہایت برجستہ انداز میں کیا ہے
اور زبان وہ استعمال کی ہے جسے صحیح معنوں میں ہندوستانی کہنا
چاہئے۔ اختر حسین رائے پوری اور گورکی دونوں شخصیتیں ایسی ہیں
جن کے تعارف کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اور یہی دونوں نام کتاب
کی جاذبیت اور اچھا ہونے کی دلیل میں کافی ہیں۔

ٹراٹسکی کا بیان

مترجمہ ایم۔ ایم۔ جوہر، شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، قیمت ۱۰ر

یہ مختصر سا مجموعہ ان بیانات کا ترجمہ ہے جو ٹراٹسکی نے اپنی
برنت میں دئے تھے۔

حکومت نے ٹراٹسکی اور اسکے لڑکے پر چند الزامات لگائے تھے
اس مقدمہ میں گولڈمین ٹراٹسکی کا وکیل تھا۔ ان بیانات میں ٹراٹسکی
نے ہر چیز کو واضح طور پر بتایا ہے۔

جو الزامات ٹراٹسکی پر لگائے گئے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔
۱۔ سوویٹ یونین کے حکومتی طبقے کے سربرآوردہ لوگوں
کے قتل کی سازشیں، خاص کر کرٹ کا قتل۔
۲۔ سوویٹ یونین میں کارخانوں، ریلوں کے تباہ کرنے کی
عملی تدبیریں تاکہ اقتصادی نظام درہم برہم ہو جائے۔
۳۔ سوویٹ یونین کے نظام کو تباہ کرنے کے لئے ایک جماعت
کی تنظیم جس کا مقصد یہ ہے کہ مزدوروں اور فوجیوں کو قتل کیا جائے
تاکہ سوویٹ یونین کی فوجی طاقت کو صدمہ پہنچے۔
۴۔ جرمنی اور جاپان سے خفیہ سازباز۔ تاکہ یہ دونوں ملک
سوویٹ یونین پر حملہ کریں اور یونین میں اندرونی بدنظمی پیدا کرنا تاکہ
ٹراٹسکی خود سوویٹ یونین کا حاکم بن جائے۔
۵۔ سوویٹ یونین میں سوشلسٹ طریقِ پیداوار کا خاتمہ اور
سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کو ازسرِ نو زندہ کرنے کی کوشش،

ٹراٹسکی نے انہیں اعتراضات کا جواب اس کتاب میں دیا ہے۔
لینن کے بعد ٹراٹسکی اور سٹالن کے درمیان کچھ کشیدگی ہو گئی
جس کی بنا پر دونوں میں ایک گہری خلیج حائل ہو گئی یہانتک کہ اسے
روس سے نکال دیا گیا اور آخر میں میکسیکو میں اسے قتل کرا دیا گیا۔
سوویٹ یونین کی کارگزاریوں سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے
یہ کتاب بہت کافی مفید ہے۔

کتاب کے شروع میں مترجم نے سوویٹ یونین کی کارگزاریوں
کو شروع سے لیکر انہیں مختصراً بیان بھی کیا ہے جس سے ٹراٹسکی اور
سٹالن کے جھگڑے اور بعد کی وجہ اور نوعیت معلوم ہو جاتی ہے
ٹراٹسکی لینن کے خاص ساتھیوں میں سے ایک ہے......
.... ہیں۔ لینن کے ساتھ ٹراٹسکی
کی زندگی اور اسکی کارگزاریوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔

شانِ خدا

مؤلفہ مولانا عبید الرحمٰن عاقل رحمانی، پبلشرز:- کتابستان، پوسٹ بکس ۲۱۶۴ بمبئی نمبر ۲ قیمت ۲ء

اس کتاب میں عاقل صاحب نے خدا کے وجود اور اسکی
صفات کا تذکرہ کیا ہے۔

ہمارا یہ دور مادیّت کا دور ہے۔ آج سے ایک عرصہ پہلے
یورپ ایک نہایت ہی بُرے دور سے گزرا۔ اسکے بعد جو دور
شروع ہوا جسے احیاءِ علوم کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی بنا پر
سے یونانی مفکرین کا سرمایہ منتقل ہو کر یورپ کے ممالک میں پہنچنے
لگا۔ یورپ کی موجودہ ترقی اسی احیاءِ علوم کے بعد سے شروع ہوئی
ہے۔ یہ ترقی ہر طرف دوڑنے لگی۔ یہانتک کہ مذہب کے بارے
میں بھی لوگ آزاد خیال ہونے لگے۔ جہاں تک مذہبی خیالات
کی طرف کا سوال تھا اس میں کوئی حرج نہیں ضرورت تھی کہ پورا

[illegible] تھا۔ لیکن یہ مادیت بڑھ کر اتنی ہو گئی کہ اسکے بعد کسی مذہب کی ضرورت باقی نہ رہی یا یوں کہئے کہ مذہب بھی تجارتی اصولوں پر رائج ہو گیا۔

اس تجارتی مذہب نے ایک عرصہ بعد مغرب میں کروٹ بدلی اور لوگ پھر روحانیت پر یقین رکھنے لگے لیکن ہندوستان ایک کثیر آبادی ہے نئے اور پرانے غلاموں کی۔ یہاں جو چیز بھی یورپ سے آئی مذہب بن گئی۔ بادشاہ کی زبان تو خیر رعیت کی زبان بننے ہی لگی۔ لیکن مذہب کے سلسلے میں بھی لوگ کئی قدم آگے بڑھنے لگے اور دہریت فیشن میں داخل ہو گئی۔

لیکن ان فیشن پرست لوگوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے دہریت کو صحیح معنی میں سمجھا اور ہندوستان کی مشکلوں کا واحد حل قرار دیا۔ دراصل وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جسکے نیچے دنیا کا ہر طبقہ پس رہا تھا ایک ساتھ ایسا جذبہ اُبھرا کہ آدمی کو ہر چیز سے بغاوت کرتے ہی بنی۔ یہ تحریک یورپ سے یورپ سے خصوصاً روس سے شروع ہو کر ہندوستان پہنچی

اس سے بحث نہیں کہ تحریک کیسی ہے — اتنا ضرور ضرور کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں نے اس کی ضرورت محسوس کی اور نمایاں طور پر قدیم عناصر سے اپنی بیزاری کا اعلان کر دیا۔

یہ تحریک ابھی تک اسی طرح جاری ہے لیکن ہمیں صرف یہاں خدا کے وجود سے بحث ہے۔ بحث ہم یہاں خود نہیں چھیڑ رہے بلکہ اس کتاب کا موضوع یہ ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہتے جو دہریت پر یقین رکھنے کے علاوہ اس پر مصر بھی ہیں اور اپنے پاس اس کے جواز میں دلائل بھی رکھتے ہیں اور جن کے پاس اپنی بربیت میں دلائل نہیں ان کے لئے یہ کتاب یقیناً مفید ہو گی۔

عاقل صاحب نے کتاب کے کچھ حصے کئے ہیں اور حصے قائم کر کے بتدریج آگے بڑھے ہیں۔ پہلے حصہ میں خدا کے ہونے کے دلائل پیش کئے گئے ہیں اور قرآن کی آیتوں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے مفکرین عالم کے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔ ان اقوال کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ مذہب ایک فطری چیز ہے۔ اور خدا کا وجود ہے۔ اس حصہ میں ان کی ان تھک کوشش بالکل صاف اور نمایاں ہے۔ اسکے علاوہ اس حصہ میں انہوں نے بڑے بڑے مفکروں کے اعتراضات نقل کر کے ان کے جوابات بھی دئے ہیں۔

دوسرے حصہ میں انہوں نے [illegible] کو ثابت کیا ہے اور یہاں بھی کلام اللہ کی آیتیں [illegible]

تیسرے حصہ میں صفات الٰہی کا بیان ہے۔

ان دونوں حصوں میں بھی مشہور فلسفیوں کے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ غرضیکہ پوری کتاب خدا کے بارے میں کچھ جاننے والے کے لئے یا خدا کے جاننے کی خواہش رکھنے والے کیلئے نہایت مفید ہے۔ کتاب کے نام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری جماعت کے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن ایسا نہیں۔ کتاب نہایت فلسفیانہ، عاقلانہ اور عالمانہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔

نازیت

شاہ حسین رزاقی ایم۔اے (عثمانیہ)
شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت عہ

ہمارے زمانہ کی جنگ دو ہی ناموں سے تعبیر کی جارہی ہے مارکسزم اور نازی ازم۔ دراصل یہ جنگ ہے بھی دو ہی قوتوں کے درمیان۔ ایک مارکس قوت اور دوسری نازی قوت۔ اس کتاب میں مارکسی نہیں بلکہ نازی قوت سے بحث کی گئی ہے [illegible] جرمنی کی ابتدائی قوت سے بحث کی گئی ہے اور جرمنی کی ابتدائی کشمکش سے شروع کر کے ہمارے موجودہ دور تک کے واقعات بیان کئے ہیں۔

دراصل ہماری وہ تمام تاریخ جب سے انسان نے موجودہ دنیا کا شعور حاصل کیا ہے آمریت اور عمومیت کے ساتھ رہی ہے جوں جوں انسان بڑھتا جارہا ہے فرد کو ترجیح دیا جارہا ہے اور یہ فرد کی بقاء کا سوال اب اتنا اہم ہو گیا ہے کہ کتابیں کی کتابیں اس پر لکھی جاچکی ہیں۔

فرد کے خیال کو اُجاگر کرنے والا تاریخ میں سب سے پیش پیش روسو ہے اور اسکے اس خیال نے انقلاب فرانس میں بڑی مدد دی تھی۔

اسی خیال کو لے کر جرمن قوم اُٹھی تھی۔ قوم نہیں، ہٹلر سے بہت پہلے ہونے والے جرمنی کے کرتا دھرتا فریڈرک اعظم اور بسمارک۔ آج کی تمام ذہنیت وہی ہے جو بسمارک کے تخیل سے شکل کر تھوڑی بہت نمایاں ہوئی تھی۔ جرمنی کی [illegible] کا خیال ایک عرصہ پہلے لوگوں کے ذہن میں [illegible]

[illegible] جائے گا [illegible] ہو جائے۔ یہ خوفناک
[illegible] کا مظاہرہ ہے۔

اس کتاب میں شاہد صاحب نے جرمن قوم کے رجحانات،
اس کا فلسفہ، اس میں کام کرنے والے اجزا کا بالتفصیل
تذکرہ کیا ہے۔

جرمن قوم کے رجحانات کے علاوہ نازی ازم کا مفہوم۔
اس کی وجہ تسمیہ اور اس کے آغاز کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے
ہٹلر کس طرح اس حلقہ میں آیا۔ نازی پارٹی کا آغاز کیونکر ہوا اور
کس طرح ہٹلر کو اقتدار حاصل ہوا۔

اس میں شک نہیں جرمن قوم کا موجودہ رویہ ایک زبردست
دباؤ کے نیچے دبے رہنے کی بنا پر اس قسم کا ہو گیا ہے کہ وہ
آج ساری دُنیا کو اپنے زیرنگیں اور اپنی نوآبادیات کی شکل میں
دیکھنا چاہتی ہے لیکن یہ تمام خواہش خود غرضی کی بدترین مثال ہے
دورِ جدید کی تمام قومیں اس کشمکش میں مبتلا ہیں لیکن انفرادی
آزار کا خیال رکھتے ہوئے کسی کو بھی دوسرے پر غلبہ پانے کا
حق نہیں۔

ہٹلر کی شخصیت اور اسکے ساتھ ہی اس کی ذہنیت کو
بنانے والی قوتوں کا تذکرہ اس کتاب میں نہایت عمدہ طریقہ
سے کیا گیا ہے۔ قومی اشتراکی جماعت کا نصب العین جو بعد میں
صرف نازی جماعت کہلائی ابتدا میں کیا تھا۔ اس نے خود
جرمنی میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے کس طرح جد و جہد کی؟ اسے
کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟ کس کس قسم کی چالاکیاں اور
عیاریاں عمل میں لائی گئیں۔ کس طرح اس پارٹی نے لوگوں کو اپنا
ہم نوا بنایا اور کیونکر پورے ملک کی فضا کو بدل دیا۔ یہودیوں
کے طرز عمل نے جرمنوں پر کیا اثر کیا۔

آخر میں شاہد صاحب نے فرد اور ــــ ، عمومیت،
[illegible]دت، آمریت اور اہلیت اور مرکزیت پر اپنی رائے دی ہے
[illegible] اسکے ساتھ ہی پورے ماحول کی معاشرتی، معاشی اور اخلاقی
[illegible]ت پر تبصرہ کیا ہے غرضیکہ یہ ہی کتاب جرمنی، اس کی موجودہ
[illegible] اور کوششوں سے پُر ہے۔

اس قسم کی کتابیں جب ہم دیکھتے ہیں تو فوراً محسوس کرنے لگتے
ہیں کہ اب ہم ذہنی طور پر کس طرف جا رہے ہیں [illegible] کی ضروریات
کیا ہیں اور اب ہمیں کون کون سے طریقے اپنے بچاؤ اور ترقی کے
لئے اختیار کرنے چاہئیں۔

اُردو زبان میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جنہیں مفید کہا
جا سکے خصوصاً بچوں کے لئے۔ دراصل تربیت اطفال ہی وہ
چیز ہے جو کسی قوم کی زندگی پر صحیح معنی میں اثرانداز ہوتی ہے
یہ چیز دوسرے ملکوں میں بہت نمایاں اور صاف ہے کہ وہاں
بچوں کی تربیت، صحت اور تعلیم کا خاص خیال رکھا جاتا ہے
اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بچے تندرست اور تعلیم یافتہ ہوتے
ہیں۔ اس تندرستی کا اثر آئندہ آنے والی نسل پر براہ راست پڑتا
ہے مگر ہمارے ملک میں ابھی تک بچوں کی تربیت کا کوئی خاص
خیال نہیں کیا جاتا۔

کھیل ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر بچے کی تندرستی اور صحت
پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ وہ بچے جو تندرست
اور صحت مند ہوتے ہیں اکثر ذہین ہوتے ہیں اور یہی تندرست
بچے آئندہ نسل کی صحت و قوت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ چنانچہ
کھیل بچہ کے لئے نہایت ضروری شے ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ
محض کھیل کے ذریعہ بچہ اپنی ذہنیت کا اظہار کرنے لگتا ہے
اور بعض عقلمند والدین محض اُسے کھیلتا ہوا دیکھ کر اندازہ لگا
لیتے ہیں کہ اس کا رجحان کس طرف ہے اور پھر اسی رجحان کے
پیش نظر پوری کوشش کرتے ہیں کہ اس کی تربیت اور تعلیم کن
ترتیبی بنیادوں پر ہونی چاہئے۔

مگر کچھ والدین ایسے بھی ہیں جو ابھی تک بچوں کے کھیل کود
کو لہو و لعب کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے
ہماری بدلتی ہوئی دُنیا میں کوئی گنجائش نہیں۔ ایسی قسم کے لوگوں کی
اولاد سوکھی ہوئی چڑچڑی۔ ڈرپوک اور بدہیئت ہو کر گھروں
سے نکلتی ہے۔

خواجہ الطاف نے ہندوستانی کھیلوں پر کتاب لکھ کر بڑی
قومی خدمت کی ہے۔ مانا کہ ادبی اور تاریخی طور پر اس کی کوئی
اہمیت نہیں۔ لیکن یہ کتاب جس کی بچوں کی دُنیا میں بڑی اہمیت
ہے ان تمام چیزوں کے لئے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔
اس کتاب میں خواجہ صاحب نے ہندوستان میں کھیلے

ثروت آرا بیگم

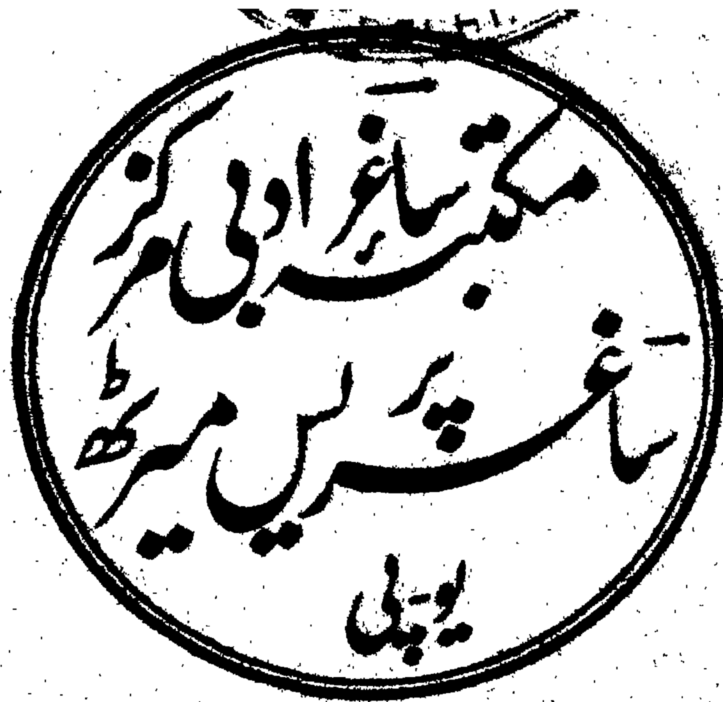
محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ جو ہندوستان کی ادیبہ خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرما دی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں زندگی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گذری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں۔ ناول میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ مُنہ سے بول رہا ہے کہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے کہ انداز بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھُلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا یہی نہیں "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر تہذیب و تمدن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھ کر دِلّی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اسکے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلّی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادرِ محترم آنریبل مسٹر فخر الدین علی احمد سابق ریونیو منسٹر آسام کے نام معنون کیا ہے۔ شروع میں فخر الدین صاحب کی تصویر بھی شریک کتاب ہے۔ — منیجر

ملنے کا پتہ:- مکتبہ ساغر ادبی مرکز میسٹن
رسالہ "ادیب" دہلی



Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.



اس نمبر کے چند لکھنے والے

مرزا یگانہ چنگیزی
نواب جعفر علی خاں اثر بی۔ اے
حامد حسین قادری
رام پرتاپ بہادر ایم۔ اے
فراق گورکھپوری
عطاء اللہ
احمد ندیم قاسمی
اکرام قمر بی۔ اے

مدیر اعلیٰ

ساغر نظامی

رنگ محل

ساغر کی رومانی نظموں، غزلوں اور گیتوں کا نیا مجموعہ

شعر و ادب کا دلکش مرکب، رومانیت و واقعیت کا مؤثر امتزاج، جدید شاعری کے تمام تر تقاضوں کا حامل، رنگ محل کی ہر نظم انسانی ذہن و روح کیلئے فکر و نشاط کا شاید بالکل مختلف پیمانہ ہے۔ اس پیمانہ میں زندگی انوکھے انداز میں چھلکتی ہے رنگ محل کی نظموں کی رومانیت داخلی ہی نہیں ایک خارجی ماحول بھی بناتی ہے جس کے پس منظر میں زندگی کے آنسو بھی ہیں مسکراہٹ بھی، محبت کا جنون بھی ہے اسکی بے بنیادی بھی، اکثر نظمیں "رنگ محل" سے نکل کر زندگی کے تپتے ہوئے میدانوں میں جاکر دم لیتی ہیں۔ گیتوں کی بنیاد قدرتی اور نفسیاتی حقائق پر قائم ہے ان میں دبا دبا دکھ ہے، پر یہ دکھ یوں ہی نہیں گنگناتے گنگناتے پڑھنے والے کے آنسو یہ بھید کہہ ہی دیتے ہیں، شاعر کی روح پر جو پہاڑ ٹوٹے ہیں کچھ ایسا ہی بوجھ میرے سینہ پر بھی ہے۔

تمام نظموں میں شاعر کا اخلاص کارفرما ہے سماجی تصورات کی کھوکھلی نہیں مؤثر نمائندگی کی گئی ہے۔ ہر چبھتا ہوا شعر اپنی تاثیر کے لحاظ سے خود اس بات کی دلیل ہے کہ سیاسی تصورات ہوں یا سماجی، رومانی تاثرات ہوں یا احساسات، فکری عناصر ہوں یا روحانی شاعر نے ان تمام طوفانوں کو روایاتی نہیں حقیقی طور پر محسوس کیا ہے، دور سے نہیں قریب سے دیکھا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ساحل سے موجوں کا تماشائی نہیں، بلکہ کیفیات و واردات کے طوفانوں میں تھپیڑے کھانے کا عادی ہے۔

جدید مفکر و شاعر کی حیثیت سے اردو شعر و ادب میں ساغر کی مسلمہ شخصیت کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں لیکن اس کی نئی تصنیف نے اسکے جوہر کو مخصوص طور پر نمایاں کر دیا ہے۔ ساغر کی نئی تصنیف حیات اور اسرارِ حیات کے متعلق نئی نسل کیلئے ایک جدید اشارہ ہے۔ قیمت عہ

ناشر

ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن

ملنے کا پتہ

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز پونا

[illegible]

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ



ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومتِ صوبہ متحدہ، حکومتِ بہار

حکومتِ سی۔پی اور حکومتِ صوبہ پنجاب

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

([illegible])

قیمت سالانہ [illegible] روپیہ (دوسرے ممالک سے)
(ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن)

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر آٹھ آنے

ماہنامہ ایشیا

ناظم:- اسد یار خان اعظم

ادبی مرکز میرٹھ

دسمبر ۱۹۴۲ء

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	ہمارے نقاد "نگار" کا ریاض نمبر	ساغر نظامی	۳
	نئی صبح (ادبیات سیاسیات)		
۲	حکومت کا دائرہ عمل	علیم اللہ صدیقی بی-اے (جامعی)	۶
۳	غزل	ولی وارثی	۱۲
۴	اخبار نویسوں کی قیمت	رئیس امروہوی	۱۳
۵	رباعی	مرزا یگانہ چنگیزی علیہ السلام	۱۶
۶	میکاولی کا سیاسی فلسفہ	اکرام قمر ایم-اے	۱۷
۷	افکار	ساغر نظامی	۲۱
۸	چین میں امداد باہمی	عطاء اللہ	۲۲
۹	منتشر جذبے	ساغر نظامی	۲۵
۱۰	منشی جی	حامد حسین قادری	۲۶
	نیا راگ (نظم و غزل)		
۱۱	آدرش	ساغر نظامی	۳۰
۱۲	ساقی	نواب جعفر علی خاں اثر بی-اے	۳۲
۱۳	احساس کی چٹکی	احمد ندیم قاسمی	۳۳
۱۴	دو غزلیں	ظفر تاباں دہلوی - فراق گورکھپوری	۳۴
۱۵	نئی موج طوفان	ساغر نظامی	۳۵
۱۶	غزل	اقبال صفی پوری	۳۶
	نئی کہانی (افسانے ڈرامے)		
۱۷	اندر اور باہر	رام پرتاپ بہادر ایم-اے	۳۸
۱۸	آتش و آہن	م-ش حقی	۴۱
۱۹	ایک خط	محمد صدیق ایم-اے	۴۲
	کسوٹی (کتابیں)		
۲۰	جاک کے سو شعر	ساغر نظامی	۴۶
	تصویر کدہ (قلمی انتقاد)		
۲۱	ایک کتاب (شالامار پکچرز کی پہلی تصویر)	ساغر نظامی	۵۴

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

جلد ۷ | دسمبر ۱۹۴۲ء | نمبر (۱۱)

ہمارے نقّاد

("نگار" کا ریاض نمبر)

نگار کا جنوری فروری ۱۹۴۳ء نمبر "ریاض نمبر" کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ انتساب، اعترافات، اور انتخابِ کلامِ ریاض، اڈیٹر کے قلم سے ہے اور باقی مضامین دوسرے مضامین نگار حضرات کے ہیں۔ سیّد عقیل احمد جعفری 'ریاض مرحوم کے عزیز ہیں'۔ اس لئے سوانح حیات، 'ریاض کی شوخیاں'، مکاتیب ریاض، ریاض کے بعض انتقادی مباحث وغیرہ جیسے اہم اور ضروری عنوانات پر ان کے مضامین نہایت موزوں ہیں۔

اس نمبر پر تفصیلی نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ اک جائزہ تنقید کے اُس زاویۂ نگاہ کا لیا جائے جو ہمارے نام نہاد نقّادوں نے بنا لیا ہے اور جس سے وہ اُردو شعر و ادب کی چھان بین کرتے ہیں، اس سلسلے میں ذیل کی سطور بڑی حد تک بنیاد کا کام دے سکتی ہیں:—

"انتقاد کی ایک عام غلطی جس میں تقریباً ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے یہ ہے کہ نقّاد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ لکھنے والے نے کسی ذوق کی رعایت کس حد تک کی ہے اور اسکے نقطۂ خیال سے کن کن ساختہ ایک تصنیف کا مکمل کیا جا سکتا ہے اور اسکے بعد وہ ایک قطعی حکم لگا دیتا ہے کہ فلاں جزو یا کتاب کا اچھا اور فلاں خراب ہے۔ میرے نزدیک یہ اصولی غلطی ہے اگر ایک شخص کا دماغ زندگی کے مختلف شعبوں [illegible] نگاہ جات سے کثیر الاتفاق [illegible]

جذبات انسانی کے مختلف کوائف، تکمیل فن کی متعدد اشکال، اور فطرت کے بوقلموں مظاہر سے علیحدہ علیحدہ لطف اندوز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا تو اس کو انتقادی ذمّہ داریاں اپنے سر نہ لینا چاہئے کیونکہ اسکے لئے ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو ہمہ گیر ہو اور ہر چیز کی جداگانہ حیثیت و امتیاز کو سمجھ کر اسکے نقائص و محاسن کا درک کر سکے لیکن چونکہ یہ صفت شاذ و نادر کسی میں پائی جاتی ہے، اس لئے حقیقی معنی میں نقّاد کا وجود بھی بہت کم نظر آتا ہے اور عام طور پر انتقادی مقالے تنقیصی جمع سے زیادہ کوئی اور حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔

فرض کیجئے ایک نقّاد فطرت کی طرف سے یہ ذوق لے کر آیا ہے کہ جذبات سوز و گداز کو پسند کرتا ہے اور یہ پسندیدگی اس قدر غلو کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی اور جذبہ اس کو پسند ہی نہیں آتا تو اس کو یقیناً نقد کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، نقد وہی شخص کر سکتا ہے جو اگر ایک طرف میر کے اس شعر پر سر دُھن سکتا ہے ؂

سب ہوئے نادم پئے تدبیر [illegible]
تیرا کلام [illegible] سے لیکن [illegible]

تو دوسری طرف داغ کا یہ شعر بھی اسے بے حد پسند ہے

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے ہوا
چھپاتے ہیں جو وہ سینہ کمر نہیں چھپتی

الغرض نقاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کی طبیعت اپنی اپنی جگہ ہر رنگ کا لطف اُٹھا سکتی ہو، اور وہ ہر کتاب کا مطالعہ صرف اس کے موضوع اور مصنف کے میلانِ طبع کے لحاظ سے کرسکتا ہو۔" (نگار ریاض نمبر)

ہر چند کہ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے، شبلی کا زاویۂ نگاہ نیاز کے الفاظ میں ہے، مگر نیاز اردو ادب کی ایک ایسی شخصیت کے الفاظ ہیں جو اپنا منکرِ فطرت کے لئے مشہور ہے۔ ہر چند کہ یہ شذرہ موقع کے لحاظ سے ایک اختیاری اصول کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن یہ اپنی جگہ بہت کچھ حقیقی ہے، غالباً اتنا حقیقی کہ خود نیاز کی رہبری کرسکتا ہے۔

آئیے ہم آپ کو ذرا وضاحت کے ساتھ یہ بتائیں کہ اُردو ادب میں انتقاد کے نام پر برسوں سے انفرادی رائے زنی کی محض ایک قیامت برپا ہے، صحیح تنقید کا تو ذکر ہی کیا، غلط تنقید کا بھی وجود نہیں، ملک میں گنتی کے چند محدود مطالعہ اور دقیانوسی رائے رکھنے والے ایک دو نثر نگار ہیں، جو اس وقت تک ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی اور اپنے جانبدارانہ ادبی مصالح کی خاطر چند مخصوص شعراء کی نقابت کرتے آئے ہیں۔ خود نیاز فتحپوری جن کو شاید اپنے متعلق یہ دھوکہ ہے کہ وہ بھی اپنی جیب میں اک کسوٹی رکھتے ہیں اور جوہر کو پرکھ سکتے ہیں بذاتِ خود اک فریبِ عظیم ہیں۔

یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ شعراء و ادباء ان کے معائب و محاسن انکے شعر ادب اور اس کی اقدار ....

.... ان کے ادبی فروغ کے امکان و عدم امکان پر اعلیٰ نقاد اور مفکر کی طرح غور کرنا نیاز کے بس کی بات ہی نہیں، ....

....

....

نیاز کی نقادی ہی میں نہیں تمام اندازِ تحریر میں ایک سن رسیدہ حکیم کا سا عالمِ ناز تو پایا جاتا ہے مگر ایک مفکر اور وسیع النظر نقاد کی سی گہرائی مفقود ہے۔"

.... ایک ادھیڑ عمر شعلہ جمال مہارانی جو جوانی ڈھل جانے کے باوجود ماضی کی تمام فتح مندیوں کے تصور، اور حاضر قوتوں کے سہارے نفرت و محبت میں انتہا پسند بھی ہے اور اشیاء و افراد کی [illegible] قطعیت سے کام لیتی ہے، کچھ ایسا ہی عالم نیاز کے تنقیدی [illegible] کا ہے، یہ شخص عدل و جوہر شناسی اور صلاحیت و رہبری سے [illegible] عاجز ہے، لیکن جس زبان میں "شعر العجم" کے بعد ایک جامع [illegible] نہ لکھی جاسکی ہو، اُس زبان میں ہر کہہ و مہ کو نمایاں ہو جانا تعجب سے نہیں، نیاز کے اندازِ تحریر کی چمک ضرور دلوں کو لبھاتی ہے اور دور سے انکو نشاط دکھاتا بھی دل چھین لے جاتا ہے، مگر محض طنز یاتی چٹکلوں اور نخروں سے تنقید جیسا اعلیٰ فریضہ کو کوئی تعلق نہیں، ایک اور بھی بات ہے، نیاز اک تو ظہور و ناقص جمالیاتی و رومانی جمعکی پیداوار ہے اُس نے اور اسکے معاصرین نے ادب میں رومانوی جمالیاتی ادب کے ارتقاء کیلئے جو کوششیں کیں وہ اپنی جگہ مسلم ہیں، لیکن یہ عہد ابھی مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُردو ادب میں تاریخ نے جست لگائی اور نئے نظریوں نے تبدیلی و تغیر کی رفتار کو بالکل نئی سمتوں میں موڑ دیا۔ ادب کے نئے تقاضوں اور بدلتے ہوئے اسالیب و مقاصد کی بنیادوں کو نیاز نے نہ دوسری زبانوں کے ادب میں مطالعہ کیا اور نہ زمانہ کے بطن سے پیدا ہونے والے طوفان کو محسوس کیا اس لئے نئی چیزوں کا اندازہ تو وہ خود کر ہی نہیں سکتا تھا، لیکن قدیم شاعری خاص کر غزل کے متعلق بھی اس کا تنقیدی زاویۂ نگاہ قطعی "ذوقی" و "انفرادی" حیثیت رکھتا ہے، مومن کو غالب پر ترجیح دینا، ابن یمین کو حافظ سے بڑھانا اور طرح طرح کی عجیب حرکتیں کرنا، یہ اصل میں ممتاز و ممیز ہونے کی تدابیر تھیں، ورنہ اس کی طرف سے کوئی تعمیری کوشش ظہور میں آنی چاہئے تھی جو شعر و ادب کی تعمیر میں مدد دیتی، اسکے یہاں تنقید محض تخریب و تردید کا دوسرا نام ہے، وہ اس عمل کو اپنی کامیابی و برتری سمجھتا ہے کہ اُسے بلور کا گلاس دیا جائے اور پوچھا جائے "نیاز صاحب یہ گلاس کیسا ہے؟" وہ اس گلاس کو ہاتھ میں لے اور زمین پر پٹک کر چور چور کردے، پھر کہے، اچھا ہے مگر ٹوٹ جاتا ہے"

اکثر جگہ اسکی رائے ذاتی دشمنی و دوستی کے ماتحت بھی ہوتی ہے جیسے کہ جوش ملیح آبادی کے خلاف اس کا کمزور جہاد، یا سیماب اکبر آبادی کی تائید (جو بعض وقتی مصالح کے پیشِ نظر کی گئی تھی) یا اس تائید کے بعد پھر اُن کی شدید تردید، (یہ تردید بھی دوسرے مخالف جذبہ کے ماتحت کی گئی تھی)، یا "اُردو شاعری نمبر" اور اس سے تعلق رکھنے والا [illegible] نمبر، یا اب یہ "ریاض نمبر"۔

جہاں تک ریاض خیرآبادی کا تعلق ہے وہ بہر حال [illegible]

نئی صبح

علیم اللہ صدیقی بی اے (جامعی)

حکومت کا دائرۂ عمل

ازمنۂ قدیم سے یہ مسئلہ مرکزِ بحث رہا ہے کہ حکومت کا دائرۂ عمل کیا ہو؟ عہدِ جدید میں بھی یہ مسئلہ مفکرین کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے اور ابتک ایسا کوئی حل نہ نکل سکا جس پر تمام اربابِ فکر متفق ہو جائیں۔ میں نے اس مضمون میں سب سے پہلے یونانی، اسلامی اور مسیحی نظریوں کا صرف ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے اور ان پر تنقید وتبصرہ کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی کیونکہ ان نظریوں کا عملی شکل میں کہیں اس عہد میں وجود نہیں ہے، لیکن عہد جدید کے دو مشہور نظریوں، سوشلزم، اور اس کی مختلف قسموں، اور انفرادیت .... کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور ان کی اچھائیاں اور برائیاں سنجیدگی کے ساتھ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یونانی نظریہ

یونان میں فرد، جماعت یا فرد اور ریاست کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں خیال کیا جاتا تھا، ان کا باہمی تعلق نہایت گہرا تھا اور ہر کام ریاست کا کام سمجھا جاتا تھا، ان کا باہمی تعلق نہایت گہرا تھا اور ہر کام ریاست کا کام سمجھا جاتا تھا، یونانی مفکرین نے اسپر بھی غور و فکر کیا تھا کہ ایک مشترک مطبخ قائم کرنا چاہئے اور شہریوں کیلئے ایک خاص پوشاک مقرر کی جائے افلاطون نے یہ بھی محسوس کیا کہ سیاست کی بنیاد اس وقت تک محکم نہ ہوگی جب تک اسے ایک متحدہ مذہب سے تقویت حاصل نہ ہو، اس نے اپنی کتاب "ریاست" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے "ریاست کے اربابِ حل وعقد کو چاہئے کہ ایک متحدہ مذہب کے قیام اور اسے عام طور سے مقبول بنانے کی کوشش کریں۔"

اسلامی نظریہ

ریاست کے دائرۂ عمل کا اسلامی نظریہ یونانی نظریہ سے کافی مشابہ ہے، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کا مذہب ایک تھا اور یونانیوں کا کوئی مخصوص مذہب نہ تھا، اسلامی مفکرین ایک خاص مذہبی تعلیم اور خاص اخلاقی اصول کے پابند تھے اور یونانی بہتر، تھے، لیکن فرد، جماعت اور سیاسی تنظیم کو یونانی سیاست کی طرح اسلامی سیاست میں بھی ایک واحدہ .... مانا گیا ہے، اتنا فرق ضرور ہے کہ اسلامی سیاست کی بنیاد مذہب پر قائم ہے اور اس کی وجہ سے ریاست پر بہت سی مذہبی اور اخلاقی قیود عائد ہیں، مثلاً "اسلامی ریاست کمزور بچوں کو پھینک نہیں سکتی ہے لیکن یونان کی بعض ریاستوں نے ایسا کیا تھا"، بیت المال کا تصور یونانیوں کے "عام مطبخ" کے تصور سے بہت قریب ہے گرچہ اسلامی سیاست میں اسکی بنیاد اخلاق اور مذہبی آئین پر قائم!

مسیحی نظریہ

عیسائی مذہب، خصوصاً رومی کلیسا کی تعلیم یہ تھی کہ دین اور دنیا یا دوسرے الفاظ میں مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں ہیں، اسی لئے ریاست کی حیثیت اتنی ہی پست تھی جتنی دین کے مقابلہ میں دنیا کی، کیونکہ ریاست دنیاوی اداروں میں شامل تھی، لیکن چونکہ سیاسی تنظیم کے بغیر عیسائی جماعت کا شیرازہ مجتمع نہیں کیا جا سکتا تھا، اسی بنا پر ۸۰۰ء میں مقدس رومی سلطنت کی تاسیس عمل میں آئی، اور اربابِ کلیسا مذہبی معاملات میں پیشوا ملنے گئے، دنیاوی معاملات کا انتظام بادشاہوں کے حوالہ کر دیا گیا جن کا سردار اصولاً مقدس رومی شہنشاہ سمجھا جاتا تھا۔ سولہویں صدی عیسوی کے اوائل تک اس نظام کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور اسی زمانہ میں "مارٹن لوتھر .... نے دین اور دنیا کے ایک ہونے اور "صحیح دینی زندگی" جینے کی تعلیم دی۔"

جدید نظریے!

جدید مذہبی تحریکوں کے ساتھ دُنیاوی زندگی کی جدید حیثیت
اور تجارت اور سرمایہ داری نے بہت ترقی کی، ترقی کر لینے والے
افراد یا جماعتیں اصولی طور سے عموماً ریاست کے وجود کو غیر ضروری
خیال کرتی تھیں، ان کے اعتدال پسند طبقہ کا بھی یہ نظریہ تھا "کم
سے کم ان کے معاملات میں ریاست دخل دے" یہ طبقہ چونکہ مالدار
تھا اس لئے ان کے اس نظریہ کی کافی شہرت ہوئی، اس نظریہ کی ابتدائی
شکل .... "کرنے دو" فرانسیسی لفظ ہے)
آزاد تجارت کا آئین اور انگلستان کے لبرلزم ....
کو اس سے بہت قریبی تعلق ہے۔ مگر اس کا زیادہ قریبی تعلق
(laissez faire free trade) اور
(Liberalism) سے ہے، یہ نظریہ اٹھارویں اور
انیسویں صدی کے تاجروں میں عام طور سے مقبول تھا، انگلستان
میں جو لبرل پارٹی بنی اور اس کا جو پروگرام بنا اس کی اساس اسی
"آزاد تجارت کے آئین" پر قائم تھی۔ ۱۸۱۵ء میں جب نپولین سے
جنگ ختم ہوئی تو زمینداروں نے اس خیال سے کہ غلہ کے دام گرنے
نہ پائیں غلہ کی درآمد پر بھاری محصول لگوا دیا، اس کی وجہ سے روٹی
کی قیمت بہت بڑھ گئی، یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ان زیادتیوں کے
خلاف احتجاج کیا گیا خصوصاً (Corn laws)
کو منسوخ کرانے کیلئے بہت سی تحریکوں نے جنم لیا جو بعد میں
(Liberalism) کی زبردست تحریک میں تبدیل
ہو گئیں اور تیس برس کی متحدہ اور مسلسل کوشش کے بعد ۱۸۴۶ء
میں (Corn laws) منسوخ کرا کر دم لیا گیا۔

لبرلزم (Liberalism) کی تعلیم کا ایک
معاشی پہلو تھا جس میں تجارت کی آزادی اور معاہدہ کی آزادی
کا مفہوم یہ تھا کہ سرمایہ دار اور مزدور کو آزادانہ معاہدہ کرنے کا
حق ہو، حکومت اس باہمی معاہدہ کو بروئے کار لانے میں ضرور
امداد کرے لیکن اسے دخل دینے کا حق حاصل نہ ہو، لبرلزم
.... کی تعلیم کا ایک دوسرا پہلو سیاسی بھی
تھا۔ وہ انفرادیت کے حامی تھے اور ان کی خواہش تھی کہ افراد کو
اپنی زندگی کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے اور
ریاست صرف وہی کام اپنے ذمہ لے جن کے متعلق یقین ہو کہ
افراد انہیں انجام نہ دے سکیں گے۔ مثلاً فوج رکھنا، پولیس کا
انتظام کرنا، عدالتیں قائم کرنا وغیرہ، لبرل کا یہ نظریہ بھی اسی نقطہ
نظر کا رہین تھا کہ حکومت کو تعلیم کے بارے میں بھی دخل دینے
کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں کی تعلیم اور اثر کی وجہ سے انگلستان
میں ۱۸۷۰ء تک عام جبری تعلیم کا رواج نہ ہو سکا حالانکہ فرانس
میں جبری تعلیم کا قانون ۱۸۳۳ء میں پاس ہو گیا تھا اور وہاں عام
طور سے اس کا نفاذ تھا جس کی وجہ سے فرانس کی تعلیمی حالت پر
خوش گوار اثر پڑا تھا۔

لبرلزم .... کی تعلیم انگلستان میں زیادہ
مقبول ہوئی، وجہ یہ تھی کہ تجارت کی آزادی، معاہدہ کی آزادی
اور انفرادیت کے اصول میں سرمایہ داروں اور متوسط طبقہ کے
افراد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ تھا اور یہ طبقہ اپنے اثر و نفوذ اور
سرمایہ کی وجہ سے چھایا ہوا تھا مگر باقی یورپ میں یہ تعلیم کبھی بھی صحیح
تسلیم نہیں کی گئی۔ انگلستان میں بھی ۱۸۷۰ء کے بعد قانوناً نہیں تو
عملاً لبرلزم کی تعلیم ترک کی جانے لگی اور بیسویں صدی میں تو اسکے
اصول کو بالکل چھوڑ دیا گیا اور اسکی جگہ اجتماعیت (collectivism)
کے رجحان نے لے لی، ریاست نے عام مفاد کیلئے ہر قسم کی ذمہ داری
اپنے سر لے لی اور جماعت کا ہر کام گویا ریاست کا کام ہو گیا،
یورپ کے دوسرے ممالک میں اجتماعیت کی طرف رجحان
انگلستان سے بہت پہلے پایا جاتا تھا۔

....

....

....

....

....

اجمالی طور سے یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ انفرادی مسلک
کے پیرو حکومت کے افراد کے حق میں دخل اندازی کو ناپسند کرتے ہیں
ان کا خیال ہے کہ چونکہ انسانی معاشرہ نے ابھی تک اتنی ترقی نہیں
کی ہے کہ بغیر خارجی دباؤ کے انسان کی زندگی، جان و مال محفوظ رہ
سکیں، اسی لئے وہ حکومت کو ناگزیر خیال کرتے ہیں تاکہ جس وقت
ان عناصر زندگی میں سے کوئی بھی معرض خطر میں ہو، اس وقت
حکومت مداخلت کر کے نقصان رساں کو کیفر کردار کو پہنچائے
لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ حکومت ایسے معاملات میں بے دخل

...اپنے افراد کے دائرہ اقتدار میں ہوں مثلاً تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ انفرادیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ انہیں طے کرنے کا ہر شخص کو کلی اختیار حاصل ہے اور وہ اپنے ان معاملات کو حکومت اور دوسرے لوگوں سے بہتر سمجھ سکتا ہے اور انہیں حل کرسکتا ہے اس لئے ان معاملات میں خارجی دخل اندازی سود مند ہونیکی جگہ مضر ثابت ہوگی۔

ان کے برعکس اجتماعیت کے حامی یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے مفاد سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوتا اور اسکے اور ریاست کے اغراض و مقاصد میں بعض دفعہ جو منافات پائی جاتی ہے اسکے بُرے نتائج کے انسداد کیلئے حکومت کی دست اندازی ضروری ہے، ان کا خیال ہے "انفرادی معاشرہ میں اصولِ مقابلہ کی ترویج کے سبب انسان کی محنت اور سرمایہ کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی قسم کے کام کو بہت سے لوگ بیک وقت انجام دیتے ہیں، اس لئے کوئی امر بھی خاطر خواہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ ان کے خیال میں بہترین ریاست وہی ہے جس میں اپنے پرائے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے، بلکہ سرمایہ وزمین دونوں ریاست کی ملکیت سمجھی جائیں اور "محنت" پر اسی کا پورا اختیار ہو، مکمل اجتماعی یا اشتراکی ریاست وہی ہے جس میں اپنے پرائے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے بلکہ سرمایہ وزمین دونوں ریاست کی ملکیت سمجھی جائیں اور "محنت" پر اسی کا پورا اختیار ہو۔ مکمل اجتماعی یا اشتراکی ریاست میں نہ زمینیں ہونگی نہ ملیں، نہ مدارس اور کارخانہ جات ہوں گے، بلکہ جس قدر بھی حاملین پیدائش ہیں سب حکومت کے دست نگر ہوں گے ہر فرد گویا ریاست کی طرف سے کام کرے گا اور اسی کے مقرر کردہ معاوضہ پر اس کی قوتِ بسری ہوگی[1]"

انفرادیت کے حامیوں کے دلائل

انفرادیت کے حامیوں نے اپنے اصول پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کا استدلال کیا ہے، ان حامیوں میں آدم اسمتھ ....

...... اور بہت سے ...... کی شخصیتیں نمایاں طور سے نظر آتی ہیں، ان انفرادیت کے حامیوں کا سب سے پہلا اصول یہ کہ ہر فرد کو اپنی حرکات و سکنات کی اس وقت تک پوری آزادی ہونا چاہئے جبتک اسکا یقین نہ ہو جائے کہ اسکی آزادی سے کسی دوسرے فرد کو گزند پہنچتا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانی معاشرہ کی بنیاد خود غرضی پر مبنی ہے، اس لئے ہر شخص اپنی غرض اور اپنے سود وزیاں کو دوسروں سے بہتر سمجھ سکتا ہے، اسی کے حصول کیلئے جتنی خارجی رکاوٹیں کم ہونگی، اسی قدر آسانی ہوگی، ان کا خیال یہ بھی ہے کہ ہر فرد کے حصولِ مقاصد ہی سے افراد کی اجتماعی فلاح و بہبود مدِ نظر ہوتی ہے، اس لئے کہ افراد ہی تو معاشرہ کے اجزاء ترکیبی ہوتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد اپنی بہبودی کیلئے جدو جہد کریگا تو مختلف افراد کے درمیان مقابلہ کی کشمکش پیدا ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں اُبھر آئیں گی اور ان میں اپنی مدد آپ کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائیگی اور جو افراد فطرۃً ناقابل ہیں یا ماحول کے باعث ان کی فطری صلاحیت زائل ہو چکی ہے وہ ناقابلِ التفات ہو جائینگے یا فنا ہو جائینگے اس کا اثر معاشرہ پر خوش گوار پڑیگا، وجہ یہ ہوگی کہ اب صرف صالح اجزاء رہ جائینگے اور فاسد فنا ہو جائینگے۔ اس بحث و نظر سے انفرادیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حکومت کو چاہئے کہ افراد کے کاموں میں بے ضرورت دخل نہ دے، اور صرف انہیں امور کی نگرانی رکھے جو ان کے جان و مال اور آزادی کے لئے ناگزیر ہیں۔

. . . .

. . . .

انفرادیت کے حامیوں کا سب سے پہلا اصول جو اس نظریہ کی جان ہے، یہ ہے کہ ہر فرد کو نہ صرف اپنی بہبودی مدِ نظر ہوتی ہے اور اسکے لئے وہ جان توڑ کوشش کرتا ہے بلکہ وہی اس جدوجہد کا اہل بھی ہوتا ہے، اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقلِ انسانی مکمل نہیں ہے، "ممکن ہے ایک چیز کو ہم مفید خیال کرتے ہوں اور وہ درحقیقت ہمارے لئے مضر ہو۔ اسی طرح یہ بھی

---

[1] اقتباس (کسی قدر تصرف کے ساتھ) از "اشتراکی تخیل اور تحریک رجحانات" باب ۸ و ۹ مؤلفہ الیاس احمد صاحب برنی ایم اے ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن ملاحظہ ہو دولت اقوام ...

[2] "خیالات متعلق تحدید دائرۂ حکومت"

[3] (Man versus State) "فرد بمقابلۂ ریاست"

ممکن ہے کہ ایک چیز ہم اپنے لئے مضر خیال کریں جو فی الواقع اصل میں ہمارے لئے مفید ہو۔ یہ صرف دعویٰ نہیں ہے بلکہ روزمرہ اس قسم کے صدہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو اسکی تائید کرتے ہیں۔ اگر ہر فرد اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کے ذرائع سے کماحقہٗ واقف ہوتا تو ہم کسی فرد کو غربت اور ناکامی کی زندگی گزارتے ہوئے نہ دیکھتے۔ دوسرے بعض مرتبہ جس چیز میں بظاہر افراد کا مفاد نظر آتا ہے اس میں ان کی اجتماعی کیفیت کی بقا ضروری ہے (اور یہ مسلم ہے کہ ضروری ہے) تو پھر دونوں خیالات کو ایک دوسرے سے بالکل جدا اور ممتاز رکھنا پڑیگا، اور ریاست کی ترقی اور اسکے مقاصد کے حصول کیلئے اسی طرح سہولتیں بہم پہنچانا پڑیں گی جس طرح خود افراد کی ترقی اور مقاصد کے حاصل کرنے میں آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تیسرے یہ کہ انفرادیت کے حامی . . . . جس "آزادی" کی بقا کی کوشش کرتے ہیں اس کا تعین ریاست کی اثباتی مداخلت کے بغیر قریبًا ناممکن ہے اور فطری حقوق اور آزادی ریاست کی اثباتی مداخلت کے بغیر ایک سرور انگیز خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ آخری دلیل انفرادیت کے حامیوں کی طرف سے جو پیش کی جاتی ہے وہ بقاء اصلح (اچھے عناصر کی بقاء) کا نقطۂ نظر ہے۔ اس دلیل کا سب سے بڑا مؤید ہربرٹ سپنسر . . . . ہے۔ وہ کہتا ہے "انسانی معاشرہ کی حقیقی فلاح و بہبودی مضمر ہے کہ بہترین افراد باہمی مقابلہ کے ذریعہ آگے بڑھیں اور بدترین فنا ہو جائیں"، سطحی نظر سے یہ خیال نہایت اچھا نظر آتا ہے کہ کوئی فرد بیکار نہ رہے جو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دوسروں کا دست نگر ہو، لیکن اگر اسے عمیق نظر سے دیکھا جائے تو یہ بالکل بے بنیاد نظر آتا ہے، اسپنسر نے یہ نظریہ ان جانوروں سے اختراع کیا ہے جن میں اپنی اصلاح کی اہلیت نہیں ہے درانحالیکہ انسان ان جانوروں سے کہیں ممتاز ہے، اور ہر وقت وہ اپنی حالت بہتر بنانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں اب وہی اندھے گونگے لولے لنگڑے اور اپاہج جنہیں شاید اسپنسر معاشرہ میں بیکار سمجھتا، معاشرہ کے بہترین عناصر گنے جاتے ہیں، جب یہ صورت حالات ہے تو جانوروں کی عادات سے استدلال کرنا اور بنی نوع انسان کو گردن زدنی سمجھنا کہاں تک روا ہو سکتا ہے! دوسری غلط فہمی اسپنسر کو یہ ہے کہ باہمی مقابلہ سے برے افراد فنا ہو جاتے ہیں اور اچھے باقی رہتے ہیں، سچ پوچھئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مقابلہ کی وجہ سے بہت سے لوگ ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کو سخت معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، دوسرے جو فرد مقابلہ کی وجہ سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے وہ اگرچہ اضافی حیثیت سے قابل ترجیح ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ بہترین فرد بھی ہو، اس کے وسائل اور اس کا دائرۂ نظر عمومًا تنگ ہو جاتا ہے، اسکے برعکس اجتماعی اعمال کی صورت میں دائرہ وسائل کی کثرت، مقاصد کی توسیع اور سرمایہ کی زیادتی کی وجہ سے وسیع تر ہو جائیگا۔

انفرادیت کی ترمیم شدہ ہیئت

جنگ عظیم سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کے بعد انفرادیت کے نظریہ نے چولا بدلا ہے اور اس کی ہیئت میں بہت کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ دوران جنگ سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء میں ہر ملک کے اندر دو قسم کی کیفیات ظاہر ہوئیں، ایک تو حکومت کی مداخلت دوسرے دیگر اداروں کے اثر میں توسیع۔ جنگ کے زمانہ میں اسکی ضرورت پیش آئی کہ مرکز سے منحرف قوتوں کا خاتمہ کر دیا جائے یا حکومت ان پر پوری طرح سے قابو پالے۔ اس مقصد کے لئے نئے نئے شکیں آرڈیننس اور ڈیفنس لاز نافذ کئے گئے، اکثر جنگجو ملکوں میں جنگ کیلئے جبری بھرتی کی گئی، ذاتی کارخانوں میں جن میں پہلے روزمرہ کے استعمال کی اشیاء بنتی تھیں، اب گولہ بارود اور دوسری جنگی ضرورتوں کا سامان طیار کیا جانے لگا، غرض ہر جگہ حکومت کی نگرانی ہونے لگی اور ہر موقع پر حکومت کے افسر نظر آنے لگے، اس کا ردعمل . . . . لازمی تھا۔ چنانچہ جنگ کے بعد لوگوں کو حکومت کی مداخلت اور دست برد سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی تھی اور بڑی قومی انجمنوں اور اداروں نے خود اپنے آئین اور ضوابط پر عمل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ترتیب و تنظیم حکومت کے جبر کے بغیر بھی ممکن ہے۔ انہیں معاشی کیفیات سے انفرادیت

لے Man Versus State (انسان بمقابلہ ریاست) بحوالہ مساوی سیاسیات ـ

جدیدہ جنم لیتی ہے۔ "انفرادیت کی انتہائی شکل نراج ......

ہے۔ اس کا مفہوم "عدم حکومت" ہے۔ اسکے حامی چاہتے ہیں کہ انسان کے قوائے ذہنی اور جسمانی میں اتنی ترقی ہو جائے کہ افراد اور جماعتیں بغیر کسی قسم کے خارجی دباؤ کے تمام زندگی کے کاروبار انجام دے سکیں، ان کے خیال میں حکومت کے فقدان کے باوجود ترتیب و تنظیم اسی طرح باقی رہیگی، مگر جبر کا عنصر بالکل الٹ جائیگا ان کا سب سے بڑا گرد کروپوٹکن .... کہتا ہے "اگر تم مجریط سے ماسکو جاؤ تو تمہیں بیسیوں ریلوں میں سفر کرنا پڑیگا، جنہیں کروڑوں مزدوروں نے بنایا ہوگا، جن کی ہم آہنگی کے لئے کسی برسر اقتدار مرکزی حکومت یا ادارہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی"[1] ان کے نزدیک موجودہ حکومت بیکار ہے اور نہ صرف تعلیم اور حفظانِ صحت بلکہ ملک کی حفاظت بھی اختیاری انجمنوں کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ ان کا قول ہے کہ تاریخ انسانی میں اس قسم کی مثالیں نظر آتی ہیں کہ بیرونی حملہ آور کسی ملک کی منظم فوجوں پر تو کامیابی حاصل کر لیتے ہیں لیکن انہیں شہریوں کے ایسے مسلح گروہوں کے سامنے نیچا دیکھنا پڑتا ہے جو جگہ جگہ سے چھپ کر ہلہ بول دیتے ہیں، ان کے نزدیک، فرد حقیقی معنوں میں اسی وقت آزاد کہا جاسکتا ہے جب سیاسی بساط سے ریاست اور حکومت دونوں کا جنازہ اٹھ جائے اس وقت فرد کو ریاست اور سرمایہ دار دونوں کی محکومی سے آزادی نصیب ہو جائیگی اور ملکی امور ان کی بجائے اختیاری انجمنوں کے ذریعہ انجام پذیر ہوا کرینگے!

. . . .

. . . .

انفرادیت جدیدہ کے حامیوں کو یہ تسلیم ہے کہ انسان خود غرض ہے افراد اور جماعتوں کی باہمی اغراض میں تصادم ہوتا رہتا ہے کیا اس تصادم کے روکنے کیلئے اختیاری انجمنیں اور اختیاری ادارات کافی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! اس کا نتیجہ یہ ہوگا جو زیادہ طاقتور ہوگی وہی موجودہ حکومت کی جگہ لے لیگی اور دوسری اختیاری اداروں کو اپنا مطیع بنا لے گی، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے انسان کی فطرت میں حاکم و محکوم ہونے کی صلاحیتیں اور احساسات پائے جاتے ہیں اور محض نظریہ اور انسانی تخیل سے انسانی فطرت بدلی نہیں جاسکتی۔

---

[1] نراج کا فلسفہ اور اسکا مطمع نظر بحوالہ مبادیٔ سیاسیات۔

اس لئے اس نظریہ کا تعلق خیالی دنیا سے عملی دنیا کے اعتبار سے زیادہ ہے جو سودمند نہونے کے لئے بڑی دلیل ہے۔

اجتماعیت کا نظریہ

اس نظریہ کی ابتدائی شکل اشتراکیت ہے، اسکے بانی اور سب سے بڑے گرو کارل مارکس .... نے ۱۸۴۷ء میں جرمنی زبان میں ایک کتاب .... (اصل داری) کے نام سے شائع کی، اس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کے جملہ آلام و مصائب کی جڑ ذاتی ملکیت ہے، دنیا کی مصیبتوں کا علاج صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی جگہ مشترکہ ملکیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اس عقلیہ کے تمام انتظامات ریاست کے ذمہ ڈال دئے جائیں۔ ریاست افراد کی فلاح و بہبودی سے خود افراد سے زیادہ واقف ہوتی ہے، مقاصد کے حصول کیلئے ریاست کو جملہ عاملین پیدائش پر خصوصی نگرانی لازمی طور پر کرنا چاہئے۔ کارخانوں کا انتظام اس کا فرض ہے اور ہر شخص کے واسطے اسکے کام کے مناسب آرام و راحت کا انتظام کرنا بھی اسی کا فرض منصبی ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ اس طرح مقابلہ کا مضرت رساں جذبہ فنا ہو جائیگا اور افراد اپنے مفاد کیلئے نہیں ملک کے معاشری مفاد کیلئے کوشاں ہوں گے اور اسکی وجہ سے پوری ریاست کو طرح طرح کے مفاد حاصل ہوں گے!

اجتماعیت .... اشتراکیت کی ترمیم شدہ شکل ہے۔ پچھلے اسی برس میں خصوصاً جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء کے بعد اشتراکیت کے اصولوں میں کافی کمی زیادتی کی گئی ہے۔ اس کا دار و مدار بھی کارل مارکس کے خیالات ہیں، اسکے حامی صرف یہ چاہتے ہیں کہ اشتراکی اصول کا اثر و نفوذ ہر ملک میں آہستہ آہستہ رواج پذیر ہو اور حکومت کی مشینری اشتراکیوں کے قبضہ میں آجائے، اس مقصد کے حصول کیلئے مغربی یورپ میں ہر ملک کے اندر باقاعدہ اجتماعی سیاسی پارٹیوں کو منظم کیا گیا، ان میں سب سے پہلا گروہ جرمنی کے اندر "انجمن مزدوران" کی شکل میں نمودار ہوا، اس انجمن کو انیسویں صدی کے وسط میں فرونینڈ لاسال نے قائم کیا تھا ۱۸۷۵ء میں جرمنی "دستوری اشتراکی" گروہ ظاہر ہوا اور اس نے اہمیت حاصل کر کے ۱۸۹۱ء میں اپنے پیش نامہ کا اعلان کر دیا یہ فریق حکومت میں اس وقت تک ارتقاء کا خواہشمند تھا جبتک ملک میں اشتراکی خیالات پورے طور سے سرائت نہ کر جائیں۔[1]

انگلستان میں اشتراکی خیالات کے روحِ رواں جارج برنارڈ شا اور فے بین سوسائٹی (جسکے کرتا دھرتا مسٹر سڈنی ویب تھے جو ۱۹۲۹ء کے وسط میں جب مزدور جماعت کی وزارت ترتیب دی گئی تھی تو وزیر نوآبادیات تھے) ان لوگوں کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ ایک طرف لامرکزیت کے اصول کی نشر و اشاعت کریں اور دوسری طرف جبری بیمہ، معمر لوگوں کے وظائف کے تقرر، کارخانہ داروں اور مزدوروں کی جبری پنچایت اور کارخانوں کی نگرانی کے اصول کی آڑ میں حکومت کے دائرۂ اثر کو وسیع کریں، یہی وہ حربے تھے جن کی وجہ سے ان اجتماعیوں کو عظیم الشان کامیابیاں حاصل ہوئیں، چنانچہ ایک طرف ۱۹۱۹ء میں جمہوریہ جرمنی کا سب سے پہلا صدر وہاں کے اشتراکی گروہ کا لیڈر فریڈرش ایبرٹ مقرر ہوتا ہے، دوسری جانب انگلستان میں ۱۹۲۴ء میں انگلستان کی مزدور پارٹی کا لیڈر ریمزے میکڈانلڈ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوتا ہے۔

کمیونزم کا نظریہ!

اشتمالیت .... بھی اشتراکیت کے اصول کو بروئے کار لانے کا ایک دوسرا طریقہ کار ہے۔ ضمناً یہ معلوم ہو چکا کہ اجتماعیت کے حامیوں کا اشتراکی اصول اور قواعد کو عملی شکل دینے کا طریق کار یہ تھا کہ ارتقاء کے ذریعہ اشتراکی کیفیت کو ہمہ گیر کیا جائے، اشتمالیت یا کمیونزم کے حامیوں کا طریق کار یہ ہے کہ ان اصولوں کو انقلاب اور فرقہ وارانہ جنگ کے ذریعہ بروئے کار لایا جائے، ان کا خیال ہے کہ سرمایہ داروں نے اپنی بنیاد اتنی مستحکم کر رکھی ہے کہ وہ نرمی سے اپنی جگہ چھوڑنے کو آمادہ نہیں ہو سکتے ہیں، ابتدائی کمیونزم کے حامیوں میں مشہور جرمانی سیاسی فلسفی اینگلز سب میں ممتاز تھا[1] لیکن اسے عملی شکل دینے والا لینن تھا جو ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۴ء تک روس کا ڈکٹیٹر رہا۔ لینن کہتا ہے[2]

"یہ خیال خام ہے کہ جس طبقہ کے قبضہ میں صدیوں سے اقتدار رہا ہے وہ بغیر فیصلہ کن جنگ کے آسانی سے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائیگا۔ ضرورت اس کی ہے کہ ملک کا مزدور اور محنتی طبقہ جبراً

[1] ملاحظہ ہو اعلان اشتمالین

[2] ملاحظہ ہو لینن کی کتاب "انقلاب طبقۂ اسفل"

موجودہ سیاسی اختیارات اپنے قبضہ میں کرلے اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے انہیں کام میں لائے۔" کمیونزم کے حامیوں کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کی بدامنی اور کشمکش کی وجہ صرف عدم مساوات ہے کامل مساوات کے بعد ایسی سیاسی فضا پیدا ہو جائیگی جس میں جبر و اکراہ کی حاجت نہ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی حاجت بھی نہیں رہے گی، اس کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب مختلف طبقوں میں توازن قائم نہ ہو

لیکن جب آبادی کے مختلف طبقوں میں مساوات کی بنا پر توازن قائم ہو جائیگا تو حکومت کی ضرورت باقی نہ رہے گی، اشتراکیوں اور انفرادیوں کے خیالات میں یوں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن دونوں کا مطمح نظر ایک ہے، یعنی دونوں کا مقصد یہ ہے کہ ایک زمانہ آجائے جس میں فرد کو کامل آزادی نصیب ہو اور کسی قسم کے خارجی دباؤ کی ضرورت باقی نہ رہے!

سوشلزم اور کمیونزم پر ایک تنقیدی نظر

یہ تحریکیں بھی حدِ اعتدال سے گزری ہوئی ہیں اور مغالطوں سے پُر ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان میں "تین عاملین پیدائش، زمین، محنت اور اصل میں سے محنت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔" دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ "موجودہ انفرادی حالات میں قیمت، نوعیت و مقدار پیداوار، تقسیم دولت اور دو معاشی امور کا تعین خود بخود طلب و رسد کے قانون کے ذریعہ ہو جاتا ہے، لیکن جب مقابلہ ہی نہ رہے گا تو پھر ان کا تعین دشوار ہو جائیگا، تیسرے جہاں مقابلہ نہ ہونے سے رشوت ستانی اور سازشوں کا بازار گرم ہو جائیگا، وہاں جب ذاتی بہبود اور ذاتی منفعت کا خیال نہ رہیگا تو افراد بے پرواہ ہو جائینگے۔" ارسطو کہتا ہے "جب انسان کسی کام کو خود اپنا تصور کرتا ہے تو وہ اس میں شرکت کے کام سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے"[1]

"خیالی دُنیا سے عملی دُنیا بہت مختلف ہے"[2] خیالی اعتبار سے ایک طرف ہربرٹ سپنسر اور کروپوٹکن کے نظریے اور دوسری طرف کارل مارکس اور اینگلز کے خیالات بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں

[1] ترجمہ انگریزی جونٹ، ۲، ۳، ۴،

[2] ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب ام اے پی ایچ ڈی

لیکن جب انہیں عملی دُنیا میں لایا جاتا ہے تو ان پر عمل دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ جن ملکوں میں انفرادی نقطۂ نظر سے حکومت رائج ہے وہاں عام بہبودی اور زمانہ کی ضروریات نے انہیں مجبور کیا ہے کہ حکومت کے مختلف شعبوں میں اشتراکی اصول اختیار کریں اور وہاں حکومت کا دائرۂ اقتدار وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری جانب روس میں جو ۱۹۱۷ء سے کمیونزم کا مرکز ہے، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل طور سے کمیونزم کے اصول پر عمل کر کے ترقی کی "موجودہ منزل" بھی اس وقت تک طے نہیں کی جا سکتی ہے جب تک افراد کو تھوڑی بہت آزادی نہ دی جائے اور انفرادیت کے اصول پر ایک حد تک عمل نہ کیا جائے۔

اس بحث و نظر سے یہ چیز بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ اشتراکیت اور انفرادیت دونوں کے اصول میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، اور ان کے حامی اعتدال پر قائم نہیں رہے ہیں، آزاد اور متمدن ملکوں میں "حکومت کا دائرۂ عمل" یہ ہے کہ ملک کی ترقی اور فلاح و بہبودی کے تمام شعبوں پر ان کی نگرانی ہوتی ہے اور نہ صرف رسل و رسائل اور معاشی پالیسی پر اس کا اقتدار ہوتا ہے بلکہ پبلک کی تعلیم اور حفظانِ صحت کے مسائل بھی اسکے ذمہ ہوتے ہیں، حکومت کی طرف سے کارخانوں کی سرپرستی کی جاتی ہے، اور وقتاً فوقتاً صنعتی نمائشوں کے ذریعہ دُنیا کی توجہ ملکی پیداوار اور مصنوعات کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ ملکی صنعت و حرفت کو بیرونی مصنوعات پر طرح طرح کے محصول عائد کر کے، محفوظ کیا جاتا ہے، اکثر متمدن ممالک میں ریلوں کو یا تو حکومت براہِ راست چلاتی ہے ورنہ ان پر نگرانی ضرور رکھتی ہے،

غرض "حکومت کا دائرۂ عمل" ہر ملک کے حسب حال ہونا چاہئے کوئی طریقۂ کار ہر جگہ یکساں طور سے مفید ثابت نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ "دائرۂ عمل" کا خاکہ بناتے وقت ہر ملک کے جغرافیائی، تہذیبی اور خصوصی حالات کا لحاظ رکھا جائے ورنہ کامیابی مشتبہ رہے گی، غور کرتے وقت یہ خیال ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ نظری اور عملی سیاست میں زمین، آسمان کا فرق ہے!

ولی وارثی

غزل

گلشن میں ہر اک پھول زباں رکھتا ہے لیکن
مبہوت سا ہے نغمۂ بلبل کے اثر سے

کچھ بادہ و ساغر کی حقیقت نہیں ساقی
مے خانے کی رونق ہے فقط تیری نظر سے

اصغر[1] کی غزل کیا ہے غزل ہے کہ فسوں ہے
پوچھے یہ کوئی جا کے ولی اور جگر سے

[1] اصغر گونڈوی مرحوم

رئیس امروہوی

اخبار نویسوں کی قیمت!

یورپی اخبارات وجرائد کے متعلق عام طور پر یہ اعتماد ہے کہ وہ خارجی اثرات سے بلند تر ہوکر قوموں اور ملکوں کی خدمت کرتے ہیں، اور اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں کسی طاقت و اقتدار سے مرعوب نہیں ہوتے ——— مگر بعض مستثنیات کو چھوڑ کر یہ خیال صحیح نہیں۔ یورپی جرائد اکثر وبیشتر اپنا قلم، اپنا دماغ، اور اپنا ضمیر بہت آسانی سے فروخت کر دیتے ہیں گو یہ مسلّم حقیقت ہے کہ وہ معمولی داموں پر یہ سودا نہیں کرتے، ان کی جنبش قلم کو خریدنے کے لئے ہزاروں لاکھوں پونڈ کی ضرورت پڑتی ہے، یہ خصوصیت تو ہم ہندوستانی اخبار نویسوں کو ہی حاصل ہے کہ اگر کبھی بکتے بھی ہیں تو پورے دام نہیں اٹھتے ——— اس مقالہ میں بتلایا گیا ہے کہ یورپ کے اخبارات کس طرح گندی جنبی مصلحتوں اور سنہری روپہلی اغراض کے ماتحت غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں ——— اگر غور کیا جائے تو رائے عامہ کو جنگ کی طرف مائل کرنے میں سب سے اہم حصہ انہیں سنگین صحافیوں اور پُرامن اخبار نویسوں کا ہوتا ہے، آپ موجودہ لڑائی کے پس منظر میں بھی ایڈیٹر کے قلم اور صحافت کے دماغ کو پُر اسرار سازشوں میں مصروف دیکھ سکتے ہیں۔ (رئیسؔ)

۱۳

لندن کے مشہور اخبار نویس اور روزنامہ "ڈیلی میل" کے بانی مسٹر کینیڈی جونس (KENNEDY Jonce) نے صحافت کی تعریف مندرجۂ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

صحافت کیا ہے؟

وہ ایسا ادارہ ہے جس کا سب سے پہلا مقصد روپیہ کمانا ہے اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو پوری طرح اخبارات کی سرپرستی اور قدر دانی پر آمادہ کیا جائے، عوام عجائب پسند ہوتے ہیں، وہ اپنی تفریحِ طبع اور دلبستگی کے لئے سنسنی دوڑا دینے والی خبریں چاہتے ہیں سنسنی دوڑا دینے والی خبریں صرف جنگ مہیا کرتی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑائی کا زمانہ اخبارات و جرائد کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا زمانہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر جزائر برطانیہ کے مشہور ترین روزنامہ "لنڈن ٹائمز" کو لیجئے، جنگ کریمیا نے ٹائمز کو ٹائمز بنا دیا اور اس نے کثرت اشاعت کی بنا پر اس قدر دولت وخوشحالی پیدا کرلی کہ صرف ایک پینی روزانہ میں اتنا ضخیم پرچہ اپنے خریداروں کو دینے لگا۔ معاصرہ "اسٹینڈرڈ" کے لئے ہندوستان کا غدر ۱۸۵۷ء بھی ایسا ہی مبارک ثابت ہوا کہ اس نے ایک پیسہ روزانہ اپنی قیمت مقرر کردی۔ فرانس اور پرشیا کی جنگ (۱۸۷۰ء) کے دوران میں "ڈیلی ٹیلی گراف" کی اشاعت پچاس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ پچاس ہزار ہوگئی۔ اور مصر و سوڈان کی جنگ کے وقت ڈھائی لاکھ تک جا پہنچی۔

جنوبی افریقہ کی جنگ (بوئر وار) کے دوران میں "ڈیلی میل" (لندن) نے اشاعت کا اک نیا معیار قائم کیا، اس نے اس لڑائی کے اخباری میدان میں اس عمدگی اور قابلیت سے قدم نکالا کہ اشاعت ۵ لاکھ کے بجائے دس لاکھ ہوگئی۔ لیکن پچھلی لڑائی کے دوران میں ٹائمز کی ساکھ گر گئی، اور وہ اپنی قیمت دو پنس کے بجائے تین پنس مقرر کرنے پر مجبور ہوا۔

ان مثالوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ جنگ اخباروں کیلئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتی ہے، اور وہ عموماً اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ صفحۂ ارض کے کسی گوشہ پر لڑائی کے شعلے بھڑکیں اور وہ عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنے لئے دولت و اقتدار پیدا کریں، مگر یہ خیال قائم کرلینا بھی غلط ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لئے

تقطایہی طریقہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات وہ جنگ کی مخالفت میں اپنا مفاد پاتے ہیں اور لڑائی کے خلاف دھنواں دھار مقالات لکھنے شروع کر دیتے ہیں، اس کی ایک بہترین مثال "قضیہ تونس" پیش کرتا ہے۔ برلن کانگریس میں مختلف یورپی طاقتوں کے نمائندوں نے خفیہ طور پر ٹیونس (جس پر ۸ ربمبر ۱۸۴۲ء کو اتحادیوں نے حملہ شروع کیا ہے) فرانس کے حصہ میں دیدیا تھا مگر جب یہ معاہدہ منظر عام پر آیا تو لندن کے اخبارات میں آگ لگ گئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانی وزارت خارجہ نے پریس کو شہ دیدی تھی، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لندن ٹائمز نے لکھا کہ

"یہ ناممکن ہے کہ فرانس شمالی افریقہ کے ساحل پر اپنی نوآبادیاں قائم کرے کیونکہ اس کا نتیجہ فرانس و انگلستان کی جنگ کی شکل میں نکلے گا۔"

۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان طنجہ (الجزائر) کے مسئلہ پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان چل پڑی، اور برطانی حکومت نے لندن کے اخباروں کو فرانس کے پیچھے لگا دیا اور انھوں نے اس مسئلہ پر خوب خوب زہر افشانیاں کیں۔"

یہ ہے برطانی پریس کا کمال —— جو تمام یورپ میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور معقولیت پسند پریس خیال کیا جاتا ہے، لیکن جو ملک جذباتی اور انتہا پسند واقع ہوئے ہیں، ان کے پریس کی تلون مزاجی اور انتہا پسندی کا کیا کہنا ؟

اس سلسلہ میں سروی اور آسٹروی پریس کی مثال ہمارے ذہن میں آتی ہے، سرویا اور آسٹریا کے درمیان عملی لڑائی کا آغاز جولائی ۱۹۱۴ء (جنگ عظیم کی ابتدا) میں ہوا، لیکن مشہور سیاستدار، مجاٹومچ راوی ہے کہ سرویا اور آسٹریا کے پریس کے درمیان ۱۹۰۳ء ہی سے ٹھن گئی تھی، وہ ایک دوسرے کے خلاف خوب خوب الزام لگاتے تھے اور یہی قلم کی لڑائی انجام کار ۱۹۱۴ء میں تلوار کی لڑائی میں تبدیل ہو گئی۔

اس چیز سے پریس کی طاقت کا ثبوت ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومتیں سماج اور رائے عامہ کے اس طاقتور آلہ کو اپنے اثر میں لینے کی کوششیں کرتی رہتی ہیں۔

برطانی حکومت زمانۂ امن میں صرف اس چیز پر اکتفا کرتی ہے کہ اخبارات کو سرکاری مراسلات اور بیانات نشر و اشاعت کی غرض سے بھیجتی رہے، لیکن بعض اوقات برسر اقتدار وزارت کا کوئی رکن کسی مشہور اخبار نویس سے گہرے تعلقات پیدا کر لیتا ہے چنانچہ جنگ کریمیا کے دوران میں لارڈ پامسٹن اور ٹائمز کے ایڈیٹر کے درمیان گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے، البتہ بعض اوقات انگریزی صحافت نے غیر معمولی ذمہ داری اور قابل رشک آزادیٔ رائے کا ثبوت دیا ہے، جس کی بہترین مثال لندن ٹائمز کا وہ دلیرانہ رویہ پیش کرتا ہے جو اُس نے ۱۹۰۲ء میں شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے مقابل اختیار کیا، اس زمانہ میں لندن ٹائمز جرمنوں کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا تھا اور شاہنشاہ ایڈورڈ قیصر ولیم سے اتحاد کرنے کے حامی وساعی تھے، آخر انھوں نے ایک خفیہ قاصد لندن ٹائمز کے ایڈیٹر کے پاس روانہ کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے مخالف جرمن رویہ کو بدل دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ تاجدار برطانیہ کے اس پیغام کا جواب لندن ٹائمز کے اولوالعزم ایڈیٹر نے کیا دیا، اس بلند نظر اور حریت پسند مدبر نے شاہنشاہ ایڈورڈ کو جواب میں لکھا کہ

لندن ٹائمز ہز میجسٹی کی خواہشات کا احترام کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے، لیکن اس معاملہ میں........ صرف اسی معاملہ میں معذور ہے۔

ٹائمز کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن اس مقام پر تو وہ شاہی اثر سے بھی آزاد نظر آتا ہے —— یہ یقیناً ایک عظیم الشان واقعہ ہے اور اس کا راوی بھی اتنا ہی عظیم الشان ہے یعنی خود قیصر ولیم اس شاندار روایت کے ناقل ہیں، پھر بھی یہ بات طے شدہ ہے کہ یورپ کی اکثر حکومتیں اخبارات وجرائد کو رشوت دینے کی عادی ہیں، بلکہ بعض موقعوں پر تو وہ مخالف پارٹی کے اخبارات کو بھی خرید لیتی ہیں —— اسکی تعجب انگیز مثال فرانسیسی چیمبر میں دوہرائی گئی کہ دوران جنگ میں حکومت فرانس نے حزب الاختلاف کے اخبار "بونٹ رگ" کو خرید لیا تاکہ اس کی مخالفت سنجیدہ حدود تک محدود رکھی جائے۔

(مانچسٹر گارجین کی رپورٹ ۱۷ دسمبر ۱۹۲۴ء)

یہ حکومتیں صرف ملکی اخبارات کے ضمیر و دماغ کو ہی نہیں خریدتیں بلکہ غیر ملکی صحافت پر بھی اثر ڈالتی ہیں چنانچہ روسی سفیر ازوسکی (۱۹۱۴ء) کا بیان ہے کہ

"ترکی الیات کے مسلّمہ افلاس کے باوجود ۱۹۱۳ء میں ترکی سفیر مقیم پیرس نے فرانسیسی اخبارات کو لاکھوں فرانک بطور

وقت پیش کئے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس سے فرانسیسی اخبارات اور صحافیوں سے تقریباً پچاس لاکھ کا وعدہ کیا تھا جس کا کچھ حصہ زرِ نقد کی صورت میں ادا ہوتا تھا، چنانچہ "لیبرے بیٹرول" نے اس سلسلہ میں ایک لاکھ فرانک حاصل کئے۔"

بہت سی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی حکومتیں اکثر اپنے غیر ملکی سفراء کے ذریعہ اخبارات کو روپیہ تقسیم کرتی ہیں اطالوی سفیر مقیم استانبول نے ۱۸۸۵ء میں سر چارلس ڈلکی کو لکھا کہ اطالوی پریس کا معتدبہ حصہ فرانسیسی حکومت نے خرید لیا ہے جیسے کہ اس سے پہلے "استیفانی ہیواس" ایجنسی نے خرید لیا تھا۔

۱۹۰۴ء میں ایک جرمن مدبر نے واضح الفاظ میں اس لین دین کی طرف اشارہ کیا جو فرانسیسی حکومت اور اطالوی پریس کے درمیان ہوا تھا۔

اخبارات کو سب سے بڑا مالی فائدہ اُس سیاسی جمود کے درمیان میں پہنچا جو ۱۹۱۴ء سے پہلے سرویا اور آسٹریا کے متنازعہ مسائل کے سلسلہ میں یورپی سیاسیات پر طاری ہو گیا تھا، جرمن دستاویزات میں اس کی طرف صریح اشارات پائے جاتے ہیں، چنانچہ کاؤنٹ جاگو اپنے جرمن سفیر (مقیم روم) سے بذریعہ تار دریافت کرتا ہے کہ

"آیا یور ایکسلنسی یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ اطالوی پریس کو متاثر کرنے کیلئے کتنے روپیہ کی ضرورت ہے؟"

۲۱ر جولائی ۱۹۱۴ء کو وہ اپنے سفیر (مقیم وائنا) کو ہدایت کرتا ہے کہ حکومت آسٹریا سے اس مقصد کیلئے رقم طلب کرو۔

۲۵ر جولائی ۱۹۱۴ء کو جرمن سفیر (روم) اپنی رپورٹ میں رقمطراز ہے کہ

"میرے آسٹروی معاصر نے اخبارات کو رشوت دینے کے لئے ۴ لاکھ فرانک خرچ کئے ہیں، کیا میں اس سلسلہ میں بیس ہزار سے چالیس ہزار مارکس تک پر اعتماد کر سکتا ہوں؟"

اب دوسری طرف روس پر نظر ڈالئے، پیرس کا روسی سفیر ازوسکی اپنی یادداشت میں رقمطراز ہے کہ

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ درۂ دانیال کا مسئلہ ہماری مرضی کے مطابق طے ہو تو ہمیں پیرس کے اخبارات کا اعتماد حاصل کرنا پڑیگا، لیکن بدقسمتی سے میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے، حالانکہ اطالوی سفیر (ٹشوں) دل کھول کر صرف کر رہا ہے۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند روز کے بعد روسی سفیر (ازوسکی) کی یہ شکایت رفع ہو گئی، کیونکہ جولائی ۱۹۱۴ء میں اس نے پیرس کے اخبارات کو بڑی فیاضی اور دریا دلی سے روپیہ تقسیم کیا۔

اس سے دو برس قبل اکتوبر ۱۹۱۲ء میں موسیو سیزونوف (روسی وزیر خارجہ) نے اپنی ذمہ داری پر تین لاکھ فرانک کی گرانبہا رقم ازوسکی کو اس مقصد کیلئے دی تھی، اور لطف یہ ہے کہ روس کا یہ کثیر التعداد روپیہ فرانسیسی اخبارات پر موسیو پوانکارے (وزیر اعظم فرانس) اور دیگر فرانسیسی مدبّرین کی زیر نگرانی تقسیم ہوا کیونکہ فرانسیسی حکومت خود ملکی رائے عامہ کو روس کی مدافعت میں منظم و مضبوط کرنا چاہتی تھی۔

اس کے بعد حکومت فرانس اور روس نے یورپی اخبار نویسوں کو خریدنے کا ایک مشترکہ پروگرام بنایا، اور ایک بین الاقوامی ایجنسی کے ذریعہ سونے چاندی کی یہ لوٹ شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ جرمن، آسٹریا اور ترکی کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا جائے، ہم ذیل میں صرف پیرس کے اخبارات کی فہرست پیش کرتے ہیں جن کو اس لوٹ مار میں حصہ ملا، ان کے علاوہ دیگر اخبارات نے جو رشوتیں لیں ان کی فہرست طویل ہے، فرانس کے جو اخبارات خرید لئے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) لا المنیٹرن .. .. .. ۴۰ ہزار فرانک
(۲) لا اُورور .. .. .. ۱۷ ہزار فرانک
(۳) ایل اونٹمینٹ .. .. ۱۱ ہزار فرانک
(۴) ایل ایکشن .. .. ۹ ہزار فرانک
(۵) ایل فرانس .. .. ۱۱ ہزار فرانک
(۶) لی ریپل .. .. .. ۷ ہزار فرانک
(۷) لی گل بلیس .. .. ۲ ہزار فرانک
(۸) پیرس جنرل .. .. ایک ہزار فرانک

(ازوسکی جلد سوم صفحہ ۳۵۱ ۔ سی۔ ایف کا زاڈ صفحہ ۲۷)

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ فرانسیسی اخبارات سے غیر ملکی حکومتیں بہت جلد معاملہ طے کر لیتی ہیں، اور فرانسیسی اخبارات مدّت سے یہ منفعت بخش کاروبار کرتے آئے ہیں، چنانچہ ۱۷۷۹ء میں پیرس کا مشہور جریدہ "ای فرانس اینڈ وی ایسٹینٹ" روسیوں کا تنخواہ دار تھا۔

جن لوگوں نے گزشتہ جنگ عظیم کے ذہنی اسباب کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ان کا متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہے کہ پچھلی لڑائی ہرگز شروع نہ ہوتی اگر یورپی اخبارات لڑائی پر اُدھار کھائے نہ بیٹھے ہوتے۔

انھوں نے رائے عامّہ کو جنگ پر ابھارا، باہم منافرت پیدا کی، ایک دوسرے کے خلاف الزامات لگائے، طرح طرح کے بہتان تراشے، جھوٹ بولے، چند ہزار سکّوں کی خاطر لاکھوں بے گناہوں کے سر کٹوادئے، اور دانستہ طور پر ان خون آشام سرمایہ داروں کے آلۂ کار بن گئے، جن کا پہلا اور آخری مقصد صرف جنگ —— عالمگیر جنگ تھا۔

اگر ہم موجودہ لڑائی کے ذہنی اور واقعاتی پس منظر کا تجزیہ کریں تو اس میں بھی ہمیں ان ضمیر فروش اخبار نویسوں کی خودغرضی اور غدّاری صاف طور پر جھلکتی نظر آسکتی ہے ڈاکٹر جوزف گوئیبلز نے دنیا بھر کے اخباروں کو نازیوں کا ہمدرد بنانے میں جس قدر روپیہ خرچ کیا ہے اس کا اندازہ آسان نہیں، رائٹر ایجنسی تو مسلّمہ طور پر برطانی پروپیگنڈا آفس کی ایجنٹ ہے، اس کے علاوہ دنیا کے بہت سے خبر رساں ادارے اور نامہ نگار برطانی وزارت اطلاعات عامّہ کے اشاروں پر کام کرتے ہیں، امریکہ، جاپان، ترکی اور دوسرے ملکوں کا بھی یہی حال ہے، ایک لاکھ اخبار نویسوں میں بمشکل ایک فرد ایسا ہوگا جس کا قلم کسی اجنبی اقتدار کے پاس رہن نہ ہو، اور اب تو یہ کاروبار پہلے کے مقابل عمومیت اختیار کرگیا ہے، سویٹ یونین کے علاوہ کسی ملک کا پریس سرمایہ داروں کی گرفت سے آزاد نہیں۔

بہرحال جنگ میں اخبارات کا حصہ دیکھ کر ہمیں پرنس بسمارک کا وہ قول یاد آجاتا ہے جو اس نے اخبارات کی ایسی (خفیہ) کارگزاری کے متعلق اپنے ایک دوست سے کہا تھا۔

"یاد رکھو! تلوار چلانے سے پہلے قلم حرکت میں لائے جاتے ہیں۔"

مرزا یگانہ چنگیزی علیہ السّلام

رُباعی

کیا بھانپ رہا ہے بھانپنے والے بازآ
حیران ہے کیوں ناپنے والے بازآ
سنھتی جائے گی اور بھی دُور سے دُور
آفاق کی حد ناپنے والے بازآ

الشیا۔ دسمبر ۱۹۴۲ء

اکرام قمر۔ ایم اے

میکاولی کا سیاسی فلسفہ

جارج۔ ایچ۔ سیبائن اپنی کتاب "سیاسی نظریہ کی تاریخ" میں میکاولی پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے "میکاولی کا کردار اور اس کا فلسفہ موجودہ تاریخ کے لئے ایک معمہ بنا رہا ہے۔ کبھی تو اُسے ایک کٹر مطلبی......... ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ کبھی ایک گرم مزاج محب وطن۔ بعض نے اُسے سرگرم قوم پرور گردانا اور بعض نے اُسے ایک سیاسی یسوعی سمجھا۔ کچھ لوگوں کی رائے میں وہ دل سے جمہوریت پسند تھا اور کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ وہ مطلق العنان فرماں رواؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بے باکی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

پندرہویں صدی عیسوی میں سلطنت اور پاپائیت کا نزاع کم ہو چکا تھا۔ جاگیرداری نظام ختم ہو رہا تھا۔ بادشاہوں کی قوت قدرتی طور پر بڑھ رہی تھی۔ کلیسا اور ریاست دونوں میں ہی شخصی قوت کی طرف قدم بڑھائے جا رہے تھے۔ جاگیرداروں اور مجموعیوں (کارپوریشنوں) کے بجائے سیاسی طاقت ایک فردِ واحد —— بادشاہ —— کے ہاتھوں میں مرتکز ہو رہی تھی۔ انگلستان میں ہنری ہفتم۔ فرانس میں لوئی نہم اور ہسپانیہ میں فرڈی ننڈ طاقتور بادشاہ تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہر جگہ مضبوط آدمی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور طاقتور بادشاہ وقت کا سب سے بڑا تقاضہ تھا۔ قومی ریاست کا موجودہ نظریہ نشو ونما پا رہا تھا۔

اس تبدیلی کا تمام یورپی سطح پر اثر ہوا۔ وسائل کی کمیابی کی بنا پر تجارت مقامی ہو کر رہ گئی تھی اور شہر اقتصادی اکائیاں بن گئے تھے۔ ایک قسم کا وفاقی نظام ہی اس صورت کا صحیح حل تھا۔ پیداوار کا انتظام بلدیاتی گلڈوں (یعنی ہم پیشہ لوگوں کی بلدیاتی انجمنوں) کے ہاتھ میں تھا۔ اب اس طریق میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ تجارت بکھری بکھری تھی۔ تمام ملوکیتیں اپنے قومی وسائل کو استعمال میں لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ سوداگر طبقہ اس دور میں پیدا ہو گیا۔ وہ امراء سے غیر مطمئن تھا اس لئے بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اس طرح ازمنۂ وسطیٰ کے تمام ادارے آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے اور بادشاہت کے پاؤں جمنے لگے۔ یہ نظریہ رائج ہو گیا کہ بہت سے ظالم امراء کی حکومت کی نسبت ایک ظالم بادشاہ کی حکومت بہتر ہے۔

سولہویں صدی کے آغاز ہی سے قومی ملوکیتیں زور پکڑنے لگیں ازمنۂ وسطیٰ کے ادارے، آئینی جاگیرداری، شہری ریاستیں، اور مرکز در مگر دولتمند کلیسا دب کر رہ گئے۔ حکومتیں اب درمیانی طبقہ پر زیادہ انحصار کرنے لگیں۔

علوم کا احیا ہو رہا تھا۔ فلاسفر بھی اپنے بدلتے ہوئے ماحول سے متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ میکاولی (۱۴۶۹ء-۱۵۲۷ء) بھی حالات زمانہ سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے اداروں سے بھی واقف تھا اور قومیت کے جس نئے جذبہ پر نئے ادارے استوار کئے جا رہے تھے وہ اس سے بھی آگاہ تھا، اسے اس کا بھی احساس تھا کہ ان تبدیلیوں میں قوت و طاقت کا کیا حصہ ہے، وہ ایک خوشگوار سماجی زندگی کا خواہاں تھا، چونکہ اس نے بے دین تربیت پائی تھی اس لئے اس نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی کہ مطلوبہ تبدیلی میں اخلاق و مذہب کا کتنا حصہ ہوگا۔

پروفیسر ہیرن شا اپنے کتابچہ "ارتقائے نظریات سیاسی" میں میکاولی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"میکاولی فلورنس کی مختصر سی مگر عظیم الشان جمہوریت کا باشندہ تھا، وہ ایک اطالوی محب وطن تھا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا ملک تشتت و انتشار اور مفسدہ پردازیوں کی بنا پر طاقت کی دوڑ میں مغرب کی بڑی بڑی قومی ریاستوں سے پیچھے رہ گیا ہے اور وہ زمانہ کچھ دور نہیں جب اُسے فرانس یا ہسپانیہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں گے یا یہ دونوں اس پر قبضہ کرنے کے لئے باہم جھگڑیں گے اور یہ تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ وہ کوئی ایسا طریقہ معلوم کرنے کے لئے بہت بیتاب تھا جس سے اطالیہ متحد ہو جائے، ہر قسم کے جارحانہ اقدام کا مقابلہ کر سکے، غیر ملکیوں کو باہر نکال سکے، نظم و قانون قائم کر سکے، اور فنون و تمدن کی ترقی کے لئے مناسب ماحول پیدا کر سکے۔ اسی مقصد کی خاطر اس نے تین بڑی بڑی کتابیں —— (۱) فن جنگ۔ (۲) لائیوی پر مکالمات —— اور (۳) بادشاہ —— لکھیں۔"

میکاولی صرف فلسفی ہی نہ تھا، وہ اپنے زمانہ کا ایک عملی انسان بھی تھا، وہ فلورنس میں ایک اہم سرکاری کمیٹی کا سکریٹری تھا۔ اُسے جلا وطنی اور قید کا سامنا بھی کرنا پڑا، رہائی کے بعد وطن واپس آ کر اس نے

باقی عمر تصنیف و مطالعہ میں صرف کی، اس نے فلورنس کی تاریخ بھی لکھی اس میں اس نے بادشاہوں کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت بہت بلند ہے۔

اطالیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ ہیجان و انتشار کا دَور دورہ تھا شہروں پر جبر و استبداد کی حکومت تھی، فوجی تنخواہ دار اور پیشہ ور تھے، وطن پرور رضاکاروں کی کوئی فوج نہ تھی۔ کئی مطلق العنان فرماں روا آمریت کے مالک تھے اور کئی اس حیثیت سے صفر تھے، اندرونی بدحالی کے علاوہ بیرونی خطرہ بھی موجود تھا۔ ہسپانیہ اور فرانس کی آنکھیں اطالیہ پر لگی ہوئی تھیں۔

اطالیہ کے پانچ حصے ہو چکے تھے، پاپائے اعظم نے اب اپنے لئے یہ حیثیت قبول کر لی تھی کہ وہ حاکموں کا حاکم نہیں بلکہ ان کے برابر ہے۔ اگرچہ وہ خود اطالیہ کو متحد کرنے کی تو قوت نہ رکھتا تھا، مگر وہ اتحاد اطالیہ کی ہر کوشش کے راستہ میں روڑے اٹکا سکتا تھا، اور بیرونی حملہ آوروں کو حملہ کے لئے بلا سکتا تھا۔ کلیسا کو امن کا علمبردار ہونا چاہئے تھا لیکن وہ حکومت کا حریف بنا ہوا تھا۔ پاپائے اعظم کی اپنی کلیسائی سلطنت تھی، پادری عوام کو بھی بھڑکا رہے تھے، اطالیہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بڑی مشکل کا سامنا تھا اس طرح اطالیہ کی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی، چنانچہ ہر طرف سے پاپائے اعظم کی مذمت ہونے لگی۔ سیاسی انتشار کے علاوہ یہ دن اخلاقی اعتبار سے بھی بدترین تھے۔ اخلاقی، مجلسی اور مذہبی غرضیکہ ہر اعتبار سے اطالیہ اضداد کا مجموعہ بنا ہوا تھا، اگرچہ لوگ مذہبی رسوم کو بڑی سختی سے ادا کرتے تھے مگر مذہب کی حقیقی روح سے تغافل برت رہے تھے۔

ذہنی آزادی تو موجود تھی مگر اداروں میں خراج قائم ہو چکا تھا، قوت اور خود غرضی کا دور دورہ تھا، ارسطو کا قول سچا ثابت ہو رہا تھا کہ "جب قانون اور انصاف باقی نہ رہیں تو انسان سب حیوانات سے بدتر ہو جاتا ہے"۔

میکاولی بے قابو انسانوں کے دور کا سیاسی مفکر تھا!

ملک کے انتشار اور بدنظمی سے وہ بہت متاثر ہوا تھا اور امن و نظم قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک صاحب بصیرت انسان تھا اور اطالیہ کو متحد دیکھنا چاہتا تھا، اور اس امر کے لئے کسی مضبوط شخص کی حکومت کی ضرورت تھی۔ اس چیز پر میکاولی کے فلسفہ کی بنیاد ہے۔

وہ امن پسند تھا اور انسانی فطرت کے متعلق کلبی نقطۂ نظر رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک سیاست کی بنیاد خود غرضی پر ہے، مقصد کے حصول کے لئے خواہ کوئی بھی راستہ اختیار کرنا پڑے، اختیار کرنا چاہئے، یعنی حکومت ہمیشہ مضبوط ہونی چاہئے، اس مسئلہ کو وہ صرف سیاسی ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس مسئلہ کو حل کرنے میں دو چیزوں نے اس کے لئے بہت سہولت پیدا کر دی۔

(۱) اس کا اپنا مطالعہ۔ اور (۲) اس کا اپنا تجربہ۔

قوتِ بازو اور دغا یہ سب اس مقصد (ریاست کی بقا) کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ میکاولی کے نزدیک صرف "طاقتور بادشاہ" کا وجود ہی اس مقصد کے حصول کا ممکن العمل ذریعہ تھا۔

تاریخ روما کے مطالعہ سے یہ بات اس پر واضح ہو چکی تھی کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، اور ہمیشہ ایک دائرہ کی شکل میں چلتی رہتی ہے۔ ارسطو نے جو دائرہ ——— بادشاہت، استبدادیت، عددیت، جمہوریت وغیرہ کا ——— پیش کیا تھا، میکاولی اس کا قائل تھا۔

میکاولی سے پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان میں اور ایک صدی پہلے کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر تاریخ روما کے مطالعہ نے اس پر یہ روشن کر دیا تھا کہ پہلے جمہوری نظام موجود تھا، پھر اس کی جگہ استبدادیت نے لی، اور جب لوگوں کی حالت اور گر جائے گی تو ایک مضبوط ملوکیت قائم ہو جائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اطالیہ میں اس وقت موخر الذکر حالت موجود ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میکاولی جو دل سے تو جمہوریت پسند ہے "بادشاہ" میں اشرافی فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اپنی دوسری کتابوں میں وہ خالصتہً جمہوریت پسند ہے۔ بعض لوگ تو اس تضاد کو حقیقی کے بجائے محض سطحی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنی کتاب "بادشاہ" میں بھی وہ دل سے جمہوریت پسند ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ کتاب لورنزو سے کیوں معنون کی گئی ہے اور اس کا ہیرو کیوں سیزر بورجیا ہے؟ اس نے بحث کیوں اس طریق پر کی ہے جس سے ملوکیت کی صاف طور پر تائید ہوتی ہے؟

میکاولی کو جمہوریت پسند کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اس کی کتاب "بادشاہ" ملوکیت کی علمبردار نہیں بلکہ ملوکیت کی پردہ دری کرتی ہے اور لوگوں کو استبدادیت سے خطرات سے آگاہ کرتی ہے لیکن یہ نظریہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ یہ کتاب نہ استبدادیت کے خلاف انتباہ کرتی ہے اور نہ اس کی پردہ دری کرتی ہے۔ یہ منافی اخلاق بنیادوں پر قائم شخصی حاکمیت کا جواز پیش کرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میکاولی دل سے جمہوریت پسند تھا، لیکن وہ ایک ایسا آدمی بھی تھا .... جسے اندرونی اور بیرونی حالات نے بدل کر اس امر کا قائل بنا دیا کہ چونکہ جمہوریت ناکام رہی ہے اس لئے یہ

ضروریات زمانہ کے مطابق نہیں ہے۔ وقت ایک مضبوط بادشاہ یا مستبد کا مطالبہ کر رہا تھا۔

اس کے سامنے سب سے اہم سوال ریاست کی بقا تھا اور یہ سوال عملی فلسفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور حالات زمانہ کے مطابق اس سوال کا حل کیا معلوم کیا جاتا ہے۔ شریفانہ اور غیر شریفانہ طریقے ہر جگہ ہی اختیار کئے جاتے ہیں، اس کا خیال ہے کہ مقصد ہر قسم کے ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے۔ بادشاہ کو بُرے اور بھلے ہر قسم کے طریقوں سے آگاہی ہونی چاہئے پروفیسر ہیرن شا اپنی کتاب "ارتقائے نظریات سیاسی" میں میکاولی کے اس نظریہ کا بدیں الفاظ ذکر کرتا ہے:۔

"بادشاہ کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ——— یعنی اطالیہ کے اتحاد، ایک قومی فوج کے قیام، غیر ملکی حملہ آوروں کے اخراج، اور امن و خوشحالی قائم کرنے کے لئے ——— کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں؟ میکاولی کا خیال ہے کہ یہ مقصد اتنا عظیم ہے کہ ذرائع غیر اہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر بادشاہ اپنا مقصد اُن ذرائع سے حاصل کرے جنہیں اخلاقی سمجھا جاتا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے لیکن یہ اغلب ——— بلکہ تقریباً یقینی ——— ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا اس صورت میں اُسے بلا تامل وہ ذرائع اختیار کرنے چاہئیں ——— مثلاً بیرحمانہ جبر و تشدد، اور غیر محدود دغا و فریب ——— جنہیں عام طور پر منافیٔ اخلاق گردانا جاتا ہے، یہ میکاولیت کا لبّ لباب ہے۔ اس طرح سے سیاست کو اخلاقیات سے خارج کر دیا گیا۔ یہ نظریہ اس امر کا اعلان ہے کہ مقصد ہر قسم کے ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے۔"

وہ ریاستوں کے عروج و زوال کے اسباب کا تجزیہ کرتا ہے "بادشاہ" میں وہ بادشاہتوں پر اور "مکالمات" میں جمہوریت روما پر تبصرہ کرتا ہے۔ وہ منافیٔ اخلاق وسائل اور طاقت پر اعتقاد رکھتا تھا، لیکن جمہوریت کا دل سے حامی تھا۔ چونکہ اطالیہ میں اُس وقت جمہوریت کا قیام ناموزوں اور ناممکن تھا، اس لئے اُس نے اپنے جمہوری اعتقادات کا کہیں بھی کھُل کر اظہار نہ کیا۔

میکاولی کا فلسفہ ایک مدبرانہ نظریہ ہے، جو حالات زمانہ کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس کے نزدیک سیاست بذاتِ خود ایک منتہا ہے۔ وہ فنِ حکومت پر بحث کرتا ہے، اس کی تمام مساعی و توجہات صرف حکومتی قوت بڑھانے پر مرکوز ہیں۔ مذہب، اخلاق اور سماج کا اس کے نزدیک اُسی وقت اہمیت ہے جب وہ سیاست پر اثر انداز ہوں۔ وہ بداخلاق نہیں، بلکہ اخلاق پر اعتقاد نہیں رکھتا وہ سیاست کو ہر قسم کے افکار ——— مذہبی، مجلسی، اخلاقی وغیرہ ——— سے علیحدہ کر دیتا ہے۔

اس کی تعلیمات ارسطو سے ملتی جلتی ہیں۔ اسے ریاستوں کی اچھائی یا بُرائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ پاپائیت کی مذمت میں وہ مارزیلیو کا ہمنوا ہے۔ وہ اسے اطالیہ کی پھوٹ کا باعث سمجھتا ہے لیکن مارزیلیو اور میکاولی میں ایک اہم فرق بھی موجود ہے۔ مارزیلیو عیسائی اخلاق کو عاقبت سے وابستہ کر کے انھیں آزادی دیتا ہے، مگر میکاولی ان اخلاق کا محض اس بنا پر مخالف ہے کہ یہ دوسرے جہان سے متعلق ہیں۔ وہ ایک دُنیا دار تھا، عیسائیت کی وہ مذمت کرتا ہے کیونکہ یہ انسان میں اطاعت گزاری اور انکساری کی عادات پیدا کرتی ہے۔ "مکالمات" میں وہ عیسائیت کا موازنہ پرانے مذاہب سے کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ہمارے مذہب میں سب سے بڑی مسرت عجز و انکسار اور دُنیوی اشیاء سے نفرت میں مضمر ہے۔ مگر دوسرے مذاہب کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ روحانی رفعت، جسمانی قوت، اور انسانی توانائی کی تمام خصوصیات کو بہترین قرار دیتے ہیں ...... میں سمجھتا ہوں کہ عیسائیت کے ان ہی اصولوں نے انسانوں کو کمزور کر دیا ہے۔ بدنیت اشخاص انھیں آسانی کے ساتھ اپنا شکار بنا لیتے ہیں اور ان پر پوری طرح قابو پا لیتے ہیں۔ اور انسانوں کی اکثریت مظالم کا انتقام لینے کے بجائے انھیں خوشی کے ساتھ برداشت کرتی ہے، کیونکہ عیسائی تعلیمات میں یہی جنت کے حصول کا طریقہ ہے۔"

میکاولی کا خیال ہے کہ ہر بدطینت شخص عیسائی اصولوں کو آلۂ کار بنا سکتا ہے اور دوسری دُنیا کے انعامات کا لالچ دیکر عوام کو لوٹ سکتا ہے وہ عوام کے مذہب و اخلاق کے سیاسی اور سماجی اثرات سے غافل نہ تھا۔ وہ حکام کو منافیٔ اخلاق وسائل کے استعمال کی اجازت تو دیتا ہے مگر اسے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عوام میں پھیلی ہوئی بداخلاقی اچھی حکومت کا قیام ناممکن کر دیتی ہے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ریاست کی بنیاد عوام ہیں اور ان کے اخلاق و اطوار کی اہمیت سے بھی آگاہ تھا۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ حاکم اور محکوم کے لئے اخلاق کے دو جُدا جُدا ضابطے ہیں۔ حاکم کو اپنی قوت کی بقا میں کامیاب ہونا ہے اور محکوم کو اپنی روش سے سماج کو مضبوط کرنا ہے۔

19

میکاولی اخلاق سے جو بے اعتنائی برتتا ہے اُسے بعض اوقات
علمی بے نیازی . . . .
قرار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی
سوال تھا ـــــ سیاسی قوت کا ـــــ اور باقی تمام مقاصد و
امور کی طرف وہ توجہ ہی نہیں کرتا۔ وہ کوئی علمی انسان بھی نہ تھا، اگرچہ
وہ تجربات سے اپنے اصول وضع کرتا ہے لیکن اس کی تحشیر بیّنت
. . . . ۔ اس لئے نہیں کہ نظریات اور عمومی اصولوں
کی صداقت کو جانچے۔ وہ واقعات سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ مگر یہ کہنا بھی
غلط ہے کہ میکاولی ایک "تاریخی" طریقہ کی پیروی کرتا ہے۔ جو مثالیں اپنے
نظریات کی تائید میں وہ پیش کرتا ہے وہ پُرانے زمانہ سے لی ہوئی ہوتی ہیں
اپنے وضع کردہ اصولوں کو وہ تاریخ کی روشنی میں دُرست ثابت کرتا ہے۔
ایک لحاظ سے تو وہ بہت غیر تاریخی تھا، وہ واضح طور پر یہ کہتا ہے کہ انسانی
فطرت ہمیشہ اور ہر جگہ ایک سی رہی ہے اچنانچہ جہاں کہیں سے بھی اُسے
اپنی تائید میں مثالیں ملتی ہیں وہ انھیں اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیتا
ہے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی سمجھ بوجھ کو کام میں لا کر واقعات کا مشاہدہ
و مطالعہ کرے۔ وہ مختلف واقعات پر تبصرے کرتا ہے لیکن کوئی فلسفیانہ
اصول پیش نہیں کرتا۔

اس کے نزدیک انسان خود غرض ہے۔ اور طاقتور سے اپنے
آپ کو ریاست کی امداد کے بغیر بچا نہیں سکتا۔ ملکیت اور زندگی کا
تحفظ ضروری ہے اور یہ صرف حکومت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ (یہی
نظریہ ہابز کے اصولوں کی بنیاد ہے) اطالیہ کی حالت بدترین ہو چکی تھی
اور اب اُسے ایک مضبوط حکومت کی سخت ضرورت تھی۔ جب ضروری
اور ناگزیر اچھائیاں باقی نہ رہیں تو صرف مضبوط حکومت ہی امن و
نظم قائم رکھ سکتی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً لڑاکا ہے اور اس کی اس فطرت
میں توازن پیدا کرنے کے لئے ایک مضبوط حکومت ضروری ہے۔
بالفاظِ دیگر سماج میں ایک مطلق العنان ریاست ہونی چاہئے جو سیاسی
اور اقتصادی طاقتوں میں توازن قائم رکھے۔

اس کا خیال ہے کہ اخلاقی اور مدنی اچھائیاں قانون سے پیدا
ہوتی ہیں، اس لئے زوال پذیر قوموں میں قانون ساز کی سخت ضرورت
ہے۔ یہ قانون ساز سماج کی تعمیر کرتا ہے اور صرف ریاست کے انتظام و
انصرام کی نگرانی نہیں کرتا بلکہ سماج کے تمام عناصر کو قابو میں لاتا ہے
وہ ایک فوج بھی بنا سکتا ہے، اور اقتصادی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی
امور میں بھی دخل انداز ہو سکتا ہے۔

قانون اخلاق نافذ کر سکتا ہے اس لئے قانون ساز اخلاق
سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے کاموں کو جانچنے کا معیار صرف کامیابی
ہے۔ وہ تشدد استعمال کر سکتا ہے۔ فلاح و بہبود کی تخریب کیلئے نہیں
بلکہ ان کی تعمیر و تخلیق کے لئے۔ میکاولی کسی درمیانی راستہ کا قائل
نہیں، وہ مطلق العنان ملوکیت کا حامی ہے۔

وہ صرف دو چیزوں کا مداح ہے ایک تو صاحب الرائے و
باتدبیر مطلق العنان فرماں روا کا۔ دوسرے خود مختار عوام کا۔ اور یہ
ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ دونوں امور متضاد و متصادم ہیں۔

میکاولی کہتا ہے کہ جب تشدد کے زور پر حکومت قائم کر لی
جائے تو اس کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ عوام سیاسی طاقت میں
حصہ دار ہوں۔ ملکیت، زندگی اور رعایا کے جائز حقوق کا تحفظ ہو
ایسی ریاستوں میں مطلق العنان فرماں روائی ہی صورتِ حال کا
صحیح حل ہوتی ہے، مگر اس مطلق العنان فرماں روا کو بھی احتیاط
سے کام لینا چاہئے۔

میکاولی اُس پابند قانون اور آزاد خیال حکومت کا بجا طور
پر مداح ہے جس میں عوام بھی حکومت میں حصہ دار ہوں، موروثی کے
بجائے وہ منتخب حاکم کو ترجیح دیتا ہے۔ عمّالِ حکومت کو اپنی غلطیوں
کی تلافی کا وہ قانوناً پابند کرتا ہے۔

امراء کو میکاولی اچھا نہیں جانتا وہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ نہ
امراء اور بادشاہ کے مفادات میں کوئی یکسانی موجود ہے اور نہ درمیانی
طبقہ اور امراء کے مفادات میں کوئی باہم آہنگی قائم ہے۔ وہ یہ کہتا ہے
کہ ایک مطلق العنان فرماں روا میں اور کوئی خوبی نہ سہی کم از کم اس
کا نقطۂ نظر امراء سے وسیع تو ہوتا ہے۔

وہ پیشہ ور فوجیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ کہتا ہے
کہ یہ فوجی اپنے ملکی بھائیوں پر تو جبر کر سکتے ہیں مگر غیر ملکی حملہ آوروں کے
سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اور شاہی خزانہ کو خالی کر کے بادشاہ کو تباہ
کر دیتے ہیں وہ قومی رضاکار فوج کا حامی ہے اور فرانس[1] کی سی شہری فوج کو

[1] سولہویں صدی کے آغاز میں فرانس میں ایک قومی محصول لگایا گیا جس سے
قومی شہری فوج بنائی گئی جس نے انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ یہ محصول
جاگیرداروں کے اختیارات میں کمی اور بادشاہ کی قوت میں اضافہ کا بھی باعث
بنا۔ کیونکہ اس طرح طاقت بہت زیادہ مرتکز ہو گئی تھی اور جاگیردار اب
محصول عائد کرنے کا اختیار ترک کر رہے تھے۔ اس طرح ان کی قوت میں
کمی شروع ہو گئی۔

پسند کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سترہ سے لیکر چالیس برس کی عمر سے کے ہر شہری کو فوجی تربیت حاصل کرنی چاہیئے۔ اس طرح ان میں شاہ کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

وہ ملکی فرض کو ہر قسم کے تعلقات پر بھاری قرار دیتا ہے وہ کسی قومی ریاست کا تصوّر بھی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ رومائی قسم کی بڑھتی ہوئی شہری ریاست کا حامی تھا۔

وہ تجربات پر اپنے اصولوں کو وضع و استوار کرتا ہے۔ وہ سیاست، فنِ حرب، اور فنِ حکومت میں دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے مشاہدات کو کسی عمومی اصول سے وابستہ نہیں کرتا۔ اقتصادی اور مجلسی مسائل سے اسے لگاؤ نہیں۔ وہ اتنا زیادہ عملی انسان ہے کہ فلسفہ کو چھوتا تک نہیں۔

ریاست کے موجودہ مروّجہ سیاسی معنی اسی کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ وہ ریاست کو انسانی زندگی میں سب سے اہم دخل دیتا ہے۔ سیاسی ارتقاء کے معنی سے وہ بخوبی آگاہ تھا۔

اس اعتبار سے میکاولی کا فلسفہ بالکل سطحی ہے کہ وہ قوموں کے عروج و زوال کو مطلق العنان فرماں رواکی اہمیت پر منحصر سمجھتا ہے۔

میکاولی کے زمانہ میں اطالیہ کے علاوہ باقی یورپ میں سیاست کو مذہب سے گہرا تعلق تھا، لیکن اپنی بحث و نظر کے دوران میں وہ مذہب کو پوری طرح مس بھی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کا فلسفہ صرف اس کے اپنے وطن اور زمانہ تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔

اصلاحِ مذہب کی تحریک کے بعد مذہب اطالیہ میں بھی اہم حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اور اگر اس تحریک کے بعد وہ اطالیہ میں بھی پیدا ہوتا تو یقیناً مذہب کو اس طرح نظر انداز نہ کرتا۔

افکار

عِشق

عشق روحِ زندگی ہے، عشق جانِ زندگی ایک چنگاری سے روشن ہے جہانِ زندگی

عشق نے بخشی زمانے کو لسانِ آرزو

ورنہ تشنہ تھی جہاں میں داستانِ آرزو

غنچے کی چٹک مرگِ گل و لالہ کا پیغام آغازِ بہاراں ہی بہاراں کا ہے انجام

آغاز کی تقدیر ہے اِک لمحۂ امید اُمید کا انجام ہے صد عبرتِ آلام

آئینہ ہے آئینہ یہ دورِ سحر و شام

اِک صبحِ درخشاں ہے ہر اِک رات کا انجام

محبّت

حاصل ہے اساطیرِ جہاں کا وہ کہانی جو دل نے کہی اور نگاہوں نے سُنائی

ساغر

عطاء اللہ

چین میں امدادِ باہمی

چین ہمارا ہمسایہ ملک اصل میں اپنے آپ میں ایک دنیا ہے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے اس کی وسعت مسلّم ہے، لیکن اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے قدرت نے آس پاس کی دُنیا سے بالکل الگ تھلگ کر رکھا ہے، چین کے بڑے بڑے جنگل، سربلند پہاڑ، وسیع ریگستان اور بے پایاں سمندر اس کی ایسی ناقابل عبور سرحدیں ہیں کہ چین کا پیوند بیرونی دُنیا سے حقیقی معنوں میں آج بھی جدا ہے، چین خدا کی خدائی کی طرح وسیع ہے، اس میں اگر ایک طرف برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں موجود ہیں تو دوسری طرف تپتے ہوئے صحراؤں کی بھی کمی نہیں، اگر ایک پہاڑ رنگ و بُو کا ایک گلستان ہے تو دوسرا تپتا ہوا آتشدان، چین کے میدان اور ریگستان، چین کے ویرانے اور جنگلات، چین کے دریا، چین میں باران رحمت کا جوش اور خشک سالی کا زور بھی ایک وقت میں ایک ہی جگہ جمع ہیں، آبادی کا یہ عالم ہے کہ آجتک باقاعدہ مردم شماری کی نوبت ہی نہیں آئی، موجودہ اندازوں میں حد درجہ اختلاف ہے، لیکن اس قدر پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ چین کی آبادی تا ہم کروڑ سے زیادہ ہو تو ہو، کم کسی صورت میں نہیں۔

چین کی زندگی کو دیکھیے تو ملک کی وسعت کے لحاظ سے اس میں بیحد رنگا رنگی پائی جاتی ہے، ان علاقوں میں جہاں مغربی اقوام کا اثر غالب آ رہا ہے موجودہ تمدّن کے تمام لوازمات یعنی شاندار عمارات، بڑے بڑے بینک، یونیورسٹیاں اور کالج وغیرہ اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ موجود ہیں، ریل ہے، تار ہے، ڈاک ہے، ریڈیو ہے، اور سبھی کچھ ہے، لیکن ان اثرات سے دور چین میں وہی مٹی کے جھونپڑے، وہی ان کی پھوس کی چھت اور وہی بانس کی کھپچیوں کے در و دیوار ہیں، اور انسان زمین سے جنگ کر رہا ہے ایک مشہور مصنف کے قول کے مطابق چین میں انسانی زندگی کی جڑیں زمین کے اندر ہیں، چین کی تہذیب زراعتی تہذیب ہے کیونکہ زراعت ہی چینیوں کی زندگی کا سہارا اور ان کے تمدّن اور معاشرت کی بنیاد ہے، اور چین کی زندگی اور ترقی اس کے شہروں کی نہیں دیہاتوں کی کیفیت کا نام ہے۔ آبادی کی تین چوتھائی سے بھی زیادہ کا انحصار براہ راست زراعت پر ہے، کسان کے کھیت چھوٹے چھوٹے، گھرانے بڑے بڑے، اور زراعت کے طریقہ وہی دقیانوسی، چینی زبان میں ایک ضرب المثل ہے، زراعت پڑھی نہیں جاتی، ہمسایہ کے عمل سے سیکھی جاتی ہے، چین زراعتی پیداوار کی مقدار کے لحاظ سے ایک اول درجہ کا ملک ہے، پھر بھی خوراک کی خاص مقدار ہر سال درآمد کی جاتی ہے۔

زراعت ایک علم ہے، اور ایک فن، فنّی تجربات سے علم بڑھتا ہے، اور علمی تجربات فن میں ایک انقلاب پیدا کرتے ہیں، جہاں کسان اَن پڑھ ہو، لکیر کا فقیر ہو، مفلس ہو، اچھے جانور اور عمدہ آلات اسے مہیّا نہ آسکیں، اور جہاں کسان کو بارآور کاموں میں لگانے کے لئے معقول مقدار میں سرمایہ قابل قبول شرائط پر میسّر نہ آسکے، وہاں زراعت مفلسی نہیں فاقہ مستی کا نام ہے مفلسی جسمانی، دماغی اور بڑی حد تک اخلاقی پستی اور ہر طرح کی ذلّت کی بنیاد ہے، ہر ملک کی طرح قدرت کی ہر ہولناکی چین میں بھی پہلے کسان ہی کو تاکتی ہے، چین میں ایسے خطّے عام ہیں جنھیں قدرت کی بے پروائیوں اور انسان کی غفلتوں اور ناداریوں نے قحط کی گھوڑ دوڑ بنا رکھا ہے، قحطوں کی کثرت اور ان کی لپیٹ میں آنے والے علاقوں کی وسعت، اور چینی کسان کی ناداری چین کی حکومت پر کسانوں کی امداد کا فرض عاید کرتی ہے، اور حکومت اپنی ہمّت کے مطابق کسانوں کو تقاوی کی صورت میں امداد دیتی ہے۔

جنگ کی وجہ سے ایک اور مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ چین کے ساحلی علاقے کا وہ جفاکش کسان جس کی آبائی وراثت جاپان کے قبضہ میں آچکی ہے بھاگ بھاگ کر آزاد چین میں پہنچ رہا ہے، جہاں

اس کو آباد کرنے کے لئے ہر قسم کا انتظام و اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ وہ دوبارہ زمین سے سونا اگلوانا شروع کر سکے ؛

چین کے کسان کی ایک خوبی اور کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی سے قرض لینا اپنی شان خودداری کے خلاف اور اپنی بڑی ہی ذلت اور توہین سمجھتا ہے، اس سے اگر ایک طرف تو یہ فائدہ ہے کہ چین کا محنتی اور دیانتدار کسان ساہوکاروں اور مہاجنوں کے پنجے سے آزاد ہے تو دوسری طرف اس میں یہ عیب ہے کہ زراعت کی ترقی کے لئے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ کسان کو میسر نہیں آتا' اور اور اسی طرح چینی کسان اور چینی زراعت دونوں ترقی سے محروم ہیں اسی لئے چینی کسان اور چینی زراعت کو امداد باہمی کی سخت ضرورت ہے۔

امداد باہمی انسان کے تمام تمدّن اور اس کی پوری معاشرت کی بنیاد ہے، مختلف صورتوں میں آپس کی امداد کے بغیر موجودہ طرز کی زندگی اور اس کی تمام آسائشیں وہم وگمان بن کر رہ جاتی ہیں' اس لئے ہر ملک و قوم میں امداد باہمی کا جذبہ اپنے اپنے تمدّن کی منزلوں کے مطابق مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا ہے، چونکہ آج کل دُنیا کا ہر کام روپیہ سے انجام پاتا ہے اور روپیہ ہی کا نہ ہونا سنو عیبوں کا ایک عیب ہے چین میں بھی امداد باہمی کے موجودہ صورت میں رواج پانے سے پہلے آپس میں مل کر مقرر ماہانہ قسطوں میں روپیہ جمع کرنے اور اسے ضرورت کے مطابق باری باری سے ہر امانتدار کو دیدینے کا طریقہ رائج تھا، ہمارے ملک میں بھی آجتک عورتوں میں باہم مل کر اسی طرح کمیٹیاں قائم کرنیکا رواج ہے، مغرب کے ایک مشہور مصنّف اس طریقہ سے سخت بیزار ہیں، اور باوجود تفصیل و تشریح ان کی سمجھ میں یہ بات آہی نہیں سکی کہ امداد باہمی کی موجودہ صورت کی عدم موجودگی میں جبری بچت کا یہ چینی اور ہندوستانی طریقہ نہایت مفید اور امداد باہمی ہی کی ایک ابتدائی شکل ہے۔

امداد باہمی کی تحریک نے اپنی موجودہ صورت میں جرمنی میں جنم لیا، اور اب دُنیا بھر میں یہ تحریک ایک زندہ اور زبردست تحریک ہے جس کی بدولت اگر یہ کہا جائے کہ قوموں اور ملکوں کی قسمتیں پلٹ گئیں ہیں تو ارباب بصیرت کے نزدیک مبالغہ نہ ہوگا، چین میں امداد باہمی کی اشاعت کا خیال سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں پروفیسر ہسائی . . . . . . کو پیدا ہوا جنھوں نے شنگھائی میں ایک امداد باہمی بینک قائم کیا اور ایک عرصہ تک اخبار "پنگنگ" میں زور دار پروپیگنڈا کرتے رہے جس کا اثر قومی پارٹی پر اس قدر گہرا ہوا کہ آجتک یہ پارٹی امداد باہمی کے پیغام کو چین کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں پہنچانے کے لئے پوری گرمجوشی سے مصروف ہے اور ملکی خدمت اور ترقی کی اس تدبیر پر عمل کرنے والے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو امداد باہمی کے اصولوں اور طریقوں میں اپنی بساط اور بصیرت کے مطابق تعلیم و تربیت دینے میں مشغول ہے؛

چین میں قحط کا سلسلہ تو رہتا ہی ہے، شمالی چین میں ایک قحط اس قدر شدید اور وسیع واقع ہوا کہ ایک بین الاقوامی قحط کمیشن قحط زدوں کی امداد کے لئے مقرر ہوا، اس کمیشن میں چینی اور غیر چینی لوگ شامل تھے اور اس کا مقصد اس بڑی رقم سے جو امداد قحط کے طور پر جمع کی گئی تھی کسانوں کی بہترین طریق پر امداد کرنا تھا، اس کمیشن کا نام "چائنا انٹرنیشنل فیمن ریلیف کمیشن" تھا؛

اس کمیشن نے ۱۹۲۲ء میں امداد باہمی کی عملی امداد کے طور پر کسانوں کی انجمنیں قائم کیں، اور ان کو اپنے فنڈ سے روپیہ قرض دیا، اور اپنی ضمانت پر چینی بینکوں سے قرض دلوایا، صوبہ وار کانفرنسیں منعقد کرائیں، اور انجمنوں کے کام کی رہنمائی اور نگرانی کے لئے اپنے خرچ سے انسپکٹر مقرر کئے، بعض انجمنوں کو اپنے سرمایہ حصص اور ممبروں کی امانتوں کے سرمایہ سے کام شروع کر کے اپنی صلاحیت اور امداد حاصل کرنے کی لیاقت ثابت کرنے کی مہلت دی، اور اس طرح صوبہ ہوپی میں پندرہ سولہ برس کے عرصہ میں اچھی انجمنوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی، اور ان انجمنوں نے کسانوں کی معقول خدمت انجام دی۔

جب ۱۹۳۱ء کے ہولناک سیلاب نے یانگسی وادی کے کتنے ہی صوبوں میں تباہی و بربادی پھیلا دی تو نیشنل فیمن ریلیف کمیشن اور چائنا انٹرنیشنل فیمن ریلیف کمیشن نے مل کر کسانوں کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے ایک تو غلّہ اور روپیہ تقسیم کیا اور دوسرے ساتھ ہی ساتھ امداد باہمی کی ہزارہا انجمنیں قائم کر دیں، پہلے تو یہ انجمنیں دس یا دس سے زیادہ کسان مل کر قائم کر سکتے تھے، جن کی ذمہ داری مشترک یا غیر محدود ہوتی تھی، اور انجمنیں غیر رجسٹری شدہ ہوتی تھیں، کمیشن ایسی انجمنوں کی معرفت کسانوں کو امداد کے لئے روپیہ دیتا تھا، اور اگرچہ کسان اپنے آپ کو دیوالیہ قرار

۲۴۳

دیگر قرض کی واپسی سے بچ سکتے تھے، لیکن چینی کسان کی ایمانداری اور خودداری نے قرض کی واپسی کو ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے برابر سمجھا۔ یہ انجمنیں تھوڑے عرصہ کیلئے قائم ہوتی تھیں اور جب سب ممبروں کا قرضہ ادا ہو چکتا تھا تو انجمنیں بند کر دی جاتی تھیں، لیکن تھوڑی دیر بعد چائنا انٹرنیشنل فیمن ریلیف کمیشن نے ایسی انجمنوں کو مستقل بنا دیا ہے اور اب صوبہ آکنگ، ہونان، ہوپی اور کیانگسی میں ہزارہا انجمنیں قائم ہیں، اور کسان کی خدمت بجا لا رہی ہیں۔

چین کے مختلف صوبوں میں امداد باہمی کی طرز کی قرضہ انجمنوں کی تعداد آج سے پانچ چھ سال پہلے ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی ۱۹۲۷ء میں ایک سرکاری زراعتی بینک قائم کیا گیا، اگرچہ وہ خالص امداد باہمی کی طرز کا بینک نہیں تاہم دوسرے تجارتی فرائض کے ساتھ ساتھ امداد باہمی کی قرضہ انجمنوں کو سرمایہ بھی بہم پہنچاتا ہے، اس فارمرز بینک کے علاوہ ایک نیشنل فارمرز بینک بھی قائم ہے جو انجمنوں کی معرفت کسانوں کی مالی ضروریات پورا کرنے میں مدد دیتا ہے، چین کی حکومت نے لیگ آف نیشنز سے زراعتی قرضہ اور مالیات کے ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور انھیں چینی کسان کی ضروریات سے واقفیت حاصل کرنے اور امداد باہمی کی ضرورت اور اس کے فروغ دینے کی تدابیر پر غور کرنے کا موقعہ بہم پہنچایا، ان ماہرین کی رائے سے دیہاتی قرضہ کی انجمنوں میں اضافہ ہوا، حکومت نے ذرائع آمدورفت میں وسعت اور آسانیاں پیدا کیں، دیہات سدھار کا دور دورہ شروع ہوا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت نے تسلیم کر لیا کہ کاشتکار کی ترقی کے لئے صرف قرضہ انجمنیں ہی کافی نہیں، چینی کسان کو دوسرے ملکوں کے کسانوں کی طرح اپنی زندگی اور پیشہ کے ہر شعبہ میں امداد باہمی کی طرز کی انجمنوں کی ضرورت ہے، مثلاً انجمنوں کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ سے سرمایہ یا قرض حاصل کرنے میں اسے طرح طرح کا نقصان ہوتا ہے، اس لئے اُسے مناسب اور معقول شرائط پر سرمایہ بہم پہنچانے کے لئے قرضہ انجمنوں کی ضرورت ہے، اسے ضروریات زندگی اور اپنے پیشہ کے آلات اور سامان حاصل کرنے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں، جو اس کے کھیتوں تو کیا اس کی زندگی تک کی شادابی کا خاتمہ کر دیتی ہیں، اسے اپنا خون پسینہ ایک کر کے پیدا کئے ہوئے اناج اور دوسرے سامان کی فروخت میں طرح طرح کا گھاٹا اور ٹوٹا اٹھانا پڑتا ہے، اس لئے انجمن قرضہ کے ساتھ امداد باہمی کی طرز کی انجمن ہائے خرید اور انجمن ہائے فروخت قائم کی گئیں، اور اس طرح کاشتکار دل کو اپنی ضرورت کے سامان کی خرید اور اپنی پیداوار کی فروخت میں آسانی پیدا ہو گئی ہے، خرید و فروخت کی انجمنوں کے زیر اہتمام کچھ پرچون کی دوکانیں بھی کھول لی گئیں،

زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے بکھرے ہوئے کھیتوں کو اشتمال آراضی یا چک بندی کی امداد باہمی کی طرز کی انجمنوں کے ذریعہ اکٹھا کر لیا گیا ہے، ہر گاؤں کا کسان اور زمیندار اس چک بندی کی انجمن کا ممبر ہوتا ہے اور زمین کی تقسیم نئے سرے سے کی جاتی ہے، اور کسان اپنا لگان زمیندار کے بجائے انجمن کو ادا کرتے ہیں، جہاں سے وہ رقم زمیندار کو دیدی جاتی ہے۔

شہروں، سکولوں اور کالجوں میں بھی کہیں کہیں اور چھوٹے پیمانہ پر خرید کی انجمنیں قائم ہیں۔

چین میں امداد باہمی کی تحریک ابھی نہایت ابتدائی حالت میں ہے، اس کی وسعت اور کارنامے ابھی قابل تذکرہ بھی نہیں اور نہ ہی اس کی گوناگونی پر کوئی اطمینان ظاہر کیا جا سکتا ہے، قرضہ کی چند ہزار دیہاتی انجمنیں، چند ہزار خرید و فروخت کی انجمنیں، دس پانچ بینک، وہ بھی خالص امداد باہمی کی طرز کے نہیں، ان انجمنوں کو چلانے کے لئے تحریک کے اصولوں سے پورے طور پر واقف لوگوں کا قحط، کارکنوں کو امداد باہمی کے علم و عمل میں تعلیم و تربیت دینے والوں کی کمی، کسان کی جہالت، عمدہ نگران اور لائق رہنماؤں کا فقدان، انجمنوں کا غیر رجسٹری شدہ رہنا، ابتدائی انجمنوں کا یونین کی صورت میں مرتب نہ ہونا، مرکب انجمنوں کا قیام یعنی ایک انجمن کا مختلف بلکہ متضاد مقاصد کے لئے قائم ہونا وغیرہ وغیرہ کتنی ہی باتیں ہیں جن کی بنا پر چین میں امداد باہمی کی وسعت اور عمل کو کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہا جا سکتا۔ چین ان نقائص کو رفع کر رہا ہے، لیکن چین میں امداد باہمی کی سب سے بڑی ساکھ جذبۂ امداد باہمی کی ہمہ گیری، اسے سمجھنے کا ولولہ، اور اس پر عمل کرنے کی اُمنگ ہے، چین کو تھوڑی سی بیرونی رہنمائی اس تحریک کی بُنیادیں استوار کرنے کیلئے درکار ہوگی، ورنہ چین والوں کی فہم و فراست اور قوتِ تعمیر کا یہ حال ہے کہ انھوں نے پورے زور کے ساتھ یہ کہہ دیا ہے کہ چین کی صنعتی ترقی کو ہم مغربی زندگی اور صنعتی ترقی کے ناگوار

اثرات سے ہلاک کیے گئے ہیں۔

چین کی سب سے بڑی دولت قدرت کے آغوش میں پرورش پانے والا جفاکش اور خوددار کسان ہے جس کی فطرت میں امداد باہمی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے، اور جسے چین کی ناقابلِ عبور سرحدوں نے موجودہ زمانہ کی خودغرضی اور حرص و ہوا کی لعنتوں سے محفوظ رکھتے ہوئے وطن کی محبت سے سرشار کر رکھا ہے، ہر ملک کی ترقی کی بنیاد اس کے باشندے ہیں وہی ملکوں کے مقدّر اور قوموں کی قسمتوں کے پلٹنے والے ہیں چین نے جس خودداری، بے جگری اور ایثار سے حفاظتِ وطن میں جانبازی اور سرفروشی کا ثبوت دیا ہے، اور جس طرح اس نے اپنے عزم و ہمت سے جاپان کی ہلاکت بازیوں کا مقابلہ کیا ہے، وہ اس کی معاملہ فہمی، قوتِ تنظیم اور اس کی بیداری اور زندگی کا ثبوت ہے۔

چین کا بہادر سپاہی برما میں ہندوستانی سپاہیوں کے دوش بدوش ہندوستان کی حفاظت کیلئے اپنا خون بہا رہا ہے، چین کا سب سے بڑا مدبّر سپہ سالار خود ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکا ہے، اب ہندوستان اور چین کی باہمی امداد میں ہماری آزادی اور آبرو کا راز پوشیدہ ہے جب دونوں ملکوں کی اس امداد باہمی کی بدولت دُنیا کو ایک نیا، بہتر اور روشن مستقبل نصیب ہوگا تو چین کی معاشی امداد باہمی کی ترقی میں کیا دیر لگے گی!

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

منتشر جذبے

برتری

تیری آنکھوں نے سکھادی رسم و راہِ برتری
ہر اشارہ اِک خدائی، ہر نظر پیغمبری

آزادی

چہ مرگ و زیست، چہ دُنیا و دیں، چہ فکر و خیال
تمام عالمِ امکاں غبارِ آزادی

ذوقِ احتجاج

پڑتی ہے روشنی مرے حالِ تباہ پر
اے کاش، بجلیوں کی چمک جاوداں رہے

خواب و بیداری

ترے خیال کے زانو پہ آنکھ لگتی ہے
ترے تصوّرِ بے حد سے جاگتا ہوں میں

عطیہ

فطرت نے جو بخشی بھی تو وہ شے مجھے بخشی
جس شے کی سمائی ہے نہ دُنیا میں نہ دیں میں

جوہر

ہوتا تو فضا نور سے بجلی نظر آتی
جوہر ابھی موّاج نہیں میرے نگیں میں

ساغر

حامد حسن قادری

منشی جی

منشی دیانراین نگم سے میرے تعلقات تقریباً چالیس برس سے تھے۔ مختلف کاموں میں میرا اُنکا ساتھ رہا۔ انکا نام اور تذکرہ بار بار آتا تھا اور میں ان کو منشی جی کہا کرتا تھا۔ یہ ان کے نام کا مترادف ہو گیا تھا۔

منشی جی نے جب ۱۹۰۳ء میں بریلی سے زمانہ جاری کیا، میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ زمانہ کے چند پرچے نکل چکے تھے جب مجھے اسکے جاری ہونے کا علم ہوا۔ میں نے پہلی ششماہی کی جلد منگا لی اور زمانہ اپنے نام جاری کرا لیا۔ پھر جب منشی جی سے ملاقات ہوئی، مراسم پیدا ہوئے۔ بے تکلفی بڑھی تو خریداری کا تکلف برطرف اور زمانہ میرے نام جاری رہا۔ بلکہ منشی جی مجھے مضمون نگاری کا معاوضہ دینے لگے۔ لیکن ایک دو مرتبہ کے بعد میں نے اس تکلف کو بھی اُٹھا دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ میں تقریباً چالیس سال سے برابر زمانہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

غالباً ۱۹۰۵ء جب زمانہ کانپور سے نکلنے لگا، میں نے اس میں مضامین اور نظمیں لکھنی شروع کیں۔ ۱۹۰۶ء میں منشی جی نے شہنشاہ اکبر اعظم کی سہ صد سالہ برسی کے موقع پر زمانہ کا اکبر نمبر شائع کیا۔ اس میں میری بھی ایک نظم (مقبرۂ اکبر) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ میں اس زمانے میں طالبِ علم تھا۔ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں بھی میرے مضامین اور رباعیاں زمانہ میں شائع ہوئیں۔

۱۹۰۹ء میں مجھے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں سے کانپور گیا کانپور کا سفر سیر و تفریح کیلئے نہ تھا۔

"ہوس سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو"

بلکہ صرف دو شخصوں کی زیارت کا اشتیاق کانپور لے گیا تھا۔ ایک منشی دیانراین نگم، دوسرے منشی رحمت اللہ رعد (مالک نامی پریس و بڑی جنتری) ایک روز منشی دیانراین صاحب سے دو بار ملا۔ دوسرے روز منشی رحمت اللہ رعد صاحب سے۔ اس ملاقات سے مجھے منشی دیانراین نگم کی ذات سے اک گرویدگی پیدا ہو گئی۔ منشی جی کو ادب سے زیادہ سیاست کا ذوق تھا۔ بعد کو تو ان کا شوقِ سیاست ذوقِ ادب پر بھی غالب و مؤثر ہو گیا تھا۔ لیکن اس رُجحان کا اثر اس وقت بھی غیر محسوس نہ تھا۔ اب سے ۳۲، ۳۳ برس پہلے کی ہندی سیاست کچھ زیادہ پیچیدہ نہ تھی، تاہم سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ کا اثر باقی تھا۔ اور کانگرس اور کانفرنس کی رقابت جاری تھی۔ انہی موضوعات پر اس پہلی ملاقات میں میری اور منشی جی کی مختصر گفتگو رہی۔

۱۹۱۷ء میں میرا بسلسلۂ ملازمت کانپور جانا ہوا۔ اور مسلسل دس برس وہاں رہا۔ ۱۹۱۸ء میں میں نے بچوں کیلئے ایک پندرہ روزہ رسالہ سعید کانپور سے جاری کیا اور سات برس لگاتار رہا۔ منشی جی صحافت کے پہلے سے مرد میدان تھے اور میرے ان سے تعلقات۔ سعید کے زمانۂ اشاعت میں منشی جی نے جس طرح میری حوصلہ افزائی کی اس کا اثر آج تک میرے دل پر ہے۔ قیام کانپور کے زمانے میں زمانہ کی مضمون نگاری (جو عرصے سے چھوٹی ہوئی تھی) میں نے پھر شروع کر دی۔ بہت سے مقالے اور افسانے لکھے۔

۱۹۲۷ء میں میرے آگرہ آنے کے بعد جب آگرہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو منشی جی اُردو بورڈ کے ممبر ہو گئے اور آخر تک برابر ممبر رہے۔ میں ممبر بھی تھا اور کنوینر بھی۔ اس حیثیت سے منشی جی سے دوگونہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اور ہر سال ملاقات ہونے لگی۔ منشی جی (بجز ۱۹۴۱ء جب ان کے ایک صاحبزادے آگرہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور وہ انکے پاس ٹھہرے تھے) ہمیشہ دیال باغ میں قیام کیا کرتے تھے۔ میرے مکان اور دیال باغ میں بُعد المشرقین ہے۔ بلکہ صحیح تر بُعد الشمالین" لیکن منشی جی اکثر بورڈ کے جلسے سے قبل یا بعد میرے مکان پر تشریف لایا کرتے تھے کہ بورڈ کی گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی ملاقات سے سیری نہیں ہوتی۔ یہ وضعداری منشی جی کی طبیعت کا خاصّہ تھی، اور کچھ میرے ہی ساتھ نہ تھی آگرہ میں لطیف الدّین احمد صاحب (ل احمد) اکبر آبادی سے بھی ایسا ہی تعلق تھا۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ دور رہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس بھی اکثر جایا کرتے تھے۔

مجھے منشی جی کی یہی ادائے قدامت پسندی و وضعداری سب سے زیادہ پسند تھی۔ اسکی ایک ذراسی، لیکن بڑی دلچسپ مثال یہ ہے کہ ان کا رسالہ (زمانہ) جب بریلی سے نکلنا شروع ہوا تو ٹائٹل پیج پر "زمانہ" کا

لفظ نستعلیق میں لکھا جاتا تھا۔ پھر جب کانپور سے شائع ہونے لگا تو خط نسخ میں (زمانہ) لکھا جانے لگا۔ اسکے متعلق منشی جی فرماتے تھے کہ یہ خط گلزار کی مرصع اور نسخ کی شکل منشی رحمت اللہ رعد نے تجویز کی تھی۔ منشی جی نے وضع کی پابندی اور رعد مرحوم کی یادگار مرتے دم تک قائم رکھی۔ اس عرصے میں دوسرے اردو رسالوں کے نئے نئے سرورق نظر آئے، خط نسخ سے عام دلچسپی نہ رہی، خطِ گلزار پرانا پڑ گیا۔ لیکن منشی جی نے اپنی وضع نہ بدلی۔ درمیان میں ایک آدھ بار جدید وضع کا ٹائٹل پیج بھی بنا اور چھپا، لیکن اُن کو پسند نہ آیا اور انہوں نے پھر وہی وضع اختیار کر لی۔

ایک مرتبہ نئی تہذیب اور نوجوانوں کے اخلاق کا تذکرہ آگیا منشی جی نے فرمایا، یہاں تو یہ حال ہے کہ جتنی عمر بڑھتی جاتی ہے "گھر" سے دلچسپی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

ایک سال اردو بورڈ میں کسی کتاب کے بدلنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ ایک ممبر نے اس کتاب کی جگہ ایک جدید انشا پرداز کے افسانوں کا مجموعہ تجویز کیا۔ میں نے اس بنا پر اختلاف کیا کہ اس میں اکثر فسانے عُریاں قسم کے ہیں۔ کالجوں میں مخلوط تعلیم جاری ہے۔ پڑھنے والوں اور امتحان دینے والوں میں کثرت سے لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ منشی جی نے اپنے پرانے پن کی وجہ سے اس رائے کو بہت پسند کیا اور وہ کتاب شاملِ نصاب نہ کی گئی۔

منشی جی پرانے سماج اور قدیم معاشرت میں پل کر جوان ہوئے تھے، اور اس زمانے میں پختہ خیال ہو چکے تھے۔ جزئی روشنی کچھ یوں ہی سی جھلکی تھی، پھیلی اور چھائی نہ تھی، اسی کا فیضان تھا کہ انکے صاحبزادے اور اہلِ خاندان تہذیب مغربی اور تعلیم جدید سے متاثر ہو کر بھی اپنے اسلاف اور اپنے خاندان کی روایات کے حامل و عامل ہیں۔

منشی جی سیاسی آدمی تھے۔ لیکن سیاست میں اُن کی رفتار نہایت احتیاط اور مصلحت اندیشی کے ساتھ جاری رہی۔ چونکہ یہ عادت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اس لئے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ان کا ادراک و احساس ان کو صحیح راستہ دکھا دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہندو نوجوان شاعر نے جو اردو کے علاوہ فارسی شاعری کا بھی ذوق رکھتے ہیں، فارسی میں ایک قطعہ لکھ کر "زمانہ" میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ شاعر نے اس نظم میں ڈاکٹر اقبال سے خطاب کر کے کہا تھا کہ آپ عالم قدس میں ہیں۔ آپ کی پرواز ماورائے عرش تک ہے۔ پھر آپ جو ملک کی سیاست میں حصّہ لیتے ہیں تو یہ گویا رجعت قہقری ہے۔ آپ اپنے پر و بال ملکوتی کو گردِ سیاست میں کیوں آلودہ کرتے ہیں۔ منشی دیانراین نگم نے اس قطعہ کو "زمانہ" میں محض اس خیال سے شائع نہیں کیا کہ ایک ہندو کی طرف سے ایک مسلمان لیڈر کو ترکِ سیاست کا مشورہ ایک طرف نازیبا اور خلاف مصلحت ہے اور دوسری طرف اپنی کمزوری کا احساس و اظہار۔ حالانکہ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ شاعر کے پیش نظر اقبال کی روحانی عظمت اور ان کی شاعری کا ملکوتی پہلو تھا۔ سیاسی پیچ مقصود نہ تھا۔ لیکن منشی جی کی احتیاط اور دور اندیشی نے وہ پہلو نکال لیا۔

منشی جی "زمانہ" کے خاص نمبر اور سالنامے نکالنے کے قائل نہ تھے۔ لیکن مشاہیر علم و ادب کی یادگاریں انہوں نے متعدد نمبر بڑے شوق اور بڑی محنت سے شائع کئے۔ حالی نمبر اور پریم چند نمبر خاص چیزیں ہیں۔

منشی جی نے "زمانہ" میں التزام کر لیا تھا کہ تمام دُنیا کے عموماً اور ہندوستان کے خصوصاً مشاہیر ملک، اربابِ سیاست، اہلِ قلم، اصحاب شعر و سخن کی وفات کے بعد ان کی تصویر اور ان کے حالات پر کم سے ایک مقالہ ضرور شائع کرتے تھے۔ انکے مجموعہ سے کتاب المشاہیر مرتب ہو سکتی ہے۔ میرے اندازے میں تقریباً سو مشہور لوگوں کے حالات "زمانہ" میں موجود ہونگے چار سو صفحوں کی کتاب بے تکلف بن سکتی ہے۔

منشی دیانراین نگم رائے بہادر، آنریری مجسٹریٹ، قومی اداروں کے سرپرست، سیاسی رہنما، سبھی کچھ تھے۔ لیکن میری نظر میں "زمانہ" کا اڈیٹر ہونا اور چالیس برس اردو کی خدمت کرنا انکی بڑی فضیلت و عظمت ہے۔ منشی جی نے "زمانہ" کی صورت میں کم سے کم پچیس ہزار صفحے اردو لٹریچر میں اضافہ کئے ہیں۔ جو علوم و فنون اور شعر و ادب کی انسائکلو پیڈیا کا حکم رکھتے ہیں۔

منشی جی [illegible] سے ان کا "فرزند معنوی" (زمانہ) معرض خطر میں ہے۔ خدا کرے کہ ان کے "فرزندانِ صوری" (اولادِ سعید) مسیحائی کر کے اس کو زندہ رکھ سکیں۔ پھر گویا منشی دیانراین نگم خود زندہ رہیں گے۔

(صفحہ ۴۴ کا بقیہ مضمون)

بھینی بھینی خوشبو کی مالک ــــ مگر پھول بننے کے بعد ــــ اور کبھی تو عالتِ ناشگفتگی میں بھی ــــ کچھ ہاروں میں گندھ کر سہروں میں چڑھ جاتی ہیں اور کچھ دُنیا کو دھوکا دینے کیلئے مرنے والے کی قبر پہ ڈال دی جاتی ہیں ــــ

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

..... آج چار دن سے اس کشمکش میں ہوں کہ یہ خط تم کو بھیجوں یا نہ بھیجوں ــــ لیکن ابھی تک یہ طے نہیں کر سکا کہ یہ خط ہے یا دماغی پراگندگی کا خاکہ ــــ تم کو خط لکھنے بیٹھا تھا لیکن نہ معلوم دماغ کے کس اشارہ پر قلم بہک کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ۔ اگر بھیجتا ہوں تو تم نہ معلوم میرے متعلق کیا رائے قائم کرو گی ــــ کاش وہی رائے قائم کرو جس کی مجھے خواہش ہے ــــ مگر خواہش؟ کیا یہ کہ تم مجھ کو اپنا دوست سمجھو؟ نہیں ــــ اسکے لئے بڑی ہمت کی ضرورت ہے جو مجھ میں نہیں ــــ پھر؟ کیا یہ سب کچھ نہیں؟ ــــ یہ کیسے کہوں؟ ــــ پھر کیا کروں؟ اور نہیں بھیجتا ہوں تو؟ ــــ اسے کون پڑھے گا ــــ مگر کیا ضروری ہے کہ کوئی پڑھے؟ ــــ کیوں نہ اس کو بھی انہیں اوراقِ پارینہ میں دفن کر دوں جن کا علم سوائے میرے اور میرے بکس کے چور خانے کے اور کسی کو نہیں ــــ ضیا صاحب کو بھی نہیں ــــ مگر پھر تم کو کیا لکھوں؟ ــــ اچھا کل فیصلہ کروں گا کہ یہ خط تمہیں بھیجوں یا نہ بھیجوں؟

تمہارا ......

یادش بخیر! آج سے چند سال پہلے میرے ایک دوست ..... (نام مصلحتاً چھپا رہا ہوں) بورڈنگ میں میرے ہم کمرہ تھے ۔ امتحان کے قریب وہ یکایک غائب ہو گئے اور ان کا ایک بکس میرے پاس رہ گیا ۔ یہ بکس ان کی کل کائنات تھی ۔ بستر اور دوسری ضروریات کا سامان ان کے احباب کے پاس بہت کافی تھا اور جنہیں اگر وہ استعمال کرتے تھے تو یہ ہم لوگوں کے لئے باعثِ فخر ہوتا تھا ۔

گھر سے کھاتے پیتے تھے مگر ضرورت سے زیادہ خودداری نے ہمیشہ ٹیوشن پر بسر اوقات رکھی ۔ اور اس معاملہ میں کمال حاصل تھا ۔ جو کچھ ضروری اخراجات سے بچتا اسے دوستوں پر خرچ کر کے خود بیڑی اور چائے پر اکتفا کیا کرتے تھے ۔ محبت کے نام سے چڑتے تھے مگر اشعار کے انتخاب نے اکثر رسوا کر دیا ۔ ہم لوگوں سے اگر کبھی اس مسئلے پر گفتگو آجاتی تو صنفِ نازک کی دھجیاں اس طرح اُڑاتے گویا ان سے اور حضرت حوّا کی بیٹیوں سے خاندانی بیر ہے مگر یہ ضرور دیکھا کہ وہ کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہوں اور سامنے کوئی مجسم "پیمانۂ و صہبا" لا کر رکھ دیا جائے تو پھر ان کی تقریر کی گل افشانی ساری فضا کو بہار و شباب سے معطر کر دیا کرتی تھی ۔

بہرحال وہ ایک دن غائب ہو گئے اور انکے بکس میں کپڑوں کے اوپر ہی یہ خط رکھا ہوا ملا ۔ اس خیال سے کہ شاید وہ "مرحوم" نہ ہو گئے ہوں میں نے یہ خط پڑھا ۔ اور خود انہیں کی طرح میں بھی اب تک اس فکر میں ہوں کہ اس خط کو مکتوبات کی کس ضمن میں رکھا جائے ۔ ایک عرصہ سے ان کی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں ملی تھی ۔ مگر پرسوں اخبار میں اسٹیٹسمین کے "احمقوں کے گوشہ" میں ان کا نام دکھائی دیا اور معلوم ہوا کہ ایک بزرگ ...... نام کے ..... شہر سے ستیہ گرہ کر گئے ۔

یہ خط مکتوب الیہا (خط کی عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے) تک وہ نہ پہنچا سکے اور پتہ خود مجھے بھی نہیں معلوم ۔ ممکن ہے عبارت اور اندازِ تحریر سے وہ محترمہ خود اندازہ لگا لیں اور پھر شاید دو سال کی قید کے بعد .... صاحب کی مسرت میں کوئی اضافہ یا ان کی زندگی میں کوئی چمک پیدا ہو سکے ۔

نیا راگ

ساغر نظامی

آدرش ۱؎

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو، افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

وہ مرا خواب، وہ ایوانِ تخیّل کی اساس
وہ مرا خواب، وہ تصویرِ خیال و احساس

جس کے قدموں پہ سرافراز تصور کی جبیں
جس کے شہپر مری پروازِ تخیّل کے امیں

جس کے انوار سے روشن ہے شبستانِ وجود
ورنہ اک صفحۂ سادہ تھا گلستانِ وجود

وہ مرا خواب، وہ ہستی کا شبستانِ جمیل
میرا سپنا، مرے مقصود کا ایوانِ جمیل

وہ مرا خواب وہ اک محشرِ انوارِ رواں
وہ مرا خواب وہ افسونِ تلاطم کا جہاں

میرا آغاز، مرا نشو، وہ میری تکمیل
میرے جینے کا سہارا، مرے مرنے کا کفیل

جس میں اک عربدہ جو رقص کناں ہے پیہم
مثلِ خوں میرے دل و جاں میں رواں ہے پیہم

تم نہیں ہو مرے سپنے کے شبستانوں میں
ہے کوئی اور مرے خواب کے ایوانوں میں

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو، افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

نہ وہ قامت کہ جسے نشوِ تمنّا کہیئے
روحِ عظمت کا اُبھرتا ہوا جذبہ کہیئے

سانپ کی طرح لچکتا ہوا پیکر بھی نہیں
رس اور امرت سے چھلکتا ہوا ساغر بھی نہیں

نہ وہ آنکھیں ہیں کہ تاباں ہوں جواہر کی طرح
دل پہ زرباز ہو دو ساغرِ گوہر کی طرح

نہ وہ ہاتھوں کا تناسب نہ وہ باہوں کا جمال
نہ وہ امواجِ تصوّر، نہ وہ گرداب خیال

نہ وہ پھولوں کی مہک ہے، نہ وہ خوشبو کی لہک
نہ وہ پائل کی صدا ہے نہ وہ گھونگرو کی دھمک

کھل کھلاہٹ نہ وہ برگِ گلِ تر کا نغمہ
مسکراہٹ نہ وہ آثارِ سحر کا نغمہ

اُس کا ہنسنا ہے نہ وہ سینۂ سیمیں کی ہے گونج
شورِ نغمہ ہے نہ وہ مطربِ رنگیں کی ہے گونج

۱؎ مطلعِ نظم

نہ وہ بازو کہ جو بیتاب ہوں گردن کیلئے
لعل و گوہر سے لدے سانپ سے بل کھائے ہوئے

نہ وہ جھکی ہوئی شاخِ گلِ تر کا عالم
نہ وہ مچلی ہوئی ناگن سی کمر کا عالم

نہ وہ رفتار نہ ہر گام پہ رقصیدہ خرام
نہ قیامت کے وہ مجرے نہ وہ آفت کے سلام

گفتگو بارشِ القا، نہ خموشی الہام
نہ وہ چُپ چاپ نظامِ ابدیّت سے کلام

نہ ملامت، نہ شکایت، نہ لطافت، نہ رضا
نہ تکلم، نہ تبسم، نہ ترنم، نہ صدا

میری رگ رگ کو جکڑتی ہیں نگاہیں جس کی
باندھ لیتی ہیں مری زیست کو باہیں جسکی

مجھ میں محدود ہے ہر روپ ہیں اُسکے بیحد
کبھی معبود، کبھی عبد، کبھی خود معبد

جہاں تک کہ میرے تخیل سے مسلسل گانا
اور پھر میرے تخیل ہی میں حل ہو جانا

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو، افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

تم لرزتی ہو مرے جذبۂ صنعت گر سے
اُس نے مقصود چُرایا ہے دلِ آذر سے

تم بھڑکتی ہو مرے شعلۂ صنّاعی سے
اُسکی فطرت کو ہے اک لاگ صنم سازی سے

نہ وہ عصیاں کی تڑپ ہے، نہ وہ ایماں کی جھلک
برسی پڑتی ہے نگاہوں سے رواجوں کی چمک

تم پہ ہر وقت روایات و عقائد کا عذاب
گرد ہے اس کی نگاہوں میں گنہ اور ثواب

نہ وہ مٹنے کی تمنّا، نہ سنورنے کا جنوں
نہ اُبھرنے کا سلیقہ، نہ بکھرنے کا جنوں

تمھیں پانی پہ بھی شک آتشِ سیّال کا ہے
زہر پر اُس کو یقیں بادۂ کم سال کا ہے

اُسکے ابرو میں، نگاہوں میں، اداؤں میں مدام
ہیں اُبلتے ہوئے ساغر تو چھلکتے ہوئے جام

اُس کی آنکھوں کی سیاہی میں جہانِ اشکال
لاکھ مبہم سے الم، لاکھ سسکتے سے خیال

ایک فنازِ خوشی اشک نما آنکھوں میں
لاکھ گردابِ وفا کھلتی ہوئی باہوں میں

یہ مری روح میں ہے قید، یہ صد صبر تمام
اور تمھیں شوق کہ بنجائے مری روح غلام

تم سمجھتی ہو کہ افلاس میں رہتی نہیں لاج
اُس کے نزدیک محبت کی یہی ہے معراج

تمھیں قیمت کی طلب، اُسکو محبت کی طلب
تمھیں عشرت کی طلب، اُسکو مصیبت کی طلب

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو، افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

نواب جعفر علی خاں اثر بی اے لکھنوی

ساقی

اک چھلکتا ہوا جام آنکھ ملا کر ساقی
جسکے ہر قطرے میں ہو صبح کا جوہر ساقی

زعفراں زار سے پھوٹے ہوئے چشمے کی طرح
موج سی آئے نظر جام کے اندر ساقی

رنگ بنجائے پری اور پری ہو رقصاں
اس قدر تیز چلے دَور میں ساغر ساقی

دیکھنا ہے مجھے مشاطگیٔ صبحِ بہار
جامِ بلّور میں دے بادۂ احمر ساقی

اپنی توڑی ہوئی انگڑائی کی ہے تجھ کو قسم
جام اسی کن سے ادھر ہاتھ بڑھا کر ساقی

کسی ترکیب سے حل کر دے تبسُّم اپنا
یوں نہیں.... ہونٹوں کے لیجا کے برابر ساقی

تجھ کو معلوم ہے میں پی کے بہکنے کا نہیں
بند مجھ پر تو نہ کر میکدے کا در ساقی

پھر پلٹ آئے زمانہ وہی بے فکری کا
آنکھ روتی نہ تھی جب دامنِ تر پر ساقی

پھوٹ آپس میں پڑی ہے کہ الٰہی توبہ
شکوہ آجائے نہ کیوں لب پہ مکرّر ساقی

دے وہ بادہ کہ غمِ دَہر فسانہ ہوجائے
دِل کے مانند فضا بھی ہے مکدّر ساقی

رحم فرما کہ یہ ہے تیرہ شبی کا عالم
زندگی جو تھی عمل، خواب ہے یکسر ساقی

ان کی رسوائی میں ہے تیری بھی سُبکی مضمر
بھولے بھٹکوں کا پھر اِک بار ہو رہبر ساقی

جب غلط کوش نہ تھے رند صفا کیش ترے
دیکھ لے پھر اثرِ مست وہ منظر ساقی

الشیا۔ دسمبر ۱۹۴۲ء

احمد ندیم قاسمی

احساس کی چٹکی

اُف مری روح پہ ماحول کا یہ بارِ گراں — اُف مری قوتِ احساس کی واماندگیاں
اُف مری فکر پہ کس بھوت نے پَر پھیلائے — چار جانب نظر آتے ہیں لرزتے سائے
اُف یہ کیا سحر ہے تہذیب کی عُریانی کا — زہرِ قاتل پہ بھی دھوکا ہے مجھے پانی کا
اُف یہ کس طرفہ شکنجے میں گرفتار ہوں میں — اپنے اللہ کی رحمت سے بھی بیزار ہوں میں
میری تحریر میں ہیں رنگ نگوں ساری کے — عکس نغموں میں مرے موت کی تیاری کے
ہاتھ پھیلائے ہوئے آنکھ جھپکتی ہی نہیں — بجلیاں قلب میں غیرت کی چمکتی ہی نہیں
سوچتا ہوں تو سُجھائی نہیں دیتا کچھ بھی — دیکھتا ہوں تو دِکھائی نہیں دیتا کچھ بھی
عِفتیں زر کے عوض بیچ کے بھی زندہ ہوں — اور غضب یہ ـ نہ پشیماں ہوں نہ شرمندہ ہوں
عشق کرتا ہوں تو دہکے ہوئے گالوں کیلئے — یاسمیں شانوں پہ بکھرے ہوئے بالوں کیلئے
قید و پابندئ مذہب سے ہوں باغی کب کا — اِک خدا روز بنا لیتا ہوں اپنے ڈھب کا
کانپ اُٹھتا ہوں جو توپوں کی گرج سُنتا ہوں — دُکھ بھرے گیت کی ہر تان پہ سر دُھنتا ہوں

گُھپ اندھیرے میں چُڑیلیں نظر آتی ہیں مجھے
کِچکِچاتے ہوئے دانتوں سے ڈراتی ہیں مجھے

آج لیکن مرے سینے میں چمک کیسی ہے! — دِل کی دھڑکن میں یہ قدموں کی دھمک کیسی ہے!
میری ہر سانس سے جھڑتے ہیں شرارے کیسے! — دُھندلے ماحول میں اُبھرے ہیں ستارے کیسے!
کیسا بادل یہ اُفق پر سے کڑکتا اُٹھا — کیسا شعلہ یہ زمیں میں سے بھڑکتا اُٹھا
ہائے یہ کس نے بگاڑا ہے عناصر کا نظام — کِس نے گردوں سے پکارا مِرے اسلاف کا نام

جانے کیوں اور میں کس سمت اُڑا جاتا ہوں
خون یوں کھول رہا ہے کہ پُھنکا جاتا ہوں

ظفر تاباں دہلوی

دو غزلیں

اُسی کو اپنا سمجھ رہا ہوں وہی نگاہوں میں اجنبی ہے
ابھی تصوّر ہے نامکمل ابھی بصیرت میں کچھ کمی ہے

ارادہ آئینہ دارِ ہستی خیال معمارِ زندگی ہے
جو ناامیدی سے لڑ رہے ہیں کچھ اُن کے دل میں امید بھی ہے

علاجِ غمہائے زندگانی رہا نہ تھا اور کوئی یا رب
معاف فرمایہ دامنِ تر کہ سخت مجبور ہو کے پی ہے

تمہیں ہیں کوتاہیِ بیاں کی شکایتیں عرضِ مدعا پر
زباں سے اظہار کرنے والو کبھی نظر سے بھی بات کی ہے؟

حجاب حائل تھے درمیاں میں حیل کے پردے پڑے ہوئے تھے
ہزار کوشش کے بعد آخر تمہاری جانب نظر اُٹھی ہے

ہوا نہ مایوسیوں سے کچھ بھی علاجِ آشفتہ خاطری کا
جسے کبھی بھولنے لگا تھا اُسی کی پھر یاد آ رہی ہے

مری نگاہوں سے کوئی دیکھے شبِ جدائی کی دلفریبی
کسی کی زُلفِ سیاہ گویا دراز ہوتی چلی گئی ہے

فنا کے طوفاں سے ڈرنے والے مقامِ ہستی سے بیخبر ہیں
وہ جس سے پہلو بچا رہے ہیں وہی حقیقت میں زندگی ہے

وہی مکافاتِ معصیت کا فسانہ دُہرا رہی ہے دُنیا
وہ داستاں پھر سے سُن رہا ہوں جو داستاں بارہا سُنی ہے

سکوں کا آئے گا دَور آخر رہے گی طوفاں کی رَو بدل کر
خزاں سے مایوس ہونے والو ابھی اُمیدِ بہار بھی ہے

خیال کی عظمتوں سے تاباں بدل رہا ہے نظامِ ہستی
اُنھیں خُدائی کی آرزو کیا جنھیں تمنائے بندگی ہے

فراق گورکھپوری ایم اے

ہوش رہتے ہوئے پیمانہ دل بھر نہ سکیں
تجھے بے بھولے ہوئے یاد تری کر نہ سکیں

جینے والو کوئی جینے میں ہے یہ بھی جینا
کچھ بھی کر دھر نہ سکیں مٹ نہ سکیں مر نہ سکیں

جو محبت بھی کریں اور نہ ہو جائیں خراب
وہ گُنہ کرتے ہی کیوں ہیں کہ جسے کر نہ سکیں

یہ نگاہِ غلط انداز ہے یا جادو ہے
انھیں آنکھوں کی قسم جی نہ سکیں مر نہ سکیں

یوں تو دُنیا کو چھکا دے تو مگر اے ساقی
نیّتیں ایسی بھی کچھ ہیں جو کبھی بھر نہ سکیں

ہو کے مجبورِ محبت سے ہیں شاکی لیکن
اِتنے آزاد نہ ہو جائیں کہ کچھ کر نہ سکیں

جیتے مردوں سے جیا بھی نہیں جاتا ہے فراق
اور مرنے کو جو کہیے تو کبھی مر نہ سکیں

ایشیا - دسمبر ۱۹۴۲ء

نئی موجِ طوفاں

آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

جگمگاتے ہوئے محلوں میں اندھیرا کر دیں ۔۔۔ تیرہ و تار خرابوں میں اُجالا کر دیں
ہر تباہی و تصادم کو گوارا کر دیں ۔۔۔ زلزلہ عالمِ محسوس میں پیدا کر دیں
اسی دُنیا کو اُلٹ کر نئی دُنیا کر دیں

یہ تضادوں کا جہاں، نفرت و لعنت کا دیار ۔۔۔ طنز کرتی ہوئی بے روح محبت کا دیار
غم سے معمور خرابہ، یہ مسرت کا دیار ۔۔۔ یہ روایات کا جنگل، یہ وراثت کا دیار
ہم جو چاہیں تو یہ سب کچھ تہ و بالا کر دیں

شکوے کب تک ہوں مشیت کی تہی دستی کے ۔۔۔ معجزے کیوں نہ دکھائیں خرد و مستی کے
کیوں نہ ہم خود ہی بسائیں نئی بستی کے ۔۔۔ اپنے عکسوں سے نئے جال بُنیں ہستی کے
اور ہستی کو حریفِ غمِ دُنیا کر دیں

اے مری جانِ سرور، اے مری جانانِ سرور ۔۔۔ حاصلِ ساغر و مینا و گلستانِ سرور
رحمتِ میکدہ اے سروِ خرامانِ سرور ۔۔۔ گو نہیں میکدۂ زیست میں امکانِ سرور
پھر بھی اِک عمر تو نذرِ مے و مینا کر دیں

وہ جو اک روح کی عشرت ہے متاعِ آخر ۔۔۔ وہ جو اک جذبۂ وحشت ہے متاعِ آخر
وہ جو اک غم کی امانت ہے متاعِ آخر ۔۔۔ وہ جو اِک سوزِ محبت ہے متاعِ آخر
مُسکرا کر اسے خورشیدِ تمنا کر دیں

تیرے سپنوں کی مہکتی ہوئی خلدِ رقصاں ۔۔۔ میرے خوابوں [illegible] رقصاں
یا ترے سینۂ مواج کا بحرِ پنہاں ۔۔۔ میرا نا پختہ تخیل، مرا احساسِ جواں
جتنے پوشیدہ طلسمات ہیں پیدا کر دیں

جھنجھناتی ہوئی باہیں ہوں دھڑکتے ہوئے دل ۔۔۔ لڑکھڑاتی ہوئی سانسیں ہوں بہکتے ہوئے دل
کپکپاتے ہوئے پیکر ہوں پھڑکتے ہوئے دل ۔۔۔ ملتے ہوئے سینے ہوں مہکتے ہوئے دل
اور یہ مل جل کے دو عالم تہ و بالا کر دیں

ہم سفر، راہنما، راہگذر ہو جائیں ۔۔۔ سفرِ زیست کا خود زادِ سفر ہو جائیں
عشق کی شام، محبت کی سحر ہو جائیں ۔۔۔ منتہا اپنے تجسس کا اگر ہو جائیں
زندگانی کو بہر حال گوارا کر دیں

خود بھی سرشار رہیں، دُنیا کو بھی سرشار کریں ۔۔۔ ہو سکے تو اسی ویرانے کو گلزار کریں
کاش اس قدرتِ فرسودہ کے اسرار کریں ۔۔۔ موت کو دامِ محبت میں گرفتار کریں
اور بقا کو ابدیت کا اشارا کر دیں

[illegible] موت کی گود میں پلی ہوئی زیست [illegible]
یا کوئی بادۂ سرجوش سے لبریز سبو — یہ جہانِ گزراں ہے کہ رمیدہ آہو
اس کو بھی کیوں نہ شکارِ غم فردا کر دیں

عہد لیں زلزلوں سے آندھیوں سے ساز کریں — بحر کے قلب میں اک بابِ اثر باز کریں
آکہ رقصاں ہوں، بپا محشرِ آواز کریں — عینِ طوفاں میں نئی زیست کا آغاز کریں
کشتی کو موج کریں، موج کو دریا کر دیں

ہے توہم رگ و پے میں وہی پیوست ابھی — آدمی نشۂ حکمت سے نہیں مست ابھی
فکرِ انساں کو بھرنی ہیں کئی جست ابھی — زندگی عشرت و آلام سے ہے پست ابھی
زیست کو عشرت و آلام سے بالا کر دیں

نقص اس کہنگیٔ فکر و عمل کے کب تک — تھرتھراتے ہوئے ذہنوں میں محلکے کب تک
ہم رہیں عزمِ گراں بار سے ہلکے کب تک — اُفقِ زیست پہ قسمت کے دھندلکے کب تک
کوئی سورج اسی عالم سے ہویدا کر دیں

حسِ اُلفت سے گزر، جذبۂ نفرت سے گزر — خبطِ دولت سے گزر، دامِ جلالت سے گزر
عشق کے نام پہ جذبوں کی تجارت سے گزر — سنگِ مدفن سے گزر، تختِ حکومت سے گزر
زندگانی کو روایات سے بالا کر دیں

بے کس و بے بس و مظلوم سراپا کا علاج — غم سے کچلی ہوئی مسلی ہوئی بیوا کا علاج
نقص اور جبر کی مدقوق مریضا کا علاج — دین سے ہو نہ سکا علتِ دنیا کا علاج
آکہ دنیا ہی کو دنیا کا مداوا کر دیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

اقبال صفی پوری

غزل

دماغ و روح میں اک تازگی محسوس کرتا ہوں — ترے غم کو بجائے زندگی محسوس کرتا ہوں
مذاقِ زندگی میں تشنگی محسوس کرتا ہوں — اُنھیں پا کر بھی جیسے اک کمی محسوس کرتا ہوں
خوشی کا نام لینے میں خوشی محسوس کرتا ہوں — فریبِ زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں
یہ کیا لے انتہائے بے خودی محسوس کرتا ہوں — وہ ملتے ہیں تو میں اپنی کمی محسوس کرتا ہوں
جہاں سے وہ مری ہستی میں شامل ہوتے جاتے ہیں — وہیں سے زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں
نہیں محدود میرا ذوقِ غم اُن کی جفاؤں تک — کہ میں اس کے سوا کچھ اور بھی محسوس کرتا ہوں
گزر جاتا ہوں تنہا ظلمتوں سے جادۂ غم کی — حدِ منزل پہ آکر روشنی محسوس کرتا ہوں
تصور ہی تصور میں گزر جاتی ہے رات اپنی — وہ آئے اب وہ آئے میں یہی محسوس کرتا ہوں
یہیں سے غالباً اے دوست آغازِ محبت ہے — جگر میں درد۔ آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں
زہے سوزِ تعلق ہو گئے دونوں جہاں روشن — جو اُن کے دل میں ہوتا ہے وہی محسوس کرتا ہوں
طبیعت ہو گئی اقبال کتنی خوگرِ وحشت
میں ہشیاری میں بھی دیوانگی محسوس کرتا ہوں

نئی کہانی

رام پرتاپ بہادر ایم اے

اندر اور باہر

"موکو رام سے کوئی ملا دے" یہ مصرع رامائن میں تو نہیں بلکہ جس بھکتی سے اُسے گایا جا رہا تھا، وہ درد اور خصوصیت بھرت جی کے گلے میں بھی شاید نہیں رہی ہوگی جب وہ رام چندر جی کی تلاش میں جنگلوں جنگلوں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ میں اپنے مکان کی دوسری منزل پر پاخانے میں تھا، نیچے پیچھے کی گلی سے یکایک ایک سُریلا راگ سماعت کو گھیرنے لگا، پاخانہ کی گلی میں کون مدھر اور دلکش انداز سے گا سکتا ہے، میں یہی سوچ رہا تھا، پاخانہ کی چھوٹی کوٹھری جسے میں اپنے "بورڑوا" دوستوں کے سامنے "باتھ روم" کے نام یاد کرتا ہوں، اسی کوٹھری بند میں چونک چونک کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، کہ آخر یہ موسیقی کس طرف سے پاخانے میں آ رہی ہے، مہتر نے پاخانہ کا گملہ گھسیٹتے ہوئے زور سے پکارا—— "بمبا کھولو" اب شک کی گنجائش نہیں رہی، گانا میرا مہتر ہی گا رہا تھا، اور اُسی نیچے کے سوراخ سے آواز آ رہی تھی، گملہ کو رکھتے ہوئے اپنی جوانی کی لَے میں پھر اُس نے الاپا—— "موکو رام سے کوئی ملا دے" یوں تو مہتر لوگ گاتے اچھا ہیں، لیکن اُس کڑی میں کتنی تھرتھراہٹ تھی! موسیقی کا کوئی اُستاد بھی کیا اپنی لَے کو اس طرح کنپا سکتا تھا!! اُس گندی اندھیری گلی میں سُریلی تان میں توڑ پیدا کرنے والی کپکپی میں سردی کا بھی کافی حصّہ رہا ہو یہ دوسری بات ہے لیکن "رام" کا لفظ کس صفائی کے ساتھ پاخانہ کے گملہ میں گونج کر دیوار کے سہارے سوراخ میں ہوکر اوپر آ رہا تھا، ساتھ ہی ساتھ ایک ہندو کی خودی کو چاہے وہ کتنی ہی دبی ہوئی کیوں نہ ہو چوٹ لگی، میں سوچنے لگا۔ جیسا کہ بزرگوں کا خیال ہے شاید یہی وجہ تھی جو اچھوتوں اور نیچوں کو شروع ہی سے مقدّس کتابوں سے دُور رکھا گیا۔

بالٹی کے پٹکنے کی تیز آواز سے میرے کانوں کو چوٹ لگی، اور میرے خیالات کی لڑی وہیں سے ٹوٹ گئی، کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ مہتر ابھی جھاڑو لگا رہا ہے، اُس کا گانا بند ہو چکا تھا، لیکن یہ عورت کی کیسی آواز! شاید مہترانی ہے، اُسے اس محلّہ میں کون نہیں جانتا، اُس کے بھولے حسین چہرے پر نہ جانے کتنی بار میری نگاہیں اٹک کر رہ گئی تھیں، کس انداز سے وہ کپڑے سے کمر کس کر تیلی کر لیتی تھی، اور ہاتھ میں جھاڑو اور بالٹی لئے سڑک پر حُسن اور بدبو کی ایک لہر پھیلاتی گزر جاتی ہے، اکثر اس کو دیکھ کر میں نے لوگوں کو کہتے سُنا ہے، بڑے شہروں کی مہترانیاں بھی خوبصورت ہوتی ہیں، اس کی جوانی کی آنکھیں ہمیشہ کوئی گمنام راگ الاپنے میں مسرور رہتی تھیں، پچھلے سال اس کمبخت مہتر پر مجھے کتنا غصّہ آیا جب اُس نے اپنی بی بی کو بے قصور ہی گھر سے نکال دیا، لیکن کسی چیز کو چھوڑنا اور پھر اُسے اپنا لینا بھی ایسے طبقہ کے لوگوں کو آتا ہے، مہترانی مہتر سے کچھ کہہ رہی تھی، میں کان لگا کر سُننے لگا "کیوں آج گایا ہی جائیگا یا کھانے پینے کی بھی کچھ فکر ہے؟ کیوں رے آج تو بقرا عید ہے نا آج بھی تجھے وہی دھن لگی ہے، مُسلمان بھائیوں کے ہاں سے بکروں کے سرے اور پائے ملیں گے جم کر کھایا جائے گا" مہتر اپنے لاپرواہ لہجہ میں اور کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اس کی بات کٹ گئی "اور کب تک دوسروں کی بھیک کے آسرے پر، چُپ کیوں ہوگئے؟ مُنہ میں پانی بھر آیا کیا؟......" مہترانی نہ معلوم کیا کیا بکتی رہی لیکن پاخانہ کی گلی میں مہتر کے مُنہ میں پانی بھر آنے کی بات سُنکر مجھے متلی آنے لگی، مہتر نے کھڑک کر کہا—— "میں نے کہہ تو دیا کسی کے ہاں سے کچھ ملے چاہے نہ ملے لیکن وہ اٹھنی خرچ نہیں ہوگی.... چاول چاول رٹ لگائے ہے...... اگر بابو جی نے دیر کر کے مہینہ نہ دیا ہوتا تو........ پیسے رکھے رہن دے شام کو کام پڑے گا" مہترانی نے مہتر کو جھڑک دیا—— "ہاں وہ تو ہم جانت ہیں نا۔ مُنوا حرامی کے ساتھ پیسے جوڑ کر اُدھا جو منگایا جائیگا...... اچھا آج دیکھت ہوں منّو کیسے میرے گھر پھٹکتے ہیں۔......" بڑبڑاتی ہوئی مہترانی گلی کے باہر نکل گئی۔

قریب ایک مہینہ سے لگاتار بدلی ہو رہی تھی، جاڑے کی بدلی ہوتی بھی ہے تکلیف دہ! اس سے کسی کو بھی تو مسرت حاصل نہیں ہوتی، پرندے جانور غریب دُکھیوں کے لئے تو اجل بن جاتے

کا موسم ہوتا ہے (شعب چاہیے تھا) اس موسم میں مجبوری ہے وہ تو ہے ہی نہیں، اور پھر اس کی بدلی اور بوندا باندی تو ہڈیوں تک کو ہلا دیتی ہے غریب غربا تو الگ متمول طبقہ والوں سے بھی اس کی ادا سہی نہیں جاتی، نوجوانوں کیلئے تو یہ دو زخی ایذا کا باعث ہو جاتا ہے۔

ایسے موسم میں میرا دن اس طرح شروع ہوا، اور کرتا ہی کیا، چُپ چاپ کمرے میں آکر بیٹھ گیا، بار بار وہی مصرع "موکو رام سے کوئی ملا دے" کانوں میں گونجنے لگتا تھا، مہتر صرف گانے کو ہی گا رہا تھا یا اُسے اُس سے کسی قسم کی روحانی مسرت بھی حاصل تھی، آخر وہ التجا کس "رام" سے ملنے کی تھی؟ پاخانہ صاف کرتے وقت بھی کس جذبہ کے ماتحت وہ رام کی رٹ لگائے ہوئے تھا؟ کون "رام" اس کے "رام" ہو سکتے ہیں؟ وہ تو پیدائش سے موت کی آخری ہچکی تک غلاظت ہی صاف کرنے کیلئے بنا ہے، اُس کے آباؤ اجداد یہی کرتے آئے ہیں، اور آگے بھی اُسے پُشت در پُشت یہی کرنا ہوگا، یہ بھی نہیں کہ مہتر اس بات سے واقف نہیں، بلکہ وہ جس لاپرواہی سے زندگی کے مسائل کو برتتا ہے وہ اس کی جانکاری کا ثبوت ہے، وہ نہ کسی کا احسان مانتا ہے اور نہ کبھی بھولے سے بھی یہ سوچتا ہے کہ اُس کی روزی کوئی اُس سے چھین بھی سکتا ہے۔ جو کماتا ہے کھا پی ڈالتا ہے مستی سے گھومتا ہے، لنگوٹا کستا اور کشتی لڑتا ہے، شراب پیتا اور شہنائی بجاتا ہے جس سے چاہتا ہے شادی یا زنا کرتا ہے، پاخانے اور موریاں صاف کرکے زندگی گزار دیتا ہے بے روزگاری کا اُسے خطرہ نہیں، مشینیں اُس کی روزی چھین نہیں سکتیں، بلکہ اُس کا کام بڑھتے ہوئے شہروں اور قصبوں کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا ہے، غریبی کی اُسے پرواہ نہیں کیونکہ شاید وہ یہ سوچتا ہے کہ غریبی بھی اس سے زیادہ غریب نہیں ہو سکتی، بلکہ یوں کہئے کہ اُس کے خیال میں غریبی اُس کے لئے اور وہ غریبی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

جیسے میں آہستہ آہستہ اس کی زندگی سے رشک کرنے لگا ہوں، مہتر کی زندگی بھی آخر کتنی اطمینان اور بے فکری کی ہے دُنیا کی غلاظت صاف کرے گا، دوسروں کے ٹکڑے کھائے گا اور مر جائے گا ایک دن، یہ سوچتے سوچتے کہ اس کی زندگی کتنی کارآمد اور آئیڈیل ہے میں اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں معلوم نہیں کب کھو گیا، معلوم نہیں کچھ ذہن میں کیا کیا آیا اور میں سوچتا سوچتا کہاں سے کہاں پہونچ گیا، پھر دیکھتا ہوں کہ خلا میں ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے میں بالٹی لئے کھڑا ہوں، ایک دم چونک پڑا، گھبرا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا، کوئی اور تو نہیں مہتر کے تصور سے چھوٹنے کے لئے پھر میں نے کیا کیا کوشش نہیں کی، اُس سے کراہت سی ہونے لگی، اپنے چاروں طرف مجھے گندگی کا احساس پیدا ہو گیا، تو کیا ان مہتروں کا بھلا ہو ہی نہیں سکتا، یہ ترقی کا زمانہ ہے ہر چیز آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہے، کیا یہ کمبخت مہتر ہی آگے نہیں بڑھ سکتا، پھر خیال آیا، آخر ان مہتروں، بھنگیوں، اور ڈوموں کے اُدھار کی بھی تو بات چلی تھی، کافی شور و غل ہوا، بڑی بڑی باتیں ہوئیں، دھن والوں نے ان کی خاطر دھن کی تھیلیاں کھول دیں، ملک کے نیتاؤں اور سماج کے خادموں نے بڑے بڑے رونے روئے، جنکو کھانے کی کمی نہیں وہ انہیں کے واسطے فاقے کرنے پر آ گئے، زمانے کی سب سے بڑی شخصیت ان کی خاطر مرمٹنے کو تیار ہو گئی، ان کا ایک پاکیزہ نام بھی رکھا گیا، ان "ہریجنوں" کو تسکین دینے کے لئے کہ ان کا پیشہ اتنا خراب نہیں بڑے بڑے لوگ جھاڑو اور ٹوکریاں لیکر سڑکوں پر نکل پڑے، آخر ان کنگالوں کی اندھیری بستیوں میں بھی اُمید کی ایک ہلکی شعاع نظر آئی، سماج نے انہیں ڈھارس بندھائی، وہ لوگ بھی ان کے ساتھ آئے جو دُنیا کا بھلا ہڑتالوں سے کرنا چاہتے ہیں، مہتروں نے بھی ہڑتالیں کیں، اپنے روزی رسانوں کو لال پیلی آنکھیں دکھا کر اکثر ان لوگوں نے اپنی مزدوری بھی بڑھالی، اور سب سے بڑا فائدہ جو ان کا ہوا وہ یہ تھا کہ ان پر پہلے پہل یہ راز فاش ہوا کہ چاہنے پر ایک دن سماج کو آگے بڑھنے سے وہ روک سکتے ہیں۔

میرے کانوں میں پھر وہی مصرع گونجنے لگا ——

"موکو رام سے کوئی ملا دے" پھر پاخانہ کی گلی یاد آئی موہی جھاڑو بالٹی اور گملہ۔ میں نے سوچنا چاہا، آخر ہوگا کیا؟ ان کا کیا کوئی مستقبل نہیں؟ کون ہیں ان کے "رام" جن کے لئے مہتر بیتاب تھا؟ لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا، بلکہ تاریکی بڑھتی گئی، منحوس بدلی اور گہری ہو گئی تھی، ناقابل برداشت دماغی ہیجان کی حالت میں سوچتا رہا، کیا کسی طرح سے ان کے ہاتھ سے جھاڑو اور بالٹی نہیں چھینی جا سکتی! آج بقرعید مسلمانوں کا تیوہار ہے، یہی ایک ایسا تیوہار ہے جبکہ میں ان کا پورے طور سے ساتھ دیتا ہوں، لیکن اس بدلی اور مہتر نے اس طرح

پرادن بگاڑنا کہ کچھ کہتے نہیں بنتا

کافی رات گئے میں دعوت سے لوٹا، محلّے میں کچھ غیر معمولی سنّاٹا چھایا ہوا تھا، جیسے لوگ آج وقت سے پہلے ہی اپنے چراغ گل کر کے سو گئے، دیر سے لوٹنے پر بی بی ناراض نہ ہوں، اس خیال سے ڈرتا ڈرتا مکان میں داخل ہوا، پھٹکار تو نہیں پڑی بلکہ اُس کے عوض میں سب کی پریشانیاں مجھے دیکھ کر کم ہونے لگیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مہتر کے ہاں نانے پر کہرام مچا ہوا ہے، دن ڈھلتے ہی مہترانی مُسلمان ججمانوں کے ہاں چلی گئی، گھر پر مہتر اور مُنوا محفل گرم کئے بیٹھے تھے، دو مسروں اور کچھ بھنی ہوئی ہڈیوں پر شراب کا ادّھا ختم ہو کر زمین پر لڑھک گیا تھا، اب دوسری... بوتل سے دَور چل رہا تھا، نشہ خوب جمنے لگا تھا، اندھیرے برآمدے میں وہ اپنی محفل روشن کئے بیٹھے تھے۔

مہتر نے گلاس خالی کرتے ہوئے کہا ــــ "مار ڈالا" اور مُنہ بگاڑ کر جھومتا ہوا بکرے کا سر اُٹھا کر دانتوں سے نوچنے لگا، مُنوا نے ہڈی چوستے ہوئے پوچھا ــــ "کس رے منیا سار تو رمیہریا کہاں گئی؟"۔ "کہوں ججمانی گے ہوئی"۔ مُنوا جھومنے لگا جیسے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا ہو ــــ "ہر وقت سسوری جھمیلے میں رہت تھی۔ ہمار میہریا ہوت تو ہم مار ہی ڈالی"۔ منیا نے ایک نلی توڑتے ہوئے کہا ــــ "ارے سرؤ نیک ہائے جو نا ہیں ہائے، نا ہیں تو تو نہکا تو یہاں بیٹھے تا ہیں دیت"۔ منوا کی آنکھوں میں شرارت تھی ــــ "ہمکا یہاں بیٹھے دیت چاہے نا دیت لیکن سرؤ تو نہکا تو یہاں بیٹھا کے بھجوا کے یہاں کلچھرّا اُڑاوت تھی"۔ منیا جیسے نیند سے جاگا ــــ "کس لیے کون بھیجوا؟ تنی پھر سے اُو کر نواے تو"۔ دوسرے بکرے کا سر منوا کے ہاتھ میں تھا ــــ "سرؤ تو ہو نکا کوئی مرد کہی۔ ہم تو روج او کا بھیجو سے کے گھروں دیکھت ہیں"۔ منیا نے ایک گلاس کس کے پی لیا، اور آنکھوں کی پُتلیاں اندھیرے میں گھما کر ذرا رازدارانہ لہجہ میں بولا ــــ "کس لیے بیچ کہت ہے؟" اپنی بی بی کو بھدّی گالی دیکر ــــ "اچھا تنی چلا چل تو اتنی دکھت بھجوا کا گھروا تو دکھائے پھر او کا ہم سمجھ لیب"۔ یہ کہتے ہوئے وہ جھپٹ کر اندر گیا اور دو لاٹھیاں نکال لایا، ایک لاٹھی مُنوا کو پکڑا کر اپنی نلی کا پیٹ کستے ہوئے برآمدے سے نیچے اُترا اور پھر اندھیرے میں دونوں غائب ہو گئے۔

ادھیڑ عمر کے عزیز میاں آبکاری محکمہ کے معمولی ملازم تھے، بی بی اُن کی ایک زمانہ ہوا مر چکی تھیں، آج تیوہار کے دن دُھلا اُجلا پاجامہ پہن کر ایک بوتل شراب کی ساتھ وہ بھی اپنے طریقہ پر کی یاد تازہ کر رہے تھے، پیچھے گلی میں شور و غل سُن کر مہترانی کو تو انھوں نے باہر نکال دیا، خود نشہ کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے دروازہ پر پہنچے، مہتر کو دیکھ کر اُن کا نشہ اور تیز ہو گیا، ہاتھ اُٹھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے، پوری طاقت لگا کر وہ چلّا کر بولے "کیوں بے سالے تو یہاں کہاں؟ بھاگ جا ابھی یہاں سے"۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے منیا کے اوسان خطا کر گئے اُس کا نشہ جیسے اُترنے لگا۔ اتنے میں مُنوا گلی میں سے مہترانی کا ہاتھ پکڑے دوسرے ہاتھ میں لاٹھی لئے سامنے آ نکلا، عزیز میاں کی گالی سُن کر منیا تلملا کر رہ گیا تھا، مہترانی کو دیکھتے ہی پاگل ہو گیا، بڑھ کر جو اس نے لاٹھی ماری تو عزیز میاں زمین پر آ رہے، مُنوا نے بڑھ کر اسکی لاٹھی چھین لی، مہترانی رفو چکر ہو چکی تھی!

خبر کو پھیلتے دیر نہیں لگی، سارے محلّہ میں سنسنی پھیل گئی، ایک مسلمان کا ہندو کے ہاں مارا جانا یوں ہی کیا کم تھا! اور پھر بقرعید کے دن!! ذرا سی دیر میں آگ لگ گئی، ہندوؤں نے دروازے بند کر لیے، مسلمان پنشن یافتہ پیشکار صاحب کے دروازہ پر صلاح و مشورے کیواسطے اکٹھا ہو گئے، پولیس موقع پر پہنچ گئی، پولیس کا اب ایسا دبدبہ ہے کہ جو پہلے پولیس کو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے وہ بھی اب اس کے نام سے ڈرتے ہیں، بات بڑھنے نہیں پائی، بڑے بوڑھوں نے رائے دی کہ معاملہ عدالت پر ہی چھوڑ دیا جائے۔

صبح کو پولیس نے مہتر کے گھر کی تلاشی لی، بغیر لیبل کے شراب کی خالی بوتلیں ملیں، عزیز میاں کے گھر کی بھی تلاشی لینی پڑی، ایک وارنٹ کے ماتحت عزیز میاں گرفتار ہو گئے، منیا اور عزیز میاں غیر موجودگی میں محلّہ کی سنسنی ختم ہو گئی۔

آج جب میری نظر اپنے برآمدے میں نیم بوٹا پر پڑی، "اِن" اور "آؤٹ" پر آنکھیں ٹھہر گئیں، مہتر کو خیال آیا نے اُس کا "آؤٹ" یعنی گلی میں مصروف کرتا اور "اِن" یعنی برآمدے میں بیٹھ کر شراب پینا دونوں دیکھا تھا، سوچنے لگا کیا ابتک کوئی نہ ہوا جو اُس کا "اِن" اور "آؤٹ" دونوں بیک وقت دیکھ سکے

آتش و آہن

م۔ ش۔ حقی

(مختصر، مختصر سا افسانہ)

"یہ حُسن خداداد کے غاصب۔ یہ دولت کے سانپ۔ یہ مقدر کے چہیتے!" وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ میں حسین عورتوں کے شوہروں کو دیکھ کر دانت پیسا کرتا تھا۔

"ثریا، اجمل۔ اجمل ثریا ـــــ اور میں؟ میں بھی تو اُسی لڑکی کو چاہتا ہوں؟" ان دونوں کی باہمی محبت، پروانہ وار محبت کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں خاکستر ہوتا۔ اجمل تو نہیں مگر ثریا میرے دل کی تپش سے واقف تھی۔ میں نے کئی دفعہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ لیا تھا، میں اکثر اُس سے شرارت کرتا تھا۔ جیسے کوئی لوہے کی لاٹھ کو پکڑ کر شغلاً ہلا کر دیکھے، اس یقین واثق کے ساتھ کہ یہ ہرگز جنبش نہ کرے گی، آہ کسے معلوم کہ میں اسی آہنی صورت کا پجاری تھا۔ مجھے اسکی صلابت کو بار بار محسوس کر کے دیکھنے میں لطف آتا تھا۔ میں اپنے دل کے اندرونی داغ پر یہ نشتر اکثر چبھویا کرتا تھا۔

ثریا رات گئے تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ اجمل کی جدائی میں وہ اکثر مجھ سے باتیں کر کے اپنا دل بہلاتی تھی اور میرے اوٹ پٹانگ فلسفے کو سُن سُن کر ہنسا کرتی تھی۔ اُس کی نظر میں شاید میں ایک معصوم آدمی تھا اور یقیناً کچھ وارفتہ بھی۔

"بیکار ہے یہ سب بیکار ہے" میں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس بگڑی ہوئی دُنیا میں ایک میں کو درست رہنا لازم ہے؟ اس کج رفتار عالم میں کیا ہمارے ہی لئے راست روی رہ گئی ہے؟ اسے بگڑنے دو اسے اور تباہ ہونے دو۔ یہ سماج ہرگز اس قابل نہیں کہ اسکے اصولوں کا احترام کیا جائے!" میں جانے کیا کیا بکتا رہا۔

وہ بیٹھی ہوئی مسکراتی رہی۔

"اُف یہ دروازہ تو کھلتا ہی نہیں" اُس نے امداد کے لئے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

"تو اسے بند ہی رہنے دو ـــــ کیا ضرورت ہے"

"لو اور سُنو! میں بھی کوئی ارواح ہوں کہ شیشے میں سے پار ہو جاؤں گی!"

میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کا لٹو گھمایا۔ آج پہلی بار وہ مجھے شب بخیر کہنا بھول گئی۔

"اجمل کا خط ہفتہ بھر سے نہیں آیا۔ میرا دل سخت پریشان ہے" ثریا افسردہ سی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

"کلکتہ میں ہیں خدا جانے کس رنگ میں ہونگے" میں نے ہوا با چٹکی سی لی۔ اور پھر اپنا فلسفہ چھیڑ کر اُس کا دھیان بٹا دیا۔ "انسان۔ فطرت۔ سماج۔ ظلم۔ بغاوت!"

وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ بنی بیٹھی رہی۔ مگر آج میری بغاوت کی رگ بُری طرح پھڑک رہی تھی۔

وہ چلی۔ میں نے روکا۔ اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "دروازہ کھول دو"

"کیا دروازہ ضرور کھلنا چاہیے" "یقیناً" اُس نے زور دیکر کہا۔

میری معصوم روح ایک عظیم الشان بغاوت کے لئے بیتاب تھی مجھے سودا تھا لوہے کی دیوار سے سر ٹکرانے کا۔ آج میں اپنی عزت سے ٹکرا کر فنا ہو جانے کیلئے تیار تھا۔

"ثریا تم باعصمت ہو، باوفا ہو۔ شاید اجمل سے بھی زیادہ۔ آہ ثریا میں بے حد کم نصیب ہوں۔ میری محرومی پر ترس کھاؤ۔ اپنی [illegible] عشرت آگیں زندگی میں سے چند لمحے مجھے چھین لینے دو۔ کیا تمہارے [illegible] دامن پر کوئی کبلاہٹ آجائے گی ـــــ ثریا!"

آنے والی مدافعت کا اندازہ کر کے میری تمام قوتیں مجتمع ہو گئی تھیں میں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

دیکھو دیکھو۔ میں بہت دن سے دیکھتی ہوں۔ ایسی باتیں زیبا نہیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے —— میرے اللہ! مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ بھی دو"

میرے بازوؤں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ میرے ہونٹ اُس کے دہکتے ہوئے رخسار سے جا ملے۔ میرا کیفِ بغاوت اپنے شباب پر تھا۔

بالآخر وہ بولی۔ "اچھا ایک بات کی قسم کھاؤ"

میرا دوران خون کئی درجے دھیما ہوگیا۔

"مرتے دم تک باز رہوگے!"

میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ میرا سر اُس کے رخسار کے برابر جھک گیا۔ میری تمام مجتمع قوت اپنے زور میں آپ پسپا ہوگئی۔ میں نے اُسے حسرت و مایوسی کے عالم میں چھوڑ دیا۔

وہ چلی گئی۔

سوچتا ہوں کیا واقعی میری نفسیاتی گہرائیوں سے واقف ہوگی؟!

محمد صدیق ایم۔اے

ایک خط

...... خوش رہو۔

گو تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی اوّلین فرصت میں تم مجھے خط لکھو گی لیکن آج چھ دن ہو گئے اور میں ابتک چشم براہ ہوں۔ کیا بھول گئیں؟ اِکی بار دہلی کا قیام میرے لئے ایک نیا باب ہے جس کی ابتدا تمہارے نام سے ہوتی ہے۔

...... یہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ میری فطرت کے وہ نازک اور کمزور پہلو تم لوگوں کے سامنے نہ آنے پائیں جنکی معمولی سی خراش بھی میرے دماغی سکون کو برباد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میں نے حسن کی مسلسل تنقیص کو اپنا شعار بنایا اور ان محفلوں سے ہمیشہ احتراز کیا جہاں بات بنائے نہ بنے!

تم سے قبل ایک اور ناوک فگن نے مجھے اپنا شکار بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کی لیکن زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہئے کہ ہر تدبیر اُلٹی ثابت ہوئی۔ اسے میں نے اپنی فطرت کے اتنے گھناؤنے پہلو دکھائے تھے کہ اگر معمولی دل و دماغ کا آدمی ہوتا تو نفرت کئے بغیر نہ رہتا۔ لیکن تم شاید سمجھ سکو کہ بعض اوقات زندہ رہنے کی یہ کوششیں خود کتنی مہلک نکلتی ہیں —— طبیعت کی پراگندگی پر کہا گیا کہ "یہ ناتجربہ کاری ہے" ذاتی بداخلاقیوں کی طرف اشارہ کیا تو فرمایا کہ "خیر یہ تو سب ہی کرتے ہیں" کیرکٹر کی خرابیاں پیش کیں تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "اچھا اب زیادہ انکساری نہ کیجئے" اور پھر اسپر بھی جب اصرار اجتناب حد سے آگے بڑھا تو یہ کہکر کہ "اوہ ہوگا۔ آپ کو کیا! آپ بُرے ہیں تو غیروں کیلئے ہیں تو آپ کو اپنے لئے اچھا بنا لوں گی" مجھے ایک ایسی دماغی اُلجھن میں مبتلا کر دیا گیا کہ جس سے آج تین برس کے بعد بھی چھٹکارا نصیب نہیں۔

...... تمہیں بتاؤ کہ کیا فطرت کا انتقام نہیں؟ کیا میری ہی سپر سے تلوار کا کام نہیں لیا گیا؟

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

میں نے دہلی کا قیام ترک کیا اور الٰہ آباد بھاگ آیا کہ شاید جگہ کی تبدیلی زندگی کو پھر پُرانے ڈھرے پر لگا دے اور میں اسی اطمینان سے واقعات کی لہروں میں بہنے لگوں جس پر کبھی اپنے دوستوں کے سامنے میں فخر کیا کرتا تھا —— مگر توبہ کیجئے۔ بھلا کھوئی ہوئی چیز اور کھوئی ہوئی بھی نہیں بلکہ چھینی ہوئی چیز کہیں واپس ملتی ہے؟ کتابیں اُلٹیں، مضمون لکھے، آگرہ، دہلی، کلکتہ، مدراس اور نہ معلوم کہاں کہاں کے سفر کئے، دوستوں سے مباحثے کئے، سیاست میں حصہ لیا، جلسوں میں تقریریں کیں اور جو کچھ ہو سکتا تھا سب کیا مگر ہر جگہ اور ہر حالت میں یہ محسوس ہوا کہ جیسے

ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

چونکہ عمر کا بیشتر حصہ بورڈنگ میں گزرا ہے، مختلف قسم کے احباب سے صحبت رہی ہے اور طبیعت کے فطری رجحان کی بدولت ہر اوقت

اپنے اندر مضمون کے [illegible] گزار ہے۔ اس [illegible]
کیفیت کو [illegible] زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑی۔ اور ہمیشہ یہ محسوس
ہوتا رہا کہ میں اپنے آپ کو ایک مسلسل دھوکا دے رہا ہوں ایک
گہرا فریب — لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ہر مرتبہ یہ فریب کھل گیا
اور میں چوروں کی طرح اپنی بے مائیگی پہ افسوس کرتا ہوا پکڑا گیا۔

میں بیٹھا پڑھ رہا ہوں۔ کتاب بہت عمدہ ہے۔ مضمون کی
سنجیدگی۔ اندازِ بیان کی لطافت توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ بارہ پندرہ
صفحے ختم کر چکا ہوں کہ چند منٹ کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے بڑی دیر
سے کسی نے دماغ کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ جو کچھ پڑھ رہا
تھا وہ نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ نہ ہاتھ میں کتاب یاد رہی اور
نہ کتاب پہ سطریں دکھائی دیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہلکا ہلکا کہرہ
بڑی دیر سے چھا رہا تھا لیکن ہم محسوس نہیں کر رہے تھے۔ جھنجھلا کر
چند صفحے اُلٹے اور پھر سے پڑھنا شروع کیا۔

ایک سطر — دو سطر — تین سطر — آج شریف صاحب
کا اخبار نہیں آیا — ڈاکیہ دکھائی تو دیا تھا — کوئی خط بھی نہیں آیا۔
معلوم نہیں امی کیسی ہیں۔ ان کا خط تو کئی دن سے نہیں آیا —
یہ لوگ خط کیوں نہیں لکھتے — چار ہفتے ہوئے ایک خط آیا تھا۔
اس میں الائچی کے دانے تھے اور یہ جملہ کہ "آپ کو الائچی بہت پسند
ہے نا؟ کھائیے" — دو دانے کھائے اور باقی اسی لفافے میں
رکھے ہیں — لفافہ بکس کے اندرونی خانہ میں ہے — دیکھوں؟
— ٹھہرو — اچھا پہلے کمرے کے دروازے بند کر لوں —
اوہو! اس میں اتنے خط جمع ہو گئے — اور چوڑی کے ٹکڑے —
الائچی کے چند دانے — دو نچے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے جن پہ
کچھ لکھا ہوا — ایک خط بے القاب کا —

"مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے۔ لوگوں
کا یہ خیال ہے کہ آپ اپنی مرضی سے ایسا کر رہے ہیں۔ اس
میں میری بڑی بدنامی ہے۔ اگر چھوٹی نانی یا ممانی جان کوشش
کرتیں تو کوئی بات نہ تھی لیکن اب آپ خدا کیلئے اپنے دل
کو سنبھالئے۔ میں تو [illegible] آپ سے زیادہ مجبور ہوں مگر پھر
بھی اپنے دل کو کیا [illegible] ہوئے ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ
اس خط سے آپ کو بڑی تکلیف ہو گی لیکن آپ کی محبت سے
[illegible] کہ آپ مجھے [illegible]۔ آپ کو دُنیا میں بڑے بڑے
کام کرنا ہیں۔ مجھ سے لاکھ درجہ بہتر آپ کو مل جائیں گی
میں تو خیر! جیسے تیسے گزار لوں گی۔ آپ اپنی حالت کو درست
کیجئے اور پڑھنے میں دل لگائیے۔ دوا خدا کیلئے پیتے
رہئے گا۔ آپ گھر خط لکھ دیجئے جیسے آپ ٹال رہے ہیں
اور ابھی نہیں کرنا چاہتے۔ میں نہ معلوم کتنی کوشش کے
بعد آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ کیا کروں۔ زمانہ کے
ہاتھوں سے مجبور ہوں۔"

چار دفعہ یہ خط پڑھنے کے بعد یہ شعر خود بخود زبان پر رواں ہو گیا۔

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

لاحول ولا قوۃ۔ میں تو بھول چکا تھا پھر یہ ہنگامہ کیوں؟ ارے توبہ
میں رو رہا ہوں؟ یہ کیا مذاق ہے۔ اونہہ! یہ خطوط جلا کیوں نہ ڈالوں۔
نہ رہے بانس نہ بجے بانسری! مگر جلانے سے کیا فائدہ۔ پڑا رہنے دو
کبھی یادگار ہی کے طور پر کام دینگے۔ ہٹاؤ بکس میں بند کئے دیتا ہوں
اور اب نہیں کھولوں گا — اور نہ دماغ میں ان کا خیال آنے دونگا۔
— چلو گھوما جائے —

"ضیا صاحب۔ ارے ضیا صاحب۔ آپ کو دُنیا میں سوائے
پڑھنے کے اور بھی کوئی کام آتا ہے" میں نے ان کے کمرے کے
دروازے زور سے جو کھولے تو شاید انہیں ناگوار ہوا۔ بہت خفا!
فرمانے لگے "..... صاحب آپ کو تو امتحان دینا ہے نہیں
پھر دوسروں کو کیوں پریشان کرتے ہیں"

"جی ہاں۔ مجھے بھی امتحان دینا ہے — مگر ذرا دیکھئے
چاندنی کیسی چھٹکی ہوئی ہے۔ آئیے گھوم آئیں — چائے نہیں پیجئے
گا؟ چلئے ملا جی کے ہاں آپ کو چائے پلا لائیں — دروازہ میں
تالا ڈال دیجئے —

شام کا رنگیں سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
ہو نہیں سکتا تیری اس بدمذاقی کا جواب

ضیا صاحب بولے "حضرت یہ شام ہے کہ آدھی رات؟"
"ہاں ہاں! ابھی آدھی رات ہی سہی۔ مگر اب چلئے —

چاندنی راتیں جب پھول کھلا کرتے ہیں
اور بڑھ جاتا ہے سودا [illegible]

ضیا صاحب آج جگر کا ایک شعر بہت یاد آرہا ہے۔ اگرچہ کافی گانے فرسودہ ہو چکا ہے مگر پھر بھی دوسرے مصرعے کی فتنہ سامانی تو جاتی ہی نہیں ۔

آکہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی نہ ۔ نا ۔ نا ۔ نا ۔ تنا
تا نہ نا ۔ نا نہ نا . . . . . . پاتا ہوں میں

جیسے ہر شے میں ـــــ ضیا صاحب کورس ختم کرلیا آپ نے ؟ کیوں ؟ آپ تو نہ معلوم کب سے کتابیں دبائے بیٹھے ہیں اور اب بھی کورس نہیں ختم ہوا ؟ ـــــ میں نے بھی آج طے کرلیا ہے کہ امتحان کی تیاری باقاعدہ شروع کردوں ـــــ نہیں مذاق نہیں واقعی اب پڑھنے کا ارادہ ہے ۔ بھئی قصہ یہ ہے کہ امتحان کے معاملے میں ذرا فراخ دل واقع ہوا ہوں ۔ جو کچھ دماغ میں سماتا ہے وہ یاد کر لیتا ہوں ۔ اور جو رہ جاتا ہے وہ کاغذ کے ٹکڑوں پر اور دوات کے لیبل پر لکھ لیتا ہوں ۔ یہ سب امتحان گاہ میں کام دیتا ہے ۔ اور صاحب میرے نزدیک تو یہ سب جائز ہے ۔ میرے ایک استاد کا قول ہے کہ "چوری ضرور کرو لیکن پکڑے نہ جاؤ" اور جناب ہے بھی یہی ۔ امتحان نام ہے ممتحن کو بے وقوف بنانے کا ـــــ جو زیادہ سلیقے سے بیوقوف بنائیگا وہ زیادہ نمبر پائے گا ـــــ اب آپ دیکھئے کہ میں اپنے درجہ میں ہمیشہ اوّل آتا ہوں ـــــ کیوں ؟ ـــــ بات یہ ہے کہ مجھے امتحان دینے کا راز معلوم ہے ـــــ مگر ضیا صاحب اس سال اگر میں پاس نہ ہوں تو کیسا رہے ؟ ہر سال تو پاس ہو جاتا ہوں ۔ اب کی مرتبہ فیل ہو کر بھی تو دیکھوں کہ کیا معلوم ہوتا ہے ـــــ اجی نہیں گھر پر کسی کو فکر بھی نہیں ہے کہ میں پاس ہوتا ہوں یا فیل ـــــ میری کامیابی ہی پر کس کو خوشی ہوتی ہے جو ناکامی پر کوئی افسوس کریگا ـــــ دنیا تو ناکامیوں کا نام ہی ہے اور پھر میں تو یوں بھی حد درجہ بدقسمت واقع ہوا ہوں ۔ اگر سونے میں ہاتھ لگا دوں تو مٹی ہو جائے ـــــ میں نے اسی لئے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ۔ نہیں معلوم کیا افتاد اس غریب پر آن پڑے ـــــ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا ۔ ہا ہا ہا ـــــ ارے بھئی یہ ہنسی کی بات تو نہیں ہے ـــــ ضیا صاحب کبھی زاہد صاحب سے ملے ہیں آپ ؟ آدمی بہت دلچسپ ہے ۔ آج مجھ سے تجزیہ نفسیاتی پر گفتگو ہو رہی تھی کچھ محبت کا ذکر چھڑ گیا ۔ آپ بہت مقدس انداز میں بولے کہ "عورت یا تو کسی سے محبت کرتی نہیں اور اگر کرتی ہے تو صرف ایک مرتبہ !

اور اسی طرح یہ کہ "مرد اصل محبت ہمیشہ ایک مرتبہ [illegible] پہلے تو اسے محبت پر مجبور کرتا ہے اور پھر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتا ہے " میں نے کہا " میاں کیا حماقت کی بات کرتے ہو؟ عورت ہمیشہ مرد کو انگلیوں پر نچاتی ہے ۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ عورت اپنی طرف سے محبت کا اظہار کرے ۔ ابتدائے اعلان کا مرتکب وہ کبھی نہیں ہوتا ۔ یہ تو کچھ عورت ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ قتل بھی کرتی ہے اور مسکراتی بھی جاتی ہے ۔ ہمیشہ محبت کا اظہار بلا خود کرے گی ۔ کبھی زبان سے اور کبھی آنکھوں سے ـــــ وہ روئیگی ـــــ تم پوچھو "کیوں روتی ہو؟" کہدیگی "کچھ نہیں" بہت اصرار کرو تو نہایت سادگی سے نظریں جھکا کر بولے گی "میں کیا بتاؤں کیوں رو رہی ہوں ـــــ آپ میری جگہ ہوتے تو سمجھتے ۔ بہرحال اچھا ہے نہ سمجھئے !"

اب جناب اگر آپ سمجھتے ہیں تو فی النار اور نہیں سمجھتے تو فی السقر ۔ اور ضیا صاحب یہی نہیں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ سے کچھ نہیں کہے گی ۔ اپنی کتاب پر آپ کا نام لکھے گی اور پھر اسے یوں کاٹ دیگی کہ سوائے آپ کی نظروں کے اور کوئی نہ پڑھ سکے ـــــ آپ کو کبھی ضرورتاً خط لکھے گی ـــــ آخر میں اپنے نام سے پہلے لکھے گی "آپ کی . . . . " اور پھر صرف نام چھوڑ دیگی باقی الفاظ کاٹ دیگی ـــــ اب آپ ہی بتائیے کہ اس سے زیادہ صبر آزما طریقہ اظہار محبت کا اور کیا ہو سکتا ہے ـ بات یہ ہے جناب کہ عورت کی فطرت کا سمجھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ـــــ اور اگر خدانخواستہ سمجھ میں آجائے تو پھر سمجھ کا خدا حافظ !

دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن !!

خیر چھوڑئے اس قصے کو ـــــ ہوگا ۔ آج کون تاریخ ہے ۔ چاند ڈوب رہا ہے ۔ ستارے بھی کچھ دھندلے دھندلے سے ہو رہے ہیں جیسے کسی دوشیزہ کی قبر پر باسی پھول ۔ کیوں صاحب کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ روشنی کتنی ہی مدھم کیوں نہ ہو کسی کسی مخرج کی مرہون منت ہوتی ہے ـــــ مگر تاریکی کے اثرات کتنے ہولناک ہو ہیں ! ـــــ میں اپنی زندگی کی تاریکیوں سے گھبرا گیا ہوں ـــــ میرا بچپن کتنا امید افزا تھا ـــــ جیسے انگور کی بڑھتی ہوئی بیل ۔ میرے دماغ میں ترقی کی کتنی قوتیں موجود تھیں ـــــ میرا خدا حافظ !! لیکن اب ؟ ـــــ اب کیا ! کچھ بھی نہیں ـــــ کلیاں سب ایک طرح کی ہوتی ہیں ـــــ خوش رنگ ، خوبصورت ' (باقی صفحہ [illegible] پر)

کسوٹی

کسوٹی

نئی کتابیں

جالب کے سو شعر

یہ مختصر سا مجموعہ محمد عادل مرزا صاحب جالب چغتائی مراد آبادی کے سو اشعار کا مجموعہ ہے جسے خود مصنف نے شائع کیا ہے۔ سو شعر جس حسن کے ساتھ شائع ہونے چاہئیں، یہ مجموعہ اس جمالیاتی معیار کو پیش نہیں کرتا۔ لیکن اس کا حقیقی جمال خود وہ اشعار ہیں جو جالب کی گداز اور حسین روح کو پیش کرتے ہیں۔

اس چھوٹی سی کتاب میں ایک "بسیط" دیباچہ منظور حسین خاں مضطر ایم۔اے لکچرار فیض عام کالج میرٹھ نے تحریر فرمایا ہے، جسے اصول انتقاد سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ دیباچہ اصل موضوع پر روشنی ڈالتا ہے "سو شعر کی غائت اشاعت پر" اس میں خیالات اور اظہار و بیان کا سخت بگاڑ پایا جاتا ہے، وہی رومانوی عہد کا نظریاتی اُلجھاؤ۔ "وہی حسن مطلق" "حسن راز سربستہ" "حسن درد" اور "حسن تپش دل" "تخیلات رنگین" وغیرہ کی تراکیب، نثر میں ایک نہیں، دو نہیں، تین تین اضافتیں "حسن تپش دل" قسم کی۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ منظور صاحب اُس تبدیلی سے ناواقف محض ہیں، جو اردو نثر نگاری کے اسالیب میں پچھلے چند برسوں میں عوامی ادب کے تقاضوں کی بنا پر ہوئی جس نے نیاز جیسے پر خود غلط انشا پرداز کو اپنے اسلوب کا احتساب کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں یہ خوب معلوم ہو گیا کہ چند عربی اور فارسی کے نامانوس اور غریب الفاظ لکھنا "ادب" نہیں ہے۔

نثر نگاری کے اسالیب ہی نہیں یہ دیباچہ چغلی کھاتا ہے کہ وہ اردو غزل اور اسکے ارتقاء سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یا واقف ہیں تو اُسے ترتیب و تسلسل کے ساتھ بیان کر دینے پر قادر نہیں۔

یہی نہیں شاعر کا جو تصور وہ پیش کرتے ہیں وہ بھی [illegible] کا "دقیانوسی" ہے۔ جن کو مجموعہ غزل کے اشعار پڑھنے نیاز جی کا [illegible] سکتا ہے ان میں [illegible] جا سکتا ہے [illegible]

جانتے ہیں کہ یہ بیچارے سو [illegible] سے بے نیاز ہونے پر مجبور ہیں۔

منظور صاحب فرماتے ہیں:۔

"جگر یا جالب ۔۔۔ لیکن اپنے نغمات ۔۔۔ جو آورد کا نتیجہ نہیں ہوتے تنہائی میں کسی کو سنانا ہوتا ہے، وہ بے نیاز ہوتا ہے اس امر سے کہ کوئی سنے اور داد دے، وہ خود ہی قاری ہوتا ہے اور خود ہی مستمع، خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق۔ میں غزل گو شاعر کو اسی معیار پر دیکھنا پسند کرتا ہوں، ہر چند قوم اور جماعت کے مفاد کا خون اس نظریہ سے ہوتا ہے (آپ کی بلا سے ہوا کرے) لیکن کیا کیا جائے ایسا شاعر افراد کی سطح سے کہیں بالا ہوتا ہے اور تنقید کی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا لہذا اس کا دور رہنا ہی بہتر۔"

جہاں تک ایسے شاعر کے خود ہی قاری اور خود ہی مستمع ہونے کا تعلق ہے قرین قیاس ہے، کیونکہ اگر یہ شاعر انسان ہے تو زبان و گوش ضرور رکھتا ہوگا۔ اپنی زبان سے اشعار "قرأت" کرے گا اور اپنے کانوں سے سمع فرمائے گا۔ لیکن ایسے شاعر کی یہ تعریف کرنا کہ وہ "خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق" ہوتا ہے، محل نظر ہے۔ عاشق "اسم فاعل" ہے اور معشوق "اسم مفعول"۔ عاشق مرد کو قیاس کر لیجئے اور معشوق عورت کو، منظور صاحب کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ بیک وقت اسم فاعل اسم مفعول اور بہ یک چشم زدن میں مرد، عورت کیونکر ہو سکتا ہے!؟ یہ ممکن ہے کہ تغزل کی انفعالیت اُسے "درمیانی درجہ کی کوئی صنف" بنا دے، ورنہ صاحب فاعل، فاعل ہے اور مفعول، مفعول۔ عاشق، عاشق ہے معشوق، معشوق !۹!

دیباچہ [illegible] کی نگاہوں میں شاعر یا ادیب [illegible] اسی قدر [illegible]

[illegible]

کا تعارف کرایا ... [illegible] ... چاہیئے۔ مگر تنقید کی غلط ... [illegible] ... ہیں۔ دنیا میں میر جیسا ہوا، نہ غالب جیسا ہوا، نہ داغ جیسا ہوا، نہ اقبال جیسا حکیم ... [illegible] ... کو سر بازار اور بازار کے ہر موڑ پر بالاعلان ... گیا۔ منظور صاحب کیسی دنیا کی باتیں کر رہے ہیں!؟ شاعری کی اس تعریف سے پہلے ایک جگہ بالکل متضاد بات کہتے ہیں:

"لیکن اس دہ بستی میں جب شاعر کا دامن سچ ہو چکا ہے

جس کو دیکھئے عاشقانہ اشعار جھوم جھوم کر پڑھ رہا ہے

. . . . . . بدیں وجہ دور حاضر کے تغزل میں

اصلیت، جدت اور اثر نہیں رہا"

منظور صاحب کے نزدیک جن غزل گو شعراء نے (ریڈیو اور ریکارڈ یعنی پردیگنڈے کے روحانیت سوز اثر رکھنے والے مقامات سے) شہرت حاصل کی ہے وہ ۹۰ فی صدی شہرت کے مستحق نہ تھے۔ حالانکہ منظور صاحب یہ نہیں جانتے کہ ریڈیو اور ریکارڈنگ . . . . . سے پہلے یہ غزل گو شعراء اپنی شہرت کا سکہ اپنے جوہر شاعری کے ذریعہ جما چکے تھے۔ ریڈیو تک اگر کسی جوہر نے پہنچایا تو وہ ان کا حقیقی جوہر تھا جس کی سفارش ان کی شہرتوں نے کی۔

منظور صاحب کا اصل مرض یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت دل شاہ جہاں پوری کے شاگرد ہیں اور ان سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ (یہ عقیدت شاید جنون کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہے) دل صاحب کو غیر مشہور اور غیر مقبول دیکھ کر انہیں روحانی صدمہ ہوتا ہے اور یہ صدمہ ان کے عمل میں طرح طرح سے پھوٹتا ہے۔

آگے چل کر اک الجھی ہوئی بے معنی ... [illegible] ... لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں اس قسم (اوپر ایک قسم ... [illegible] ...) کے ماتحت یوں تو حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، [illegible] اکبر آبادی، یگانہ چنگیزی، [illegible] کا کلام بلاغت نظام نہایت ... [illegible] ... جا سکتا ہے لیکن میں ... [illegible] ... دل شاہ جہاں پوری [illegible] ... خیال کرتا ہوں"

مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے [illegible] ... اور تاجیا کیوں تصور کر لیا ... [illegible]

[illegible] ... ان سے ... [illegible] ... کچھ وجہ نہیں کہ ان سے اعراض کیا جائے۔ دل صاحب ... [illegible] ... غیر مقبول ہونے کے بھی اسباب نہیں کہ ان کو بد قسمتی سے مواقع نصیب نہیں، اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اردو تغزل کے بدلتے ہوئے رجحانات کو گرفت میں نہیں کر سکے۔ نہ صرف دل صاحب بلکہ اس وقت نوح، سائل اور باقی ایسے تمام بزرگ جو قدیم معاملات نگاری یا دبستان ... [illegible] ... کے شاعر تھے، اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ یوں بھی ان کے بعض کے لوگ بھی کنارے پر پہنچ چکے ہیں۔

محمد عادل مرزا جالب مراد آبادی کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔ جالب صاحب کی شاعرانہ حیثیت کافی بلند ہے، جگر کے بعد مراد آباد نے جالب کو پیدا کیا، اور کوئی شک نہیں کہ ترقی یافتہ تغزل کی تمام دل آویزیاں اور تاثر جالب کی شاعری کی روح رواں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جالب کے شعر میں اک دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے۔

بہاریں بھی ہیں گلشن بھی ہے قطرہ و انجم بھی
مگر اس دل سے پوچھو جو کمی معلوم ہوتی ہے

قدیم تغزل ہو کہ جدید، تاثراتی عناصر ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ گیت اور غزل میں "المناکی" اور انفعالیت ہمیشہ سے "حسن" سمجھا گیا۔ شاید انسانی محبت کا منتہا ہی ناکامی اور بد نصیبی ہے۔ مشرقی زندگی میں چاروں طرف سے غم کے ... [illegible] ... قسم کے دباؤ پڑتے تھے، اس کا لازمی نتیجہ وہ المناکی اور افسردگی ہے جو مشرقی شعراء کے کلام میں زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہے ... [illegible] ... رنگینی و ... [illegible] ... افسردگی کا ... [illegible] ...

جالب کے کلام میں ... [illegible] ... اور افسردگی ... [illegible] ... نہیں ہے جس پر اس کے کلام ... [illegible] ... اور تاثر کی عمارت کھڑی ہوتی۔ اکثر جگہ نہایت ... [illegible] ... زندگی کی ... [illegible] ... کے کھلنے کا سا منظر پیش نظر ... [illegible] ... ایک جگہ کہتا ہے کہ

[illegible]

[illegible]

آتا ہی گیا مجھے عالم خیال میں ... ہستی سے ہوسکا نہ گریزاں کسی طرح
بھر گیا ساغر گو نہیں کو اک آن میں کون
میں نے دیکھا نقاد دو عالم کو تہی جام ابھی

"سو شعر" کی اشاعت کا تخیل جامعہ ملیہ دہلی نے پیدا کیا۔ گو انتخاب میں وہ بھی کامیاب نہیں ہوئے، مگر نسبتاً مکتبہ جامعہ نے جو انتخابات شائع کئے وہ معیار رکھتے ہیں۔ اسکے بعد جن لوگوں نے انتخابات شائع کئے وہ انتخاب کے مفہوم اور حسن کو قائم نہیں رکھ سکے۔ کسی شاعر کے سو دل گداز اشعار، سو سلطنتوں سے کم نہیں، مگر بہر صورت یہ دراصل طبع انتخاب کیا اور شائع کر دیا۔ اس انتخاب کے معنی یہ ہیں، کہ وہ سو شعر جن پر اک عامی سے لیکر مخصوص فرد تک سر دھننے کیلئے مجبور ہو جائے اور جو انتخاب سے پہلے خود ہی سماعت اور شہرت نے چن لئے ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ جالب صاحب نے بھی اس زاویۂ نگاہ سے انتخاب نہیں کیا، ورنہ جو اشعار اس کتابچہ میں ہیں، ان کے کلام میں اس سے اچھے اشعار موجود ہیں۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۴)

اسکے حقدار تھے کہ ان کی یاد میں ایک نمبر شائع کیا جاتا، جو ان کے متعلق کامل معلومات پر مبنی ہوتا۔ گو نگار کا جنوری و فروری نمبر کوئی ایسی جامع حیثیت نہیں رکھتا، کہ اُسے پڑھ کر ریاض کے متعلقات یا ان کی سیرۃ کے مختلف گوشے سامنے آجائیں، لیکن بہرحال نیاز کے ذوقِ خود پسندی کی تکمیل ہو گئی ہے۔

ریاض خیرآبادی کی یاد میں یہ نمبر اس لئے شائع نہیں کیا گیا کہ

۴

ریاض اسکے حق دار تھے، بلکہ اس لئے شائع کیا گیا ہے کہ "نیاز" ان کو پسند کرتے ہیں۔

حضرت ریاض مرحوم کی مدح سے قبل یہ ضروری تھا کہ ملک کے باقی تمام شعراء کو "جنس فرومایہ" کہا جاتا، چنانچہ "اعترافات" میں تین سطروں کے بعد ہی "انتقاد کا فرض" اس طرح ادا کیا جاتا ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا شاعر، جیسا کہ اس سے قبل میں بارہا ظاہر کر چکا ہوں (لہجہ قابل غور ہے) بہ حیثیت انسان ہونے کے ایسی جنس فرومایہ ہے کہ مشکل ہی سے کسی کو اسکے پیش کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے (بدبختی سے ممدوح نیاز (ریاض) بھی شاعر ہیں اس لئے گریز بھی لازمی تھی تاکہ "جنس فرومایہ" کے انبار میں سے اپنے ہیرو کو بہ حفاظت نکال لیا جائے) چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر واقعی کوئی انسان اس گروہ میں نکل آیا تو پھر اس کا جواب "عالم آب و گل" "کیا معنی" "ملائکہ مقربین" اور "گروہ بیانِ مقدسین" کی جماعت میں بھی نہیں مل سکتا۔"

میں نیاز کے بیان میں صرف اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کا شاعر ہی نہیں، بلکہ نقاد بھی ایسی جنس فرومایہ ہے کہ مشکل سے بھی اسکے پیش کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی، لیکن اسکے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ شعراء کے گروہ میں تو ایک آدھ انسان ایسا نکل بھی آتا ہے جس کا جواب "عالمِ آب و گل" "کیا معنی" "ملائکہ مقربین" اور "گروہ بیانِ مقدسین" کی جماعت میں بھی نہیں مل سکتا۔ مگر ہندوستان کا بر خود غلط، خود پسند، بے اصول، کم نظر اور جاہل نقاد ایسی "جنس فرومایہ" ہے کہ اس میں کسی قسم کے استثناء کی گنجائش نہیں۔

ریاض مرحوم کا تعارف کراتے ہوئے نیاز اس عہد کے سب سے بڑے جوہری تحریر فرماتے ہیں:۔

"ریاض کیا چیز تھے؟ اگر میں تفصیل سے کام لوں تو اسکے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں لیکن اختصار و اجمال کے ساتھ اگر کوئی دریافت کرے تو میں اسکے جواب میں وہی کہہ سکتا ہوں جو یوسف کی خصوصیات معلوم کرنے کے بعد بعض زبانوں سے بے اختیار نکل گیا تھا:۔

"ان هذا الا ملك كريم"

اور اسکے بعد بھی عرفی کا یہ مصرع پڑھونگا کہ:۔

"مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ"

کیونکہ یوسفؑ تو خیر پیغمبر پیدا ہوئے، پیغمبر زندہ رہے اور پیغمبر مرے، اور ان کے لئے "ملک کریم" ہو جانا کوئی امتیاز نہ تھا لیکن ریاض تو بقول شخصے اس تیرہ خاکدانِ ہند میں ایک گنہگار انسانی خاندان میں پیدا ہوئے کہ جوانی کا معصیت کوش زمانہ اس فضا میں بسر کیا جہاں "حسن" کا مفہوم "استغناء" نہ تھا اور ضعیفی ان حالات کے تحت گزاری جب "ممنوعات و محرمات" کا سوال شرعاً و قانوناً دونوں طرح اٹھ جاتا ہے لیکن کہا کوئی [illegible] سکتا ہے

کہا مثل عشرت گاہی منزل میں نا مجی حیات کے کسی مشغلہ میں اور اپنی عمر کے کسی موسم میں ایک لمحہ کیلئے بھی اُس جادۂ انسانیت و اخلاق سے ہٹتے ہوئے نظر آتے جو کبھی کبھی گنہگاروں کو تو مل جاتا ہے، لیکن وہ زاہدانِ مرتاض کے حصہ میں کبھی نہیں آتا۔ اس لئے اگر ان کو ملک کریم کہنے کے بعد بھی عرفی کی طرح اعترافِ قصور کیا جائے تو غالبًا نادرست نہ ہوگا۔ ریاضؔ اُس عہد کی یادگار تھے جب اودھ و مضافاتِ اودھ کے اکثر مقامات میں زندگی کا مفہوم باوجود انتزاعِ سلطنت کے بدستور خندہ و قہقہہ چلا آرہا تھا اور ہر صحبت اسی احساس حسن و شباب کا مکمل نمونہ ہوتی تھی جسے شعر و موسیقی کا خلاق کہنا چاہیئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہر اجتماع ہنگامۂ نائے و نوش تھا اور ہر منظر بساطِ گل فروش، بے فکریاں تھیں اور عیش کوشیاں، عیش کوشیاں تھیں اور ان اسباب کے ساتھ جن کا ایک ادنیٰ منظر صاحبِ رسائل طغریٰ کی زبان میں بہرِ بناگوش مطربانِ جلاجل نعل در آتش" کے تیور لئے ہوئے ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایسے مدہوش اور مدہوش کن زمانہ میں جوانی آئے اور شخص بھی کون؟ ریاضؔ ایسا غیر معمولی طبع رنگین رکھنے والا، وہ جس قدر دادِ معصیت دیتا کم تھا۔ لیکن اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ یہ ساری عمر خمریات کی شاعری میں مبتلا ہو کر بسر کرنے والا شاعر، یہ زندگی کی تمام شگفتہ سامانیوں کے ساتھ حسن و شباب کے ہجوم میں بہترین ایامِ حیات گزارتے ہوئے جادۂ اخلاق سے کبھی ایک لمحہ کیلئے نہ ہٹنے والا شخص جس طرح ایک انسان پیدا ہوا تھا بدستور اسی طرح انسان رہا۔ اس زمانہ میں بھی جبکہ گناہ سے پہلے "عذرِ گناہ" پیدا کر لیا جاتا ہے ضعیفی کے وقت کا کیا ذکر کہ اس وقت تو ریاضؔ حقیقی معنی میں معصوم تھے۔"

آگے چل کر اپنی اور ریاضؔ مرحوم کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:—

"لیکن باوجود اسکے کہ زمانہ موافق نہ تھا، حالات نے سخت دلگیر بنا رکھا تھا، ہجومِ افکار نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا لیکن ریاضؔ باوجود سراپا غم و الم ہونے کے دوسروں کے لئے یکسر بہار و شگفتگی تھے۔"

نیازؔ کے پاس اپنے اسلوب کے سوائے کچھ نہیں، دیکھئے کتنے محکم الفاظ میں وہ ریاضؔ کے متعلق اپنی شیفتگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا ذہن اک شخصیت سے اس درجہ متاثر معلوم ہوتا ہے، کہ وہ جرح کے امکانات اور اندیشوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

یہ محاسن جو انہوں نے ریاضؔ مرحوم کے گنوائے ان کی تردید مقصود نہیں لیکن یہ فطری طور پر نفسیات کے دقیق مسائل کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان سطور کے متعلق کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اڈیٹر نگار جنہیں حکیم اور مفکر، نقاد اور نباضِ ادب ہونے کا دعویٰ ہے، میری تشفی کریں!

(۱) اخلاقِ انسانی کے متعلق خود ان کا قطعی نقطۂ نگاہ کیا ہے!؟

(۲) انسان کی کیا تعریف ہے!؟

(۳) شباب کی کیا تعریف ہے!؟

(۴) کیا انہوں نے اب "گناہ" کی دقیانوسی تعریف قبول کر لی ہے؟

(۵) شاعری کا فن، انسانی فکر و عمل سے تعلق رکھتا ہے یا وہ محض ایک جامد آرٹ ہے!؟ آرٹسٹ کی روح اور احساسات کو اسکے آرٹ میں دخل ہے یا نہیں!؟

(۶) ہجومِ حسن و شباب میں "جادۂ اخلاق" پر چلنے والے اسی زمین کی مخلوق کہلاتے ہیں، یا آسمان کی۔ یا ذہن کی؟؟

اگر یہ واقعہ ہے کہ "خطابت" اور "سوانح نگاری" دو مختلف فرائض ہیں تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ اس قسم کا تعارف ریاضؔ کے ساتھ، اسکی جوانی کے ساتھ، اسکی رومانیت اور اسکی غزل کے ساتھ شدید ظلم ہے۔

ریاضؔ خیرآبادی کی شاعری کے متعلق کچھ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں، لٹتے ہوئے درباروں میں عیش و تفریح کی جو مٹی ہوئی یادگاریں باقی رہ گئی تھیں وہ ان کا دھندلا سا پرتو تھے۔ ان کے ذہن میں وہ ادائیں رس بس گئی تھیں جن سے امراء خوش ہوتے تھے، رفتہ رفتہ وہی باتیں ان کے اخلاق و اعمال کا ضمنی سانچہ بنا گئی تھیں، اور یہ سانچہ بالکل سطحی تھا، وہ شاعروں کی اُس نسل سے تھے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے تضادوں کا مجموعہ ہوتی تھی، ان کے فکر و عمل کے رشتے بالکل مختلف سمتوں میں جا کر جڑتے تھے، بادہ نوشی بھی

لیکن شراب پر شعر کہہ رہے ہیں شاہد باز نہیں لیکن رند بنے ہوئے ہیں، نہ کسی سے محبت ہے نہ نفرت، لیکن کلام میں سب کچھ موجود ہے، غرضیکہ قافیے تھے جو کچھ کہا وہی بن گئے! ۳۰، ۴۰ برس کی مشق کے بعد یہ لوگ کچھ اچھے شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

کوئی شک نہیں، ریاض بعض مسائل میں مستثنیٰ تھے، وہ بہ حیثیت انسان سینہ میں حساس دل رکھتے تھے لیکن ان کی شاعری اور اعمال و اخلاق میں سخت قسم کا تضاد پایا جاتا ہے! اسی لئے ہم ان کی شاعری کو روایتی شاعری کہنے کیلئے مجبور ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کی شاعری کا اک معیار ہے اور ذہن و دماغ کی تفریح کرتی ہے، مگر شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ اسکے دل پر بھی بیتا ہے یا اس کو شراب سے واقعی ذوق رہا ہے! یہ ان کے کلام سے معلوم نہیں ہوتا۔

نیاز نے ریاض کا مقدمہ اسی عجب انداز میں پیش کیا ہے جس میں تبختر، شان اور ریاض نمائی سے زیادہ خود نمائی کی ادا پائی جاتی ہے۔ یہ احساس مجہول (   ) نیاز کی مخصں ترین کیفیت ہے۔ نیاز خوب جانتے ہیں، مجنوں اور فراق اور دسیوں نوجوان انکے مقابلے میں انگریزی ادب پر وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں اس لئے ان سے جب ملیں گے اک خودی کے ساتھ گویا احساس مجہول کے ساتھ۔

تمام نمبر میں فراق، نیاز، اور دوسرے لکھنے والوں کی یہ سعی رہی ہے کہ وہ ریاض کی شاعری کا کوئی صحیح پس منظر بنائیں، مگر کامیابی نہیں ہوئی، فراق نے ذرا جرأت دکھائی ہے مگر مقصد ان کا بھی قصیدہ خوانی ہے، مگر کیاں اس لئے کھائیں ہیں کہ آپ کو گمان ہے، لوگ آپ کو بھی ترقی پسند خیال کرتے ہیں۔ دوسری طرف ترقی پسند دوستوں سے زیادہ اڈیٹر نگار کی خاطر منظور ہے۔ ریاض کی غزل کو فراق نے "اداکاری" سے تعبیر کیا ہے، جھوٹ کہا ہے، مگر اس "جھوٹ" کہنے کے لئے اسے خود بھی بہت بڑا جھوٹ بولنا پڑا ہے: —

"ناسخ کا جھوٹ، ریاض کا سچ بن گیا ہے" (فراق)

غلط کو صحیح، اور صحیح کو غلط، ثقاہت کو ابتذال، اور ابتذال کو ثقاہت کر دکھانا نیاز فتحپوری کا کمال ہے، اگر انہیں ابتذال کی نمائندگی کرنی ہے تو وہ تمام عالم منطق، تمام دنیائے طلاقت، کل امکاناتِ خطابت کو، جائز و ناجائز کے خیال سے آزاد ہو کر درہم برہم کر دیں گے! اور دنیا سے تسلیم کرائیں گے کہ یہ ابتذال نہیں ثقاہت ہے!

ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں ہوا کہ [illegible] کے خلاف جذبہ پیدا ہوا جو دور نئے تمدن کا نتیجہ [illegible] اور "حویلی" کی تہذیب نے جو دیواریں سماج میں کھڑی کر دی تھیں ظاہر ہے کہ داغ اور ریاض کی شاعری ان دیواروں کے سایہ میں پلی بڑھی ہے۔ اقبال سے پہلے اردو شاعری اسی "عنصر" کی بنا پر اس درجہ مردود اور مسترد ہو چکی تھی کہ بچوں اور عورتوں کے سامنے شعر پڑھنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ حالی نہ سہی مگر اقبال نے شاعری کو وہ گہرائی اور سنجیدگی بخشی کہ شعرا کی مٹی ہوئی عظمت سماج میں دوبارہ اس طرح ابھر آئی جیسے کیچڑ کے اندر سے کنول کا پھول!

شاعر کے اس ارتقا اور نکھار کو نیاز "سنجیدہ سوختگی" اور "متین برشتگی" اور کھل کھیلنے کی حالت میں بھی "جرأت رندانہ کے فقدان" سے تعبیر کرتے ہیں! ان کا خیال ہے کہ آج "شمع سخن" کے پروانوں کی خاک سرد پڑ گئی ہے۔

وہ اپنے حسرتناک بڑھاپے میں سٹھیا کر اس چوک کو یاد کرتے ہیں، جہاں "تماشائے لبِ بام" کی رسم جاری تھی اور شام اودھ کے دھندلکے میں نغمہ و سرود کی گونج باقی!

حالانکہ یہ وہ موقع تھا کہ وہ اس فرسودہ "ادبِ لطیف" کی نگارش سے پرہیز کرتے اور اس پس منظر کو پیش کرتے جو ہندوستانی سماج کے ابتذال کا ایک دردناک اور چیختا ہوا منظر تھا۔ یہ شعر ؎

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں جھپکے سے اٹھا لے

نیاز کی نظر میں محض "ناواجب شوخی" کا آئینہ دار ہے، لیکن ریاض کے علاوہ داغ کے اس قسم کے اشعار کے متعلق یا غالب کے اس شعر پر کہ ؎

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

وہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ابتذال کا چارج لگا دیں گے مگر ریاض کی وکالت کے زعم میں اس شعر کے متعلق وہ ادب کے مختار مطلق بن کر حکم صادر کرتے ہیں کہ "اسے مبتذل کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے" غالب کو وہ مفکر شاعر نہیں طنز [illegible] تسلیم کرتے ہیں! حالانکہ . . . .

خود انکا طریق انتقاد، محض لفاظی اور طنز نگاری کی [illegible] کے علاوہ کچھ نہیں!

[illegible]
نفسیاتی اور جمالیاتی ... کا ہے جو بہت ہوتے ہوئے جگہ کیا ہے یہ شعر فراق کے مضمون کی اساس ہے، بہ حیثیت نقاد فراق ملحوظ رکھتے ہوئے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جائیگی۔ لیکن یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میر و غالب کی صف میں ریاض کو نہیں بٹھایا جا سکتا۔ فراق نیاز سے زیادہ "باتونی" ہیں اور انہوں نے کافی طاقت ریاض کی شاعری کو اعلیٰ درجہ کی حقیقی شاعری ثابت کرنے پر کی ہے، لیکن اس وکالت سے زیادہ لوگ خود ریاض کی شاعری سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

زندگی کے دکھ سکھ کی وہ حقیقت جو الفاظ میں بیچ کر شعر کو ابدیت عطا کرتی ہے، لکھنؤ والوں کے یہاں مفقود اور دہلی والوں کے یہاں نمایاں طور پر موجود ہے۔ میر کہتا ہے ؎

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

عجلت میں یہ چند سطریں تحریر کر دی ہیں لیکن ہمارے نقاد اور ان کی بے راہ روی متقاضی ہے کہ ان کے اعمال و افکار کے متعلق باقاعدہ ایک مبسوط سلسلہ لکھا جائے، چنانچہ انشاءاللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آئندہ نمبر میں نیاز، مجنوں، فراق، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین زور، عبدالقادر سروری، مسعود الحسن، احتشام الدین، سجاد ظہیر، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور دوسرے اصحاب کے انتقادی نقطۂ خیال اور جملہ اعمال و افعال کو اصول انتقاد کی روشنی میں دیکھا جائیگا۔

اصل میں ہمارے ادب میں انتقاد کی بڑی کمی ہے خاص کر موجودہ عہد کے اکثر شعراء نے اپنی نثر نگاری کی الجھنوں کا تجزیہ و احتساب نہیں کیا، یہی نہیں انتقاد کے ذوق کی تکمیل سے بھی عاجز رہے، مگر اب وقت آگیا ہے کہ سونا خود اپنی کسوٹی کو پرکھے!

ایک رات

(شالامار پکچرز کی پہلی تصویر)

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۶)

کلچر سے تعلق رکھتا ہے! راجہ کے مکان میں آنے کے بعد نینا کو جج کی رانیوں کا لباس لہنگا سلوکا اور اوڑھنی پہنایا جاتا تو شاید مناسب ہوتا۔ میں جانتا ہوں ڈائرکٹر اس موقع پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ شلوار عام طور پر پہنی جاتی ہے اس لئے پہنائی جا سکتی ہے! ان دو مقامات کے علاوہ "ایک رات" کے تمام لباس اپنے اندر موزوں ترین انتخاب وصحت رکھتے ہیں۔

سوتیلی بہن کی پارٹی میں نینا کو جو بیل اوور پہنایا گیا ہے، وہ اسے بالکل نہیں سجتا، دوسرے لباسوں کے مقابلے میں اس لباس میں اسکی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کوئی شام کا لباس زیب کرانا تھا۔ گو یہ منظور ہے کہ اس پارٹی میں اس کی سوتیلی بہن نے نینا کو شریک نہیں کیا ہے اور وہ اوروں سے الگ تھلگ علیحدہ بیٹھی ہوئی ہے۔

ترتیب و پلاٹ

کہانی دو معصوم صفت محبت کرنیوالے مرد و عورت سے شروع ہوتی ہے، جو ایک منزل پر آکر سماج کے اخلاقی بندھن کو توڑنا چاہتے ہیں، مگر نینا کی معصومیت دونوں کو ناکام بنا دیتی ہے۔ اسکے بعد راجن اور نینا کسی قسم کا باغیانہ اقدام نہیں کرتے، یہ مقام بڑا انتقادی اور نفسیاتی مقام ہے۔

سماج میں عورت کی پوزیشن باوجود ترقی آزادی اور روشنی کے ابھی تک رجعت غلامی اور تاریکی میں جکڑی ہوئی ہے، اس سے زیادہ خود عورت کا ذہن و روح ان پرانے سماجی رسم و رواج اور اعتقادات کے جال میں پھنسا ہوا ہے جو اسے پرانے اور دقیانوسی ماحول سے وراثت میں ملے ہیں، اس لئے افسانہ نگار نے نئی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے اپنا دامن بچایا ہے اور عافیت اسی میں سمجھی ہے کہ نینا کی نفسیات اور قائم کردہ کردار راجہ کی سیرت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ایک قدرتی ترتیب کو جاری رکھے اور یہی مگر [illegible] پلاٹ کے ذریعہ کہانی کے انجامی مرکز تک

میں اس لحاظ سے کہانی میں کوئی نقص نہیں ہے اور وہ ترتیب و پلاٹ کے لحاظ سے درست ہے۔

تشکیل

میں یہ یقین کرتا ہوں کہ ایک رات کے ڈائرکٹر کا جمالیاتی ذوق عام ڈائرکٹروں سے بالکل مختلف اور بلند ہے کیونکہ اس تصویر میں تشکیل کی ادنیٰ سی غلطی نہیں پائی جاتی غالباً اس لئے کہ تصویر کی جو فضا اور ماحول ہے، شاید اس ماحول و فضا کے ایک ایک جزیہ کو اسکے ڈائرکٹر ذاتی طور پر مشاہدہ کر چکے ہیں۔

اداکاروں کی تعداد

ایک رات میں اداکاروں کی تعداد دو مناظر میں اجتماعی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ ایک چائے کی پارٹی میں، ایک عدالت میں۔ ایسے مواقع پر زیادہ تعداد کی وجہ سے مجبوراً ایسے چہروں والے افراد کو جمع کر دینا پڑتا ہے کہ جو جمالیاتی اور رنگارنگی کے نقطۂ نگاہ سے وہ توازن باقی نہیں رکھتے جس میں وقار اور کم تری حسن اور بدصورتی، اور مجموعی طور پر حقیقت بھی قائم رہ سکتی۔ چنانچہ چائے کی پارٹی میں نینا کی سوتیلی بہن کی جو سہیلیاں جمع ہوئی ہیں ان میں یہ تناسب باقی نہیں رہا، کوئی بھی اُن میں حسین لڑکی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ڈائرکٹر کہہ سکتے ہیں کہ نینا کی سوتیلی بہن جیسی ہے ویسی ہی اسکی سہیلیاں ہیں، مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عوامی اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے ان کا جواب تسکین بخش نہیں ہوگا۔

البتہ عدالت کا منظر اس لحاظ سے بالکل مکمل ہے، یہ ایک رسمی منظر ہے مگر تکمیل کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آتا ہے اور کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔

اداکاری

رہی اداکاری، سو، فلم انڈسٹری میں شاید کوئی سوشل تصویر ایسی نہیں ہے جس میں کسی ہیروئن نے نینا کی طرح حقیقت کا مجسمہ بن کر دکھایا ہو۔ نینا کی ہستی، نینا کی مکالمت، اندازِ گفتگو، اس کا طور و طریق، اسکی چلت پھرت، اسکی آنکھوں کی جنبش، اسکی حیا، اسکی بے باکی، سب ایک گھریلو کنواری لڑکی کی حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی ہے، خاص کر اسکی آواز اور اندازِ گفتگو اتنا ہی دلربا اور اثر ریز، بے ساختہ اور پاکیزہ ہے جس قدر شمالی ہند کے ایک ایسے گھرانے کا ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک رات میں دکھایا گیا ہے۔ اس لئے واقعیت اور فنِ اداکاری کے لحاظ سے اسکی کامیابی بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔ ایک رات کی تمام عمارت نینا کے ستون پر قائم ہے۔

اوّل سے آخر تک نینا کا رول بغیر کسی نقص اور اکراہ کے بے ساختہ طور پر ادا ہوا ہے اور اسکی اداکاری میں حسن و تکمیل کی اتنی مقدار جمع ہو گئی ہے

کہ وہ تقسیم ہو کر تمام باقی افراد کی اداکاری میں توازن قائم کر دیتی ہے۔

راجن (ہیرو) یعنی پرتھوی راج بی اے کی اداکاری میں پہلی بار انکی مخصوص خصوصیات نمایاں ہوئی ہیں۔ خاص قسم کی شرمیلی مردانگی، پُر وقار اندازِ مکالمت، شاندار وجود، مردانہ صبر و ضبط، شریفانہ تہذیب، صبر، مخصوص حرکات، چہرہ کے مختص خطوط، اپنی گھبراہٹ، اپنی مسکراہٹ، اپنی مسرت، اپنا غم، پرتھوی راج کی اداکاری اپنے اندر ایک شخصیت پوشیدہ رکھتی ہے۔ جب شخصیت کو سامنے لانا ہو تو پرتھوی راج کو چُننا چاہئے، وہ پُر وقار شریفانہ افراد کی نمائندگی کرنے میں مخصوص درجہ رکھتا ہے۔ میراں بائی میں راجہ کا کام اس کا وہ اختراعِ فائقہ ہے جو ایک بار ظاہر ہوکر پھر دوبارہ ظاہر نہ ہو سکا۔

مجھے یاد نہیں رہا کہ امن سنگھ اور مبارک کا کیا رول ہے، مگر چتر لال اور راجہ نے حقیقی مصاحب اور حقیقی راجہ کو پیکر بخش دیا ہے۔ چتر لال نے اوّل سے آخر تک اپنے رول میں تکمیل و توازن کا کمال کامیابی سے باقی رکھا ہے۔ نینا کے باپ کا اندازِ گفتگو قطعی بے روح ہے۔ اور نینا کی سوتیلی ماں نے اپنی شخصیت کو فراموش نہیں کیا۔ باقی ضمنی کرداروں میں راجہ کا ملازم اور نینا کی خادمہ نے بڑی کامیابی سے اپنا رول ادا کیا ہے۔ دیکھنے میں تو یہ ضمنی کردار ہیں لیکن اگر یہ جامد ہو جاتے تو ایک رات ٹھٹھر کر رہ جاتی۔

عکاسی

ایک رات کی عکاسی، فنی لحاظ سے موزوں ترین معیار رکھتی ہے۔ البتہ پارٹی میں نینا کے جو پوز دئے گئے ہیں، وہ غلط ہیں اور منظر کو کم تر بنا دیتے ہیں۔ صرف یہی ایک ایسا مقام ہے ورنہ عکاسی شروع سے آخر تک ایک معیار قائم رکھتی ہے۔

ہدایت کاری

رہی ہدایت کاری سو غور کرنے سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معمولی مسائل سے تعلق رکھنے والی کہانی میں جو اعلیٰ روح تناسب کام کر رہی ہے۔ اسکا کامل کریڈیٹ ایک رات کے ڈائرکٹر مسٹر ڈبلیو زیڈ احمد کو حاصل ہے، جو معمولی سے معمولی جزئیات کو اہمیت دیتے ہیں اور فنی طور پر جمالیات، اداکاری، تہذیب و تمدن، کلچر، نفسیات اور جملہ باتوں کے متعلق علم و وقوف رکھتے ہیں، یہی نہیں ان کو عالمِ تصویر میں نمایاں کر سکتے ہیں۔ ایک رات کا ڈائرکشن کسی طرح اعلیٰ تصویروں کی ہدایت کاری سے کم نہیں۔ انہیں بنیادوں پر شمالی ہند میں یہ تصویر اعلیٰ تصویروں کا سنڈیکا رڈ قائم کر رہی ہے۔

میں تو حیران رہ گیا جب حیدرآباد میں میرے ایک جاگیردار دوست نے کہا کہ چلو، ایک رات دیکھو، میں اسے آج چودھویں بار دیکھنے جا رہا ہوں۔ — ساغر

تصویر کدہ

ایک رات

(شالامار پکچرز کی پہلی تصویر)

نثر و نظم، تحریر و تقریر، محض اظہار کا فرض ادا کر سکتی ہے لیکن صدیوں کے بعد انسانی ذہن نے فلم جیسا ایک ایسا فن ایجاد کیا ہے جس میں اظہار کی قابلیتوں کے ساتھ ساتھ "ابلاغ" کی کامل اہلیت موجود ہے، فلم آرٹ، صناعت و ادب، اظہار و ابلاغ کا ایک ایسا نادر امتزاج ہے جسکی مثال انسانی تمدن و آرٹ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ابلاغ کی قطعی محسوس اور واضح قابلیتوں نے اس فن کو انسانی سماج کیلئے ایک ایسا ذریعہ قرار دیدیا ہے کہ لمحۂ پیدائش سے لیکر موت کی منزل تک جس قدر انسانی مسائل اور ضروریات ہیں ان سب کی تکمیل و ترویج، اصلاح و تبلیغ کے لئے اس ذریعہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔

یورپ و امریکہ، جرمنی و جاپان نے اس حقیقت کو سمجھا اور برتا، ہندوستان غلام ملک ہے، یہاں نہ کوئی حقیقی منصف حکومت ہے نہ قومی حکومت، اس لئے فلم انڈسٹری سے بھی وہ کام نہیں لیا جا سکتا جو تعمیر حیات میں دوسرے آزاد ملکوں میں لیا جاتا ہے۔

پھر بھی ہزار مجبوریوں کے عالم میں صنعتِ فلم نے ہندوستان میں جس قدر ترقی کے مدارج طے کئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اس ملک کو یورپ کے سے آزاد وسائل حاصل ہو جائیں اور اپنے ملک کی پیداوار اور نظم و نسق پر اختیار دیدیا جائے تو فلم انڈسٹری بہت جلد مرکزِ عروج تک پہنچ سکتی ہے۔

ابھی دس پندرہ سال بھی نہیں ہوئے کہ صنعتِ فلم الجھن کی گود میں ٹھٹک رہی تھی، مگر اب اس نے آرٹ کا ایک معتدل معیار قائم کر لیا ہے اور اس کی آغوش میں نوجوانی مسکرانے لگی ہے، گو اٹھان اور رفتار کی بڑی کمی ہے۔ تقلید اور مطابقت نے اس جوہر کو بہت دبا دیا ہے، ایک ہی قسم کی موسیقی، ایک قسم کی تجویز فنی، ایک ہی قسم کی زندگی اور ایک ہی قسم کی کلچری خصوصیات میں فلمی جہان الجھا ہوا ہے، مگر بعض گوشوں میں ترقی و تجدد، مستحسن اور معتدل تغیر کی کوششیں بھی کار فرما نظر آتی ہیں۔ انہیں کوششوں میں سے ایک ہلکی سی کوشش شالامار پکچرز بمبئی کی تازہ تصویر "ایک رات" بھی ہے۔

اس تصویر کا سماجی پس منظر کچھ دوسری تصویروں سے مختلف نہ سہی مگر پھر بھی زندگی کو بڑی حد تک قیاسی صورت میں پیش کیا گیا ہے، شاید اسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اسکے ہیرو، اور ہیروئین اور دوسرے اداکار، حقیقت سے بعید قریب ہو گئے ہیں۔

کہانی ایک رات کی کہانی اتنی سی ہے کہ نینا ایک ہندو امیر گھرانے کی لڑکی ہے، اس کی ماں مر چکی ہے۔ سوتیلی ماں زندہ ہے اور ایک بہن۔

نینا کی جوانی اپنی عمر کے غول سے اس طرح نمودار ہو رہی ہے جیسے صبح موجھ لیتی ہوئی جھیل پر کھلی ہوئی کنول کی کلی، سوتیلی بہن کی جوانی جنگلی دھتورے کے پھول کے مانند ہے، الھڑ اور اجڈ مگر اس کی ماں زندہ ہے اس لئے نینا بھر کا چین آرام اور نیک آرزوئیں اسی کے لئے ہیں۔ نینا کا باپ اسکی سوتیلی ماں کے دام میں الجھا ہوا ہے سوتیلی ماں نینا کے شگفتہ اور قدسی شباب کو دیکھ کر جلتی ہے۔

اس گھرانے کے پڑوس میں دوسرا گھرانا ہے

اس میں راجن ایک نوجوان رہتا ہے اور تنیا [illegible]
دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تنیا کی سوتیلی
ماں اس بھید کو تاڑ جاتی ہے حد سے زیادہ جلتی ہے
راجن اک فوجی ڈاکٹر، جمیل، وجیہ اور مہذب نوجوان ہے۔
تنیا کی سوتیلی ماں اپنی بیٹی سے اس کا بیاہ رچانا
چاہتی ہے۔ آخر وہ ایک دن تنیا کے بلوغ کی طرف
اشارہ کرکے اپنے شوہر کو راضی کر لیتی ہے اور
خود تنیا کے لئے بر تلاش کرنے کا وعدہ کرتی ہے
اور کر بھی لیتی ہے۔

چترلال ایک آوارہ شخص کے ذریعہ وہ ایک عیاش
و آوارہ راجہ کو تنیا کے ساتھ شادی کرنے کے لئے راضی کرتی
ہے اور راجہ اس لئے تیار ہو جاتا ہے کہ لڑکی خوبصورت
ہے اور لڑکی کے باپ کا روپیہ بھی۔

اسی دوران میں راجن کو اپنی ملازمت پر جانا
پڑتا ہے، اس کے جانے کے بعد تنیا کی شادی کے
انتظامات ہوتے ہیں۔ راجن چھٹی لے کر واپس آتا
ہے، تو اس سے تنیا کی سوتیلی ماں اپنی لڑکی کی
شادی کے بارے میں بات چیت کرنے کیلئے مکان پر
جاتی ہے۔ مگر راجن مسترد کر دیتا ہے۔ وہ تنیا کے
باپ سے مل کر بھی متنبہ کرتا ہے کہ وہ راجہ سے
تنیا کی شادی کرکے بہت بڑی غلطی کر رہا ہے، مگر
وہ اسکی ایک نہیں سنتا، راجہ سے بھی کہتا ہے مگر
وہ اور اسکا مصاحب چترلال بھی اس کا مذاق
اڑاتے ہیں۔

آخر وہ تنیا سے ملتا ہے اور کہتا ہے آؤ ہم تم
رات کو بھاگ چلیں۔ وہ جھجکتی ہے مگر پھر بھاگنے کا
فیصلہ کرتی ہے۔ وقت مقرر کرکے راجن اسکا انتظار
پائیں باغ میں کرتا ہے مگر معصوم تنیا کو اندازہ نہیں
ہوتا کہ اسکی ماں یہ سب کچھ سمجھ رہی ہے اور بھاگنے
کی ہر راہ بند کی جا چکی ہے۔ آخر راجن ناکام ہو کر
واپس چلا جاتا ہے۔ تنیا کی شادی زبردستی راجہ
کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔
تنیا کا ہونے والا شوہر - [illegible]

آوارہ اور دولت سے کھوٹے کی طرح کھیلنے والا [illegible]
شخص ہے۔ اسکی ایک داشتہ اسپر چھائی ہوئی ہے وہ
اسے یقین دلاتا ہے کہ یہ شادی میں نے محض روپیہ کیلئے
حاصل کی ہے۔ چترلال کو اپنی زر اندوزی سے کام ہے
وہ راجہ کی داشتہ، راجہ، اور تنیا ہر شخص کو بیوقوف بناتا ہے۔

شادی کے بعد راجہ کا جوش عیش پرستی اسے
ابھارتا ہے۔ وہ تنیا اپنی نئی بیوی سے ملنا چاہتا ہے،
داشتہ تعاقب کرتی ہے اور ملنا ناممکن بنا دیتی ہے
اسی طرح راجہ داشتہ سے بھی نفرت کرنے لگتا ہے اور چاہتا
ہے راہ سے اس کانٹے کو نکال دے۔ معصوم تنیا
راجہ کا کلچر اور طور طریق دیکھ کر حیران و نافر ہے۔ چترلال
راجہ کا مصاحب اُسے نئی راہوں پر ڈالتا ہے اور
طرح طرح راجہ سے جبر و تعدی کرا کے تنیا کے باپ سے
روپیہ اینٹھتا ہے۔

بالآخر ایک رات تنگ آکر راجہ کی داشتہ شراب
میں زہر ملا دیتی ہے، خود بھی مر جاتی ہے اور راجہ کو
بھی مار دیتی ہے اور اس واقعہ کے متعلق یادگار
میں اک تحریر چھوڑتی ہے۔

قمار خانہ میں نہ پہنچنے کی بنا پر چترلال راجہ کی کوٹھی
میں آتا ہے، مگر دونوں کو مُردہ پا کر حیران ہوتا ہے
تنیا بھی گھر پر نہیں ہے وہ اس سے پہلے تنگ آکر چلی
جاتی ہے۔ راجن اپنے گھر پر آ، اس سے نوکری
چھوڑ چکا ہے۔

بہر حال اس قتل کے الزام میں چترلال راجن کو
گرفتار کراتا ہے، مقدمہ ہوتا ہے۔ چترلال وہ تحریر
جو راجہ کی داشتہ چھوڑ کر مری تھی۔ ۲۰ ہزار میں تنیا کے
باپ کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔ تنیا راجن کی محبت
سے مغلوب ہو کر اسکی جان بچانے کی خاطر باپ سے
چاہتی ہے کہ روپیہ دیدے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ تنیا
اپنی ترکیب سے یہ تحریر چترلال سے چھین لیتی ہے۔ یہ تحریر
کورٹ میں پیش ہوتی ہے۔ جرح کے وقت راجہ کی
داشتہ کا شوہر نمودار ہو کر اسکی تصدیق کرتا ہے۔ بالآخر
راجن اور تنیا کی محبت کامران ہوتی ہے [illegible]

مقصد کہانی کی بُنیاد قطعی سماجی ہے، پس منظر میں سماج کے بیتی رواج سوتیلی ماں کا سلوک، ہندو سماج میں عورت کی بے وقعتی، دھن دے کر من خرید نے کی رسم' اور بے من تن سپرد کر دینے کا طریق، روایتی شان و شوکت، بے جان عزت کا تخیل اور راجہ سوسائٹی کی ذلیل و قابلِ نفرت فضا کے خلاف "ایک رات" نہایت نازک احتجاج ہے۔

اس تمام انبوہ کی جان یہ حقیقت ہے کہ تن کی خرید وفروخت ہو سکتی ہے من کی تسخیر ممکن نہیں، عورت کی نفرت و محبت اٹل ہے اور سچی محبت بالآخر کامیاب ہو کر رہتی ہے۔

نفسیاتی گہرائیاں کہانی کی بُنیاد سماجی مشکلات ہیں ہندو سماج میں عورت کی مجبور پوزیشن اور سوتیلی ماں کے گھر میں بن ماں کی بیٹی کی ہندوستان میں بدبختانہ بنتی ہے چنانچہ سوتیلی ماں راجن سے اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے مگر نیا اور راجن کا معاہدہ ابدی ہو چکا ہے، شادی کے بعد بھی وہ راجہ (شوہر) سے محبت نہیں کرتی بلکہ نفرت کرتی ہے اور راجن کو سمجھاتی ہے جو اسکی طرف سے غیر یقینی عہد شکنی کا وہم رکھتا ہے؛

رنگ محل کا حیران کن اور پُر شکوہ ماحول، اور اک بداعمال شخص کی معصیت کا جال، نیا کو بہک جانا چاہیے تھا، مگر محبت انسان کو کتنی قوت بخش دیتی ہے' اس کا اندازہ نیا کے کردار سے ہوتا ہے۔ اس تمام سماجی اور نفسیاتی اُلجھاؤ کو مسٹر احمد کے ڈائرکشن نے اپنی تمام بلند اور فنی خصوصیات کے ساتھ نہایت تناسب اور فطری انداز میں ظاہر کیا ہے۔

مکالمات نیا کی شخصیت اور اسکی اداکاری تمام تصویر پر ساون کی گھٹا کی طرح چھائی ہوئی ہے جس طرح ساون کی گھٹا انسانی نفسیات اور قوتِ احساس کو صرف اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ نیا کا کمال اداکاری دیکھنے والوں کو اپنی طرف ہی متوجہ رکھتا ہے ورنہ مکالمات بُرے نہیں' صلاح الدین احمد کے لکھے ہوئے ہیں؛ یہ ادبی دُنیا کے مدیر بھی ہیں اور خود اہلِ قلم ہیں، مکالمات میں کردار کے لحاظ سے بے ساختگی کے کیف و کم کو باقی رکھا گیا ہے اور جب کوئی کردار بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُسی کی زبان اور اُسی کا دل ہے۔

یہی وہ معیار ہے جسے مکالمات میں ہر مکالمہ نگار کو قائم رکھنا چاہئیے۔

گیت بھی بُرے نہیں، مگر کسی تصویر کے گیتوں کی خصوصیت میرے نزدیک یہ ہونی چاہئے کہ وہ اسکرین سے اُچھلیں اور گلیوں میں گونج جائیں، جذبات کی شدت ان گیتوں میں نہیں ہے۔ یہ شدت خود ایک رات کے نغمہ نگار پنڈت اندرجیت شرما میں بنیادی اور طبعی طور پر نہیں ہے۔ پھر بھی گیت ایک سطح رکھتے ہیں۔ اس تصویر کی تہذیب و تناسب کا اندازہ صرف ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی موڑ پر ہیرو مغنی کی حیثیت میں نمودار نہیں ہوتا۔ اگر احمد صاحب ایک آدھ بول پرتھوی راج صاحب سے گوا دیتے تو کم از کم یہ تاریخ تو بن جاتی کہ وہ بھی گنگنا لیتے ہیں!؟

خیر، مگر یہ حقیقت پرستی کا کمال ہے، کہ ایک رات کے ماہر ڈائرکٹر نے اس سمی عنصر سے اپنی تصویر کو پاک رکھا ہے۔ ایسی مثالیں صرف انگریزی تصویروں ہی میں ملتی ہیں؛

موسیقی ایس۔ کے پال۔ فنِ موسیقی' اور قدیم و جدید تقاضوں کے ماہر معلوم ہوتے ہیں؛ گو ایک رات کی موسیقی۔ نغموں' راگ' راگنیوں، اور شوخ آوازوں کا انبار نہیں ہے' پھر بھی نغموں میں شدت کی کچھ مقدار تو ہونی ہی چاہئے تھی، مگر جو کچھ ہے' وہ دلکش اور دلدوز ہے۔

پس منظر موسیقی کا جہاں تک تعلق ہے وہ نہایت دلنواز ہے تصویر میں رومانی اثر و فضا پیدا کرنا اصل میں پس منظر موسیقی کا کمال ہے۔ یہ ایک ماحول پیدا کرتی ہے اور انسانی روح کو غافل کر کے مسرت و توجہ کے اُس مرکز پر لے آتی ہے جو منظر کا اصل مرکز ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لحاظ سے ایس کے پال بیحد کامیاب ہوئے ہیں؛

ایک رات کی پس منظر موسیقی نے تمام تصویر کے رومانی حلقوں میں ایک تسلسل و تعلق پیدا کر دیا ہے' اور زندگی و سماج ایک رشتہ میں پروئی ہوئی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہیں۔

لباس میں راجن (فوجی ڈاکٹر) کے جسم پر فوجی وردی کے ساتھ تلوار کا پرتلہ لٹکا نا حیرت کی بات ہے۔ فوجی ڈاکٹر کچھ نہیں رکھتا، پھر یہ تعلقہ تو سہ ادویہ پاتے والے لڑاکا فوجی سپاہی کے لباس کا جزو ہے نہ کہ فوجی ڈاکٹر کا، نیتا کو ساری کے علاوہ زیادہ تر شلوار میں دکھانا سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ مکالموں کی زبان اور کل تصویر کے کلچر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پنجاب نہیں یو۔ پی کے کسی جگہ کی کہانی ہے۔ راجہ و مصاحب اور جملہ متعلقین کے جو لباس ہیں اُن سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ تصویر کا ماحول یو۔ پی کے [illegible]

رس ساگر

جس کے سرورق کا ڈزائن مشرق کے سب سے بڑے مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے بطور خاص کیا ہے

ہندوستانی ادب میں یہ پہلی کامیاب کوشش ہے جس کی بنیاد میں لسانی اتحاد، قومی ملاپ اور ہندوستان کی ایک لنگوا فرینکا وضع کرنے کے خیال کی طرف پورے وثوق کے ساتھ قدم اٹھایا گیا ہے۔ یہ کوئی ترجمہ نہیں بلکہ ساغر کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کی منتخب نظموں اور نئے کلام کو ناگری رسم الخط میں ایک مرتب مجموعہ کی حیثیت میں شائع کیا گیا ہے اور حواشی میں ان تمام الفاظ کے معنی آسان زبان میں دیدئے گئے ہیں جن کو ہندی جاننے والے آسانی سے نہیں سمجھتے۔

کتاب کے لئے خاص طور پر پیلا اینٹک پیپر ل سے بنوایا گیا ہے اور چھپائی ہندوستان ٹائمز پریس دہلی میں ہوئی ہے۔ سبز رنگ کپڑے کی مضبوط جلد ہے اور ڈسٹ کور سات رنگوں میں چھاپا گیا ہے۔

غرض کہ "رس ساگر" مجموعی طور پر اردو دنیا کی طرف سے ہندی سنسار کیلئے اعلیٰ اور حسین ترین تحفہ ہے آپ اپنے ہندی جاننے والے دوستوں کو نہایت فخر و مسرت کے ساتھ اس تحفہ کی نذر دے سکتے ہیں۔

ادبی مرکز پونا (صوبہ بمبئی)

Registered No. A





PUBLISHED BY :—


ایشیا

[illegible] آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

[illegible] سلطان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں ۔ ادبی حلقوں کے بہم اصرار اور تقاضوں سے
"ثروت آرا بیگم" شائع فرمادی ہے ۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں
[illegible] گئی ہے ۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصورات اور گندی ہوئی شہرت کی جھلک نہیں
[illegible] کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے ۔ اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص [illegible]
[illegible] نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے الگ امتیاز رکھتی ہے ۔ اس کا ہر جزو [illegible] سے [illegible] ایک
کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو ایک امتیازی حیثیت دے دی ہے ۔ [illegible]
[illegible] نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی ۔ لفظی [illegible] اور لہجے کی بے ساختگی ، سادگی
تمام عناصر ایسے گھلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ
[illegible] تہذیب اور تمدن رکھتی ہے ۔ اس کو پڑھ کر دلی کی مٹتی ہوئی تہذیب [illegible]
[illegible]

[illegible]

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ



ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبہ متحدہ

حکومت صوبۂ بہار اور حکومت صوبۂ سی۔ پی (برار)

زیر سرپرستی

ڈاکٹر سیّد محمود

ایڈیٹر ——— ساغر

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

جملہ حقوق محفوظ

(illegible)

قیمت سالانہ [illegible]

قیمت سالانہ [illegible]

فہرست مضامین الیشیائی سنہ ۱۹۴۲ء

نمبر صفحہ	مضمون نگار	مضمون	شمارہ
۲		فہرست	۱
۳	ادارہ	فاشیزم اور ادب	۲
	نئی صبح (ادبیات، تاریخ و سیاست)		
۱۱	جوش ملیح آبادی	مشاہیر شعرائے اردو کا فلسفۂ حیات میرا فلسفۂ حیات	۳
۱۴	ساغر	زندگی میری نظر میں	۴
	ضیاں اکبرآبادی	ناوک باتیاں	۵
۱۸	قاضی عبدالغفار	غیر جنبہ داری	۶
۲۰	ڈاکٹر تاراچند	اردو اور ہندی	۷
۲۵	سید محمد آصف علی	کیبرس مشن	۸
۲۷	عبدالسلام رامپوری	اسلام سے قبل کے بعض مشہور کتب خانے	۹
	دکھ سکھ (افسانے و ڈرامے)		
۳۷	علی اطہر	آیود الوف (ڈراما)	۱۰
۳۹	رام پرتاب بہادر ایم-اے	ندینہ (افسانہ)	۱۱

نمبر صفحہ	مضمون نگار	مضمون	شمارہ
۶۴	حسرت ترمذی بی-اے	محبت کی وادیاں	۱۲
	نیا راگ (نظم و غزل)		
۶۷	ساغر	سماج	۱۳
۷۰	"	انقلاب	۱۴
۷۱	"	آنکھیں	۱۵
		حرف آخر کا ایک ورق	۱۶
۷۳	جوش ملیح آبادی	حور کا احساس شباب	۱۷
	کسوٹی (نئی کتابیں اور رسالے)		
۷۷	ساغر	روح غالب	۱۸
۷۸		بحر الکاہل	۱۹

ایشیا

جلد ۷ | مئی سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۴

فاشیزم اور ادب

موجودہ زمانہ کی کشمکش — فرد اور سماج کے تنازعہ کی تفسیر ہے یہ کشمکش کسی نہ کسی شکل میں تاریخ کے ہر دور میں جاری تھی۔ فرد کی یہ تمنا کہ ہر ممکن طریقے سے اپنی خواہشات کی تکمیل کرے اور سماج کی یہ سعی کہ انفرادی جدوجہد کو جائز حدود تک محدود کر دے — ان دونوں نظریوں میں کھینچ تان کیونکر پیدا ہو، ہر مذہب اور فلسفہ کی بنیاد یہیں شروع ہوتی ہے بجائز حدود کا تعین کون کرےگا، یہ حکمراں طبقہ کا کام قرار پایا اور یہ کام حکومت کے آلہ سے لیا جانے لگا۔

فوج، پولیس، قانون — یہ سب فرد کو جائز حدود کے اندر رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

غرض یہ کشمکش بہت عرصہ تک جاری رہی۔ سماج کے نام حکمران طبقہ فرد پر طرح طرح کے بندھن لگاتا گیا ان میں سب سے بڑا بندھن روح کا تھا اور روح کا چوکیدار کلیسا تھا۔ کامیاب اور وسیع پیمانہ پر اس روحانی تجربہ کے خلاف یورپ میں تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کا نام نشاۃ ثانیہ (Renaissance) ہے۔

نشاۃ ثانیہ کا دور قدیم و جدید زمانے کے درمیان ایک سنگ راہ ہے۔ تاریخ میں پہلی بار بیچارے فرد کو کسی نہ کسی حد تک اپنی قسمت کے فیصلے کا حق ملا۔ گو یہ حق بہت محدود تھا تاہم وہ سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا جس پہ انقلاب فرانس کی عمارت کھڑی ہوئی۔

انقلاب فرانس سے لے کر گزشتہ جنگ عظیم کا دور [illegible]

کا دور کہا جا سکتا ہے — عملی طور پر نہیں تو نظریاتی طور پر امریکہ اور یورپ میں ہر طرف انسانیت پروری اور لبرلزم کی ہوائیں چلنے لگیں۔ سماجی جبر کے ردِ عمل کے طور پر اب سب کا عقیدہ یہ ہو چلا کہ اگر ہر فرد کو اپنی [illegible] اور مرضی کے مطابق زندہ رہنے دیا جائے تو ساری دنیا میں [illegible] ہو جائےگی۔ لیکن عملی طور پر یہ آزادی محض نام نہاد تھی۔ جب تک [illegible] کے اقتصادی ڈھانچہ میں استحصال کا عنصر موجود تھا سیاسی [illegible] خودمختاری کی بھلا کیا قیمت تھی۔ جب کسی کو تعلیم کی برکت میسر [illegible] وہ ووٹ کا پرچہ لے کر کیا کرے۔ اور خیر کلچر کوئی ایسی سستی شے [illegible] دن رات محنت کرنے والا مزدور اس سے فیض مند ہو سکے لیکن [illegible] یہ کہہ کر تکیہ کر لیا کہ اگر آپ امیر ہیں تو آپ کو اپنی امارت بڑھانے [illegible] ہے اور کوئی غریب تو اسے فاقہ کرنے کی آزادی ہے۔ اس [illegible] نے فرد اور سماج کی کشمکش کو اور بھی بھڑکایا۔ سماج کا شیرازہ [illegible] اور ہر شخص محسوس کرنے لگا کہ اس فرسودہ نظام کو بدل کر ایک [illegible] کی جائے جس میں آزادی اور پابندی کا تخیل فرد اور جماعت [illegible] بھلائی کا باعث ہو۔

مختصراً یہ ہے پس منظر اس جدوجہد کا جس [illegible] کی اشتراکیت اور درمیانی یورپ کے فاشیزم کو جنم دیا [illegible] مشترک [illegible] فرد کے حقوق پر جماعت کے مفاد کو ترجیح [illegible]

حکومت جماعت کی نگہبان ہے لہٰذا فرد حکومت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن دونوں نظاموں کے مقاصد میں مشرقین کا فرق ہے۔ سوویٹ نظام فرد پر جو پابندیاں لگاتا ہے اُن کا انداز اصلاحی ہے اور مقصد یہ ہے کہ فرد سرمایہ دارانہ ذہنیت کی کدورت کو دھو کر انفرادیت کی معراج کو پہونچ سکے۔ یہ ویسی ہی پابندی ہے جو طبیب بیمار پر لگایا کرتا ہے۔

لیکن فاشیزم فرد کو ہمیشہ کے لئے جماعت یعنی حکومت یعنی حکمراں طبقہ یعنی سرمایہ دار کا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور اس غرض سے اُس کے ذہن و احساس کو بھی فنا کر دینا چاہتا ہے۔

ہم کلچر اور ادب کے خادم ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جب یہ سارے سیٹھ ساہوکار مر جائیں گے تو مفلس شاعروں کے گیت اور نادار مصنفوں کے افسانے زندہ رہیں گے۔ اس لحاظ سے ہم صرف اس نظام کے حامی ہیں جو انفرادیت کو اس طرح فروغ دینا چاہتا ہے کہ وہ حسن و حقیقت دونوں کی خدمت کر سکے اور یہی شعر و ادب کی جان ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ فاشیزم ان سب اقدار کو یکسر مٹا دینا چاہتا ہے جن سے اعلیٰ قسم کا آرٹ پیدا ہوتا ہے۔ جب جرمنی کے قید خانوں سے دنیا کے بڑے بڑے آرٹسٹوں کی کراہ سنائی دیتی ہے۔ جب دنیا کے تمام پرانے اور نئے آرٹسٹ وہاں مردود قرار دئے جاتے ہیں — تو ہم نازیزم اور فاشیزم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اگر ہمارا قلم اس کارزار کے موقع پر ان لعنتوں کی مخالفت میں مصروف نہ ہو تو ہم کلچر اور آرٹ سے غداری کریں گے۔

یہ وہ جذبات تھے جنھیں لے کر ہم دہلی کی آل رائٹرس کانفرنس میں گئے۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے اینٹی فاسسٹ مصنفوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں۔ ان کا کوئی متحدہ محاذ قائم کریں۔ یہ کام کرنے کا تھا اور گو کہ یہ کانفرنس — کانفرنس کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نہ رہی بہرحال داغ بیل تو پڑ گئی۔ ہم خیال لوگوں میں جاگ تو پڑ گئی۔ اچھا ہوتا اگر کانفرنس کے منتظم جلدی نہ کرتے۔ لوگوں کو مہلت دیتے۔ بحث طلب مسائل کو گشتی چٹھی کی صورت میں تقسیم کرتے۔ لیکن کانفرنس کرنے میں اتنی جلدی کی گئی کہ باہر کے بہت لوگوں کو جواب دینے کا بھی موقع نہ ملا۔ علاوہ بریں اتنی اہم کانفرنس کی تشکیل نہایت باقاعدگی سے ہونا چاہئے تھی۔

بہر حال غنیمت ہے کہ ادیبوں نے کروٹ تو لی، کچھ تو ہوا۔

ہم کانفرنس کے منتظموں کو اب بھی یہ صائب مشورہ دیں گے کہ زیادہ وسیع النظری سے کام لیں۔ مقاصد کی بلندی کے اعتبار سے دل و نگاہ کو بھی بلند رکھا جائے تو کیا اچھا ہو۔ ایک تو یہ کہ کانفرنس کسی لحاظ سے نمائندہ نہ تھی باہر تو باہر خود دہلی کے بہت سے ہمدرد مصنف شامل نہ تھے۔ وجہ جو بھی ہو اس سے بحث نہیں۔ لیکن اگر آگے کام چلانا ہے تو کیا اُن کے تعاون کی ضرورت نہیں اگر ہے تو پھر ( ) کو صرف حاضرین سے یہی کیوں پر کر دیا گیا اور ان حاضرین میں صرف "انجمن ترقی پسند مصنفین" اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ہی حضرات کیوں تھے۔ یہ حلقہ زیادہ وسیع کیوں نہ کیا جائے؟

یہ چند نکات برادرانہ مشورہ کے بطور ہیں کسی کو ہماری نیک نیتی پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایشیا کسی لیبل کی تمنا کئے بغیر ترقی پسند تحریکوں کی حمایت اور فاشیزم کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے۔

ہماری خواہش صرف یہ ہے کہ کیونکہ مختلف زبانوں اور اسکولوں کے مصنفوں کے ملنے کے ٹھکانے کم ہیں اس لئے جب کبھی اس قسم کی کوئی تحریک شروع ہو تو اسے زندہ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

دنیا اور ہندوستان کی نجات اسی میں ہے کہ فاشیزم اور اس کے تمام عناصر فنا ہو جائیں۔ ہم سب کو اس جنگ میں حصہ لینا ہے، فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے اور نہ کوئی فصیل پر بیٹھ سکتا ہے۔

ادارہ

نئی صبح

پنڈت جواہر لال نہرو کی شہرۂ آفاق کتاب

جگ بیتی

دُنیا کی تاریخ سنین و سلاطین کی فہرست کا نام نہیں ہے نہ مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال اور تاج و تخت کے لئے زور آزمائی کرنے والوں کی باہمی کشمکش کو تاریخ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل تاریخ نام ہے افراد کے ذہنی ارتقار کا۔ جماعتی نظام کی تنظیم کا۔ تہذیب و تمدن کے اصولوں کی تدوین کا اور علوم و فنون کی ترویج کا۔ پھر تاریخ کا دائرہ کسی ایک ملک یا قوم کے حالات تک محدود نہیں ہوتا۔ اسکے پیش نظر تمام ممالک اور تمام اقوام ایک سلسلے میں منسلک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور متاثر کرتے ہیں۔

جگ بیتی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے انہی اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے اور تمام مختلف زمانوں میں تمام ممالک اور تمام اقوام کے خاکے پیش کر کے دُنیا کی ایک یکجائی تصویر کھینچی ہے۔ اس لئے ان کی یہ کتاب ہندوستان کے تاریخی ادب میں ایک جدت ہے ایک تنوع ہے جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔

سیاسی مصروفیتوں کے باوجود پنڈت جی کا وسیع مطالعہ اور غیر معمولی غور و فکر کی عادت اس کی متقاضی تھی کہ جگ بیتی جیسی تصنیف منظرِ عام پر آئے۔ چنانچہ ان خطوط کی شکل میں جو پنڈت جی نے جیل سے اپنی لڑکی کے نام لکھے۔ یہ کتاب اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچے گی۔ اب مکتبۂ جامعہ نے محمود علی خاں جامعی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرا کے پیش کرنے کا فخر حاصل کیا ہے۔ قیمت جلد اوّل ۱۲ ؍

مکتبۂ جامعہ دہلی ـ قرولباغ

شاخیں:۔ دہلی ـ لکھنؤ ـ بمبئی ۳

(ادبی مرکز میرٹھ سے بھی مل سکتی ہے)

(۱) جوش ملیح آبادی

(۲) ساغر نظامی

مشاہیر شعرائے اُردو کا فلسفہ حیات

ہو سکتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ملک کو مختلف قسم کی شکایتیں ہوں، لیکن کچھ عرصے سے اس نے اپنی تقریروں کے معیار کو کافی بلند کیا ہے، دلّی سے آج کل ادبی، علمی اور حکیمانہ مسائل پر جو تقریریں ہو رہی ہیں، وہ اپنی رنگا رنگی، افادیت، زبان اور ادب کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو دہلی نے جو.................................. اور اُردو کے مشاہیر شعراء کو دعوت دی کہ وہ دُنیا کو بتائیں، زندگی ان کی نظر میں کیا ہے؟ وہ حیات کے متعلق منفی نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں یا اثباتی! ؟ یا محض یونہی، چنانچہ اس سلسلے کی کچھ تقریریں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے جوش ملیح آبادی و ساغر نظامی کی تقریریں اس نمبر میں شائع کی جاتی ہیں۔

"ادارہ"

(۱) جوش ملیح آبادی

میرا فلسفہ حیات

یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ پندرہ منٹ کی سی بے حقیقت مدت کے اندر سمیٹا نہیں جا سکتا۔ بہر حال کوشش کرونگا کہ مجمل طور سے اپنے مفہوم پر کسی قدر روشنی ڈالوں۔

انسانی ذرائع اور انسانی ذہن دونوں ابتک اس درجہ تشنہ و محدود ہیں کہ بیسویں صدی کے اس نسبتاً ترقی یافتہ دور میں بھی زندگی ایک دردناک عذاب بنی ہوئی ہے۔ کیا داخلی اور کیا خارجی دونوں حیثیتوں سے انسان ابتک افسردہ و بیمار ہے۔ ہم مسرتوں کے حاصل کرنے کے واسطے دوڑتے ہیں۔ لیکن اس تمام دوڑ دھوپ اور عرق ریزی کے بعد آخر کار جس شے کے پانے میں ہمیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ وہ غم اور صرف غم ہے۔ امیدیں ہر صبح ہم کو جگاتی اور نا امیدیاں ہر رات کو ہمیں سُلاتی ہیں۔

تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سلاتی ہے   نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی
لڑکپن صَرفِ بازی تھا جوانی دل کو روتی ہے   نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی

ہماری اس ناکامی و نامرادی کا سبب ایک طرف تو جیسا میں بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے ذرائع اور ذہن دونوں ابتک محدود ہیں۔ اور دوسری طرف چونکہ ہم ابتک انسانیت کے صحیح [illegible] کرنے کے خوگر نہیں ہوئے [illegible]

ہماری نظر محدود ہے۔ اس لئے ہمیں اس زندگی میں دُکھ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاید اپنے انفرادی حاجات و مقتضیات سے ہم کبھی آزاد نہیں ہو سکینگے لیکن انسانی نفسیات پر نظر رکھنے والے اس خیال کے قائم کرنے میں قطعی حق بجانب ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد ہماری انفرادیت اس قدر وسیع ہو جائے گی کہ عالمِ انسانیت کے مجموعی تقاضے عین ہمارے انفرادی تقاضے بن جائینگے ۔

لیکن اس وقت تک تو انسانی دُنیا کی حالت نہایت خستہ و خراب ہے اور اس وقت ہماری زبوں حالیاں اور بھی شدید ہو جاتی ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے غموں ہی کا تال غم نہیں ہوتا۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا۔ تو شاید ہم کچھ نہ کچھ اپنے کو تسلّی دے لیتے۔ لیکن بڑی بے پایاں درد مندی تو یہ ہے کہ ہماری مسرتوں کی تان بھی غم ہی پر ٹوٹتی ہے۔ اور ہماری وقتی مسرت جس قدر شیریں ہوتی ہے اس کا پیدا کردہ غم اتنا ہی دیرپا اور تلخ ہوا کرتا ہے ۔

ہمیں کبھی کبھی یہ زندگی تھوڑی دیر کے واسطے فرشِ گل پر چلنے کا موقع دیتی ہے ۔ اور وہ صرف اس لئے کہ ہمیں فرشِ گل کا خوگر بنانے کے بعد کانٹوں پر چلائے۔ اور اس وقت ایک طرف تو کانٹوں کی تکلیف ہمیں زیادہ محسوس ہو اور دوسری طرف پھولوں کی یاد میں ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ یعنی ایک طرف تو ہمارا جسم فگار ہو اور دوسری طرف ہمارے دل کے ٹکڑے اُڑ جائیں ۔

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کیلئے
طالبانِ عیش سے کہدوں تو اُڑ جائیں حواس کس قدر رو یا ہوں میں اک مسکرانے کیلئے

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ابتک تو اس زندگی میں اگر کوئی ٹھوس حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ غم اور صرف غم ہے۔ رباعی کہتے ہو کہ مُنہ آنسوؤں سے تر نہ کروں غم ٹھوس حقیقت ہے یہ باور نہیں کروں۔ بیکار ہے ہائے ہائے کرنا لیکن۔ انسان ہوں ہائے ہائے کیوں نہ کروں۔ بیشک اس وقت تک انسانیت پر مسرت کا صحیفہ نازل نہیں ہوا ہے۔ اور اب تک جس شے کو مسرت کہا جاتا ہے وہ صرف ایک وقفۂ غم کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب ہم پر غم کا ناقابلِ برداشت حملہ رُک جاتا ہے تو اس وقفۂ مختصر کو ہم خوشی کے نام سے پکارنے لگتے ہیں حالانکہ وہ صرف ایک گونہ تسکین اور ایک وقتی رستگاری ہوتی ہے۔ جسے خوشی کا لقب نہیں دیا جاسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اس دردناک حقیقت کا جو افراد مطالعہ کرتے ہیں وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو حیات کی اس درد مندی کو دیکھ کر سپر انداختہ ہو جاتا ہے۔ مایوسی اس کا احاطہ کرلیتی ہے۔ اسکے ہات پاؤں ڈھیلے دل زخمی اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور یہی وہ گروہ ہے جسے ہم قنوطی کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور دوسرا گروہ ان درد مندیوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن سپر انداختہ نہیں ہوتا۔ ہر چند یہ گروہ بھی سمجھتا یہی ہے کہ ہم اس درد مندی پر فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ اس سے مغلوب ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔ اور اپنے کو فریبِ مسرت میں مبتلا کر دینے کی خاطر ایسے رنگین مشاغل میں خود کو غرق کر دیتا ہے۔ کہ ضرباتِ غم سے نسبتاً بہت کچھ محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس گروہ کو ہم رجائی کے نام سے پکارتے ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ رجائیوں کے مقابلہ میں قنوطی گھاٹے میں رہتا ہے۔ رجائی اس دو روزہ حیات کے کچھ نہ کچھ مزے تو اُڑا لیتا ہے۔ لیکن بیچارے قنوطی کے پلّے کچھ نہیں پڑتا ۔

لیکن جہاں تک زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کا تعلق ہے قنوطی ہوں کہ رجائی دونوں گروہ اس شرفِ عظیم اور اس سعادتِ کبریٰ سے قطعی محروم رہتے ہیں ۔

میں نے زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کو سعادتِ کبریٰ کہا ہے ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ آپ جسے سعادتِ کبریٰ کہتے ہیں سعادتِ کبریٰ تو بڑی چیز ہے۔ میں اُسے ایک مہمل خود آرائی سے زیادہ کوئی مرتبہ نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ زندگی جبکہ آلام سے بھری ہوئی ہے۔ جبکہ غم ہی کی نہیں خوشی کی تان بھی غم ہی پر ٹوٹتی ہے اور جبکہ ہر عمل کا خواہ وہ کتنا ہی شائستہ کیوں نہ ہو۔ ایک دردناک ردِّ عمل ہوا کرتا ہے۔ تو کیا ہم اتنے دیوانے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں حصہ لیکر اپنا وقت برباد اور اپنی قوّت کو تباہ کریں۔ اور کیا یہ عاقلانہ روش نہیں ہے کہ یا تو ایک آہ سرد بھر کر ہم زندگی سے مایوس ہو جائیں یا ساز اُٹھا کر اس طرح الاپیں کہ تمام غموں کو بھول جائیں ۔

لیکن جو شخص بھی خواہ وہ کتنی وجاہت رکھتا ہو۔ ایسے کم بینی کے کلمات زبان سے نکالے گا۔ ہم بجا طور سے اُسکے متعلق یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جائینگے کہ وہ دُنیا کے مزاج، انسانی فطرت اور انسانی عزائم کی وسعت اور ارتقاء

کے قانون سے قطعی طور پر بیگانہ ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تک انسانیت دردمند ہے اور ہم مسرّت کے حصول کی جد وجہد میں بالآخر غم ہی سے دوچار ہو رہے ہیں لیکن اسکے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ صورتِ حال اٹل اور ابدی ہے اور ایسی کہ اس سے رُستگاری حاصل کی ہی نہیں جا سکتی ہے ۔

غور کرنا چاہئے کہ اس کرۂ خاکی پر حیات کو رونما ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور اس منزل پر ہم غموں کو کیونکر فتح کر سکتے ہیں جب کہ انسانیت ہنوز طفلی کے عالم میں ہے اور اُس کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہیں ہے ۔

لیکن یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ روز بروز ہم غم سے دور اور خوشی سے قریب ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہماری یہ فطری اور مسلسل رفتار اس بات کا یقین کرنے پر ہمیں مجبور کرتی ہے ۔ کہ ایک نہ ایک دن ہم تمام مکروہات و آلام سے نجات حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ مسرّت کی زندگی بسر کرینگے ۔ اور یہ مسرّت کی زندگی ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں حالتوں کا احاطہ کرے گی ۔

یہ وہ منزل ہوگی جبکہ ایک طرف تو ہمارے مزاج اور عادات و اطوار بدل جائینگے اور اشیائے مادّی و ذہنی کی معروف قدریں تبدیل ہو جائینگی ۔ اور دوسری طرف اس عالم کے تمام قوائے کارفرما کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر انہیں ہم اشاروں پر نچانے لگیں گے ۔

اور جبکہ ہمارا مستقبل اس قدر شاندار اور یقینی طور سے شاندار ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم انسانیت کی اس جنگِ عظیم اور ارتقاء کے اس جہادِ اکبر سے بزدلوں کی طرح بھاگ کر کسی گوشۂ خلوت یا محفلِ عشرت میں جا کر چھپ جائیں ۔

اس کے علاوہ جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آج جو یہ مادّی و ذہنی نعمتیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ہمیں حاصل ہیں وہ تمام کی تمام ہمارے بزرگوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہیں ۔ جنہیں وہ ہمارے واسطے ایک مبارک وراثت کے طور پر چھوڑ گئے ہیں اور اسکے صاف و صریح یہ معنی ہیں کہ ہم اپنے خاموشی کے ساتھ احسان کرنیوالے بزرگوں کے مقروض ہیں ۔ اور اسقدر کہ ہمارا بال بال قرض سے گندھا ہوا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ ہر اچھے شہری اور ہر بھلے آدمی کا یہ ایک شریفانہ کارنامہ ہے کہ وہ اپنا قرض پائی پائی ادا کر دے ۔ اور وہ قرض صرف اس واحد شکل سے ادا کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے ہمیں آگے بڑھایا ہے اسی طرح ہم بھی اپنی آئندہ نسلوں کو کچھ آگے بڑھا کر مریں ——

اور اگر ہم اس مقدّس فریضے کے ادا کرنے میں کوتاہی کرینگے تو ہماری موت ایک بد دیانت مقروض کی موت ہوگی ۔ اور کیا کوئی شریف اور خوددار انسان ایک بد دیانت مقروض کی موت کا ننگ گوارا کر سکتا ہے ؟ ۔۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک ہوا ہی کیا ہے ۔ ابھی تو ہمیں بہت کچھ کرنا ہے ۔ ابھی تک تو ہم اپنے چھوٹے چھوٹے غموں اور معمولی عناصر یہاں تک کہ خاک کے ایک بظاہر حقیر ذرّے تک پر قبضہ نہیں کر سکے ہیں ۔ حالانکہ ہمارا پروگرام بہت ہی بڑا اور نہایت ہی پیچیدہ ہے ۔ ہمیں ہر فرد کو اسکی اطلاع دے دینا چاہئے ۔ کہ ابھی ہمیں بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں ۔ بڑے بڑے ہفت خواں طے کرنا ہیں ۔ صدیوں اور قرنوں تک پسینہ بہانا اور جانیں کھپانا ہے ۔ جھوٹے رسم و رواج سے لڑنا ہے ۔ عقائد و اوہام کو مٹانا ہے ۔ تندرست خیالات اور بلند افکار کی تخم ریزی کرنا ہے ۔ دہشت انگیز جنگوں اور خون ریزیوں کا سدّباب کرنا ہے ۔ بیماریوں اور وباؤں کو فنا کر کے شباب کو قائم کرنا ہے ۔ اور شباب کو قائم کر کے ہیبت ناک موت کو موت کے گھاٹ اُتارنا ہے اور پھر اُلوہیت کے تاج کو پیشانی پر کج کر کے اس سرکش ستارے اور دوسرے کُروں پر اپنا پرچم لہرانا ہے ۔

ممکن ہے ، اور ہندوستان میں تو ممکن ہی نہیں ۔ گمان غالب ہے کہ لوگ میرے ان بلند عزائم اور درخشاں امیدوں پر مسکرائیں اور ارشاد فرمائیں کہ یہ شاعر تو شیخ چلی کی سی باتیں کرنے لگا ہے ۔ کہاں ضعیف انسان اور کہاں تسخیرِ کون و مکاں ۔ میں ایسے تمام حضرات کی خدمت میں صرف اسی قدر مشورہ دونگا کہ وہ براہِ معارف نوازی ۔ اپنے مطالعے اور مشاہدے کو بڑھائیں ۔ نظر کو وسیع اور تفکر کو عمیق بنائیں ۔ انسان کی فطرت اور انسان کے عزائم تیز ارتقاء کی رفتار اور زمانے کے قرائن و آثار پر نگاہ ڈالیں ۔ اگر وہ میرے مشورے پر عمل کرینگے ۔ سو فی صدی میرے ہم خیال و ہم نوا ہو جائینگے ۔ ورنہ میرے پاس ان کے تمسخر و تبسم کے مرض کا کوئی علاج نہیں ہے ۔

ہاں تو ہمارے سامنے اس قدر وسیع اور اسکے ساتھ ساتھ اس قدر پیچیدہ

ہم ہے کہ ہم نہ تو تتلیوں کی طرح رونے میں وقت ضائع کر سکتے ہیں اور نہ رجائیوں کی مانند ہر وقت کے رامش و رنگ ہی کیلئے وقت نکال سکتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں رو ہوں سے کے بین بین زندگی بسر کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ابھی ہمیں بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں۔ لیکن اس حکیمانہ نکتے کو بھی پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ہمیں اپنے کو اس قدر تھکانا بھی نہیں ہے کہ چار دن کام کرنے کے بعد ہمارے قوائے عمل و ذہن اور ہماری صحت برباد ہو جائے۔ ہمیں بیشک کام کرنا اور ایک جاں باز سپاہی کی طرح پوری کاوش اور سرگرمی سے کام کرنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر روز چند گھنٹے رجائیوں کی سی زندگی بھی بسر کرنا ہے۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ہر صبح کو ہم تازہ ہمت اور بلند تر ولولوں کے ساتھ دن کی محنت کے واسطے تیار ہو جائیں۔ کام کرنا مستعدی اور سنجیدگی سے انسانیت کو آگے بڑھانا۔ کوئی شک نہیں ہمارا تنہا فریضہ ہے لیکن ہر وقت کام کرنا اور ہر آن سنجیدہ رہنا اپنی ذات کے ساتھ ایک خطرناک مسخرگی ہے۔ اس لئے ہمیں زیادہ کام کر سکنے کی خاطر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم اپنی ذات کے ساتھ خطرناک قسم کا مسخراپن نہیں کرینگے۔ دن کے وقت ہم ایڑی چوٹی کا پسینہ بہائینگے۔ اور رات کو جب تاریکیوں کے دامن دراز ہو جائینگے اور ستاروں کی خنک روشنی ہمارا احاطہ کر لیگی تو ہم بچوں کی طرح خوشیاں منائیں اور فراغت و مسرت کے دریا بہائینگے۔ اقبال

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

پر عمل کر کے اس شریر ستارے کو جسے کرۂ ارض کہتے ہیں۔ اپنے قدموں پہ جھکا کر نعرہ لگائینگے۔ کہ ؎

میں اور ڈروں صولتِ دنیائے دنی سے
خود لرزہ بر اندام ہے دنیا مرے آگے

دن کو اگر کوئی ہم سے رنگ رلیوں کی باتیں کریگا تو ہم اسے انسانیت کا دشمن یا کم سے کم جاہل سمجھ کر اس کی طرف سے منہ پھیر لینگے لیکن اگر رات کو کوئی ہم سے محنت یا سنجیدگی کا مطالبہ کریگا تو اسکی کم بینی اور خفتِ عقل پہ قہقہے مارینگے ؎

آپ آرائش بھی کرتے ہیں مناسب وقت کی
دن کو منہ دھویا گیا زلفیں سنواریں رات کو

ساغر نظامی (۲)

زندگی میری نظر میں

زندگی اور میں اچانک صبح سے پہلے بیدار ہو گئے۔ مجھے اور اسے ابھی دن چڑھے تک سونا تھا۔ مگر کچی نیند میں ہم دونوں ان کم سن خانہ بدوشوں کی طرح جاگنے کیلئے مجبور ہو گئے جن کی حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی۔ کون رہرو ہے اور کون رہبر یہ بھی ہوش نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وجود کے مبہم دھندلکے میں چست و چالاک دو سایہ کائنات کے بام و در پہ چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

امید اور ناامیدی۔ روشنی اور تاریکی۔ خیر و شر۔ دھوپ اور چاندنی۔ کفر و ایمان۔ ہار اور جیت۔ یعنی ہر وہ منزل جو انسان لاکھوں سہارے لیکر طے کرتا ہے۔ میں نے براہِ راست زندگی کے سہارے طے کی۔ دنیا کے طویل سفر میں زندگی ہی میرا سفر تھی۔ اور زندگی ہی ہمسفر رہزنی اور رہبری۔ آبادی و بربادی کے جتنے تجربے تھے زندگی ہی ان کا معمول تھی۔ اور زندگی ہی ان کی عامل۔

ہمارے علم کی تمام تر اساس تجربات پر مبنی ہے۔ آپ کو اصرار ہے تو ہو۔ میرے خیال میں فطری تصورات۔ تجربات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے اس لئے جتنے اصول اور کلیے ہیں وہ تمام تر تجربات کی پیداوار ہیں۔ میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں زندگی اندھیری رات ہے اور تجربہ نورِ سحر۔ ذہن تاریک کو ٹھہری ہے اور مشاہدات و تجربات شعاع نور۔

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۲ء

مشاہدے اور تجربے سے پہلے انسانی ذہن ہر قسم کے نقوش اور
تصوّرات سے اسی طرح محروم ہوتا ہے جس طرح بیج ڈالنے سے پہلے بنجر زمین
کچھ محرکات انسان کے احساس و شعور پر خارج سے پڑتے ہیں اور اپنا اثر چھوڑ
جاتے ہیں۔ دوسرے وہ تصوّرات ہیں جو ذہنی افعال کے نتیجوں کی صورت
میں مترتب ہوتے ہیں۔ اصل میں وہ محرکات بھی جو ہمارے احساس خیال پر
اثر ڈالتے ہیں ہمارے تصوّرات ہی کا عکس ہیں۔

جس وقت میں نے آنکھ کھولی۔ زندگی اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔
تہذیب و تمدن۔ قدیم و جدید نظریے۔ اصول اور فلسفے علوم و فنون ترقی
اور تکمیل کا بڑا حصّہ زندگی کو مل چکا تھا۔ غرضیکہ کائنات سجی سجائی۔ ہزاروں
سال کی روائتوں کی امانت لیے منتظر تھی۔ میں دُنیا کے غم سے واقف تھا
نہ مسرت سے۔ ناکامی کو جانتا تھا نہ کامیابی کو۔ عشق کو پہچانتا تھا نہ ہوس
کو۔ جنگ کو سمجھ سکتا تھا نہ صلح کو۔ ہار سے واقف تھا نہ جیت سے۔ زندگی
کے کارزار میں میرا داخلہ اس غیر مسلح نوجوان کی طرح ہوا جو میدانِ جنگ میں
کسی ریلے کے ساتھ اتفاقیہ داخل ہو جائے۔

میدانِ جنگ کی پہلی ضرورت نہ شاعری ہے نہ حکمت۔ نہ بیم ہے
نہ رجا۔ یاس ہے نہ اُمید۔ نہ زندگی کا تاریک رُخ ہے نہ روشن پہلو۔ اسکی
پہلی اور آخری ضرورت صرف اپنا بچاؤ ہے اور اپنا بچاؤ والہانہ خود اعتمادی
کے بغیر ممکن نہیں۔ ٹکراؤ کی جنون انگیز قوّت۔ تصادم کی بے پناہ طاقت۔
یہی وہ جوہر جو خودی کے روپ میں انسانی فطرت کی رہنمائی کرتے ہیں۔

زندگی میں سب سے پہلے مجھے اپنے انہیں اچھوتے تصوّرات
سے واسطہ پڑا۔ خاص کر مقابلے اور تصادم کی رَو سے۔ یہ رَو "مشیّت"
کے مقابلے میں مجبور سہی۔ مگر زندگی کا پہلا اور آخری بھید ہے۔ مقابلے کی
بڑھتی ہوئی قوّت۔ پنپنے کی مچلتی ہوئی آرزو۔ اور آگے بڑھنے کی سیلابی
خواہش۔ انسان کو فریب۔ جوش اور جنون میں اُلجھا دیتی ہے۔ مجھ پر بھی
اس نے اپنا جال پھینکا۔ اور مدتوں پھسلاتی رہی "تو سب سے بلند ہے
تو کامل آزاد ہے" مجھے بلندی کا یقین ہو گیا۔ میں نے خود کو آزاد جان لیا۔
یہ احساسات شباب پر تھے۔ سُرمیلے تصوّرات دل سے دور لے رہتے رہے
افسردگی اور حواس کا سامنا ہے۔ کبھی کبھی غمگین جذبات دل میں جاگتے۔
مگر یہ "ناامیدی" انسانی زندگی کے جسم کا گھن۔ یہ گھن مجھے کبھی نہیں لگا۔
جب یہ ناگن میری طرف بڑھی۔ خودی کے نامحسوس جذبہ نے اس کا
سر کچل دیا۔

میں ایک ایسا جہاز تھا جو ساحل سے لنگر اُٹھاتے ہی طوفان
میں گھر جائے۔ ابر و باد کی یورش میں ملاح بڑے بڑے نظریوں اور فلسفوں
پر غور نہیں کرتے۔ مقابلہ کی قوّت کو استوار کرتے ہیں۔ جاتے ہوئے حوصلوں
کو مضبوط بناتے ہیں۔ زندگی اور موت سے بلند ہو کر وہ اس مقصد کیلئے
اپنی ہستی سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔ جس مقصد کو لے کر وہ ساحل سے
روانہ ہوئے تھے۔

یہی ہے زندگی کا وہ محور جس پر زندگی کے چلنے اور رُک جانے
کا دارومدار ہے۔ یہ محور جو امید اور مقصد کی بُنیاد پر زندگی کو گردش دیتا
ہے دائروں کو بڑھاتا چلا گیا۔ آس پر یاس خندہ زن ہوئی۔ مقصد کے
سامنے نتیجوں کی آرزو نے ہاتھ پھیلائے۔ ناکامیوں نے کامیابیوں کا راستہ
گھیرا۔ نئے واسطے ہوئے اور انوکھے رابطے۔ لیکن کامیابی اور ناکامی
مقصد سے افضل ہیں۔

خود یہ اُلجھ کے رہ گئی میرے جنوں کے دام میں
میرا جنوں نہ دب سکا گردشِ روزگار سے

مجھے "اندھی مشیّت" کا علم نہیں تھا۔ "زندگی" اندھی مشیّت کی
انجانی حرکت ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ مگر آدم کی مجبور و معذور نسل کے لئے
جو نسخہ المانوی حکیم شوپنہار نے تجویز کیا تھا۔ وہ میری گھٹی میں گُھلا ہوا تھا
یعنی اپنے انفرادی ارادوں کو مٹا کر مشیّت کو ہرانے کی کوشش میں
کیوں جان گنواتا۔ میں کائنات اور انسان کے حُسن پر مٹنے کیلئے کسی حکیم کا محتاج
نہیں تھا۔ میں تو حُسن کے ابھرتے ہوئے سمندر ہی میں پیدا ہوا۔ مجھے کیف خود اپنے
میکدہ سے ملا۔ دُکھ سُکھ کی قیدوں سے آزاد اک سرور۔ کامیابی و ناکامی۔
رنج و راحت۔ ہار جیت۔ مجھے ان سپنوں کو یاد رکھنے کا ہوش ہی کب تھا کیونکہ
میرے جینے کے لئے یہ فریب کافی تھا۔ "میں سب کچھ ہوں" اور "سب کچھ
کر سکتا ہوں" لیکن زندگی اپنے محور پر اور تیزی سے گھومی۔ نقاب چہرے سے
گرنے لگے۔ مسکراتی ہوئی تازہ و شاداب لڑکی کا ٹھٹھرا ہوا پنجر بن گیا۔
مشاہدہ کی یہ منزل۔ نئی منزل تھی۔ مضبوط اور عکسِ حواس کے کھلے ہوئے تلخ
حقیقتوں نے اپنی گرگی باہیں ڈالدیں۔ دُکھ سُکھ کی سچّی قدریں معلوم ہوئیں

پہلی مرتبہ زندگی میں تلخی اور کمزوری کا احساس ہوا۔ انسانی روح کی بے بسی اور نفسیاتی مجبوری سوئیاں چبھونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے ایک تاریک و دبیز دیوار آکھڑی ہوئی۔ پہلی بار تمام تر جسمانی و روحانی قوتیں جی چھوڑتی ہوئی دکھائی دیں۔ زندگی مصیبتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ نظر آنے لگی۔ احساس وخیال آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ شاید یہ سچ بھی ہے کہ دُنیا کی تعمیر ہی اس انداز سے ہوئی ہے۔ ہر انسان اپنی تمام آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ناکامی اٹل ہے تو دُکھ بھی اٹل ہے۔

زندگی بھی اصول و قوانین کی ایک معین حد تک پابند ہے لیکن نفسیاتی و اخلاقی خاص کر معاشی و سیاسی ضابطوں اور قاعدوں کی مقید نہیں کسی ارادے و قصد کے بغیر ناکامی و کامیابی اور دُکھ سُکھ کی آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ اس پر انسانی فکر و ارادہ کا ذرا قابو نہیں۔ بہ ایں حال کچھ بھی ہو پھر بھی یہ مجال کس کو ہے کہ مسرت کا تنہا مدعی بن بیٹھے۔ مسرت کی تمناؤں سے کھیلنا ہرگز دانشمندی نہیں۔ حیات کی پہلی اور آخری تمنا خوشی سہی۔ مگر خوشی ہے کیا؟ محض ایک موج۔ صرف ایک حرکت۔ فقط ایک مسلسل مطالبہ۔

اور "الم"۔ الم مسرت کے مقابلہ میں ذی مقدار بھی ہے اور پائدار بھی۔ مسرت کی تھاہ ہے مگر غم کی تھاہ نہیں۔ لامحدود شے محدود سے بہرحال افضل ہے۔ مگر ان جذبوں کا مرکز خود "انسان" ہے انسان الم اور مسرت دونوں سے افضل ہے۔ رنج اور خوشی محض دو مرحلے ہیں اور ان سے گزر جانا ہی آدمی کی بڑائی ہے ؎

غم بھی کوئی منزل ہے رہِ عشق و جنوں میں
آلام کے مواج سمندر سے گزر جا

وہ انسان جسے مقصد کا جنوں نہیں۔ زندگی سے نہیں جیت سکتا ایسے انسان کا سینہ مشرق کی مانند ہے۔ جہاں ہر گھڑی اک نئے طلوع اور جدید آغاز کی بھیڑ رہتی ہے۔

غم کے تبسم نے زندگی میں نئی شگفت پیدا کی۔ انانیت کی سیمابی روح ایک سانچے میں ڈھلنے لگی۔ کامیابی اور فتح کی نئی تعبیریں ہونے لگیں۔ سربند شراب شیشے سے اُبلنے لگی۔ ماحول اور قدرت کے جبر نے انفرادی ارادوں کو اجتماعی شکل بخشی۔ شعور نے سنبھالا لیا۔ مگر ذہن لاشعور اندر ہی اندر گریز و فرار کی خواہش تڑپنے لگی۔

گریز و فرار کی یہ خواہش کبھی آنسو بنی۔ کبھی تبسم۔ کبھی ترک و رہبانیت کا احساس بنکر ساکت ہوئی۔ کبھی تخریب کا سرکش شعلہ بن کر لپکی کبھی کامل نیکی کی شکل میں نمودار ہوئی۔ کبھی مکمل شر کی صورت میں۔ مرحلہ سخت تھا۔ مگر ہر وہ انسان جسے کوئی لگن ہو۔ اس مرحلے سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔

بیرونی محرکات اور میرے تصورات نے گھُل مل کر ایک نیا سانچہ بنایا۔ اور میں اس سانچے میں ڈھل کر رہ گیا۔ تیاگ اور رہبانیت روحانیت کے نام پر زندگی سے گریز ہے۔ کھُلی ہوئی ہار۔ وجود کے ہنگامے اور مشیت کے آہنی پنجے سے ابدی نجات حاصل کرنے کے لئے رندانہ محویت محض فرار ہے۔ اس گریز اور فرار کی داستان اور بھی سنگین ہو جاتی ہے جب ہم اس کے اجتماعی ردِّ عمل پر غور کرتے ہیں۔

ایسے تمام فلسفے جو اس قسم کے مسئلوں کے مقابلے میں انسانی زندگی کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ میرے نزدیک دُنیا کے لئے مہلک اور انسانی ترقی میں سدّ راہ ہیں۔

انسانی زندگی دو پاٹوں کے درمیان دبی ہے۔ ایک پاٹ مشیت ہے۔ ایک پاٹ انسانی سماج۔ چکّی میں پڑے ہوئے دانوں پر اوپری پاٹ کا دباؤ نچلے پاٹ کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ مگر زندگی وہ چکّی ہے جس کے دونوں پاٹ برابر کا دباؤ رکھتے ہیں۔ یہ نظام جس میں انسان نے اپنی جنس کو پیس رکھا ہے۔ ابھی تک اجتماعی تصوّر سے عاری ہے۔ ابھی تک یہ عوام کے لئے جہنم ہے محض مشیت پر جبر کا الزام انسانی سماج کے ناقص اور غیر منصفانہ نظام سے چشم پوشی کرنا ہے۔ مشیت نے حسن کو محدود نہیں کیا تخلیق کو نہیں روکا۔ ارتقا پر بندشیں نہیں کیں۔ مگر انسان نے اپنی جنس پر مسرت راحت اور آزادی کا ہر دروازہ بند رکھا۔ انسان کے تمام ارادی اعمال و افعال کی اساس انفرادی و اجتماعی مسرت کا حاصل کرنا ہے۔ ہر ایک کی کوشش ہے، سُکھ ملے۔ زندگی کو سجائے۔ سنوارے۔ تمام انسانی تاریخ مسرت و راحت کے حصول کی ناکام کوشش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ مگر یہ اتھاہ سلسلہ آدم کے خونخوار بیٹوں نے انتہائی خود غرضی کے ساتھ جاری رکھا۔ کسی نے کامل طور پر زندگی اور اسکی

مسرتوں کو برابر بانٹنے کا نظام پیدا نہیں کیا ۔

زندگی جہنم تھی - اور ہے - یہ جہنم آج بھی فردوس بن سکتا ہے لیکن پرانی دنیا کو ڈھا دینے کے بعد - جو ایک مجموعی سماج بنانے سے قاصر رہی ۔

دکھ، شکوہ اور محض جبر و اختیار کے جنجال میں انسانی ذہن کو مقید کرکے جو بزرگ زندگی سے گریز کی تعلیم دیتے رہے - وہ انسانی ترقی اور حیات کی پرواز کے دشمن تھے - اگر یہ دنیا لاکھوں قیامتوں اور تباہیوں کے بعد بھی چلتی رہی ہے - تو ہو سکتا ہے کچھ اور چلتی رہے - شاید آنیوالا ارتقا کوئی ایسا نظام ریاست پیدا کردے جو زمین کی مصیبتوں کو ختم کرکے انسان کو سماجی و اقتصادی مسرتوں کی دولت بخش دے - عمریں مختصر ہو جائیں اور مسرتیں طویل - پُر آلام زندگی کے مقابلے میں مسرت کی ایک گھڑی ابدی زندگی سے کم نہیں ۔

پھر بھی میرے نزدیک مسرت و الم جبر و اختیار اور اس قسم کے حکیمانہ مسائل سے افضل - انسانی زندگی اور اس کی تہذیب و تکمیل ہے - ارتقا کی معجز نمائی کا فریضہ ہے - شاید ایک ایسا سماج بن سکے - جس میں امیر و غریب برابر کا آرام حاصل کر لیں - بھوک کی الجھنیں ختم ہوں - انسان انسانیت کے لئے زندہ رہیں اور انسانیت کے لئے قربان ہوں ۔

میں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک نورانی مستقبل کا تصور رکھتا ہوں - ظاہر ہے یہ زندگی کا منفی پہلو نہیں اثباتی ہے - سوچئے تو تیاگ اور رہبانیت نے انسانوں کو ہزاروں سال غلام رکھا - رندی و سرشاری نے نسلیں برباد کر دیں - شرمیلے اور سجیلے تصورات نے توازن کو مفلوج کر دیا شاعرانہ محویت اگر محض ظالم مشیت کے ہاتھوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ہے - تو میرے نزدیک وقت کی تباہی ہے - ہاں اگر یہ انسانی زندگی میں تہذیبی مساوات اور انصاف پیدا کرنے کے کام آئے جس کا نتیجہ انسانی نشاط و راحت ہو - تو دنیا کی تمام عبادتوں سے بڑھ کر ہے - شاید یہی جوہر شاعری کا حاصل ہے - اور یہی زندگی کی حکمت ۔

نیساں اکبر آبادی

نازک بیانیاں

جلوۂ حسن وہ دکھاتے ہیں — نقش حیرت بنائے جاتے ہیں

پھول تو پھول ان کے ہنسنے پر — آج کانٹے بھی مسکراتے ہیں

ہم انہیں دیکھتے ہیں پیش نظر — یا فریب نگاہ کھاتے ہیں

بیخودی میری بڑھتی جاتی ہے — جس قدر آپ یاد آتے ہیں

سوچتے ہیں کریں گے اُن سے گلہ — جب وہ ملتے ہیں بھول جاتے ہیں

آپ سمجھے بھی یا نہیں اب تک — اشک خوں داستاں سناتے ہیں

آرزوئیں ہماری ختم ہوئیں — اک سکون دل میں آج پاتے ہیں

ضبط غم مری بات رکھ لینا — آج وہ مجھ کو آزماتے ہیں

یہ ہمارا ہی کام ہے نیساں
درد میں بھی جو مسکراتے ہیں

قاضی عبدالغفار

غیر جنبہ داری

۱۹۱۴ء کی جنگ تک بلکہ اُسکے بعد بھی کچھ عرصہ تک "غیر جنبہ داری" ایک ایسی سیاسی اصطلاح تھی جس کے مفہوم کو عوام اور اخبار پڑھنے والے لوگ تھوڑا بہت سمجھ لیتے تھے۔ لیکن جرمن آمریت کے ارتقاء نے اس لفظ کی معنوی اہمیت کو اس قدر مسخ کر دیا کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اُنیسویں صدی میں جب یورپین دول کی سامراجی سیاست نے ساری دُنیا میں جدید سیاسی تصوّرات پیدا کرنے شروع کئے تو اُس کے ساتھ جنگ اور صلح کے جدید بین الاقوامی قواعد و ضوابط میں ملکوں کے ایک ایسی سیاسی حیثیت کا بھی تعین کیا گیا جو بطور ایک اصطلاح کے "غیر جنبہ داری" کہلائی۔ اس تصوّر کو اختیار کرنے کیلئے اُس کا اعلان ضروری سمجھا گیا اور بین الاقوامی قانون میں اُسکی تعریف بھی مقرر کر دی گئی اور بعض ایسی شرائط کا بھی تعین کر دیا گیا جو "غیر جنبہ دار" حکومت پر عاید ہوتی تھیں۔

حکومتوں نے اس بین الاقوامی اصول کی تفصیلات کو مقامی قواعد و ضوابط کے تحت اپنے اپنے دستور العمل میں معین کر لیا۔ امریکہ نے ۱۸۱۸ء میں اپنے لئے ایک "قانون غیر جنبہ داری" مرتب کر لیا۔ اور ۱۸۷۰ء میں برطانیہ نے بھی اسی قسم کا ایک قانون بنا کر اپنے کو اُس کا پابند کر لیا۔ دوسرے ممالک نے بھی ان دو قوانین کی تقلید کی اور بین الاقوامی سیاست میں یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ غیر جنبہ دار حکومت وہ ہے جو کسی جنگ میں نہ تو فریقین میں سے کسی کا ساتھ دے اور نہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کسی فریق کو امورِ جنگ میں امداد حاصل ہوتی ہو۔ ۱۹۲۴ء تک غیر جنبہ داری کے یہ تصوّرات باقی رہے اور جنگ عظیم کے بعد بھی مجلسِ اقوام کے قوانین میں ان تصوّرات کو زیادہ مؤثر صورت میں قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔

لیکن نازیوں اور فاشیوں نے جنگ کے تمام قدیم نظریات کو بدل دیا اور اُن ہی کے ساتھ صلح اور امن اور غیر جنبہ داری کے تمام قدیم نظریات بھی بدلنے لگے۔ محوری نظریات کے تحت جنگ کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ ہر قسم کی غیر جنبہ داری اُس کی زد میں آگئی۔ قدیم زمانہ میں جنگ شروع کرنے کے لئے اعلانِ جنگ ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن محوری "فوجیت" نے اعلانِ جنگ کے بغیر ہی حملے کرنے شروع کر دئے اس لئے اعلان غیر جنبہ داری بھی بیکار ہو گیا۔ جس طرح اصول جنگ کی تمام اخلاقی حدود شکست ہو گئیں اسی طرح اور لازماً غیر جنبہ داری کے اخلاقیات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ جنگ کسی بین الاقوامی قانون کی پابند رہی ہے اور نہ غیر جنبہ داری کا کوئی اصول باقی رہا ہے۔

اس وقت تمام یورپ میں بلکہ دُنیا کے (۳/۴) حصہ میں اگر کسی ملک کو غیر جنبہ دار کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف سوئزرلینڈ ہے لیکن اُسکی غیر جنبہ داری ایک مسلح جنبہ داری ہے یعنی وہ اپنی غیر جنبہ داری کی حفاظت کرنے کے لئے اپنی فوجی قوّت کو تیار رکھتا ہے۔ پھر بھی باوجود اسکے کہ تمام دول نے ایک بین الاقوامی معاہدہ کے تحت ۱۶۴۸ء میں سوئزرلینڈ کی دوامی غیر جنبہ داری کو تسلیم کر لیا تھا اور ۱۸۱۵ء کی ویانا کانفرنس میں اس معاہدہ کی مزید توثیق بھی کی گئی تھی لیکن یورپ میں واقعات کی جو رفتار ہے اُس کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ غیر جنبہ داری کسی دشمن کے حملے سے کے دن محفوظ رہ سکے گی۔ وہ زمانہ گزر گیا جب ۱۸۷۱ء میں فرانس کی بھاگی ہوئی ۸۰ ہزار فوج کے اسلحہ جو ملک میں گھس آئی تھی سوئزرلینڈ نے اپنی غیر جنبہ داری کی بنا پر رکھوا لئے تھے اور اُنکو نظر بند کر دیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجلس اقوام نے اپنی بین الاقوامی فوجی پولیس کے گزر جانے کے لئے سوئزرلینڈ سے راستہ مانگا تھا تب بھی [illegible] نے

اس درخواست کو منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لیکن آج جبکہ محور کے فلسفۂ جنگ نے تمام بین الاقوامی قوانین اور جنگ کے اخلاقی اصولوں کو ٹھکرا دیا ہے اور ہر غیر جنبہ دار ملک کا یہ حال ہے کہ اُس میں ہزارہا جرمن فوجی سیاحوں کے بھیس میں پھیلے ہوئے ہیں۔ غیر جنبہ داری کی قیمت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔

بہرحال یورپ میں مسلحہ "غیر جنبہ داری" کی صرف ایک مثال ہے۔ لیکن وہ بھی

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

غیر جنبہ داری کی ایک اور وسیع تر اصطلاح دوستانہ غیر جنبہ داری ہے اس غیر جنبہ داری کا رجحان کسی ایک فریق یا دونوں فریقین کی طرف ہو سکتا ہے ۱۹۳۶ء کی جنگ کے بعد اس دوستانہ غیر جنبہ داری کی پہلی مثال وہ تھی جب کہ اسپین کی خانہ جنگی میں اٹلی اور جرمنی نے کوئی فوجی مداخلت تو نہیں کی لیکن جنرل فرانکو کو ہر قسم کی اخلاقی اور مادّی امداد دیتے رہے۔ محور کی کتاب کا یہی ورق اب امریکہ نے اُڑا لیا ہے اور "دوستانہ غیر جنبہ داری" کی تمام منطقی انتہاؤں تک اب امریکہ جمہوریتوں کی امداد کر رہا ہے۔

اس قسم کی غیر جنبہ داری کی حدود اب اس قدر وسیع ہو چکی ہیں کہ میدانِ جنگ میں فوج بھیجنے کے علاوہ ہر قسم کی عملی ہمدردی اور امداد غیر جنبہ داری کے منافی نہیں سمجھی جاتی۔ یہ نتیجہ بھی براہ راست ہٹلر کے اس طرزِ عمل کا ہے اُس نے جنگ کے اخلاقیات کے تمام حدود کو توڑ دیا۔ درحقیقت اب اس قسم کی غیر جنبہ داری ایک مشروط غیر جنبہ داری ہے بین الاقوامی قوانین کے اکثر ماہرین اس قسم کی غیر جنبہ داری کو قانوناً ناقص سمجھتے ہیں لیکن خود بین الاقوامی قوانین کی تمام بنیادیں اس درجہ مسمار ہو چکی ہیں کہ اب اُس کو کسی عمل کے جواز و عدم جواز کا معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ ہیگ کنونشن نے اس قسم کی جنبہ داری کو ناقص قرار دیا تھا اور ایسے غیر جنبہ دار کا شرکاءِ جنگ میں شمار کیا جانا جائز قرار دیا تھا۔

لیکن قانون کی انتہائی تباہی کا نام ہی جنگ ہے اور ۱۹۴۱ء سے آج تک ہم دیکھ رہے ہیں کہ "قوت" کا فلسفہ روز بروز تمام قوانین اور اصولوں پر بالادست ہوتا جا رہا ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں یونان عرصہ تک غیر جنبہ دار رہا لیکن اُس نے اپنے علاقہ میں اتحادی فوجوں کے داخل ہونے کی اجازت دیدی تھی۔ خود اٹلی اور جرمنی کے تعلقات اُس جنگ میں بہت عرصہ تک اصطلاحاً ایک دوسرے کے مقابلہ میں غیر جنبہ داری اور صلح جوئی کا اعلان کرتے ہے۔ کچھ دن تک مشرق بعید کے ایک گوشہ میں وہی صورت پیدا رہی یعنی جاپان بظاہر غیر جنبہ دار رہا لیکن بباطن شریکِ جنگ تھا اور دوسرے محوری شرکاءِ جنگ کی مصلحتوں کا پابند۔ (بالآخر اب وہ لڑنے والوں میں سے ایک ہے)۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

اگر بین الاقوامی اخلاقیات اور قوانین و روایات کو گزشتہ ۲۰ سال میں محوری طاقتوں نے اس قدر برباد نہ کیا ہوتا تو یہ دوستانہ یا غیر مشروط جنبہ داری کی اصطلاح پیدا ہی نہ ہوتی۔



ڈاکٹر تاراچند

اُردو اور ہندی

(ڈاکٹر تاراچند صاحب نے پروفیسر امرناتھ جھا کے چند اعتراضات کا جواب انگریزی اخبار لیڈر (الہ آباد) کے نام ایک خط میں دیا ہے یہ خط ایک مستقل مضمون ہے جس میں اُردو ہندی اور ہندستانی کے موجودہ مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ہم ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ (ادارہ)

سہروسنگھ (مظفر پور) کے ایک جلسے میں پنڈت امرناتھ جھا نے جو تقریر کی تھی اسکے کچھ ٹکڑے لیڈر مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے تھے جن سے ہندوستان کی قومی زبان کے سوال پر انکے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے اخبار میں ان باتوں کے لئے بھی کچھ جگہ نکال سکیں گے جو ان خیالات سے مختلف ہیں جو مظفر پور میں ظاہر کئے گئے تاکہ مسئلے کے تمام پہلو لوگوں کے سامنے آجائیں۔ میں اس تقریر میں پیش کئے ہوئے دلائل پر سلسلہ وار بحث کرونگا۔

پروفیسر جھا کہتے ہیں کہ "صرف ہندی ہی ہندوستان کی قومی زبان ہوسکتی ہے اور یہ رتبہ صرف اسی کو مل سکتا ہے کیونکہ یہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ اس کو فیضان اسی ملک سے ملتا ہے، ملک کے تمدن و تہذیب کی حامل ہے اور ملک کی بڑی بڑی زبانوں سے اس کا میل ہے" —— اس بیان میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ ہندی سنسکرت سے نکلی ہے؛ یہ بیان دونوں طرح سے غلط ہے اس لئے کہ اس میں جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ ہندی —— یعنی وہ جدید ہندی جس کو آج کل کے بہت سے ہندی شاعر استعمال کرتے ہیں —— جس کو بقول پروفیسر امرناتھ جھا، ہندوستان کی قومی زبان ہونی چاہئے —— ہرگز سنسکرت سے نہیں نکلی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ ہندوستانی قومی زبانوں میں سے کوئی زبان بھی سنسکرت سے مشتق نہیں ہے کیونکہ سنسکرت ایک معین ادبی زبان ہے جس کو زبان کی قواعد بنانے والوں نے اس کی کبھی اجازت ہی نہ دی کہ وہ بڑھے اور پھیلے اور اس سے نئی نئی شاخیں نکلیں۔ انڈو آرین لسانیات کی کسی کتاب کو بھی پڑھ کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ہندی دراصل سورسینی پراکرت کی اپ بھرنشا سے نکلی ہے اور یہ بولی مدھیہ دیس میں کئی صدیوں سے بولی جاتی ہے۔ سورسینی پراکرت خود ان پُرانی انڈو آرین بولیوں کی پیداوار ہے جو بدھ کے زمانے سے قبل شمالی ہندوستان میں بولی جاتی تھیں۔ پُرانی انڈو آرین پراکرت میں کئی بولیاں شامل تھیں جن میں سے ایک کو ادبی ضرورتوں کیلئے استعمال کیا جانے لگا۔ سب سے پہلی ادبی صورت چھندوں میں پائی جاتی ہے جو ویدوں میں استعمال کئے گئے۔ بعد کو ایک بولی نے ادبی حیثیت اختیار کر لی اور اسکو سنسکرت کہا جانے لگا۔ پانینی اور دوسرے قواعد دانوں نے اسکی قواعد بنائی اور اس نے ایک ایسی جامد صورت اختیار کر لی کہ اس میں پھیلنے اور بڑھنے کی قوت باقی نہ رہی۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ ہندی سنسکرت سے نکلی ہے، بالکل غلط ہے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ اُردو ان انڈو آرین زبانوں سے نہیں نکلی ہے جن سے ہندی نکلی ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان اسی اپ بھرنشا، اسی پُرانی سورسینی پراکرت کی پیداوار ہے جس پر جدید ہندی کی بُنیاد ہے گویا جہاں تک ابتدا کا سوال ہے دونوں زبانوں کی بُنیاد ایک ہی ہے اور دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے برتری کا دعویٰ نہیں کرسکتی اب رہا یہ کہنا کہ ہندی کو فیضان اسی ملک میں ملا اور ملک کی تہذیب و تمدن کی وہ آئینہ دار ہے اور اُردو کو یہ حیثیت حاصل نہیں —— تو یہ بیان یک طرفہ اور مبالغہ آمیز ہے۔ یاد رہے کہ اُردو ہندوستان سے باہر کسی ملک کی زبان نہیں جو ہندوستانی باہر جاکر آباد ہوگئے ہیں وہی اُردو بولتے ہیں اور انہوں نے البتہ اپنے نئے ہموطنوں کو اُردو سکھا دی ہے ورنہ اُردو ہندوستان کیلئے ویسی ہی "دیسی" اور "ملکی" ہے جیسی کہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی یا تامل! اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستانیوں ہی کے ہاتھوں اسکی پرورش ہوئی جن میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں۔ اسکی بُنیادی ساخت اور اسکا صوتیاتی اور صوریاتی نظام ہندوستانی ہے اور اسکی بالائی ساخت میں تو ہندی سے کہیں زیادہ فراخدلی پائی جاتی ہے کیونکہ اسکے ذخیرے میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے تہذیبی ماحول میں استعمال ہوتے رہے ہیں ہندی کے مقابلے میں اُردو کی بُنیاد کہیں زیادہ وسیع ہے اور اسکے مقابلے میں اُردو کا مشرب زیادہ آزاد اور فراخ ہے اور یہ سب اس لئے کہ اُردو نے دونوں فرقوں کے تمدن سے فیضان حاصل

کیا ہے اور دونوں کی روایات پر حاوی ہے۔

لوگ اُردو کے متعلق کچھ کہتے وقت (عموماً یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوانی زندگی کا شاید ہی کوئی رُخ اور پہلو ایسا ہو جسے اُردو زبان میں نہ پیش کیا گیا ہو۔ اُردو میں اُپنشدوں کے ترجمے موجود ہیں۔ بھاگوت گیتا کا ترجمہ ہو چکا ہے، اسمرتیوں رامائین، مہابھارت اور بہت سے پُرانوں کے ترجمے بھی اُردو میں مل سکتے ہیں۔ ہندو مذہبیات اور فلسفۂ مذہب پر اُردو میں بڑی بڑی تصنیفیں موجود ہیں جن میں ہندو دیومالا، ہندوؤں کی عبادتوں اور جاتراؤں وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ہندو آرٹ اور خصوصاً موسیقی پر کثرت سے اُردو کتابیں موجود ہیں۔ سنسکرت کے بہت سے ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں اُردو ادب میں جگہ پا چکی ہیں۔ ہندوؤں کے علوم ریاضی، ہیئت و کیمیا وغیرہ کے تذکرے اُردو کتابوں میں ہیں۔ اور یہ سب کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک بہت سے ہندو اُردو کو خاص اپنی زبان مانتے تھے۔ ہندو شعراء اور نثر لکھنے والے اُردو کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے تھے اور شمالی ہند کے بہتیرے پڑھے لکھے ہندو نہ صرف معلومات بڑھانے کی خاطر بلکہ ذوقِ سلیم کے تقاضے سے اُردو کتابیں پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں البتہ ہندو لوگ احیائی اور فرقہ وارانہ تحریکوں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ اُردو کو چھوڑ رہے ہیں۔ ایسی کتابوں کی مانگ کم ہو گئی ہے اور کتابوں کے تاجروں کو اس قسم کی کتابیں شائع کرنے میں نفع نظر نہیں آتا اسکے باوجود اگر گورنمنٹ گزٹ پر نظر ڈالی جائے جو صوبجاتی حکومتوں کی طرف سے شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ ایسی کتابیں اب بھی شائع ضرور ہوتی ہیں۔

اُردو نے ہندوؤں کی خدمت کی اور ان کی ضروریات پوری کیں اور ساتھ ہی ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کی ضروریات کو زیادہ تر پورا کیا۔ جہاں تک تخلیقی ادب کا تعلق ہے اُردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر فخر ہے۔ بے شمار ہندو اہلِ قلم نے ——— شاہجہاں کے زمانے کے ولی رام ولی سے لیکر اب تک اُردو کو اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مسلمان تذکرہ نویسوں کی کوتاہ بینی کی بدولت ان کا اعتراف پورا پورا نہ ہو سکا مگر اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہندوؤں کی زیادہ تعداد اُردو کی طرف نہیں آئی تو اس میں کچھ خطا خود مسلمانوں کی بھی ہے۔ بہت سے مسلمان شاعروں نے ہندو اساتذہ کے قدموں کے پاس بیٹھ کے پڑھنا لکھنا سیکھا مگر خبطِ برتری پھر بھی نہ گیا اور اسی وجہ سے بہت سے اپنے (ہندو) اساتذہ کی خودداری مجروح ہوتی رہی

ادبی شہرت کے متمنی تھے۔ اور پھر اب تو احیائی اور فرقہ وارانہ تحریکوں کا زہر دونوں کی رگوں میں ایسا سرایت کر گیا ہے کہ دونوں کے مناقشات اور زیادہ بڑھ گئے۔ مسلمان اگرچہ قرونِ وسطیٰ میں سیاسی قوت کے اجارہ دار تھے مگر انہوں نے برج بھاشا، اودھی اور دوسری دیسی زبانیں سیکھنا ہرگز کسرِ شان نہ سمجھا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ان زبانوں کے ایسے ایسے شاعر پیدا کئے جن کے نام اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک یہ زبانیں سیکھی اور پڑھی جاتی رہیں گی مگر حالیہ دور میں وہ اپنے ہموطن ہندوؤں کے تمدن کا مطالعہ کرنے کا رجحان برابر کم کرتے چلے جاتے ہیں۔

بہرحال اور کچھ بھی ہو مگر یہ الزام کہ اُردو ادب میں باہر کی بوباس زیادہ ہے، محض مبالغہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سا اُردو ادب مسلمان فرقے کی روایات سے رنگا ہوا ہے لیکن مسلمان فرقہ بھی تو ہندوستانی ہے اور یہ تو فطری بات ہے کہ اسکے افراد جو ادب پیش کرینگے اس میں کسی حد تک انکی آرزوؤں، اُن کے خیالات اور ان کی روایات کا ذکر ضرور ہوگا۔ ایسا نہ ہونا غیر فطری تھا۔ ہندوستان کے وہ فرقے جو ایسے مذہبوں کے پیرو ہیں جن کی ابتدا ہندوستان سے باہر ہوئی یعنی پارسی، عیسائی اور مسلمان ——— ان کو محض اس ایک وجہ کی بناپر اجنبی یا پردیسی نہیں خیال کیا جا سکتا کہ ان کے مذہب دیسی نہیں ہیں۔ جو لوگ اسکے خلاف رائے رکھتے ہیں وہ دراصل ہندوستان کو تقسیم کرنے والی اسکیموں کی تائید کرتے ہیں۔

پھر یہ کہ جو لوگ اُردو ادب سے پوری طرح واقف ہیں اور ان کی معلومات ادھوری نہیں ہیں ان کو معلوم ہے کہ اجنبی یا بدیسی ہونے کا یہ الزام کتنا ظالمانہ اور غلط ہے۔ دکن کے اُردو شعراء کا کلام پڑھیے۔ خصوصاً ان کی مثنویاں اور مرثیے سودا اور میر کا کلام پڑھیے۔ ان کی مثنویاں، قصیدے اور مرثیے پڑھیے یا میر حسن کی مثنوی سحر البیان یا دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم اور میر انیس کے مرثیے یا نظیر اکبرآبادی کی نظمیں۔ یا حال کے شعراء خصوصاً آزاد، حالی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی، چکبست اور بہت سے موجودہ شعراء کی بڑی بڑی نظمیں پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اردو ادب کے ماحول کو بیگانہ یا بدیسی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی جگہوں پر جہاں [illegible] نام اور مقامات بدیسی ہیں جیسے کہ مرثیوں میں، وہاں بھی جذبات خیالات [illegible] کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے بالکل ہندوستانی ہے۔

اب اگر نثر پر نظر ڈالی جائے جیسے نذیر احمد کی اخلاقی ناولیں [illegible] شاہکار خصوصاً آزاد یا پریم چند کے افسانے اور کہانیاں، تو پڑھنے [illegible]

کہ اردو ادب میں ہندوستانی زندگی کی نمائندگی نہیں ہے یا اُردو ادب ہندوستان کے مختلف تمدنی ماحول کو پیش کرنے سے عاری ہے۔ پھر جب شیکسپیر کے ڈرامے، ہیملٹ۔ جولیس سیزر۔ اینٹونی اینڈ کلیو پیٹرا، مرچنٹ آف وینس، رومیو اینڈ جولیٹ، اوتھیلو، ٹرائلس اینڈ کریسیڈا اور ٹائمن آف ایتھنز نیز ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ اور سیمپسن ایگونسٹس، بائرن کی نظم پرزنر آف شلان، اسکاٹ کی ناولیں۔ کونٹن ڈر وارڈ اور ٹیلیسمین، لٹن کی ناول رنزی، جارج ایلیٹ کی ناول رمولا نیز وہ بہت سے ترجمے جو عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، لاطینی، پرتگالی، جرمن، روسی اور چینی زبانوں سے انگریزی میں کئے گئے انگریزی ادب کیلئے بدیسی نہیں خیال کئے جاتے تو ان ترجموں پر جو عربی یا فارسی زبانوں سے اُردو میں کئے گئے ہیں یہ الزام کیوں عاید کیا جاتا ہے کہ ان میں بدیسی پن ہے۔ انگریزی ادب میں یونانی، رومی اور یہودی روایات اور تاریخی واقعات اور تاریخی اور اصنامی ہستیوں کے بیشمار اشارے اور تلمیحیں ہیں لیکن اسکے باوجود انگریزی ادب کے کٹر سے کٹر شیدائیوں نے بھی کبھی ان تلمیحوں یا اشاروں کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ پھر یہ کون سی سمجھ ہے کہ اگر ہندوستانیوں کا ایک طبقہ کہ جس کی مذہبی نسبتیں ہندوستان کے حدود تک محدود نہیں ہیں۔ ہندوستان سے باہر کی تلمیحیں استعمال کرتا ہے تو اُردو کو اسکے لئے موردِ الزام قرار دیا جائے۔

یہ کہا گیا ہے کہ "ہندی کو ہندوستان کی تمام بڑی بڑی زبانوں سے نسلی تعلق ہے۔" میں اس بحث کو زیادہ طول نہ دونگا۔ لیکن یہ بیان ظاہر ہے بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ پھر دراوڑی زبانوں کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ کیا اُردو کا پنجابی سے ویسا ہی تعلق نہیں جیسا ہندی کا پنجابی سے ہے؟

ہندی پر اُردو کو ترجیح دینے کیلئے پروفیسر جھا نے جو دلیلیں پیش کی تھیں ان پر بحث کرنے کے بعد اب میں "ہندوستانی" پر ان کی رائے زنی سے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستانی" کو بُرا بھلا کہنے میں ان کو خاص لطف آتا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے "ہندوستانی" کو دوغلا جانور (Hybrid Monster) کہا تھا۔ اب وہ اس کو ایک "مضحکہ خیز زبان" کہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ان کے ذہن میں ہے کیا۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ دُنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جو مخلوط نہ ہو۔ انگریزی زبان نے تو نہایت بے باکی کے ساتھ دُنیا کی تقریباً ہر زبان سے استفادہ کیا ہے، اس طرح "دوغلوں" کی فہرست میں انگریزی کا نام تو سب سے پہلے آنا چاہئیے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا سنسکرت خالص زبان ہے۔ اگر ایسا ہے تو اُن دراوڑی اور منڈا الفاظ کے متعلق کیا کہا جائے جو ایک بڑی تعداد میں سنسکرت میں داخل ہو چکے ہیں۔ ویبر نے تو سنسکرت ادب کی تاریخ میں بتایا ہے کہ ہیئت کی بہت سی عربی اصطلاحیں سنسکرت کی ان کتابوں میں ہیں جو ہندوستانی ہیئت کی خاص کتابیں کہلائی جاتی ہیں۔ کیا اُردو مخلوط زبان نہیں ہے جس میں افعال تو انڈو آرین ہیں اور اسم فارسی! اور ہندی کیا ہے ـــــ کیا تلسی داس، بہاری لال، کیشو اور دوسروں نے عربی اور فارسی لفظ نہیں استعمال کئے ہیں اور کیا نئی ہندی میں انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ دراوڑی، منڈا اور چینی زبان کے لفظ استعمال نہیں کئے جاتے ہیں۔ دکھنی اُردو پر غور کیا جائے جو تقریباً چار سو برس تک ادبی زبان بنی رہی اور اسکے پڑھنے لکھنے والوں نے پراکرت اور فارسی لفظوں کے میل جول کو کبھی مضحکہ خیز نہیں سمجھا۔ یہ سب بالکل ویسا ہی ہے کہ بعض لوگوں کو پیاز کا شوق ہوتا ہے اور بعض کو لہسن کا۔ اور بعض لوگ پیاز اور لہسن کے آمیزے کو پسند کرتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو جو پیاز کے شائق ہوں یہ حق ہو سکتا ہے کہ ان کو بُرا بھلا کہیں جو لہسن اور پیاز کے آمیزے کو پسند کرتے ہیں۔

پروفیسر جھا کو یہ یقین نہ کر لینا چاہئے کہ ملک میں اس سنسکرت ملی ہندی کے ہمدرد بہت ہیں۔ اُن صوبوں میں جہاں اُردو یا ہندی مادری زبان کی طرح نہیں بولی جاتی ہیں۔ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سارے ہندوستان کیلئے ایک لنگوا فرانکا ہو۔ ان کو یقین ہے کہ اُس زبان کی کوئی شکل جو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں بولی جاتی ہے یہ مقصد پورا کر سکے گی۔ لیکن ان کو یہ یقین نہیں ہے کہ کون سی شکل اختیار کی جائے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر ایس کے چٹرجی مشہور ماہر لسانیات نے "ایک ایسی ہندی یا ہندوستانی کے رواج کے لئے کوشش کی تھی جو تمام نحوی مشکلوں مثلاً افعال کی تذکیر و تانیث وغیرہ سے بری ہو۔ مسٹر ستیانراین نے جو جنوبی ہند میں ہندی پرچار کے بہت پُرجوش حامی اور نہ تھکنے والے کارکن ہیں ہندی پرچار سماچار میں جو دکھشنی بھارت ہندی پرچار سبھا کا خاص اخبار ہے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے جو ہندی کو سنسکرت لفظوں سے بھر دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ لکھا ہے اور ان کو متنبہ کیا ہے کہ

"اگر ہم کو ایک ایسی ہی زبان قبول کرنا ہے جو سنسکرت سے بھری ہوئی ہو یا جس میں بڑا حصہ سنسکرت کا ہو تو ہمیں شمال کی زبانوں ہی پر نظر جمانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ

بنگال، مہاراشٹر اور دکن وغیرہ کی زبانیں ایسی غریب نہیں کہ
اس لین دین میں ان کا دیوالہ نکل جائے (سنسکرت ملانے کی)
اس دلیل میں اتنا فائدہ نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے بلکہ
اسکے برعکس نقصان کا زیادہ امکان ہے"

کچھ روز ہوئے جب ان صوبوں کے باشندوں نے جہاں ہندی نہیں
بولی جاتی یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندی میں کچھ ادل بدل کیا جائے تو ڈاکٹر دھریندر
ورما نے اس مطالبے پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان بننے کی عزت کے
خیال اور اس لالچ نے ہندی والوں کو اس وقت ایک
ایسی خود فریبی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ یا تو اپنی زبان کے
اصلی مسائل کو بھلائے دے رہے ہیں اور یا پھر انکی صحیح
نقطۂ نظر سے دیکھنے کی قوت ہی جواب دے گئی ہے۔" (ایضاً)

پروفیسر جھا ان چند لوگوں کو خوش کرنے کے خیال سے جو ہندی کو اس
لئے پڑھیں گے کہ وہ انگریزی کی جگہ لیکر بین صوبائی زبان بنے گی اس میں سنسکرت
ملانے کی زبردست حمایت کر رہے ہیں لیکن وہ یہ نہیں محسوس کرتے کہ اس طرح سے
وہ لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں جو ہندوؤں کے ہمسائے کے طور پر دریائے
سندھ سے دریائے کوسی تک اور ہمالیہ سے ست پڑا تک پھیلے ہوئے ہیں دشمنی
اور نفرت کا جذبہ پیدا کئے دے رہے ہیں۔

اب میں ان اعتراضوں کا تجزیہ کروں گا جو اُردو پر کئے گئے ہیں
پروفیسر جھا فرماتے ہیں:۔

"اُردو ادب کا سارا ماحول غیر ہندوستانی ہے مشکل
ہی سے کوئی دیسی بحر اُردو میں مستعمل ہے۔"

یہاں پر مجھے وہ سب دہرانے کی ضرورت نہیں جو اُردو کے ہندوستانی
ہونے کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں لیکن بحر (Metre) کے متعلق اتنا
ضرور کہوں گا کہ اوّل تو کوئی بحر (Metre.) کسی زبان سے مخصوص نہیں
ہوتی اس لئے کہ زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ بحریں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ کیفیت
اس قدر عام ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن انگریزی اور بنگالی ادب پر
غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزی میں ۔۔۔ جیسا کہ انگریزی ادب کا ہر متعلم
جانتا ہے کہ ہر نئے دور کے شعراء نظم کی مختلف طرز کے تجربے کر کے اپنا شیوہ

بناتے رہے۔ اس رجحان کا سب سے تازہ مظاہرہ (Sprung Verse.)
ہے جس کو جیرارڈ ہاپکنس نے پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں ایجاد کیا تھا۔ اب
ہارڈی اور برجز کی ارکانی (Syllabic.) نظم کی جگہ عام ہو رہی ہے
بنگالی میں پرانے ماترا بیتا اور اکشر بیتا کے علاوہ ایک تیسری بحر سور بیتا ہے۔ پہلی
بحریں تو شمالی ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی ہیں لیکن تیسری بحر جس کی بنیاد غالباً
تان (Stress.) ہے بنگالی کیلئے مخصوص ہے۔ بعض ماہرین لسانیات کا
خیال ہے کہ یہ غیر آرین چیز ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر اب مجھے یہ بتانا ہے کہ با قافیہ نظم کے لحاظ سے
اُردو اور ہندی یکساں ہیں اور سنسکرت ان دونوں سے مختلف ہے اس لئے کہ سنسکرت
میں با قافیہ نظموں کا وجود ہی نہیں۔ اسکے علاوہ اُردو میں گیتوں کی ایک بہت بڑی
تعداد ایسی ہے کہ ان کے راگ ہندی گیتوں کے راگ جیسے ہیں اور راگوں کی اس
یکسانی کی وجہ سے اُردو گیتوں اور ہندی گیتوں میں پہچان نہیں کی جا سکتی۔ اس
وقت اگرچہ اُردو نظم اور ہندی نظم پر کوئی بڑی علمیاتی بحث نہیں کی جا سکتی ہے
لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کی حد تک اُردو ہندی سے بالکل مختلف نہیں
ہے۔ جو بھی اس کی تصدیق کرنا چاہے۔ ہندی "چوپائی" اور اُردو "بحر متقارب"
کا موازنہ کرے۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ اُردو کا ماحول بالکل غیر ہندوستانی ہے
پروفیسر جھا نے ان لفظوں کا ذکر کیا ہے جو مشہور لغت فرہنگ آصفیہ میں دئے
گئے ہیں۔ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ذکر جس پیرائے میں کیا گیا ہے وہ بہت گمراہ کن
ہے۔ پروفیسر جھا نے اس کا تذکرہ ہی نہیں کیا کہ اس لغت (فرہنگ آصفیہ) میں پچاس ہزار
سے زیادہ لفظ دئے گئے ہیں جن میں سے صرف ساڑھے تیرہ ہزار لفظ فارسی اور
عربی کے ہیں گویا بدیسی لفظوں کی تعداد کل لفظوں کی چوتھائی ہے۔ اس حساب
کی بنیاد پر کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو غیر ہندوستانی زبان ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں ثابت کرنے
کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن، مسٹر سمپورنانند اور
ساہتیہ سمیلن کے دوسرے ادیب آجکل میں یہ بھول گئے کہ ابھی دو تہائی صدی
ہی تک نہیں کہ اُردو اور ہندی در اصل ایک ہی بولی جانے والی زبان کی دو
مختلف شکلیں یا صورتیں ہیں۔ اسی طرح چھوٹے موٹے مضمون لکھے ہیں کہ
پھر بھی اگر لسانیات کی کسی کتاب سے اس دعوے کی تصدیق چاہیئے

ادھی اور نئی ہندی ایک ہی ہیں! زبانوں کی یکسانی کا دارو مدار ظاہری مشابہت پر نہیں ہوا کرتا۔

اگر اس وقت ہندی اور اُردو کے لکھنے والوں میں ایسے شدت پسندوں کی اکثریت ہے جو اپنے طرزِ تحریر کو نمایاں اور مؤثر بنانے کے شوق میں دقیق اور غیر مانوس عبارت کے عادی ہیں تو اسکے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہو سکتے کہ یہ اکثریت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اُردو کے ادیبوں نے ایک زمانے میں صوتیاتی اور لسانی خالصیت کے اصولوں پر غلط طریقے سے کاربند ہو کر عام استعمال کے بہت سے اچھے، سادے اور مؤثر لفظوں کو ادب سے نکال پھینکا تھا اور اُردو الفاظ کی کانٹ چھانٹ کیلئے ایسے قاعدے بنا دئے تھے جن میں اس رواج کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا جو صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ یہ انہوں نے بڑی سخت غلطی کی تھی۔ آج ہندی کے حق میں اس سے بھی بڑھکر غلطی بہت سے ہندی کے ادیب کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو "ہندوستانیت سے مراد کیا ہے" اسکے متعلق نہایت غلط عقیدہ رکھتے ہیں اور بعض علانیہ فرقہ واری تعصب سے متاثر ہیں۔ ہندی والے یہ غلطی چار طرح سے کر رہے ہیں۔

(۱) بدیسی زبانوں کے وہ لفظ نکالے جا رہے ہیں جو نہایت سہل، سادے اور عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) عام تدبھو کی جگہ سنسکرت تت سم رکھے جا رہے ہیں۔

(۳) مشتقات کیلئے سنسکرت کی قواعد استعمال کی جا رہی ہے جو پراکرتی فطری ترقی کے مخالف ہے۔ اور ہندی کے صوتیاتی نظام پر بوجھ ہے۔

(۴) سنسکرت کے ذخیرۂ الفاظ سے موزوں اور ناموزوں ہر قسم کے لفظ بلا امتیاز لئے جا رہے ہیں۔

اُردو اور ہندی کے متعلق صرف یہی درست نہیں کہ اُردو میں ہندی کے معمولی لفظوں کی جگہ بدیسی لفظ استعمال کئے جانے لگے بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ نئی ہندی بھی اس طرح کہ اُردو میں سے فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دئے گئے اور نئی ہندی تیار ہو گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندی کے مقابلے میں اُردو ایک بہت شاندار قدامت کی حامل ہے اور اُردو والوں کو یہی اصلی شکایت ہے، کہ ہندی والے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ایک ہندوستانی زبان کو مٹا کر دوسری نئی گھڑی ہوئی زبان جاری کر دیں۔

یہ کہنا کہ اس طرح اُردو اور ہندی دونوں فطری ترقی کے راستے الگ الگ طے کر رہی ہیں، واقعات کی بہت غلط تاویل ہے اس لئے کہ یہ کسے نہیں معلوم کہ یہ رجحانات زبردستی اور ایک خاص مقصد سے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ اُردو اور ہندی کے درمیان خلیج کو بڑھانا دراصل ادبی زندگی میں اس فرقہ واریت کا مظاہرہ ہے جو ہماری معاشری اور سیاسی زندگی میں اس قدر سرایت کر گئی ہے میری مخالفت ضرور ہوگی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سنسکرت ملی ہندی کا پروپیگنڈا کوئی صحت پرور قومی تحریک نہیں ہے کیونکہ اس سے علیحدگی کی پالیسی میں مدد ملتی ہے۔ ہندوستان ایک مرکب ملک ہے۔ یہاں کئی نسلیں، کئی مذہب، کئی تمدن اور کئی زبانیں ہیں۔ ہندوستان کی قوم انگلستان، فرانس، اٹلی یا جرمنی کی قوموں کی طرح ایک وحدانی ہم جنس ادارے کی شکل نہیں اختیار کر سکتی۔ ہندوستان کی مشترک لنگوا فرینکا میں ہندوستانی قومیت کے تمام اجزا کی نمایندگی ہونی چاہیئے اور اسی لئے ہر وہ کوشش ناکام رہے گی اور تفرقہ برپا کرے گی جو ایسی زبان کو ملک کی قومی زبان بنانے کے لئے کی جائیگی جس کی بنیاد کسی ایک مخصوص تمدن کی روایات پر ہو۔

انہی مشکلات کا اعتراف کرکے انڈین نیشنل کانگرس نے ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان کے طور پر اختیار کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے دقتوں کو صاف صاف محسوس کرتے ہوئے لکھا تھا:

"مجھے اب ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندی اور اُردو کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب آجانا چاہیئے اور چاہے انکی ظاہری شکل مختلف ہو مگر وہ لازمی طور سے ایک ہی زبان ہو جائینگی"

دونوں فرقوں کی باہمی یگانگی دور کرنے کی خواہش نے ابھی حال میں مہاتما گاندھی کو یہ کہنے پر مجبور کیا:-

"میں ایک ایسی انجمن بنانا چاہتا ہوں جس کا مقصد یہ ہو کہ اسکے اراکین دونوں بولیاں اور دونوں رسم خط سیکھیں اور اس کا پروپیگنڈہ بھی کریں اور یہ سب اس اُمید پر کہ بالآخر دونوں ملکر "ہندوستانی" کے نام سے ایک ہی صوبائی زبان بن جائے اور پھر مساوات یہ نہ ہوگی کہ ہندی + اُردو = ہندوستانی، بلکہ مساوات یہ ہوگی۔ ہندوستانی = ہندی = اُردو"

مجھے امید ہے کہ تمام ذی فہم لوگ اس مسئلہ کی طرف دل سے توجہ کریں گے اور اپنی عنک

(ہماری زبان)

سید محمد آصف ی

کرپس مشن

(وہ مٹا ہوا کرپس مسودہ جسپر لکھ کر پھر مٹایا گیا)

برطانوی حکومت کا مسودہ اعلان واپس ہو گیا۔ جس شخص کو حالات کی انتہائی نزاکت کا ٹھیک ٹھیک خیال ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ جن سب کا اس سے تعلق ہے ان کے لئے کتنے بڑے نتیجے آغوشِ مستقبل میں ہیں، وہ موجودہ حالت کو نہایت تشویش کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ معاملوں کو اس جگہ چھوڑ دینا، جہاں وہ جمودی حالت پیدا کر دیں، تو اوّل درجہ کی مصیبت کو دعوت دینا ہے، ہندوستان کی حفاظت کا مسئلہ داخلی طور پر متضاد حالات کا یرغمال ہے، حکومت غیر ملکی ہاتھوں میں ہے اگرچہ اس مشینری کے پہیوں کے بیشتر کاگ ہندوستانی ہیں، جو لوگ عوام کے نظریہ اور اسپرٹ کو بدل لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ صرف وہی لوگ ہیں جو اس وقت لڑائی سے خارج ہیں۔ حکومت کی روح تاریک بدشگونیوں سے پُر ہے اور وہ اس طرح کے سوچ بچار میں ہے جیسے وہ کوئی عمل کرنا چاہتی ہو اور کر نہ سکتی ہو، اسکے مستقبل پر غم، مصیبت اور بے یقینی کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بیرونی کیفیت یہ ہے کہ اسکے سمندری راستوں میں زبردست حملہ آور گھوم رہے ہیں، جنہوں نے اسے گھیر لیا ہے، امریکہ کی سپلائی نہ صرف ہندوستان کیلئے بلکہ چین اور ریچ یورپ کیلئے بھی گومگو کی صورت میں ہے، محوری طاقتوں کے موسم گرما کا مسئلہ خوفناکی کے ساتھ فضا میں گھوم رہا ہے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان ایک باعزت سمجھوتہ اور اتحادی قوموں کے ہاتھوں اسکی آزادی کے تسلیم کر لئے جانے سے راتوں رات تمام پوزیشن میں انقلاب ہو جاتا، اور اتحاد شکنی اور کامیابی کے طوفانی دروازے کھل جاتے۔

پھر کرپس مشن کا خاتمہ اس بے تکے پن سے کیوں ہوا؟ اسکی بہت سی وضاحتیں ہیں جن میں سے ایک خود مسٹر اسٹیفورڈ کرپس کی پیش کی ہوئی ہے جو صریحی طور پر حقیقی واقعات سے اتنی غیر مطابق ہے کہ صرف وہی لوگ اسے جائزہ لینے کے قابل سمجھ سکتے ہیں جو اس بات کے لئے بیتاب تھے کہ آخری وقت تک کسی طرح معاملہ الٹ سکے، اس سے نہ تو ہندوستان والے دھوکے میں آسکتے ہیں اور نہ غیر جانبدار غیر ملکی مبصر ہی کسی فریب میں آسکتے ہیں۔

ایک وضاحت ان لوگوں کی ہے جو عملاً اس گفت وشنید میں شریک تھے وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ دہلی یا لندن سے ایسے موقعہ پر کا یک "ہالٹ" (ٹھہرو) کا حکم صادر کیا گیا، جبکہ حکومت برطانیہ یا حکومتِ ہند کے نزدیک وہ منزل آچکی تھی جو امریکہ چین وغیرہ میں ان کے نزدیک پروپیگنڈہ کیلئے کافی تھی لیکن صدر کانگریس کے آخری خط نے تو اس بہانہ کو بالکل ہی بے نقاب کر دیا کہ کانگریس نے برطانی پیٹھ پر آخری تنکا رکھ دیا۔ (ایک انگریزی محاورہ ہے کہ آخری تنکا اونٹ کی پیٹھ توڑ دیتا ہے) آخری بار سر اسٹیفورڈ کرپس صدر کانگریس اور پنڈت جواہرلال نہرو کے درمیان جو زبانی بات چیت ہوئی اس سے ان کے دلوں میں ذرا بھی شبہ نہیں رہا کہ مسودہ اعلان کے فقرے ایسے ہیں جو پیش کش کی گئی ہے وہ صرف ایک نمکین جال ہے۔ اگست ۱۹۴۰ء میں تو اسے بالکل ہی گیا گزرا قرار دیدیا گیا تھا، لیکن اس بار شروع کی گفتگو میں ایسا نمک مرچ لگایا گیا کہ ۲۵ مارچ سے ۱۰ اپریل تک کی بات چیت میں یہ اُمید زندہ رہی کہ حقیقت میں اس کا نتیجہ ایک آزاد حکومت ہو گی، اور جنگ کو کامیابی سے چلانے کیلئے جو اختیارات ضروری ہیں وہ ایک سابقہ معاہدہ کے ذریعہ وزیر جنگ کو دیئے جائینگے مجبوراً یہ خیال کرنا پڑتا ہے کہ شروع میں جو یاد دہانی کی گئی تھی وہ محض ایک دل لبھانے والا فریب تھا، یہ نتیجہ اس وقت مجبوراً ہمارے ضمیر کو قبول کرنا پڑتا ہے، جب ہم مجوزہ ہندوستانی کیبنٹ کی تمام رنگا رنگ جھلکتی ہوئی تصویر کو اپنے ذہن میں لے آتے ہیں، جو شروع میں پیش کی گئی تھی۔

پہلی نظر میں یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دفاع اس اعلان کی جان ہے لیکن چونکہ ڈیفنس کا محکمہ بالکل ریزرو رکھا گیا، اس لئے اس میں خوشنما نقص یہی تھی۔ صدر کانگریس اسی نتیجہ پر پہنچے، چنانچہ پہلی ملاقات میں مستقبل کے متعلق چند چبھتے ہوئے باریک جملوں کے بعد انہوں نے دفاع کا ...

توجہ مرکوز کی۔ سرسٹیفورڈ اس یقین سے کہے جاتے تھے کہ اصل مقصد یہ ہے کہ بس ایک استثناء سے تمام اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کئے جا رہے ہیں، اور وہ استثناء کمانڈر انچیف کے اختیارات کے متعلق ہے۔ یہ بھی امکان تھا کہ ایک ڈیفنس منسٹر مقرر ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ لفظوں پہ نہ جائیے، عملاً ایک نیشنل کیبنٹ ہوگا، اور وائسرائے اور اس کیبنٹ کے درمیان ویسے ہی تعلقات ہوں گے جیسے بادشاہ اور ہمارے کیبنٹ کے درمیان ہیں۔ بہرحال وائسرائے ملک معظم کا نمایندہ ہے اور وہ بادشاہ سے زیادہ اختیارات استعمال نہ کر سکے گا بعد کی گفتگو میں انہوں نے اس خیال کو اور بھی واضح کر دیا اور موجودہ آئین کے پیش نظر انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ وائسرائے کی پوزیشن ایک چیئرمین اور ایک وزیر اعظم کے درمیان ہوگی، لیکن آخری خط میں دفعہ "سرا" کی وضاحت کا تمام لب ولہجہ ایک مطلق العنانہ حکومت میں تبدیل ہو کر رہ گیا اور اقلیتوں کے اعتراض کا بالکل نیا مضمون اسی میں پیوست کر دیا گیا۔

شروع میں سرسٹیفورڈ کرپس نے یہ بات بالکل صاف کر دی تھی کہ اگر کبھی وزارت بننے کا اسٹیج آیا تو میں ہندوستان میں اور زیادہ ٹھہر جاؤں گا اور یہ دیکھوں گا کہ اس سلسلہ میں آخری تدبیریں اختیار کر لی گئیں، اپنے آخری خط میں صدر کانگریس نے پولٹ لکتہ چینی اور شبہ سے بالاتر انداز میں ظاہر کر دی کہ اگر وہ منزل آجاتی تو اطمینان بخش حل بھی نکل آتا، کیا سرسٹیفورڈ کرپس کیلئے یہ جواب دیدینا غیر ممکن تھا کہ مزید گفتگو میری موجودگی میں وائسرائے اور متعلقہ پارٹیوں کے درمیان ہونے دیجئے لیکن سرسٹیفورڈ کرپس جو مٹے ہوئے حروف پر لکھے ہوئے حروف کا مسودہ لائے تھے اس کی عبارت بھی یکایک چھیل دی گئی۔ کیا اسکی وجہ یہ تھی کہ اطمینان بخش حل پیش نظر تھا۔ کیا یہ اس لئے تھا کہ یہ خوف تھا کہ ملک کے عوام کی نمائندگی کرنے والی مختلف پارٹیوں کی مشترکہ مرضی ملک کے لئے طاقت کا نہیں بلکہ کمزوری کا باعث ثابت ہوگی۔ ہندوستانی عوام کی بے اعتمادی بہت قوی ثابت ہوئی۔ سب پارٹیاں اس بات پر تیار تھیں کہ مستقبل کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور جنگ کو کامیابی سے چلانے کے لئے موجودہ حالت پر ہی توجہ مرکوز کی جائے۔ تمام پارٹیاں اس بات پر ہاتھ ملانے کے لئے تیار تھیں کہ مشترکہ کوشش سے حصول مقصد اور قربانی کیلئے ملک کے جوش کو اعلیٰ ترین منزل تک پہنچایا جائے لیکن قسمت انسانی خواہش سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

۲۶

بے عملی کے پوسٹ مارٹم کی کارروائی ایک ایسے وقت میں جبکہ خوفناک مقدرات اپنا سایہ ہم پر ڈال رہے ہیں مصیبت کم نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ اسکی مدد سے ہمیں اس اندھیری گلی سے باہر راستہ دیکھنے میں مدد نہ ملے، باہمی اتہام طرازی تو صریحاً خطرناک ہے، کیونکہ اسکی بدولت بدمزاجی پیدا ہوتی ہے اور اس سے بے لوث فیصلوں پر اثر پڑتا ہے، آخر وہ چیز کیا تھی جس کا مطالبہ کانگریس نہ صرف اپنے لئے بلکہ تمام ہندوستان کیلئے کر رہی تھی، سب سے پہلی چیز یہ ذہنی تبدیلی ہے کہ قسمت پرستانہ بے بسی اور مخالفانہ بے رغبی کی جگہ ایک نئی شان پیدا ہو اور وہ پُرجوش حب وطن ہو۔

کسی ملک کی جنگی قوت کا بہت بڑا حصہ عوام کا جوش ہوتا ہے اسکے بعد اسکے مادی وسائل ہوتے ہیں، ہندوستان کے پیشہ ور فوجی بھی بہادر سپاہی ہیں، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نیا جوش بھر جانے سے ان میں سے ہر ایک اٹل سورما بن جائیگا، جبکہ کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں اپنے خون سے ملک کی آزادی پر مُہر لگانے کی جوت جل رہی ہوگی۔ ہر سپاہی اپنے اعلیٰ ترین حد تک پہنچ جائیگا اور ہر ہندوستانی دل و جان سے متحدہ قوموں کی کوشش جنگ میں شریک ہو جائیگا یہ تو تسلیم کر لیا گیا تھا، اور یہ حق دے بھی دیا گیا تھا کہ اعلیٰ فوجی تدبیروں کا یہ تقاضہ ہے کہ کمانڈر انچیف ہندوستان کا وزیر جنگ ہو اور اسے مسلح فوجوں پر پورا کنٹرول ہو، کسی تحریر کی رو سے نہیں بلکہ بے لکھے قانون یا ایسے رسمی ضابطہ کی رو سے جو گورنر جنرل اور حکومت کے ممبروں کے درمیان طے ہو، یہ پیش کیا گیا تھا کہ اگر کوئی کیبنٹ کی حیثیت سے عمل کرے اور ممبر مشترکہ طور پر اپنے عمل کے لئے حکومت کے روبرو ذمہ دار ہو اسکے معنی لیجسلیچر کے سامنے ذمہ داری کے نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے سامنے ذمہ دار ہونے کے ہیں تاکہ حکومت کے ہر صیغہ میں قریب تر تعاون رہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ لڑائی چلانے کے لئے وار منسٹر (وزیر جنگ) کی خاص ذمہ داریوں پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ اس میں اقلیتوں کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ پورے جی جان سے تعاون کا قابل اطمینان فارمولا حاصل کئے بغیر کوئی کیبنٹ بن ہی نہیں سکتی۔ ایسی حکومت کوئی جنگ چلا نہیں سکتی جو لوگوں پر مشتمل ہو جو اس تاک میں ہوں کہ ہم اپنے اختیارات سے مزید طاقتیں چھین لیں اسی لئے استعفیٰ کی دھمکی سے وزیر جنگ کے اختیارات پر غلبہ حاصل کرنے کا سوال تو سرسری طور پر ہی خارج کر دیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ وزیر جنگ

(بقیہ مضمون صفحہ ... پر دیکھو)

عبد السلام رامپوری

اِسلام سے قبل کے بعض مشہور کتاب خانے

اب سے ہزاروں سال پہلے جبکہ فطرت سرتا پا راز تھی، مظاہرِ قدرت انسان کے لئے باعثِ تحیّر تھے، ماضی کے تجربات سے اُسکا حافظہ سادہ تھا، مستقبل کے متعلق امید اور نا امیدی دونوں کی دونوں بے معنی تھیں اُس کا کام صرف مشاہدہ تھا۔ اُس سے قوی اور اُس سے کمزور دونوں کی مخلوق اُس کے سامنے تھی، وہ مختلف جذبات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ روزانہ نئی نئی چیزوں کا احساس ہوتا جاتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ اب وہ قوت اور ضعف کو سمجھے۔ مضرت اور منفعت اب اُس کے لئے غیر مانوس تصوّر نہیں ہے رفتہ رفتہ واقعات کا ساتھ ساتھ ہونا اور یکے بعد دیگرے ہونا اُنکا مختلف اور متحد ہونا انسانی دماغ کو متوجّہ کرنے لگا۔ مبہوتی اور تحیّر کا دور ختم ہوگیا۔ اُسکے دماغ میں اسباب و علل کی کرید شروع ہوگئی۔ اُس کے ذہن میں کون؟ کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟ کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ واقعات کی توجیہ کیلئے اُس کو قدرۃً اپنے آپ سے قوی تر مظاہر کی طرف متوجّہ ہونا پڑا۔ اُنکی قوت سے اُس کا ذہن خواہ نخواہ اُنکی برتری کی طرف منتقل ہوگیا۔ عقلی قویٰ کی کوتاہی نے اس تصوّرِ برتری کے تحت اپنے جیسے جذبات و عواطف، حسیات و اعمال کو ممکن حد تک بڑی مقدار میں اُن کے لئے بھی ثابت کردیا۔ کہتری کے جذبے نے خود بخود اُن کو دیوتا اور دیوی کا مقدس لباس پہنادیا۔ کثرت سے وحدت کی طرف اس ابتدائی حالت میں نہ عقل متوجّہ ہوسکتی تھی نہ ہوئی۔ چنانچہ مختلف اعمال و افعال کیلئے مختلف دیوتا اور دیوی منتخب ہوئے ہر قوم نے اپنے مذاق کا خدا تلاش کرلیا۔ بنی نوع پر تفوق حاصل کرنے کے جذبے نے عقیدۂ حلولیت کو رواج دیا۔ انسانی نسب دیوتاؤں سے ملا دئے گئے۔ دیوتاؤں کی غیر معمولی طاقت کے اظہار کے لئے محیّر العقول واقعات گھڑے گئے۔ واقعات کی نوعیت اور دیوتاؤں کی شخصیت کے تصوّر نے مندر اور ہیکل کی تعمیر میں نقشے کا کام دیا۔ مندر کے خادم مذہب کے امین کہلائے۔ بادشاہ اور امرا دیوتاؤں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اُن کے مظاہر بلکہ خود دیوتا مان لئے گئے۔

کتابت عام سرسبزی اور خوشحالی کیلئے دیوتاؤں کو بھجن گا گا کر خوش کیا گیا اُن کا تفوّق ثابت کرنے کے لئے اُن کے کارنامے بیان کئے جانے لگے۔ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے یا اُن پر فتح پانے کے لئے، قحط وبا اور دوسری مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے دُعائیں کی جانے لگیں کامیاب اتفاقی نتائج نے الفاظ اور طرز کی خصوصیت کو اہمیت دیدی اور قوتِ ارادی کی تاثیر نے اس وہمی اہمیت کو ایک واقعیت بنادیا۔ چیزیں برابر بڑھتی جارہی تھیں۔ انسانی حافظہ کب تک امداد دیتا۔ ادھر انسانی عقل میں مسلسل نشو ونما ہوتا رہا ذہنی طاقتیں منجھتی رہیں۔ مذہبی عقلاء نے اُن چیزوں کو آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ رکھنے کی تدبیر پر غور کیا۔ چنانچہ مختلف قوموں نے اس سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لئے مختلف طریقے ایجاد کئے۔ اشوری اور کلدانی قوموں نے مختلف آوازوں کے لئے مختلف علامتیں بنائیں جن کو میخوں اور پیکانوں سے مشابہ ہونے کی وجہ سے خطِ میخی یا خطِ پیکانی کہتے ہیں۔ قدیم مصری قوموں نے واقعات کو تصاویر سے ظاہر کیا۔ اہلِ فنیقیہ نے انہیں تصاویر سے بائیس مختصر شکلیں انتخاب کیں اور وہ حروفِ تہجی تسلیم کرلی گئیں۔ دُنیا کی مہذب قوموں نے بھی ان کو شرفِ قبول بخشا۔ عربی، عبرانی، لاطینی، یونانی بلکہ بعض علماء کی رائے کے مطابق سنسکرت، جرمنی اور تاروے کے مقدس خطوط کا سرچشمہ بھی فنیقی حروف قرار دئیے گئے۔

کتابیں جب خط کسی نہ کسی حیثیت میں ایجاد ہوگئی تو سب سے پہلے مذہبی دعائیں۔ دیوتاؤں کی تعریفیں اور جھاڑ پھونک کے منتر لکھے گئے۔ ادویۃ اور علاج کے طریقے قلمبند ہوئے۔ زمانہ ترقی کرتا گیا نئے مشاہدے انسانی علم میں آتے گئے ضرورتیں وسیع ہوتی گئیں اور اس تناسب سے تحریروں میں تنوع پیدا ہوتا گیا۔ حروف کی شکلوں اور ان کے لکھنے کے طرز میں ترمیمیں ہوئیں مکتوبات میں وسعت ہوئی۔ تجارتی دستاویزیں، عدالتی کارروائیاں، نظری طب، پند و مواعظ، فلکی مشاہدات، موسمی تغیرات، ہندسی نظریے اور لسانی قواعد غرض یہ ہے کہ اس وقت تک کے علوم کل کے کل قلمبند ہونا شروع ہو گئے اور کتابت ایک مستقل اور باقاعدہ فن بن گیا۔

کتاب خانے کتابت کی ترقی سے کتابوں کے ذخیروں میں اضافہ لازمی تھا جن کے رکھنے کے لئے کسی نہ کسی جگہ کا تعین ناگزیر ہے۔ یہیں سے کتاب خانہ کا تصور پیدا ہوا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے کہ کتابت کی ایجاد کا بڑا سبب مذہب ہے تو یہ قیاس بھی بیجا نہیں کہ مخطوطات کا سب سے پہلا مخزن بھی کوئی مندر ہی ہو سکتا ہے۔ ایسے مخزن کا محافظ کسی پرانے مندر کا بوڑھا کاہن یا پجاری ہی ہوگا۔

رفتہ رفتہ مخطوطات جمع کرنیکا شوق عام ہوتا گیا۔ مندر اور ہیکل سے نکل کر علماء کے کاشانے اور بادشاہوں کے ایوان قدیم اور جدید مخطوطات سے آراستہ کئے جانے لگے۔ بادشاہوں سے یہ شوق امرا میں آیا اور علم کی اشاعت و ترقی کے لئے کتابوں کے فائدے کو زیادہ عام کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی حتیٰ کہ خصوصی کتاب خانوں سے عمومی کتاب خانے بن گئے۔ اب کتاب خانے صرف مذہبی کتابوں کے ہی مخزن نہ تھے بلکہ ان میں وقت کے تمام مروجہ علوم و فنون کے زر پارے بڑی کوشش سے جمع کئے جاتے تھے۔

چونکہ تہذیبی اور تمدنی ارتقا تمام قوموں میں یکساں نہیں ہوا ہے بعض قومیں اب سے ہزارہا سال پہلے سے تہذیبی اور تمدنی درجے پر آچکی تھیں درآں حالیکہ بعض قومیں آج بھی اپنی بدوی حالت پر قائم ہیں۔ مزید براں بعض قومیں خاص خاص اسباب عروج و زوال کے تحت تہذیب و تمدن سے پھر بدوی حیات کی طرف لوٹ گئیں یا اپنی قومی اور اجتماعی حیثیت میں دنیا سے ہی معدوم ہوگئیں اور اس طرح ان کے ساتھ ہی ان کے متعلق ہر قسم کے ذرائع علم بھی ختم ہو گئے۔ لہٰذا کتاب خانوں کا سلسلۂ وجود بھی جو تہذیب و تمدن کی پیداوار ہے دنیا کی ہر قوم میں نہ ہو سکتا تھا اور نہ آج ہے۔ اور نہ آج ان تمام قوموں کا احصار ممکن ہے جن میں کسی نہ کسی حیثیت میں کتاب خانے تھے۔ ہمارے تحریری ذخیرے اور اثری انکشافات نے جن قوموں میں کتاب خانوں کے وجود کا سراغ لگایا ہے ظاہر ہے کہ ان کو حقیقت سے کمیت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔ میں نے اس مضمون میں اسلام سے پہلے کے بعض مشہور کتاب خانوں کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب خانے مختلف اقوام اور مختلف ممالک سے متعلق ہیں جو قدیم دنیا کے تینوں براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ سے وابستہ ہیں۔

مصر

دنیا کی قدیم تاریخ میں مصر کی عظمت ناقابلِ انکار حقیقت ہے جب تقریباً ساری دنیا پر وحشت و بربریت کی گھٹا ٹوپ اندھیاری چھائی ہوئی تھی مصر اپنی تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے اس معراجِ کمال پر تھا جس پر دوسری قوموں کو پہنچنے کے لئے ہزاروں سال انتظار کرنا پڑا۔ اس کے علوم و معارف، اس کی صنعت، اس کا نظامِ سلطنت اس کے قوانین دنیا کیلئے نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ جن کتاب خانوں سے ہم ابتک واقف ہوئے ہیں ان میں سے سب سے قدیم کتاب خانے کا سراغ مصر میں ہی ملتا ہے۔

دنیا کا قدیم ترین کتاب خانہ مقام جیزہ میں اہرام کے قریب کھدائی کے دوران میں ایک قبر برآمد ہوئی ہے اس قبر کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان مصر کے دوسرے خاندان کے کسی بادشاہ کے کتاب خانے کے ناظر کی یہ قبر ہے۔ اس کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب خانے میں طب۔ ہندسہ۔ فلسفہ۔ فلکیات۔ تاریخ۔ ادب وغیرہ کا اچھا خاصا ذخیرہ محفوظ تھا۔[1] مصر کے حکمرانوں کے دوسرے خاندان کا زمانۂ حکومت ۲۷۵۱ق م سے ۲۴۴۹ق م ہے[2] اس کے معنی یہ ہیں کہ اب سے کم از کم چھ ہزار سال پہلے مصر قدیم کے کتاب خانے اس حد تک ترقی کر چکے تھے کہ انہوں نے ایک خصوصی شعبے کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور ان کے لئے خاص عہدے کے تحت ایک خصوصی نگراں کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ مزید براں اس کتبہ کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علمی حیثیت میں اس نے کتنی

---

[1] الکافی فی تاریخ مصر الحدیث والقدیم الجزو الاول ص ۱۲۹

[2] ایضاً ص ۲۹۲۔

ترقی کر لی تھی اور کتنے اہم فنون اُس وقت تک اپنی مستقل حیثیت میں وجود میں آ چکے تھے۔

اُمن محفت کا کتاب خانہ | اُمن محفت دوسرے خاندان کا سب سے پہلا بادشاہ ہے سنہ ۲۷۵۰ ق م میں مصر کے قدیم پایۂ تخت منفس میں تخت نشین ہوا۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اُس نے ایک نہایت اعلیٰ کتاب خانے کی بُنیاد رکھی ہزاروں سال تک یہ کتاب خانہ عروج و زوال کی مختلف منزلیں طے کرتا رہا۔ چنانچہ اس کتاب خانے کی کتابیں مصر پر یونان کے حملے تک یعنی تقریباً تین صدی قبل مسیح تک موجود تھیں[2] گو ہمارے پاس شواہد و آثار موجود نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا کتاب خانہ یہی اُمن محفت کا کتاب خانہ ہو اور جیزہ والی قبر اسی کے ناظروں میں سے کسی ناظر کی قبر ہو۔

اُمیڈیاس کا کتاب خانہ | امیڈیاس مصرِ قدیم کا ایک نامور اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے عہدِ حکومت میں بہت تلاش اور جستجو سے قدیم کتابوں کو مہیّا کیا اور ایک عظیم الشان کتاب خانے کی بُنیاد ڈالی۔ یہ کتاب خانہ اپنے زمانے میں خاص شہرت اور اہمیت رکھتا تھا۔

کتاب خانہ شفاخانۂ روح | ریمسیس اوّل نے جب مصر کی حکومت کی زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے امیڈیاس کے مذکورہ بالا کتاب خانے کی ترقی میں مزید کوشش کی اور مختلف مقامات سے کتابیں حاصل کر کے اُس میں شامل کیں اور اُس کو شفاخانۂ روح کے نام سے موسوم کر کے اس نام کا کتبہ کتاب خانے کے دروازے پر نصب کرا دیا[3]

اسکندریہ | تقریباً تین سو سال قبل مسیح یونان اپنی ترقی اور عروج کی آخری منزل پر تھا اُس وقت کی معلومہ دُنیا کو زیرِ نگیں کرنے کے لئے اسکندرِ اعظم اپنی آخری کوششیں کر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر اپنی قدیم روایتی طاقت اور دولت کھو چکا تھا۔ مصر کی قوی حکومت کمزور ہوتے ہوتے تقریباً ۵۲۵ ق م ایرانیوں کے ہاتھوں سے آخر ختم ہو گئی۔ جاہ و جلال والے فراعنہ جو اپنی قوت و شوکت کے گھمنڈ میں خدائی کے دعوے سے بھی نہیں چوکتے تھے اپنے مدفنوں میں ہمیشہ کیلئے سو چکے تھے کہ سکندر کی زیرِ قیادت یونان نے حملہ کر دیا اور مصر پر اہلِ یونان کا تسلط ہو گیا۔

سکندر کی فوج کا مشہور سالار بطلیموس سوطر ۳۲۵ ق م میں مصر کا حکمراں ہوا[4] بحرِ روم کے ساحل پر اُس نے سکندر کے نام پر اسکندریہ آباد کیا اور اُسی کو دارالحکومت بنا لیا۔

اسکندریہ کا کتاب خانہ | سکندر کے خاص مصاحب اور یونانی فلسفے کے ہیرو ارسطاطالیس کے مشورے سے بطلیموس نے اسکندریہ کے مشہور عجائب خانے کی بنا ڈالی[5] یہ عجائب خانہ شہر کے ایک مشہور حصے بروشیم میں واقع تھا۔ دوسری شاہی عمارتیں بھی اس جگہ واقع تھیں۔ عجائب خانے کی عمارت سنگِ مرمر کی تھی چہل قدمی کیلئے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے۔ اس عمارت میں دُنیا کا مشہور کتاب خانہ، کتاب خانۂ اسکندریہ قائم کیا گیا[6] دُنیا کے مشہور علمی مرکزوں میں ایجنٹ بھیجے گئے اور کتابیں منگوا کر اس کتاب خانے میں جمع کی گئیں۔ ایران کا وہ علمی ذخیرہ جس کو سکندر نے فتح ایران کے بعد مصر بھیجا تھا[7] غالباً اسی خزانے میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔

کتاب خانے کے مہتمم کو حکم تھا کہ جہاں کہیں سے کتابیں دستیاب ہوں سرکاری خرچ سے خرید لی جائیں۔ اسکے ساتھ ساتھ کتاب خانے کے متعلق کاموں کا پورا عمل تھا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی کتاب فروخت کرنا نہ چاہتا تو اُس کی نقل کرا کر مالک کو دے دی جاتی اور اصل نسخہ کتاب خانے میں داخل ہو جاتا۔ کتاب خانے کی طرف سے اکثر بیش قرار قیمتیں معاوضے یا تاوان کے طور پر اصل مالکوں کو دی جاتی تھیں[8]

یوسیفس کی روایت کے مطابق بطلیموس نے بیت المقدس کے ستر منتخب علما کو اسکندریہ آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنی مذہبی کتابوں کی ایک نہایت صحیح نقل کر دیں، اور اُس کو کتاب خانے میں داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ فرنانس کے مطابق جب یہ علما نقلیں پوری کر چکے اور مقابلہ ختم ہو گیا تو بادشاہ کی طرف سے اُن کو بہت سا انعام دیا گیا اور عنایات سے نواز

۱۔ الکافی فی تاریخ مصر الحدیث والقدیم الجزو الاوّل صفحہ ۱۶۷

۲۔ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۵۰ء جلد ششم صفحہ ۲۰۸

۳۔ نائل انسائیکلوپیڈیا صفحہ ۵۲۳

۴۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد شانزدہم صفحہ ۵۶۶

۵۔ معرکۂ مذہب و سائنس اردو ترجمہ صفحہ ۲۸، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم صفحہ ۵۶۶

۶۔ تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء از حمزہ بن الحسن [illegible]

۷۔ معرکۂ مذہب و سائنس صفحہ ۲۶

سے اُن کو رخصت کیا گیا۔[1] بائیبل عہدِ قدیم کا سبعینیہ نسخہ یہی کہلاتا ہے۔

بطلیموس سوٹر کے بعد اُس کا بیٹا بطلیموس فلاڈیلفوس ۲۸۵ ق م میں تخت نشین ہوا۔[2] فلاڈیلفوس بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست تھا کتاب خانے سے اُس کو خاص دلچسپی تھی چنانچہ اُسکے عہدِ حکومت میں اسکندریہ کے کتاب خانے نے خوب ترقی کی۔ مشہور یہودی مورخ مانیتھون نے یونانی زبان میں قدیم مصر کی تاریخ اس کی فرمائش سے لکھی تھی۔ اس تاریخ کو دفتری کاغذات سرکاری دستاویزوں اور مختلف کتابوں اور نوشتوں کی مدد سے جو پرانے مندروں اور ہیکلوں میں محفوظ تھے جمع کیا گیا تھا۔[3]

کتاب خانہ اگرچہ بطلیموس سوٹر کے زمانے میں ہی کافی ترقی کر چکا تھا لیکن اُسکے عہدِ حکومت میں اُس کی کوئی فہرست مرتب نہیں ہو سکی تھی۔ فلاڈیلفوس نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ اُس کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کرائی۔[4] فلاڈیلفوس کے بعد بھی ہر بادشاہ نے اپنے زمانہ سلطنت میں اس کتاب خانے کی سرپرستی کی۔ چنانچہ اس کی کتابوں کی تعداد چار لاکھ نسخوں تک پہنچ گئی۔ اور کتاب خانے کی عمارت اس سے زیادہ کتابوں کی گنجائش نہ رکھتی تھی۔ لہذا اس عمارت میں کتابوں کا مزید داخلہ روک دینا پڑا۔

سیراپیم کا کتاب خانہ | اسکندریہ کے عجائب خانے کی وہ عمارت جو کتابوں کے لئے مخصوص تھی مزید تعداد کی متحمل نہ ہو سکی تو سراپیم کے مشہور مندر میں ایک دوسرے کتاب خانے کا افتتاح کیا گیا۔ اس کتاب خانے کی حیثیت عجائب خانے کے پرانے کتاب خانے کے اعتبار سے ایک شعبے کی تھی۔ چنانچہ سراپیم کا کتاب خانہ پہلے کتاب خانہ کا ایک تتمہ تھا۔ حکومت کے علمی ذوق اور اُس کی غیر معمولی توجہ سے اس شعبے نے بھی تھوڑی مدت میں کافی ترقی کر لی اور اس میں بھی تین لاکھ کے قریب کتابیں جمع ہو گئیں۔[5]

اسکندریہ کے کتاب خانوں میں آتشزدگی | اسکندریہ کے یہ دونوں کتاب خانے بروکشین کا کتاب خانہ اور سراپیم کا کتاب خانہ جو پہلے کا ایک شعبہ تھا مسیح علیہ السلام سے تقریباً نصف صدی پیشتر تک موجود تھے۔ مصر کی ایک اندرونی نزاع کے سلسلے میں رومی شاہنشاہ جولیس سیزر مصر کی مشہور ملکہ کلوپیٹرا کی حمایت کیلئے آیا ہوا تھا۔ مصریوں نے ارکلاس کی زیر قیادت بروکشین میں سیزر کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ سیزر کا بیڑا مصریوں کے قبضے میں آ جائے بیڑے کو مصریوں سے بچانے کی ایک ہی تدبیر تھی کہ بیڑے میں آگ لگا کر اُس کو تباہ کر دیا جائے۔ سیزر نے مجبوراً بیڑے میں آگ لگانے کا حکم دیدیا اتفاق سے یہ آگ زیادہ پھیل گئی اور بروکشین تک پہنچکر شاہی کتب خانے میں لگ گئی اور پورے کتاب خانے کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔[6]

جب یہ کتاب خانہ اس طرح برباد ہو گیا تو مارک انیٹونی نے تلافی نقصان کے طور پر پرگیماس کا کتاب خانہ جس میں دو لاکھ کے قریب کتابیں تھیں اور جو اب روم کے تحت تھا ملکہ کلوپیٹرا کے حوالے کر دیا کلوپیٹرا کے حکم سے یہ ذخیرہ سراپیم کے کتاب خانے میں منتقل کر دیا گیا۔[7]

بروکشین کے کتاب خانے کے جل چکنے کے بعد اب اسکندریہ میں صرف ایک ہی کتاب خانہ موجود تھا۔[8] ۳۸۹ء میں اسکندریہ کے بشپ تھیافیلس نے رومی بادشاہ تھیاڈوسیش کے حکم سے مصر کے اس قدیم علمی ذخیرے کو بھی برباد کر دیا۔[9] اس طرح اسکندریہ کے ہی یہ دونوں کتاب خانے برباد نہیں ہوئے بلکہ پرگیماس کا علمی ذخیرہ بھی جو کلوپیٹرا کے عہدِ حکومت میں مصر آ چکا تھا برباد ہو گیا۔

اسکندریہ کے کتاب خانے کے جلانے کا حضرت عمرؓ پر اتہام | اسکندریہ کے یہی کتاب خانے ہیں جن کو جلانے کا الزام ساتویں صدی ہجری کے دو مورخ عبداللطیف بغدادی اور علی بن یوسف قفطی کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کی بنیاد پر فاروق اعظم پر لگایا جاتا ہے جس کی حقیقت مشہور مورخ گبن کے

---

[1] تاریخ یوسیفوس فصل اول ترجمہ عربی ص ۴۹-۵۰
[2] نائل انسائکلوپیڈیا ص ۵۲۴
[3] الکافی الجزو الاول ص ۲۰۹
[4] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۶۶
[5] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۵

[6] الکافی الجزو الاول ص ۲۳۳ / معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸
[7] سوانح عمری انیٹونی از پلوٹارک بحوالہ حاشیہ ذیلی معارف جلد نہم نمبر ششم ص ۴۴۶
معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸
[8] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸
[9] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸، انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۶۶

اقرار کے مطابق صرف اتنی ہے کہ پڑھو اور تعجب کرو۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ احمق کے افسانے کا اصل ہیرو یحییٰ نحوی (یوحنا عبرانی میں، جہان انگریزی میں، ژان فرانسیسی میں یوہن جرمنی میں، اس لفظ کی مختلف شکلیں ہیں) جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے مصر کے عامل حضرت عمرو ابن عاص سے یہ کتاب خانہ مانگا تھا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے استصواب کیا۔ حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اگر یہ کتابیں کتاب اللہ کے موافق ہیں تو ان کی ضرورت نہیں۔ کتاب اللہ کافی ہے اور مخالف ہیں تو مضر ہیں۔ بہر حال ان کو جلا دیا جائے چنانچہ ان کے حکم سے یہ کتاب خانہ نذر آتش کر دیا گیا، مسلمانوں کے اسکندریہ کو فتح کرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔[2]

اس بے بنیاد الزام کا ڈھنڈورا متعصب عیسائی مورخین ایک زمانے تک پیٹتے رہے ہیں۔ اس طرح کہ ساری دنیا اس کی بازگشت سے گونج اٹھی لیکن کب تک یہ کاٹھ کی ہانڈی چڑھی رہتی۔ آخر حقیقت بے نقاب ہو کر رہی۔ بجز سر پھروں کے ہر پڑھا لکھا اس الزام کو دہرانے میں اپنی علمی توہین سمجھتا ہے۔ لیکن جہاں تک تدلیس اور تغلیط کا تعلق ہے اب بھی لوگ باز نہیں آتے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انگلستان کا نہایت فاضل اور مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن جو اس الزام کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے حضرت عمرؓ کے سلسلے میں اسکی طرف نفیاً اور اثباتاً کسی قسم کا اشارہ نہیں کرتا۔ اندلس کی عربی ادبیات کے بیان میں اس واقعہ کی طرف ضمناً اشارہ کرتا ہے مگر اس طرح کہ ہر پڑھنے والا یہ سمجھے کہ یہ الزام بالکل صحیح ہے اور ساتھ اپنے علمی وقار کو بھی ٹھیس نہ لگے۔ "تاریخ ادبیات عرب" میں اندلس میں مسلمانوں کے ہشت صد سالہ علمی ذخیرے کی بربادی پر ماتم کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اگرچہ یہ مشتبہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسکندریہ کے کتاب خانے کو جلوا دیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ پادری زمینیر کے تعصب نے مسلمانوں کے اس علمی ذخیرے کو نذر آتش کر دیا۔" حالانکہ نکلسن کو معلوم ہے کہ یہ الزام اب مشتبہ نہیں رہا ہے بلکہ اس کے غلط اور جھوٹے ہونے پر نہایت قوی اور واضح دلائل موجود ہیں۔ وہ صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا ہے بلکہ اس پر ذیلی حاشیہ لکھا ہے کہ "اگرچہ مصر کے جرجی زیدان نے اس الزام کی صحت کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔" ان دونوں عبارتوں کو ملا کر پڑھنے سے ایک عام پڑھنے والے پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے جہاں تک جرجی زیدان کے دلائل کا تعلق ہے محققین نے اسکے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں۔

عراق اور اس کے اطراف

دجلہ اور فرات کے درمیان کا علاقہ آرمینیا کے کوہستانی سلسلے تک قدیم اقوام کی مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کے اختلاط اور تصادم کا آماجگاہ رہا ہے چنانچہ اسکی تاریخ بھی مصر قدیم کی تاریخ کے تقریباً پہلو بہ پہلو رہی ہے۔ اکادی سومیری اشوری کلدانی قوموں کے عروج و زوال، جنگ و صلح اور فتح و شکست کا گہوارہ اس دو آبے کے ہی مختلف مقامات ہیں۔ تہذیب تمدن اور کتاب خانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہذا اس درمیانی علاقے میں کتاب خانوں کا وجود بھی نہایت قدیم زمانے سے ہے جن کی تفصیلات قدامت کی تاریکی میں چھپی ہوئی ہیں۔

سارگن اول کا کتاب خانہ سارگن اول ۳۸۰۰ ق م میں کلدہ کا ایک سامی فرمانروا تھا۔ اپنے عہد حکومت میں اس نے ایک عظیم الشان کتاب خانے کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ کتاب خانہ کلدہ کے مشہور شہر اورک میں واقع تھا۔ اسی مناسبت سے اس شہر کو "کتابوں کا شہر" کہا جاتا تھا۔ اس کتاب خانے میں نجوم، تاریخ، قواعد وغیرہ بہت سے فنون پر ہر قسم کی قدیم اور جدید کتابیں جمع کی گئیں تھیں۔ اس کتاب خانے کے انتظام سے اس عہد کی عام تہذیبی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے تک خود کتاب خانوں نے کتنی حیرتناک ترقی کر لی تھی۔ چنانچہ اس کتاب خانے کی تمام کتابوں پر نمبر شمار درج تھے۔ پورے کتاب خانے کی ایک باقاعدہ فہرست موجود تھی۔ مطالعہ کے شائقین فہرست سے کتاب کا انتخاب کر لیتے تھے اور مطلوبہ کتاب کا نمبر کتاب خانے کے ناظم کو بتا دیتے تھے۔ اور مطلوبہ کتاب ان کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کتاب خانے کی کتابوں پر اسکے ناظم کی مہر ثبت ہوتی تھی۔ کتاب خانے کے ناظم کا نام "ابن سرو" تھا۔ یہ قدیم سے قدیم ناظم کتاب خانے کا نام جس کا اب تک علم ہو سکا ہے۔[1]

---

[1] ڈکلاین اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر از گبن جلد پنجم صفحہ ۵۳۴

[2] دی عرب کانکوئسٹ آف ایجپٹ از بٹلر، [illegible] المعارف جلد نہم / بستانی جلد ششم صفحہ ۲۳۲

[1] تاریخ ملل قدیم صفحہ ۱۰۱، انٹرنیشنل سائکلو پیڈیا جلد دوم صفحہ ۱۹۰، [illegible] جلد ششم صفحہ ۴۰۸

اشور نصر پال کا عام کتاب خانہ اس زمانے میں بہت سے کتاب خانے مختلف شہروں میں موجود تھے جن میں اشور اور نینوا کے کتاب خانے خاص اہمیت اور شہرت رکھتے تھے۔ اشور کا سب سے آخری اور سب سے اہم کتاب خانہ اشور کے بادشاہ اشور نصر پال کا تھا جو ۶۶۸ ق م میں موجود تھا یہ کتاب خانہ تمام رعایا کیلئے عام تھا اور پبلک لائبریری کی حیثیت تھی جس میں عام فائدے کے لئے ہر قسم کی کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ یہ کتاب خانہ ۶۲۶ ق م تک موجود تھا آخر نبو چند نصر کے ہاتھوں سے برباد ہوگیا۔ اس زمانہ میں بھی ایک کتاب خانہ نہ تھا بلکہ اشور نصر پال کے عہد میں اور اس کے بعد بھی ہر بڑے شہر میں کوئی نہ کوئی عام کتاب خانہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔[1]

یونان

یونان کی علمی ترقی اور فلسفے اور حکمت کے مختلف شعبوں میں اس کے کارنامے دنیا کے تاریخی حافظے پر اس طرح ثبت ہیں کہ ان کو کوشش کرکے بھی نہیں مٹایا جاسکتا۔ لیکن جہاں تک کتاب خانوں کا تعلق ہے ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں باضابطہ کتاب خانوں کا وجود زیادہ قدیم نہ ہو لیکن خود علماء کے پاس ذاتی طور پر کتابیں نہ ہوں بہت زیادہ مستبعد ہے۔

ارسطاطالیس کا کتاب خانہ اسٹرابو کے بیان کے مطابق مشہور یونانی فلسفی اور سکندر اعظم کا خاص مصاحب ارسطو (۳۲۲ - ۳۸۵ ق م) پہلا یونانی ہے جسنے کتاب خانہ جمع کیا۔ ارسطو کی علمی حیثیت کا اور ان سہولتوں کا لحاظ کرتے ہوئے جو اس کو کتابیں جمع کرنے میں حاصل تھیں یہ قرین قیاس ہے کہ اس کا کتاب خانہ کتابوں کی تعداد اور ان کی اہمیت دونوں کے اعتبار سے خاص حیثیت رکھتا ہوگا۔ ارسطو کا جمع کیا ہوا یہ کتاب خانہ اس کی موت کے بعد اسکے شاگرد نیلیس کے قبضے میں آیا[2] نیلیس اس کو سیپس لے گیا۔ اس زمانے میں پرگیاس کے بادشاہ خاص طور سے کتابوں کی جستجو اور تلاش میں رہتے تھے۔ نیلیس انہیں کتابیں دینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ ان کی دستبرد سے بچانے کے لئے بعض مؤرخین کے خیال کے مطابق اس نے اس قیمتی کتاب خانے کو زمین میں دفن کردیا۔ اسٹرابو بیان کرتا ہے کہ اس کتاب خانے

[1] تاریخ تمدن قدیمہ ص ۱۰، انٹرنیشنل انسائکلوپیڈیا جلد دوم ص ۱۹۰۰، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم ص ۹۰۔ [2] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۶۶، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم ص ۵۰۶

کو اپیلیکن نے خرید لیا اور ایتھنس لے آیا۔ اپیلیکن کے مرنے کے بعد یہ کتاب خانہ روم آگیا۔ انتی نیوس کا بیان ہے کہ بطلیموس نے اس کتاب خانے کو خرید لیا تھا اور وہ اسکندریہ کے کتاب خانے میں شامل کردیا گیا۔

پیسس ٹریٹس کا کتاب خانہ پیسس ٹریٹس ان یونانیوں میں جو کتابیں جمع کرنے کے شائق تھے خاص شہرت رکھتا تھا۔ اس کا کتاب خانہ کتابوں کی تعداد اور اہمیت دونوں کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتا تھا۔

پالکریٹس اقلیدس نیکاکریٹس یوریپڈیس قبل مسیح صدیوں کے ان علماء میں سے ہیں جن کے کتاب خانے خاص طور پر شہرت اور اہمیت رکھتے تھے

پرگیاس کا کتاب خانہ پرگیاس ایشیا کوچک کا ایک شہر تھا اور اس نام کے صوبے کا پایہ تخت جس کی تقریباً تیسری صدی قبل مسیح میں بنیاد رکھی گئی۔ یہ یونانی مہاجرین کی ایک نوآبادی تھی۔ یہ صوبہ ابتداً مقدونیہ کے تحت تھا اس کے بعد آزاد ہوگیا اور ۱۳۳ ق م میں رومی حکومت کے تحت آگیا۔[1]

جس زمانے میں اسکندریہ کا کتاب خانہ ترقی کر رہا تھا شاہان پرگیاس نے اسکندریہ کے کتاب خانے کی مسابقت میں پرگیاس میں اس کتاب خانے کی بنیاد رکھی اور اس کو ترقی دیکر اسکندریہ کے کتاب خانے سے بڑھا دینے کی ہر طرح کوشش کی۔ مختلف مقامات میں ایجنٹ بھیجے گئے تاکہ جس طرح ممکن ہو کتابیں لائی جائیں۔ گو یہ حقیقت ہے کہ پرگیاس کا یہ کتاب خانہ اسکندریہ کے کتاب خانے سے سبقت تو کیا اسکے مساوی بھی نہ ہوسکا لیکن ان کوششوں کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ دنیا میں اسکندریہ کے بعد دوسرے درجے پر یہی کتاب خانہ تھا تقریباً نصف صدی قبل مسیح تک اس میں دو لاکھ کتابیں جمع ہوچکی تھیں۔ آخر اسی زمانے میں مارک انیٹونی کے حکم سے ملکہ کلوپیٹرا کے حوالے کردیا گیا اور سراپئم کے کتاب خانے میں داخل ہوگیا۔[2]

روم

روم کو اپنے عہد عروج میں ایک زمانے تک کتابوں اور کتاب خانوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی چنانچہ ۱۴۶ ق م میں روم کے بادشاہ سیپیو نے کارتھیج کو فتح کیا اور مال غنیمت کے طور پر ایک کتاب خانہ بھی لایا تو اس کو اپنی طبعی غیر دلچسپی کی بنا پر سوائے چند زراعتی تصانیف کے اور کوئی کتاب پسند نہ آئی اور

[1] نائتل انسائکلوپیڈیا ص ۴۹۴

[2] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸۲، سوانح عمری مارک انٹونی بحوالہ ایشیا ستمبر ۱۹۳۳ء

اُس کو روم میں رکھنے کے بجائے افریقی حکومتوں کو بخش دیا۔ اسکے بعد بھی مختلف شاہانِ روم نے بہت سے کتاب خانے مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کئے ۸۶؁ ق م میں سولا اتھنس سے اپلیکیس کا کتاب خانہ لایا لیکن اُس سے کوئی دلچسپی نہوئی۔ لیکن اسکے بعد سے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا اور اُن کو جمع کرنیکا جذبہ پیدا ہوگیا۔

لوکوس کا کتاب خانہ | لوکوس کا کتاب خانہ اس حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اُس نے دوسرے لوگوں کیلئے نمونے کا کام دیا اور اُس کے بعد سے لوگوں میں عام علمی شوق نے نشو ونما پانا شروع کر دیا۔ اس کتاب خانے کی بنیاد ۶۷؁ ق م میں اس طرح پڑی کہ لوکوس اپنی مشرقی فتوحات کے سلسلے میں مالِ غنیمت میں کتابوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ساتھ لایا اور اُس کو اپنے احباب اور دوسرے اہلِ علم کے مطالعہ کیلئے عام کر دیا۔

سسیرو اور اٹیکس کے کتاب خانے خاص اہمیت رکھتے تھے ان کے مالک سسیرو اور اٹیکس دونوں زیادہ سے زیادہ کتابیں جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح بہت کافی ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔

نجی کتاب خانوں کا شوق بھی روز بروز بڑھتا جارہا تھا جن میں بعض کتاب خانے کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے کافی عظمت رکھتے تھے چنانچہ ٹیرانین کا کتاب خانہ تقریباً تیس ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ سیمونیکس نے اپنے شاگرد گورڈین کے لئے باسٹھ ہزار سے بھی زیادہ کتابیں چھوڑی تھیں۔

روم کا سب سے پہلا عام کتاب خانہ | اووڈ کے قول کے مطابق اس زمانے میں جی ایسینیوس پولیو نے سب سے پہلا عام کتاب خانہ قائم کیا یہ کتاب خانہ ایٹریوم کالیبرٹیٹس میں قائم کیا گیا تھا۔

اکٹیوین کا عام کتاب خانہ | جی ایسینیوس پولیو کے کتاب خانے کے بعد دوسرا شاہی عام کتاب خانہ قیصر آگسٹس نے ۳۳؁ ق م میں اکٹیوین کے نام سے قائم کیا۔ یہ پورٹیکس اکٹیویئے میں قائم کیا گیا۔ یہ کتاب خانہ تقریباً ایک صدی تک رہا آخر ٹیٹس (۷۹ء-۸۱ء) کے زمانے میں جل کر تباہ ہوگیا۔

پلاٹین کا عام کتاب خانہ | یہ کتاب خانہ بھی قیصر آگسٹس نے قائم کیا تھا۔ اسکی کوئی مستقل عمارت نہ تھی بلکہ اپالو کے مندر میں پلاٹین پہاڑی پر قائم کیا گیا تھا اور اس پہاڑی کے نام پر اس کا نام بھی پلاٹین کا کتاب خانہ ہوگیا۔ اس میں

یونانی اور لاطینی دونوں زبانوں کی کتابیں موجود تھیں۔ یہ کتاب خانہ ایک زمانے تک رہا۔ آخر چھٹی صدی ہجری میں پوپ گری گوری کے حکم سے نذرِ آتش کر دیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ دوسرے اتفاقی حادثے میں جل کر تباہ ہوا۔[1]

ایران

یونان و روم بلکہ مصر کی طرح ایران بھی دُنیاءِ قدیم کی تہذیب اور تمدن کے بڑے نمائندوں میں سے ایک ہے۔ اس لئے ایران کے علوم و معارف سے انکار کرنا حقیقۃً اُسکی پرانی تہذیب اور اُس کے قدیم تمدن سے آنکھیں بند کر لینا ہے واقعہ یہ ہے کہ ایران پر سکندر کی سرکردگی میں یونانیوں کے حملے نے جہاں اُنکی قومیت کو عظیم الشان صدمہ پہنچایا وہاں اُن کو اُن کے قدیم علوم و فنون سے اور اُسکے بیش بہا علمی خزانوں سے بھی محروم کر دیا اور وہ علمی حیثیت سے تقریباً برباد ہوگئے۔ جو کچھ رہ گیا وہ بالکل مخلوط غیر منظم اور پارہ پارہ، اس قومی حادثے کے بعد سے اُن کی فطری ذہانت اور دماغی صلاحیت کو پھر اُبھرنے کیلئے تقریباً ہزار سال انتظار کرنا پڑا اور اسلام کے بعد وہ اپنی علمی عظمت کو واپس لا سکے۔ یہی اُنکی علمی بربادی تھی کہ اُن کی کتابوں کے پُرانے ذخیرے یا کتاب خانے سکندر کے حملے کے بعد ختم ہوگئے چنانچہ اُنکے کتاب خانوں کی تاریخ سکندر کے حملے پر ایک حد تک ختم ہو جاتی ہے۔

ایران کا سب سے پہلا کتاب خانہ | ایران کی اپنی قدیم روایت کی بنا پر سب سے پہلا کتاب خانہ طہمورث بن ہوشنگ بن سیامک بن کیومرث نے قائم کیا تھا۔ ایران کے تجربہ کاروں اور ماہرین کے مشورہ اور رائے سے اصفہان میں مقام سارویہ میں اس کتاب خانے کی بنیاد رکھی گئی اور اُس زمانے میں جن جن علوم پر کتابیں موجود تھیں۔ اُن کو بڑی کوشش سے جمع کیا گیا اور اُن کو اس خیال سے کہ آئندہ حوادث سے تباہ و برباد نہ ہو جائیں محفوظ کر دیا گیا۔ مشہور منجم ابو معشر جعفر بن محمد بن عمر البلخی (متوفی ۲۷۲؁ھ) نے اصفہان میں ایک مقام کی کھدائی کے اثناء میں کتابوں کے ایک ذخیرے کو دیکھا تھا جس کے متعلق اس وقت یہی خیال کیا گیا کہ یہ وہی کتاب خانہ ہے[2]

درِ نشت | یہ کتاب خانہ قدیم پارسی پالس یا اصطخر میں واقع تھا اس میں طب فلسفہ نجوم زراعت اور بہت سے دوسرے فنون پر کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ یہ کتاب خانہ سکندر کے حملے تک موجود تھا۔ سکندر نے اسکی کتابوں میں سے بہت سی اہم کتابوں کا ترجمہ اور تعلیم کرا کے اُن کو یہاں کی بہت سی کتابیں [illegible] کیا اور بقیہ کو برباد کر دیا۔

گنج شایگان | [illegible] شایگان کے نام سے سمرقند میں کسی جگہ یہ کتاب خانہ قائم کیا تھا [illegible]

کے حملے تک یہ بھی موجود تھا لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ اس حملے میں دوسرے علمی ذخیروں کی طرح یہ بھی برباد ہوگیا یا کسی دوسرے اتفاقی حادثے کے تحت ختم ہوا۔

اس کتاب خانے کے بعد سے ایران میں باقاعدہ کتاب خانوں کے متعلق عام روایتیں خاموش ہیں۔ اتنا یقینی ہے کہ ایران میں کتابیں موجود تھیں خصوصاً تاریخ اور اخلاقیات پر کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود تھا چنانچہ عہدِ اسلام میں جب تراجم کا دور شروع ہوا ہے تو ان میں سے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا تھا۔[1]

چین

براعظم ایشیا میں چین کی اپنی تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے وہی حیثیت ہے جو افریقہ میں مصر کی ہے لیکن چونکہ چین کے تعلقات دوسرے ممالک سے عام نہیں ہو سکے اس لئے اُسکے متعلق دوسرے ممالک کی تاریخیں خاموش رہیں اور آج اس دورِ تہذیب میں بھی چین کے متعلق عام لوگ اُس سے بہت کم جانتے ہیں جتنا کہ وہ دوسرے ممالک کے متعلق جانتے ہیں۔ اور چونکہ چین کے تعلقات عام نہیں ہوئے اور دوسرے ممالک سے خیالات و نظریات کا تبادل عمومیت کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس لئے اُس کی تہذیب و تمدن، علوم و صنائع میں دوسرے ممالک کا بہت ہی کم حصہ ہو سکتا ہے۔ اُس نے بلا شرکت غیر اپنی تہذیب اور اپنے علوم اور اپنی صنعتیں خود ہی پیدا کیں اور خود ہی نشو و نما دیتا رہا۔ بہرحال چین کی قدامت ایک مسلّمہ حقیقت ہے علم و تہذیب میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کتاب خانوں کا وجود ناگزیر ضرورت ہے چنانچہ چین میں کتاب خانوں کا وجود بھی بہت پُرانے زمانے سے ہے۔

جہاں تک میرے ذرائع علم کا تعلق ہے اُسکی بنا پر چین کے کتاب خانوں کے متعلق تفصیلی اطلاعات بہم نہیں پہنچائی جا سکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۱۳ ق م سے بہت پہلے چین میں ہر قسم کے کتاب خانے کثرت سے تھے جن میں ایک شاہی کتاب خانہ بھی تھا۔ چین خاندان کے چوتھے فرمانروا چی وانگ۔ ٹی متوفی ۲۱۰ ق م نے قانون اور ملکی نظام میں کچھ جدید اصلاحات جاری کرنی چاہی تھیں۔ یہ اصلاحات قدیم رسوم و رواج اور پُرانی کتابوں کے خلاف تھیں۔ لوگوں نے پُرانے رسوم و رواج اور قدیم کتابوں کی بُنیاد پر ان اصلاحات کے خلاف آواز اُٹھانی شروع کر دی۔ چی وانگ ٹی نے اپنے وزیر لی شی کے مشورے سے پورے شاہی کتاب خانے کو آگ لگوا دی اور لوگوں کی ذاتی کتابیں بھی ضبط کر لی گئیں اور اُن کو جلوا دیا گیا۔ جن لوگوں نے کتابیں دینے سے انکار کیا اُن کو قتل کر دیا گیا۔ جیمز کارکرن کے قول کے مطابق ایسے مقتولین کی تعداد چار سو ساٹھ تک پہنچ گئی تھی۔

غالبًا یہ تاریخ میں سب سے پہلا واقعہ تھا کہ کسی قوم کی ادبیات کو ملکی و سیاسی وجوہ کی بنا پر برباد کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً ایک صدی قبل مسیح سے پھر از سر نو کتابوں کے جمع کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی اور جو کتابیں بالکل ضائع ہو گئی تھیں اُن کو حافظے کی مدد سے پھر لکھوانے کی کوشش کی گئی۔ شاہی کتاب خانہ پھر دوسری بار قائم کیا گیا۔[2]

ہندوستان

ہندوستان اپنی تاریخی روایتوں کی نگہداشت میں کمزور رہا ہے چنانچہ خود اہم تاریخی روایات کی شہادتیں نہیں چہ جائیکہ خفیف جزئیات کی۔ اور جو موجود ہیں اُن میں سے حقائق کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ مستند ذرائع کے فقدان کی وجہ سے اور اگر ہوں بھی تو دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے میں ہندوستان کے کتاب خانوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں بہم پہنچا سکا۔

بہرحال قدیم ہندوستان میں بُدھ سے پہلے کسی کتاب خانے کے وجود کا ثبوت نہیں۔ ہاں بدھ کے بعد سے پیروانِ بُدھ کے مندروں اور مدرسوں میں کتاب خانوں کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ چینی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں مدرسوں کے سلسلے میں اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ نالندہ کے کتاب خانے ساتویں صدی عیسوی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ نالندہ کے متعلق بعض سیاحوں کے تاثرات کی تلخیص "قرون وسطیٰ میں ہندوستان کی تہذیب" کے فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں کی ہے[3] جس میں اُس کے کتاب خانوں کا بھی ضمناً تذکرہ کیا ہے۔

ان سب کے ساتھ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم ہندوستان اپنے علوم و فنون خصوصاً فلسفہ اور ریاضیات میں قدیم دُنیا کی علمی نمائندگی کا فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہا تھا۔

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۳۳۳، تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء ص ۳۳، طبری جلد دوم ص ۹، معارف نمبر ۱ جلد دوم ص ۳۲ — [2] تاریخ مملکت چین از جیمز کارکرن جلد دوم ص ۲۴۴، ۲۴۱، ۲۴۳، چائنا از رابرٹ ڈگلس ص ۱۴، ۱۵ — [3] "قرون وسطیٰ میں ہندوستان کی تہذیب" مذکور ہیرا چند اوجھا ص ۱۷۵، ہیونسانگ کے بیانات کی تلخیص

ایشیا۔ مئی سنہ ۱۹۴۲ء

دُکھ

پجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰

حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہم ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلپذیر جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں۔ سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرس وائس"

علی اطہر اور چیخوف

(ڈراما)

آیوانوف

(روسی افسانہ نگار چیخوف کا ایک شاہکار)

(دوسرا اور تیسرا ایکٹ)

[لیبیڈیو کے مکان کا ڈرائنگ روم۔ اسٹیج کے مقابل باغ میں جانے کا دروازہ۔ دائیں اور بائیں بھی دروازے ہیں۔ پرانی وضع کے قیمتی فرنیچر۔ جھاڑ۔ فانوس اور تصویریں۔ سب ڈھکے ہوئے۔)

زنیدہ سوشنا کوسیخ۔ اودوتیا نذارووِنا۔ یگورشکا۔ گیورل۔ ایک ماما۔ بڈھی مہمان عورتیں۔ کچھ نوجوان اور مادام بباکن۔

زنیدہ سوشنا صوفے پر بیٹھی ہیں اُن کے ایک جانب آرام کرسیوں پر بڈھی عورتیں اور دوسری جانب معمولی کرسیوں پر کچھ نوجوان بیٹھے ہیں۔ پس منظر میں باغ کے دروازے کے قریب کچھ لوگ تاش کھیل رہے ہیں۔ کھیلنے والوں میں کوسیخ۔ اودوتیا نذارووِنا اور یگورشکا ہیں۔ گیورل دائیں جانب دروازے کے قریب کھڑا ہے۔ ایک ماما مٹھائیوں کا تھال سبھوں کے پاس باری باری لیجاتی ہے۔ پورے ایکٹ میں مہمان باغ سے دائیں دروازے کی جانب اور پھر واپس آتے جاتے رہتے ہیں۔ مادام بباکن دائیں دروازے سے اندر داخل ہوتی ہیں۔ اور زنیدہ سوشنا کے پاس جاتی ہیں]

زنیدہ:۔ (خوشی میں) پیاری مارفا یگورووِنا!

مادام بباکن:۔ کیسا مزاج ہے زنیدہ سوشنا! بیٹی کی سالگرہ پر میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں (ایک دوسرے کا بوسہ لیتی ہیں) خدا کرے کہ......

زنیدہ:۔ شکریہ۔ ڈارلنگ۔ میں بہت خوش ہوں............ ہاں اور تم کیسی ہو؟

مادام بباکن:۔ بہت بہت شکریہ (اُن کی بغل میں صوفہ پر بیٹھ جاتی ہیں) اور کہو نوجوانو تم لوگ کیسے ہو۔

(مہمان اُٹھتے ہیں اور سر جھکاتے ہیں)

پہلا نوجوان:۔ (ہنستا ہے) نوجوانو!...... تو آپ کیا بڈھی ہو گئیں۔

مادام بباکن:۔ (آہ بھر کر) اور کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جوان ہوں

دعویٰ نہیں کر سکتی

پہلا مہمان :- (ادب کے ساتھ ہنستے ہوئے) اور بھی کچھ کہئے گا!؟
چہرے سے تو آپ بیوہ نہیں معلوم ہوتیں بلکہ جوان چھوکریوں کو
بھی مات کر سکتی ہیں۔ (گیورل مادام بباکن کو جائے دیتا ہے)۔

زنیدہ :- (گیورل سے) اس طرح کیوں لائے ہو؟ تھوڑا سا جام بھی لاؤ
کروندے کا یا اور کسی چیز کا

مادام بباکن : بہن تکلف مت کرو۔ شکریہ ...... (مختصر وقفہ)

پہلا مہمان :- مارفا یگوروونا کیا آپ مشکونن کی راہ سے آئی ہیں۔

مادام بباکن :- نہیں۔ زمشتنشے کی طرف سے۔ ادھر کی سڑک اچھی ہے۔

پہلا مہمان :- ضرور

کوسیخ :- دو کالا پان

یگورشکا :- پاس

اودوتیا :- پاس

دوسرا مہمان :- پاس

۳۸

مادام بباکن :- لاٹری کے ٹکٹ کی قیمت تو حیرت انگیز طریقے پر چڑھ گئی ہے
پیاری زنیدہ اتنی زیادہ قیمت کبھی سُنی بھی نہیں ہے۔ پہلے قرعہ میں
دو سو ستر ہے اور دوسرے میں دو سو پچاس۔ پہلے کبھی اتنی قیمت
نہیں ہوئی تھی۔

زنیدہ :- (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) جن کے پاس زیادہ ہے ان کیلئے اچھی چیز ہے

مادام بباکن :- یہ نہ کہو ڈارلنگ قیمت تو اتنی زیادہ ہے لیکن اس میں روپیہ لگانے
سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صرف بیمہ ہی آدمی کو پاگل بنا دینے کو
کافی ہے۔

زنیدہ :- ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن پیاری اس میں پھر بھی امید تو رہتی
ہے ..... (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) خدا رحیم ہے۔

تیسرا مہمان :- میرا خیال تو یہ ہے خواتین کہ آج کل سرمایہ رکھنے والوں کو
کوئی نفع نہیں۔ تجارت میں روپیہ لگانے سے منافع تو تھوڑا ملتا ہے
لیکن خطرے بہت زیادہ ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمانے
میں جس کے پاس سرمایہ ہے اُس کی حالت زیادہ اندیشناک ہے
بہ نسبت اس شخص کے جو ....

مادام بباکن :- یہ سچ ہے۔
(پہلا مہمان جمائی لیتا ہے)

مادام بباکن :- خواتین کے مجمع میں یہی تہذیب برتی جاتی ہے!؟

پہلا مہمان :- معاف کیجئے خاتون یہ محض اتفاق تھا۔

(زنیدہ سوشنا اُٹھتی ہے اور دائیں دروازے کی طرف جاتی ہے۔
(طویل خاموشی)

یگورشکا :- دو ٹھکری

اودوتیا :- پاس

دوسرا مہمان :- پاس

کوسیخ :- پاس

مادام بباکن :- (علیحدہ) یا اللہ کتنی موت کی سی اُداسی ہے۔
(زنیدہ سوشنا اور لیبیڈیو داخل ہوتے ہیں)

زنیدہ :- (لیبیڈیو کے ساتھ دائیں دروازے سے خاموشی سے آتے ہوئے)
تم وہاں اکیلے چپکے رہنا کیوں چاہتے ہو۔ جیسے تم بہت بڑے آدمی
ہو۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھو
(جہاں پہلے بیٹھی تھی بیٹھ جاتی ہے)

لیبیڈیو :- اُفوہ - اُفوہ (مادام بباکن کو دیکھ کر) واللہ یہاں تو رسگُلّا
بیٹھی ہوئی ہیں۔ (ہاتھ ملاتا ہے) آپکا قیمتی مزاج کیسا ہے۔

مادام بباکن :- بالکل ٹھیک بہت شکریہ۔

لیبیڈیو :- خیر خدا کا شکر ہے (بیٹھ جاتا ہے) ہاں۔ ہاں ..... گیورل
(گیورل ایک گلاس شراب اور پانی کا جگ لاتا ہے۔ وہ شراب
پیتا ہے اور پھر پانی)

پہلا مہمان :- آپ کی بہترین صحت کے لئے۔

لیبیڈیو :- بہترین صحت۔ ضرور ...... مجھے مشکور ہونا چاہئے کہ میں
نے اپنی صحت بالکل تباہ نہ کرلی (اپنی بیوی سے) زیورشکا آج کی
ملکہ کہاں ہے۔

کوسیخ :- (غمگین آواز میں) میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ کیوں ہم لوگوں نے آج ایک
بازی بھی نہیں جیتی (اُچک پڑتا ہے) کیوں ہم تمام بازیاں ہار گئے
خدا مجھے غارت کرے۔

اودوتیا:۔ (کودتی ہے اور غصہ میں کہتی ہے) کیوں؟ جب تم کو کھیلنا نہیں
آتا تو اچھا ہے کہ ایک بازی بھی نہ جیتو۔ آپ کو وہ پتہ چلنے کی
کونسی ضرورت پڑی تھی جو فریق کے پاس زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے
آپ کا یکّہ رکھا کا رکھا رہ گیا۔ (دونوں میز سے آگے کی طرف
دوڑ کر جاتے ہیں)

کوسیخ:۔ (روتی آواز میں) سُنئیے ذرا ...... میرے پاس اکا۔ بادشاہ
بیوی۔ آٹھ اور ٹھکری کے پتے۔ حکم کا اکا اور ایک چھوٹا پان تھا
اور یہ چھوٹا سلام نہ بول سکیں۔ شیطان جانے کیوں۔ میں تو
ٹرمپ بولا تھا۔

اودوتیا:۔ میں تو ٹرمپ بولی تھی۔ تم دو بولے اور نو ٹرمپ ......

کوسیخ:۔ یہ سخت تکلیف دہ ہے ...... معاف کیجئے ....
تمہارے پاس ...... میرے پاس ..... تمہارے
پاس ..... (لیبیڈیو سے) خیال کرو پاؤل کر بیچ ....
میرے پاس۔ اکا۔ بادشاہ۔ بیوی اور آٹھ اور ٹھکریاں تھیں

لیبیڈیو:۔ (اپنی انگلی اُس کے کان میں ڈالتے ہوئے) بُرا نہ مانئے تو
مجھے بخش ہی دیجئے۔

اودوتیا:۔ (چلاتی ہے) میں تو ٹرمپ بولی تھی۔

کوسیخ:۔ (خوفناک آواز میں) میں ذلیل اور کمینہ ہونگا اگر پھر کبھی اُس بُڈھی
چڑیل کے ساتھ کھیلوں۔ (جلدی سے باغ میں چلا جاتا ہے
دوسرا مہمان اُسکے پیچھے جاتا ہے میز پر صرف یگورشکا رہ جاتا ہے)

اودوتیا:۔ اخ۔ میں سر سے پیر تک گرم ہو رہی ہوں ...... چڑیل؟
...... چڑیل وہ خود ہے۔

مادام بباکن:۔ تم جلد باز بھی ہو دادی۔

اودوتیا:۔ (مادام بباکن کو دیکھ کر تیزی سے ہاتھ ملاتی ہے) میری جان
میری مورت۔ تم یہاں ہو اور میں اتنی اندھی ہوں کہ تمہیں دیکھ
بھی نہ سکی ...... میری پیاری ...... (اُسکے کندھے کو
پیار کرتی ہے اور اُس کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے) کتنی خوشی ہوئی
آؤ تمہیں جی بھر کے ذرا دیکھ تو لوں۔ میری سفید بطخ! ......

لیبیڈیو:۔ اب تو تمہیں فرصت ہے ...... بہتر ہوتا کہ تم ان کیلئے
ایک دولھا ڈھونڈھ دیتیں ......

اودوتیا:۔ ضرور، ضرور، میری پُرانی گناہ گار ہڈیاں اس وقت تک قبر میں
نہ جائینگی جب تک کہ میں ان کے لئے دولھا نہ ڈھونڈھ دوں اور ساشا کے
لئے بھی ..... کبھی نہیں! .... (ٹھنڈی سانس لیکر) لیکن آج کل
دولھے ملتے کہاں ہیں؟ آج کل کے نوجوان بیٹھے پر پھڑپھڑاتے رہتے ہیں
جیسے برسات میں مرغے کرتے ہیں۔

تیسرا مہمان:۔ تشبیہ نہایت مہمل ہے۔ میرے خیال میں محترمہ اگر اس
زمانے میں نوجوان کنوارا رہنا پسند کرتے ہیں تو اس کی وجہ آج کل
کی معاشرتی حالت ہے یعنی ....

لیبیڈیو:۔ اچھا، اچھا، وعظ کی ضرورت نہیں! .... میں اسکی
پروا نہیں کرتا ......

(ساشا آتی ہے)

ساشا:۔ (اپنے باپ کے نزدیک جاتی ہے) اتنا بہترین موسم اور آپ
لوگ اس بند کمرے میں بیٹھے ہیں۔

زنیدہ:۔ ساشنکا دیکھتی نہیں کہ مارفا یگوروونا آئی ہیں؟

ساشا:۔ میں نادم ہوں (مادام بباکن کے پاس جاکر ہاتھ ملاتی ہے)

مادام بباکن:۔ تم کچھ مغرور ہوگئی ہو ساشا۔ ایک مرتبہ بھی مجھ سے ملنے
نہیں آئیں (اس کو پیار کرتی ہے) میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں [illegible]

ساشا:۔ شکریہ۔ (اپنے باپ کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے)

لیبیڈیو:۔ ہاں اودوتیا نذاروونا، آج کل کے نوجوان کچھ عجیب طرح کے
ہوتے ہیں۔ دولھا تو کیا شادی وادی کے موقع پر کوئی اچھا
شہ بالا بھی اس زمانے میں نہیں ملتا۔ آج کل کے نوجوان (میرا
اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں) نہایت ڈھیلے اور ڈھیلے ہوتے
ہیں۔ خدا ان کی مدد کرے ...... نہ تو گفتگو کا سلیقہ
جانتے ہیں نہ رقص کرنا اور نہ شراب ہی پینا

اودوتیا:۔ ارے نہیں شراب پینے میں تو سب اُستاد ہیں اگر موقع مل جائے

لیبیڈیو:۔ شراب پینا کوئی مشکل آرٹ تو ہے نہیں۔ گدھا بھی پی سکتا ہے
...... مطلب یہ ہے کہ تہذیب کے ساتھ پینا۔ ہم لوگ جوان تھے
تو دن بھر [illegible] کے ساتھ سر مغزی کرتے رہتے [illegible]

شام ہوئی سب کسی طرف نکل جاتے اور پھر صبح تک لٹو کی طرح چکر لگاتے رہتے
اس درمیان میں کچھ دیر رقص میں حصہ لیتے، کچھ دیر لڑکیوں کا جی بہلاتے اور جی
بھر کے پیتے بھی۔ جہل بکواس کرتے یا فلسفہ چھانٹتے یہاں تک کہ زبانیں تھک
جاتیں ..... لیکن آج کل کے نوجوان ..... (شانہ ہلاتا ہے) انکا تو کچھ
سر پیر ہی سمجھ میں نہیں آتا ...... نہ خدا کے اور نہ شیطان کے۔ ضلع
بھر میں صرف ایک سمجھدار نوجوان ہے اور اسکی شادی ہو چکی ہے (ٹھنڈی
سانس لیتا ہے) اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا دماغ بھی اپنی جگہ سے کھسکنے
لگا ہے ....

مادام بیاکن :۔ وہ کون ہے ؟

لیبیڈیو : نکولاشا آیوانوف ۔

مادام بیاکن :۔ ہاں آدمی تو اچھا ہے (منہ بنا کر) لیکن کچھ بدقسمت ہے .....

زنیدہ :۔ تو خوش قسمت کیسے ہوتا بہن ؟ (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) بیچارے
سے کیسی بھاری غلطی ہوئی! غریب نے یہودن سے شادی کی
اس امید میں کہ ساس سسر بیٹی کے جہیز میں سونے کا پہاڑ دیدینگے
لیکن ہوا بالکل الٹا ..... جب سے اُنا نے مذہب بدلا۔ ماں
باپ نے اس کو ٹھکرا دیا۔ بد دعائیں دینے لگے ..... اسی لئے
اس بیچارے کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ اب پچھتاتا ہے لیکن
تیر کمان سے چھوٹ چکا ہے .....

ساشا :۔ اماں یہ صحیح نہیں ہے ۔

مادام بیاکن :۔ (بگڑ کر) کیا کہا ساشا، صحیح نہیں ہے ؟ ساری دنیا یہ بات جانتی
ہے۔ اگر روپیہ کی غرض نہ ہوتی تو وہ ایک یہودن سے شادی ہی
کیوں کرتا ؟ سینکڑوں روسی لڑکیاں موجود تھیں یا نہیں ؟ بات
یہی ہے ڈارلنگ کہ اس سے چوک ہوئی، سخت چوک .....
(ذرا جوش کے ساتھ) اور میں کہتی ہوں کہ اُنا کے ساتھ اس کا سلوک
کیسا ہے ! نہایت ہی پُر لطف۔ جیسے ہی وہ گھر پہنچتا ہے بیوی پر
برس پڑتا ہے، "تمہارے ماں باپ نے مجھے دھوکا دیا نکل جاؤ
میرے گھر سے" وہ بیچاری بھلا جائے کہاں ؟ ماں باپ اسکو
اپنے گھر میں قدم نہیں رکھنے دینگے، ماما گیری کر سکتی ہے لیکن
اس کو کام کاج سے کبھی واسطہ نہیں رہا ..... اسی طرح
اسکو ستاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کاؤنٹ غریب کو اسکی حمایت
کرنی پڑتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ کاؤنٹ نہ ہوتا تو وہ ایسے سلوک
سے کب کی مر چکی ہوتی ....

اودوتیا :۔ اور کبھی کبھی تو وہ اس کو تہ خانہ میں بند کر دیتا ہے اور شلجم
کھانے پر مجبور کرتا ہے .... وہ بیچاری کھاتی ہے اور
کھاتے کھاتے بیمار پڑ جاتی ہے (قہقہہ)

ساشا :۔ ابا جان یہ بالکل جھوٹ ہے آپ تو جانتے ہیں !

لیبیڈیو :۔ تو میں کیا کروں ؟ بکنے دو ان لوگوں کو ..... (پکارتا
ہے) گیورل !

(گیورل اس کو شراب اور پانی بڑھاتا ہے)

زنیدہ :۔ یہ ہے داستان اسکی تباہی کی۔ بیچارہ ! اس کی حالت خراب
ہو رہی ہے بہن ..... اگر بورکن اسکی جائداد کی دیکھ بھال
نہ کرتا تو وہ اور اسکی یہودن فاقہ کرتے (ٹھنڈی سانس لیتی ہے)
اور اسکی وجہ سے ہم لوگوں کو کتنا نقصان اٹھانا پڑا .....
خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی وجہ سے کتنا گھاٹا ہوا ! تم یقین
نہیں کرو گی بہن گزشتہ تین سال سے ہمارے نو ہزار روپے
اس پر واجب ہیں !

مادام بیاکن :۔ (چونک کر) نو ہزار روپے ؟

زنیدہ :۔ ہاں ..... یہ میرے رحم دل لیشنکا کی رائے تھی کہ اسکو قرض
دینا چاہیئے۔ یہ تو بالکل جانتے ہی نہیں کہ قرض کس کو دینا چاہیئے
اور کس کو نہیں۔ اصل تو الگ ہی رہا۔ اس کی فکر ہی بیکار ہے
لیکن سود تو کم از کم پابندی سے ادا کرنا چاہیئے تھا

ساشا :۔ (غصہ میں) اماں آپ ہزاروں مرتبہ اس کا تذکرہ کر چکی ہیں

زنیدہ :۔ تو تمہارا اس میں کیا بگڑتا ہے ؟ تم کیوں اسکی وکالت کر رہی ہو ؟

ساشا :۔ لیکن آپ کیسے اس طریقے سے ایک ایسے شخص کے بارے میں
اس قسم کی گفتگو کر سکتی ہیں جس نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ؟
آخر انہوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے

تیسرا مہمان :۔ الیگزنڈر یو لونا، میری بھی دو باتیں سن لیجئے، میرے دل
میں نکولائی الیگزنڈرو چ کی بڑی عزت ہے اور اس [illegible]

...... لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ میرے خیال میں وہ ایک موقعہ باز آدمی ہے ۔

ساشا: بہت خوب! میں آپ کو آپ کے اس خیال پر مبارکباد دیتی ہوں!

تیسرا مہمان: ۔اور اسکے ثبوت میں ایک واقعہ سُن لیجیئے جو مجھ سے اسکے دُم چھلا یار از دار بورکن نے بیان کیا تھا۔ دو سال ہوئے کہ مویشیوں میں پلیگ پھیل گیا تھا اس نے مویشیاں خرید کر ان کا بیمہ کرالیا......

زنیدہ: ۔ہاں ہاں ہاں۔ مجھے وہ واقعہ یاد ہے مجھ سے بھی کسی نے ذکر کیا تھا۔

تیسرا مہمان: ۔جی ہاں تو اس نے بیمہ کرالیا۔ اسے یاد رکھیئے گا۔ اسکے بعد مویشیوں میں پلیگ کے جراثیم کو مصنوعی طریقے سے پھیلایا اور اس طرح بیمہ کا روپیہ مار لیا۔

ساشا: ۔اخ۔ یہ سب نہایت بیہودہ بکواس ہے۔ نہ تو کسی نے مویشی خریدے اور نہ پلیگ پھیلایا۔ یہ سب بورکن کے دماغ کی تخلیق تھی اور وہ اس اسکیم کا فخریہ ذکر کرتا پھرتا تھا' جب آیوانوف نے سُنا تو اسکے سامنے ہفتوں پیشانی رگڑی تب معافی ملی۔ آیوانوف کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ کمزور ہے اور اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ اس بورکن نمک حرام کو نکال باہر کردے۔ اور وہ صرف اس لئے ملامت کا مستحق ہے کہ وہ لوگوں پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ ہر طرح سے لوگوں نے اس کو لوٹا اور تباہ کیا ہے۔ اس کی فیاضانہ اسکیموں کی بدولت جس سے جس سے ہوسکا اس نے روپیہ بنایا۔

لیبیڈیو: ۔ساشا تم بہت تیز زبان ہو۔ چُپ رہو!

ساشا: ۔تو کیوں یہ لوگ اس قسم کی مہمل بکواس کرتے ہیں! یہ بہت تکلیف دہ اور اُکتا دینے والی حرکت ہے! آیوانوف، آیوانوف، آیوانوف، ہر وقت آیوانوف، اور کوئی دوسرا تذکرہ ہی نہیں۔ (دروازہ کی طرف جاکر پلٹ پڑتی ہے) مجھے حیرت ہے (نوجوانوں کو مخاطب کرکے) مجھے حیرت ہے آپ حضرات کے صبر پر! کیا اس طرح چپ چاپ بیٹھے بیٹھے تھک نہیں جاتے؟ یہاں کی تو ہوا میں بھی اُکتاہٹ ہے۔ کچھ بولئے، لڑکیوں کی خاطر کیجیئے، ادھر اُدھر چلئے پھرئیے۔ اگر آپ کے پاس گفتگو کیلئے آیوانوف کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع نہیں تو آئیے سب مل کر ہنسیں، گائیں، ناچیں یا کچھ ....

لیبیڈیو: ۔(ہنستے ہوئے) ہاں ہاں خوب خبر لو ان لوگوں کی۔

ساشا: ۔آئیے میں کہتی ہوں میری ہی خاطر کچھ کیجیئے۔ اگر آپ ہنسنا، ناچنا یا گانا نہیں چاہتے۔ اگر ان باتوں سے طبیعت گھبراتی ہے تو میں درخواست کرتی ہوں، التجا کرتی ہوں۔ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ تو۔ محض عجوبہ کے طور پر کچھ ایسا کیجئے کہ ہم لوگ متحیر ہو جائیں یا ہمارا دل بہل جائے۔ کوشش تو کیجیئے۔ سب مل کر شاندار پُر لطف بات سوچیئے۔ کچھ بات ہی کیجیئے بلا سے بازاری ہی کیوں نہ ہو لیکن دل خوش کن اور نئی ہونی چاہیئے! یا سب مل کر کچھ ایسا کام کیجیئے، چھوٹا ہی سا سہی، کہ یہ نوجوان لڑکیاں زندگی میں ایک مرتبہ تو آپ کو دیکھ کر (واہ) چلا اُٹھیں آپ آپ ہم لوگوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں، چاہتے ہیں یا نہیں؟ تو کیوں خوش کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ لیکن بات یہ ہے کہ آپ لوگ کسی کام کے نہیں۔ آپ میں سے کوئی بھی کسی کام کا نہیں...... اس فضا میں تو مکھیاں بھی مارے اکتاہٹ کے مرجائیں اور آپ کو دیکھ کر شمع سے بھی دھواں اٹھنے لگے ...... آپ لوگ بالکل کسی مصرف کے نہیں، کوئی بھی نہیں ...... میں پہلے بھی ہزاروں مرتبہ آپ سے کہہ چکی ہوں اور ہمیشہ کہتی رہوں گی۔

(آیوانوف اور شیبلسکی داخل ہوتے ہیں)

شیبلسکی: ۔(آیوانوف کے ساتھ داہنے دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے) یہاں وعظ کون صاحب فرما رہے تھے؟ تم تھیں ساشا؟ (ہنستا ہے اور اس سے ہاتھ ملاتا ہے) خوش رہو خوش رہو میری فرشتہ۔ خدا کرے تم عمر خضر پاؤ اور مرکر پھر پیدا ہو ......

زنیدہ: ۔(خوش ہوکر) نکولائی الیکزیوچ! کاؤنٹ!

لیبیڈیو: ۔ارے، یہ میں کس کو دیکھ رہا ہوں ...... کاؤنٹ (اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھتا ہے)۔

شیبلسکی: ۔زنیدہ، ساشا اور نادا مہمانوں کے

بیٹھتا ہے) ایک صوفے پر دو سونے کی چڑیا . . . .
کتنا مسرت بخش منظر ہے (ہاتھ ملاتا ہے، پھر زنیدہ سوشا کو
مخاطب کرتا ہے) تم کیسی ہو زیوشکا؟ . . . . . (مادام بیاکن سے)
اور تم کیسی ہو پیٹرا؟

زنیدہ:- بڑی خوشی ہوئی کاؤنٹ تم تو بالکل عید کے چاند ہو (چلا کر کہتی ہے)
گیورل چاء لاؤ! آپ لوگ تشریف رکھیں (اُٹھتی ہے، داہنے
دروازہ سے باہر جاتی ہے پھر فوراً لوٹ آتی ہے- چہرے سے
معلوم ہوتا ہے کسی سوچ میں ہے، ساشا جہاں پہلے بیٹھی تھی وہیں
پھر بیٹھ جاتی ہے- آیوانوف خاموشی کے ساتھ سبھوں سے ملتا ہے)

لیبیڈیو:- یہ تم کہاں سے نازل ہو گئے؟ کیسے کیسے راستہ بھول گئے؟ میں تو
حیرت میں پڑ گیا! (اس کو بوسہ دیتا ہے) کاؤنٹ تم نہایت ہی شریر ہو
شریفوں کا یہ رویہ ہوتا ہے؟ (ہاتھ پکڑ کر اس کو روشنی کے پاس
لے جاتا ہے) تم ہمارے یہاں آتے کیوں نہیں؟ کچھ خفا ہو یا
کیا بات ہے؟

شیبلسکی:- میں کیسے آسکتا ہوں؟ کیا چھڑی پر سوار ہو کر آؤں؟ میرے
پاس اپنی کوئی سواری نہیں اور نکولائی مجھے اپنے ساتھ لانا نہیں
چاہتا، وہ کہتا ہے کہ میں سارہ کے پاس رہا کروں تاکہ
وہ تنہائی محسوس کرے اپنے گھوڑے بھیج دیا کرو تو آجایا کروں گا . . . .

لیبیڈیو:- (ہاتھ ہلا کر) ارے بھئی، میں گھوڑوں کو ہاتھ بھی لگاؤں تو
زیوشکا مجھ پر برس پڑے گی- میرے پیارے دوست ڈارلنگ
تم جانتے ہو کہ تم میرے عزیزترین اور قریب ترین دوست ہو،
پُرانے لوگوں میں ص[illegible] اور تم بچ گئے ہیں، تمہیں دیکھکر میں اپنے
ماضی [illegible] نے لگتا ہوں اور مجھے اپنی خوبصورت
[illegible] بے پروائی سے لٹا دیا . . . .
[illegible] روؤں (کاؤنٹ کو پیار کرتا ہے)
[illegible] کی طرح مہک رہے ہو . . . .
[illegible] پُرانے دوستوں کو
[illegible] جاہتا ہے پھانسی
اپنے [illegible] ٹھورنے کے جنون میں
اس کو کام کاج [illegible]

تمام اچھے لوگوں کو بھڑکا دیا ہے، دیکھ لو سوائے زلو کے کوئی بھی
دلچسپ آدمی نہیں رہا . . . . . بس صرف ڈوکن پڑکن رہ گئے
ہیں . . . . . آؤ چاء پیو-
(گیورل شیبلسکی کے لئے چاء لاتا ہے)

زنیدہ:- (بے چین انداز میں گیورل سے) تم کیا کررہے ہو؟ جام لے
آؤ یا اور کوئی چیز . . . . . .

شیبلسکی:- (ہنس کر آیوانوف سے) دیکھو میں نے تم سے کہا تھا نہ؟
(لیبیڈیو سے) میں نے راستہ میں شرط لگی تھی کہ جیسے ہی ہم یہاں
پہنچینگے، زیوشکا جام سے ہم لوگوں کی خاطر کرینگی-

زنیدہ:- کاؤنٹ ابھی تک تمہاری مذاق کی عادت نہ گئی (بیٹھ جاتی ہے)

لیبیڈیو:- انہوں نے دو درجن جام بنوائے ہیں، آخر اسکی کھپت کیسے ہو؟

شیبلسکی:- (میز کے قریب بیٹھتے ہوئے) تم خوب روپیہ جمع کر رہی ہو زیوشکا
کیوں؟ میرا خیال ہے اب تک لکھ پتی ہو چکی ہو گی- ہے نا؟

زنیدہ:- (ٹھنڈی سانس لیکر) ہاں، باہر والے یہی سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کے
مقابلہ میں زیادہ روپیہ رکھتے ہیں- لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ آخر
روپیہ ہم لوگوں کے پاس آیا کہاں سے؟ یہ سب صرف گپ ہے . . .

شیبلسکی:- رہنے بھی دو، ہم لوگ سب جانتے ہیں . . . . . خوب
جانتے ہیں کہ یہ کھیل تم کتنی خوبی سے کھیلتی ہو- (لیبیڈیو سے)
پاشا تم سچ بتاؤ، دس لاکھ جمع کر لئے ہیں یا نہیں؟

لیبیڈیو:- مجھے کچھ نہیں معلوم، زیوشکا سے پوچھو . . . .

شیبلسکی:- (مادام بیاکن سے) اور ہماری چھوٹی موٹی بطخ کے پاس
بھی جلد ہی دس لاکھ جمع ہو جائینگے- اس کا جسم تو روز بروز
کیا ہر ہر گھنٹہ گداز اور خوبصورت ہوتا جارہا ہے، یہ خاص
دولتمندی کی علامت ہے . . . . . .

مادام بیاکن:- میں جناب والا کی نہایت ہی ممنون ہوں لیکن مجھے اس کا
شوق نہیں کہ میرا مذاق اُڑایا جائے-

شیبلسکی:- میری پیاری سونے کی گڑیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارا مذاق
اُڑا رہا ہوں- یہ تو میرے دل کی آواز تھی، دل کی سیری ہی سے
زبان کھلتی ہے . . . . . تم سے اور زیوشکا سے مجھے جتنی

محبت ہے اس کی کوئی انتہا نہیں۔ (پر سرور لہجے میں) تم میں سے کسی کو دیکھتا ہوں تو ایک بے پناہ مسرت، ایک خاص انبساط محسوس کرتا ہوں۔ دل ایک خاص کیفیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

زنیدہ:۔ ابھی تک تم بالکل پہلے ہی جیسے ہو۔ (یگور فشکا سے) یگورشکا بروشنی بجھا دو۔ کھیل نہیں ہو رہا ہے؟ (یگورشکا اُٹھ کر روشنی بجھاتا ہے اور پھر بیٹھ جاتا ہے) (آیوانوف کو مخاطب کر کے) نکولائی الیکزیوچ تمہاری بیوی کیسی ہیں؟

آیوانوف:۔ بہت بیمار ہیں، آج ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ ان کو یقینی تپ دق ہے۔

زنیدہ:۔ واقعی؟ بڑا افسوس ہے۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) ہم سب انہیں بہت چاہتے ہیں۔

شیبلسکی:۔ مہمل، مہمل، بالکل مہمل۔۔۔۔ اس کو دق وق کچھ بھی نہیں یہ سب نیم حکیمی ہے۔ ڈاکٹروں کی چال ہے۔ یہ حضرت اس مکان کا چکر لگاتے رہنا چاہتے ہیں اس لئے دق تشخیص کی ہے۔ خوش قسمتی سے شوہر صاحب میں رقابت نہیں (آیوانوف ایسی حرکت کرتا ہے جس سے بے صبری ظاہر ہوتی ہے) اور جہاں تک سارہ کا تعلق ہے میں اس کی کسی بات، کسی بات پہ بھروسہ نہیں کرتا، میں نے زندگی میں کبھی ڈاکٹروں، وکیلوں اور عورتوں کا اعتبار نہیں کیا، یہ سب مہمل ہے، نیم حکیمی اور چالبازی

لیبیڈیو:۔ (شیبلسکی سے) تم عجیب آدمی ہو باتونی۔۔۔۔ تم نے دنیا جہان سے نفرت کرنے کا بناوٹی طریقہ اختیار کیا ہے اور اس کی اس طرح نمائش کرتے ہو جیسے ایک احمق نئی ٹوپی کی۔ تم بھی دوسروں کی طرح ایک انسان ہو لیکن باتوں میں ایسے چڑچڑی ہو جیسے تمہاری زبان میں کوئی آبلہ ہو یا تمہیں بدہضمی کی شکایت ہو گئی ہو

شیبلسکی:۔ کیوں کیا تم چاہتے ہو کہ میں لچوں اور بدمعاشوں کو پیار کرتا پھروں یا کیا؟

لیبیڈیو:۔ تم نے لچے اور بدمعاش کہاں دیکھے؟

شیبلسکی:۔ یہاں جو لوگ موجود ہیں ان کی طرف میرا اشارہ نہیں ہے

لیبیڈیو:۔ پھر تم نے اگر مگر شروع کیا۔۔۔۔ یہ سب مکاری ہے

شیبلسکی:۔ مکاری؟۔۔۔۔ بہت اچھا ہے کہ تمہاری زندگی کا کوئی اصول نہیں

لیبیڈیو:۔ میری زندگی کا اصول کیا ہو سکتا ہے۔ بیٹھا ہوا ہر لمحہ پیالے کے لبریز ہونے کا انتظار کیا کرتا ہوں۔ یہی میری زندگی کا اصول ہے بڑے میاں ہمارے اور تمہارے لئے زندگی کے اصول کا تذکرہ کرنے کا وقت نہیں، وہ زمانہ گزر چکا۔ جی ہاں (چلا کر پکارتا ہے) گیورل!

شیبلسکی:۔ کیا بار بار گیورل کو پکارتے ہو۔۔۔۔۔۔ ابھی سے تمہاری ناک چقندر کی جڑ کی طرح سرخ ہو رہی ہے۔

لیبیڈیو:۔ (پیتا ہے) کچھ پرواہ نہیں، پیارے دوست۔۔۔۔ آج کچھ میرا بیاہ تو ہے نہیں

زنیدہ:۔ بہت دنوں سے ڈاکٹر لووو ہم لوگوں سے ملنے نہیں آئے انہوں نے ہم لوگوں کو بالکل چھوڑ دیا۔

ساشا:۔ مجھے اُلٹی بغض ہے اس شخص سے۔ ایمانداری کا چلتا پھرتا مجسمہ وہ ایک گلاس پانی یا ایک سگریٹ بھی اپنی غیر معمولی ایمانداری کی نمائش کئے بغیر نہیں پی سکتا۔ جب وہ چلتا ہے باتیں کرتا ہے تو گویا اسکے چہرے پر لیبل لگا رہتا ہے کہ "میں ایماندار آدمی ہوں" مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔

شیبلسکی:۔ وہ بڑا ضدی اور تنگ نظر آدمی ہے (نقل کرتے ہوئے) ایماندار کی محنت کیلئے راستہ خالی کر دو۔ کوے کی طرف ہر قدم پر چلاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ڈوبرلیوبوف ثانی ہے۔ اسکے خیالات بھی حیرت انگیز ہیں۔ اگر کوئی کسان ذرا خوش حال ہے اور آدمی کی طرح رہتا ہے تو بس وہ بدمعاش اور خون چوسنے والا ہو گیا میں نے کسی دن مخمل کا جیکٹ پہن لیا اور نوکر نے مجھے کپڑے پہنا دیئے بس میں بدمعاش اور غلام رکھنے والا ہو گیا۔ وہ مارے ایمانداری کے پھٹا پڑتا ہے۔ آپ کے معیار پر کوئی پورا نہیں اترتی۔ مجھے تو واقعی اس سے ڈر لگتا ہے۔۔۔۔ اللہ! نہیں معلوم کس وقت ایک طمانچہ لگا دے۔ یا احساس فرض میں گالی دے بیٹھے

آیوالنوف :- میں بھی اس سے بہت تنگ رہتا ہوں لیکن ساتھ ہی میں اسے
پسند بھی کرتا ہوں۔ آدمی نہایت مخلص ہے ۔
شیلسکی :- جی ہاں۔ کیا اخلاص ہے! کل میرے پاس آیا اور بلاوجہ کہنے لگا
"کاؤنٹ تم مجھے بہت مکروہ معلوم ہوتے ہو" بڑا احسان فرمایا جناب
نے۔ اور یہ سب حرکتیں کچھ یونہی نہیں کرتا بلکہ اصول کی خاطر۔ اسکی
آواز میں لرزش ہوتی ہے۔ آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور سر سے پیر تک
کانپنے لگتا ہے ...... خدا غارت کرے ایسے خشک اخلاص
مجھ سے نفرت کرتا ہے کرے۔ کوفت ہوتی ہے ہو۔ یہ قدرتی بات
ہے میں اسے سمجھ سکتا ہوں لیکن رو در رو مجھ سے ایسا کہنے کی کیا
ضرورت ہے۔ میں ایک تباہ حال انسان ہوں۔ پھر بھی میرے بال
سفید ہو چکے ہیں ..... یہ ایمانداری کیا ہے حماقت اور بیرحمی ہے!
لیبیڈیو :- جانے دو بھئی جانے دو ...... تم بھی کبھی جوان تھے اور نوجوانوں
کی حماقتوں کو در گذر کر سکتے ہو
شیلسکی :- ہاں میں بھی جوان اور احمق رہ چکا ہوں۔ میں بھی اپنے دنوں میں
شاتسکی بنا پھرتا تھا۔ میں نے بھی بدمعاشوں اور لچوں کو برا بھلا
کہا ہے لیکن زندگی میں کبھی کسی چور کو اسکے منہ پر چور نہیں کہا ہے
نہ پھانسی پائے ہوئے شخص کے مکان پر کبھی پھانسی کے تختے کا
ذکر کیا۔ میری تربیت اچھی ہوئی تھی۔ لیکن آپ کے کوڑھ مغز ڈاکٹر
صاحب تو ایسے ہیں کہ اگر قسمت سے ان کو اپنے اصول اور انسانیت
کے مقاصد اعلیٰ کی خاطر سر بازار میرے منہ پر ایک چانٹا یا پیٹ میں
ایک گھونسہ مارنے کا موقع مل جائے تو خوشی کے مارے ساتویں
آسمان پر پہنچ جائینگے اور سمجھینگے کہ اپنی زندگی کا مشن پورا کر رہے ہیں
لیبیڈیو :- نوجوان ہمیشہ اپنی قابلیت جتاتے ہیں۔ میرے ایک چچا تھے ہیگل
کے پیرو ...... وہ اپنے ہاں ایک جم غفیر کی دعوت کرتے۔ انکے
ساتھ شراب پیتے اور پھر کرسی پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کرتے "تم لوگ
جاہل ہو، تاریکی کے ستون ہو، نئی زندگی کی کرنیں پھوٹنے والی ہیں
وغیرہ وغیرہ ..... اس طرح بکے جاتے ۔
ساشا :- اور مہمان کیا کرتے تھے ؟
لیبیڈیو :- اوہ کچھ نہیں ...... بیٹھے سنتے رہتے اور شراب پیتے۔ البتہ

۴۳

میں نے ایک مرتبہ ان کو ڈوئیل لڑنے کا چیلنج دیا ...... اپنے
چچا کو۔ جھگڑا بیکن کے بارے میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے
میں ماتوی کی جگہ پر بیٹھا تھا اور چچا اور گراش بلیچ گویا اسی جگہ کھڑے
تھے جہاں اس وقت نکولائی ہے ...... گراش بلیچ نے
ایک سوال کیا ......
(بورکن بھڑکیلا لباس پہنے ہاتھ میں ایک پارسل لئے دائیں دروازے
سے داخل ہوتا ہے گنگناتا اور پھسلتا جاتا ہے ... خوشی
کی لہر دوڑ جاتی ہے)
نوجوان خواتین :- مائیبل مائیسلچ ۔
لیبیڈیو :- مائیبل مائیسلچ! میرے کان کہتے ہیں ....
شیلسکی :- مجمع کی روح ۔
بورکن :- میں حاضر ہوں! (دوڑ کر ساشا کی طرف جاتا ہے) محترم خاتون!
میں کائنات کو آپ کے جیسے شاندار پھول کی پیدائش پر مبارکباد
دینے کی جرأت کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ وہ تاریک رات کو اسی طرح
روشن کر دیں جس طرح آپ تاریکی کی سلطنت کو روشن کر رہی ہیں۔
(ڈرامائی طور پر جھکتا ہے)
ساشا :- شکریہ ......
لیبیڈیو :- (آیوالنوف) تم اس بیہودہ سے اپنا پیچھا کیوں نہیں چھڑاتے ؟
بورکن :- (لیبیڈیو سے) پاول کیرلیچ کی خدمت میں تسلیمات! (آیوالنوف سے) اور
اپنے سرپرست کی خدمت میں بھی! (گاتا ہے اور مجمع کے چاروں طرف
چکر لگاتا ہے) معزز ترین زنیدہ سوشا کی خدمت میں بھی! فرشتہ
خصلت مارفا یگوروونا ...... قدیم ترین ہستی اووقیتا ندرونا
...... مقتدر کاؤنٹ ......
شیلسکی :- (ہنستا ہے) مجمع کی روح ...... جہاں کہیں پہنچتا ہے فضا
ہلکی ہو جاتی ہے۔ تم نے غور کیا ہے ؟
بورکن :- اف میں تھک گیا ...... میں سمجھتا ہوں میں تمام لوگوں کی خدمت
میں تسلیمات عرض کر چکا ہوں۔ اچھا تو کیا خبر ہے خواتین و حضرات ؟
ہماری طبیعتوں کو ابھارنے والی کوئی خاص بات نہیں۔ (انتہائی جوش کے
ساتھ زنیدہ سوشا کو مخاطب کرتا ہے) سنئے تو ماما ۔ آتے ہوئے

راستہ میں..... (گھوڑ سے) جائے ملانا گیورل لیکن کوئے کا جام
ملانا۔ (زنیدہ سے) ہاں تو آتے ہوئے راستہ میں میں نے کچھ کسانوں
کو دیکھا آپ کے سرکنڈہ کی چھڑیاں توڑتے ہوئے دیکھا اسے بیچ
کیوں نہیں دیتیں؟

لیبیڈیو:۔ (آیوانوف سے) کیوں نہیں تم اس بیہودن سے نجات حاصل کرتے؟

زنیدہ:۔ (بھونچکی ہو کر) ٹھیک تو مجھے ضرور ہی کرنا چاہئے کبھی خیال ہی نہیں کیا

بورکن:۔ (بازوؤں کی ورزش کرتا ہے) ورزش کے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔
..... ماما میں کونسا کام کروں جو غیر معمولی ہو؟ مارفا گیورووِنا
میں آج ہوں ذرا سرور میں۔ جوش سے بے قابو (گاتا ہے)
پھر تیرے سامنے میں حاضر ہوں ......

زنیدہ:۔ کچھ کرو کیونکہ ہم سب اُداس ہیں۔

بورکن:۔ واقعی؟ کیوں آپ لوگ اتنے دل برداشتہ کیوں ہیں؟ اس طرح
بیٹھے ہیں جس طرح اراکین جوری..... چلئے کچھ کیا جائے۔ آپ
لوگ کیا چاہتے ہیں۔ تاش۔ کبڈی۔ آنکھ مچولی۔ رقص یا
آتشبازی؟

نوجوان خواتین:۔ (تالیاں بجا کر) آتشبازی، آتشبازی (دوڑ کر باغ میں
جاتی ہیں)۔

ساشا:۔ (آیوانوف سے) اس وقت آپ اتنے سست کیوں ہیں؟

آیوانوف:۔ سر میں درد ہے ساشا اور کوفت ہو رہی ہے

ساشا:۔ ملاقات کے کمرے میں آئیے۔ (وہ دونوں دائیں دروازے کی
طرف جاتے ہیں۔ دوسرے تمام لوگ باغ میں چلے جاتے ہیں سوائے
زنیدہ سوشا اور لیبیڈیو کے)

زنیدہ:۔ ہاں یہ ہے ایک نوجوان۔ آتے ہوئے ایک منٹ بھی نہ گزرا کہ
سبھوں کو خوش کر دیا (بڑا لیمپ بجھا دیتی ہے) اب سب لوگ باغ میں
چلے گئے تو بیکار موم بتیاں ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ (بتیاں
بجھا دیتی ہے)۔

لیبیڈیو:۔ (اس کے پیچھے پیچھے) زنیدہ ان مہمانوں کے لئے کھانے کا کچھ انتظام
کرنا چاہئے.......

زنیدہ:۔ کتنی موم بتیاں [illegible] ضائع گئیں (آیئے [illegible]

دروازہ کی طرف جاتی ہے)۔

لیبیڈیو:۔ خود (باغ میں چلا جاتا ہے)

(آیوانوف اور ساشا داخل ہوتے ہیں)

ساشا:۔ (دائیں دروازہ سے آیوانوف کے ساتھ آتی ہے) سب لوگ
باغ میں چلے گئے۔

آیوانوف:۔ تو ساشا یہی میرا حال ہے۔ پہلے میں بہت کام کرتا تھا۔
خوب سوچتا تھا اور کبھی نہیں تھکتا تھا۔ اب نہ کوئی کام کرتا ہوں
نہ سوچتا ہوں۔ پھر بھی جسم اور روح دونوں تھکے رہتے ہیں
میرے ضمیر میں دن رات ایک چبھن سی رہتی ہے میں محسوس کرتا
ہوں کہ قصور سراسر میرا ہی ہے لیکن یہ قصور ہے کیا یہ نہیں جانتا
اسپر بیوی کی بیماری، روپیہ پیسہ کی تنگی۔ ہمیشہ کی ڈانٹ ڈپٹ
اور طرح طرح کی افواہ، غیر ضروری باتیں۔ وہ بیوقوف بورکن
..... گھر کاٹے کھاتا ہے اور وہاں رہنا ایک مصیبت ہے
میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میری بیوی مجھ سے محبت
کرتی ہے پھر بھی اسکے ساتھ رہنا ناقابل برداشت ہے تم
ایک زمانہ سے میری دوست ہو سچ بات کہنے سے خفا نہ ہونا تمہارے
پاس اس خیال سے آیا تھا کہ شاید کچھ سکون میسر ہو۔ لیکن یہاں
بھی کوفت ہو رہی ہے اور اب گھر جانے کے لئے بے چین ہوں
معاف کرنا چپکے سے نکل جاتا ہوں۔

ساشا:۔ نکولائی الیکسیوچ میں تمہارے دل کی کیفیت اچھی طرح سمجھتی ہوں
تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم بالکل تنہا ہو۔ تمہارے ساتھ ایک ایسا
آدمی ہونا چاہئے جس سے تم محبت کرتے ہو اور جو تمہیں سمجھے محبت
کے علاوہ تمہارا دوسرا علاج نہیں

آیوانوف:۔ اوہ ابھی کچھ کہو ساشا۔ میرے جیسے پریشان خستہ حال انسان
کیلئے نئے سرے سے عشق و محبت شاید دوسرے جنم میں ہو۔ خدا
مجھے اس عذاب سے بچائے۔ نہیں میری چھوٹی سی عقلمند دوست
میری اس حالت کا محبت سے کوئی تعلق نہیں [illegible]
کو میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں مصیبت [illegible]
کی [illegible] قبل از وقت بڑھاپا، تنہائی سب کچھ لیکن اپنے آپ سے

نفرت، یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس خیال سے مارے شرم کے
مر جانا چاہتا ہوں کہ میرے جیسا مضبوط اور صحت مند آدمی ایک قسم
کے ہیملٹ یا مانفرڈ! ایک فضول سا آدمی اور نہ معلوم کیا.....
ہو کر رہ جائے۔ بہت سے قابلِ رحم لوگ ایسے بھی ہیں جو ہیملٹ یا
فضول آدمی کے خطاب پر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن میں اسے ذلیل سمجھتا
ہوں۔ میری خودداری کو اس سے ٹھیس لگتی ہے۔ شرم سے پس
جاتا ہوں اور بےچین ہو جاتا ہوں۔

ساشا:۔ (آنسوؤں کے درمیان مذاق کرتے ہوئے) آؤ نکولائی ہم لوگ امریکہ
بھاگ چلیں......

آیوانوف:۔ میں اس دروازے تک بھی جانے میں کاہلی محسوس کرتا ہوں اور
تم امریکہ کی بات کرتی ہو (دونوں باغ کے دروازے تک جاتے ہیں)
یہ ٹھیک ہے ساشا کہ تم بھی یہاں عافیت سے نہیں رہتی ہو۔ تم جن
لوگوں میں گھری رہتی ہو انہیں دیکھ کر میں اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں
کہ ان میں کون ایسا ہے جس سے تم شادی کر سکو۔ صرف یہ امید کی جاتی
ہے کہ شاید کبھی ادھر سے کوئی فوجی افسر یا طالب علم گزرے اور
تم کو بیاہ لے جائے...... (زنیدہ بائیں دروازے
سے جام کا برتن لئے آتی ہے)

آیوانوف:۔ معاف کرنا ساشا میں ابھی آتا ہوں......
(ساشا باغ میں چلی جاتی ہے)

آیوانوف:۔ زنیدہ سوشنا میں ایک عنایت کی درخواست کرنے آیا ہوں۔

زنیدہ:۔ کیا بات ہے نکولائی الیگزیوچ؟

آیوانوف:۔ (جھجکتا ہے) بات یہ ہے کہ پرسوں آپ کا سود ادا کرنے کا
دن ہے۔ بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ تھوڑی مہلت دیدیں یا اجازت
دیں کہ سود کو اصل کے ساتھ ملا دوں۔ اس وقت روپیہ بالکل
نہیں ہے.....

زنیدہ:۔ (خوفزدہ ہو کر) نکولائی الیگزیوچ۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ معاملہ کا کوئی
طریقہ نہیں ہے۔ نہیں ایسا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ خدا کے لئے
مجھے پریشان نہ کرو، مجھے یوں ہی کافی پریشانیاں ہیں......

آیوانوف:۔ مجھے بڑی ندامت ہے۔ (باغ میں چلا جاتا ہے)

زنیدہ:۔ اُف اس نے مجھے گھبرا دیا۔ میں کانپ رہی ہوں۔ سر سے پیر تک
کانپ رہی ہوں......
(دائیں دروازے کی طرف چلی جاتی ہے) (کوسیخ داخل ہوتا ہے)

کوسیخ:۔ (دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے اور اسٹیج کے دوسری
طرف جاتا ہے) میرے پاس اکّہ، بادشاہ، بیوی، آٹھ اور
چھکریاں، حکم کا اکّہ اور صرف ایک...... ایک چھوٹا سا
پان تھا اور اس نے چھوٹا سلام بھی نہیں کیا۔ خدا غارت
کرے...... (دائیں طرف کے دروازے کی طرف جاتا ہے)
(اودوتیا، نذار روونا، اور پہلا مہمان داخل ہوتے ہیں)

اودوتیا:۔ (باغ کی طرف سے پہلے مہمان کے ساتھ آتے ہوئے) میں چاہتی
ہوں اسکے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دوں۔ یہ بھی کوئی مذاق ہے۔ پانچ بجے
سے میں یہاں بیٹھی ہوں اور اس نے ایک باسی مچھلی بھی نہیں
کھلائی...... یہ بھی کوئی آدمی کا گھر ہے...... یہ
کوئی انتظام کا طریقہ ہے۔

پہلا مہمان:۔ مجھے اتنی کوفت ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے جا کر دیوار پر سر
دے ماروں۔ یہ بھی عجیب لوگ ہیں۔ خدا ہم لوگوں پر رحم کرے
اتنا بھوکا ہوں اور اتنی کوفت ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے بھیڑیے
کی طرح چلاؤں اور لوگوں کا منہ نوچنا شروع کر دوں۔

اودوتیا:۔ میں گنہگار تو ہوں ہی۔ بس اسکی بوٹیاں نوچ لوں گی۔

پہلا مہمان:۔ میں تو بڑی بی کچھ پیوں گا اور گھر چلا جاؤں گا۔ مجھے آپ
کی ان مہذب نوجوان خواتین کی ضرورت نہیں۔ دوپہر کے کھانے
کے بعد اب تک جس نے ایک گلاس شراب نہ پی ہو اس کو عشق و
محبت کہاں سوجھ سکتا ہے۔

اودوتیا:۔ چلو چل کر کچھ ڈھونڈیں......

پہلا مہمان:۔ شا شا۔ چپکے چپکے۔ میرا خیال ہے کھانے کے کمرے میں
جو الماری ہے اس میں وودکا ہے، یگور [illegible] لایا ہے...
شا۔ شا (دونوں بائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)
(اناپیٹرونا اور لودو دائیں [illegible])

اناپیٹرونا:۔ ٹھیک ہے [illegible] گے۔ میں یہاں [illegible]

کوئی بھی نہیں۔ضرور سب باغ میں ہیں۔

لودو:۔ مجھے حیرت ہے کہ تم مجھے گدھوں کے اس گھونسلے میں کیوں لائیں؟ یہ جگہ میرے اور تمہارے لئے نہیں ہے۔ایمانداروں کو اس فضا سے الگ تھلگ رہنا چاہئے

انا پیٹرو ونا:۔ سُنئے جناب ایماندار صاحب۔یہ کوئی تہذیب نہیں ہے کہ آپ ایک خاتون کو اپنے ساتھ لائیں اور راستہ بھر ایمانداری کے علاوہ کوئی دوسری بات نہ کریں۔ممکن ہے ایمانداری کا طریقہ یہی ہو لیکن کم از کم بہت اُکتا دینے والا ہے۔عورتوں سے اپنی خوبیوں کا کبھی آپ کو تذکرہ نہ کرنا چاہئے۔وہ خود دیکھ لیں گی جب میرا نکولائی تمہاری عمر کا تھا تو عورتوں کی صحبت میں سوائے گانے اور قصّہ کہنے کے کوئی دوسرا کام نہ کرتا۔پھر بھی سب جانتے تھے کہ وہ کن خوبیوں کا مالک ہے

لودو:۔ آہ مجھ سے اپنے نکولائی کا تذکرہ مت کرو۔اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

انا پیٹرو ونا:۔تم آدمی تو اچھے ہو لیکن سمجھتے خاک بھی نہیں۔چلو باغ میں چلیں نکولائی نے کبھی ایسے جملے نہیں کہے کہ "میں ایماندار آدمی ہوں اس فضا میں میرا دم گھٹتا ہے۔گدھے۔اُلّو کا گھونسلا، مگر مچھ" وہ چڑیا خانہ کو ہمیشہ الگ ہی رکھتا۔غصّہ میں بھی میں نے اس کو یہی کہتے سُنا "آہ آج میں نے کتنی ناانصافی کی" یا "مجھے اس شخص پر افسوس آرہا ہے" وہ اس قسم کا آدمی تھا اور تم ..... (دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

(اودوتیا نذاروونا اور پہلا مہمان داخل ہوتے ہیں)

پہلا مہمان:۔(بائیں دروازے سے اندر آتے ہوئے) کھانے کے کمرے میں تو نہیں ہے گوشت والی الماری میں کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوگا یگور شکا کو لانا چاہئے۔چلو ملاقات کے کمرے میں ہو کر چلیں۔

اودوتیا:۔جی چاہتا ہے اسکے ٹکڑے اُڑا دوں(دائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)۔

(مادام بیاکن اور بورکن باغ سے بھاگتے آتے ہیں شیبلسکی ان کے پیچھے [illegible] ہنستا اور [illegible])

مادام بیاکن:۔کتنی اُداس فضا ہے(ہنستی ہے) بہت اُداسی ہے۔یہ اس طرح بیٹھنے اور چلتے پھرتے ہیں جیسے مکھیں نگل لی ہیں۔اکتاہٹ سے گھٹ گئی ہوں(ادھر اُدھر پھسلتی ہے)ذرا پیر پھیلا لیں (بورکن اسکی کمر میں ہاتھ دیکر گالوں کو پیار کرتا ہے)

شیبلسکی:۔(ہنستا اور اُنگلی دکھاتا ہے)ستیاناس ہو۔(کھکارتا ہے) آخر ....

مادام بیاکن:۔چھوڑو۔بے شرم اپنے ہاتھ ہٹاؤ۔خدا جانے کاؤنٹ کیا خیال کرے گا۔ہٹ جاؤ........

بورکن:۔میری روح کی حسرت، میرے دل کی راحت ....(پیار کرتا ہے) پیاری تین سو روپے مجھے قرض دیدو .....

مادام بیاکن:۔نہ نہ نہیں۔نہ نہ نہیں.....جو جی چاہے کہو۔لیکن روپیہ کا ذکر نہ کرو۔نہیں شکریہ نہیں نہیں نہیں۔وہ ہاتھ ہٹاؤ

شیبلسکی:۔(ان کے ارد گرد ٹہلتا پھرتا ہے) چھوٹی سی بیر بہو...... اس میں ایک دلکشی ہے......

بورکن:۔(سنجیدگی سے) خیر بہت ہوا آؤ مطلب کی بات کریں ہمیں معاملات کو کاروباری آدمی کی طرح سیدھی سیدھی طرح طے کرنا چاہئے بغیر حیلہ حوالہ کئے مجھ کو ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ہاں یا نہیں۔سُنو(کاؤنٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے) اُن کو روپیوں کی ضرورت ہے کم سے کم تین ہزار روپے ہر سال۔تم کو شوہر کی ضرورت ہے تم کاؤنٹس ہونا پسند کرو گی؟

شیبلسکی:۔عجیب سنکی آدمی ہے.....

بورکن:۔تم کاؤنٹس ہونا پسند کرو گی۔ہاں یا نہیں۔

مادام بیاکن:۔(اضطراب میں) سوچو تو تم کیا کہہ رہے ہو [illegible] ایسے معاملے اس طرح ہنسی مذاق میں طے نہیں [illegible] اگر کاؤنٹ کی خواہش ہے تو وہ خود.......

[illegible] نہیں سمجھتی کہ کیسے ایک لمحہ میں.......

بورکن:۔رہنے بھی دو بہت ہوا بانہہ چکیں، یہ [illegible] ہاں یا نہیں۔

شیبلسکی:۔[illegible]

کیوں نہ ایک جرأت رندانہ کروں؟ کیوں! پیٹرو (مادام بیاکن کے گال پر پیار کرتا ہے) موہنی۔ دل کی ملکہ

مادام بیاکن:۔ ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو ...... تم نے مجھے پریشان کردیا... جاؤ چلے جاؤ۔ نہیں نہیں مت جاؤ ......

بورکن:۔ جلدی کرو۔ ہاں یا نہیں۔ ہمارے پاس وقت ضائع کرنے کیلئے نہیں ......

مادام بیاکن:۔ کاؤنٹ میری ایک تجویز ہے۔ تم اگر دو تین دن میرے ساتھ رہو۔ دلچسپی رہے گی۔ میرا گھر اس گھر کی طرح نہیں ہے۔ کل آؤ ..... (بورکن سے) نہیں تم مذاق کر رہے ہو۔ کیوں؟

بورکن:۔ (خفگی میں) گویا ایسے معاملہ میں بھی مذاق کیا جاسکتا ہے!

مادام بیاکن:۔ ایک منٹ ٹھہرو ایک منٹ ..... آہ میں بیہوش ہو رہی ہوں۔ میں بیہوش ہو رہی ہوں۔ کاؤنٹس ..... میں بیہوش ہو رہی ہوں۔ کاؤنٹس ..... میں بیہوش ہو رہی ہوں.... میں گر پڑوں گی۔ (بورکن اور شیبلسکی ہنستے ہوئے اسکے بازو پکڑ لیتے ہیں اور گال پر پیار کرتے ہوئے دائیں دروازے سے باہر لیجاتے ہیں)۔

(آیوانوف اور ساشا باغ سے دوڑتے ہوئے اندر آتے ہیں)

آیوانوف:۔ (اپنا سر گھبراہٹ میں پکڑتے ہوئے) یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ساشا یہ مت کرو ..... اف مت کرو۔

ساشا:۔ (بے قابو ہوکر) میں تمہاری محبت میں پاگل ہو رہی ہوں.... تمہارے بغیر میری زندگی بے معنی ہے۔ تمہارے بغیر میرے لئے کوئی خوشی نہیں۔ کوئی مسرت نہیں۔ میرے لئے تم ہی سب کچھ ہو ....

آیوانوف:۔ کیا فائدہ۔ یا خدا .... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ساشا ایسا مت کرو ....

ساشا:۔ بچپن میں میرے دل کی مسرت تم ہی تھے۔ میں تم سے تمہاری روح سے اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح اپنے سے ...... لیکن اب ..... مجھے تم سے عشق ہے نکولائی الیکزیوچ ..... میں تمہارے ساتھ دوسری دنیا میں چلی چلوں گی۔ تم چاہوگے تو قبر میں بھی ساتھ چلی چلوں گی لیکن خدا کے لئے جلدی طے کرو نہیں تو میرا دم گھٹ جائیگا ....

آیوانوف:۔ (خوشی کا قہقہہ لگاتا ہے) یہ کیا ہوا! تو نئے سرے سے زندگی شروع کروں ساشا۔ ہاں؟ ..... میرے دل کی راحت (اسکو اپنی طرف کھینچتا ہے) میری جوانی ... میری تازگی ....

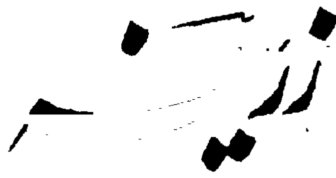
(انا پیٹرووونا باغ کی طرف سے آتی ہے اور اپنے شوہر اور ساشا کو دیکھ کر اسکے قدم زمین پر گڑ جاتے ہیں)

آیوانوف:۔ تو ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ ہاں! پھر کام شروع کرنا ہے (ایک بوسہ۔ بوسہ کے بعد آیوانوف اور ساشا ارد گرد نظر دوڑاتے ہیں اور انا کو دیکھتے ہیں)

آیوانوف:۔ (خوفزدہ ہوکر) سارہ!

پردہ گرتا ہے

رام پرتاب بہادر ایم۔ اے



زرینہ

زرینہ! جس کا یہ نام ہو وہ سوائے خوبصورت ہونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ میرا یہ کامل یقین ہے، صرف نام یاد کرنے سے ایک آدھ کھلی کلی کی خوشبو اور حسن سنگیت بنکر میرے دماغ میں گونجنے لگتا ہے، زرینہ!! پھر مجھے گلے اور رخساروں سے کھیلتے ہوئے اسکے چمکتے ہوئے مُندے یاد آئے، کانوں اور گالوں کے اوپر سے گزرتا ہوا سفید ساڑی کا مخملی کالا چوڑی دار کنارہ اسکے چہرہ کی لامحدود خوبصورتی کو محدود کرتا ہوا میرے شاعرانہ دل و دماغ کو وجد میں لے آتا تھا۔ میں نے وہی ایک چہرہ دیکھا جس میں ناک اوپر سے دھری ہوئی چیز نہیں معلوم ہوئی فقط دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھوٹی ناک اسکے حسن کا ایک نازک تر حصہ تھی اور اس میں وہ ننھی سی شربتی رنگ کی کیل! اب بھی جب میں سوچتا ہوں تو وہ شیشہ کا ٹکڑا میری آنکھوں میں چبھنے لگتا ہے اسکے لب ایسے ملے ہوئے تھے جیسے آپس میں مل جُل کر خاموش باتیں کر رہے ہوں ان ہونٹوں کو کبھی میں نے بناوٹی رنگ کا محتاج نہیں پایا۔ سیاہ چنچل آنکھوں کا اسکے گورے مکھڑے پر ازلی رقص میری سوتی جاگتی روح کو ابدی تماشائی بنائے رہتا تھا۔ زرینہ!!! ہمیشہ مجھے اس لفظ سے کسی کی پتلی نازک کمر کی یاد آتی ہے۔ اور پھر وہ کمر جس پر اس کی غیر محسوس جوانی اٹھکیلیاں کرتی چلتی تھی اسکی لمبی سڈول بانہوں کو دیکھ کر میرے خودغرض دل نے کتنی بار نہیں چاہا کہ کنٹھ کی طرح وہ مجھے لپیٹ لیں۔ زرینہ!!!! اس لفظ سے مجھے ہمیشہ ادھورے افسانے یا ادھورے شعر کا خیال آتا ہے۔

لیکن تھی وہ طوائف، میں اسے طوائف ہی کہونگا کیونکہ اس لفظ میں مجھے واجد علی شاہی شان کی جھلک ملتی ہے — قالین کا فرش، مسند، پاندان اور اُگالدان — بیسوا میں اُسے نہیں کہہ سکتا کیونکہ اسے بیسوا کہتے وقت میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میں اسکے ساتھ بے انصافی کر رہا ہوں، اس لفظ میں زہر ہے، جو آلودگی ہے [illegible] ہے جو غلیظ ہے وہ زرینہ میں نہیں تھی، زرینہ وکیل [illegible] وہ [illegible] کی [illegible] تی

چپلوں کا خیال کر کے مجھے گاندھی جی کی یاد آتی ہے اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے بیوائیں اس ملک کی غربت پیروں میں پہنکر چل رہی ہیں کالی سلیپر کے ساتھ چلی ہوئی وکالت کا خیال آتا ہے، اس طرح کی سلیپر طوائفیں اور کامیاب وکیل پہنتے ہیں۔ زرینہ سر سے پاؤں تک سادگی اور خوبصورتی کا مجسمہ تھی، وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جسے ہر کوئی پڑھ سکتا تھا، زرینہ بکتی تھی اپنے کو بیچتی نہیں تھی۔ بیسوا کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے نفرت ہوتی ہے، زرینہ کو دیکھکر عزت کرنے کی خواہش ہوتی تھی، محبت بڑھتی تھی۔ کیا سلجھی ہوئی پہیلی تھی وہ جس میں میں اُلجھ گیا!

(۲)

میری اس کی جب پہلی بار ملاقات ہوئی وہ مجھ سے کچھ کم عمر کی تھی، میں بھی زندگی سے انجان تھا۔ یوں بھی طالب علمی کی زندگی میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ دُنیا کے غیر معمولی عیش و مسرت کا حصہ دار ہو سکے۔ لکھنے پڑھنے کی عمر میں جب کبھی ہلکے قسم کے جذبات و خواہشات سر اُٹھاتے ہیں تو انہیں خیالوں اور خوابوں سے سینچکر سُکھا دینا پڑتا ہے وہ ایسی عمر ہوتی ہے جبکہ خاص طور سے کچھ کرنے کو نہ ہوتے ہوئے بھی ہم ضرورت سے زیادہ مصروف رہتے ہیں دُنیا اس وقت تک زندگی کو کھیلنے کے لئے کوئی خاص کھلونے نہیں دیتی جس کے ساتھ ہم مصروف ہو کر کھیلیں، پھر بھی ہم اپنے بچپن کے کھیلوں میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ آغاز شباب چیزوں کے سمجھنے کا وقت ہوتا ہے ہر شخص جو مجھ سے ایک دن پہلے بھی اس دُنیا میں آیا ہو وہ مجھے سمجھانے کا حقدار بن جاتا ہے۔ ہر طرف سے ہم پر نصیحتوں کی بارش ہونے لگتی ہے اگر بچہ سب نصیحتوں کو مان لے تو بڈھا ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ان کو اس طرح نہیں سمجھ لیتے جس طرح ہمیں بتایا جاتا ہے۔ مگر دُنیا میں آتے ہی ہر شخص ہمارے سامنے ہمدرد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے [illegible] دُنیا کو ہم [illegible] یا [illegible] کی شکل میں [illegible]

ہر چیز پر کوئی نہ کوئی مہر لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ عام طور سے کشل کی مُہر الملی پر، مہوے کی آم پر ہے۔ دُنیا ہمیں نصیحتوں کی خُردبین دیتی ہے جس کی مدد سے ہم ہر چیز دیکھ سکیں، ہر شخص میرے لئے زندگی کے راستے پر خطروں سے آگاہ کرنے والا راہنما بن جاتا ہے۔ اس چیز کو مت چھوؤ، اس سے مت بولو۔ اس سے مت اُلجھو اس سے مت ملو .... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دُنیا خرابیوں اور بُرائیوں کا ایک ڈھیر سا بنکر رہ جاتی ہے، راستے ہم کو کم ملتے ہیں اور رُکاوٹیں زیادہ روڑوں اور رُکاوٹوں کے سامنے ہم سے سر جھکانے کو کہا جاتا ہے۔

اس طرح جوانی کی صبح کو میں نے دیکھا ہر چیز میرا راستہ روکے کھڑی ہے مگر میرے اندر ایک طاقت تھی جو مجھے آگے بڑھاتی تھی۔ میں خود کو روکنے لگا ایک زبردست کشمکش ہوئی، زندگی جسے میں ایک بہتے ہوئے چشمے کی طرح سادہ اور سہل سمجھتا تھا وہ میرے واسطے ہر قدم پر بندھن ثابت ہونے لگی، لیکن میں اندرونی طاقت سے مغلوب ہوگیا اور ساری رُکاوٹوں، بندھنوں کو توڑ کر زندگی میں گھس پڑا۔

(۳)

۵۰

اس سے پہلے میں نے سُرون کمار، اور شوُرداس، ایسے ڈرامے دیکھے تھے اور اسٹیج پر رنگ برنگ کے پردوں کے سامنے مختلف قسم کے مناظرِ قدرت کے درمیان سُنہری تتلیوں جیسی پریوں کو ناچتے تھرکتے دیکھا تھا اور اپنی عمر کے لحاظ سے اس سے لطف اندوز ہوا تھا، کبھی کبھی اسکول سے لوٹتے وقت تھیٹر کے شامیانے کے باہر کھڑا ہو کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ انگریزی بینڈ کو بجتے سُن کر اپنا جی بہلا لیا کرتا تھا، لیکن آج ناٹک دیکھتے وقت کچھ اور ہی قسم کا احساس اور تجربہ ہو رہا تھا۔ اسٹیج پر خوبصورت ہیروئن کو عشق کے طوفان میں گھر کر جو کچھ سہنا اور برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس سے میری پوری ہمدردی ہیروئن کے ساتھ تھی۔ ہمدردی ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی میرا نوجوان دل تو ایسا مست ہو جاتا کہ جی چاہتا تھا ہیروئن کی دُکھ درد کی کہانی ختم کرنے کیلئے خود اپنے کو نثار کر دوں اور اس طرح ہیرو اور ہیروئن کی تمام مشکلات ختم کر دوں۔

میں جس درجہ میں بیٹھا تھا اسی قطار میں دو بہنیں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ناٹک دیکھ رہی تھیں۔ دیکھنے سے وہ بنگالی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی بہن تو عورت زیادہ تھی اور لڑکی کم جس کی وجہ سے وہ میری جوانی کے سپنوں کے نزدیک بھی نہیں آسکتی تھی لیکن اس کے اور اس کی ماں کے درمیان وہ پندرہ سولہ سال کی لڑکی وہ لڑکی تھی جسے دیکھتے ہی میرے بدن میں ایک طرح کی سنسنی دوڑ گئی۔ اُسے ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنا ہی میرا کام رہ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس ہال میں میرے واسطے دو ناٹک ہونے لگے تھے۔ ایک اسٹیج پر اور دوسرا اس لڑکی کے ارد گرد۔ اسے دیکھتے ہی میرے دماغ میں بہت سے سوال اُٹھ کھڑے ہوئے اس کو جاننے اور سمجھنے کیلئے میرے جسم کا ایک ایک تار بیچین ہو گیا ــــ اس چھوٹے سے شہر میں وہ کس بنگالی گھرانے کی ہوسکتی ہے ؟ وہ میرے لئے اتنی بیش قیمت ہوگئی تھی کہ میری نظر میں اس شہر میں کوئی ایسا خوش قسمت نہیں ہوسکتا تھا جس کی وہ ہوسکتی تھی۔

یہ معلوم نہیں کہ شہد کی مکھی پہلے پھول پر بیٹھتی ہے یا کانٹے پر۔ لیکن جب سے میں اس سے دلچسپی لینے لگا تھا اسی وقت سے میری آنکھیں اس سے تعلق رکھنے والوں کی جانچ پڑتال کرنے لگی تھیں۔ ہر شخص کو میں شبہے کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس تھوڑے وقت میں اس کے سادہ حُسن کے کنج میں میری معصوم محبت نے جو آشیانہ بنا لیا تھا اس میں میں ایک غریب پرند کی طرح بیٹھا چاروں طرف آنکھیں گھما گھما کر یہی دیکھ رہا تھا کہ خوبصورتی اور محبت کے دو تنکوں کے بنے ہوئے آشیانہ کے بگاڑنے والے وہاں کون کون تھے۔ جب پردہ گرتا تو اُسکے آس پاس مجھے دو غنڈے گلاس میں شربت یا ہاتھ میں پان لئے نظر آتے معلوم نہیں وہ غنڈے تھے یا کیا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میرا دل اس سے واسطہ رکھنے والوں کے بارے میں اچھا نہیں سوچ سکتا تھا۔ میرے واسطے زیادہ پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اُس بیچین فضا میں مجھے ہر کوئی اسی کی طرف دیکھتا ہوا نظر آتا تھا یہاں تک کہ بجلی کا "ٹیبل فین" بھی جو اس کی قطار کے سامنے ہوا دینے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے داہنے بائیں گھومتے ہوئے اس کے سامنے آکر رُکنے لگتا تھا اور مجبوراً وہاں سے ہٹتا تھا۔ جس چیز کی طرف میں اپنے سُکھ اور شانتی کیلئے کھنچ گیا تھا وہ میرے واسطے لامحدود تکلیف اور پریشانی کا سبب بن گئی تھی جسے میں اچھی طرح دیکھ یا جان بھی نہ پایا تھا، وہ ملکیت میری ہوگئی تھی۔ اپنا بنانے کیلئے تو میں کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن اسے دوسروں کے چنگل سے چھڑانے کیلئے میری ساری قوت اندر ہی اندر ختم ہوئی جا رہی تھی۔ اُس اتھاہ سمندر میں امید اور ناامیدی کے اُٹھتے ہوئے جوار بھاٹے میں میرے لڑکپن کا دل ڈوبتا اور اُبھرتا رہا۔

ناٹک ختم ہوتے ہی باہر نکلا، برآمدے میں کئی سو کینڈل پاور
( ) کی روشنی میں اس کی خوبصورتی کو چار چاند
لگ گئے۔ اسکی آنکھوں سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مجھے غیرارادی طور پر
اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ ادھر اُدھر دیکھ کر میں اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بھیڑ
سے نکل کر سونی سڑک پر چلتا ہوا بھی میں اپنے چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا جب
بجلی کی روشنی کا کھمبا قریب آتا تو میں ذرا پیچھے رہ جاتا، روشنی میں پہنچ کر وہ مڑ
کر میری طرف دیکھتی تھی، رات کو دو بجے ہونگے، ناٹک نہ دیکھنے والی شہری دنیا
سو گئی تھی، سڑک سونی پڑی تھی۔ وہ پیدل اپنے گھر والوں کے ساتھ چلی جارہی
تھی، اسکے ساتھ وہی پان شربت والے آدمی تھے، انہیں دیکھ کر کبھی کبھی میرے
دل میں ڈر پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ ارادہ کرکے بھی کہ اگلی گلی سے مڑ کر گھر چلا
جاؤں گا۔ میں اسکے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ
میرے اندھیرے راستہ میں روشنی دکھا رہی ہے۔ اندھیری گلیوں میں
پھر کیسے جاتا ــــــ

چلتے چلتے میں اس محلے میں پہنچ گیا جہاں دن میں جانے کا مجھے
خیال تک نہ آسکتا تھا۔ اسکے گھر کے سامنے پہنچ کر میں نے اُسے پہچانا، اب
میرے دل میں مطلق شبہ نہیں رہا، اُسے گھر تک پہنچا کر وہ شہدے لوٹ پڑے
انہیں آتے دیکھ کر میری جان نکل گئی، طے نہیں کر پایا کہ کس طرف جاؤں، پریشانی
کی حالت میں پاؤں بڑھتے گئے، سیدھا اندھیری گلی میں میں چلتا گیا لیکن آگے
جا کر وہ گلی بند ملی، مجبور ہو کر لوٹنا پڑا، اسکے مکان کے سامنے اندھیرا تھا وہ
برآمدہ میں کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر اندر چلی گئی۔

اب میں اکیلا تھا۔ اور سوائے ان اندھیری گلیوں کے اور کوئی
میرا ساتھی نہیں تھا۔ جدھر سے گیا تھا اسی طرف سے لوٹ رہا تھا کبھی ڈر لگتا
تو کبھی اپنے ڈرنے پر غصہ آتا۔ اپنی زبوں حالی پر زبردست دماغی چبھن اور
شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں کہاں چلا آیا تھا؟ یہ مجھے ہو کیا گیا تھا؟
مجھے اپنی ذات سے سخت نفرت ہو رہی تھی، ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بڑا بھاری
گناہ کرکے لوٹ رہا ہوں، اتنی رات گئے سڑکوں پر صرف میلے کی گاڑیاں چل
رہی تھیں [illegible] کی آواز دور سے کھینچتی ہوئی آتی تھی۔ میں چلتا
جاتا تھا [illegible] ایسا محسوس کرنے لگا جیسے میں خود
میلا گاڑی [illegible] چلا جا رہا ہوں [illegible] ایک

کتا دوڑا آیا اور مجھے گھیر گھیر کر بھونکنے لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا [illegible]
وہ مجھے پھٹکار رہا ہے میں اور شرمندہ ہوا، کتے سے جان چھوٹی تو گھر کا
خیال ستانے لگا۔ معلوم نہیں نوکر نے بھونا نکالا ہوگا یا نہیں، اماں شاید میرا
انتظار کر رہی ہوں۔ پھر خیال آیا کہ محلہ کے کسی آدمی نے مجھے دیکھا تو نہیں،
انہیں خیالوں کی بھیڑ میں ڈرتا کانپتا اور افسوس کرتا میں گھر پہنچا سب سو گئے
تھے، دروازہ پر میری چارپائی بچھی تھی، کوٹ اُتار کر سرہانے رکھا۔ صراحی سے
ایک گلاس پانی اُنڈیل کر پیا۔ پھر چارپائی پر بیٹھ کر منہ ہاتھ پاؤں دھوئے۔
مسہری گرا کر میں نے اپنے دونوں کان پکڑ کر قسم کھائی، اب ایسی بھول کبھی نہ
ہوگی اور گائتری منتر پڑھتا پڑھتا سو گیا۔

(۴)

مگر میری غریبی کا خیال نہ کرو، زرینہ! میں تمہیں پیار کرتا ہوں"
میں نے اسکے ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا، اس نے مسکرا کر
اپنی اُنگلیاں چھڑاتے ہوئے جواب دیا ــــ "لیکن تم نہیں جانتے میں کون ہوں"
اس کی بات کاٹتے ہوئے دکھی آواز میں میں نے کہا ــــ "جانتا ہوں،
لیکن مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہو؟ ..... تم میری سب کچھ ہو" یہ کہتے
کہتے میرا گلا بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے میں نے اسکے
دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ایک لمحہ مجھے وہ چپ چاپ اُداس آنکھوں سے
دیکھتی رہی ــــ "تم مجھے بالکل نہیں جانتے، میں محبت کرنے کے لئے
نہیں ہوں۔ یہ کہتے ہوئے ناک کی نتھ چھو کر وہ بولی ــــ اسے دیکھتے ہو
اس کی قیمت ہے ۵۰۰ سو روپے، اب مجھے چھوڑ دو، مجھے جانا ہے" وہ
اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کے نیچے سڑک چل
رہی تھی میں گھٹنوں کے بل زمین پر اسکے پاؤں کے پاس جھکا ہوا تھا،
اسکے دونوں ہاتھ پکڑے حسرت بھری آنکھوں سے دیکھتا ہوا کہنے لگا "میں
دونگا ..... سب کچھ دونگا ..... میں سو ہزار روپے دونگا ....."
یہ کہتے کہتے میری زبان لڑکھڑائی، اسکے چکنے چکنے پاؤں میرے ہاتھوں میں
آگئے تھے، وہ مسکرانے لگی، اپنے پاؤں چھڑا کر کھمبے کے [illegible]
دیوار پر بیٹھ گئی، مجھے بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیا، تھوڑی دیر [illegible]
رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔ "تم کیا کر[illegible]
[illegible] پھر اس نے [illegible]

ایک کتا اسکے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اُسے میں نے زور سے ایک لات مار کر
بھگا دیا، اُس کی کمر میں نے اپنا بایاں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کا داہنا ہاتھ
میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پاگل کی طرح بیٹھا سوچ رہا تھا۔۔۔ اس کی کمر زیادہ
پتلی ہے یا اس کا ہاتھ زیادہ ملائم ہے، اتنے میں ایک یکے والا کوئی غزل
گاتا یکہ تیز دوڑاتا ہوا گزرا، ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا، وہ
مسرور ہوکر میٹھے راگ میں گنگنانے لگی ـــــــ

....

پھر اس نے میرے گالوں کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے
مجھے پیار سے چوم لیا، ہونٹ سے ہونٹ ملتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں
اس نے مجھے اپنی لمبی لمبی باہوں میں کس لیا۔ میں نے اُس کی کمر زور سے
پکڑلی، معلوم نہیں ہم دونوں کب تک اس حالت میں چُپ چاپ بیٹھے رہے پھر
اسے نیند آنے لگی، میں نے اسے اپنی گود میں اُٹھا کر پل کی دیوار کے پاس
زمین پر سلا دیا، اسکی خوبصورتی کتنی سُبک تھی! ہم دونوں ایک دوسرے
سے لپٹ کر سڑک کے کنارے سو گئے۔

زور سے مرغ نے میرے سرہانے بانگ دی، میری آنکھیں کھُل
گئیں۔ گھبرا کر میں اُٹھ بیٹھا، میں کہاں ہوں! مسہری سے مُنہ نکالتے ہی دیکھا
سُرخ مرغا ایک مُرغی کو دوڑا رہا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ کیا وہ خواب تھا! میں
سوچنے لگا۔ جلدی سے چارپائی سے اُٹھ پڑا، سب لوگ جاگ گئے تھے
نوکر برآمدہ میں جھاڑو دے رہا تھا، سرہانے اخبار رکھا تھا۔ اُٹھا کر
پڑھنے لگا۔

(۵)

سوائے بڑھیا ماں کے دُنیا میں میرا اور کوئی نہیں تھا۔ پتاجی اپنی
کمائی ہوئی دولت چھوڑ کر جوانی ہی میں اپنی حسرتوں کا بوجھ لئے اس دُنیا
سے چل بسے تھے، میں ہی اپنی ماں کی بوڑھی آنکھوں کی روشنی تھا۔ ماں ہی
کی وجہ سے بچپن میں میں نے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی، میری طرف سے
بھی ماں کو کبھی دلشکنی نہیں ہوئی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی میں کبھی بُرا نہیں رہا
امتحان میں پاس ہونا ہی ماں کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ میری کسی خواہش
کو پورا کرنے میں انہوں نے کبھی کچھ اُٹھا نہیں رکھا، انہیں مجھ پر پورا یقین
تھا۔ سوائے ان کی محبت کے میری زندگی میں اور کوئی رُکاوٹ شاید
نہیں تھی۔

لیکن وہ دن کتنی پریشانی میں کٹ رہے تھے، پاگلوں کی سی میری
حالت ہوگئی تھی، کھانا کھاتے وقت وہ مجھ سے اور کھانے کا اصرار کرتے
کرتے اُداس ہو جاتیں۔ لیکن میں ان سے ہر طرح محبت کرتے ہوئے بھی
انہیں خوش نہیں کرسکتا تھا۔ وجہ یہ تھی میں خود اپنی خوشی کھو بیٹھا تھا۔

دھیرے دھیرے میرا سب ملنا جلنا بھی چھوٹ گیا، گرمی کے
دنوں میں زیادہ وقت کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے گزر جاتے۔ کبھی کمرہ کے گرم
ماحول سے پریشان ہو اُٹھتا۔

شام ہوئی نہیں کہ میں ندی کی سمت چلا، ندی کے کنارے جی بہلانے
کو جاتا اور زیادہ تر اس خیال سے کہ لوٹتے وقت اُس محلے کی طرف سے
آنے کا بہانہ مل جائیگا۔ عموماً سورج ڈوب جانے کے بعد میرا اس کے
دروازہ کے سامنے سے گزر ہوتا۔ مکان کے سامنے ہمیشہ کوئی نہ کوئی
سواری موٹر یا تانگہ کھڑا ہوتا، روشن کمرہ میں محفل جمی ہوتی جس کے بیچ
میں وہ حُسن کی دیوی بنی صدارت کرتی ہوتی، مسند سے لگے ہوئے دوچار
اور بڑے آدمی نظر آتے، پان سگریٹ کا دور چل رہا ہوتا۔ کبھی گانے
بجانے کی محفل جمی ہوتی، میں نالے کے کنارے دیوار سے لگا دیر تک
کھڑا رہتا۔ اتنے میں کسی کے مست قہقہے کی آواز آتی اور میں وہاں سے
بے چین ہوکر چلنے لگتا۔ اور وہ مجھے اپنی خاموش نگاہوں سے اس طرف آتے
دیکھتی۔ مجھے اپنے اوپر جھنجھلاہٹ ہوتی، غصہ آتا اور نفرت ہوتی، میں
تہیہ کرتا قسم کھاتا کہ اب پھر یہاں نہیں آؤں گا۔

لیکن گھر پہنچنے کے بعد پھر اسکی یاد ستانے لگتی، میں سوچتا وہ مجھے
ضرور چاہتی ہے، مجھے کن آنکھوں سے دیکھتی ہے! لیکن اپنی ماں سے مجبور
ہے، وہ بڑھیا چوکھٹ ہی پر پاندان لئے بیٹھی رہتی ہے۔ آخر وہ کرے تو
کیا کرے، لیکن وہ مجھے ضرور چاہتی ہے، آخر میرے خواب میں آئی تھی!
اسکی باہیں، اسکی کمر، اسکی اُنگلیاں، اسکے ہونٹ، اس کا گداز وملائم
جسم!! اس نے کس طرح مجھے چوم لیا تھا!! اور میں طے کر لیتا ـــ وہ
میری ہے۔ چاہے جو ہو میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اسکے جسم کے ہر حصہ
کو کتنے نزدیک سے میں نے دیکھا ہے، چھوا ہے، آہ کیسی پھول سی نئی
ہے وہ، میں ان خیالوں سے پاگل ہو جاتا۔ اسے [illegible] میری

انگلیاں پھر ایک بار رینگنے لگتیں، کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ میرے بازو ٹوٹنے
لگتے، جیسے میرے بدن کے کوئی ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ آنکھوں سے چنگاریاں
نکلنے لگتیں، بند کمرہ میں میری روح چیخ اٹھتی ——— میں اسکے پاس جاؤں گا!
ضرور جاؤں گا!!

(۶)

دوپہر کا وقت تھا۔ جیٹھ تپ رہا تھا۔ لو چل رہی تھی، ننگے سر میں
اسکے مکان کے سامنے سے گزرا، دروازے بند ملے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا
لیکن ذرا اور غور کر کے سنا تو طبلے اور گانے کی آواز ساتھ ساتھ کہیں سے آ رہی
تھی۔ بے چین ہو کر جلدی جلدی چلنے لگا۔ اتنے میں میرے کندھے پر کسی نے
زور سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ روشن لال! اس نے تعجب
کا اظہار کرتے ہوئے ہنسکر پوچھا "کہئے جناب! آپ یہاں کہاں؟ بڑے
چھپے رستم نکلے" میرے تو ہوش اڑ چکے تھے، گھبراہٹ میں معلوم نہیں کیا جواب
دیا۔ پھر ہم دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اس چوڑی گلی سے گزر
رہے تھے۔ دونوں طرف اونچے اونچے کوٹھے، دھول لئے ہوئے لو زور
سے چل رہی تھی۔ اتنے میں روشن لال ایک دم بے تحاشا بھاگا، ہوا کے
ساتھ دھول کا بگولا اڑتا دیکھ کر میں بھی اسی طرف بھاگا، جتنا تیز میں بھاگ سکتا تھا
بھاگ رہا تھا، ادھر اُدھر کے مکانوں کی دیواروں کو دیکھتا جاتا۔ زمین مکانوں
کو لئے ہوئے نیچے اوپر ہو رہی تھی، روشن ایک گلی میں گھس گیا میں بھی اس کے
پیچھے ہو لیا۔ روشن کھڑا زور زور سے ہانپ رہا تھا، میں نے ہانپتے ہوئے
پوچھا ——— "بڑے آئے ہو جی! بھاگے کیوں؟" روشن لال نے دم لیکر
ہنستے ہوئے جواب دیا ——— "ارے یار بال بال بچ گئے، ادھر کی گلی سے
میرے خسر آرہے تھے" مجھے بھی ہنسی آگئی ——— "لیکن تم بھاگے
کیوں؟" اس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا ——— "تمہارا دماغ پھر گیا ہے کیا۔
جانتے نہیں یہ کون محلہ ہے، اگر انہوں نے دیکھ لیا ہوتا تو بڑے جوتے پڑتے"
اس کے ساتھ چلتے چلتے میں بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے پوچھا
——— "اور تم کیوں بھاگے؟" میں نے جواب دیا ——— "بھئی میں نے
سمجھا زلزلہ آگیا" روشن تالیاں بجاکر زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں نے بیان
صفائی دیتے ہوئے کہا "تمہیں ہنسی آرہی ہے۔ یاد نہیں جو زلزلہ میں تمہیں
بھاگ سکے [illegible] کے بچ گئے" پھر ہم دونوں خوب ہنسے ———
وہ میرے زلزلہ سے ڈر کر بھاگنے پر اور میں اس کے خسر کو [illegible]

(۷)

میں اچھے یا برے راستہ پر چل رہا تھا۔ یہ میں نہیں سوچ سکتا تھا
لیکن اپنے کو ہزاروں مرتبہ اس راستہ پر چلنے سے روکا، کس کس کا خیال میرے
دماغ میں نہیں آیا۔ شرم نفرت اور ڈر مجھے جیسے کتنے سپاہیوں کی طرح ہمیشہ
گھیرے رہتے تھے۔ جس طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھتا مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے
ہر چیز مجھ پر ہنس رہی ہے ——— مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ راستہ میں
جو بھی مجھے ملتا اور ہنسکر میرا خیر مقدم کرتا۔ اسپر مجھے شبہ ہوتا۔ ہو نہ ہو وہ [illegible]
سے مجھ پر ہنس رہا ہے۔ ہر شخص مجھے اپنا دشمن معلوم ہوتا۔ چنانچہ میں سب سے
بچنے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی تو سڑک پر چلتا ہوا میں ایسا محسوس کرنے لگتا
جیسے پولیس والا ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے میری گردن پکڑ لینا چاہتا ہے۔ اپنے
کو ہمیشہ مجرم سمجھنے کی میری عادت ہوگئی تھی۔ کبھی یکایک میں اس خیال سے کانپ
اٹھتا۔ دھیرے دھیرے مجھے ہر چیز سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ ہر چیز پر غصہ
آتا تھا۔ خیالی دنیا میں کھویا ہوا میں ہمیشہ اپنے ہی کو خلا میں پاتا ——— پوری
طاقت لگاکر پھاوڑے سے کسی بڑے ستون کو یا کبھی کسی بھاری دیوار کو توڑ
توڑ کر گرا رہا ہوں۔ جب کبھی سوچنے کی کوشش کرتا تو اپنے کو ایک زبردست
باغی اور دہشت انگیز کی شکل میں پاتا تھا۔ میری حالت بگڑتی گئی اور میری بوڑھی
ماں کی حالت اور بھی پریشان کن ہوتی گئی۔ وہ میری وجہ سے بہت متفکر رہتی تھیں
میں کسی حالت میں بھی اپنے بھلے کے واسطے ان کا برا نہیں سوچ سکتا تھا لیکن
میں کرتا کیا! میں ان کی خوشی کے لئے اپنا سکھ اور اطمینان قربان کر سکتا تھا۔
لیکن زرینہ تو میری زندگی میں سکھ نہیں بلکہ دکھ کا پیغام لیکر آئی تھی ———
میں کتنا مجبور تھا! میں اکثر اسے تیاگ دینے کا تہیہ کر لیتا اور کبھی اس سے
نجات حاصل کرنے کی قسم کھاتا۔ لیکن میں کیسے تیاگ دیتا اور کس طرح تیاگ
دیتا؟ زرینہ میرے واسطے تھی ہی کیا یا اس کے لئے میں کیا تھا۔ میں ان
خیالات سے پریشان ہو اٹھتا، کبھی سوچنے لگتا ——— جیسے پھنسنے کس
مصیبت میں پڑ گیا، لیکن مکھی کی طرح گڑ میں پھنس گیا تھا۔ جتنا زور نکلنے
لگاتا اتنا ہی پھنستا جاتا۔ کنول کی طرح اس کا سادہ حسن، اس کی [illegible]
اس کی سڈول ملائم باہیں، پتلی نرم انگلیاں!! اس سے [illegible] سے
مجھے [illegible] کر میرے ہونٹوں کو چوم لیا تھا!! [illegible]

مجھے یوں محسوس کرے کہ میں پاگل ہو جاتا، کیا یہ سب خواب تھا؟ کیا زرینہ صرف ایک خواب ہے میں پھر سوچنے لگتا۔ لیکن کتنا پُرمعنی خواب! پوری کوشش کرکے میں خواب کو خواب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ خواب نہیں جادو تھا۔ پھر میں سوچنے لگتا — وہ میرے بارے میں ضرور سوچتی ہوگی، ورنہ میرے خواب میں کیوں آتی۔ یہ سوچتا ہوا میں اُٹھا اور اسکے مکان کی طرف اُسی حالت میں چل دیا۔

(۸)

اندھیرے میں مکان کی منڈیر کے نیچے کھڑا ہوگیا، بجلی کے پنکھے سے اسکے کمرے کی روشنی کانپ رہی تھی۔ اُستاد کے مست ہاتھوں کے نیچے طبلے کھڑک رہے تھے۔ جوڑی کی کھن کھن کھن جیسے مجھے چڑھا رہی ہو، ایک سارنگی تھی جو میرے دل کے ساتھ رو رہی تھی۔ اور وہ گا رہی تھی،

نا برسو نا برسو،

نا برسو نا برسو،

ساون کے بادرا کارے

میری سوئی ہوئی آتما جاگ اُٹھی۔ جوڑ جوڑ پھڑکنے لگا، آنکھیں اُٹھا کر میں نے آسمان کی سمت دیکھا — کہیں بادل نہیں تھے۔ لیکن اسکی آواز میں کتنی التجا ہے ان سروں کا التماس سن کر میگھ دوت مان ہی نہیں بلکہ وہ جائینگے۔ اتنے میں اس نے ذرا اونچی آواز میں انترا اُٹھایا،

آئے ہونگے آج ساجن ہمارے

پریت کے مارے تلوارے

سُنتے سُنتے میں بوکھلا اُٹھا۔ کیا تخت پر مسند لگا کر بیٹھے ہوئے موٹے موٹے بدمعاش اسکے ساجن ہیں! میرے دل نے کہا — ہرگز نہیں ایک دم جی میں آیا کہ کمرہ میں داخل ہوں اور ان بدمعاشوں کو پیٹ کر وہاں سے نکال دوں اور زرینہ کو لیکر کہیں بھاگ جاؤں۔ میرے قدم بڑھے، برآمدہ کی سیڑھی کے پاس سے کتراتا ہوا میں صحیح راستہ پر پڑ گیا۔

لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہوکر رہے گی، گھر پہنچ کر سیدھا اپنے کمرہ میں گیا۔ پیچھے کمر پر ہاتھ باندھے کچھ دیر کمرہ میں ٹہلتا رہا نوکر کو تیز آواز سے پانی لانے کو کہا۔ پھر ٹہلنے لگا، گلاس میں پانی لئے ماں کمرہ میں داخل ہوئیں، پانی مجھے دیتے ہوئے ایک کرب انگیز نگاہ سے میری طرف دیکھا۔ ماں کو دیکھ کر میں بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہیں خوش کرنے کے لئے میں نے ہنس کر کہا — "آماں، کئی دنوں سے میں تم سے کہنے کو سوچ رہا تھا۔" ماں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "کہو بیٹا! کہو، کیا بات ہے؟ آخر کہو گے نہیں تو معلوم کیسے ہوگا۔" میں بالکل بچہ بن گیا۔ سر جھکائے ہوئے، رو ٹھکر میں نے کہا "ماں، میں ایک سونے کی گھڑی لوں گا۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔"

"اچھا بیٹا، اچھا۔ اچھا۔ اتنی ہی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں کہا؟ میں نے تمہیں کب روکا ہے؟" میں نے دوسری طرف مُنہ پھیر کر کہا — "میں نے ایک گھڑی دیکھی ہے — وہ مجھے پسند ہے۔ گھڑی والا دوسو روپے اس کے مانگتا ہے۔" ماں حیرت سے تکتی رہ گئیں — "بیٹا اتنے دام کی گھڑی لیکر کیا کرو گے؟ کوئی ہلکی —"، مجھے چُپ دیکھ کر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکیں۔ جب میں کچھ نہیں بولا تو انہوں نے اندر جاتے ہوئے کہا:۔ "اچھا اس میں کیا ہے، میں روپے دیتی ہوں، میں نے تمہاری کون سی بات نہیں رکھی۔" — اور وہ نہیں معلوم کیا کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

(۹)

ہائے جوانی دوانی، تو کیا کچھ نہ کرا لے۔ جیب میں دوسو روپے نقد لئے اور جیب کو ہاتھ سے دابے زرینہ کے مکان کے سامنے گندے نالے کے پُل پر میں اندھیرے میں کھڑا تھا، ہر آدمی کو دیکھ کر چور اُچکّے کا شک ہوتا تھا، کوئی جیب نہ کاٹ لے۔ میں جس کی جوانی خریدنے کے لئے وہاں کھڑا تھا اس کا دروازہ آج بند ملا۔ برآمدہ اور دروازہ پر خاموشی کا عالم تھا اور اس تاریکی میں سے مایوسی کی لہریں نکل رہی تھیں جو مجھے ٹکرا کر لوٹ جاتیں لیکن سیلاب کی طرح ہر لہر میرے جسم کے زیادہ حصّہ کو ڈبو دیتی تھی، دھیرے دھیرے پانی میرے گلے تک پہنچ رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کی روح کی طرح میری روح پھڑپھڑانے لگی۔ اتنے میں سامنے کے دروازے کا ایک کواڑ کھلا اور میں امید کے خوف سے بھیگے ہوئے آدمی کی طرح کھڑا کھڑا کانپنے لگا۔ وہ آکر برآمدہ میں کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر ساکت کھڑی رہنے کے بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اندر جاتے ہوئے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک غیر ارادی سکوت سے جس طرح مجرم پھانسی کے تختہ کی طرف بڑھ رہا ہو میں اس کا اشارہ پاکر اسکی طرف جا رہا تھا۔

کمرہ میں داخل ہوتے ہی اس نے [illegible]

[illegible]

کی کُرسی پر اُس کا اشارہ پاکر میں بیٹھ گیا۔ اسے سنجیدہ دیکھ کر میری زبان بند ہوگئی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آخرکار کمرہ کی دردناک خاموشی اسی نے توڑی "آپ کیوں روز یہاں تشریف لاتے ہیں؟" یہ سوال سنتے ہی میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ ہچکچاتے اور ڈرتے ہوئے میں نے کچھ کہنا چاہا، میں نے کچھ کہنا چاہا، "میں آپ کو ——" لیکن میری بات اس کی ہلکی ہنسی سے کٹ گئی۔ سر اُٹھا کر وہ سامنے دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں تصویر پر جمی تھیں۔ سر جُھکائے میں آنکھیں چُرا کر اُسکے گلے تک کا حصّہ دیکھ رہا تھا۔ اس سے کہنے کیلئے میں کتنے رومانی مضامین اپنے دل میں نہیں لکھ لایا تھا لیکن اس وقت زبان کھولے نہ کھلتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کمرہ کی خاموشی سے میں گھبرانے لگا۔ یہاں سے نکالا نہ جاؤں۔ آخر اس طرح وہ کب تک میری خاموشی برداشت کرے گی۔ میں یہی بیٹھا سوچ رہا تھا۔ جب مجھے کچھ کرتے نہ بنا تو میں نے جیب سے گٹھری نکال کر رکھ دی۔ اس نے پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں مجھ سے برابر سوال کر رہی تھیں، آخر یہ کیا ہے، میں نے اس کی ناک کی نتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا "اس کی قیمت دو سو روپے" کہتے ہوئے میرا دل زور سے دھڑکنے لگا اور میں آگے کچھ اور نہ کہہ سکا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گٹھری کھولی، روپے دیکھ کر اُس نے ہنستے ہوئے کہا ——
"آپ کو نوٹ نہیں ملے؟" میں بے حد شرمندہ ہوا اور اپنی اُس چھوٹی سمجھ کو کوسنے لگا جس نے زرینہ کو خریدنے کے لئے چاندی کے روپیوں کو کاغذ کے نوٹوں سے زیادہ کارگر سمجھا تھا۔ زرینہ نے شرارت سے میری جیب کی طرف اشارہ کرکے کہا "آپ کے پاس کچھ اور ہے؟" میں نے مجرمانہ انداز سے جیب میں تھوڑے سے پیسے تھے۔ وہ بھی نکال کر میں نے اسکے سامنے رکھ دئے۔ زرینہ روپے پیسے سب ہاتھ میں لیکر بچّوں کی طرح بجانے لگی۔ میں اُسکے سامنے اُلّو بنا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے ساری مایا میری جیب میں ڈال دی اور ریشمی رومال میں جو کائنات بندھی تھی جھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا، اس رومال میں اپنی انگلیاں ڈال کر کھیلنے لگی۔ "رومال میرا ہے، روپے میں نے اپنی طرف سے آپ کو مٹھائی کھانے کے لئے دئے" اس نے کہا۔
میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے میں کرسی سے لٹکے بیٹھا ہوں —— میں سوچ رہا تھا اب [illegible]

کہہ ڈالوں —— "لیکن میں آپ سے محبت کرتا ہوں —— جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے اپنی خوشی کھو بیٹھا ہوں —— اگر آپ مجھے اپنا نہیں بنا لینگی تو میں کہیں کا نہیں ہونگا۔"
اسکے ہونٹوں کی سُرخی مُسکرائی اور اسکے حسین چہرہ پر ہنسی کی ایک لکیر ناچ گئی۔ وہ پھر ایک تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ میں اسکی ادھ کھلی پتلیوں کی سفیدی کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسکی آنکھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ میں بھی تصویروں کی طرف دیکھنے لگا۔ دیوار کی لٹکی ہوئی تصویر میں ہوائی جہاز اُڑ رہا تھا سامنے کی سیٹ پر زرینہ پائلٹ کی ٹوپی اور چشمہ لگائے بیٹھی تھی اسکی پیچھے کی سیٹ پر راجئی ٹھاٹھ کے کوئی راجا صاحب بیٹھے تھے اور ان کے پیچھے دُبلے پتلے سے کوئی صاحب انگریزی لباس میں سجے ہوئے بیٹھے تھے۔
اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "راجہ صاحب اور انکم ٹیکس کے افسر۔ انہوں نے پچھلے تین سال میں مجھے کوئی دس ہزار روپے دئے ہیں۔ میں ان کی مہربانیوں کے ہاتھ بک چُکی ہوں، انہیں لوگوں نے میری نتھ اتاری تھی۔" اچنبھے میں اسکی نتھ کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے شبہ میں کہا "لیکن آپ تو اب بھی ——" زرینہ نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ماں کا حکم ہے"۔ ماں کا حکم ہے اور ان لوگوں کو بھی یہ حسین فریب پسند ہے۔ کچھ لمحے ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخرکار میری پریشانی دیکھ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اپنے حُسن کا بوجھ ہتھیلی پر رکھے جُھکی ہوئی مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" میں اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا، لیکن میں نے جھٹ سے جواب دیا "میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔" ناک پر انگلی لیجا کر اس نے ہنس کر کہا "تو آپ بھی اسے اُتارنا چاہتے ہیں؟" اور میرے جواب کا [illegible] وہ میرے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی۔
میں چُپ چاپ بیٹھا کمرہ کی ہر چیز کو غور سے [illegible] ہر چیز اپنی جگہ سجی ہوئی تھی۔ کتنا ملائم کچھونا تھا [illegible] کے سامنے دو گدے دار کرسیاں رکھی تھیں [illegible]
[illegible]

پڑا تھا اور دیواروں پر چاروں طرف بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں ۔ پھر میری نظر اس مخصوص تصویر پر پڑی جس میں زرینہ ہوائی جہاز چلا رہی تھی ۔ زرینہ کے پیچھے ان دو شریف آدمیوں کو دیکھ کر پہلے مجھے ایک عجیب اُلجھن ہوئی اور پھر ترس آیا ۔ پلنگ میں سرہانے کی طرف ایک آئینہ جڑا ہوا تھا ۔ ذرا پیچھے کھسک کر آئینہ میں اپنا منہ دیکھنا چاہا ۔ آئینہ میں میرا چہرہ چوروں کا سا لگا ۔ ایک دم میں نے منہ ہٹا لیا جیسے کوئی میرے کانوں میں گا رہا ہو " مکھڑا کیا دیکھت درپن میں "

زرینہ واپس آکر پھر میرے پہلو میں بیٹھ گئی ۔ اس کی طرف میں نے دیکھا ناک میں نتھ کی بجائے شربتی رنگ کی نگ جڑا دیکے مست ہاتھوں نے کیا حسن اس کیل کے جڑاؤ سے کوئی مدھر راگنی الاپ رہا تھا ۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں پیوست کرتے ہوئے ہنس کر کہا ۔ " آپ یہی چاہتے تھے نا ! لیجئے اب آپ والی ہو گئی " یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ اپنی چھوٹی ہتھیلیوں میں لیکر سنجیدگی سے بولی " تو آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں ! لیکن میں محبت کے لئے نہیں بنی ہوں آپ پڑھنے لکھنے والے بھلے گھر کے لڑکے ہیں —— آج تو خیر آتا ہی نہیں ہیں —— لیکن آپ میرا کہا مانئے —— " میں ایک عجیب ہیجان میں یکبارگی بول اٹھا " یہ ناممکن ہے ، زرینہ یہ مجھ سے نہ ہو گا " میرے منہ سے وہ اپنا نام اس بیباکی سے سن کر مسکرائی " یہ ناممکن ہے ! اور اگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں ؟ " میرا سر جھک گیا " اگر آپ کی اسی میں خوشی ہے تو میں آپ کو پیار کرتی ہوں لیکن میں پھر آپ سے کہتی ہوں کہ میں محبت کیلئے نہیں بنی ہوں میں یہاں بکتی ہوں " میری نظریں سیدھی اس جہاز پر گئیں ۔ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا " یہاں ہر چیز ایک فریب ہے ، ایک جھوٹ ہے ، وہ نقلی ہوائی جہاز کی تصویر ہے جس میں میری اور میرے چاہنے والوں کی تصویریں بعد میں شامل کر دی گئی ہیں ، ان لوگوں نے سب سے زیادہ میری قیمت دی ہے ، میں ان کی ملازم ہوں " اس کی باتیں سنتے سنتے میں ایک نامعلوم تشویش میں پڑ گیا میرا چہرہ کمہلا گیا اور اندر زبان سوکھ جانے سے دم گھٹنے لگا ۔

" میں نے اس دن آپ کو تھیٹر کے باہر دیکھا تھا اور اس دن سے لگاتار ادھر آتے جاتے دیکھ رہی ہوں ، آپ مجھے چاہتے ہیں لیکن یہاں کی ہر چیز دھوکا ہے ، فریب ہے ، ہر شخص جو یہاں آتا ہے وہ یہ جانتا ہوا آتا ہے لیکن تم کچھ نہیں جانتے " اسکے منہ سے " تم " سن کر میرا دل کھل گیا ۔ اسکے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے " لیکن اگر اس طرح تم یہاں آئے ہو تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے برباد نہ ہونے دوں گی ۔ لیکن میری کامیابی بغیر تمہاری مدد کے نہیں ہو سکتی " اسکی طرف ایک ٹک دیکھتا ہوا میں اسکی باتیں سنتا رہا " تم جانتے ہو تم نے میرے اندر ایک طوفان اٹھا دیا ہے ۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے وہ نہ چاہو گے جس کے لئے دوسرے یہاں آتے ہیں ۔ اسکے بدلے میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تم سے وہ سلوک نہ رکھوں گی جس کے لئے میں یہاں دروازہ کھولے بیٹھی ہوں ۔ میں تم سے امید کرتی ہوں کہ تم مجھے وہ نہ سمجھو گے جو سمجھ کر دوسرے یہاں آتے ہیں ۔ تم سے مجھے جو زندگی کی ایک نئی جھلک ملی ہے اسے قائم رکھنے میں تم میری مدد کرو اور مجھے امید ہے کہ تم مجھ میں وہی پاؤ گے جس کی تصویر دل میں لیکر تم یہاں آئے تھے "

میرا دل خوشی سے ناچ رہا تھا ۔ پلنگ پر اسکے ساتھ لیٹا ہوا میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بادلوں کی سیج پر سوئے ہوئے ہم دونوں آسمان میں اُڑ رہے ہوں ۔ میں شروع سے آخر تک اسی کو دیکھ رہا تھا اور وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی ۔ اتنے میں کوئی باہر سے دروازہ پیٹنے لگا ۔ اس نے میری ہمت بندھائی وہ آگے چلی اور میں اسکے پیچھے ہو لیا ۔ ڈیوڑھی کی تاریکی میں پہنچکر اس نے مجھے اپنی بانہوں میں کس کر میرے ہونٹھ چوم لئے ۔ جس وقت وہ بڑے کمرے کا دروازہ کھول رہی تھی ڈیوڑھی کا ایک پٹ کھول کر میں باہر نکل گیا ۔ کوئی صاحب باہر انگریزی کپڑے پہنے سر پر نائٹ کیپ رکھے پتلون میں سے قمیص کا دامن کھینچکر جلدی جلدی ہوا کر رہے تھے ۔ میں ان کے پیچھے سے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا اس بیچارے کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے وہ دن یاد آیا جب مجھ کو بھی ایک بار اس دروازہ پر پسینہ آنے لگا تھا ۔

گھر پہنچ کر میں نے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا ۔ روپیوں کو بکس کی تہ میں رکھا ۔ پھر دھیرے سے وہ پانچ روپے کی سونے کی گھڑی نکالی ۔ اس نقلی گھڑی میں مجھے وقت دیکھتے ہوئے ہنسی آئی ۔ گھڑی لیکر اندر گیا ۔ ماں کی ضعیف آنکھیں لالٹین کی روشنی میں اصلی سونا دیکھ کر چمکنے لگیں ۔ ماں نے کہا " بیٹا اب تو تم نے خرید ہی لی ۔ اگر کہو تو میں اسے اپنے پاس رکھ لوں ۔ شاید تم سے کھو جائے " میں نے اپنی رضامندی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ اور کوئی نہ جاننے پائے ہم نے سونے کی گھڑی خریدی ہے ۔ ماں کو میری بات پسند آئی ۔ اور ان کو خوش دیکھ کر میں اُداس ہو گیا ۔

(۱۰)

انگریزی کہاوت ہے " کسی خواہش کو دبانا نہیں چاہئے " لیکن میرا

تجربہ یہ ہوا کہ اپنی خواہش کے سامنے ایک بار سر جھکا دینے سے معاملہ حل نہ ہوا۔
میری روح کی یہ پیاس بار بار بجھ کر بھی نہ بجھ سکی۔ زرینہ کی تنبیہ پر بھی اسکے یہاں
بار بار جانے کو جی کرتا تھا جس طرح شرابی کو جب شراب نہیں میسر ہوتی تو وہ بھٹی
کے دروازے پر جا کر وہاں کی ہوا پی کر مسرور ہو آتا ہے۔ اسی طرح میں زرینہ کے
مکان کے گرد چکر لگا کر اپنا جی بہلا آتا تھا۔

لیکن اس دن پھر دل نے میرے اوپر قابو پا لیا۔ شام کا وقت تھا
بیچ کے بڑے کمرے میں روشنی نہیں جلی تھی۔ میں چپکے سے اندر جا کر کونے میں
کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بغل کے کمرہ میں تخت پر کوئی آدمی ایک موٹے
تکیہ پر منہ کے بل پڑا ہوا تھا۔ اسکے سامنے ایک گلاس میں شراب رکھی تھی جس میں
سوڈے کے بلبلے اٹھ رہے تھے، شراب کی بوتل اور دو سوڈے کی بوتلیں
سامنے تھیں۔ گلاس میں برف کا ٹکڑا گل کر چھوٹا ہو گیا تھا۔ اگالدان کے اوپر
پان کی بھدی پیک پڑی تھی۔ اس آدمی کے بال ماتھے پر بکھرے تھے، منہ لال
ہو گیا تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ گلاس پر ہاتھ رکھے وہ منہ کے بل تکیے پر
پڑا تھا۔ میں نے ذرا جھک کر دیکھا، موتیوں کی جھلملی کے پیچھے زرینہ پلنگ پر
پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ اسکے ہاتھ میں بھی گلاس تھا اور آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں
وہ ٹکٹکی لگائے شرابی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں اپنی آنکھوں سے یہ کیا دیکھ رہا ہوں! زرینہ شرابی!! وہی زرینہ
جو میری سیدھی سادی زندگی کی اکیلی رہبر ہے!!! میں بیٹھا سوچتا رہا اور جب
سوچ نہ سکا تو صرف دیکھتا رہا۔ شرابی نے خمار سے جاگ کر آنکھیں اٹھا کر
زرینہ کی طرف دیکھا، میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ نہ راجہ صاحب
نہ انکم ٹیکس کے افسر۔ پھر آخر یہ تیسرا آدمی کون ہے؟ کیا بہت سے ایسے بدمعاشوں
کی گذر زرینہ کے یہاں ہے؟ میں نے پھر سوچنے کی کوشش کی۔ اتنے میں زرینہ
اس کی آنکھوں کا اشارہ پا کر اٹھی اور بوتل سے شراب اس کے گلاس میں انڈیلنے
لگی۔ اسکے ضد کرنے پر تھوڑی شراب اپنے گلاس میں بھی ڈال لی اور پھر اپنی
جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ شرابی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ زرینہ کو اس نے اپنے پاس
بیٹھنے کی دعوت دی اور پھر اپنے گلاس کی شراب زرینہ کے اوپر پھینکنے کے لئے
اس اٹھایا، زرینہ ہنستی ہوئی اسکے سرہانے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

اب میں صرف زرینہ کو دیکھ سکتا تھا۔ شرابی زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسکی
انگلیاں توڑ رہا تھا۔ زرینہ ہنستی ہوئی انگلیاں چھڑا کر اسکے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی

اتنی ہمدردی شرابی کے ساتھ! اتنی مہربانی اسکے اوپر! میرا احساس ادھر [illegible]
سے میرے کانوں میں چیخ رہا تھا۔ پھٹے ہوئے موٹے گلے سے شرابی نے گانا [illegible]

پیے جا اور پیے جا

زرینہ نے اس کو اپنے گلے سے گانا بنا دیا۔

بوتل اٹھا، کاگ اڑا

شرابی نے گانے کو جاری رکھا،

جتنا پی سکتا ہے پی لے [illegible] زندگی میں اور دو دن بھی

زرینہ نے ایک گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کر دیا اور جھوم جھوم کر گانے لگی

عاقبت کی باتیں جانے کوئی کیا خیر جو ہو گا دیکھا جائے گا

شرابی نے ٹٹول کر اپنا بایاں ہاتھ زرینہ کی جانگ پر رکھا اور دوسرے
ہاتھ سے گلاس خالی کر دیا۔ زرینہ نے جتنی شراب بچ رہی تھی شرابی کے گلاس
میں انڈیل دی اور جھک کر خالی بوتلیں تخت کے نیچے رکھنے لگی۔ شرابی نے
اسکی جانگھ میں انگلیاں گڑاتے ہوئے دوسرے گلاس کو بھی خالی کر کے اسے
تخت پر الٹ دیا۔ میں نیم بیہوشی میں شرابی کو انگلیاں زرینہ کی جانگھ میں گڑاتے
دیکھ رہا تھا۔ میری گرم آہ بول اٹھی۔ وہی جانگھیں!

57

معلوم نہیں اس حالت میں کب تک پڑا رہا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور
اس کا احساس نہیں میں سویا جاگ رہا تھا۔ یکا یک کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا
اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے سامنے زرینہ کھڑی تھی۔ شرابی منہ کے بل تخت پر
پڑا پڑا سو گیا تھا۔ اور اسکے منہ سے سرخ رال ٹپک کر تکیہ پر بہہ رہی تھی۔ زرینہ کے
اشارہ پر میں اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ مجھے کوٹھے پر اپنے کمرہ میں لے گئی۔ وہ
اپنی چارپائی پر پڑ گئی۔ تھکا اور اکسایا میں بھی اسکی بغل میں لیٹا رہا۔ بالکل چپ
چاپ ہم دونوں اسی حالت میں پڑے رہے۔ پھر کوئی کمرہ میں داخل ہوا۔
زرینہ چونک کر اٹھ بیٹھی، میں نے سر اٹھا کر دیکھا زرینہ کی بڑی بہن الٹے
پاؤں کمرہ سے باہر جا رہی تھی۔ زرینہ کچھ سوچتی ہوئی پلنگ پر کچھ دیر تک
بیٹھی رہی۔ میں اپنی جگہ پڑا رہا۔ اتنے میں زرینہ کی ماں کی آواز کمرے تک
سنائی دی "کیوں زرینہ یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس سوال کے لہجہ میں [illegible]
اور سخت ہو گئی "تیری جیسی کئی زرینہ میں پیدا کر کے بیٹھی ہوں [illegible]
کرنے! سارے شہر کے لونڈوں کا کیا یہ کوئی ٹھکانا ہے؟" زرینہ [illegible]
[illegible]

کی آواز اندر کے برآمدہ میں غائب ہوگئی۔ میری خودی کو بڑی زبردست ٹھیس لگی تھی زرینہ کی آنکھوں کے آگے میری سخت بےعزتی ہوئی۔ زرینہ کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرہ کے باہر نکلا، نیچے برآمدہ میں پہنچکر اس نے دھیرے سے کہا ۔" جاؤ میں لکھوں گی۔" اور میں چور کی طرح وہاں سے بھاگتا ہوا گھر آرہا تھا ۔

(۱۱)

سکنڈ کلاس ڈبّہ میں ہم بیٹھے تھے ۔ ان کے اور میرے سوا ڈبّے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میرے ہی برتھ پر وہ دوسری طرف بیٹھی تھیں لیکن داہنے رُخ پر ساری کا پلّہ اس طرح پڑ رہا تھا کہ میں انہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی چلنے پر میرے دل میں جو پہلی خواہش پیدا ہوئی وہ تھی ان کو دیکھنے کی۔ ویسے تو انکی خوبصورتی کی تعریف دوسروں کے مُنہ سے میں نے بہت کچھ سُنی تھی لیکن آج تو میں اپنی ہی آنکھوں کا اعتبار کرسکتا تھا۔ مجھے اس کا بھی خیال تھا کہ گھر سے جُدا ہونے کا انہیں بڑا رنج ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی ہیں اس لئے ان کا رنج دور کرنے اور اپنے دل کی پیاس بجھانے کی غرض سے میں نے ان کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ رکھنا چاہا ۔ حالانکہ سماج نے قانون کی زنجیروں میں باندھ کر انہیں میرے حوالہ کردیا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک انجان عورت پر جس کی صورت سے بھی میں آشنا نہ تھا ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے ڈر لگا۔ ایک مرتبہ ان کو چھونا چاہا لیکن ہاتھ کانپ کر رہ گیا۔ دوبارہ ہمّت کرکے میں نے مُسکراتے ہوئے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ ہی دیا۔ وہ ڈر اور لجا سے میرے غیر مانوس ہاتھ کے بوجھ کے نیچے دبی جارہی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا، میں نے انہیں اپنے پاس کھینچنا چاہا۔ لیکن جب کامیابی نہیں ہوئی تو میں نے جُھک کر ان کی ٹھوڑی پکڑ کر شرارت سے کہا۔ "مجھ سے بھی کیا شرم! تم تو اب میری ہو۔" یہ کہتے وقت میں نے اپنی بھوکی اور امیدوں سے بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا! زرینہ! وہی آنکھیں، وہی صورت وہی معصوم ادائیں لیکن زرینہ کی وہ مسکراہٹ نہ تھی! نہیں زرینہ نہیں یہ میری دھرم پتنی ہیں۔ میرے ضمیر کی آواز آئی۔" میں اپنے شاعر دل کو کوسنے لگا۔ جو ہر پیکرِ حُسن میں زرینہ کو ڈھونڈھتا تھا۔ میں نے سوچا یہ تو میری بیوی ہے، ہندو گھر کی نئی دُلہن ہے۔ پتی کے سامنے کیسے مسکرا سکتی ہے۔ وہ نیچی نگاہوں سے کسی دوسری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ حسین چہرہ، وہ رنگ کا نکھار، ماتھے کا سیندور، کانوں اور گلے میں جھومتے جھلکتے سونے اور نگوں کے جڑاؤ گہنے! باریک ریشمی ساری میں سے ان کا حُسن جھانک رہا تھا۔ ایسی حسین معصومیت بھی میں نے کم دیکھی۔

میں پلنگ پر لیٹا ہوا خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے ہوا میں محل بنا رہا تھا اور اس محل میں اپنی نئی بیوی کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن ہر بار اس میں زرینہ ہی نظر آتی، اور میں جھنجھلا کر دھوئیں کے محل کو ہاتھ سے مار کر بار بار بگاڑ دیتا۔ اتنے میں میں نے محسوس کیا میرے سرہانے کوئی کھڑا ہے پلٹ کر میں نے دیکھا۔ میری بیوی چاندی کی طشتری میں پان الائچی لئے کھڑی ہیں میں نے اپنے تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اپنی بھابی کی تاکید کے مطابق گنّی نکالکر طشتری میں رکھ دی۔ زرینہ پھر مجھے یاد آئی۔ جب میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑی ہے تو میں نے دو گلوریاں خود لیکر کھالیں۔ اچانک مجھے اس مسافر کا خیال آیا جسے میں نے ایک بار تھک کر کہیں کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں دباتے دیکھا تھا لیکن میری بیوی کے چہرہ کا رنگ نہیں بدلا۔ انہوں نے طشتری اُٹھا کر میز پر رکھ دی۔ طشتری میں گنّی دیکھ کر کمبخت زرینہ کا خیال مجھے بُری طرح ستانے لگا۔

صبح کے آفتاب کی نرم اور رنگین کرنیں جنگلے سے گزر کر میرے پلنگ پر پڑ رہی تھیں۔ میں چُپکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا، سورج کی لمبی لمبی کرنوں کی روشنی میں میری بیوی کی کلائی۔ گلے اور کان کے گہنے دمک رہے تھے۔ وہ ابتک سوئی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ گہنوں اور ساڑی سے لیکر ان کی پیشانی تک کی ہر چیز مجھے زرد دکھائی دے رہی تھی۔ میری آخری شاعرانہ اُمنگیں اصلیت کی دُنیا میں پیلے سونے اور پیلی صورت سے مس ہوکر خودکشی کررہی تھیں۔ انکی سانس کی حرکت سے ہار کی کمانی دار تتلیاں کانپ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی کرنوں نے تتلیوں میں جان ڈال دی تھی اور وہ ابھی رنگین کرنوں پر بل کھاتی ہوئی اُڑ جائینگی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کمرہ میں آرہی تھی جس سے میری بیوی کے رخسار پر بکھرے ہوئے بال ہلکے ہلکے اُڑ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا جس تتلی کے کمانی دار پنکھ رات ٹوٹ گئے تھے وہی تتلی بےحس پڑی تھی۔

لیکن میرے لئے شادی بھی اپنے ساتھ راحت نہ لائی۔ میرے دل میں زرینہ کی طرف سے نفرت روز بروز بڑھتی جارہی تھی مگر اس کا خیال دل سے نہ جاتا تھا۔ اسکی یاد آتے ہی میرا غصہ بڑھ جاتا اور میری بیوی جواب مجھ سے دھیرے دھیرے ہل مل گئی تھیں میرے منٹ منٹ پر احساس کے تغیرات سے ایک قدم آگے بڑھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔

اسی سلسلے میں ایک روز ڈاک کے ذریعہ ایک قیمتی ساری میری بیوی کے واسطے شادی کے تحفہ میں آئی۔ پارسل پر بھیجنے والے کا نام پتہ نہیں تھا۔ صرف یہی لکھا تھا "ایک دوست کی طرف سے" میں نے پیسے والوں کو گمنام خیرات کرتے سُنا تھا لیکن یہ گمنام تحفے بھیجنے کا طریقہ اپنی جگہ پر ایک ہی تھا اور مجھے بہت پسند آیا۔ اگر چڑھ ہوئی تو اس بات سے کہ وہ گمنام طریقہ سے میری زندگی میں پھر کیوں داخل ہوئی۔

باغوں میں جب پھول کھلنے لگتے ہیں تو بسنت کا چھپ کر آنا بھی سب پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا راز اوروں کو بھی معلوم تھا میں اپنی لاعلمی میں اپنی شادی کو صرف ایک اتفاق یا سانحہ سمجھتا تھا۔ ایک دن صبح کو ٹہل کر واپس ہوا تو دیکھا کہ میز کے پاس کپڑا جلا پڑا ہے، پوچھنے پر بیوی نے غصہ میں بتایا، خود انہوں نے وہ ساری جلا دی تھی۔ دو سو روپے کے تحفے کی جلی ہوئی سیاہی نے میری آنکھوں میں جلن پیدا کر دی، ولائتی کپڑے جلائے جانے کے دنوں کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے میں سوچنے لگا یہ بھی بائیکاٹ کا کیا قیمتی طریقہ ہے۔ لیکن زرینہ کی بات ان سے کہی کس نے؟ اپنی بھابی کا خیال آیا، میرا دماغ چکرانے لگا۔ ایک دم جی چاہا کہ سامنے جو عورت کھڑی تھی اس کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن وہ میری بیوی تھیں۔

(۱۲)

شہر سے دو میل کی دوری پر اک پارک ہے۔ جب سے دُنیا کے جنجال سے دور جا کر وقت گزارنے کی میری عادت پڑی اسی وقت سے میں اس پارک سے مانوس ہوں، شہر کی بھیڑ بھاڑ اور گندگی سے بہت دور سول لائنس کی امیری کی بو سے ذرا ہٹ کر، دریا سے تھوڑی دور یہ پارک کئی میل کی لمبائی چوڑائی میں پھیلا ہوا تھا۔ میں نے یہی ایک پارک پایا جس میں آدمی عام طور پر بہت کم ملتے تھے۔ اس سے پہلے میں یہاں صبح کے وقت آیا ہوں، شام کو آیا ہوں اور رات کو بھی۔ لیکن اس رات کو نو بجے وہاں ہونا مجھے عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ ہلکی چاندنی پارک کی ہری گھاس اور پھولوں پہ سو گئی تھی۔ بڑے بڑے درخت اپنی سہم خاموشی میں چپ چاپ کھڑے تھے۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، میں راستہ کے کنارے بڑی بڑی گھاس میں جو لوہے کی کرسی رکھی تھی اس پر قریب آدھ گھنٹہ سے چپ چاپ بیٹھا تھا میرے سر کے اوپر سیمر کا ایک بڑا پیڑ کھڑا تھا، ہر دم اسکے بڑے لال لال پھول زمین پر پٹ پٹ گرتے تھے۔ جب کوئی پھول گرتا تو میری نظر اسکی طرف چلی جاتی تھی آسمان سے زمین پر گر کر وہ اپنے زوال کی سُرخ کہانی سُناتا ہی ہوتا کہ اتنے میں دوسرا پھول پٹ سے زمین پر گر پڑتا۔ ہر پھول کے گرنے میں کم سے کم دو آوازیں ہوتیں۔ ایک کسی ڈال سے ٹکرانے کی اور دوسری زمین پر گرنے کی۔ سیمر کے بھاری پھولوں کے گرنے کی منحوس آوازوں میں گھرا ہوا کرسی پر بیٹھا تھا۔

کرسی پر بیٹھا بیٹھا جب میں اپنے خیالوں میں کھو جاتا تو کوئی سیمر کا پھول زمین پر گر کر مجھے جگا دیتا۔ میں سمجھتا زرینہ آگئی۔ کتنی ہی بار اسی جگہ زرینہ مجھ سے ملی تھی۔ جب سے میں نے اسکے گھر جانا چھوڑا تھا وہ مجھ سے یہیں ملتی تھی، آج مجھے اسکی آخری ملاقات یاد آرہی تھی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اُداسی سے مسکرا کر مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس وقت میری شادی کی بات چیت گھر پر ہو رہی تھی۔ اس سے میرے اندر ایک نئی خواہش پیدا ہو گئی تھی، میں اسکے تصور سے ناچ اُٹھا۔

زرینہ میری ہو جائیگی۔ میں خوشی سے پھولا ہوا زرینہ سے یہاں ملنے آیا زرینہ کو شام کو کہیں گانے کیلئے جانا تھا۔ وہ اکثر ایسے موقعوں پر مجھ سے یہاں ملنے کا ارادہ کر لیتی تھی۔ زرینہ مجھ سے دور ہی تھی کہ اس کی زری کی ساری کا عکس میری آنکھوں کی پُتلیوں میں جھلکنے لگا۔ زرینہ آکر تھکی ہوئی میری بغل میں اسی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ مجھے باسی پھول جیسا لگا، شادی کی بات سُن کر وہ اُداس ہنسی ہنسنے لگی۔ میں اس بات کو لاکھ طرح سے اُٹھاتا اور ہر طرح سے التجا کرتا تھا لیکن وہ میری بات ٹالتی ہی گئی۔ جب مجھے غصہ آنے لگا تو اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا "شادی کر لو میں بھی بہو دیکھنے آؤں گی"

میرا غصہ بڑھنے لگا۔ کرسی سے اُٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر ٹہلنے لگا۔ میں بار بار یہی سوچ رہا تھا۔ اسی نے میری شادی کرائی اور میری . . . . زندگی برباد کی۔ میرا ماتھا گرم ہو گیا تھا۔ اندر سے بغاوت کا ایک طوفان اُمڈا آرہا تھا۔ ایک بھاری پھول پٹ سے زمین پر گرا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ پھول نہیں تھا۔ زرینہ آرہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے نزدیک آکر کہا "میں نے کہا آداب عرض" میں نے جواب دیا "آداب عرض" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا کہ خیریت تو ہے، بہت دنوں بعد ملے" "آپ کی مہربانی ہو، کہئے خیریت تو ہے"

کچھ روٹھے سے لگ رہے ہو بھو نے کچھ کہا تو نہیں ؟"——"سب آپ کی مہربانی ہے"——"کیوں کیا بات ہے کچھ کہو تو سہی —— جب سے شادی ہوئی تم ملے بھی نہیں، خود سوچا چلو آج مل آؤں"——
"اچھا سوچا میں بھی ملنے ہی والا تھا"——"لیکن کچھ کہو تو کیوں ایسی روکھی روکھی باتیں کر رہے ہو؟ میرا جی گھبرا رہا ہے، میں تو خوشی خوشی ملنے آئی سوچا بہت دنوں بعد تم سے ملاقات ہو گی۔ تم سے باتیں کر کے جی بہلاؤں گی اور ایک تم ہو کہ روٹھے بیٹھے ہو"——"زرینہ! جو کچھ تم نے کہا میں نے کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں کہیں کا نہ رہا۔ میں ناراض نہیں ہوں، میرا اپنا کون ہے جس سے میں ناراض ہونگا"——"کیا ہوا ہے"——؟
"مہو مہو مت کرو، اگر تم چاہتی ہو کہ میں یہاں بیٹھا رہوں۔ جب سے ساری جلائی گئی میں نے اس کی شکل . . . ."——"ساری جلائی گئی"——"جی ہاں۔ وہ ساری جو تم نے بھیجی تھی جل کر خاک ہو چکی۔ لیکن اسے چھوڑو، اس وقت میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے میں خود جلا جا رہا ہوں اور اگر تم مجھ کو اس آگ سے نکالنا چاہتی تو میری مدد کرو۔"
پریشانی کے عالم میں زرینہ کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے، سر اوپر اٹھائے میری طرف دیکھ رہی تھی"——"نہیں تو مجھے تم سے رخصت ہونا پڑیگا۔"
یہ کہکر میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ٹہلنے لگا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی اور کچھ عرصہ تک ہم لوگ خاموش رہے، صرف پھولوں کے گرنے کی آواز ہو رہی تھی۔
زرینہ نے سنجیدگی سے کہا——"بیٹھ جاؤ۔ مجھ سے بھول ہوئی جو میں نے تم سے شادی کرنے کے لئے کہا—— میری بھول تھی کہ اس رات کو تم کو اندھیری سڑک پر سے اپنے مکان میں بلایا اور یہ بھی بھول تھی کہ انہوں نے وہ ساری جلا دی۔ لیکن سب سے بڑی بھول ہے تمہاری جو ان کی شکایت لیکر تم میرے پاس آئے ہو۔ میں کیا کر سکتی ہوں، اگر میں معافی بھی مانگ لوں تو معاملہ حل نہ ہو جائیگا۔ میں نے تمہارے راستہ میں آ کر غلطی کی"——"یہ مجھے سمجھنے کے لئے چھوڑ دو"——"نہیں مجھی کو سمجھنا چاہیئے"——"مجھے کیا حق تھا کہ اپنی اچھی یا بُری زندگی سے نکل کر تمہاری زندگی کی ہریالی پر تفریح کرنے آئی۔ خوش تھی میں اپنی زندگی میں"——"زرینہ! جھوٹ مت بولو۔ تم خوش نہیں تھیں"——"یہ تمہیں کیسے معلوم، میں آج سے زیادہ خوش تھی"——"اُن شرابیوں اور بدمعاشوں کے ساتھ"——"ہاں! لیکن آج دو انسانوں کے رنج کی وجہ بنکر خوش نہیں ہوں، میں گندگی میں رہتی تھی اور وہی میری خوشی تھی۔ بگڑے ہوئے میرے پاس آتے تھے، میں اور بگاڑتی یا بناتی تھی، اسی لئے وہ میرے پاس آتے تھے۔ وہی میری زندگی کی تفریح تھی۔ اُسی کیلئے سماج نے ہم کو شہر کے کنارے اس محلّے میں بٹھا دیا تھا۔ جن کو دُنیا میں کوئی بھی خوش نہیں کر سکتا، وہ مجھ میں راحت ڈھونڈنے آتے تھے جنکا سنسار میں کوئی نہیں ہوتا وہ مجھے اپنا پاتے۔ میں اُس آتی جاتی اور بنتی بگڑتی دُنیا میں رہ کر خوش تھی، سُکھی تھی"——"شراب پی کر؟"——"——"ہاں شراب پی کر وہی شراب جس سے تمہیں نفرت ہے، وہی شراب جو تم کو میں نے نہیں پلائی، شراب پینا اور اس زندگی میں رہنا مجھے پسند تھا۔ لیکن میرے دل میں ایک ایسا کونا تھا جس کو میں جیت نہ پائی۔ اپنے من کے اسی جھروکے سے میں نے تمہیں دیکھا۔ میں تم پر فریفتہ ہو گئی"——"اور میری شادی کرا دی"——"وہ میری ہار تھی اور تمہارا شادی کر لینا میری جیت ہے، اپنے آنسوؤں کا ہار تمہارے گلے پر ڈال کر میں نے کہا جاؤ شادی کر لو۔ میرے آنسو ہی میری محبت کی یادگار رہے اپنی خود غرضی پر میں نے تم کو قربان نہیں کیا۔ لیکن تم مجھ سے بہت امیدیں کرنے لگے جس کا نتیجہ ہے کہ آج تم اس طرح مجھے ملامت کر رہے ہو"۔
اس کی باتیں سُنتے سُنتے میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا "تم سے اپنی زندگی کو سُکھی بنانے کی کوشش کرنا میری بھول تھی۔ میں نہیں سوچ سکتی تھی کہ اس دُنیا میں کسی کا سُکھ کم کر کے ہی ہم سُکھی ہو سکتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو"
میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "یہ سوچ رہا تھا بہت دیر ہو رہی ہے"
زرینہ ایک دم رُک کر بولی "ہاں چلو چلتی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی تھی اس لئے میں نے تمہارا بُرا نہیں چاہا (پارک کے کسی کونے سے لومڑی کے رونے کی آواز آنے لگی) مجھے امید ہے تم مجھے سمجھنے کی کوشش کروگے (لومڑی زور زور سے رو رہی تھی) ایک شخص دو انسانوں کو آج سُکھی نہیں بنا سکتا وہ چاہے میں ہوں یا تم۔ مجھے امید ہے تم مجھے غلط نہیں سمجھوگے (ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لومڑی روتی ہوئی میری طرف بڑھتی آ رہی تھی) میں چلتے چلتے رُک گیا اور مُڑ کر اس سے کہا "زرینہ!—— (وہ لومڑی بالکل میرے پیچھے آ کر رونے لگی)—— اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بھول جاؤ جو کچھ ہوا"۔

(۱۴)

سات سال بعد ———

اب میں دو بچوں کا باپ ہوں، کھاتا پیتا آدمی ہوں، اپنے بچوں کو پیار اور بیوی کی عزت کرتا ہوں کسی چیز کی کمی نہیں محسوس کرتا۔ ویسے تو موجودہ زندگی ایسی ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسکے پاس سب کچھ ہے۔

کسی چیز کے بارے میں اُسے الگ کر کے نہیں سوچا جا سکتا ہے۔ ہر چیز دوسری چیزوں کے مقابلہ میں ہم کو چھوٹی یا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ میں اپنے بارے میں بھی اپنے سے بڑوں اور چھوٹوں کو دماغ میں رکھے بغیر کیسے سوچ سکتا ہوں۔ اور اس زمانہ میں تو ہر آدمی کو یہ شکایت ہے کہ اسے زندگی سے اتنا نہیں ملا جتنا وہ سمجھتا ہے اسے ملنا چاہئے تھا اور میں تو خود اسی اعتقاد کے بل پر جیتا ہوں اور مشقت کرتا ہوں کہ کل کی دنیا میرا احسان مانے گی ۔؎

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

یہی میرا نظریہ ہے اور یہی میرا فلسفہ۔ یہ دوسری بات ہوئی کہ آئے دن ہماری خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ ہر ایک آج کو مئوّر اور کل کی روشنی میں دیکھ کر خود کو تسکین دیتا ہوں۔ اگر دنیا ہم کو ایسی نہیں ملتی جس طرح کہ ہم نے ایک خیالی تصویر بنا رکھی ہے تو اسکی یہ وجہ ہے کہ شروع ہی سے ہم دو دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک وہ دنیا جس کو میں نے کتابوں میں پڑھا اور جس کی بنا پر دماغ میں ایک نئی دنیا کے نقش بنائے۔ وہ دنیا میرے دماغ کی ہے اور دوسری دنیا میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، لیکن میں اس سے ہراساں نہیں ہوتا کیونکہ میں سوچتا ہوں کہ اسی فرق کی بنا پر انسان کی مسلسل ترقی کا مدار ہے۔

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ نسبتاً میں اپنے کو سُکھی سمجھتا ہوں۔ چھوٹے پیمانے پر میری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، میری ازدواجی زندگی سُکھی ہے اپنے بال بچوں میں اپنے آپ کو خوش پاتا ہوں، اسکے علاوہ مجھ میں اوروں کے مقابلہ میں ایک طرح کی برتری کا احساس بھی ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری جڑیں آم، املی، پیپل یا برگد کے درختوں کی طرح زندگی میں نیچے تک گئی ہیں۔ دوسرے مجھے گملوں میں لگے ہوئے پودوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس ایک دھکا لگا اور وہ اپنے گملوں سمیت زمین پر ڈھلک جائیں گے۔

میں شام کو اپنے برآمدہ میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ سامنے سڑک پر کوئی تانگہ رُکا۔ ایک ادھیڑ عمر کی تندرست بھرے بدن کی عورت سفید ساڑی پہنے تانگہ سے اُترنے لگی۔ اسکے ماتھے پر گھونگھریالے بالوں کے دو گُچھے دونوں طرف لٹکے ہوئے اس عورت کے بیتے ہوئے حُسن کی کہانی سُنا رہے تھے۔ اس نئے محلّے میں ہر آدمی راستہ بھولا ہوا آتا ہے۔ میں سوچنے لگا ضرور شریمتی جی کسی کا مکان پوچھنا چاہتی ہیں۔ وہ میرے برآمدہ میں آ گئیں حالانکہ میں ان سے واقف نہیں تھا۔ لیکن ان کی نسوانیت کے احترام میں مجھے کرسی چھوڑ کر اُٹھ جانا پڑا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کیا، میں نے بھی غیر ارادی طور پر جواب میں ہاتھ جوڑے۔ وہ مسکرائیں۔ میرا دل چیخ اُٹھا، یہ کیا! زرینہ!!

میں نے اسے پہچانا اور گھبرایا ہوا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے اُنکے ساتھ بڑے کمرے میں آیا۔ فوراً بیوی کا خیال ہوا۔ لیکن وہ ان دنوں اپنے گھر گئی ہوئی تھیں، وہاں بھی مجھے چین نہ ملا۔ ان کے ساتھ سامنے کانپتی ہوئی ٹانگوں سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میری کوئی قیمتی چیز پا گیا تھا کہ اسے چھپانے کی کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی، جیسے کتّا روٹی کا ٹکڑا پا کر کوئی کونا تاک کر بھاگتا ہے۔

اوپر کے کمرہ میں آکر میں نے ان سے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ ریڈیو دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ میں نے پوچھا "آپ ہنسیں کیوں؟" زرینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یوں ہی"۔ میں نے پوچھا "کہئے آپ مزے میں ہیں" "آپ کی مہربانی" —— "اِدھر کیسے آنا ہوا" —— "بنارس تک ایک بیڑے کے سلسلے میں آئی تھی۔ سوچا آپ سے بھی مل لوں"۔ میں نے تعجب سے پوچھا —— "لیکن میرا پتہ؟" انہوں نے ریڈیو کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولیں "میں نے ریڈیو سُنا تھا" میں تعجب سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ذرا دیر بعد مجھے یہ خیال آیا۔ شرم سے میرا سر جھک گیا۔ بہت دن ہوئے ریڈیو والوں کو میں نے خط لکھا تھا۔ ریڈیو پروگرام کے بارے میں زرینہ کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے میں نے صلاح دی تھی کہ انہیں اکثر گانے کے واسطے بلایا جائے" —— "لیکن وہ چٹھی آپ کو کیسے ملی؟" —— چٹھی کا جواب میں نے سُنا تھا" "اچھا میں نے نہیں سُنا" —— "جی ہاں، آپ نے بڑی مہربانی کی۔ میرا کئی بار کھو جاتا ہوا، بڑی مدد آپ نے میری ......" میں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا —— "جی ہاں میں نے اپنے کچھ ساتھیوں سے ویسے خط لکھنے کو کہہ دیا تھا" زرینہ مُسکراتی ہوئی بولی۔ "مجھے آپ بھولے نہیں، یہی میرے لئے کیا کم ہے"۔

ایشیا، مئی ۱۹۵۱ء

میں نے ہنستے ہوئے نوکر کو آواز دی اور اُسے چائے لانے کو کہا ۔۔۔ "جی نہیں تکلف نہ کیجئے! میں نے اسٹیشن پر چائے پی لی ہے"۔ میں نے اس بات سے ذرا نامطمئن ہو کر کہا "آپ میرے وہاں آرہی تھیں تو ۔۔۔" انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "جی نہیں، یہ بات نہیں، میں نے سوچا آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو"۔ میں نے بات کاٹ کر کہا "رہنے دیجئے بہت ہو چکا اب، پان میں تو اعتراض نہیں ہے" میں نے نوکر سے پان لانے کو کہا"۔ . . . .

. . . . اس وقفہ میں ان کی نظر کمرہ کے کونہ کی میز پر رکھے ہوئے فوٹو اسٹینڈ پر پڑی، زرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا "یہی ایک لڑکی ہے؟" میں نے تصویر میں دیکھا۔ میری دھرم پتنی میرے پہلو میں بیٹھی تھیں اور ہمارے سامنے ہماری لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے کہا "جی نہیں ایک بچہ گود میں ہے"۔ تصویر پر آنکھ جمائے ہوئے انہوں نے پوچھا "آپ کی بیوی تو مزے میں ہیں"۔ تصویر میں میں اپنی بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ شرماتے ہوئے میں نے کہا "جی ہاں مزے میں ہیں"۔

نوکر نے پان لاکر دیا۔ پان کھاتے ہوئے سنجیدگی سے زرینہ نے کہا

۶۲

"میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔ میرے پاس وقت زیادہ نہیں ہے، اسی گاڑی سے لکھنؤ جانا ہے"۔ میں نے بات کاٹ کر کہا "لیکن آپ نے تو کہا تھا بنارس"۔ زرینہ بیچ میں بول اٹھی "جی نہیں۔ کل لکھنؤ سے پروگرام ہے"۔ سامنے پڑا ہوا لسنر (Listeners) میں الٹنے لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی "میرا اس طرح آنا یہاں، معاف کیجئے گا۔ کچھ دنوں سے برابر آنے کو سوچ رہی تھی، آنا ضروری تھا"۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنا منی بیگ کھولنے لگی، میں تعجب سے منی بیگ کی طرف دیکھ رہا تھا ۔۔۔ "آپ کو یاد ہوگا"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے سونے کی ایک چھوٹی سی دو موتیوں کی نتھ نکالی ۔۔۔ "آپ تو اسے پہچانتے ہوں گے ۔۔۔۔ یہ اس وقت اتر چکی تھی، اسکے اتارے جانے میں میری ماں کا ہاتھ تھا، وہ میری رسم نہ تھی لیکن میں ایسے آدمی کی تلاش میں تھی جسے میں اس کو نذر کر سکتی۔ جو عورت کو پہچانتا ہو اور اس کی قیمت سمجھتا ہو . . . . . . اس دن ریڈیو پر آپ کا خط سنکر میں نے طے کیا کہ آپ عورت کی اس عزت کا بوجھ اٹھا سکیں گے"۔ نتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر وہ کرسی سے اٹھنے لگی، میں نے پریشان آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے شک کی حالت میں اس سے پوچھا "لیکن میں اس کا کیا کروں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ آپ کی چیز ہے، اس میں عورت کی لاج اور عزت دونوں ہیں ۔۔۔ یہ امانت آپ کے پاس رہنی چاہئے"۔ یہ کہکر وہ چلنے کو تیار ہوگئیں۔ میں نے بےچین ہو کر کہا "لیکن اتنی جلدی کیا ہے، آج رہ جائیے۔ کل صبح بھی لکھنؤ جا سکتی ہیں"۔ اس نے کمرہ کے چاروں طرف دیکھ کر پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "یہ میرے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا"۔ یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھی سے اترنے لگی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "پھر کب ملاقات ہوگی؟" اس نے مڑ کر میری آنکھوں میں دیکھا "زندگی کا کیا ٹھکانا"۔ یہ کہتے کہتے وہ ساڑی کا کونہ اٹھا کر اپنی آنکھوں تک لے گئی۔ میں دروازہ پر کھڑا تھا اس کا تانگہ چلا جا رہا تھا وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا زرینہ کتنی بدل گئی ہے۔ اسکی عمر کس تیزی سے ڈھلتی جا رہی ہے۔ اس کا کہنا یاد ہو آیا۔ "زندگی کا کیا ٹھکانا"۔ اور میں یکبارگی کانپ گیا۔

خیالوں میں ڈوبا ہوا اپنے کمرہ میں واپس آیا۔ چھوٹی میز پر سونے کی امانت پڑی تھی، کہاں رکھوں اسے؟ یہی سوال بار بار میرے دل میں اٹھتا تھا، وہ چھوٹی سی چیز مجھے کتنی بھاری معلوم ہو رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے میرے گلے میں پتھر کی بھاری چکی ڈال دی ہے۔ کچھ دیر اسے ہاتھ میں لئے ادھر ادھر گھومتے رہنے کے بعد اپنا بکس کھولا اور اسکی تہ میں نتھ رکھ دی۔ پھر کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد پھر میں بےچین ہو گیا، جا کر بکس کھولا نتھ کو ڈھونڈتے ہی سونے کی ایک گھڑی ملی۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ اتنی دیر میں اس نے اپنا ایک ساتھی بھی ڈھونڈھ لیا، اب میں دونوں چیزوں کو ہاتھ میں لئے کمرہ میں گھومنے لگا۔ پھر الماری کھولی، الماری کے اندر بیچ کے خانہ میں دیوار پر ایک تصویر دو کیلوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

تیئیس سال ہوئے آسمان میں اتر کی طرف ایک بڑا تارہ چمکا تھا جس کی سرخ روشنی دنیا کے پانچویں حصہ پر آج بھی چمک رہی ہے۔ یہ اسی لال ستارہ کی تصویر ہے۔ چکنا سر، چمکتی ہوئی گہری آنکھیں، بھدی ناک، مضبوط جبڑے اور چھوٹی سی ڈاڑھی! ۔۔۔ دیکھنے میں وہ آدمی چوروں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ دراصل چوروں اور ننچوں سے زندگی میں اس کا گہرا تعلق رہا۔ اس تصویر کو دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا، تصویر دو کیلوں پر ٹھہری تھی ایک کیل پر وہ نتھ اور دوسری پر وہ گھڑی میں نے لٹکا دی۔ سونے کی نقلی گھڑی میں میرا ماضی چھپا ہوا تھا اور اصلی سونے کی نتھ میں میرا مستقبل کا بوجھ! ایک کے بغیر دوسرا ممکن نہیں، نتھ کا بوجھ میں اکیلے نہیں اٹھا سکتا تھا [illegible] کو ساتھی بنایا۔

بقیہ مضمون صفحہ ۲۶

اور وزیر بچاؤ کے اختیارات کے حدود کی صاف صاف وضاحت کردی جائے یہ تمام باتیں بہترین نیک نیتی سے کی گئیں، اور خاص مقصد یہ تھا کہ زور شور سے کام شروع ہو جائے۔ یہ ظاہر تھا کہ بغیر اسکے ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی۔

موجودہ حکومت یہ یقین کر سکتی ہے کہ وہ عوام کے جذبات و احساسات کا علم رکھتی ہے، لیکن خلیج بہت بڑی ہے اور عوام کے لیڈر ہی اسے پاٹ سکتے ہیں اور عوام کے لیڈر بھی اُسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ عوام کی امیدوں کے قدم بقدم رہیں۔ نظر بہ حالات کانگریس کی ورکنگ کمیٹی سمجھوتہ کی صادق اور پُرجوش خواہش کی وجہ سے اس انتہا تک پہنچ گئی کہ عوام کے جذبات انتہا درجہ تک جھیل جھال کر کم کر دئے گئے، کمیٹی کو اس بات کا پوری طرح علم تھا کہ آسٹریلیا اور ہندوستان کی پوزیشن میں جو فرق ہے وہ ہندوستان کے بچاؤ کے کنٹرول اور رہنمائی کی نسبت سے عوام کو سمجھانا مشکل ہوگا۔ لیکن اس امید کا پورا بھروسہ تھا کہ ایک بار جہاں سمجھوتہ ہوا تمام پارٹیوں کی مشترکہ کوشش ایک دم سے فضا کو بدل دے گی، اور ہندوستان میں ہر شہر اور گاؤں میں پُرجوش والنٹیروں کی چہل پہل نظر آئے گی، صرف یہ کہنے کا موقع ملنا چاہئے تھا کہ ہندوستان عملاً آزاد ہے، اور برطانی اور امریکن آپ کے دوستوں اور ساتھیوں کی حیثیت سے یہاں ہیں، تاکہ آپ کو اپنی آزادی قائم کرنے اور بچانے میں مدد دیں، اس میں کسی ایک فرقہ کے دوسرے پر چھا جانے یا کسی اقلیت پر اکثریت کی جابرانہ حکومت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

سر اسٹیفورڈ کرپس کے آخری خط اور ان کی براڈکاسٹ تقریر نے تو اور بھی زیادہ گنجلک پیدا کر دی اور بعد کو انہوں نے کراچی کے اخبار والوں کو جو انٹرویو دیا، اس سے تو اس انتشار میں جو رہی سہی کسر تھی وہ بھی پوری ہو گئی انہوں نے قدرتی طور پر یہ کوشش کی کہ حالات کے سیاسی جائزہ میں شخصی نوازن داخل کر کے صریحی دشتیوں کو نرم کر دیں، اس . . . . سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر مُنہ بد ذائقہ ہو گیا۔ ہندوستان ہکا بکا ہے اور پہلے سے زیادہ غیر یقینی حالت میں ہے اور یہ محسوس کیا جاتا ہے (جس کے لئے بہت کچھ جواز موجود ہے) کہ سر اسٹیفورڈ کرپس کی آخری ادا کاری خاص اس مقصد سے تھی کہ وہ دہلی اور لندن میں اپنے آدمیوں میں اپنی ناکامی کو ایک قسم کی کامیابی ظاہر کریں، ایک ایسے رجعت پسند کی کامیابی جو دقیانوسی سامراج کے محافظ ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہو۔

شائد مسٹر جناح سے آخری انٹرویو کے دوران میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کانگریس مشترکہ ذمہ داری کے کوشش سے لیجسلیچر کے روبرو ذمہ داری چاہتی ہے۔ ورنہ مسٹر جناح اتنے تجربہ کار پالیمینٹیرین ہیں کہ وہ اپنے اخباری بیان میں وہ خیال نہ ظاہر کرتے جو انہوں نے سر اسٹیفورڈ کرپس کی روانگی کے بعد ظاہر کیا۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو سر اسٹیفورڈ کرپس نے مختلف آدمیوں سے مختلف مقصدوں سے مختلف باتیں کہیں، اس سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگریس کے صدر سے انٹرویو کے دوران میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے نہی ہمت کر کے یہ کہا تھا کہ چونکہ اگزیکٹو کے ممبر لیجسلیچر کے سامنے ذمہ دار نہیں ہو سکتے، وہ ایک طرح پر ان پارٹیوں کے سامنے ذمہ دار ہوں گے جن میں سے وہ آئے ہوں گے۔

بہرحال کیبنٹ کی تشکیل پر تو اس لئے بحث نہیں ہوئی کہ وہ منزل آئی ہی نہیں، لیکن یہ ظاہر تھا کہ اس مشترکہ کیبنٹ سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ مشترکہ ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ایک ٹیم کی سی اجتماعی اسپرٹ سے کام کریگی اگزیکٹو اور گورنر جنرل کے رابطہ کا جو نسٹال تھا، اس کیبنٹ کی مشترکہ ذمہ داری اور گورنر جنرل سے تھا، کیبنٹ کے اندر فرقہ واری کی بنیاد پر پالیسی اور لائن پر اکثریت اور اقلیت کا سوال تو کبھی زیر بحث آیا ہی نہیں۔ اگر بحث کیلئے یہ مان بھی لیا جائے کہ مجوزہ کیبنٹ کی تشکیل ایسی ہوتی ہے کہ اس کے دیہی معاملہ میں اقلیتوں کے نمائندے گھاٹے میں رہتے، لیکن انتہائی وسعتی نظر والی اکثریت ہی خانہ بہ انداز ظالمانہ کھیل کھیل سکتی ہے سب سے تجربہ کی بنا پر میں اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ پارٹی کیبنٹ میں بھی اقلیتیں اپنی تعداد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وزن رکھتی ہیں۔ وقتی مسئلے جن پر اہم نتیجوں کا انحصار ہوتا ہے دوٹوں سے نہیں بلکہ عام اتفاق رائے سے طے ہوتے ہیں لیکن اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کا موقع نہیں

مجموعی حیثیت سے ہندوستان میں کرپس مشن کا نتیجہ یہ ہے کہ مصیبت کی گھٹائیں اور زیادہ گھر آئیں۔

حسرت ترمذی بی-اے

محبّت کی وادیاں

یہ عہدِ محبّت کی آبادیاں　　سلامت رہیں دل کی بربادیاں

نشیمن کی وہ آرزو کیا کرے　　سمجھتا ہو جو خانہ بربادیاں

محبّت کی رسمیں ہی اب اور ہیں　　نہ فرہادیں اور نہ فرہادیاں

کہاں فکر کی اُلجھنوں سے نجات　　کہاں زندگانی میں آزادیاں

کوئی کیا کسی کی شکایت کرے　　چمن میں لٹیں خود چمن زادیاں

نگاہوں میں شوخی لبوں پر ہنسی　　کوئی سیکھ لے تم سے صیّادیاں

تمہاری اداؤں کے سب کھیل ہیں　　نہ آبادیاں ہیں نہ بربادیاں

کہاں تک یہ ہم سے تری غفلتیں　　کہاں تک یہ ہر لحظہ بربادیاں

محبّت کے جلووں سے آباد ہیں　　یہ صحرا، یہ گلزار، یہ وادیاں

قفس کے لئے دل تڑپتا رہے
ملیں ہم کو حسرت جو آزادیاں

ایشیا مئی ۱۹۴۲ء

نیاگرا

عورت کی زندگی (تریاقِ نسواں)

اس حیثیت سے کہ عورت زندگی میں خلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ دُنیا اور سماج کی تمام تر صحت کی ذمہ وار ہے، یہی نہیں، آنے والی نسلوں کی صحت کا دار و مدار خود آج کی عورت کی تندرستی پر ہے، مگر افسوس مرد غافل اور خود عورت دور رس نہیں۔ اس کی حیا، اور مرد کی غفلت دُنیا کو مریض مستقبل کی طرف لئے جا رہی ہے۔

عورتوں کی معمولی بیماری ہی کو لیجئے، عام جسمانی کمزوری و نقاہت، بعض اوقات زچگی کے امراض اور کبھی رحم کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے سفید رطوبات خارج ہونے لگتی ہیں، جس کی وجہ سے زندگی مضمحل نظر آنے لگتی ہے۔ قبل از وقت بُڑھاپا چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اولاد ہونا بھی بند ہو جاتا ہے ان تمام شکایتوں کے لئے تریاقِ نسواں نہایت ذی تاثیر دوا ہے۔ پہلی ہی خوراک اثر کرتی ہے۔ اس دوا نے صنف نازک کے طبقے میں بڑی قبولیت حاصل کی ہے، اصل میں یہ اکسیر ہمارے دواخانے کی شہرت اور کامیابی کا باعث ہوئی ہے۔ تریاقِ نسواں ۳ ماشہ صبح اور ۳ ماشہ شام گائے کے تازہ دودھ کے ساتھ استعمال کیجئے۔ ترش اشیاء اور گڑ وغیرہ سے پرہیز لازمی ہے۔ قیمت برائے ایک ماہ فی ڈبہ [illegible] علاوہ محصول ڈاک —

نوٹ:۔ یہ تریاقِ حکیم نعیم اللہ صاحب سند یافتہ طبیہ کالج لاہور رجسٹرڈ اندیجنیس میڈیکل پریکٹیشنر کلاس اے گورنمنٹ یوپی کا شہرۂ آفاق دوا ہے [illegible]

منیجر مشہور عالم آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ

جہانگیرآباد (ضلع بلند شہر یوپی)

ساغر نظامی

سماج

کِھل کِھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا، جانِ بہار — اے مری جانِ بہار
خندہ، بجز شورشِ آغازِ بلا کچھ بھی نہیں
نغمہ، بجز ماتمِ تابوتِ صدا کچھ بھی نہیں
ہر روشِ صحنِ گلستاں کی مزارِ بُو ہے
گو دہیں موجِ تبسّم کے فقط آنسو ہے
جگنوؤں کا یہ چراغاں ہے شراروں کا فریب
لالہ و گُل کا تبسّم ہے بہاروں کا فریب
کِھل کِھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا، جانِ بہار — اے مری جانِ بہار
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا، جانِ سخن — اے مری جانِ سخن
جھوٹ نے مستیِ گفتار میں بدلا ہے لباس
غیبت و کذب کی رنگین و تراشیدہ اساس
بحرِ تکذیب کے ٹھہرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ
یا جہنم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
[illegible] کو اک آن میں الہام بنا دیتے ہیں
[illegible] ہونٹوں پہ نہ جا، جانِ سخن — اے مری جانِ سخن

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر، کیفِ نظر　　اے مرے کیفِ نظر

یوں تو شیریں ہیں بظاہر یہ مئے زیست کے جام
لیکن احساس ہیں یہ جام ہیں زہرابِ تمام
تلخیاں جھانک رہی ہیں کوئی جیتا تو نہیں
بادۂ عیش جہاں میں کوئی پیتا تو نہیں
میٹھی میٹھی یہ نگاہیں، یہ تبسّم یہ نیاز
سب کے پردے میں ہے اک تلخ حقیقت غمّاز

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر، کیفِ نظر　　اے مرے کیفِ نظر

گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا، سازِ خیال　　اے مرے سازِ خیال

استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستون چاہیے اس بیل کو زردوزی کا
حلقہ کرتی ہیں یہ زرّیں کمر و گردن کا
عکس پڑتا ہے بہاروں ہی پہ اس گلشن کا
فن ہو یا حُسن، جوانی ہو کہ پیغامبری
ہار پڑتا نہیں مفلس کے گلے میں یہ کبھی

گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا، سازِ خیال　　اے مرے سازِ خیال

عطر آلود لباسوں پہ نہ جا، روحِ گلاب　　اے مری روحِ گلاب

اُس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائیگا دنگ
عہدِ تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ دھڑنگ
ہے یہی مرکزِ بو، اور یہی مخزنِ رنگ
جسمِ عریاں پہ مگر جامۂ انفاس ہے تنگ
توشہ خانے سے امیروں کے اُڑے ہیں یہ لباس
خونِ مزدور کی خوشبو میں بسے ہیں یہ لباس

عطر آلود لباسوں پہ نہ جا، روحِ گلاب　　اے مری روحِ گلاب

ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ، حُسنِ نظر — اے مرے حُسنِ نظر

چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جو تہذیب کے بُت
تیشے ترشائے ہوئے آذرِ تادیب کے بُت
ان کے دل سنگ ہیں، جان سرد ہے سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب، ان کے سفینے تاریک
کوئی در ان پہ سیہ کاریوں کا بند نہیں
جانِ ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں

ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ، حُسنِ نظر — اے مرے حُسنِ نظر
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا، کشتِ حیات — اے مری کشتِ حیات

کبھی مجبور پہ ہو بارشِ الطافِ امیر؟
ایک ہو جائے کبھی قسمتِ صیاد و اسیر!
زہر خود شہد بنے، آب ہو خود موجۂ شیر
اپنی ہر کاٹ سے پیدا کرے امرت شمشیر
جذبۂ جبر کے ہونٹوں پہ تبسم ہو، محال
ظلم کی روح کو احساسِ ترحم ہو، محال

ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا، کشتِ حیات — اے مری کشتِ حیات
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا، حُسنِ نظر — اے مرے حُسنِ نظر

یہ کرم اور یہ اخلاق، یہ مجرے، یہ سلام
یہ تواضع، یہ تکلف، یہ تبسم، یہ کلام
ہر نفس گدگدے صوفوں پہ قعود اور قیام
ہر ادا قاتل و صیاد، نظر دانہ و دام
پر یہ سب ذوقِ نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
اس کی تہ میں صداقت بخدا کچھ بھی نہیں

مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا، حُسنِ نظر — اے مرے حُسنِ نظر

ساغر نظامی

انقلاب

کیوں لطف تم کو شام و سحر میں نہیں رہا
کیا میرا اعتبار نظر میں نہیں رہا

ساکت ہے کائنات تو جامد ہیں شش جہات
جیسے کہ دورِ شمس و قمر میں نہیں رہا

جس میں فروغِ لالہ و گل دیکھتا تھا میں
وہ آئینہ حریمِ سحر میں نہیں رہا

آئینہ ہی نہیں ہے تحیّر سے چور چور
جوہر مزاجِ آئینہ گر میں نہیں رہا

ہر شے کو دیکھتا ہوں، مگر دیکھتا نہیں
احساسِ دید چشم و نظر میں نہیں رہا

دل اختیار میں ہے نہ قابو ہے روح پر
میرا وجود میرے اثر میں نہیں رہا

تھی گردشِ حیات بھی جس عزم سے خجل
وہ عزم میرے ذوقِ سفر میں نہیں رہا

جو چومتا تھا اُڑ کے تخیّل کی چوٹیاں
وہ اشتیاق بازو و پَر میں نہیں رہا

جو میرے آشیاں کو بناتا تھا آشیاں
وہ اضطراب برق و شرر میں نہیں رہا

کشتی مری امید کی اب کون لے چلے
طوفان کوئی دیدۂ تر میں نہیں رہا

جس نے تجھے تراش کے معبود کر دیا
وہ بُت تراش قلب و نظر میں نہیں رہا

جس میکدہ کا مست خرامی تھا ایک نام
وہ میکدہ بھی راہ گزر میں نہیں رہا

آتا تھا جس سے تیرے خرامِ حسیں میں لوچ
اب وہ ہجوم راہ گزر میں نہیں رہا

ملتا ہوں ہاتھ آہ کہ جب لگ رہی تھی آگ
کیوں اس گھڑی میں بھول کے گھر میں نہیں رہا

ہر دم نوازشیں ہیں نہ پیہم ستائشیں
اب کوئی لطف عرضِ ہنر میں نہیں رہا

عکّاس تھا جو تیرے جمال و جلال کا
وہ سوزِ حسن شام و سحر میں نہیں رہا

مبہم سا اک فریب اجابت تھا جس کا نام
وہ ربط بھی دعا و اثر میں نہیں رہا

پر تو سے جس کے آرزوئے دل جوان تھی
وہ التفات تیری نظر میں نہیں رہا

شائد یہ کائنات بکھرتی نہ کچھ دنوں
کچھ اور کیوں میں تیری نظر میں نہیں رہا

ساغر نظامی

آنکھیں

نسیم و نکہت و رنگ و شراب ہیں آنکھیں — شگفتگی ہیں، کنول ہیں، گلاب ہیں آنکھیں
جزیرہ ہائے مہ و آفتاب ہیں آنکھیں — پہیلیوں کی طلسمی کتاب ہیں آنکھیں

نظر اُٹھا کے خود اپنا جواب ہیں آنکھیں

سجودِ صبح کے پاکیزہ تراشہ کی قسم — شب گنہ کی دھڑکتی ہوئی سحر کی قسم
کسی عفیف کی بہکی ہوئی نظر کی قسم — تمام عالمِ اسرارِ خیر و شر کی قسم

پیامِ کفر و گناہ و ثواب ہیں آنکھیں

مچل رہی ہیں کبھی مُسکرا رہی ہیں کبھی — سنبھل رہی ہیں کبھی لڑکھڑا رہی ہیں کبھی
فریبِ کیف میں سب کچھ لُٹا رہی ہیں کبھی — چھلک رہی ہیں کبھی اور پلا رہی ہیں کبھی

شراب ہیں کبھی جامِ شراب ہیں آنکھیں

تڑپ رہی ہے غمِ گفتگو کی بیتابی — جھلک رہی ہے خفی جستجو کی بیتابی
شگفتگی کو ہے پروازِ بو کی بیتابی — چھلک رہی ہے مئے آرزو کی بیتابی

لطیف دو قدحِ اضطراب ہیں آنکھیں

سلام ہوتے ہیں پیہم پیام آتے ہیں		کلام ہوتے ہیں باہم سلام آتے ہیں
ابد نشاط تمنا کے جام آتے ہیں		عجیب ان کو طریقِ کلام آتے ہیں

کہ چپ ہیں بزم میں اور کامیاب ہیں آنکھیں

تصدق انپہ ہیں، شام و پگاہ کے بھونرے		طواف کیلئے بیکل ہیں آہ کے بھونرے
تڑپ رہے ہیں مری تشنہ چاہ کے بھونرے		بنے ہیں نغمۂ رقصاں نگاہ کے بھونرے

کنول کی شاخ ہو تم اور گلاب ہیں آنکھیں

دلوں میں سوئے ہوئے کاروان جگاتی ہیں		عجیب خواہشوں کی مثنوی سناتی ہیں
سپردگی کے عجب راگ گنگناتی ہیں		بغیر ساز ہی سازِ کرم بجاتی ہیں

نگاہِ شوق ہے مطرب، رباب ہیں آنکھیں

بیان پھر ہوں فسانے حسین آنکھوں سے		بلند پھر ہوں ترانے حسین آنکھوں سے
کچھ اور مست نشانے حسین آنکھوں سے		بدل گئے ہیں زمانے حسین آنکھوں سے

نویدِ شورشِ صد انقلاب ہیں آنکھیں

جوش ملیح آبادی

"حرفِ آخر" کا ایک ورق

حوّا کا احساسِ شباب

(ایک کُنج کے سبزہ زار پر حوّا بیٹھی ہوئی ہے، آدم اسکے زانو پر سر رکھے سو رہا ہے کہ دبے پاؤں اک سُرخ پوش چہرہ پر گہری سیاہ نقاب ڈالے حوّا کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور اسکے احساسِ شباب کو بیدار کرنے کی خاطر آہستہ سے کہتا ہے)

اس آبِ تبسّم میں نہ آئے گی روانی — اس حرف سے چھلکے ہیں نہ چھلکیں گے معانی
اس حسن سے ہوگی نہ کبھی شعلہ فشانی — برسے گا نہ اک بوند بھی اس ابر سے پانی

نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس سلسلۂ شرم سے بل جائیگا جس وقت — رگ رگ میں جوان خون اُبل جائیگا جس وقت
سانچے میں نئی آگ کے ڈھل جائیگا جس وقت — کانٹا ترے سینہ کا نکل جائے گا جس وقت

کُھل جائیں گے تخلیق کے اسرارِ نہانی

نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس شرم سے اس ضبط سے اس بیم و رجا سے — اس جذبۂ ناملس سے اس خوفِ خدا سے
اس شدّتِ آداب سے اس فرطِ حیا سے — اس خفّتِ مغروئ انداز و ادا سے

شامیں ہی سلونی ہیں نہ صبحیں ہیں سہانی

نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

ہاں جھوم، کہ انگارہ جوانی کا دھک جائے — کوندا سا لپکنے لگے بجلی سی چمک جائے
[illegible] عشرت کہ ترا جسم چھلک جائے — اور اتنی کہ انگڑائی جو لے جلد مسک جائے

اُٹھ رقص میں آ [illegible] بھرپور جوانی

(یہ کہتے ہی سُرخ پوش نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ حوّا پر بیداریٔ شباب کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ اپنی کلائی کو بلند کرکے دیکھتی ہے۔ ایک عجیب لذت و کرب کے عالم میں دل ہی دل میں کہنے لگتی ہے)

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں — یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں دواں
بیداریوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے — کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کئے ہوئے
آنکھوں سے ایک بھاپ سی اُٹھتی ہے گرم و سرد — پنڈے کے پھیکے پن میں ہے کیسے مزہ کا درد
تڑپا رہا ہے کون دلِ دردمند کو — اینٹھن سی کھائے جاتی ہے ہر جوڑ بند کو
رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں — رُخ سے سکون کے چھوتے ہی اُٹھتا ہے اک دھواں
کوئی ہمک رہا ہے یہ اندازِ دل نشیں — سینے میں ہے کہ گود میں مجھ کو خبر نہیں
کانوں سے لو نکلتی ہے اور آگ ہے جبیں — چھاتی اُبل رہی ہے نہ ہو جائے شق کہیں
زانو پہ سونے والے ہی سے کیوں نہ پوچھ لوں — یہ بیخودی سی مجھ میں پھٹی پڑ رہی ہے کیوں
دھومیں مچی ہوئی ہیں وہ دل میں کہ الاماں — اینٹھی سی جا رہی ہیں نگوڑی کلائیاں
اک پو سی پھٹ رہی ہے الجھتی نجوم سے — کیا صبح ہو رہی ہے رگ و پے میں دھوم سے
ہوتی ہے کیوں لچک سی کمر میں یہ بار بار — کیسا یہ اُف ہے دھوم مچاتا ہوا اُبھار
پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بُری — پہلو سے زلف مس ہو تو آتی ہے جھرجھری
تیزی سے بن رہی ہوں میں اک زندہ پھول بن — ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے پھبکا ہوا بدن
ہر رونگٹے کی جاگ اُٹھی پیاس الاماں — احساس اور جسم کا احساس الاماں
شیریں و تلخ زہر رگ و پے میں بھر دیا — کس نے یہ مجھ کو جسم سے آگاہ کر دیا
لگتا ہے تیر بن کے جھلک ہزار کا — در آیا ہے بدن میں زمانہ بہار کا
سیّال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن — معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن
اے کاش مجھ پہ رحم نہ کوئی ذرا کرے — مجھ کو نڈھال کر دے مجھے ادھ موا کرے
دشمن کی طرح بھینچ کے رگ رگ کو توڑ دے — اور توڑنے کے بعد سسکتا ہی چھوڑ دے

(حوّا کے جسم کی برقی لہروں سے آدم بیدار ہو جاتا ہے اور ایک سیاہ لکّۂ ابر دونوں کو چھپا لیتا ہے)

کسوٹی

اکسیر برص (سفید داغ)

حسن، انسانی زندگی اور جد وجہد کا اعلیٰ ترین مقصود ہے، سوسائٹی اور زندگی میں خوبصورتی کبھی ناکام نہیں ہوئی، مگر سفید داغ (برص) انسان کی انتہائی بدقسمتی ہے، نفرت وحقارت کا موجب ہیں، سوسائٹی میں برص زدہ انسان سے کوئی حقارت کا اظہار نہ کرے، مگر اسکے منظر کا اثر انسانی دل ودماغ پر ضرور ہوتا ہے موذی ترین مرض ہے، اور انسانی حسن کا شدید دشمن، مگر اس شدید دشمن کا علاج صرف اکسیر برص ہے جس کے استعمال سے یہ جلدی مرض جڑ سے جاتا رہتا ہے۔

صبح وشام، اکسیر برص ۶، ۶ ماشہ تیز گرم پانی میں بھگو رکھیں اور کچھ دیر بعد نتھار کر پی لیں، بچے ہوئے فضلہ کو پیس کر اور سرکہ میں ملاکر داغوں پر لیپ کرلیں۔ سوتے وقت ضماد برص نیم گرم داغوں پر لگائیں اور اسکے بعد دیکھیں کہ کس طرح یہ اپنا کام کرتا ہے۔ قیمت ایک ماہ کیلئے ۵ؕ علاوہ محصول۔

نوٹ:۔ یہ اکسیر حکیم نعیم اللہ صاحب سند یافتہ طبیہ کالج لاہور رجسٹرڈ انڈیجنس میڈیکل پریکٹیشنر گورنمنٹ یو۔پی کی مجرب اور کارگر ادویات میں سے ہے (ادارۂ ایشیا میرٹھ)

منیجر مشہور عالم آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ
جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر۔ یو۔پی)

کسوٹی

نئی کتابیں اور رسالے

روح غالب :- مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور،
سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ (۲۱)
قیمت ۱۲؍ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

مرزا غالب کی نظم و نثر اور اُن کی زندگی کے متعلق کافی لٹریچر پیدا ہو چکا ہے مگر شکسپیر کے برابر نہیں۔ غلام، بد ذوق اور جاہل قوم میں جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ مایوس کن نہیں۔ روح غالب کے نام سے ڈاکٹر زور (حیدرآباد والے) مرزا غالب کے متعلق ایک نئی کتاب ترتیب دی ہے۔ اس تالیف و ترتیب کا مقصد یہ ہے کہ اُردو کے اس شاہکار سے صرف ایسے شہ پارے چن لئے جائیں جو زبان اور اسلوب کے لحاظ سے دلچسپ ہوں اور اُن علمی و فنی بحثوں کو علیحدہ کر دیا جائے جو تحقیق و تفتیش کرنے والوں کے لئے کارآمد ہیں نہ کہ غالب کے اسلوب خاص سے لطف اندوز ہونے اور اُردو نثر کے پاکیزہ نمونوں سے واقف ہونے کے لئے۔

جن ادب پاروں کو ڈاکٹر صاحب نے منتخب کیا ہے اُن کی حیثیت ادبی ہے۔ نثر کے جو انتخابات شامل کئے گئے ہیں وہ اُن کے اُردو مکاتیب کا نچوڑ ہیں ان خطوط سے غالب کی روحانی کیفیتیں پھوٹی پڑتی ہیں۔ غالب کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔

اصل میں یہ کتاب اک تالیفی نمونہ ہے، مغربی اصول ترتیب کا، دوسری کتابوں کے سقوط کے لئے اسے ترتیب نہیں دیا گیا۔ بلکہ جماعت کے لئے رنگارنگ مزاج و ذوق کے مطالبہ کی ضمنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس تالیف میں لاعلمی و فنی باتوں کے علاوہ اس مجموعے کے خطوط سے ان عبارتوں کو بھی علیحدہ کر دیا گیا ہے جن میں غالب نے حوائج ضروری اور دیگر ایسے امور کا ذکر کیا ہے جو مطالعہ کے لطف میں بدمزگی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتے تھے۔

یہی وہ خصوصیات ہیں کی بنا پر اسے روح غالب کہا جا سکتا ہے۔

خطوط کے سمجھنے کے لئے، مرزا غالب کے حالاتِ زندگی، تصنیفات و تالیفات، خاص عزیزوں اور دوستوں کے متعلق معلومات بھی ایک باب میں درج ہیں۔

کتاب کے پہلے باب "غالب کے متعلق ادب" میں ابتدائی کوششوں کی داستان، سوانح عمریاں، اور غالب کے سوانح نگاروں اور ناقدوں حالی آزاد حیدر یار جنگ طباطبائی۔ دوسری نثر میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف غلام رسول مہر شیخ محمد اکرام۔ سالک رام اور مہیش پرشاد کا ذکر ہے۔

تیسرے باب میں حیاتِ غالب میں بہ الف خاندان، تعلیم تربیت، شادی اور سکونت دہلی، صحبت کا اثر، مالی پریشانیاں، کلکتہ میں، بدنامی، قید، قلعہ کی ملازمت عروج و زوال، رام پور سے تعلق، انگریزوں کی خفگی، رام پور کا دوسرا سفر، وفات ب آزادہ روی و رندمشربی، اسراف، خوشامد، مروت و فراخ حوصلگی، مذہبی بے تعلقی و رواداری اور ظرافت کا ذکر کیا گیا ہے۔ *

۴ پانچویں باب "خطوطِ غالب کے دلچسپ ادبی حصے" میں غالب کے خطوط کی خصوصیت، خطوطِ غالب کی فہرست، اور غالب کے خطوط درج کئے گئے ہیں۔

اس کا پیش لفظ آنریبل مولوی سید مہدی حسین صاحب بلگرامی نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات ممالک محروسہ و صدر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے تحریر فرمایا ہے۔ اس پیش لفظ کا یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ غالب کو مغربی معیار و نقطۂ نگاہ سے نہیں مشرقی زاویۂ نگاہ سے ہی دیکھنا چاہئے۔ یہ انتباہ ان حضرات کے لئے ہے جو مغربی اصول تنقید کی روشنی میں غالب کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ گویہ پیش لفظ مختصر ہے لیکن معنی کے لحاظ سے بہت ہی خوب ہے۔

دیباچہ مرتب نے لکھا ہے۔ غالب اور ڈاکٹر زور صاحب کے فوٹو ہیں۔ غالب کی کوئی نئی تصویر نہیں ہے۔

کتب تنوع کے طور پر نہایت خوب ہیں اور شعرا کے متعلق اس قسم کی ہی تالیفات اور بھی آئیں تو اردو زبان کی یہ بہت بڑی خدمت ہے۔ ضرورت ہے کہ اب ڈاکٹر زور قبرستانوں سے رخ پھیر کر زندگی کی طرف رجوع ہوں اور عصر حاضر کے زندہ جدید شعرا کی چھان بین کی طرف رجوع کریں اگر یہ پوری نسل کی نسل خودرو طور پر پروان چڑھنے کے لئے چھوڑ دی گئی تو اس کی ذمہ داری ان افراد پر ہوگی جو خود کو نقاد کہتے ہیں اور اس وقت تک زیر زمیں دفن شدہ دنیا ہی سے تعلق رہا ہے۔

اردو میں نیا سیاسی ادب

کسی زبان میں رومانی ادب کی زیادتی ذہنی انفعال ہونے کی دلیل ہے۔ اردو میں صدیوں ایک خاص قسم کے ادب کی ترقی ہوتی رہی۔ سیاسی ادب نام کو بھی نہ تھا۔ آزاد نے تو تاریخ کا لہجہ بھی افسانوی کر دیا۔ آخر دوسری زبانوں نے اردو ادب پر اپنا پرتو ڈالا۔ یہاں کی سیاسی جدوجہد نے بھی اردو ادب کو کافی متاثر کیا۔ چنانچہ اب وقتی ضروریات سے ہم آہنگ سیاسی ادب پیدا ہو رہا ہے اور یہ مستقل افادی حیثیت رکھتا ہے۔ "الہلال" اور "نگار" نے بڑی حد تک عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ پڑھنے والوں کو کچھ عادت سی ہو گئی کہ نظم و افسانہ کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی سیاسی جدوجہد سے بھی واقف ہوں

۷۸

اس باب میں مکتبۂ جامعہ دہلی کی کوششیں بھی کم اہم نہیں۔ مکتبہ نے سیاسیات کی مبادیات و تاریخ کے متعلق اس وقت تک متعدد سیاسی کتابیں شائع کی ہیں حال ہی میں اسی قسم کی کتابوں کا ایک سیٹ چھاپا ہے جو لڑائی کی جغرافیائی و سیاسی حیثیت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اس سلسلے کی چار کتابوں بحر الکاہل کی سیاست اور بین الاقوامیت، ممالک اسلامیہ کی سیاسیات اور نازیت پیش نظر ہیں اس وقت میں صرف "بحر الکاہل کی سیاست" پر اظہار رائے کر سکوں گا۔

بحر الکاہل کی سیاست ——— محوریوں اور اتحادیوں کی موجودہ جنگ میں بحر الکاہل (پیسفک) کی ہستی ایک نئے ہی انجام و آغاز کی کنجی ہے۔ پُرسکون پانی کی یہ وسیع دنیا کرۂ ارض کے کروڑوں انسانوں کے اقتصادی قومی اور ملکی مسئلوں کا مجموعہ ہے۔ اس سمندر کی اہمیت دنیا کے باقی سمندروں کے مقابلے میں دوسرے درجہ پر ہے بحر الکاہل کی موجوں نے مغرب کی ہوس ملک ستانی اور سینکڑوں تاجرانہ آرزوؤں کے قافلے کو اپنے سینے سے گذارا ہے۔ جاپان کی بیداری کے بعد بحر الکاہل کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جاپان نے مغربی اثرات سے آزاد کر کے ایشیا کو خود اپنے اثر میں لینے کا جو خواب دیکھا ہے وہ شرمندۂ تعبیر ہوگا یا نہیں، اس سے بحث نہیں لیکن بحر الکاہل کی موجوں میں اس وقت تک طوفان اٹھتا رہے گا جب تک ایشیائی اقوام کو اقتصادی اور سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔

یہ چھوٹی سی کتاب بحر الکاہل کی سیاسیات پر جامع ترین کتاب ہے جغرافیائی حالات، ساحلی ممالک، بحر الکاہل کے جزیرے، خود جنگی اہمیت اور بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس کا تقابل ان تمام جغرافیائی حقیقتوں کو روشن کرتا ہے جو اس سمندر سے تعلق رکھتی ہیں۔

بحر الکاہل کی سیاسی اہمیت کا رشتہ دنیا کے مستقبل سے نہایت گہرا ہے، دنیا کی تمام تر تجارت کا رخ بھی بحر الکاہل ہی کی طرف ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ بحر الکاہل دنیا کی تجارت کا مرکز ہوگا۔ اس چھوٹی سی کتاب میں ان تمام سیاسی و اقتصادی حالات سے بحث کی گئی ہے جو بحر الکاہل کی اقتصادی اہمیت کو بڑھاتے ہیں جس قدر موجودہ سیاسی کشمکش ہے اس کے پس منظر میں بھی بڑھتی ہوئی اقتصادیات کارفرما ہیں جو بحر الکاہل کے ذریعہ ہونے والی تجارت کو دنیا میں ممتاز کر رہی ہیں۔

"چین اور دور حاضر" کے عنوان سے ۱۸۹۶ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک کے وہ تمام سیاسی انقلابات اور سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے جس کی آماجگاہ چین کی سرزمین اب تک بنی رہی۔ ان انقلابات کے پیچھے جاپان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یورپی طاقتوں کے سیاسی و تجارتی مفادات کام کر رہے تھے۔ ٹیلپنگ کی بغاوت، باکسر کی جنگ، چین اور جنگ عظیم، چین کا دوسرا انقلاب، چین اور بیرونی ممالک اور اس کے بعد موجودہ دور تک کی تمام سیاسی جدوجہد آئینہ بن کر سامنے آجاتی ہے۔ چین اور جاپان کی سیاسیات کا ہر پہلو بھی اس کے اوراق میں روشن ہو جاتا ہے۔ جاپان مشرق میں اپنی طاقت کے قیام و استیلا کے لئے مغرب سے لڑ رہا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ "ایشیا ایشیا والوں کے لئے ہے" بظاہر یہ نعرہ ایک طاقتور مشرقی تحریک کا اجتماعی نشان معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح مغربی طاقتیں اور امریکہ طلب منفعت کے جذبے سے مغلوب ہیں جاپان بھی ایشیائی شکارگاہ پر بلاشرکت غیرے اپنا قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جاپان کا مفاد بحر الکاہل اور اس کے ممالک سے وابستہ ہے اس سمندر کی لہروں پر وہ اتنے ہی ہاتھ پیر مار رہا ہے جتنے دوسرے پیراک اس وقت اپنی غواصی کے کارنامے دکھلاتے رہے۔

لیکن مغربی امپیریلزم اور جاپانی امپیریلزم میں مقاصد اور نظام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ اس کتاب میں نہایت وضاحت کے ساتھ ان مسائل اور حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

برطانیہ اور بحرالکاہل کی سیاست ایک مکمل باب ہے جس میں برطانوی مفاد کنیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی سیاسیات کے متعلق لکھا گیا ہے اسی طرح ایک باب ریاست ہائے متحدہ اور بحرالکاہل کے عنوان سے ہے جس میں امریکہ کے مفاد، اصول غیر جانب داری .... جزائر فلپائن اور جزائر ہوائی کے متعلق واضح معلومات درج ہیں۔ تیسرا باب روس اور بحر الکاہل کی سیاست کے متعلق ہے۔ ان مخصوص ابواب کے بعد یہ ابواب ہیں :-

(۱) بحرالکاہل میں ہالینڈ کے مقبوضات اور اس کی سیاسی پالیسی۔
(۲) جاپان اور برطانیہ و ریاست ہائے متحدہ۔
(۳) بحرالکاہل کے ممالک میں نقل وطن اور نسلی امتیاز۔
(۴) بحرالکاہل میں ہوائی راستے۔

ان ابواب میں بحرالکاہل کے متعلق سیاسی معلومات کا اک سمندر بند ہے۔ آخر میں چند نقشے ہیں جو اپنی مباحث کے متعلق ہیں اور مسائل سمجھنے میں بڑی امداد کرتے ہیں۔

میرے خیال میں جاپان، امریکہ اور برطانیہ کی جنگ کا پس منظر سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

(باقی) ساغر

مجبورِ معذرت

موجودہ خلفشار میں زندگی کے اہم ترین معمولات الٹ پلٹ ہو رہے ہیں۔ ایشیا کی اشاعت کا فریضہ تو عام حالات میں، جمود اور پریشانی سے آزاد نہیں رہ سکا۔ آجکل کاغذ کی گرانی و کمیابی اور دوسری پریشانیوں کا حملہ اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ ۶ ماہ کے لئے حکومت کی طرف سے کاغذ کی سپلائی کا انتظام ہوا تھا وہ میعاد ختم ہوئی۔ اب نئے انتظامات پیش نظر ہیں کچھ اس لئے کچھ دوسری وجوہ سے اس نمبر میں تاخیر واقع ہوئی۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے

منیجر

مفرح یاقوتی محمد شاہی

جواہرات گرانمایہ ورق طلاء ونقرہ مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ طب کیمیاوی کا اعجاز نما کرشمہ بوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی بے ضرر شہنشاہ

خادم خلق اللہ

محمد عبدالمغنی انصاری مع برادران نبیرہ لقمان الملک علامہ حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی منیجر انصاری دواخانہ زیر نگرانی حکیم محمد عبدالغنی انصاری خسرو شاہی

(واقع شاہ گنج حیدرآباد دکن)

یاقوتی محمد شاہی

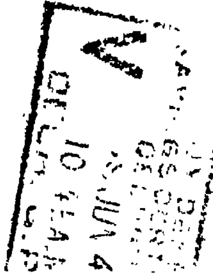
معروف ومشہور مغل شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمال کی دوا جس کا نسخہ قطعی راز میں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل ہمارے خاندان عالیہ انصاریہ میں (جو [illegible] میں علاوہ منصب طبابت شہنشاہی کے عہدۂ جلیلہ ملکی ہفت ہزاری تک پر متقررہ ہو چکا ہے) چلا آرہا ہے یہ نسخہ صرف سلاطین ملک وشاہ وامراء کیلئے مخصوص طور سے بنایا جاتا رہا۔ اگر اس کو ہر اعتبار سے علاوہ قطعی بے ضرر ہونیکے سرتاج وشہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار مشاہدات کی بے لاگ کسوٹی پر ہرگز بیجا نہ ہوگا۔ یوں تو یاقوتی اور مفرحات سے طب یونانی کی قرابادینیں [illegible] اور بعض تجارتی دواخانے مفرحات میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کر کے بدنام کنندہ نکو نامے چند کے مصداق ہو رہے ہیں مگر یہ نسخہ [illegible] یاقوتی جسکو ایک جماعت اطباء وکملاء وفضلاء عصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا۔ اسکے اجزاء ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گرانمایہ کا مجموعہ ہے اس کو مجدد طب علامہ [illegible] نابینا صاحب نے اپنے جدید طب کیمیاوی کے طریقہ سے اب اس کو مکمل فرمادیا ہے کہ یہ مفرح بنہایت معتدل ہوگئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں [illegible] طلاء نقرہ۔ مروارید ناسفتہ۔ لعل بدخشانی۔ یاقوت رومانی ویاقوت اصفر وکبود زمرد تابناک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول لطیف بنا کر اس [illegible] اسی وجہ سے قلب دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو صد درجہ تقویت پہنچاتی ہے اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو ہر صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے ہیں کہ [illegible] اور باہ بھی بڑھے جسم و روح اور اعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اس وجہ تفریح اور ایسی ہیجان فرحت کمال کا مال پیدا کرتی ہے [illegible] شائد۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے عجیب وغریب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب وغریب صفت ہے کہ یہ مثل جوہر الجواہر یا جواہر مہرہ کے [illegible] منشیات کو ترک کرادیتی ہے۔ اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شرابی شوقینے شراب ترک کردی افیونیوں نے افیون ترک کردیا اور دوسرے منشیات کے استعمال کرنیوالوں نے [illegible] حرزجان بنایا۔ یہ مفرح یاقوتی جسم کی تمام ارواح کو کمال درجہ تقویت بخشتی نشاط پیدا کرتی معدہ افعال کو جزو بدن بناتی ہے وہ لوگ جو گرم مقویات کھا کر پریشان ہو چکے ہیں ایسے جگر [illegible] ہوں مگر ان کے لئے یہ مفرح یاقوتی واقعی آب حیات سے کم نہیں ہے۔ بلا کسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کیلئے بہترین مقوی ہے بہرحال یاقوتی ہر لحاظ سے بہ صفت موصوف [illegible] صرف ایک صفت اس میں نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ صد درجہ بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اور روح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی ایک شاہی [illegible] جو حضرات [illegible] ہمیشہ کیلئے اسکے دلدادہ وشیفتہ ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گویا مجموعہ ادویہ ہے اس لئے اسکی مقدار [illegible] [illegible] سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مفرح اور ہر قسم کی [illegible] منشیات سے قطعی پاک ہے۔

[illegible] یاقوتی [illegible]

[illegible] حکیم نابینا صاحب [illegible]

ia Meerut

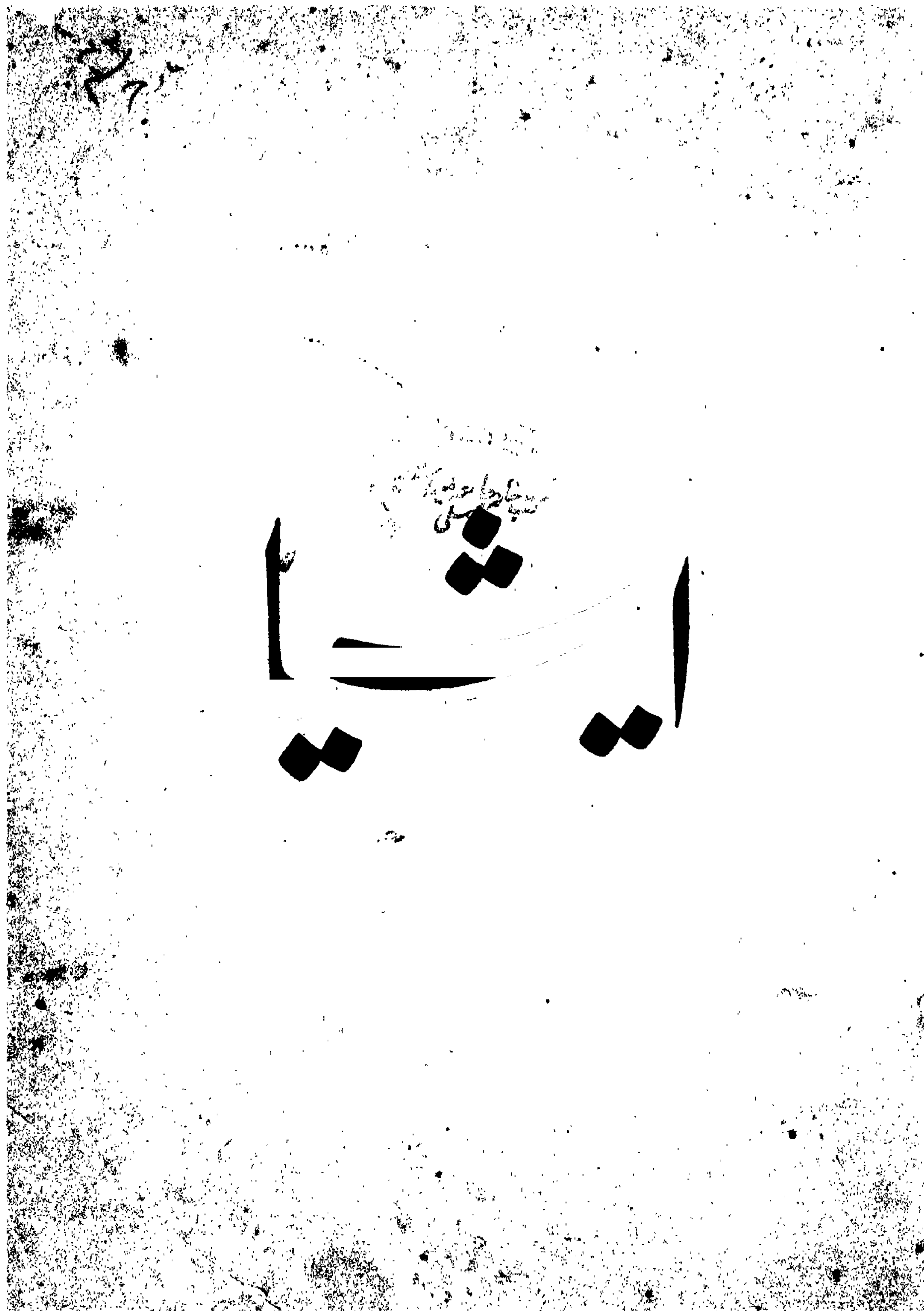
Registered No. A. 656





Published by

The Adbi Markaz Sagher Press, (India)
MEERUT.


ایشیا

مفرح یاقوتی محمد شاہی

جواہرات گرانمایہ اورق طلا و نقرہ مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ طب کیمیاوی کا اعجاز نما کرشمہ۔ بوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی بے ضرر شہنشاہی مفرح

خادم خلق اللہ

محمد عبد المغنی انصاری مع برادران نبیرۂ لقمان الملک علامہ حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی منیجر انصاری دواخانہ زیر نگرانی حکیم محمد عبد الغنی انصاری خسر و شاہ نظامی

(واقع شاہ گنج حیدرآباد دکن)

یاقوتی محمد شاہی

معروف و مشہور مغل شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمال دوا جس کا نسخہ قطعی راز میں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے خاندان عالیہ انصاریہ میں زیر عہد سلطنت مغلیہ میں علاوہ منصب طبابت شہنشاہی کے عہدۂ جلیلہ ملکی ہفت ہزاری تک پر مفتخر رہ چکا ہے) چلا آرہا ہے یہ نسخہ صرف والیان ملک رؤسا و امراء کیلئے مخصوص طور سے بنایا جاتا رہا۔ اگر اسکو ہر اعتبار سے علاوہ قطعی بے ضرر ہونیکے سرتاج و شہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار مشاہدات کی بے لاگ کسوٹی پر ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ یوں تو یاقوتی اور مفرحات سے طب یونانی کی قرابادینیں پٹی پڑی ہیں اور بعض تجارتی دواخانے مفرحات میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کرکے بدنام کنندہ نکونامے چند کے مصداق ہو رہے ہیں۔ مگر یہ شہنشاہ پسند مفرح یاقوتی جسکو ایک جماعت اطباء و کملاء و فضلاء عصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا۔ اس کے اجزاء ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گراں مایہ کا مجموعہ ہیں اسکو مجدد طب علامہ لقمان الملک حکیم نابینا صاحب نے اپنے جدید طب کیمیاوی کے طریقہ سے اب اسدرجہ مکمل فرمادیا ہے کہ یہ مفرح بغایت معتدل ہوگئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں کرتی۔ ورق طلا و نقرہ مروارید ناسفتہ لعل بدخشانی۔ یاقوت رمانی و یاقوت اصفر و کبود زمرد تامناک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول اور بعید الطف بناکر اسمیں شامل کیا جاتا ہے اسی وجہ سے قلب و دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو حد درجہ تقویت پہنچاتی ہے اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو بہمہ صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے ہیں کہ تقویت قواء و باہ بھی ہو جسم و روح اور اعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اسدرجہ تفریح اور ایسی ہیجان و فرحت کمال کا حال پیدا کرتی ہے کہ بالکل شائد۔ دماغی کام کرنیوالوں کیلئے عجیب و غریب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب و غریب صفت ہے کہ یہ مثل جوہر الجواہر یا جواہر مہرہ کے پرانی سے پرانی عادت منشیات کو ترک کرا دیتی ہے۔ اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شراب نوشوں نے شراب ترک کردی افیونیوں نے افیون کو ترک کردیا۔ اور دوسرے منشیات کے استعمال کرنیوالوں نے اس یاقوتی کو دھتا بتایا۔ یہ مفرح یاقوتی جسم کی تمام ارواح کو کمال درجہ تقویت بخشتی، نشاط پیدا کرتی عمدہ اغذیہ کو جزو بدن بناتی ہے وہ لوگ جو گرم مقویات کھاکر پریشان ہوتے ہیں اور وہ جن کو سرد دوا موافق آتی ہو دگرم ان کے لئے یہ مفرح یاقوتی واقعی آب حیات سے کم نہیں ہے۔ بلا کسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کیلئے بہترین مقوی ہے بہرحال یہ یاقوتی ہر اعتبار سے بہمہ صفت موصوف ہے۔ مگر صرف ایک صفت اسمیں نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ صد درجہ بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اور روح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی ایک شاہی دوا ہے جو حضرات نمونتاً بھی اسکی چند خوراکیں نوش جان فرمالیتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے اسکے والہ و شیفتہ ہوجاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گویا روح ادویہ ہے اسلئے اسکی مقدار خوراک حد درجہ قلیل ہے جو چاہے اس کا تجربہ یعنی عمل انالائز کرکے بہت اچھی طرح جانچ سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مفرد ادویہ ہر قسم کی سمیات مکا سات کشتہ جات سے قطعی پاک ہے۔

مقدار خوراک۔ ۲ رتی سے ۸ رتی تک ہے۔ ۸ رتی سے زیادہ شاذ ہی کوئی قوی آدمی برداشت کرسکے۔ قیمت فی شیشی جسمیں ۶ ماشہ یہ شہنشاہی یاقوتی ہے (عہ) پانچ روپیہ

بمنفعہ کھاسیوعہ گرم پانی قیمت مع فیس رجسٹری ملاکر (المعلن :- عبد الغنی انصاری منیجر انصاری دواخانہ نبیرۂ علامہ لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی

(سنہ ۱۹۳۰ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ



ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

حکومت صوبۂ بہار اور حکومت صوبہ سی، پی (برار)

زیر سرپرستی:۔ ڈاکٹر سیّد محمود

اسسٹنٹ اڈیٹر
محمد تقی

اڈیٹر
ساغر

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی پرچہ ۸ر آٹھ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۰ فیصدی کمیشن

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

فہرست مضامین ایشیا مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	فہرست		۶
۲	رات اندھیری طوفاں سرپا	ساغر	۷
	نئی صبح (ادبیات وسیاسیات)		
۳	شعلے کے شرارے	ڈاکٹر اختر امام (بنگالی)	۱۱
۴	جرمن کلچر اور نئی تنظیم	قاضی عبدالغفار	۱۵
۵	ہندو مسلم تنازعہ	پنڈت سندر لال	۱۹
۶	سنگاپور	قاضی عبدالغفار	۲۱
۷	آج کا انسان اور ماحول کی جدوجہد	مرزا ارشاد بیگ	۲۳
۸	ادب اور اس کے نئے تقاضے	سید محمد تقی امروہوی	۲۵
	دکھ سکھ (افسانے اور ڈرامے)		
۹	بچے کی ذہنیت اور کہانی	حمیدہ بیگم	۳۳
۱۰	بازگشت	طاہرہ دیوی شیرازی	۳۶
۱۱	محفلِ رقص کی تصویر	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	۴۰
	نوائے وقت	منظور حسین شور ایم۔ اے	۴۴
۱۲	آرٹسٹ کی زندگی اور موت	فضل قریشی دہلوی	۴۵
۱۳	ہماری حقیقت	ڈاکٹر زاہر قدوائی	۵۰

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
	نیا راگ (نظم وغزل)		
۱۴	مطلوب	ع جہاں بیگم آوا (بدایونی)	۵۵
۱۵	دور ہے تیری منزل	شارق میرٹھی	۵۶
۱۶	تیرا تصور	مظفر حسین شمیم	۵۷
۱۷	منور ظلمتیں	احمد ندیم قاسمی	۵۸
۱۸	طلوع	ظفر تاباں	۶۰
۱۹	رکے رکے سے آنسو	فراق گورکھپوری ایم اے	۶۱
۲۰	نئے ارادے	شوکت تھانوی	۶۲
۲۱	چار تصویریں	سراج الدین ظفر بی اے	۶۳
۲۲	ہوش و مستی	شاہد صدیقی	۶۴
۲۳	جنگل	محشر بدایونی	۶۵
۲۴	اتنی فرصت کہاں	ساغر	۶۷
۲۵	روحِ ایثار کا ترانہ	ساغر	۶۹
	کسوٹی (تنقید وتبصرہ)		
۲۶	زندہ چین	ساغر	۷۳
۲۷	مورخ کے افسانے	"	۷۶
۲۸	نشترہ	"	۷۸
۲۹	نگارش جاری	"	۷۸
۳۰	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن	"	۷۹

ایشیا

جلد ۷ — مارچ سنہ ۱۹۴۲ء — نمبر ۲

رات اندھیری طوفاں سر پر!

محصور اور مظلوم دنیا کے لئے، قیامت سے کم نہیں، قیامت بربادیٔ عالم کی اک لفظی تعبیر تھی مگر یہ وقت گرجتی اور دہکتی ہوئی حقیقت ہے۔ یہ حقیقت قوموں کی ناقابلِ معافی فروگذاشتوں، قیاسی تقاضوں اور قدرت کے معینہ جابر نظام کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ قیامت کی حقیقت! جس سے ہمارے ٹکرانے یا نہ ٹکرانے کا سوال نہیں، وہ خود ہم سے ٹکرانے کیلئے پوری خوفناکیوں کیساتھ بڑھی چلی آتی ہے۔

کوئی خود مختار اور آزادی پسند ہندوستانی، ملک کو غلامی کا نیا چولا بدلوانے کی تائید میں نہیں۔ ہر شخص کی آرزو ہے کہ دنیا میں جمہوریت اور انفرادی آزادی برقرار رہے، مگر اس کے لئے موجودہ نظام اور ذہن کی کامل تبدیلی کی ضرورت ہے اس تبدیلی کے بعد ہندوستان ترقی اور حرکت کے اس نقطۂ عروج پر نظر آسکتا ہے جہاں سے آنیوالی قیامت سے ٹکرا کر کم از کم مٹ جانے کی حسرت ہی سلیقے سے پوری ہو سکے۔

ہم تاریخ کے اہم ترین منازل سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ اس تاریخ کے منفی پہلو سے مجھے غرض نہیں، مگر شاید تدبر اور عاقبت اندیشی کی سچی ہوئی صلاحیت کچھ معجزہ دکھائے۔ شاید اتنا کر سوچتے ہوئے دنیا کے سیاسی حالات نے برطانیہ کی قلب ماہیت کر دی ہو، شاید [illegible] سیاسی پیامبر کرپس ہندوستان کے دل کو جیت لے، شاید انگریز قوم اپنی روایات کے خلاف کوئی صالح اور فیصلہ کن قدم اٹھائے۔ اگر ایسا ہوا تو دنیا کے مستقبل کا خواب ہندوستان اور صرف ہندوستان کھولے گا!

کامل اور واضح نتیجے قبل از وقت نکالنا ممکن نہیں، ہندوستان جو سینکڑوں غلیظ اور ناقص، لاکھوں غلط و منافق عناصر کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے اسوقت تک ترقی و آزادی کے کئی موقع ضائع کر چکا ہے، اگر ہندوستانیوں اور خود حکومت نے پرانی راہوں ہی پر چل کر منزل پر پہونچنا چاہا تو میرے خیال میں سفر شروع کرنے ہی کی ضرورت نہیں۔

پچھلے سیاسی گناہوں کے بطن سے پھوٹنے والی آتشیں قیامت کا مقابلہ کرنے کیلئے حکومت کو اپنے مفاد کی خاطر تبدیل ہیئت کر لینا چاہیے۔ اور ہندوستانیوں کو اگر ملک کی آزادی، انفرادی خود مختاریت، تقریر و تحریر کا اختیار۔ یہی نہیں تمام عالم انسانیت کا امن، کمزوروں اور غریبوں کی بقا منظور ہے تو ایک مرکز پر متحد ہو جانا لازمی ہے!

یہ مرکز کیا ہو سکتا ہے؟؟ کل ہندوستان کی نمائندہ ترقی یافتہ قومی جماعت کا عارضی ڈھانچہ، اور اس کو جنگ کے بعد مستقل آزاد قومی حکومت کے نام پر تسلیم کر لینا متحدہ مطالبہ!

یہ ڈھانچہ کیوں کر بنے؟؟ اس ڈھانچہ کو ہندوستان کی مختلف سیاسی پارٹیاں، ہندوستان کی آزادی اور جمہوریت کے نام پر تیار کر سکتی ہیں، اگر [illegible] ہندوستانی ضد ہیں، اور لیڈرشپ کی دلی خواہشات کے [illegible]

نزدیک آزادی سے زیادہ مقدم فرض سیاسی لیڈروں کا زوال قرار دیا جانا چاہئے۔

اور اگر برطانیہ کی پیشکش اتنی ترقی یافتہ ہی نہ ہو کہ اس کی طرف توجہ کی جا سکے۔ تو پھر سوال ہی کیا ہے۔ یہ طلسم خیال خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی کی یہ خواہش نہیں کہ یہ مرحلہ ناکام ہو مگر تاریخ اور دوڑتے ہوئے ہنامر اس مرحلہ کا بھی انتظار نہیں کرینگے۔ اس کے بعد ناکامی کی صورت میں ملک کی ہر پارٹی کو تحفظ کے ذرائع پر غور کرنا لابدی ہے۔ حکومت کو بہت کام ہے، اس لئے ہر آنے والی مصیبت سے بچاؤ یا مقابلہ کی ذاتی قوت و حوصلہ ہم میں خود ہونا چاہئے۔ اس حوصلہ کو اک مرکزی قوت دینے کے لئے، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، تمام قوموں کو مذہبی اور سیاسی اختلافات مٹا کر ایک دوسرے کی امداد و ہمدردی کیلئے کوئی نظام بنانا چاہیئے۔ خواہ حکومت سے مل کر، خواہ علیحدہ، بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ ہم موقع کی نزاکت کو محسوس کریں؛ طوفان سر پر ہے، اور اندھیری رات گہری ہوتی چلی جا رہی ہے۔

گرجتے ہوئے طوفان میں!

گرجتے ہوئے طوفان میں ادارۂ ایشیا جس رفتار سے کام کو جاری رکھے ہوئے ہے وہ اس کے لئے اعجاز ہے، یہ رفتار شاید بہت ہی دھیمی ہو جاتی اگر اس ادارہ کو قلمی امداد پہونچانے والے، اپنے اعلیٰ ثبات دماغی اور صادق ترین اخلاص کا ثبوت نہ دیتے۔ مجھے یہ عام رائے معلوم کر کے اطمینان ہے کہ مکاتیب نمبر کی دو جلدوں کے بعد جو معیار ادب ایشیا نے پیش کیا ہے، وہ اس کے گذشتہ معیار سے بہت بلند ہے۔ اور اس تمام پرواز میں رجعت کی سمتیں قطعی مفقود ہیں۔ کم از کم یہ وہ بلند مرکز ہے جہاں سے ہم ترقی کی مقصود چوٹی کی طرف آسانی سے اُڑ سکتے ہیں؛

فروری سے ایشیا کے لکھنے والوں میں کچھ نئے رفقاء کا اضافہ ہوا ہے۔ طاہرہ دیوی، ہاجرہ بیگم، پنڈت سندرلال، قاضی عبدالغفار، فضل قریشی دہلوی، شارق میرٹھی، محشر بدایونی، ڈاکٹر اختر امام (بنگال)، اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈی، لٹ (پیرس)،

اختر حسین رائے پوری، ایشیا کے قدیم دوست اور ہمدرد پرستار ہیں۔ اُن کی ذہانت اور اخلاص نے ایشیا کو ہمیشہ نوازا، مگر جب تک یہ سورج مغرب کی گود میں رہا ایشیا کو بھلاتے رہا۔ اور جب مشرق میں اپنی نئی تابانیوں کے ساتھ طلوع ہوا، ایشیا پر اُس نے وہ خاص پر تو ڈالا جو اُس کے اخلاص کی روشنی کی مضبوط گواہی ہے، ہم سب ایک مقصد کے لئے جیتے ہیں، وہ مقصد ہے۔ انسانی ذہن کی ترقی و پاکیزگی، مسرت اور بلندی؛ اسی مقصد میں ڈاکٹر اختر نے ایشیا کے حلقہ کو وسیع کر کے دل کی جو وسعت دکھائی، وہ اُن کے اعلیٰ ادیب ہی نہیں، بلند تر انسان ہونے کی دلیل ہے؛ اور اچھا انسان ہونا ادیب ہونے سے زیادہ ضروری ہے۔ گرجتے ہوئے طوفان میں، ان ساتھیوں کی رفاقت ہمت افزائی نہیں، حیرت ناک ہے۔ مگر شاید یہ صحیح ہے، اعلیٰ درجہ کی مصیبت اعلیٰ کارناموں کا موجب ہوتی ہے۔

ساغر

نئی صبح

ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

بابتہ مارچ ۱۹۴۲ء



سعید احمد رشید میرٹھہ

ڈاکٹر اختر امام (بنگال)

شلر کے شرارے

(یہ مختصر سا مقالہ ۱۲ ستمبر [illegible] ء کو انجمن ادب بنگالہ میں پڑھا گیا)

جس وقت المانیا کی حیات اجتماعی میں شعریت اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جلوہ فرما تھی۔ یہاں کی سرزمین سے ایک شاعر پیدا ہوا۔ وہ شاعر جس کی بے وقت موت خود ایک یاس آمیز شعر ہے، میری مراد فریڈرش شلر سے ہے جسکے اچھوتے تخیل، حسن بیان اور جوش محبت نے دنیائے ادب میں ایک ہلچل ڈالدی یہ ایک حقیقت ہے بیحد شیریں اور مستحکم کہ دنیا کی تمام امیر زبانوں میں ایسے شاعر بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں جنھوں نے خود اپنے جذبات سے مجبور ہو کر شاعری کی یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں ایک عالمگیر محبت اور کائناتی تخاطب ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس بے پناہ شاعر کے خیالات سے اُردو دنیا بہت کم واقف ہے۔ وہ تو خدا اقبال کا بھلا کرے کہ اُس نے گوئٹے کے مشرقی دیوان ....

کے جواب میں پیام مشرق، لکھ کر المانوی ادب سے ہم لوگوں کو روشناس کرایا۔ ورنہ ہم ابتک ان سدا بہار پھولوں سے ناواقف ہی رہتے۔ جہاں تک شلر کا تعلق ہے اور شلر ہی پر کیا موقوف ہے۔ انگریزی زبان کے علاوہ مغربی زبانوں کے شہپارے اب تک ہماری زبان میں منتقل نہیں ہو سکے۔ اس بے اعتنائی کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مغربی شاعری زنانہ بھونڈی اور بھیانک تصویروں سے بھرا پڑا ہے۔ اور ہمارے نقطۂ نگاہ سے ان میں کوئی کشش نہیں یا یہ کہ ہم اُردو بولنے والے اس سے کامل واقفیت کی بنا پر اس کا بار بار تذکرہ بیکار سمجھتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو اب وقت آگیا ہے کہ ہم تراجم کی اہمیت کو سمجھیں اور اس طرح اپنے ادب کو غیر اُردو افکار سے متعارف کریں۔

"نہ بہ تازہ زیبا [illegible]"

فریڈرش شلر ۱۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو دریائے نیکر کے کنارے چھوٹے سے خوبصورت شہر مارباخ میں پیدا ہوا۔ چونکہ اس کا باپ پوتان کا ز... ایک فوجی ڈاکٹر تھا اس لئے کسی ایک جگہ جم کر اسکا تعلیمی سلسلہ شروع نہیں ہو سکا۔ اس کا سیرت نگار کہتا ہے کہ لورخ (Lorch) اور لڈوِش بورش (Ludwigsburg) میں اس کے والدین کافی عرصہ تک رہ گئے۔ اس لئے صحیح معنوں میں اس کے خیالات کی نشو و نما انہی دو قصبوں میں پڑی۔ کچھ دنوں بعد ورتم بورش .... کے نواب صاحب کے حکم کے بموجب اس کو حربی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہ فطرت پرست نوجوان فوجی پابندیوں سے اُکتا سا گیا۔ اور فن حرب سے زیادہ شاعری کا دلدادہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۷۷۶ء میں جبکہ شلر کی عمر سترہ سال کی تھی اس نے پہلی بار غنائی شعر کہے اور اس کے بعد اس مدرسہ کو چھوڑ کر آزاد انہ پھرا کیا۔ ۱۷۸۱ء میں جبکہ نوجوان شاعر کچھ کم بائیس برس کا تھا، اس نے اپنا پہلا ناٹک موسوم بہ "رہزن" ملک کے سامنے پیش کیا۔ گوئٹے کے ورتھر کی طرح "رہزن" میں شلر نے جس باغی کا ذکر کیا ہے۔ غالباً خود شاعر اپنی صورت آئینۂ تخیل میں دیکھ رہا تھا۔ اسی زمانہ میں مانہائم (Mannheim) میں ناٹک کمپنی کے ڈائرکٹر دالبرگ (Dalberg) نے شلر سے درخواست کی کہ کچھ ترمیم کے بعد "رہزن" کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی جائے۔ شلر راضی ہو گیا۔ "رہزن" کھیلا گیا تماشائیوں نے طوفانی استقبال کیا۔ اس طرح المانیا میں پہلی بار شلر کے شعلے بھڑک اٹھے۔

اس ڈرامے میں شلر کی ابتدائی خامیاں اور مستقبل کی ترقیاں صاف نظر آتی ہیں جس وقت شاعر نے یہ ناٹک لکھا تو اسوقت اُس نے صحیح معنوں میں انسانی سیرت کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ مردوں کے کردار کہیں کہیں تو اپنے اصلی روپ میں جھلک بھی پڑتے ہیں۔ مگر جہاں تک نسوانی تحلیل نفسی کا تعلق ہے۔ شاعر کو ایک سطحی علم تھا۔ دنیا کے بسنے والوں کو اُس نے کتابوں کے ذریعہ [illegible]

دیکھا تھا۔ خود اپنے مشاہدات کا سرے سے فقدان ہے۔ باغیانہ فطرت کے تحت اس کے ناٹکی مکالموں میں ضرورت سے زیادہ پُرزور انداز بیان ہے۔ جیسے دو دیوگرج رہے ہوں۔ حالانکہ شاعر کا مقصد تو یہ تھا کہ گفتار میں جوش اور گرمی ہو۔ اس کے علاوہ افسانہ کے اہم واقعات میں باہمی ربط کی کمی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری کہانی گونگے کا خواب بن جاتی ہے۔ یہ تو تھا تصویر کا ایک رُخ۔ دوسری جانب اس ڈرامے میں ایک فطری تمثیل نگاری کی پوری شان موجود ہے مثلاً ناٹکی فضائے بعید پیام اور دنیا کے تمام المیہ کی نمایاں خصوصیت یعنی خواہشات کا تصادم، حیرت، رحم اور خوف وغیرہ۔

۱۷۸۳ء کے لگ بھگ اُس نے دوسرا ڈرامہ "جینوا میں جینکو کی سازش" پیش کیا۔ یہ ڈرامہ کیا ہے ایک سماجی المیہ! جس میں ایک شریف النفس، بلند حوصلہ اور حریت پسند آدمی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ ایسا حریت پسند جو ملک کو ظالم حکمراں سے نجات دلائے۔ اس ناٹک پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ شاعر سماج کی بے جوڑ بندشوں کو توڑ کر اُن کے تار و پود بکھیر دینا چاہتا ہے۔ ابسن ( ) کی طرح اس باغیانہ فضا میں وہ کافی عرصہ تک سانس لیتا رہا۔

اس کے ناٹکوں کی تخلیق اسی طرح وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔ اس کے بعد اپریل ۱۷۸۵ء کا سکر تیز و تفہ شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ اس کے پاس دو غیر متعارف پرستاروں کے خطوط لائپزگ سے آئے۔ شلر ان دونوں کو جانتا بھی نہ تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ موسم بہار لائپزگ کے مضافات میں گذاریئے اور ہمیں میزبانی کا شرف عطا کیجئے۔ شلر حیران تھا کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ آخر یہ پرستار ہے کون؟ اس کو شاید پہلی بار صحیح احساس ہوا کہ اب وہ گھریلو نہیں بلکہ المانیا کی قومی ملکیت ہے۔ شلر نے دعوت نامہ قبول کر لیا اور اپریل کے اواخر میں لائپزگ روانہ ہو گیا۔ لائپزگ سے اس کے پرستار اسکو گولیز ( ) لے گئے اور وہاں ان دو ادب نوازوں نے اپنی اپنی محبوبوں سے تعارف کرا دیا۔ موسم بہار کی رنگینیاں، ہر طرف بالزم کراٹ، ہیل شلوسل، لالہ اور گلاب کے پھول، شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، سکون، شباب اور خوشبو نے اس جوشیلے شاعر کو موہ لیا۔ وہ اس فردوس بریں میں کھو سا گیا اور تمام ارضی مسرتوں سے لطف اندوز ہوا۔ یہ سفر ادبی اعتبار سے بہت قیمتی ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے "نغمۂ مسرت" لکھا۔

نغمۂ مسرت میں، بہار، خوشبو اور حسین جوانیاں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

جولائی ۱۷۸۷ء میں جب کہ نواب صاحب وائمر سے کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ شلر یہاں پہنچا۔ وہ اکثر یہ محسوس کرتا تھا کہ گوئٹے کے خیالات کا جو اساسی چشمہ بہہ رہا ہے اس کا مزہ اس سے زیادہ کسی نے نہیں لوٹا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ شلر کا بے پناہ ہمعصر گوئٹے اپنی بیتاب روح کو تسکین دینے کی خاطر اطالیہ چلا گیا تھا۔ وائمر میں صرف ہرڈر (Herder) اور ویلاند (Wieland) موجود تھے۔ ان دو ادیبوں نے شلر کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہرڈر اور ویلاند نے گوئٹے اور کانٹ کی طرح شاعر کے تصورِ حیات کو کافی متاثر کیا ہے۔ وائمر میں کچھ دنوں تک رہنے کے بعد شلر رُوڈول اشٹاٹ (Rudolstadt) چلا گیا۔ اور فون لینگفلڈ کے خاندان سے مراسم شروع ہو گئے۔

خود شاعر "روڈول اشٹاٹ" کے شریر کام دیوتا کا ذکر اشارتاً کر گیا ہے۔ اور غالباً یہیں اس کا محبت اور حسن پرست دل تیرِ الفت سے زخمی ہوا۔ لانگفیلڈ کی چھوٹی لڑکی حسن، صحت اور رومانی سطحِ نظر کا مجموعہ تھی، شلر نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ اس واقعہ کے بعد وہ بدستور مطالعہ میں مصروف رہا مگر اس کا رجحان تاریخ و فلسفہ کی طرف ہو گیا۔ تاریخی اور فلسفیانہ مقالے لکھتا رہا جو اس زمانہ کے گلدستوں میں شائع ہوئے اور آج تک سدا بہار ہیں۔ اس کے تاریخی اور فلسفیانہ مقالوں نے ملک الشعرا گوئٹے کو اس کی طرف متوجہ کیا اور شاعرِ اعظم کی سفارش سے شلر کو ینا (Jena) میں پروفیسری ملی۔

خارجی اثرات کا جہاں تک تعلق ہے، گئٹے، کانٹ اور روسو کے بلند پایہ خیالات نے اس کی شاعری پر کافی اثر ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی تحریک کا پرتو بھی موجود ہے۔ ریوکرٹ (Rückert) اور پرگشٹال (Purgstall) نے مشرقی شہپاروں سے مغرب کو روشناس کیا، اور یہ اثر گوئٹے کے کلام میں اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ خصوصاً مغرب کے مشرقی دیوان (West Östlicher Divan) میں، جیسی گوئٹے نے خواجہ حافظ کے رنگ میں ردیف و قوافی کو مدِنظر رکھتے ہوئے رباعیاں غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں۔

کائنات کے مطالعہ سے "جمالیات" کا صحیح تصور شاعر نے متعین
کر لیا۔ یہی وجہ ہے اس کے اخیر زمانے کے ناٹکوں میں جمالیات کے لئے ایک
مخصوص جگہ ہے۔ بہ حیثیت مجموعی جوش بیان اور فطری زندگی میں ایک
معصومانہ رنگ دوڑتا ہے۔ شاعر نے اپنے اشعار میں مرکزی خیالات کے
اردگرد جو فطرتی مناظر پیش کئے ہیں اس سے وہ ایک قسم کی صدائے بازگشت
کا کام لیتا ہے۔ جو شعر اور زمین شعر میں ہم آہنگی پیدا کر دیتی ہے۔ وہی ہم
آہنگی جو لیونارڈو ڈاونچی (Leonardo da Vinci) نے مونالزا
کی شبیہ اتارتے وقت مد نظر رکھی۔

۱۷۹۹ء سے شاعر مستقل طور پر وائمر میں رہنے لگا۔ یہ دور ہر اعتبار
سے اہم ہے کیونکہ یہیں گوئٹے سے استفادہ کا براہ راست موقع ملا۔ شاعر اپنی
تمام جودت طبع دکھانے اور المانوی ادب کو حیات نو بخشنے کے بعد یہیں
۹ مئی ۱۸۰۵ء میں اس دنیا سے چل بسا۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد اب میں اس کی مختلف نظموں کا ترجمہ
پیش کرتا ہوں۔ اہل نظر اس بات سے خوب واقف ہیں کہ ترجمہ ترجمہ ہی ہے۔
مجھ کو اس وقت کامیاب ترجمہ پر ایک المانوی ناقد کا یہ جملہ یاد آتا ہے۔
وہ کہتا ہے: "ترجمہ مشکل کام ہے۔ کامیاب ترجمہ ایسا ہے جیسے
ایک حسین دوشیزہ کے رخ پر باریک ترین نقاب کا بوسہ لے لیا جائے۔" یہی
حال ہر زبان کا حال ہے۔ فردوسی ہی کو لیجیے۔

یہ بالا یکے سرو شاداب بود   تو گوئی ہمہ تخت سہراب بود

یا امرالقیس کا یہ شعر

مکر مفر مقبل مدبر معاً   کجلمود صخر حطہ السیل من عل

اور غالب کے

چاک مت کر جیب بے ایام گل   کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

شاید ترجمہ سے لطافت کم ہو جائیں گے۔ اب ملاحظہ ہو شاعر کا بہاریہ گیت
کہتا ہے:۔

اے حسین دوشیزہ!
او فطرت کی خوشی، خوش آمدید!
تیرے [illegible] پھولوں کو دیکھ کر سبزہ زار خوش آمدید کہہ رہے
ہیں اے دوشیزہ [illegible]

حسینہ! تو کتنی من موہنی معلوم ہوتی ہے۔
اب تو ہم لوگ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے ہیں اور تیرا استقبال
کرتے ہیں۔
او بہار! اور اس تو! کبھی مجھ کو میری محبوبہ دلنواز کا بھی خیال آتا ہے
خدارا اسکا بھی دھیان رکھ!
میری پیاری معشوقہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔
اور وہ تو اب تک مجھ کو چاہتی ہے۔
بہار! اس میری محبوبہ کی زیبائش کیلئے چند کلیاں بھی پیش کرنا!
تجھ سے بس یہی التجا ہے۔
بہار تجھ سے دوبارہ التجا کرتا ہوں،
سچ بتا تو بیوفائی تو نہ کرے گی؟
اے حسین دوشیزہ!
او فطرت کی خوشی! خوش آمدید!

یہ نمونہ ہے اس کے ابتدائی کلام کا جس میں معنویت سے زیادہ نغمیت
جھلکتی ہے، ہاں ایک اعتبار سے اسکا مرتبہ بلند ہے وہ یہ کہ بہاریہ نغمے
کی پوری شان موجود ہے۔ دوسرے دور کی ایک نظم ہے "ملاقات"
اس میں کہتا ہے۔

"ہاں! تو پھر آج بہت دنوں بعد ہم لوگ رہائن کی دلکش سرزمین
میں ملے ہیں!
تو سن! اسی مناسبت سے نغمہ کے گلے کا ہار
شاداب اور معطر پھولوں سے تیار کرنا چاہیئے۔
لیکن کس مقدس ہستی کی شان میں ان گیتوں کا نذرانہ پیش کریں؟
ہاں سن بھی! خوشی کی تمنا میں خوب ناچیں اور گائیں!
یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ عبادت گاہوں کو پھولوں سے مزین کیا
ہے اور عیش و عشرت کا دیوتا انگوروں کو نچوڑ رہا ہے۔
پیاری! جس کا آتشکدہ بھڑک اٹھا ہو
اس کو آسمانی شراروں کی حاجت ہی کیا؟
جب دل میں محبت کی چنگاریاں سلگ رہی ہوں تو باہر سے
آتشیں کی ضرورت ہی کیا؟

اے کاش کہیں بادلوں میں چھپ کر، دیوتا پھول برسا دے۔

اور سُن! دنیا کے تمام حکمرانوں سے زیادہ طاقتور محبت بھری آنکھیں۔

زمین و آسمان میں فطرت کا رنگ دوڑ رہا ہے۔

یہ تمام دیوتا اسی سے اکتسابِ نور کرتے ہیں اور دنیا نے نئے جوڑے زیب تن کر لئے۔

جیسے آفتاب کی سنہری کرنوں میں کوئی ہفت رنگ قالین بن رہا ہو، یا رنگا رنگ پل برسے، ویرانہ میں کوئی دیوتا آسمان کی طرف اڑا جا رہا ہو۔

ہاں ایسی ہی برقی چمک کے ساتھ حسن جلوہ ریز ہوتا ہے۔

اور شباب پرور رات کہیں جا کر چھپ جاتی ہے۔

اس نظم میں راگ اور رنگ دونوں موجود ہیں۔ مسرّت کا صحت بخش تصوّر موجود ہے۔ اور اس کی بیتاب فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرے دور کی ایک نظم اب ملاحظہ ہو۔

جلوہ ریز خدا! غروب ہو جا

زمین اوس کی پیاسی ہے اور انسانوں کے ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ کرنوں کے شہسوار اپنے گھوڑوں کو دوڑائے لئے جا رہے ہیں۔ اس لئے اپنے محل میں آرام کر!

ذرا دیکھ تو خدا! سمندر کی بلوریں موجوں سے تجھے محبتانہ تبسم کے ساتھ کون چشمک زنی کر رہا ہے؟

کیا تیرا دل اُس درد سے آشنا ہے؟

کرنوں کے شہسوار اپنے گھوڑوں کو بھگاتے لئے جا رہے ہیں اور خدائے سیر تبسم ہے۔

لے وہ سردار لگام پھینک دیتا ہے۔ جس کو کام دیوتا تھام لیتا ہے۔

یہ شہسوار ٹھیر گئے اور برفانی موجوں سے پیاس بجھاتے ہیں۔ آسمان میں دبے پاؤں معطرات چلی آ رہی ہے اور اُس کے پیچھے شیریں محبت ہے۔

سکون اور محبت!

دوسری جگہ ایک دوشیزہ رنجِ فرقت سے بیتاب ہو کر کہتی ہے۔

الکسک کے پتے تیز ہوا میں سرسرا رہے ہیں اور بدلیاں سرکتی چلی آ رہی ہیں۔ اور ایک دوشیزہ دریا کنارے شاداب زمین پہ بیٹھی ہوئی ہے سامنے

بھری موجوں کا جوش شباب پہ ہے۔

یہ دوشیزہ، ایک آہِ سوز کے ساتھ اپنی مضطرب رینا آنکھوں سے رات کی بھیانک تاریکی کو تک رہی ہے۔

" آج دنیا سونی پڑی ہے اور میرا جی اداس ہے۔ ایسے میں یہ ہماری امیدوں کا دامن بھری کیا سکتی ہے۔

خدائے مقدس! اپنی تجلّی کو اٹھا لے۔

کیونکہ یہ تیری عنایتوں کا مزا لوٹ چکی۔

میں کافی زندہ رہی اور محبت بھی کی

آنسو ہیں کہ تیزی سے رواں ہیں

اور نالۂ فراق بھی جو مردوں کو جگا نہیں سکتے۔

اس المیہ میں ایک دوشیزہ کی درد بھری لے موجزن ہے۔

اب ایک اور نظم ملاحظہ ہو جس میں شاعر نے اپنی معشوقہ Emma کو بیتابانہ یاد کیا ہے۔

دور بہت دور کہر کے دھندلکے میں

میری محبتوں کے دن جا چھپے ہیں

اور اب صرف ایک جھلملاتے ہوئے تارے کو میری آنکھیں فرطِ شوق سے تک رہی ہیں۔

اندھی موت نے تجھ پر ایک طویل نیند طاری کر دی ہے اور تیری ذات سے میری تلخیاں وابستہ ہیں۔

ایما! آہ تو طوفانِ نور میں موجزن ہے

میری محبت اب کہاں؟

- ایما! کیا اس سے بھی شیریں تمنا اور ہو سکتی ہو کہ ہمارے گذرے ہوئے رومانی دن پلٹ آئیں۔ میری پیاری ایما! بیتے ہوئے دنوں نے جو گلہائے رنگا رنگ جمع کر رکھے ہیں۔ کیا یہ واقعی محبت کے پھول تھے؟

اور یہ ساری چنگاریاں جنہیں آسمانی سوز پوشیدہ تھا بجھ کر راکھ ہو گئیں!

شلر اور گوئٹے اٹھارویں صدی کے دو مایۂ ناز المانوی شعرا گذرے ہیں ان میں سب کچھ موجود ہے خصوصاً المانوی زاویۂ نگاہ ہے۔ یہ دونوں خود مضطرب روحوں کے لئے سامانِ تسکین بہم پہنچاتے ہیں جس طرح ہارون الرشید کا بغداد و شکستہ حال مسلمانوں کی دلی [illegible]

ایشیا پر [illegible]

[illegible]

قاضی عبدالغفار

جرمن کلچر اور نئی تنظیم

مکتبہ جامعہ [illegible] دہلی

خون اور فولاد کا دیوتا محبت اور رحم کی جگہ لیگا۔ ان چند لفظوں میں صدر روز ویلٹ نے تقریر کرتے ہوئے دنیا کی اس مستقبل کا ذکر کیا تھا جسکو پیدا کرنے کیلئے جرمن "کلچر" کی ترقی کے مختلف طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ لفظ "کلچر" لاطینی زبان سے لیا گیا ہے۔ اس کے اصلی معنی خیالات کی شائستگی اور تربیت کا ایک اعلیٰ مقام ہے جو کسی قوم کے اجتماعی اور انفرادی زندگی کو حاصل ہوجائے یہ تہذیب انسانی ذہنی اور دماغی تکمیل ہے۔ لیکن جدید جرمن اور نازیت کے بانیوں نے اس لفظ میں جو معنی پیدا کئے ہیں وہ ایک ایسی قوت کا عملی تخیل ہے جس کے تحت حیوانی قوت کی انتہائی شدت کیساتھ تہذیب کے تمام قدیم اخلاقی معیار کو برہم کرکے کمتر اور کمزور اقوام پر جرمن تسلط قائم کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس تسلط کی تکمیل کیلئے جرمن قوم کے افکار و عزائم کو انسانیت کے اس عہد قدیم سے ملا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو حیوانیت سے زیادہ قریب ہے۔ بقول ایک جرمن مفکر کے جرمن قومیت اُن اجنبی اثرات سے قطع تعلق کرتی جا رہی ہے جس کو یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایات نے اس کی اجتماعی زندگی میں داخل کر دیا تھا۔ اب وحشت انسانیت کے ارتقا کا (اسکو آپ ارتقائے معکوس بھی کہہ سکتے ہیں) ایک اعلیٰ ترین مظہر ہے اور اس کے اندر موجودہ تہذیب و تمدن سے ہزار ہا سال پہلے کی وہ تمام خصوصیات تازہ کیجا رہی ہیں جو صرف حیوانی قوت کو تفوق کا معیار بناتی تھیں۔ اسکی صرف ایک مثال میں آج آپکو سنانا چاہتا ہوں۔

عورت اور نازیت

جو لوگ مذاہب کے تعلیمات اور تہذیب انسانی کے عام اصولوں سے [illegible] واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی تنظیم میں عورت کا درجہ اور مقام کیا ہے۔ ماں بیوی اور بہن کی حیثیت سے تمام مذاہب اور تہذیبوں نے عورت کی ایک مخصوص حیثیت اور تمدن میں اس کا ایک خاص مقام مقرر کر دیا ہے اور متمدن اقوام کی زندگی میں اس کے جنسی فرائض کا ایک اخلاقی معیار بھی مقرر ہے۔ جس کے مطابق مرد اور عورت کے تعلقات کی تنظیم کی جاتی ہے۔ اُن جماعتوں میں بھی جو لامذہب ہیں زن و شو کے تعلقات کا کوئی نہ کوئی معیار مقرر ہے۔ عورت کا وجود جس طرح کہ مرد کا وجود اپنے بعض فطرتی فرائض کا پابند ہے اور ان میں سب سے بڑا فرض نسل انسانی کی ترقی ہے لیکن جرمن "کلچر" نے فطرت کے اس تقاضے کو اپنی ضرورتوں کا اس درجہ پابند کر لیا ہے کہ اب جرمن اور محوری ممالک میں عورت کا وجود تمام انسانی حقوق سے محروم ہو کر صرف ایک ایسی مشین کے مماثل ہو گیا ہے جس کا کام سوائے بچے پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ نازیوں کے ایک اخبار نے حال ہی میں کہا تھا کہ جرمنوں کو سب سے زیادہ "انسانی سامان جنگ" درکار ہے اور ایک جرمن یونیورسٹی کی پروفیسر نے فرمایا تھا کہ وہ لڑکی اور عورت جو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا نہ کرے اپنے ملک سے غداری کرتی ہے۔ اگر بچوں کی یہ مانگ نسل انسانی کی ترقی کیلئے ضروری سمجھی جاتی تو اس پر اعتراض کرنا نا روا ہوتا لیکن جرمن "کلچر" میدان جنگ میں توپوں کیلئے صرف ایندھن تیار کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر اصرار کرتا ہے اس کی نظر میں ہر نوجوان ایک ہیزم سوختنی ہے جو جنگ کے آتش خانوں کو گرم رکھنے کیلئے پیدا کیا جاتا ہے اور پالا جاتا ہے بقول ایک جرمن مصنف کے "ہر جرمن ماں کا ہر فرزند جو جرمن قوم کی زندگی میں میدان جنگ کا ایک سپاہی ہے۔ الفو [illegible]

کہتا ہے کہ "جرمن ..... میں ہر ایسی عورت جو بچہ پیدا نہ کرے — خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ — قومی دولت مشترکہ کا ایک ناکمل جزو سمجھی جائیگی" ظاہر ہے کہ جرمن "کلچر" کے اس نقطۂ نظر نے مناکحت اور مرد و عورت کے جنسی تعلقات کی اس اخلاقی حیثیت کو بالکل ختم کر دیا ہے جس کی بنا پر گھروں کی خاندانی زندگی منظم ہوا کرتی ہے۔ اب تو آرنسٹ برگمان مناکحت کی تمام پابندیوں سے قطع نظر کر کے صرف یہ حساب لگاتا ہے کہ:

"ہر ایک تندرست جرمن نوجوان کو کم از کم (۲۰) لڑکیوں سے بچے پیدا کرنے کے قابل ہونا چاہیئے"

۱۹۲۰ء میں نازیوں کی حکومت نے ایک قانون نافذ کر کے زن و شو کے ایسے تمام تعلقات کو ناجائز اور قابل تنسیخ قرار دیدیا جن سے بچے پیدا نہ ہوں۔ جرمن نوجوانوں کی تمام انجمنوں میں جو ملک میں پھیلی ہوئی ہیں لڑکیوں کو عام طور پر یہ تعلیم دی جانے لگی کہ ماں بننے کیلئے شادی کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ مملکت اور فیوہرر کی خدمت کرنے کیلئے بغیر شادی کئے بھی بچے پیدا کرنا ضروری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج جرمنی کے ہر ایک ہزار بچوں میں سے پندرہ بیس بچے غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے جنسی اتصال کا نتیجہ ہوتے ہیں ان بچوں کی پرورش اور نگہداشت اس توجہ اور اہتمام کیساتھ کی جاتی ہے جس توجہ اور اہتمام کیساتھ سامان جنگ کے ذخائر جمع کئے جاتے۔ توپیں ڈھالی جاتی ہیں۔ طیارے بنائے جاتے ہیں۔ پٹرول جمع کیا جاتا ہے۔ اور دبابے تیار کئے جاتے ہیں!

جرمن کلچر کی اس جد و جہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۳۴ء میں لاتعداد جرمن بچے پیدا ہونے لگے۔ کہ وہ جوان ہو کر میدان جنگ میں مرنے والے نوجوانوں کی جگہ پُر کر سکیں ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جو لاکھوں جرمن نوجوان مارے گئے تھے اُن کی جگہ جلد سے جلد پُر کرنے کے لئے ہٹلر نے اپنی قوم کو جنسی تعلقات میں ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر دیا اور انسانی نسل توپوں کا ایندھن بنا دی گئی۔ جرمن "کلچر" کے اس اصول کو دوسرے محوری ممالک میں بھی اختیار کیا گیا۔ چنانچہ اٹلی اور جاپان میں تمام قوانین بدل دیئے گئے حتیٰ کہ زنا اور اغوا کی سزاؤں میں بھی بہت تخفیف کر دی گئی۔ وہاں کچھ عرصہ پہلے (۲۱) سال کی عمر تک کی لڑکیوں کا اغوا جرم تھا لیکن مسولینی نے اس عمر کے معیار کو گھٹا کر (۱۴) سال کر دیا۔ یعنے اب چودہ برس کی عمر سے زیادہ کی لڑکی کا اغوا کوئی جرم نہیں رہا۔ جرمن "کلچر" نے حیاتیات کے قدیم اخلاقی اصولوں کو خارج کر کے ایسے اصولوں کو تمام محوری ممالک میں رائج کر دیا ہے جو انسانوں کے جنسی قوانین کو خالص حیوانی زندگی کیطرف واپس لئے جا رہے ہیں۔ اب حیاتیات کے جرمن ماہرین صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ملکوں کی اجتماعی زندگی میں سے زیادہ سے زیادہ کتنے بچے پیدا کئے جا سکتے ہیں اور یہ بچے صرف اس طرح شمار کئے جاتے ہیں جیسے توپیں یا رائفل یا دبابے اس سے زیادہ جرمن "کلچر" کی نظر میں اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ گویا بھیڑیں یا بکرے ہیں جو قربانی کیلئے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں یعنے جرمن کلچر نے انسانیت کی تمام دوسری خصوصیات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔

"حیاتیات" کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک جرمن مصنف نے لکھا ہے کہ تندرست مرد ستر برس کی عمر تک بھی بچے پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ جنگ میں نوجوانوں اور جوانوں کے مارے جانے کی وجہ سے شرح پیدائش کم ہو سکتی ہے البتہ عورتیں اکثر (۵۰) سال کی عمر کے بعد بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ اس لئے ان کا وجود اس عمر کے بعد بیکار ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کی رائے میں (۷۰) سالہ مردوں کی قیمت بھی (۵۰) سالہ عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ نازیوں کیلئے گھر کی زندگی میں عورت کا وجود بے قیمت ہے اگر وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا نہیں کرتی ہے۔ جرمن ماہرین فن نے "حیاتیات" کے تجربات کے بعد یہ حساب لگایا ہے کہ جس طرح ایک گھوڑا (۵) سال کی عمر میں (۸۰) یا (۹۰) گھوڑیوں سے بچے پیدا کر سکتا ہے اس طرح کوئی وجہ نہیں کہ ایک نازی سپاہی بھی بہت سی عورتوں سے بہت سے بچے پیدا نہ کرلے۔ وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مناکحت اور ازدواجی تعلقات کی مذہبی یا اخلاقی پابندیوں کو منسوخ کر کے صرف حیوانی فطرت کے مسلّمہ اصولوں کو رہنما بنا کر جرمن نسل کی ترقی میں کوشش کرنی چاہیئے۔

— یہ جرمن "کلچر" ہے۔ یہ وہ "تنظیم نو" ہے جس کو دنیا پر مسلط کرنے کیلئے ہٹلر لاکھوں انسانوں کا خون بہا رہا ہے۔ اس کلچر میں انسانوں کی انسانیت کو گھوڑوں اور گدھوں کی طرح افزایش نسل کیلئے استعمال کرنا ایک قومی فرض قرار دیدیا گیا ہے۔ نازی کلچر کے ان حقائق پر گہری نظر

ڈالنے اور دیکھئے کہ یہ کیسا خوفناک انقلاب ہے جو آدم کی اولاد کو وحشت اور بربریت کے اُن ویرانوں کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے جہاں اُن کی قدیم تہذیب کا کوئی اخلاقی معیار اور اصول باقی نہ رہیگا۔ جہاں وہ جنگل کے بہائم کے ساتھ ساتھ شمار کئے جائیں گے جہاں وہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی طرح بچے پیدا کرینگے۔ جہاں ان کی جنسی قوتیں صرف ایک مشین کی طرح استعمال کی جائے گی۔ جہاں مرد محض توپوں کا ایندھن سمجھے جائیں گے اور عورتیں کوئی جنسی آبرو نہ رکھیں گی۔ سوائے اس کے کہ وہ مردوں کی جنسی ضروریات کو پورا کریں اور ایسے بچے پیدا کریں جن کی ہڈیوں سے ڈکٹیٹروں کی عظمت و جلال کے مینار و محراب تعمیر ہو سکیں۔ نازیوں نے بچوں کے پیدا کرانے کا جو حیوانی اصول اختیار کیا ہے اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہو سکتا کہ انسانی زندگی کے ہر ذہن اور اخلاقی شعبہ میں پستی اور خواری پیدا ہو اور موجودہ سماج کی ساری تنظیم یکسر برباد ہو جائے۔ جنسی اخلاق اور مناکحت اور خاندانی زندگی کی اس تباہی سے صرف ایک ایسی ہی "تنظیم جدید" پیدا ہو سکتی ہے جو انسانوں کو حیوان بنا دے اور اُن تمام حد بندیوں کو توڑ دے جن سے انسانیت اور حیوانیت کے درمیان ایک بیّن امتیاز قائم ہے۔

آج دو کروڑ سے زیادہ مرد اور عورتیں بھی ذہنی تربیت مسلسل کر رہی ہیں کہ ان کا وجود صرف ایک لیڈر کے احکام کا پابند ہے اور اُن کا کام سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں میں جنگل کے درندوں کی سی قوت پیدا کریں۔ انسانی شعور اور عزت نفس۔ اس جرمن کلچر کی فرہنگ میں ایک بے معنے اصطلاح ہے۔ وہ صرف چند لیڈروں کا حصہ ہے۔ اور باقی جتنے انسان ہیں وہ جانوروں کا ایک بڑا گلہ ہیں۔ ذہنی اور اخلاقی غلاموں کا ایک بڑا گروہ جو صرف ایک فرعون کو سجدہ کرنے اور صرف ایک فرعون کی ٹھوکروں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے! —— ہٹلر کی تنظیم جدید کا یہ محض کوئی تصور نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جس کا خوفناک چہرہ اب بے نقاب ہو چکا ہے۔

نئی تنظیم

دنیا کی تنظیم کے نقشے ہر گوشہ میں بنائے جا رہے ہیں۔ تہذیب حاضر کی عظیم الشان عمارت مسمار کی جا رہی ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کی تعمیر ہی میں "معمار کی ایک صورت خرابی کی" اور اہل فکر و نظر کی نگاہ نظر کے پُر سکون گوشوں

میں اب یہ تلاش ہو رہی ہے کہ آمریت و جمہوریت کے اس ہنگامۂ دار و گیر کے ختم ہونے کے بعد انسانی تمدن کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ دنیا کے اس حال خراب پر متعجب ہونے میں کیوں وقت ضائع کیجئے۔ جو ہونا تھا وہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ حیوانی "عالمگیریت" کی پُر خروش قوتیں آخر ایک دن دنیا کے اس ویرانہ میں کہیں نہ کہیں تھک کر گرنے والی ہیں۔ اسوقت آمریت کے وحشیانہ فلسفہ اور جمہوریت کے راہ گم کردہ تصورات دونوں نظر ثانی کے محتاج ہوں گے اور جس طرح ان میں سے ایک یعنے آمریت جناب انسانی تمدن کو ہزارہا سال پیچھے لیجانا چاہتی ہے اسی طرح دوسری ان میں سے جو بہت عرصہ تک انقلاب کی آواز کو سُننے سے انکار کرتی رہی۔ اپنی زندگی کے تمام نقوش پر نظر ثانی کرے گی اور قوموں کی آنیوالی نسلیں اپنے لئے ایک نئی زمین مانگیں گی اور ایک نیا آسمان۔

آمریت کا فلسفہ یا نازیت کا فلسفہ جو ہٹلر کی کتاب "میری سرگزشت" میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ اب اپنی ہی پیدا کی ہوئی آگ اور فولاد کی کشمکش میں اس قدر مصروف ہے کہ اُسے اب اس بات پر غور کرنیکی فرصت ہی نہیں کہ مستقبل کی گود میں جو نئی دنیا پرورش پا رہی ہے وہ کیا ہوگی۔ وہ تو اب صرف ہٹلر کے اس تصور میں لپٹا ہوا ہے کہ (۱۰) کروڑ نازیوں کی ایک مضبوط چٹان زندگی کے سمندر میں قائم کی جائے جس پر یورپ اور شاید ایشیا کی بھی تمام اقوام غلامی کی زنجیروں میں باندھ کر ڈال دی جائینگی۔ محوری مدبّرین کی تقریروں اور تحریروں میں بار بار یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے خونخوار عزائم میں کامیاب ہو گئے تو اس خاک و خون کی دُنیا کا ٹوٹا ہوا ڈھانچہ ایک ایسی عالمگیر آمریت کی صورت اختیار کریگا جس کا محور و مرکز ایک غیر مشروط نازیت ہوگی۔ اور اس دُنیا کو اس طرح بسایا جائیگا جس میں انسانوں کی انفرادیت آمریت کے قوی بازو میں سلب کر لی جائے۔ لیکن اہل نظر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس جنگ میں دو چیزیں تو یقیناً ختم ہو رہی ہیں۔ ایک آمریت اور ایک سامراج۔ پھر ان دو کے بعد انسانیت کا جو اساس باقی رہتا ہے اس کی تشکیل و تنظیم کیا ہوگی۔

آمریت کو فی الوقت اس بات کی کچھ پروا نہیں اور نہ اُس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہے۔ جرمن اور اٹلی ایک "نئی تنظیم" کے تخیل کو اپنے عہد جبر کا اساس بتلاتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے اور شاید بتا ہی نہیں سکتے کہ آخر اس تخیل کے خد و خال کیا ہیں اور دائمی غلامی کا جو طوق وہ انسانوں کے گلے میں ڈالنا

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

چاہتے ہیں وہ فطرت انسانی کے قوانین کو کس طرح ہمیشہ کیلئے ختم کر سکے گا۔
جاپان اس تخیل کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ وہ ایشیا میں اپنی ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جو اُس کو پھیلنے کا موقعہ دے اس کی قوم کو آباد ہونے کیلئے زمین کے وسیع علاقے دے۔ اور اُس کی معاشی ضروریات کو ضرورت سے زیادہ پورا کرے۔ وہ اپنی ایسی دنیا چاہتا ہے کہ جس کے علاقے فاتح اور مغلوب تو نہ کہا جائے۔ مگر جس پر جاپانی، قومیت کی مستحکم سیادت قائم ہو ـــــ مستقبل کے متعلق یورپ اور ایشیائی محور کے یہ تصورات ہیں اور یہ ایسے تصورات نہیں ہیں جن سے دنیا واقف نہ ہو۔

اب ذرا دوسری طرف بھی دیکھئے۔ جمہوریت میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ بہت سے دھوکے اور فریب ہیں۔ بہت سی خامیاں ہیں مگر اس میں انقلابی لچک بھی اور انقلابوں کیلئے وسعت بھی ہے۔ وہی ایک ماں کی گود ہے جس میں انسانی زندگی کے انقلابات پرورش پاتے ہیں۔ جمہوریت ہی کی اولاد سے اشتراکیت بھی ہے اور کمیونزم بھی۔ اولاد اچھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی۔ مگر نہ تو وہ اپنی ماں کے وجود سے انکار کر سکتی ہے اور نہ ماں اُس کے وجود سے انکار کر سکتی ہے۔ اس کو اپنی خاندانی میراث بھی ملتی ہے اور وہ اپنی نسل کی روایات بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے موجودہ شور محشر میں بھی جمہوریت کے مختلف گوشوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے تصورات میں مستقبل کے خاکے تیار کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا انگلستان کے مفکر ایچ۔ جی۔ ویلز نے "حقوق انسانیت" کی ایک دستاویز مرتب کر کے شائع کرائی تھی۔ اُس کے بعد چند ہی روز ہوئے کہ مسٹر چرچل اور صدر روزویلٹ کے مشورہ کا نتیجہ ایک دستاویز اطلانتک شائع ہوئی جس کی تفصیلات سے ابھی ہم واقف نہیں ہو سکے ہیں لیکن جس کے بنیادی اصولوں کی ایک جھلک ہمیں دکھائی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اہل نظر اپنے تصورات کو پیش کرتے رہے ہیں اور بہت سے گوشوں میں سوچا جا رہا ہے کہ آخر بیسویں صدی عیسوی کے اس طوفان نوح کے بعد ہماری یہ دنیا اگر کوئی کروٹ لیگی تو وہ کیا بن جائیگی۔

ان خیالات کا مرکزی نقطہ جس پر ہر مکتب خیال متحد ہے یہ سوال ہے کہ جنگ کے ان حیوانی جذبات کو جنھوں نے انسانیت اور تہذیب کے بڑے بڑے گنبدوں اور میناروں اور محرابوں کو مسمار کر دیا ہے۔ کس طرح قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح دنیا میں انسانی زندگی کا ایک ایسا نقشہ بنایا جا سکتا ہے جس میں سیاسی رقابتوں اور نسل و قومیت کے امتیازات کی کشمکش کے امکانات باقی نہ رہیں۔ اس طلسم پیچ و تاب میں امن و امان کی بہت سی آرزوئیں مبتلا ہیں۔ اور اہل نظر ان حالات و اسباب کا گہرا مطالعہ کر رہے ہیں جن کی بنا پر مغربی تمدن اور مغربی علوم و سائنس کی ترقیوں کا خمیر اس طرح بگڑا ہے کہ بگڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔

تھیٹر کے اسٹیج پر اداکار خود اپنی اداکاری کے عیب و ستم کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے سامنے جو تماشائی ہوتے ہیں وہ اُن کی اداکاری کے معائب و نقائص پر زیادہ نظر کر سکتے ہیں۔ اس لئے جنگ کے فریقین کی طرف سے دنیا کے مستقبل کی تنظیم و تشکیل کے جو تصورات اور خاکے پیش کئے جا رہے ہیں اُن پر تنقید وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی جھونپڑیاں ابھی تک جنگ کے شعلوں سے محفوظ ہیں اور جو کسی قدر فاصلہ پر کھڑے ہوئے اُن عالیشان محلوں اور ایوانوں کو منہدم ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

تفصیلات سے بحث کرنا تو اس وقت ناممکن ہے لیکن میرے خیال میں اس عالمگیر عہد ابتلا کا بڑا سبب مجلس اقوام کے تخیل کی ناکامی ہے اور اس ناکامی کا بڑا سبب اپنے مفادات کے متعلق اقوام کی خود غرضیاں ہیں اور جمہوریت کی وہ اخلاقی کمزوری ہے جس کی تین بڑی مثالیں ہماری نظر کے سامنے ہیں۔ یعنی چین، حبش اور اسپین۔ چین میں جاپانی آمریت کی پیشقدمی نہ روکی جا سکی۔ حبش میں اٹلی کی دست درازی کا کوئی انسداد نہ ہو سکا اور اسپین میں اٹلی اور جرمن کی سازشوں کا سدباب نہ ہوا۔ پے در پے تین بڑے امتحانوں میں ناکام ہو کر مجلس اقوام کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا۔ اور تقلیل اسلحہ کی تجویز حرف غلط بنا دی گئی۔

اگر ان نتائج کے سرچشمہ کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دور عقلیت میں فکر و عقل کی بے قید آزادی اور مادی قوت پر انسانوں کے عزائم کا انحصار ہے جس نے انسانوں کے تمدن کا کوئی اخلاقی معیار باقی نہیں رکھا جس طرح اعمال و اقوال کے اس طرح فکر و نظر کے بھی کچھ راستے وہ ہیں جو سیدھے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ٹیڑھے ہیں۔ ٹیڑھے وہ ہیں جن پر خود غرضی اور افادیت پسندی تمام دوسرے انسانی امتیازات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ دور حاضر کے ہم بظاہر تندرست بیمار علم اور بظاہر دانشمند بے عقلوں کا حقیقی مرض یہی ہے۔ اور یہ ایک ایسا ابتلا ہے جس کا علاج

(بقیہ مضمون صفحہ [illegible] پر)

پنڈت سندر لال

ہندو مسلم تنازعہ

(پنڈت جی کے اصل مسودہ کے مطابق)

کسی بھی اخلاقی مریض پر غصّہ کرنا یا اُس سے نفرت کرنا اُسی طرح بیجا اور غلط ہے۔ جس طرح کسی جسمانی مرض میں مُبتلا انسان پر غصّہ کرنا یا اس سے نفرت کرنا۔ خود بیماری سے بچنے کی کوشش ایک علیحدہ چیز ہے۔ جس طرح افراد پیدا ہوتے ہیں۔ تندرستی کا حظ اٹھاتے ہیں بیمار پڑتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ اُسی طرح قومیں پیدا ہوتی ہیں۔ تندرستی کا سکھ بھوگتی ہیں۔ بیمار پڑتی ہیں اور مرتی ہیں۔ اور جو حالت جسمانی بیماریوں کی ہے وہی اخلاقی اور رُوحانی بیماریوں کی ہے۔ ہر مرض میں اگر مریض کے اندر جراثیم کے مُقابلہ کی طاقت باقی ہے اور مناسب علاج ہوگیا تو پھر سے تندرستی حاصل کرلیگا اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی کمی رہی تو مرجائیگا۔ دونوں کا امکان رہتا ہے۔ ہماری قوم اس وقت ایک گہرے مرض میں مبتلا ہے۔ غصّہ کرنے یا ایک دوسرے کو الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ صحیح علاج کی کوشش کی جائے اگر اس دیرینہ سال قوم میں دم یا وائیٹیلٹی ر توکمانے کا ماننا، باقی ہوگی ممکن ہے۔ اللہ پھر اس کے دن پھیر دے۔ ورنہ ہم سب کو اُسی کی رضا پر توکل کرنا چاہیئے۔ اور اگر اُس کی مشیت کو یہی منظور ہے تو دوسری زیادہ تندرست۔ زیادہ سمجھدار اور زیادہ جوان قوموں کے لئے میدان خالی کرکے صفحۂ ہستی سے مٹ جانا چاہیئے۔ آخر ہوگا وہی جو اُسے منظور ہے۔

جسم کے اندر سودا۔ صفرا۔ بلغم اور خون وغیرہ اگر ایک مناسبت سے رہیں تو اُسی کا نام تندرستی ہے۔ اگر کوئی مناسبت سے بڑھ جائے یا کم ہوجائے اس حالت کا نام مرض ہے۔ اسی طرح قوموں کے مختلف اوصاف ہیں۔ مثلاً خود پسندی جب تک خودداری کی حد تک رہے بڑی اچھی چیز ہے۔ اس سے بڑھ جائے بُرائی ہے۔ یہی حالت قدامت پسندی کی ہے۔ اپنے ملک اپنے مذہب بلکہ دُنیا کے متقدمین کی دل میں عزت ہونا بڑی اچھی چیز ہے۔ قدیم زمانے کی اچھائیاں بھی ہیں ہاتھ سے نہیں کھونی چاہئیں۔ ہر زندہ مہذب اور ترقی پذیر مُلک میں ہر فرد کے لئے کامل مذہبی آزادی بھی ایک ضروری چیز ہے۔ ہر شخص کو اپنے طریقہ پر اور جس زبان میں وہ چاہے اپنے معبود کو یاد کرنے اور اپنے مذہبی رسوم کو ادا کرنے کا پورا موقع اور حق ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر کسی قوم میں قدامت پسندی اس حد تک پہنچ جائے کہ اُس ملک کے رہنے والے باوجود مکمل مذہبی آزادی اور مذہبی اختلاف کے ایک عام اور مشترکہ سماجی زندگی۔ مشترکہ کلچر اور مشترکہ زبان بازار میں میلوں میں۔ کھیلوں میں کچہریوں میں تعلیم میں صنعت وحرفت میں۔ علم وفن میں۔ لباس میں۔ کھانے پینے میں۔ رہن سہن میں۔ اپنے اندر کم وبیش ایک مشترکہ اور متحدہ زندگی پیدا نہیں کرسکتے۔ اور قائم نہیں رکھ سکتے تو وہ مُلک بحیثیت ایک مہذب اور آزاد مُلک کے دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں یہ مُلک اُس شان اور خوبصورتی کے ساتھ اس طرح کی ایک مشترکہ اور متحدہ سماجی زندگی کو اپنے اندر پیدا کررہا تھا جسے دیکھ کر دنیا دنگ تھی۔ سب سے زیادہ رونا اس چیز کا ہے کہ اپنی تواریخ بھی ہمیں نہایت غلط پڑھائی جاتی ہے۔ اور ہمارے اسوقت کے بڑے بڑے مُلکی رہنما ایسی ہی غلط تاریخ کو پڑھ کر بڑے ہوئے ہیں۔

موجودہ جھگڑوں کا بیج اس وقت پڑا جب کہ پچھلی صدی کے آخیر اور موجودہ صدی کے شروع میں قدامت پرستی کی کچھ بے وقت لہریں اس مُلک کے اندر چلنی شروع ہوئیں۔ ہم نے اس صدیوں کی متحدہ زندگی سے پیچھے ہٹانا چاہا۔ سب سے زیادہ افسوس ناک صورت اس رجحان نے اس وقت اختیار کی جب کہ کچھ نیک دل لیکن ناعاقبت اندیش محبّانِ وطن نے ہندی کے نام سے ایک ایسی نئی زبان وجود میں لانے کی کوششیں شروع کیں جو آج تک بھی ہندوستان کے کسی ضلع یا حصّہ کی عام بول چال کی زبان نہیں ہے اور جس نے ہندوستانیوں کے

[illegible] دوسرے سے بھاڑنے میں سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے۔ جس وقت اُن لوگوں نے بھی جن کے ہاتھ میں ایک وقت تمام قوم نے اپنی قسمت کی باگ ڈور سونپ دی تھی۔ اپنا رجحان اس طرف ظاہر کیا۔ حالت اور زیادہ نازک ہوگئی۔ دوسرے فریق پر اس کا ردِ عمل لازمی تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اُسے محسوس ہونے لگا کہ برادرانِ وطن اُس متحدہ اور مشترکہ زندگی سے پیچھے ہٹنا چاہتے ہیں۔ جسے سب نے ملکر صدیوں میں تعمیر کیا تھا۔ ردِ عمل بڑھا۔ قدرتی تھا کہ مُلک کے دشمن اس حالت سے پورا فائدہ اٹھائیں طبیعتیں یہاں تک بہکیں کہ ایک قوم کی دو قومیں نظر آنے لگیں۔ آئندہ کے لئے متحدہ قومیت ایک خواب معلوم ہونے لگی۔ یہ خیال کیسے کہ جو غلط کشمکش ایک کی جگہ دو قومیں دکھا رہی ہے۔ وہ اگر قائم رہ گئی تو اتنے ہی پر نہیں رُک سکتی۔ پھر خدا نہ کرے۔ دو نہیں تین نہیں۔ کم از کم بیسیوں آزاد قومیں اور آزاد سلطنتیں اس مُلک میں نظر آئیں گی جو علیحدہ علیحدہ دُنیا کی مختلف طاقتور قوموں کے ہاتھوں کے مُہرے ہوں گی۔ اور اس وقت جو "ہندوستان" اور "ہندوستانی" کہلاتے ہیں۔ اُن کا ہمیشہ کے لئے جنازہ نکل جائے گا۔ مرض فی الحال کافی زور پر ہے۔ نیتیں دونوں طرف کی درست ہیں۔ لیکن دونوں اپنے اپنے سے مجبور ہیں۔ جس دھرم اور جس مذہب کو عالمگیر ہونیکا دعویٰ ہے اُسے اندیشہ ہے کہ اگر اس ملک میں "نمائش" کی جگہ "پردرشنی" یا "پردرشنی" کی جگہ "نمائش" کہا جانے لگا تو اُس کی ہستی خطرہ میں ہے۔ جن لوگوں کو وہ زبردست روشنی ورثہ میں ملی ہے۔ جو ہزاروں رنگ کی رنگ برنگی

چمنیوں میں سے بھی اپنا جلوہ دکھا سکتی ہے۔ اور دکھاتی رہی ہے۔ انھیں اب ڈر ہے کہ چمنی کا رنگ بدلا اور روشنی بھی منتشر بیسی کیا ہوگا یہ اندھیرا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن مایوسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ملک کے عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل ابھی تک بالکل صاف ہیں۔ وہ گیتا اور قرآن۔ کبیر کی ساکھی اور مولانا روم کی مثنوی۔ نانک اور محب اللہ۔ دادو اور بُلّھے شاہ کو ابھی تک بھولے نہیں ہیں۔ اُن کا دھرم۔ اُن کا مذہب ابھی تک باوجود توہمات اور ضعیف الاعتقادی کے "پریم کا دھرم" اور "عشق کا مذہب" ہے جنھیں دونوں طرف غیریت نظر آرہی ہے۔ اُن میں سے زیادہ تر عملاً اور اعتقاداً نہ ہندو ہیں اور نہ مسلمان۔ یورپ میں فرقہ وارانہ جھگڑے ایک ہزار سال سے اوپر تک اس سے ہزاروں گنا زیادہ خوفناک شکل میں جاری رہے۔ جاپان میں بودھوں اور عیسائیوں میں صدیوں اس سے کہیں زیادہ بُری صورت رہی۔ یہ بادل چھٹینگے۔ فضا بدلے گی اگر وہ دن نہیں رہے تو یہ بھی ہمیشہ نہ رہیں گے۔ ایک خواب ہے نہایت بُرا خواب ہے جس سے یہ قدیم قوم کم از کم ایک مرتبہ اور بیدار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی جیسے کوئی شبہ نہیں۔ مریض کا اصلی قلب درست ہے۔ اسمیں غضب کی وائیٹیلٹی (قوتِ مدافعت) ہے۔ علاج صاف ہے۔ راستہ نظر آرہا ہے۔ غیروں کی آمد سے ٹھیک پہلے کی جس مشترکہ اور متحدہ زندگی سے ہم نے قدم پیچھے ہٹائے ہیں۔ اُسی طرف ہمیں پھر لوٹنا ہے اور لوٹنا ہے مضبوطی اور اعتقاد کیساتھ۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۸)

کسی دستاویز اور عہدنامے اور دستور اساسی سے نہیں ہو سکتا۔ یہ دلوں کا معاملہ ہے۔ دماغوں کا معاملہ نہیں ہے جمہوریت ہو یا قومیت ہو یا اشتراکیت ہو۔ یہ سب ایک ایسی اخلاقی بنیاد کے محتاج ہیں جس کو خواہشیں اور خود غرضیاں نقصان نہ پہونچا سکیں لیکن ہٹلر نے "میری سرگزشت" میں سیاست کی تمام اخلاقی بنیادوں کو یہ کہہ کر منہدم کر چکا ہے کہ "حق اور باطل کا معیار صرف کامیابی ہے"۔

نوح کے زمانہ میں دنیا غرق کی گئی تھی، تاکہ ایک نئی اور بہتر دنیا پیدا ہو اس طوفان کے بربادیوں میں نئی آبادیاں مضمر تھیں سا اس ابتلائے عظیم کی ہلاکتوں میں ایک بہتر زندگی کے وعدے پنہاں تھے۔ یہی داستان دنیا کے ہر عہد میں دہرائی جاتی رہی ہے اور اب پھر دہرائی جا رہی ہے۔ ان بربادیوں کے ہنگامہ ہی میں نئے قاید پیدا ہوا کرتے ہیں اور وہ نئی راہیں پیدا کیا کرتے ہیں۔ فطرت کے وعدے اور قانون جھوٹے یا نااستوار نہیں ہوا کرتے۔ اسلئے ہمیں یقین ہے کہ ہم آج ایک نئے انقلاب کے دروازہ پر کھڑے ہوئے ہیں اور عہد حاضر کا یہ فتنہ جس سے جرمن

آمریت کے گہوارہ میں پرورش پائی ہے۔ دنیا کے ایک نئے دور۔ ایک نئی بیداری اور ایک نئے انقلاب کی تمہید ہے۔۔۔ ایک نوید ہے جو ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے اسلئے آنیوالے خطرات کے خیال سے پریشان ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ گویا ہماری نظر وسیع تر دائرہ میں کام نہیں کرتی یا ہم اونی اور ذاتی مفادات کے زاویۂ نظر سے عالمگیر مفادات کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ذاتی مفادات اور ذاتی خطرات ایک عالمگیر انقلاب کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ اور اکثر آندھیوں اور طوفانوں میں برباد ہو جایا کرتے ہیں لیکن اُن ہی کی مٹی سے جمہوریت کی نئی عمارتیں تیار ہوا کرتی ہیں۔ درحقیقت جمہور کے اجتماعی وجود میں شخصی زندگی کا سرمایہ اتنا بھی نہیں جتنا کہ سمندر میں ایک قطرہ "ہم قوموں کے ارتقا کو اگر انسانوں کی زندگی کے مختصر زمانہ سے ناپا کریں تو وہ ایسا ہے جیسے کہ سمندر کے پانی کو آبخوروں میں بھر کر تولا جائے"۔ افراد کا فنا ہو جانا انسانی نسل کی تاریخ میں ایک بہت ہی خفیف واقعہ ہے۔ لہٰذا جو لوگ انسانیت کے افق پر نظریں جمائے ہوئے ہیں وہ اپنی ذات اپنی جان یا اپنے ادنیٰ مفادات کے تحفظ کا خیال بھی نہیں کر سکتے وہ دنیا کی ایک نئی تشکیل [illegible]"

(بقیہ مضمون صفحہ [illegible])

قاضی عبدالغفار

سنگاپور

بحرِ پیسفک اور بحرِ ہند کے درمیان ملایا اسٹیٹس کی آخری نوک پر جو ایک طرف جزیرۂ بورنیو اور دوسری طرف جزیرۂ سماٹرا سے ملی ہوئی ہے مشرق بعید کا یہ ایک برطانوی چوکیدار تھا۔ جو جبل الطارق۔ نہر سویز اور مالٹا کی طرح ایشیا کی طرف برطانوی اقتدارات کے دشمنوں کا راستہ روکے ہوئے تھا۔

جس وقت فرانس یورپ کے میدان جنگ میں موجود تھا۔ ہند چین میں اس کی طاقت برطانیہ کے لئے بھی باعث اطمینان تھی۔ لیکن فرانس کے انہدام کے بعد اب برطانیہ کو بحرِ پیسفک کی طرف امریکہ اور بحرِ ہند کی جانب سنگاپور کے استحکامات پر بھروسہ کرنا تھا۔ اور اس لئے مشرق بعید کے اس برطانوی چوکیدار کی اہمیت اب اس قدر زیادہ ہو گئی تھی جس قدر کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ اس چوکیدار کی سیاسی عمر دوسرے برطانوی چوکیداروں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ لیکن اُس کی اہمیت کسی دوسرے دفاعی استحکام سے کم نہیں تھی۔

سنگاپور کی قدیم تاریخ بہت دھندلی ہے۔ تیرہویں اور چودہویں صدی میں سنگاپور ایک آزاد ریاست تھی۔ مگر ۱۳۶۲ء میں اہل جاوا نے اس کو برباد کر دیا اور اس کے بعد تقریباً (۵۰۰) سال تک وہ ویران رہا۔ اس زمانہ میں تاریخ کے صفحات پر اُس کا نام و نشان نہیں ملتا تا آنکہ ۱۸۲۴ء میں وہ برطانوی سیاست کی بساط پر نمودار ہوتا ہے۔ البتہ حال ہی میں آثارِ قدیمہ کے ایک ماہر ڈاکٹر گوارش نے اس جزیرہ نما کی قدیم تاریخ کے متعلق بعض انکشافات کئے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ وہاں چوتھی صدی سے تیرہویں صدی تک کے ایسے قدیم آثار برآمد ہوئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ [illegible] میں بھی ہندوستان کی قدیم تہذیب اس جزیرہ نما تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ہند چینی میں ایک قدیم ہندی ...... کے آثار برآمد کئے ہیں [illegible] صدی عیسوی میں وہاں آباد تھا۔

[illegible] ملایا میں برطانیہ کا سب سے پہلا مقبوضہ مشرق میں [illegible]

سب سے قدیم مقبوضہ پینانگ ہے جس کو سلطان کدا ح سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۸۶ء میں حاصل کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اہل پرتگال کے قبضہ میں تھا۔ اور اس کے بعد ۱۶۴۱ء میں اہل ہالینڈ کی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا تھا ۱۸۰۲ء کے بعد سے اس مقبوضہ کی وسعت میں کافی اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ ۱۸۲۴ء میں کمپنی نے سلطان جوہور سے ایک کارخانہ قائم کرنے کیلئے سنگاپور کے علاقہ میں ایک قطعہ زمین حاصل کیا جس کی قیمت (۱۲ ½) ہزار پونڈ دی گئی اور جس کا سالانہ کرایہ (۵) ہزار پونڈ تھا۔ چونکہ یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاروبار میں شامل تھا اس لئے ۱۸۲۶ء میں اس کو ہندوستان کی حکومت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ ۱۸۳۶ء میں اس علاقہ کا صدر مقام سنگاپور کو بنایا گیا۔ جو ایک نوآبادی تھی۔ ۱۸۶۷ء میں اس علاقہ کا تعلق حکومت ہند سے دفتر نوآبادیات کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد برطانوی سلطنت کے رسل و رسائل کے وسیع سلسلہ میں رفتہ رفتہ یہ ایک دفاعی مورچہ بن گیا۔ اور اس کے استحکامات میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔

جغرافیائی لحاظ سے سنگاپور کا محلِ وقوع اس قسم کا ہے کہ حکومت برطانیہ اگر اس بندرگاہ کو سر تا سر قلعہ بندیوں سے مستحکم نہ کرتی تو فرانس کے انہدام کے بعد وہ ایک دن بھی اس پر قابض نہ رہ سکتی۔ چنانچہ سنگاپور کی حفاظت کے لئے جہازوں کا ایک جنگی بیڑہ اور متعدد تباہ کن کشتیاں اور ساحلی توپیں اور مشین گنیں اور بم پھینکنے والے زبردست طیارے مہیا کئے گئے تھے۔ یہاں بڑی بڑی طیارہ شکن توپوں کا انتظام کیا گیا تاکہ سنگاپور ہر طرح کے حملے اور ہر طرح کی مصیبت سے محفوظ رہے۔ بحرالکاہل میں نیوزی لینڈ کی حفاظت کیلئے آسٹریلیا کی حفاظت کیلئے اور ہندوستان اور برما اور سیلون اور جزیرہ نمائے ملکا کے دفاعی انتظامات اور حفاظت کیلئے سنگاپور پر ان تمام فوجی ساز و سامان کا ہونا [illegible]

ضروری تھا۔

جزیرہ نمائے ملکا پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا رقبہ پانچسو مربع میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اور وسعت کے لحاظ سے یہ جزیرہ گرد و نواح کے مقامات میں سب سے زیادہ زرخیز ہے۔ اس جگہ کی آبادی کے لحاظ سے یہاں کی درآمد بہت زیادہ ہے۔ صرف ۱۹۳۰ء میں اس جزیرہ کی ربڑ وغیرہ کی سالانہ برآمد بقدر ساٹھ لاکھ روپیہ کے تھی۔ سال بھر میں اس جزیرہ نما کی برآمد و درآمد کے مال کی کل میزان چالیس ملین روپیہ تک ہوتی ہے۔ اگر اس کا ہم ہندوستان اور ہانگ کانگ کی درآمد و برآمد کے ساتھ مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی (۸۰) ملین روپیہ کی اور ہانگ کانگ کی (۵۵) ملین روپیہ کی درآمد برآمد ہے۔ اس سے واضح ہو جائیگا کہ تجارتی حیثیت سے یہ مقام کتنا اہم ہے۔

اس مقبوضہ کی آبادی کا حال یہ ہے کہ ۱۸۲۰ء میں چین کے پانچسو آدمی سنگاپور میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے یہاں آکر آباد ہو جانے سے ہر سمت کے لوگ اس آبادی کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اور اس کی رونق رفتہ رفتہ بڑھنے لگی یہاں تک کہ آج سنگاپور کی آبادی (۵) لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اور ان میں پنجابی چینی، جاپانی، عرب۔ فرانسیسی۔ روسی، جرمن۔ ہالینڈ کے رہنے والے اور ہندوستان کے سکھ سب ہی موجود ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں اس آبادی میں (۵۲) ہزار ہندوستانی موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر مزدور اور تجار ہیں۔ ان کے علاوہ یورپ کے دیگر مختلف ممالک کے دس ہزار آدمی بھی آباد ہیں۔ مختلف قوموں کی یہ رنگ میل بستی ہے۔ جسمیں مندروں کی کلغیوں کے ساتھ مسجدوں کے مینارے سر بفلک نظر آتے ہیں۔ اور کلیسا کے گھنٹوں کی آواز میں چینی عبادت گاہوں کی گھنٹیاں بیک وقت اپنی آواز ملایا کرتی ہیں۔ مشرق و مغرب اور کالے سفید اور زرد کا سنگم برطانوی سلطنت کی اس ہمہ گیری کا آئینہ دار ہے۔ جس کی وسعت میں ایشیا کے ڈانڈے یورپ سے مل گئے ہیں اور مشرقی سمندروں کا پانی مغربی سمندروں کے پانی سے ٹکرا رہا ہے۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہو کر ۱۹۲۱ء میں حکومت برطانیہ نے سنگاپور کو اپنا مشرقی نقطۂ دفاع قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ برطانیہ کی بحری فوج کا ایک حصہ سنگاپور کی حفاظت کیلئے وقف کر دیا گیا۔ اور کابینہ نے سنگاپور کے استحکامات کے متعلق ایک تجویز پیش کی اور یہ تجویز فوراً منظور ہو کر نافذ ہو گئی۔ اور سنگاپور میں ہوائی مستقر قائم کر دیا گیا۔

اس سال سنگاپور میں مختلف معدنیات کھودنے کیلئے کانیں دریافت ہوئیں اور ان کانوں کی وجہ سے باہر کے لوگوں کی آمد کا سلسلہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ سنگاپور کی شہرت نے بھی غیر معمولی ترقی کر لی۔ سنگاپور اور انگلستان کے مابین آٹھ ہزار میل کا فاصلہ ہے اور بحیرۂ روم کے مشرقی دہانے سے سنگاپور پانچ ہزار ایک سو بیاسی میل دور ہے۔ ہندوستان اور سنگاپور کے مابین ایک ہزار پانچسو میل کا فاصلہ ہے۔ سنگاپور اور شانگھائی میں یکہزار دو سو چالیس میل سے زیادہ اور سنگاپور اور آسٹریلیا میں دو ہزار میل سے زیادہ مسافت ہے۔

برطانیہ کا یہ مشرقی چوکیدار جس قدر زیادہ مستحکم ہوتا گیا اسی قدر زیادہ وہ جاپان کا مرکز نظر بنتا گیا۔ ایشیا میں جاپانی استعمار کے منصوبے برطانیہ یا امریکہ کی چوکیداری کو گوارا نہیں کر سکے اور ایک دفعہ سے زیادہ ایسا نازک وقت آ چکا ہے۔ جب کہ یہ اندیشہ تھا کہ جاپان اور برطانیہ کی رقابت جنگ و جدال کا رنگ اختیار کر لیگی۔ لیکن چند سال ہوئے برطانیہ اور جاپان کا ایک معاہدہ ہو جانے کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ اب کچھ عرصہ کیلئے مشرق و مغرب کی ان دو قوتوں کا تصادم نہ ہوگا۔ لیکن چین کے خلاف جاپان کی جارحانہ زبردستیوں نے برطانیہ سے اس کے تعلقات کو پھر خراب کر دیا اور جاپان کے بحری جہاز سنگاپور کے سامنے اپنی بحری طاقت کے مظاہرے کرتے ہوئے دیکھے جانے لگے۔ چنانچہ مشرق بعید کا یہ جبرالٹر پھر کسی دشمن کی ٹکر کیلئے تیار ہوتا رہا۔ یہ صورت حال اور بھی زیادہ نازک اس لئے ہو گئی کہ جاپان اور محوری دول کے تازہ معاہدہ نے بحر پیسفک کے ساحل پر امریکہ کو اور بحر ہند کے کنارے پر برطانیہ کو خطرہ کے قریب آگاہ کر دیا۔ جس طرح طارق کی چٹان سے بحر روم کی طوفانی موجیں ٹکرا رہی تھیں اسی طرح جاپان کی فوجی آمریت کے عزائم کا ایک طوفان سنگاپور کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ اور بالآخر اسے ڈبو دیا۔

مرزا ارشاد بیگ

آج کا انسان اور ماحول کی جدوجہد

آج کا انسان دیکھتا ہے کہ دنیا کا نظام اس کی زندگی کو نظر انداز کرتا اور کچلتا ہوا چل رہا ہے۔

—— حالات اس کی زندگی کی تمناؤں، خواہشوں اور تخلیقی بلندیوں (جو علم و انکشافات و ترقی اور اقدار کیلئے بے چین ہیں) سے بغاوت کرتے ہیں۔ نام نہاد سیج جسکی وہ عزت اور احترام کرتا تھا۔ زندگی کی مشکلات میں رتی بھر کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ مصائب اور اذیتیں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ اپنے دور میں خود کو تنہا پاتا ہے۔ اور موجودہ نظام کا کھوکھلا پن اس پر پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔

—— اس کے پاس کوئی نصب العین نہیں ہے۔ اس کے لمحاتِ زندگی پر تعطل چھایا ہوا ہے۔ اس کے پرانے شعور اور ارتقائی ذہن و احساسات میں کشمکش ہے۔ آج کے حالات اور اس کے اپنے ارتقائی دل و دماغ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ خود گویا پرانا شعور ہے۔ اس طرح آج انسان کے دو (Egos) ہیں۔ ایک پرانے شعور پر مبنی۔ اور دوسرا ارتقائی محرکات کا حامل۔ انسان خود بھی اپنے حقیقی ارتقائی Egos کا ہمنوا نہیں ——

آج تمام دنیا کے انسان یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ جہاں تک ان کی حقیقی آرزوؤں اور خواہشوں کا تعلق ہے۔ وہ یکساں قابلِ توجہ ہیں۔ محبت۔ خاندانی زندگی۔ کاروبار۔ علم و انکشافات اور ترقی کی نئی راہیں۔ غذا، سکون اور آرام۔ حفاظت اور امن و چین کی زندگی۔ جذبات اور احساسات اور اقدار سے متعلق حس یہ سب تشنہ اور گرسنہ ہیں۔ انسان کائنات کے اس شور و غوغا میں اس طرح جھلایا ہوا کھڑا ہے۔ جیسے [illegible] وہ وحشی اور بربری نظامِ عالم نے اس کے عزیز ترین اور لطیف ترین جذبات کے منہ پر تھپڑ رسید کیا ہے۔ اور وہ غیرت و خودداری سے غیظ و غضب میں تڑپ کر سوچ رہا ہو کہ اس بے معنی وحشی نظام کی دھجیوں کو بھی آگ لگا دے۔ اور ان کی خاک تک کو نہ رہنے دے۔ آج کا انسان گویا کہہ رہا ہے۔ خدا کی قسم۔ اس نظام کے سایہ میں جتنی ناانصافیاں مجھ پر ہوئیں۔ اور جو جو ظلم اور دکھ میں نے سہے۔ وہ آدم کی اولاد نے کبھی نہ سہے ہوں گے۔ میرے دل و دماغ کی گہرائیاں آج وہ وہ چرکے اور ناسور اپنے اندر روپوش اور نہاں پاتی ہیں۔ جنھوں نے مجھ پر آشکارا کر دیا ہے کہ اس ماحول میں ایک حساس اور خوددار انسان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ اس دنیا کو سلام کرے۔ اور کہے۔ اے خدا میں تیری دنیا سے بھر پایا۔ تیری کائنات میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تیری دی ہوئی روح اس کائنات میں سسکتی ہوئی کس میرسی کیساتھ بلک رہی ہے۔ آہ کیا طرفہ نیرنگی ہے۔ اس کے جذبات کا اس رنگ و بو کے عالم میں کوئی مول نہیں۔ اس کے درد کا کوئی شناسا نہیں۔ آہ کیسی رقت انگیز بے بسی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے۔ وہ جان رہا ہے۔ وہ محسوس کر رہا ہے۔ اس پر ظلم ہو رہا ہے۔ ناانصافی کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اُسے کچلا جا رہا ہے لیکن وہ خود کو بے دست و پا پاتا ہے۔ اے انسان آج تجھے کس نے مفلوج کر دیا۔ تیری قوت پرواز اور جرأت کس نے سلب کر لی ...... یہ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ کہ انسان کے شعورِ کہنہ نے اسے مجروح اور بے بس کر کے پھینک دیا ہے۔ یہ اس پرانے شعور کی ہار ہے۔ اور یہ بے بسی پرانے شعور کی بے بسی۔ اے انسان تو۔ مردہ۔ کہ تو ازل سے اپنی سرشت میں بے بس نہیں ہے —— تاریخ کے اوراق میں تیرے شعورِ کہنہ کی شکست کے ذکر تو ہیں۔ لیکن انسان کی شکست سے قادرِ مطلق نے [illegible] کو کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔

میرا دل زار زار رو رہا تھا۔ اے خدا تو نے اپنے سچے بندوں کو [illegible] کچل ڈالا ہے۔ کیا ان کی بے بسی تیری بے بسی نہیں —— میں نا واقف تھا [illegible]

بے بسی یعنی یا تی خدا کی بے بسی ہے۔ اور یہ شکست دنیا کے بیکار اور تصوری خدا کی شکست۔ دنیا کی جدوجہد بیکار خداؤں کے تصور کی شکست اور پائمالی سے خون آلود ہے۔ لیکن لاریب حقیقی قادر مطلق دنیا اور انسان کی ہر حرکت اور عمل میں نئے انسان کے روپ میں بڑھتا آیا ہے۔ عرب کے بت پرستوں کے بت بھی تو خدا ہی تھے۔ کیا ان کی ہار کو ہم نے خدا کی ہار کہا۔ کیا ہے۔ اگر دنیا آج مذہب کے بیکار خدا کی شکست کو خدا کی شکست کہتی ہے۔ کیا ہے۔ اگر انسان آج اپنے تصوری خدا کو کوستا ہے۔ قادر مطلق تو نئے انسان کے روپ میں اپنی جیت پر مسکرا رہا ہے۔ اگر پہلے اس نے بت پرستوں کو شکست دی تھی۔ تو آج وہ تصور اور توہم پرستوں کو شکست دے رہا تھا۔ اگر کل اس نے مٹی کے سینکڑوں ہزاروں خداؤں کو مٹا کر اپنا قدم بڑھایا تھا۔ تو آج اپنے حریف بیکار روایاتی خدا کو مٹا کر اپنی برکتیں لئے نئے انسان کے واسطے منتظر ہے۔

آج انسان اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں کا اطمینان چاہتا ہے۔ آج انسان حیوانی زندگی۔ مذہب کی رسمی زندگی۔ خاموش اعتقاد۔ اور وطن کے فرض کی تباہ کن زندگی کے بجائے اپنے فطری حواس اور احساسات کی۔ اپنی ارتقائی قوتوں اور حقیقی تمناؤں کی زندگی کے لئے یکساں مضطرب ہے۔ آج ارتقائی ذہن اور [illegible] کی قوتیں اپنے بلند ترین مدارج پر مجسم ہیں۔ آج انسان کا پہلا شعور بیحد کنگال ہے۔ لیکن اس کا ارتقائی ذہن ہمارے تصور کی رسائی سے زیادہ مالا مال ۔۔۔۔۔ آج انسان کا شعور بیحد نسلوں، قوموں اور مذاہب میں بٹا ہوا ہے۔ لیکن اس کی تحت الشعوری [illegible] یگانگت اور یک جہتی کے ناقابل تقسیم سلسلہ میں منسلک ہو چکی ہے۔ آج ہمارا پہلا شعور تار تار اور تباہ حال ہے۔ مایوس اور ناامید۔ تاریکی میں لپٹا ہوا اور بے بس و بے کس ۔۔۔ نیا شعور اپنی [illegible] اور ناقابل تسخیر قوتیں لئے نئے انسان کی صورت میں ان گنت روشنیاں۔ امیدیں اور آشائیں توتیں اور طاقتیں لئے کھڑا ہے۔ اے تباہ حال اور حرماں نصیب انسان احساس کی قوت تجھ میں مردہ ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ بے شمار تباہیاں اور بربادیاں تیرے گرد منڈلا رہی ہیں۔ اور اس طرح منڈلا رہی ہیں۔ کہ تو ادھر ارتقائی قوتوں کا یقین تک کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ تیرے شعور کہنہ نے تجھے تہی دامنی اور بربادی ہی دی ہے۔ اور تو ایک بلند ترین زندگی کے خیال کو ایک خواب دل خوش کن سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں ہے۔

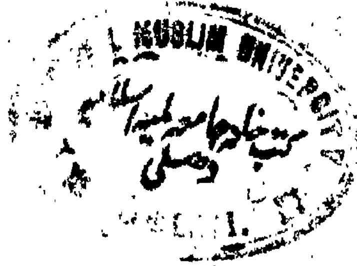
بقیہ مضمون صفحہ (۴۰)

بقیہ مضمون صفحہ (۴۰)

وہ جمہوریت کی ایک نئی تشکیل کیلئے ہر گوشہ میں آمریت کے برباد کرنے کے ہر امکان کیلئے ہر قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہیں ـــــ ان کی نظر میں یہ آنیوالا زمانہ کوئی ایسا زمانہ نہیں جن کو افراد کی عمروں سے ناپا جائے۔ یہ قوموں کی اجتماعی عمروں ہی کے طول سے ناپا جا سکتا ہے۔ پس اس عظیم الشان تصور میں اس آنیوالے زمانہ کا انتظار کیجئے۔ جب انصاف اور مساوات اور امن کی سیاسی اصطلاحات کا ایک بہتر اور زیادہ استوار اخلاقی معیار پیدا ہوگا۔ اور جنگ کے عالم سوز شعلوں میں جو دنیا برباد ہو گئی وہ بارہ دگر آباد ہو گی۔ ـــــ یہ لوگ جن تصورات کا دامن پکڑے ہوئے ہیں اُن کی وسعت۔ ارادہ اور آرزو کی اس حد پر ختم ہوتی ہے۔ جہاں شاعر نے کہا تھا کہ:۔

گوشت خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد

سید محمد عقیل



ادب اور اس کے نئے تقاضے

اس عہد میں جس سے ہم گذر رہے ہیں، ایک تہذیب شکست ہو رہی ہے۔ اور دوسری نئی دنیا اس کی جگہ حاصل کر رہی ہے۔ یہ چیز کس قدر تعجب انگیز ہے کہ جو کچھ گذرنا چاہتا ہے اور جو کچھ آرہا ہے۔ اُسے بجا طور پر نہیں سمجھا گیا۔ ہم جو کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں اس کی تنقید کر سکتے ہیں، "ایک تھکا ہوا دماغ کسی طرح نہیں سمجھ سکتا کہ عہد جوانی میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔

فن مصوری کے نئے تقاضے ان لوگوں کے لئے پریشان کن ہیں جنہوں نے ان حیاتیاتی اسباب کی موجودگی پر کبھی شک نہیں کیا۔ جو بڑے بڑے سامراجوں کی تباہی اور نئی شہنشاہیتوں کے احیاء کا باعث ہوئے۔ جو لوگ اپنے ارد گرد کی بدلتی ہوئی دنیا کو ایک ایسا وقتی حادثہ سمجھتے ہیں جو کسی بنیادی تبدیلی کو پیدا کئے بغیر گذر جائیگا، وہ ابدی تحفظ پر کامل یقین کئے ہوئے ہیں"

(البرٹ گلیزز)

فرانس کے مشہور فن کار اور عہد جدید کے قابل نقاد البرٹ گلیزز کی یہ رائے ادب اور اس کے اسباب پر بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جو لوگ حیاتیاتی اسباب اور ان کے فعل و ردِ فعل کو تسلیم نہیں کرتے اور جو ہمارے سماج کو محض جامد تصور کرتے ہیں ان کے نزدیک جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ ہونے والا ہے وہ محض ایک ایسی چیز ہے جو سماج کی گہری بنیادوں پر اثر کئے بغیر گذر جائیگی۔ مگر جن لوگوں کے نزدیک سماج کا نام ہے اقتصادی اسباب کا اس مجموعی اثر کا جو صدیوں کی پیہم کوششوں کے نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوا ہے وہ نئے حالات کے ضروری تقاضات کا اندازہ لگاتے ہیں:

ادب کے متعلق قدیم نقطۂ نظر رکھنے والا گروہ یا وہ گروہ جو ادب برائے ادب کا قائل ہے، ادب اور سماج کو ایک ناقابلِ تغیر وجود تسلیم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حیاتیاتی اسباب یا اقتصادی اقدار کوئی اہمیت نہیں رکھتیں وہ ان اسباب سے آنکھیں بند کئے ہوئے محدود ترین حلقہ میں غور کرنیکا عادی ہے۔ لیکن ادب کو بدلنے والے سماج کا نقیب سمجھنے والے "ادب برائے زندگی" کے نظریہ پر عقیدہ رکھتے ہیں:

ادب برائے زندگی

نئے مصنفین نے "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کے موضوع پر کافی بحثیں کی ہیں۔ لیکن چند مستثنیات کو چھوڑ کر اس واقعہ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابھی تک "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کا مفہوم کامل طور پر واضح نہیں ہوا۔ بعض لوگ ادب برائے زندگی اس ادب کو سمجھتے ہیں، جو انقلاب، مزدور، سماج، سرمایہ داری، جاگیرداری کی نئی اصطلاحوں پر مشتمل ہے۔ اور ادب برائے ادب، ان حضرات نے اس ادب کا نام رکھا ہے جو حسن و عشق، رنگ، نغمہ، موسیقی، شراب و کباب جیسے نشاطی موضوعات کو عنوانِ نثر و نظم بنائے ہوئے ہے لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ اگر ادب برائے زندگی صرف چند اشتراکی اصطلاحوں کا نام قرار دیدیا جائیگا تو میکسم گورکی، پشکن، کرانیکیفن، مادام رولاں برنارڈ شا اور اسی قسم کے چند اور حقیقت پسند اہلِ قلم کو چھوڑ کر ہمیں تمام دوسرے ادیبوں کو صرف "ادب برائے ادب" کا نقیب ماننا پڑے گا۔

حقیقتاً ادب برائے ادب بذاتہ کوئی چیز نہیں ہے، ادب ہمیشہ انسانی سماج کے کسی نہ کسی پہلو کا پرتو رہا ہے۔ وہ کبھی ہماری سوسائٹی کے مابعد الطبیعیاتی رجحانات کی تشریح کرتا تھا۔ لیکن اب ان انقلابی عناصر کی تفسیر کرنیکی طرف رجوع ہوا ہے جو نئے سماج کو متاثر کر رہے ہیں۔

یہ مابعد الطبیعیاتی عناصر عہد جاگیرداری کی ممتاز خصوصیت تھے۔ اس عہد میں ادب چند فارغ البال انسانوں کی دماغی تفریح کا ایک ذریعہ تھا۔ ان لوگوں کو اپنے عجوبہ پسند روحانی اور غیر حقیقی تصورات کیلئے غذا کی ضرورت تھی۔ ادب اس ضرورت کو پورا کرتا تھا، تاہم اس دور میں بھی ادب کو کبھی کبھی زندہ حقیقتوں پر بحث کرنے کیلئے مجبور رہنا پڑا۔ ہرچند کہ ان حقائق کے اظہار کا کوئی منطقی پس منظر نہیں تھا۔ یعنی ماحولی اثرات اس قدر چھائے ہوئے تھے کہ ان اثرات کے جال سے ذہن انسانی کے لئے فرار ناممکن ہوگیا تھا۔

جاگیرداری عہد کا ادب، زندگی کے دبے ہوئے گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر یہ نہیں بتاتا تھا کہ وہ دبے ہوئے کیوں ہیں؟ اور ہر جبر زندگی کو مقدرات سے تعبیر کرکے آگے بڑھ جاتا تھا۔

زندگی

بحث طلب امر یہ ہے کہ زندگی سے ہم کیا مراد لیتے ہیں، اگر زندگی ایک فرد اور اُس کی محدود اقتصادی ضروریات کا نام ہے تو بلاشبہ ادب برائے زندگی بھی اسی ادب کا نام ہو کر رہ جائیگی جو ہمیں یہ بتائے کہ معاش حاصل کرنے کے ذرائع کیا ہیں۔ اور اگر زندگی نام ہے سوسائٹی اور اس کی تمام تر ضروریات اور تمام رجحانات کا اور اگر معاشرہ وکائنات کے مختلف اثرات کے باہمی روابط، عمومی حیاتیاتی اسباب وغیرہ کا بھی اس سے تعلق ہے تو ادب برائے زندگی بھی اس ادب کا نام ہوگا جس کے دائرہ میں یہ تمام وسیع دنیا آجاتی ہے۔

پرانی دنیا میں (جو جاگیرداری عہد کیساتھ ختم ہوگئی) اقتصادی اسباب مجموعی سوسائٹی نہ بنا سکے۔ گو مذاہب نے قبل از وقت اجتماعی تصور پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس ارادہ میں بُری طرح ناکامی ہوئی۔ سماج اور اس کے اقتصادی ذرائع اس قدر محدود تھے کہ وہ کسی عظیم مجموعی سماج کا بار برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے سوسائٹی مجبوراً چند بے تعلق ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ البتہ مذہب نے اتنا ضرور کیا کہ اُن کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کو اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندوئیت اور بدھ مت جیسے بڑے بڑے ٹکڑوں میں بانٹ دیا لیکن جہاں ان روحانی تصورات کا مقابلہ سماج اور اُس کے اقتصادی حیاتیاتی اسباب سے ہوا، ان کو اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی۔

ایران نے اسلام کی وہ تشریح کی جو عرب سے بالکل مختلف تھی۔ بدھ مت چین میں جاکر کنفیوشس کے قومی تصورات سے اتنا متاثر ہوا کہ ہندوستانی بدھ ازم اس کے مقابلے میں ایک دوسری چیز نظر آنے لگا۔ ان خارجی تصورات نے سماج کی ساخت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ مختلف سوسائٹیوں اور مختلف ماحولات نے ان رومانوں کو اسی قدر قبول کیا جس قدر وہ ان کے اپنے تصورات سے مطابق ہوئے۔

ان مذاہب کی ناکامی کے بعد صرف اقتصادی اسباب ہی سماج کی بناوٹ کے ذمہ دار تھے۔ لیکن یہ سخت غیر منظم اور منتشر تھے۔ اُن کی بنیادوں پر انسانی اجتماعیت کسی بڑے حلقہ تک وسیع نہیں ہوسکتی تھی۔ اور سماج پر انفرادیت کا دباؤ تھا۔ انفرادیت ہی کا یہ اثر تھا کہ اس دور میں، رومانی شاعری جو خدا، فرشتوں، روحانی چیزوں اور حُسن ومحبت جیسے مسئلوں پر بحث کرتی تھی، کافی اثر رکھتی تھی۔ تاہم اس عہد کے ادب کو بھی ادب برائے ادب کے ذیل شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ چیزیں بھی ایک عہد کے انسانی احساسات کا پرتو ہیں۔ البتہ ہم اپنی ضروریات کے پیش نظر پرانے ادب پر یہ اعتراض کرسکتے ہیں کہ اس نے ضروری وغیر ضروری میں فرق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہرچند کہ زندگی میں رومان کا ایک درجہ ہے۔ مگر سماج کی بنیادی ضرورت، اس کے اقتصادی اسباب کی اہمیت ہے۔ زندگی پہلے زندہ رہنے کیلئے مجبور ہے۔ سوچنا اور خواہش کرنا، بعد کی منزلیں ہیں۔ لیکن پرانے ادب نے محض سوچنے اور محض خواہش کرنے کو پہلا درجہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ داخلیت پُرانی شاعری کا خاص عنصر تھی۔

اگر سماج نام ہے افراد کی اس کثیر تعداد کا جو وسیع معاشی ذرائع کو چلاکر ہماری دنیا کو آگے بڑھا رہی ہے تو ادب جو حاضر سماج کا پرتو ہے اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان ضروریات کو واضح کرے۔ اگر آج کا ادب رومانی تصورات کی تسکین کرنے پر قناعت کرلیتا ہے تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آج سے کئی صدی پیچھے لوٹ کر جاگیرداری عہد کے ادب کی نقالی کرتا ہے۔ وہ سماج کے اعلیٰ طبقے کے افراد کی رومانی خواہشوں کو پورا کرتا ہے۔ اور سماج کے نچلے طبقوں کی نمائندگی نہیں کرتا۔ حالانکہ آج ایک مجموعی سماج کی تعمیر وتشکیل کا آغاز ہوچکا ہے۔ اور ادب آنکھیں جنھیں دیکھنے کی قوت حاصل ہے، زندگی کے ان گوشوں کو نظر انداز

کرسکیں۔ جن پہلوؤں تک نظر نہیں پڑی تھی ۔ یا جو کم تھی کا ویدہ ودانستہ نکالا سکے۔

بلاشبہ وہ وقت آئیگا جب موجودہ سماج ان اقتصادی مشکلات کا حل تلاش کریگا اور اُسے موقع ملے گا کہ وہ رومانی دنیا پر بحث کرے۔ وہ پوچھے کہ خدا، عشق رہبانیت اور رُوحانی احساسات کیا قیمت رکھتے ہیں۔ اور منطقی دنیا میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ لیکن ابھی یہ وقت بہت دور ہے۔ آج ہم محض اُن موضوعات پر غور کرنے کیلئے وقت نہیں نکال سکتے۔ آج ادب میں رومانیت کا صرف اس قدر درجہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہمارے منفی احساسات کا ترجمان رہے اور بس۔

عہدِ سرمایہ داری

سرمایہ داری عہد میں اوسط طبقے کو کافی اقتدار حاصل تھا۔ یہ نچلے طبقوں کے لاکھوں انسانوں پر حکومت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ادب کو منفی احساسات ومطالبات کی تکمیل کا ذریعہ بنا دیا۔ انیسویں صدی کے شروع میں رومانی ادب کا بول بالا تھا۔ شیلی، بائرن، کیٹس، اور ورڈز ورتھ یورپ میں اور ہندوستان میں ۱۹۱۰ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک کے تمام ادبا وشعرا اسی سماجی رجحان کو ظاہر کرتے تھے۔ ادب کا یہ دور بھی ادب برائے ادب کے تحت نہیں آتا۔ اسلئے کہ سرمایہ داری دور کی ابتدا میں اقتصادی ومعاشی اسباب نے کوئی مستقل سانچہ اختیار نہیں کیا تھا۔ کہ نچلے طبقہ کے افراد سماج کی ساخت میں کوئی انقلاب لاسکتے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب یہ تھا کہ سماج اسوقت نام تھا چند افراد کے مجموعہ کا، اسے نچلے طبقوں کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے تاثرات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ انسانوں کی یہ کثیر تعداد سماج پر اپنا حق جتانے کیلئے کوئی اقدام کرسکتی تھی۔ اور کبھی اس قسم کی کوئی کوشش کی بھی گئی تو وہ کوشش بڑی طرح ناکام ہوگئی۔

پُرانی دنیا میں سماج کے اس انفرادی تخیّل کی وجہ سے ادب چند افراد کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا، اور یہ افراد اقتصادی طور پر قطعی مطمئن تھے، وہ ایسی غیر مادی خواہشوں کی تکمیل چاہتے تھے۔ لیکن اب صورت حال قطعی مختلف ہے آج کا سماج اجتماعی بندھنوں میں اسیر ہے۔ ان حالات سے ادب کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے، یہ حالات معاشری ومعاشی نظام کی تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔ جن کا پر تو اپنے پورے کمال کیساتھ [illegible] ہے۔

[illegible] ادب [illegible] ہے۔ اور وہ انہیں کے میلانات کو ظاہر کرتا ہے۔ [illegible] اوسط طبقہ کی [illegible]

داری اس حد تک بڑھ گئی۔ کہ جین کاکین نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

" عوامی شعروادب کا وجود ہی نہیں پایا جاتا۔"

کاکین کا یہ خیال غلط نہیں ہے یہ واقعہ ہے کہ جاگیرداری عہد میں عوامی ادب ایک بے معنی اصطلاح تھی لیکن بیسویں صدی میں حالات نے ایک شاندار تبدیلی پیدا کی۔ اب انسانی شعور میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اور اجتماعیت کا احساس پیدا ہوگیا ہے۔ آج اگر سماج کا کوئی حصّہ اقتصادی مشکلات کا شکار رہے تو سوسائٹی اطمینان کی زندگی بسر نہیں کرسکتی۔ چنانچہ آج سماج ہر گھڑی تباہی وبربادی کے کنارے لرز رہا ہے۔ اور وہ اتنے سخت ہچکولے کھا رہا ہے۔ کہ سوسائٹی کا کوئی بھی طبقہ واقعات سے بے توجہ ہوکر نہیں رہ سکتا، اب شاعری کو عوام کی شاعری ہوکر ترقی کرنی ہوگی۔ ورنہ وہ ختم ہوجائیگی۔ ٹالسٹائی نے اپنے مشہور نظریۂ "حسن کاری" میں اس امر پر انقلابی حیثیت سے زور دیا ہے کہ ادب وشاعری کو عام فہم ہونا چاہیئے اور انسانیت کے کم سواد اور کثیر حصّہ کو فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اس زمانہ میں ادب کا محض رومانیت میں مبتلا رہنا قطعی غیر منطقی ہے۔

رومانیت تو آج تک صرف اوسط طبقات کے ذہنی رجحانات کو ظاہر کرتی رہی ہے۔ نچلے طبقے تو سخت اقتصادی دباؤ، اور تعلیمی وجمالیاتی احساس کی کم شعوری کی وجہ سے رومان کو رومان کی طرح محسوس بھی نہیں کرسکتے۔ یا اگر کبھی رومانیت کا پر تو ان پر پڑتا بھی ہے تو ان کا رومان اقتصادی زنجیروں میں الجھ کر رہ جاتا ہے! اس لئے اگر آج کا سرمایۂ ادب فقط رومانیت کو قرار دیا جائیگا تو ادب تمام طبقات کی نمائندگی کرنے میں قطعی ناکام رہیگا!

بلاشبہ، جب تک انسانی زندگی میں صنفی رجحانات موجود ہیں، رومان اک حقیقت ہے۔ اور ہم مسائل کے خشک عناصر کو محسوس کرنے کے باوجود اسکے اثر سے انکار نہیں کرسکتے۔ پھر غلط یا صحیح اوسط اور اعلیٰ طبقہ بہرحال ہمارے سماج کے حصّے ہیں۔ اس لئے ادب کا فرض ہے کہ وہ اُن کے حسّیات ومیلانات کی ترجمانی بھی کرے اور بہتر ترجمان بنے۔ ہمیں سچّے دعویدار کو ان نفسیاتی رشتوں کو نہیں توڑنا چاہیئے۔ جو حقائق دنیا سے الگ ہوکر تخیّل اور حقیقت کو جوڑتے ہیں۔

جہاں تک زندگی کے کاہل عناصر کا تعلق ہے۔ وہ سماج سے رفتہ رفتہ گھٹتے اور مٹتے جائیں گے۔ اور ادب میں اُن کی نمائندگی خود بخود مدّھم پڑتی جائیگی۔ آگے چل کر وقت خود مطالبہ کریگا۔ کہ ادب کی حدود سے اُن طبقوں کے احساسات کو خارج کردیا جائے۔ [illegible] وقت ادب [illegible]

ادب پر جب اس حیثیت سے غور کیا جائے کہ وہ بہرحال کسی نہ کسی طبقے کے ذہنی میلانات کی تشریح کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ سوسائٹی نے کسی مخصوص عہد میں سوچنے کی کتنی مخصوص لائنیں پیدا کی تھیں۔ تو ہمیں اسکو من حیث المجموع ادب برائے زندگی کی صنف میں لانا پڑے گا۔ مگر جاگیرداری عہد کا ادب عام طور پر خیالی حقیقتوں کو زیر بحث لاتا تھا۔ اس لئے اس کے اس مخصوص رجحان کو بلا شک محدود ہے۔ ادب برائے ادب کی صنف میں شمار کرنا لازمی ہے؛

یہ ادب، محاسنِ الفاظ، جدتِ کلام، دروبست، بندشِ الفاظ کی ہم آہنگی اور موسیقی پر زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کی سچی حقیقتوں سے بحث کرنا کوئی ضروری فریضہ نہیں۔ وہ کبھی کبھی کائنات کے اچنبھوں کی تشریح کرنا چاہتا ہے۔ مگر سبب اور اسباب کی پیچیدہ کڑیوں میں پھنس کر مجبوراً تخیلاتی دنیا میں بھٹکنے لگتا ہے۔ عبوری دوروں کا تمام ادب انھیں ناکام کوششوں کی ایک طویل داستان ہے۔

حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع

ہمارے عہد کی ادبی کشمکش سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذریعوں نے پرانے سماج پر کتنے غیر متوازن اثرات ڈالے۔ کبھی حیاتیاتی اسباب افراد کو سماج کے معیار سے آگے لیجانے کا باعث ہوتے تھے۔ اور کبھی اقتصادی ذریعے سماج کو افراد کے معینہ ارتقائے ذہنی سے صدیوں دور لیجانیکی کوشش کرتے تھے!

۲۸

حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع کے اسی عدم توازن یا افراد اور جماعت کی اسی غیر متناسب ذہنی ترقی، باہمی نصیحت اور انفعالیت نے غیر مادّی فلسفہ کو پیدا کیا۔ اور پروان بڑھایا۔ کبھی ایک شاعر و فلسفی اپنے عہد کے فکری خطوط سے کئی صدی آگے بڑھ کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن جہاں تک اس کے عہد کا سماج اچکا ہے۔ اسی قدر اُس کے خیالات میں حقیقت پسندی ہوتی تھی۔ لیکن اس عہد کے عام معیار سے جس قدر وہ آگے کی طرف پرواز کرتا تھا۔ اُس کے نظریوں میں خیال پسندی بڑھتی جاتی تھی؛

ارسطو، روسو اور مارکس نے مستقبل کیلئے چند حقیقی اور بنیادی خیالات پیش کئے لیکن یہ اپنے نظریوں میں اس قدر کامیاب نہیں۔ جس قدر اُن کے عہد کا عام ذہنی معیار اُن کا ساتھ دیتا ہے، جیسے ہی یہ مستقبل کی گہری اندھیاریوں میں زیادہ داخل ہونیکی کوشش کرتے ہیں۔ عقلیت اور منطق ان کا ساتھ چھوڑتی جاتی ہے۔ حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع کی بے آہنگی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ایسے بلند دماغ افراد کا وجود ملتا ہے جو اگر آج ہوتے تو ان کی ذہنی صلاحیتیں موجودہ ترقی یافتہ دماغ سے ہم آہنگ اور مسلح ہوتیں۔ اس کے برعکس بیسویں صدی کے سماج کے کئی ٹکڑے اتنے غیر ترقی یافتہ ہیں کہ چار ہزار سال قبل کی سوسائٹی کے حصے معلوم ہوتے ہیں!؛

درمیانی عہد کی اس ذہنی کیفیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عہد جاگیرداری کے مفکر اور شاعر رجعت پسند نہیں تھے۔ ان کی نظر مستقبل پر تھی۔ مگر فکری تہیدستی کی بنا پر مجبور ہوتے تھے۔ اس مجبوری میں خیالی دنیا ہی ان کا مامن ہوسکتی تھی۔

پرانے ادب اور شاعری میں اخلاقی، صوفیانہ، اور مذہبی افکار کی کثرت بلاغت، فصاحت لفظی گورکھ دھندوں اور بندش کی چستیوں کا وجود اسی غیر متناسب صورتِ حال کی چغلی کھاتا ہے؛

لیکن بہرحال پرانے سماج کے فکری معیاروں کا اندازہ حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع کی ہم آہنگی اور ناآہنگی کے بدلتے ہوئے تناسب کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے؛

سماج کے خالق اور نشوونما دینے والے عناصر

سماج کو اقتصادی ذرائع پیدا کرتے اور بڑھاتے ہیں یا حیاتیاتی اسباب اس کی ترقی اور نشوونما کا اصل سبب ہیں؟ یہ سوال اپنی جگہ ایک اہم سوال ہے اشتراکی ادبا کا دعویٰ ہے کہ سماج کے تمام تغیرات محض اقتصادی اسباب کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ غیر اشتراکی ادیب سماج کی تبدیلی اور تغیر کو حیاتیاتی اسباب کا نتیجہ خیال کرتے ہیں؛ بقائے اصلح کے اصول کے ماتحت سماج ارتقا حاصل کرتا ہے اور اقتصادی ذرائع سماج پر اثر کرنے میں بالکل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ سماجی ترقی کو محض انفرادی کوششوں کا رہینِ وجود خیال کرتے ہیں؛

بلاشبہ اشتراکی ادبا کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، فقط اقتصادی ذرائع ہی سماج کی نشوونما اور ترقی کا ذریعہ نہیں، مگر اس کے ساتھ ہی غیر اشتراکی ادیبوں کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ سماج پر فقط حیاتیاتی اسباب ہی موثر ہوتے ہیں۔ بے شک یہ ایک واقعاتی چیز ہے۔ کہ حیاتیاتی اسباب سماج پر اثر ڈالنے میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اقتصادی ذرائع ثانوی، مگر جہاں تک سماج کو بنانے اور آگے بڑھانے کا تعلق ہے ان دونوں کی حیثیت برابر ہے۔

یہ دونوں اسباب جس قدر قریب ہوتے ہیں اتنی ہی جماعت ترقی کرتی ہے۔

یا یوں کہیے کہ یہ جتنی تیزی سے اثر ڈالتے ہیں اسی تناسب سے یہ قریب ہوتے ہیں، عہد
جاگیرداری میں اُن کی بے آہنگی جتنی وسیع تھی اسی قدر انفرادیت کا زور تھا، لیکن ان
کی تیز تر اثر انگیزی کے نتیجے میں سرمایہ داری میں اجتماعیت پیدا ہوتی چلی گئی۔ اور آخر
اجتماعی تصور انفرادیت پر غالب آ گیا۔ گو یہ زمانہ اجتماعیت کے غلبہ کا زمانہ ہے تاہم
اب بھی انفرادیت فیسزم اور نازی ازم کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اقتصادی
اسباب نے اسے اتنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ انفرادیت کے محدود معنی میں اجتماعیت سے کچھ
نہ کچھ مستعار کیفیت لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔ مستقبل میں انفرادیت قطعی طور پر ختم
ہو جائیگی۔ اس کے فنا کے بعد حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع میں پوری
ہم آہنگی پیدا ہو جائیگی۔

اقتصادی ذرائع سماج کے عقلی، فکری اور ذہنی اداروں کی ترقی کو
بتاتے ہیں۔ یعنی افراد کی عقلی سطح کسی عہد کے اقتصادی ذرائع ہی ہوتے ہیں۔ لہذا
ادب میں بھی واقعیت اور صداقت جو کسی عہد کے ذہنی و فکری ارتقا کا پتہ دیتی
ہے۔ اسی تناسب سے پیدا ہوتی ہے۔ جو حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع کی ہم
آہنگی کے درمیان پایا جاتا ہے۔

جاگیرداری زمانہ میں یہ ہم آہنگی بہت کم تھی، اس لئے ادب میں واقعیت
نسبتاً کم درجہ پر پائی جاتی تھی۔ مگر عہد سرمایہ داری میں یہ دونوں تاثیری عناصر قریب
تر ہو گئے۔ اس لئے ادب میں واقعیت اور حقیقت نگاری بھی بڑھ گئی۔

ادب کی تقسیم

اگر ادب برائے زندگی کی روح واقعیت نگاری ہے تو فقط نئے ادب
کو ادب برائے زندگی کی تفسیر ماننا صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ پرانے ادب میں بھی واقعہ
نگاری اور مرقع نگاری ایک اہم عنصر کی حیثیت سے تسلیم کی گئی ہے۔ قدیم
ہندوستان، مصر، بابل اور عرب کی شاعری میں اس کی ان گنت مثالیں موجود
ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر گارفیلڈ نئے اور پرانے ادب کی تقسیم کو صحیح نہیں مانتا۔
اس کے نزدیک قدیم و جدید ادب کی رُوح ایک ہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ،

"جو شخص ادب کی حقیقی روح سمجھ سکتا ہے اُسے چاہیئے کہ
وہ کسی خاص دور کے ادیبوں کو نہ چنے بلکہ ادب کے سرچشمہ
تک پہنچے اور اس ہلکی سی لہر کا اندازہ لگائے جو زمانے
کے [illegible] میں ظاہر ہوتی ہے اور خیال
کے سمندر میں بتدریج وسیع اور گہری ہوتی جاتی ہے۔۔۔
جدید زمانے کے لوگ اسی قسم کی لہروں کی تلاش میں ہیں"

گارفیلڈ کے نزدیک ادب کی تقسیم قدیم و جدید کے لحاظ سے نہیں کی جا سکتی
اس کے نزدیک ادب اک ہلکی سی لہر کا نام ہے۔ جو ہر دور میں یکساں پائی جاتی ہے
یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اگر ادب کی رُوح، واقعیت نگاری، یا ارسطو کے الفاظ
میں فطرت کی نقالی تسلیم کر لی جائے (آرٹ فطرت کی نقالی کا نام ہے۔ (ارسطو)
یا افلاطون کے قول پر کہ "آرٹ چند سایوں کا نام ہے" سر تسلیم خم کر دیا جائے؛ تو
اس خیالی، ذہنی، غیر حقیقی ادب کی تشریح کیا کی جائے گی، جو پرانے زمانے کی
اک ممتاز خصوصیت رہا ہے اور جس کا ہلکا سا پرتو ہم آج بھی اپنے ادب میں پاتے ہیں؟
جہاں تک پرانے ادب کی تخیلیت اور خالص تصوریت کا تعلق ہے۔
اتنا ضرور صحیح ہے کہ قدیم ادب خیالی نتیجے نکالتا تھا لیکن اس کے تصورات کی کچھ
استعاراتی بنیادیں تو بہر حال ضرور تھیں۔

"طلسم ہوش رُبا" کے جنوں اور بھوتوں کا پایا جانا ممکن نہ سہی۔ لیکن خود ک
انسانوں کا پایا جانا اور ان اجزار کا پایا جانا بالکل یقینی ہے۔ جن کے مجموعہ کو ایک
خاص شکل میں پیش کرنے سے ان کے مجسمہ کی تصویر ہمارے ذہن میں ابھر جاتی ہے۔
حقیقتاً ارسطو کا یہ کہنا کہ آرٹ فطرت کی نقالی کا نام ہے۔ اس منطقی
نظریہ سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا سمجھتا، بولتا اور غور کرتا ہے وہ
لازمی طور پر خارجی مادی اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ کہ انسان غیر مادی
چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور کوئی بھی خیالی چیز جہاں تک لفظ کے خیالی
حقیقی معنی کا تعلق ہے۔ ذہن انسانی میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ لہذا
آرٹ بھی لازماً فطرت اور اس کے تغیرات کی ایسی نقل کا نام ہے جس سے ایک
خاص جمالیاتی اثر پڑے، لیکن فطرت کی نقالی کا یہی طریقہ نئے اور پرانے آرٹ
یا ادب میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس لئے یہ دو مختلف چیزیں ہو جاتی ہیں۔

نیا ادب

ادب برائے ادب۔ کی تقسیم میں اعتقاد رکھنے والے اور ادب برائے
ادب کے نظریہ کو تسلیم کرنیوالوں کا بیان ہے۔ کہ ادب کی تقسیم نئے اور پرانے
ادب کے دو ٹکڑوں میں نہیں کی جا سکتی۔ ادب ایک ہی ہے اور وہ ایک ہی رہنا
چاہیئے۔ ان کے نزدیک گارفیلڈ کے بیان کے مطابق ادب ایک ہلکی سی لہر ہے

جو ملنے کے بہتے ہوئے دریا کیساتھ بہہ رہی ہو۔

یہ صحیح ہے کہ ادب ایک ہلکی سی لہر ہے۔ لیکن وہ گار فیلڈ ہی کے قول کے مطابق خیال کے سمندر میں بتدریج وسیع اور گہری بھی ہوتی جاتی ہے۔ فطرت کی نقالی یا۔ ایک ہلکی سی لہر پرانے ادب کی بھی روح تھی اور نئے ادب کی بھی روح ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ نئے ادب نے فطرت کی نقالی میں زیادہ سے زیادہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ نیا ادب کوشش کرتا ہے کہ وہ نفسیات کی باریک اور نازک گہرائیوں میں اُتر جائے۔ اور فطرت کے رازِ لطیف اچھوتے طرز سے بیان کرے کہ ہر جذبہ، واقعہ اور واردات کی تصویر نگاہ و خیال کے سامنے کھینچ جائے۔ یہ کچھ آسان نہیں۔ فطرت کے پُرپیچ دقیق اور نازک جزئیات کا احاطہ اور انہیں اُن کے صحیح اور معینہ مقامات پر رکھ کر کامل درست اور فطری نتیجے نکالنا نہایت مشکل فریضہ ہے۔ لیکن یہی وہ فریضہ ہے جو آرٹسٹ کی امتیازی خصوصیت ہے۔

نئے اور پُرانے ادب کا ایک اہم امتیاز۔ فنکار اور غیر فن کار کے مابین ذہنی معاہدہ کی تنسیخ ہے۔ نئے ادب نے اس معاہدہ کو چاک کر دیا ہے۔

۳۰

معاہدۂ ذہنی

قدیم فنکار اپنے ادّعائے فن کاری کی بنا پر عوام سے چند مراعات کا متمنی تھا؛ وہ جانتا تھا کہ زندگی کے جن جمالیاتی گوشوں کو وہ نمایاں کر سکتا ہے عوام کی نگاہیں ان گوشوں میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ وہ امید کرتا تھا کہ اُسے اپنے آرٹ کی اساس کو ایک متصورہ اور ممکن واقعہ، شئے یا حادثہ پر قائم کرنیکی اجازت دی جائے گی؛ خواہ وہ واقعہ یا حادثہ حقیقتاً پیش نہ آیا ہو۔

ایک مصور کسی اُس بادشاہ۔ دیوی یا دیوتا کی تصویر بناتا تھا جس کا موجود ہونا قدیم زمانہ میں ممکن ہے۔ گو وہ حقیقتاً موجود نہ رہا ہو۔ عوام آرٹ کی اہمیت کے پیشِ نظر فنکار کو۔ ممکنات۔ کی یہ مراعات دیدیتے تھے۔ اس طرح فنکار اور غیر فنکار کے مابین یہ ذہنی معاہدہ قائم تھا کہ وہ فنکار کو چند مراعات دینگے اور کسی واقعہ کی بنیادی سچائی سے متعلق اپنے ذہن میں پیدا ہونیوالے منطقی سوالات کو دبا دیں گے۔ جس کے جواب میں۔ فنکار۔ اُن کے جمالیاتی اور رومانی حِس کی تسکین کا سامان مہیا کرے گا۔

ایک یونانی مصور اس تصور کیساتھ کہ۔ ایک حسین دیوی کا وجود ممکن ہے اُس کی تصویر اس طرح تیار کرنیکا مجاز تھا۔ کہ اس میں حُسن سے متعلق ہر ممکن چیز کی رنگ آمیزی کر دے۔ اسی طرح انیسویں صدی میں یورپ کا ایک افسانہ نگار اس امکان کو فرض کرکے کہ ایک۔ نوجوان مرد اور نوجوان لڑکی کے درمیان محبت ہی ممکن ہو۔ اپنے پورے افسانہ کی بنیاد ڈالدیتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس معاہدۂ ذہنی کی رُو سے مذکورہ مراعات دی جاسکتی ہیں۔ لیکن پرانے ادب اور آرٹ نے اس معاہدہ کی آڑ میں اتنی غیر منطقی اور بے ربط چیزیں بیان کی ہیں کہ وہ تمام محض خیالی دنیا کی پرچھائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن عوام کے بڑھتے ہوئے منطقی مطالبوں کیوجہ سے یہ معاہدہ کمزور ہوتا چلا گیا اور فنکار سے وہ بہت سی مراعات چھین لی گئیں جو پُرانے ادب نے اسے دیدی تھیں۔ نیا ادب فنکار سے یہ جائز مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فرضیات سے نکل کر نفسیات کو اختیار کرے۔ آخر وہ کیوں کچھ ممکن الوقوع چیزیں فرض کرتا ہے۔ جبکہ ہماری زندگی میں اَن گنت یقین الوقوع چیزیں پائی جاتی ہیں۔

بلاشبہ اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ پُرانے ماہرینِ فن نے ان مراعات سے جائز فائدے اٹھائے۔ اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فن کے بہترین نمونہ پیش کئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر وہ اس معاہدہ سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے چند جاندار اور ٹھوس حقیقتوں پر اپنے آرٹ کی بنیاد رکھتے تو اس میں اتنی تیز تاثیر پیدا ہو جاتی جو مصنوعی حقیقتوں کی ملمع کاری سے ممکن نہیں۔ اس لئے نیا ادب ایک شاعر سے یہ اُمید کرتا ہے کہ اگر وہ شراب کے اثرات کا خود تجربہ نہیں اٹھا سکا تو صرف اس لئے کہ اس کی معلومات میں وہ اثرات آچکے ہیں۔ اُسے ان کو بیان کرنیکی اجازت نہیں ہے۔ یا تو وہ خود تجربہ حاصل کرے یا وہ اُن چیزوں کو بیان کرے جنکا تجربہ انھیں حاصل ہو۔

بالکل اسی طرح ایک بادہ کش شاعر سے نئے ادب کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ صرف اس لئے کہ عوام کی رومانی حِس کو متحرک کرے کیوں شرابیات و خمریات میں خود کو محدود کئے لیتا ہے جبکہ عوام کے جمالیاتی احساسات کو مشتعل کرنے کے لئے زندگی کی ان چند در چند حقیقتوں کو بیان کرنا زیادہ بہتر ہے۔ جو آئے دن ہمارے تجربہ میں آتی ہیں۔ اور یہ بالکل مناسب نہیں کہ اس رعایت کو لیتے ہوئے کہ ایک مخمور شرابی کی کیفیات کچھ ایسی حقیقتیں ہیں جو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بہرحال ممتاز ہیں۔ اور اس لئے کہ وہ ممتاز ہیں ان کی نفسیات کا اظہار ہمارے مجوزہ پسند جذبہ بنکر بہت اپیل کرے گا۔ لہذا انھیں بہتر طور پر بیان کرنا شاعر کا ایک ارشتہ۔ (بقیہ مضمون صفحہ ۵ پر)

دُکھ

ایشیا

دوسرا باب

فسانے و ڈرامے

بابتہ مارچ ۱۹۲۳ء

ہاجرہ بیگم

بچّے کی ذہنیت اور کہانی

بچّے کی زندگی میں کہانی کی بڑی اہمیت ہے۔ سو لئے اُن مظلوم بچّوں کے جن کے پلنے کارخانے ہوتے ہیں اور جن کی مائیں مشین کے شکنجے میں خود مشین بن جاتی ہیں۔ کون ایسا بچّہ ہوگا جو کہانی کے نام سے واقف نہ ہو۔ کہانی کی دلچسپی سے تو انکار کسی کو نہیں لیکن کم لوگ ایسے ہیں جو اس بات پر غور کرتے ہیں کہانی کیوں ہر بچّے کو بھاتی ہے اور کس طرح ہم اُن کی اس دلچسپی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کہانی شروع ہوئی جب سے کہ انسان کی نسل شروع ہوئی۔ زبان بنی اور سماج کے قاعدے قانون مقرر ہوئے اور اسکا ثبوت خود ہمیں کہانی سے ملتا ہے کیونکہ ادب کی اس شاخ سے شوق رکھنے والوں نے جب دنیا بھر کی کہانیاں اکٹھا کیں تو ان کو چند کہانیوں میں بعض باتیں عام معلوم ہوئیں۔ مثلاً اکثر قوموں کی کہانیوں میں اسی طرح کی باتیں عام تھیں جیسے کہ انسان کا جانور کی شکل میں تبدیل ہو جانا۔ کسی خوفناک چیز کا دوسروں کو نگل لینا اور پھر ان چیزوں کا جانور کے پیٹ سے برآمد ہونا۔ جان کا کسی چیز (ڈبیہ یا طوطے میں) بند ہونا۔ آسمان پر گھوڑے کھٹولے یا قالین کی مدد سے چڑھنا۔ کسی خاص ٹوٹکے کی مدد سے مرے انسان کا جی اٹھنا وغیرہ سا اور زیادہ چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ان قوموں کی کہانیوں میں عام تھیں جو کہ ایک عام تمدنی دور سے گذر چکی ہوں۔ مثلاً وہ تمام قومیں جو کسی نہ کسی وقت قدرت کی طاقتوں کی پجاری رہ چکی ہیں (گو آج نہ ہوں) اپنی کہانیوں میں آدمی کیساتھ جنوں اور دیوؤں کا بیان کرینگی۔ اسی طرح جن جن قوموں میں یہ عقیدہ رائج تھا کہ سورج ایک لمبی مسافت طے کرکے شام کو جب مغرب میں پہنچتا ہے تو اندھیرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور پھر صبح کو نکل آتا ہے۔ ان سب قوموں میں آپ ایک ہی کہانی پائیں گے کہ کسی خوبصورت اور چیز کو کوئی خوفناک جانور ہڑپ کرجاتا ہے اور پھر وہ پیٹ چاک کرکے باہر نکل آتی ہے۔ یورپ کے ملکوں، انگلستان، سکینڈینیویا۔ فرانس وغیرہ میں ایک سُرخ پوش لڑکی کو بھیڑیا نگلتا ہے۔ (Red Ridinghood) امریکہ کے سُرخ انڈین میں ایک بہادر کو زچھ کھا جاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں مور کو (جو سورج کی نہایت خوبصورت شبیہ ہے) گیدڑ نگل جاتا ہے۔

اسی طرح آپ تمام آریہ قوموں میں خواہ وہ یورپ کی ہوں یا ایشیا کی سات بھائیوں یا سات بہنوں کی کہانیاں عام پائیں گے۔ ان کہانیوں میں ہمیشہ سب سے چھوٹا بچّہ ہوشیار اور خوش قسمت ہوتا ہے۔ اور گو کئی طرح کی مشکلات کا سامنا اسے کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کوئی پہیلی بوجھنی، کبھی بیوی تلاش کرنی لیکن وہی فتحیاب ہوتا ہے۔ یہ کہانی اس لئے آریہ قوموں میں پائی جاتی ہے کہ آریہ ایک زمانہ میں چھوٹے بیٹے کو ہی ماں باپ کا وارث قرار دیتے تھے۔ اسلئے کہ بڑی اولاد جوان ہو کر خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ لیکن سب سے چھوٹا کمزور اور کم عمر رہ جاتا ہے لیکن جب بڑے بیٹے کو وارث بنایا جانے لگا تو ضرورت اس بات کی ہوئی کہ چھوٹے بچّے کی وراثت اسکو عقلمند کہہ کر مناسب ثابت کی جائے۔

جان کا کسی ڈبیہ یا جانور میں محفوظ ہو جانا غیر آریہ قوموں کا عقیدہ تھا۔ چنانچہ آج بھی افریقہ کی حبشی قومیں اس پر یقین رکھتی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا کوئی خاص ٹوٹم مقرر ہے اور اسی چیز کی حفاظت کرتے اور دشمن سے اس کو بچاتے ہیں اور اس کا اثر یہاں تک سُنا گیا ہے کہ اگر کوئی دشمن کسی کے ٹوٹم کو توڑ ڈالے تو وہ شخص واقعی دہشت سے مر جاتا ہے۔

غرضکہ کہانی کی ہر ایک بات گو شروع میں بے سر و پا معلوم ہو چھان بین کرنے پر صاف ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک نقشہ تیار کیا جائے تو کہانی کو خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصّے سے آئی ہو اُس کے مرکزی پلاٹ کی مناسبت سے ایک خاص خانہ میں درج کر سکتے ہیں۔ اور اُن کے ایسے گروپ بنا سکتے ہیں جیسے کہ جانوروں کی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں، سوتیلی ماں کی کہانیاں

سات بھائیوں یا تین بھائیوں کی کہانیاں اور دہرانے والی کہانیاں۔

یہ دہرانے والی کہانیاں نہایت دلچسپ ہیں۔ تقریباً سب قوموں میں عام ہیں اور مختلف ناموں کی عجیب فہرستیں ان میں ہوتی ہیں۔ جن کا آپس میں کچھ زیادہ رشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً ایک پرانی کہانی ہے۔ ایک مکھی کی جو اپنا نام بھول گئی۔ اس نے گائے سے اپنا نام پوچھا۔ گائے نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ بچھڑے سے پوچھو، مکھی نے کہا گائے۔ گائے کا بچھڑا۔ اپنا نام بتا۔ بچھڑے نے کہا "گائے گائے کا بچھڑا۔ بچھڑے کا چرواہا میرا نام بتا۔ اسی طرح ہوتے ہوتے وہ مچھیرے کے پاس جاتی ہے اور کہتی ہے۔ گائے گائے کا بچھڑا۔ بچھڑے کا چرواہا۔ چرواہے کا سونٹا سونٹے کا پیڑ۔ پیڑ کی چڑیاں۔ چڑیوں کی ندی۔ ندی کی مچھلیاں۔ مچھلیوں کے مچھیرے میرا نام بتا۔ یا ایسی کہانیاں بھی ہوتی ہیں جن میں صرف چند فقرے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

کہانی سنانے کو تو ہر کوئی سناتا ہے لیکن سنانے کا اصلی ڈھب کم کو آتا ہے۔ پہلے زمانہ میں اس فن کے ماہر پیشہ ور داستان گو ہوتے تھے۔ لیکن وہ داستان گو بڑے آدمیوں کو قصہ سنانے کیلئے موزوں تھے۔ کیونکہ اُن کی پیچیدہ اور رنگین داستانیں دراصل اس فن کی یادگار تھیں۔ جس کی مدد سے تحریر کی ایجاد سے پہلے لوگ اپنی روایات، مذہبی قاعدوں اور سماج کے قوانین کو یاد رکھتے تھے۔ یہاں تو ہمارا مقصد بچوں کی کہانیوں سے ہے۔

بچہ کی پہلی کہانی وہی دہرانے والی کہانی ہوتی ہے۔ اس کی پلاٹ نہایت سادہ ہوتی ہے اور چند فقرہ بار بار دہرا کر نئے نام کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں۔ مثلاً خالہ بلی حج کو چلیں راستہ میں بلی بیٹا اس نے ساتھ چلنے کو کہا اور پوچھا خالہ بلی تم ہمیں کھاؤ گی تو نہیں۔ خالہ بلی نے کہا "تیرے کھاتے کرتا کھاؤں، تیرے کھاتے عصا کھاؤں۔ تیرے کھاتے تسبیح کھاؤں۔ تجھے کیوں کھانے لگی تھی۔ آگے ملا طوطا۔ طوطے نے بھی یہی سوال کیا اور وہی جواب پایا اسی طرح کبوتر مرغا چوہا وغیرہ سب ملتے ہیں اور ایک جواب پاتے ہیں۔ یہ کہانیاں اتنی سادہ ہوتی ہیں کہ دو سال کے بچے بھی انھیں سمجھ لیتے ہیں۔ اور بار بار دہرانے سے یاد کر لیتے ہیں۔ ان کا خاص مقصد ہوتا ہے سنے نام سیکھنا اور حافظہ بڑھانا ساتھ ہی اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ بچہ سنکر اچاٹ نہیں ہوتا۔

تین چار سال کی عمر میں ذرا لمبی کہانی جسمیں کئی ایک وارداتیں ہوں سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ جیسے ایک تھی چڑیا۔ ایک تھا چڑا۔ چڑیا لائی دال کا دانہ چڑا لایا چاول کا دانہ۔ دونوں نے ملکر کھچڑی پکائی... یا ایک کوا تھا ایک فاختہ تھی۔ کوے نے نمک کا گھر بنایا۔ فاختہ نے موم کا "وغیرہ۔ ان سب کہانیوں میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً چڑے چڑیا کی کہانی میں چڑیا کا جھوٹ بولنا اور اُس کی سزا پانا۔ کوے اور فاختہ کی کہانی میں ہمسایہ کی مدد سے انکار اور اس کا برا نتیجہ۔ اس طرح سے بچے آپس کے برتاؤ کے قاعدے سیکھتا ہے اور اس کی (Socal Sense)کی بنیاد پڑتی ہے۔ لیکن یہ سب اس خوبی سے بات میں بات کے طور پر وہ سنتا ہے کہ نصیحت کے طور پر اسکو بار خاطر نہیں معلوم ہوتا۔

پانچ چھ سال کی عمر میں بچہ کی سمجھ اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ جان جاتا ہے کہ انسان حیوان اور اُس کے گرد و نواح کی چیزوں کی عام طاقتیں محدود ہیں نہ گائے بات کرتی ہے نہ چڑیا ہنڈیا پکاتی ہے۔ لہذا اُس کے تخیل کو اب ضرورت ہوتی ہے۔ پریوں اور دوسری غیر انسانی طاقتوں کی۔ اب اَن ہونی بات بھی جادو کے زور سے ہو جاتی ہے۔ لڑکی ندی بن جاتی ہے۔ شہزادہ پنکھا جھل کر اوجھل ہو جاتا ہے۔ پتھر پانی چھڑکنے سے انسان ہو جاتا ہے۔ وغیرہ

یہ غیر محدود فضا بچے کے پہلے خیالات کیلئے ضروری ہے۔ اور اس آزادی میں وہ بہت بلندیوں کو پہنچتا ہے۔ "یوں ہو تو کیا ہو"

شاید یوں بھی ہو جائے "مزہ ہو جو یوں ہو۔ یہ اُس کے دماغی رجحانات ہوتے ہیں اور اُن کی تکمیل میں پریوں کی کہانیوں سے مدد ملتی ہے۔ ان کہانیوں میں بھی جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ کچھ قاعدہ قانون ضرور ہوتے ہیں۔ مثلاً المیہ یعنی ٹریجڈی نہیں ہوتیں۔ بچھڑے ملتے ہیں۔ مشکلات حل ہوتی ہیں۔ اور دُکھ کے بعد سُکھ ہوتا ہے اور ہونا بھی ایسا چاہیئے۔ بچہ قدرتی طور پر [illegible] ہوتا ہے۔ اس کے حوصلے بلند اور فطرت بشاش ہوتی ہے۔ ان کہانیوں سے بچے کو دنیا کے بہت سے نئے اور پرانے قاعدوں قرینوں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ غریبی امیری کا فرق۔ راجہ کی مطلق العنانی۔ ماں کی ممتا۔ سوتیا ڈاہ۔ مرد عورت کی محبت۔ شادی کا رواج۔ موت کا تذکرہ۔ غرضکہ کیا کچھ نہیں ہوتا۔ اور سننے والا کی دنیا اب بجائے گھر کی چاردیواری کے شہروں۔ بیابانوں اور پرستانوں تک وسیع ہو جاتی ہے۔

لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یعنی وہ جبکہ بچہ ہر چیز کو پرکھنا۔ جانچنا۔ اور آزمانا چاہتا ہے۔ اب اس کے لئے اڑان کھٹولے

کاذکر کافی نہیں۔ وہ اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر سمرقند جانا چاہتا ہے۔ جادو کی چھڑی کرہاتھ سے چھونا چاہتا ہے اور جب یہ طلسماتی دنیا اس کے گرفت میں نہیں آتی تو اس کے وجود پر بھی اس کو کچھ شک ہونے لگتا ہے۔ اور اب اس کو اُس جیسے بچوں کی اور انسانوں کی کہانیاں زیادہ پسند آتی ہیں۔ بہادری کے قصے۔ سیاحت نامہ رستم اور سہراب۔ سندباد جہازی۔ گلور صاحب کی سیاحت وغیرہ اس کو زیادہ بھاتے ہیں۔ اور دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ کہانی کی اوّل منزل کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

یہ تو موٹے طور پر ایک عام بچے کی دماغی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن سب بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور جو بچے کہ عام بچوں سے ممتاز ہوتے ہیں اُن کے لئے خاص طور پر سوچنا پڑتا ہے کہ اُن کو کیسی کہانی سنائیں یا پڑھنے کو دیں۔ مثلاً ایک بچہ ہوتا ہے جس کو انگریز سائیکولیجسٹ (Considerable Type) کہتے ہیں۔ یہ بچہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں سست۔ ڈرپوک۔ بے وقوف اور کھویا ہوا رہتا ہے۔ لیکن اپنے خیالات کی دنیا میں وہ ایک نئی زندگی بسر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ دراصل شاہزادہ یا شاہزادی یا کوئی اور پوشیدہ شاندار ہستی ہے۔ ایسا بچہ کسی کھلونے یا گڑیا کو نہ چھونا چاہتا ہے۔ کہانی خاص طور پر ایسی جس میں مظلوم بچہ آخر میں شاہزادہ یا پری بن جاتا ہے۔ نہایت شوق سے سُنتا ہے۔ لیکن ایسے بچے کو بڑی عمر تک بھی کہانیاں سُنانا اُس کے حق میں ظلم کرنا ہے۔ ہم کہانی کے ذریعہ اسکی ذہنیت پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس کو اپنے آپ پر بھروسہ کرانے کیلئے ہم اُس کو اُس جیسے چھوٹے بچوں کی بہادری کی داستانیں سُنا سکتے ہیں۔ اور بجائے جنوں اور پریوں کے قصوں سے اُس کے دماغ کو بھر دینے کے سائنس کے سچے کرشمے و سیاحت کے عجیب عجیب واقعات اُس کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اور اس طرح مادّی دُنیا میں دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک ٹائپ ہوتا ہے۔ نہایت ہی بے درد بچے کا جو ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا چھوٹے بچوں کو مارتا اور جانوروں کو ستاتا ہے۔ ایسے بچوں کو چوروں اور ڈاکوؤں کے قتل اور غارت گری کے قصے سنانا ان کو اور خونخوار بناتا ہے۔

بجائے اس کے اگر انھیں جانوروں کے قصے جن میں اُن کی حیرت انگیز زندگی کی داستانیں ہوں۔ یا قربانی اور سچی بہادری کی روایات سُنائیں تو یقیناً اُن کی ذہنیت تبدیل ہونے میں مدد ملیگی۔

غرضکہ ہر بچے کی طبیعت کی مناسبت سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کونسی کہانی اس کے دل پر بڑا اثر ڈالے گی۔ علاوہ اس کے چند ایسی چیزیں ہیں جو کہ بچوں کی کہانیوں میں کبھی بھی نہ آنا چاہئیں۔ مثلاً موت کا خوفناک تذکرہ۔ یا دہشت دلانے والی چیزوں کا ذکر۔ یا انسان کے کسی فرقہ یا گروہ سے نفرت اور حقارت کا سبق دہشت۔ نفرت اور حقارت یہ سب ایسے جذبات ہیں جن کا بچے کے دماغ پر بہت بُرا اور گہرا اثر پڑتا ہے۔



طاہرہ دیوی شیرازی

بازگشت

وہ مصوّر تھا۔ ایک باکمال مصوّر

مختلف رنگوں کے مناسب امتزاج سے جب وہ اپنے شاعرانہ دماغ کے تخلیق کردہ ذہنی پیکر صفحۂ قرطاس پر تکمیلِ فن کے ساتھ پیش کر چکتا۔ تو بسا اوقات خود اُسے مغالطہ ہو جاتا۔ کہ شاید وہ ذی حیات ہیں۔ اور اگر کوئی حسین دوشیزہ اُن سے گفتگو کرنے لگے، تو جواب دینے کی غرض سے لب کشائی کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن وہ اپنے اس ذہنی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی جرأت کبھی اپنے دل میں پیدا نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ امر اسے کبھی کسی عنوان گوارا نہیں تھا۔ کہ انھیں صحیح معنوں میں ذی حیات بنا کر سریع الزوال اور فانی بنا دیا جائے۔

زندگی اور موت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

۳

مسلک کے اعتبار سے وہ اس عقیدے کا زبردست حامی تھا۔ کہ کوئی فنِ لطیف بغیر عریانی کے معراجِ کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بشرطیکہ عریانی صرف اس حد تک روا رکھی جائے۔ کہ وہ برہنگی کے ضمن میں نہ آ سکے۔ گویا جس طرح سنجیدہ فطرتیں اظہارِ مسرت کو محض تبسم تک محدود رکھتی ہیں نہ کہ قہقہہ تک پہنچ۔ بالکل اسی طرح کبھی نور کے پردوں میں چھپ کر اور کبھی نکہت کے نقابوں میں ملفوف ہو کر اس کے تصورات کی مستور عریانیاں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ اور چونکہ اس کے خیال کے مطابق عریانی کا بہترین مظہر صرف عورت ذات سے ممکن ہے۔ —— اور عورت بھی وہ جو بارِ جوانی سے دب رہی ہو—— اس لئے اس کی ذہنی تخلیق [illegible] وہ ترصرف صنفِ نازک ہی کو ذخل حاصل ہوتا تھا۔ جن کے خصوصاً مینائے شباب کو نقش کرتے وقت وہ ہمیشہ پچھلے پہر کے تاروں کی ہلکی ضیاء، نسیم سحر کی خنک لطافتیں، اور شبنم کی مرطوب لذتیں چرا لیتا تھا۔ پھر اگر یہ نعمتیں اس کی صحیح ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر رہ جاتیں تو اسے مجبوراً سماوات کی لانہایت وسعتوں میں گم ہو کر سورج دیوتا اور چاند دیوی سے بھیک مانگنی پڑتی۔ یعنی جب آفتاب دن بھر کی مسافت طے کر چکنے کے بعد سیاہ پوش رات کے دامنِ ظلمت میں روپوش ہونے لگتا، تو وہ اُسے مخاطب کر کے کہتا۔

اے اندھیری دنیا میں اجالا کرنیوالے دیوتا! مجھے اپنی شفق افروز رخشاں پیشانی سے تھوڑا سا وہ رنگِ عقیدت دے دے جس کے پرتو کی ایک ہلکی سی جھلک نوعِ انسان کے اکثر افراد کو تیری بارگاہ میں آمادۂ پرستش کر دیتی ہے۔ میں اس رنگ سے اپنی تصویر کے آخری خطوط کی تکمیل کروں گا۔"

اسی طرح جب ماہتاب ایک عریان دوشیزہ کی طرح "تابوت فلک" سے برآمد ہوتا۔ تو وہ اس سے التجا کرتا۔

"اے رات کی ملکہ! اے آسمان کی دیوی! مجھے تیرے جواں سال و گداز سینہ کی وہ کشش و جاذبیت درکار ہے جن کا ادنیٰ کرشمہ خاموش سمندروں میں طوفان اور پُر سکون موجوں میں بے قراری پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے اس کشش کی ساحرانہ قوتوں سے تصویر کے مینائے شباب میں وہ جادو بھرنا ہے، جو دیکھنے والوں کو ایک ہی نظر میں دلدادۂ تخیل بنا دے۔"

اور عموماً ایسا ہوتا کہ اس کی یہ آرزوئیں پوری ہو جاتیں۔

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک اس کے حقیقی ذوق اور تکمیلِ ذوق کی عملی سرگرمیوں کی

لیکن ایک وقت آیا، جب اس کی طبیعت کی افتادگی اس یک رنگی سے گھبرا گئی، جس کا سب سے بڑا سبب اُس کی بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضہ تھا۔ وہ شباب کی منزلوں سے گذر کر شیب کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ جہاں دل کی امنگیں مضمحل ہو کر بے حس ہو جاتی ہیں، اور انسان عموماً مذہب کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ مذہب جو جذباتِ لطیف کی دُنیا کو برباد کرنے کا سب سے زیادہ کارگر آلہ ہے۔ جو انسان کو اُس کی انسانیت فنا کر دینے کے بعد—— باطن میں اسی فرشتہ کا ہمسر بنا دیتا ہے۔ جو الوہیت کے تمام مدارج طے کر کے ابلیسِ لعین ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ تقدس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ فرشتہ کی معراج یہی ہے۔ کہ وہ شیطان بن جائے۔ غرض یہ کہ وہ زندگی کے ہر جزو میں مذہب کی کارفرمائی

دیکھنے کا دلدادہ ہوگیا۔ حتیٰ کہ آرٹ میں بھی، حالانکہ آرٹ کو مذہب کیا سروکار ہوسکتا ہے۔

اس نے فیصلہ کرلیا۔ کہ آئندہ وہ کبھی عریاں تصاویر نہیں بنائیگا۔ کیونکہ عریانی آئینِ مذہب میں مذموم ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے ممنوع بھی ہے۔ اس ضمن میں وہ گرجا کے پادریوں کا ہمخیال ہوگیا۔ کہ عریانی ہیجانِ جذبات پیدا کردینے کے باعث ہمیشہ مخربِ الاخلاق ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا نسوانی حُسن کے وہ تمام دلکش مظاہر جو کبھی اس کے پندار میں لطیف ترین تھے، صد درجہ کریہ المنظر سمجھے جانے لگے۔

پیکرِ نسائیت کے وہ مینائے شباب، جن کو ہمیشہ عریاں رکھنا وہ شانِ مصوری تصور کرتا تھا۔ اس درجہ مستور رہنے لگے۔ کہ مختلف ملبوسات کی متعدد تہوں کو ناکافی سمجھ کر گرد و پیش کے ماحول تک سے استفادہ کرنے لگا۔ مثلاً کبھی شاخِ گُل اور کبھی طاؤس کی لمبی گردن اور کبھی دستِ بدُعا کے ذریعہ وہ سینے کو اس طرح چھپا دیتا کہ دیکھنے والے کی نظر اس کے نشیب و فراز تک مشکل سے پہونچ سکتی۔ اور ایسی صورت میں کہ اگر کوئی شئے درمیان نہ آسکتی، تو وہ خود پیکر کے یک رخی طرزِ نشست سے سینہ کا وجود ہی معدوم کردیتا۔

انجیلِ مقدس کے اوراق اور اُن کی مندرجہ کہانیاں اس کے دل و دماغ پر حاوی ہوگئیں۔ وہ آدم سے لیکر یسوع ناصری تک تمام پیغمبروں اور آسمان و زمین کے جملہ فرشتوں کے نمایاں کارنامے اور مشہور روایات — جن کو تکمیلی اعتبار سے کوئی بھی اہمیت دی جاسکتی تھی۔ بڑی جانکاہی سے صفحۂ قرطاس پر نقش کرنے لگا۔ سب سے زیادہ محنت حضرتِ عیسیٰ کے حالاتِ زندگی پیش کرتے وقت اٹھانی پڑتی تھی۔ کیونکہ اس ضمن میں وہ فنی مہارت کے علاوہ اپنی عقیدت مندی کا ثبوت بھی دینا چاہتا تھا۔ اور چونکہ مسیح کے ساتھ مقدس مریم کا وجود ایک خاص نسبت رکھتا ہے۔ اس لئے پیکرِ نسوانی کی وہ عمیق معصومیت جسے وہ اپنی تمام عمر میں کسی عنوان اور کسی رنگ میں پیش نہ کرسکا تھا۔ اَب بڑی آسانی کے ساتھ اپنی جھلک دکھانے لگی۔ یہاں تک کہ بہت ہی قلیل مدت میں اطالیہ کے وہ ماہرینِ فن جو مذہبی نقاشی کے باعث شہرۂ آفاق تھے۔ اس کے مقابلے میں محض طفلِ مکتب ہوکر رہ گئے۔

اس کے مقام پچھلے شاہکار جن کی قدر و منزلت خود اُس کی نگاہ میں بھی تھی، اس کی نظر سے گر گئے۔ اور اسی لئے اُن کو اپنے "نگارخانے" کی دیواروں سے اتار کر ایک ایسے تیرہ و تاریک کمرے میں ڈالدیا جس کی وقعت طاقِ نسیاں سے کم نہیں تھی۔ اس کے برعکس نگارخانے کو اچھی تازہ چیزکاریوں سے اس طرح مزین کیا، کہ دیواریں بجائے خود کتابِ مقدس کے اوراق معلوم ہونے لگیں۔

یہ ہے ایک ہلکا سا خاکہ اُس کی طبیعت کے انقلاب اور انقلاب کے مابعد اثرات کا۔

بڑے دن سے کچھ عرصہ قبل جب اس کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ وہ سالانہ تہوار کے موقع پر بڑے گرجا کی تزئین کیلئے مقدس مریم کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جس کے نقش و نگار میں انتہائی معصومیت کیساتھ شدید مظلومیت کی کیفیات کو سمو دیا گیا ہو۔ تو اُس نے اپنی تمام توجہ صرف ایک غیرفانی شاہکار تخلیق کرنے کیلئے وقف کردی۔ اور ساتھ ہی تہیہ کرلیا۔ کہ اس کے بعد وہ مُوقلم کو ہاتھ بھی نہ لگائیگا۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا شبیہ مریم پر سبقت لے جائے۔ وہ مغرور تو نہیں تھا۔ لیکن بالکل غیرشعوری طور پر یہ حقیقت اس کے دل و دماغ میں پنہاں تھی کہ اُس کا ہر نقشِ ثانی اپنے نقشِ اوّل سے بہتر رہتا ہے۔

ناقدین کی رائے اس سے بھی زیادہ بلند تھی۔

ایک ماہرِ فن کیلئے سب سے اولین کاوش "ماڈل" کا انتخاب ہے۔ کیونکہ جس طرح بھی زندگی میں منزلِ مقصود تک پہونچنے کیلئے ایک قبلہ نما کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح تاثراتِ قلبی کو کسی پیکرِ مجسم سے منسوب کئے بغیر متشکل کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

اُن تمام مقاماتِ سیر و تفریح پر جہاں صنفِ نازک کا ہجوم خاص طور پر ہوتا ہے، اُس نے بے شمار چکر لگائے۔ اُس کی نظر ہزاروں صورتوں پر پڑی، مگر کسی کو بھی وہ معیاری درجۂ قبول حاصل نہ ہوا۔ جو پہلے سے اُس نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا۔ بیشتر میں معصومیت کا فقدان تھا۔ اور کہیں یہ جھلک بھی نظر آئی تو دوسری خصوصیات کی کمی نے اُس کو نظرِ انتخاب سے گرا دیا۔ پھر یہ بھی تو دقت تھی کہ محض انتخاب سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ تا وقتیکہ اس کی پسندیدہ ہستی ماڈل بننے کیلئے آمادہ نہ ہو جائے۔ اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

دلی تجسس سے کام لیا جائے۔ تو اس دارِ امکاں میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی سعیٔ پیہم ایک روز بارآور ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

آفتاب سرمگیں پہاڑیوں کے پیچھے روپوش ہوچکا تھا۔ لیکن اس کی آخری قرمزی شعاعیں دامنِ اُفق کو ہنوز زرنگار بنائے ہوئے تھیں۔ جس کے انعکاس سے پانی کی شفاف مگر بیتاب لہریں، جن کی بیتابی آبی جانوروں کی تڑپ کے علاوہ کسی اور اثر کی بھی رہینِ منت تھی، آتشِ سیّال بنی ہوئی تھیں۔ دیوقامت ساحلی درختوں کے سائے تڑپتی ہوئی موجوں پر عفریتی پیکروں کی طرح آپس میں ایک دوسرے

۳۷

سے دست وگر بجاں معلوم دیتے تھے۔

ٹھیک اسی وقت اس سنسان فضا میں وہ بند کے قریب ایک سنگین لوح پر کنیاں جلائے مطالعۂ قدرت میں مصروف تھا۔ اور ساتھ ہی سوچ رہا تھا کہ ماڈل مل جانے پر وہ اپنی نئی تصویر میں اس قسم کا پس منظر پیش کرے گا۔ تاکہ اس کی ایمائی کیفیات کے ساتھ ماحول اچھی طرح ہم آہنگ ہو سکے۔

اچانک پاؤں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک پریشان حال عورت ڈگمگاتے قدموں سے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ یقیناً اُس کا چہرہ اُن معیاری خدوخال کا حامل تھا جو قدیم اطالوی مصوروں نے حضرت مریم کیلئے مخصوص کر دئے تھے اور انہیں کے مطابق وہ اپنی تصاویر تیار کرتے تھے۔

ہر ایک ٹھنڈا سانس بتا رہا تھا۔ کہ وہ زمانے کے ہاتھوں بُری طرح ستائی ہوئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قرنوں کی اسیرانہ بیکسی اور سرو کا معصومانہ سکوت اس کے اعضاء میں ایک افسردہ لوچ بن کر تحلیل ہو گیا ہے۔

چہرے کے مضمحل نقش و نگار، اور رنگ و روپ کی پژمردگیاں یقین دلا رہی تھیں کہ وہ عہد جوانی میں حسن و جمال سے محروم نہیں رہی ہے۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی چمک — عورت کی آنکھوں کی وہ چمک جو دل کا آئینہ سمجھی جاتی ہے — شاہد بن رہی تھی کہ معصیت کی دنیا میں اُس نے کبھی قدم تک نہیں رکھا۔ اس کا دامن ہمیشہ گناہ کی آلودگیوں سے منزہ رہا ہے۔ وہ پھولوں کے رخسار پر پڑے ہوئے قطراتِ شبنم کی طرح پاک ہے۔

حد درجہ محویت کے باعث ایک لمحہ کیلئے اُسے ایسا محسوس ہوا۔ گویا وہ بھی وقت و مقام کے تعینات سے بے نیاز عالمِ خواب میں نظر آنے والے کسی پیکر کی مانند ہے جس کا عدم و وجود برابر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتی ہوئی وہ اسکے قریب سے ہو کر گذر گئی تو یہ یقین کر لینا اُس کے لئے آسان تھا۔ کہ دراصل وہ اسی عالمِ رنگ و بو کی رہنے والی ہے۔ اور اس کا مرتبہ ان دیویوں سے [illegible] ہو سکتا ہے۔ جو یونان و روما کی اساطیرِ اولین میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔

جس طرح ایک محفلِ سرود میں کسی دوسرے کے گیت سُن کر ایک مغنی کی اپنی رگِ موسیقی بھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اسی طرح اسکو اپنے دائیں ہاتھ کی ان تین انگلیوں کا بالائی سرے پر جو مصوری کے وقت مُوقلم کو اپنی مضبوط گرفت میں لئے رکھتی ہیں خفیف ارتعاش سا محسوس ہونے لگا۔

وہ غیر ارادی طور پر ایک سایۂ متحرک کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

لیکن زیادہ دور تک نہیں۔ کیونکہ جلدی ہی وہ ایک دوسرے کے دوش بدوش ہو گئے عورت کی سبک خرامی کے مقابلے میں مرد کی آہستہ چال بھی تیز رفتار ہی ثابت ہوتی ہے۔

ایک اجنبی کو اس طرح اپنے ہمراہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکی، مڑی اور بنظرِ استفسار دیکھنے لگی۔ وہ کھوئی ہوئی حالت میں عرضِ مدعا کیلئے مناسب الفاظ ڈھونڈھنے لگا۔

روپیہ حصولِ مقصد کی کلید ہے۔ وہ غریب تھی، مفلس و نادار۔ اور یہ اپنی آرزو پوری کرنے کیلئے تمام مال و متاع قربان کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ صرف سات یوم ماڈل بن کر نگار خانے میں بیٹھے رہنے کا معاوضہ ایک گراں قدر رقم! بھلا کون آتی ہوئی دولت کو ٹھکرا دیتا۔

معاہدے کی حدیں ختم ہوئیں۔ کام شروع ہو گیا۔ اور مقدس مریم کی مظلوم معصومیت مُوقلم کے اعجاز سے صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہونے لگی۔

معاہدہ کا ساتواں دن تھا اور سالانہ تہوار میں ابھی دو یوم باقی تھے۔ تصویر تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ وہ ماڈل کے انتظار میں خاموشی کے ساتھ کمرے کے اندر گھوم رہا تھا۔ اور دور و نزدیک کے مختلف مقامات پر کھڑے ہو کر مختلف زاویہ ہائے نظر سے خطوط کی کشش اور رنگوں کے امتزاج کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ اگر کوئی نقص یا کمی باقی ہو تو آج اُسے پورا کر لے۔ حقیقتاً اُس نے فنِ لطیف کا وہ بے مثل نمونہ تیار کیا تھا جس کی قدر و منزلت خود صانع کی نظر میں بھی بہت بلند ہوتی ہے۔

یوں تو اُس کی شہرت اب بھی کچھ کم نہیں تھی۔ لیکن اس معجز نگار کے سلسلے میں وہ بڑے فخر کیساتھ محسوس کر رہا تھا۔ کہ خراجِ تحسین تمام گذشتہ کارناموں کے مقابلے میں سبقت لے جائیگا۔

انتظار کی شدید گھڑیاں ابھی ختم نہ ہونے پائی تھیں۔ کہ بڑے گرجا کے پادری کی غیر متوقع آمد نے اس کے سلسلۂ خیال کو توڑ دیا۔ اُس نے آتے ہی تصویر پر ایک معنی خیز نظر ڈالی اور پھر مقصد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ غیر معمولی رنگِ رُخ کسی خاص جذبے کا پتہ دے رہا تھا۔ تاہم اُس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پہلے غیر متعلقہ گفتگو شروع کی۔ اور کچھ دیر بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کیا۔

اُس نے یہ تسلیم کرا لینے کے بعد کہ مذہبی نقاشی کو عقائد کی روشنی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور مقدس مریم کی شبیہ بنانے کیلئے جو ماڈل منتخب کیا جائے۔ ضرورت ہے کہ وہ کردار کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ہو، مصور کو اس حقیقت سے باخبر کیا۔ کہ اس تصویر کیلئے جو عورت اُس نے انتخاب کی ہے۔ وہ سماج کی نظروں میں ذلیل ترین

— ایشیا مارچ [illegible]

سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا شمار بازاری عورتوں میں ہوتا ہے۔ جوانی کی راتیں اس نے اس طرح بسر کی ہیں۔ کہ ہر شب اس کا آغوش ایک نئے مرد کی ہوسناکیوں سے گرم رہا۔ اور سنسار کے ہر گناہ کے ارتکاب میں جو کسی عنوان عورت ذات سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اسنے کبھی تامل سے کام نہیں لیا۔ اس کے چہرے کی وہ کیفیات جو معصومیت و مظلومیت کے ظاہری رنگ میں نمایاں ہیں۔ درحقیقت شباب کے بے جا تصرّف اور اس شکستِ پندار سے پیدا ہونیوالی افسردگی کا نتیجہ ہیں۔ اب اس کے لئے پرستیدۂ عالم بننے کا زمانہ گذر گیا یکسر گویا معصیت کی تمام جمع پونجی عیاشیوں کی نذر ہو گئی۔ اور اس لئے فاقہ مستی سے پیدا ہونیوالا اضمحلال مظلومیت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔

سکوتِ مطلق میں مصوّر کو اپنے دل کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی اس کے بحرِ تصوّر میں زبردست طوفان برپا تھا۔ ایوانِ آرزو کی دیواریں جن کو لطیف رنگوں سے تعمیر کیا تھا منہدم ہو کر بنیادوں سے بھی نیچے گر پڑی تھیں۔ اُسے کمرے کی ہر شے گھومتی معلوم دے رہی تھی —— وہ تصویر بھی، جس کو مریم سے منسوب کرنا تھا۔ مگر اب عنوان طلب تھی۔

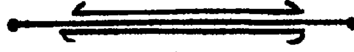
زندگی ایک فریب ہے۔ — وہ سوچ رہا تھا —— اور زندگی کا ہر فعل ریاکاری کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ تقدّس خواہ کتنا ہی عمیق ہو معصیت کی لطیف چاشنی سے اسکو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ نیکیاں بدی سے الگ ہو کر قائم نہیں رہ سکتیں۔ اور حُسن کی رعنائیاں عیاشیوں کے بغیر پھیکی ہیں۔ عورت، جس کے عناصر ترکیبی کا ابتدائی خمیر ہی گناہ سے تیار کیا گیا تھا۔ کسی طرح بھی گناہ سے خالی الذہن نہیں رہ سکتی۔ اس ضمن میں ایک حوّا اور ایک مریم، ایک دیوی اور ایک طوائف سب برابر ہیں۔ پھر آخر کب تک دنیا اس قسم کے مغالطوں اور اوہامِ خیالی میں مبتلا رہے، یسوع مسیح تا عمری واقعی بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ عقل میں نہ آنیوالی باتوں کو بغیر سمجھے تسلیم کر لینے سے بہتر یہ ہے کہ ان کو اچھی طرح سمجھ کر تسلیم نہ کیا جائے۔

چنانچہ ماڈل کے آجانے پر خود اُس کی زبانی معلوم کر لینے کے بعد کہ گرجا کے پادری نے جو اطلاع دی تھی وہ واقعی درست تھی۔ اس کا سب سے پہلا حکم یہ تھا۔ کہ وہ عورت اپنا تمام لباس اتار کر پھینک دے۔ وہ مریم کی ایک فنی تصویر بالکل عُریاں حالت میں تیار کرنیکا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے اپنا قدیم اصول یاد آگیا۔ کہ کوئی فنِ لطیف بغیر عریانی کے معراجِ کمال حاصل نہیں کر سکتا۔

نقشے میں چور کر کے اُس نے عورت کو خوب متوالا بھی بنا دیا۔ تاکہ وہ عہدِ پیری میں کچھ دیر کے لئے جوان معلوم ہونے لگے۔ وہ تصورات سے کام لیکر تصویر کے پردے میں مقدس مریم کے عہدِ شباب کی ایک ایسی تعیش گذار رات کا منظر پیش کرنا چاہتا تھا جس کی ایمائی کیفیتوں میں عہدِ دوشیزگی کے اندر ہی ماں بن جانیکا راز مضمر ہے۔

وہ جانتا تھا۔ کہ علم بردارانِ مذہب اس کے آخری شاہکار کو قبول نہیں کرینگے۔ لیکن اُس کے نگارخانے کی زینت —— کیا وہ بھی اس سے دوبالا نہ ہو سکے گی۔ اسکے جذبات میں زبردست انقلاب برپا تھا۔ اس لئے وہ ایک باغیانہ سرکشی کے ساتھ مذہب کے تمام عقیدوں، سماج کے جملہ اصولوں اور معلّمانِ اخلاق کے زرّین اقوال کو ٹھکرا دینا چاہتا تھا۔

انجام کار وہ اپنے مسلک کے اعتبار سے جہاں تھا وہیں آگیا۔



ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
ڈی لٹ (پیرس)

محفلِ رقص کی تصویر

(کالیداس، پیرلوتی اور میر حسن کے قلم سے)

یہاں نظارۂ رقص کی تین تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن کے صنّاع تین باکمال ادیب ہیں۔
کالیداس نے اپنے ڈرامے مالوکاگنی متر میں نہایت حُسن و خوبصورتی سے محفلِ رقص و سرود منعقد کی ہے۔ راجا اگنی متر اپنی رانی دھرنی کی باندی مالوکا کی تصویر دیکھ کر اس پر ریجھ جاتا ہے۔ اور اُسے دیکھنے کا موقع تلاش کرتا ہے۔ مالوکا اور راجا کی ایک دوسری باندی گوتمی دو مختلف استادوں سے ناچ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ یہ دونوں استاد جوشِ رقابت میں ایک محفل سجاتے ہیں۔ تاکہ اپنی اپنی چیلی کے کرتب دکھلائیں۔ ایک جوگن جو محل میں رہتی ہے۔ اس مقابلے کی ثالث مقرر کی جاتی ہے۔ راجا کا مطلب بر آتا ہے۔ اور وہ اپنی محبوبہ کو رُوبرو دیکھ لیتا ہے۔ سنسکرت ڈرامے میں ودوشک (مسخرہ) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کلاسکل یورپین ڈرامے میں "فول" کو، وہ عموماً ہیرو کا لنگوٹیا یار ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ ڈرامے کے دوسرے ایکٹ سے براہِ راست سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ حصۂ نظم داوین میں رکھا گیا ہے۔

فرانس کے نامور ادیب پیرلوتی (Pierre Loti) نے اپنے سفرنامۂ ہند میں کوچین کے ایک ناچ کا حال بڑے لطیف انداز میں لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ ہندوستانی رقاصہ کے عنوان سے کیا گیا ہے۔

میر حسن نے بھی اپنی مثنوی میں بدرِ منیر اور بے نظیر کی شادی کے بیان میں ناچ کی محفل بڑی دھوم سے سجائی ہے۔
ان ترجموں اور اقتباس سے ایک تو اُن ادیبوں کا کمال ظاہر ہوتا ہے اور پھر ادب کا تقابلی مطالعہ بھی کم دلچسپ نہیں۔ (مترجم)

(رقص و سرود کا انتظام ہو چکا ہے۔ اور راجا اپنے دوست کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ رانی، جوگن اور خدم و حشم حسبِ مراتب بیٹھے ہوئے ہیں)

راجا۔ دیوی ان دونوں اُستادوں میں سے پہلے کس کی تعلیم اداکاری کا امتحان لیا جائے؟

جوگن۔ یوں تو دونوں اپنے فن کے چاند سورج ہیں، تاہم عمر کی بزرگی کے لحاظ سے گن داس کو ترجیح دینا چاہیئے۔

راجا۔ اچھا تو مودگلیہ، ان صاحبوں کو یہ خبر پہنچا کر اپنی خدمت پر مستعد رہو۔

حاجب۔ کرامات، جہاں پناہ۔ (رفت)

گن داس۔ حضور، شرمشٹھا[1] کا بنایا ہوا ایک گیت چوپائی میں ہے، جو مدھم سُر میں گایا جاتا ہے۔ اس کے ایک بند کو توجہ سے سننے کی زحمت فرمایئے۔

راجا۔ فرطِ احترام سے میں ہمہ تن گوش ہوں۔

(گن داس باہر جاتا ہے)

راجا (علیحدہ، یار:) وہ جو لبِ پردہ ہے، اس کے شوقِ دیدار میں یہ بیقرار نین گویا پردے کو اُٹھا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مسخرہ (چپکے سے) بھئی لو، تمہاری آنکھوں کا رس تو آگیا، لیکن تمہاری رانی شہد کی مکھی بنی بیٹھی ہے۔ ذرا ہوشیاری سے درشن کیا جائے۔

(مالوکا اپنے استاد کے ساتھ جو اس کے سڈول بدن کو غور سے دیکھ رہا ہے، اندر آتی ہے)

[1] شرمشٹھا جنوں کے راجا کی بیٹی اور راجا ییاتی کی بیوی تھی جس کا ذکر پرانوں میں کئی جگہ آیا ہے۔

مسخرہ۔ (کان میں) حضور دیکھئے تو سہی۔ تصویر اور اصل کے حسن میں جو سر مو فرق ہو۔

راجا (آہستہ سے) دوست میرا دل اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں جب میں اس کا روپ نکھر آیا ہو۔ لیکن اب تو یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کا مصور نظارۂ حسن میں اتنا کھو گیا تھا کہ تصویر جیتی جاگتی نہ بن سکی۔"

گن داس۔ بیٹی لاج اور جھجک کو چھوڑ کر اپنے آپے میں آجا۔

راجا۔ (خود بخود) حقا کہ اس کا ہر عضو تن سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

آنکھیں غلافی ہیں۔ چہرہ زمستاں کے ماہتاب کی طرح روشن ہے اور کاندھوں سے دونوں ہاتھ کس بانکپن سے نیچے ڈھل گئے ہیں بھری ہوئی چھاتی میں گدرائے ہوئے جوبن تن کر ایک دوسرے سے بھڑ گئے ہیں۔ آغوش میں کیا گداز ہے۔ اور کمر اتنی پتلی کہ بازو حائل کرلے۔ ساق بلوریں گداز ہیں اور ان سب پر پاؤں کے انگوٹھے کی ہلکی سی کجی غضب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کالبد اپنے اُستاد کے تخیل کی مناسبت سے تیار کیا گیا ہے۔"

(مالو کا تال سر ملا کر اس رباعی کو لحن سے گاتی ہے)

"پیتم پیارے کا ملنا ناممکن ہے۔ اس لئے لے دل اب آس چھوڑ دے لیکن میری بائیں آنکھ کی کور رہ رہ کر پھڑک کیوں رہی ہے۔ مدت دراز کے بعد آج جو محبوب نظارہ فروز ہے تو اس کے پاس جاتے ہوئے میں شرما رہی ہوں۔ میرے مالک! گو میں باندی ہوں پھر بھی یقین جان کہ تیرے فراق کی ماری ہوئی ہوں۔"

(گیت میں سطوت عشق کے اظہار کیلئے وہ ناچ کر بھاؤ بتلاتی ہے)

مسخرہ۔ (کان میں) دوست، یہ چھپا سا کر اس نے بھی اظہار الفت کر دیا۔

راجا۔ بھائی میرا دل بھی یہی شہادت دیتا ہے۔

"میرے مالک میں تیری مشتاق ہوں" یہ گا کر غمزہ و عشوہ سے اس نے ان الفاظ کو واضح کیا اور اشارے اشارے میں مخاطب کرکے اپنا درد دل سنا دیا۔ کیونکہ رانی معترض کی موجودگی کے سبب اظہار مدعا کی کوئی دوسری صورت نہ ہو سکتی تھی۔"

(گانا ختم کرکے مالو کا محفل سے اٹھنا چاہتی ہے)

مسخرہ۔ ٹھہریے جناب آپ کی ایک کوتاہی کے متعلق مجھے دریافت کرنا ہے۔

گن داس۔ بیٹی ذرا ٹھہر جاؤ۔ کسی کو یہ کہنے کی جگہ نہ رہ جائے کہ تمہاری تعلیم میں کوئی نقص رہ گیا۔

(مالو کا پلٹ کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے)

راجا۔ (خود بخود) ہر ڈھب پر اس کا حسن نئی آن بان دکھلانے لگتا ہے۔

"اریب کر شان رقص سے یہ اندازِ استادگی کہیں زیادہ دلفریب ہے، یہ انداز کہ دھڑ چھڑی کی طرح سیدھا ہے۔ اور بایاں ہاتھ سرین پر اس انداز سے رکھا ہوا ہے کہ اس کی چوڑی چپ چاپ کلائی سے لپٹی ہوئی ہے۔ اور دوسرا ہاتھ یوں ڈھیلا لٹکا ہوا ہے گویا شیام بیل کی زلف ہے۔ اس کی آنکھیں روش پر جمی ہوئی ہیں جس پر بکھرے ہوئے پھولوں کو وہ اپنے انگوٹھے سے آہستہ آہستہ مسل رہی ہے۔"

گن داس (مسخرے کو مخاطب کرکے) سنیں تو سہی کہ جناب کا اعتراض کیا ہے؟"

مسخرہ۔ پہلے اپنی ثالث سے پوچھ لیں بعد ازاں میں اس نقص کا ذکر کروں گا جو دوران رقص میں مجھے نظر آیا۔

گن داس۔ دیوی! اپنے مشاہدہ کے مطابق فیصلہ کیجئے کہ یہ کرتب کامیاب رہا یا ناکام

جوگن۔ میری دانست میں تو وہ بالکل بے عیب تھا۔ کیونکہ:

"اس کے جسم نازنیں کا ہر بنِ مو جذبات کی بولتی ہوئی تصویر بن گیا تھا۔ خرام اور لے میں مناسبت تھی اور وہ خود جذبات کے اظہار میں محو ہو گئی تھی۔ بیں بازوؤں کی ہر جنبش کمال ناٹک تھی اور رس کی لہریں یکے بعد دیگرے امنڈتی آتی تھیں لیکن از ابتدا تا آخر جذبۂ محبت میں جو قیام تھا۔ اس نے دلچسپی میں اتار چڑھاؤ پیدا نہ ہونے دیا۔"

ہندوستانی رقاصہ

وہ چہرہ قریب آتا جاتا ہے۔ جس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں۔ جو شباب پہ مدہے۔ جس پر غازہ ملا ہوا ہے۔ شہوانیت اور کلفت اس کے صاف عیاں ہیں۔ اور بڑی نزاکت و سرعت سے وہ کبھی سامنے آتا اور پھر فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس کی ناچتی ہوئی تین پتلیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ سفید میناکاری کی زمین پر سیاہ سنگ سلیمانی جڑے ہوئے ہیں۔ ہر خرام ناز کے ساتھ

جذبۂ شہوت کو ابھارتی ہوئی وہ آگے آکر پھر تاریکی کی طرف لوٹ جاتی ہے اور اس
کی ہر پیش قدمی میں ایک نیا اشتعال انگیز اشارہ پنہاں ہوتا ہے۔ اور اس سارے
وقفے میں اس کا تارِ نظر مجھ پر بندھا ہوا ہے۔ یہ سانولا سلونا مکھڑا جواہرات سے منڈھا
ہوا ہے۔ ہیرے اور کندن کا ایک مکٹ پیشانی کا ہالہ بنا کر اور زلفوں کو اپنے آغوش
میں چھپا کر کانوں کے اوپر ڈھلک گیا ہے۔ ناک میں اور کانوں میں کئی ہیرے
جگمگا رہے ہیں۔

رات کا وقت ہے اور ہر طرف روشنی ہو رہی ہے لیکن اس انبوہ میں میں
فقط اس تاجدار حسینہ کو دیکھ سکتا ہوں جس کے مکٹ کی انی مجھ پر جادو پھونک رہی
ہے۔ بہتیرے تماشائی اس کے گرد حلقہ بنا کر یوں گھور رہے ہیں کہ اسے بمشکل تمام ناؤ بھاؤ
بتانے کی جگہ ملتی ہے۔ ایک ذرا سی کھلی ہوئی جگہ رہ گئی ہے جس میں سے ہو کر وہ میرے
قریب آتی اور پھر پلٹ جاتی ہے۔ لیکن اس کا ہونا نہ ہونا میرے لئے برابر ہے۔ اور
میں صرف اس عورت کو، اس کے درخشاں مکٹ کو، اس کی چشمِ سرمہ سا کو اور کٹیلی
ابرو کو دیکھ سکتا ہوں۔ اس کا جسم ناگنی سانپ کی طرح لچکیلا ہوتے ہوئے بھی گداز
اور مضبوط ہے۔ کیسے سحر طراز بازو ہیں وہ جو گل بہیاں کرنے کو بیتاب معلوم ہوتے
ہیں۔ جو سانپوں کی طرح بل کھا رہے ہیں اور جو کاندھوں تک گہر و زمرد سے زیر بار ہیں

۴۲

لیکن نہیں کشش تو ان آنکھوں میں ہے جن کا انداز ہر آن تغیر پذیر ہے۔ کبھی وہ
طعنہ زن ہیں تو کبھی ان میں عجب دلپذیر حلاوت ہے۔ جب وہ میری آنکھوں میں
آنکھیں ڈالتی ہے تو میں کانپنے لگتا ہوں۔ مکٹ کے رتن اور ناک کان کے جواہرات
اس آب و تاب کے ساتھ جلوہ فگن ہیں۔ اور یہ طلائی فیتہ ایسا روشن حلقہ بنائے ہوئے
ہے کہ اس وقت بھی جب وہ مجھ سے بالکل بڑھ جاتی ہے، اس کا چہرہ اپنے دل ربا نک
سک اور اٹھے اٹھے سے سانولے رنگ کے ساتھ ایک پر اسرار ابہام میں ملبوس نظر
آتا ہے۔ رقاصہ آتی ہے اور جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مجھے ناچ دکھا رہی ہے
لیکن اگر غور کرو تو یہ رقص [illegible] بیش قیمت گھنگروؤں کی رم جھم سنائی دیتی ہے! اس کے
ننگے اور ننھے پاؤں کی چاپ کا زیر و بم قالین ہی میں سما جاتا ہے۔ ان پیروں کی کشیدہ
اور سیماب وش انگلیوں میں چھلے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ رقص جس جگہ ہو رہا ہے وہ پھولوں کی مہک اور عطروں کی لپٹ سے اس
قدر بسی ہوئی ہے کہ دم گھٹ رہا ہے۔ فرانسیسی علاقے کے جو ہندوستانی یہاں رہتے ہیں
انھوں نے میری خاطر یہ محفل سجائی ہے۔ میں اس کا مہمان ہوں جو ان میں سب سے زیادہ
دولتمند ہے۔ میرے آتے ہی میزبان نے یاسمین کے پھولوں کے کئی لڑی کا ہار گلے
میں ڈال دیا اور ایک نقرئی گلاب پاش سے مجھ پر چھڑکاؤ کیا۔ گرمی کے مارے سانس
رک رہا ہے۔ تقریباً سب ہی مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ گویا کالے کالے سروں کی
ایک قطار ہے جس پر بندری کی پگڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ نیم برہنہ ایستادہ نوکر تاڑ
کے رنگین پتوں کے بڑے بڑے پنکھوں کو ان کی کھوپڑیوں پر جھل رہے ہیں۔ اس
خوش لباس مجمع میں جہاں مرد بھی جواہر جڑے ہیں، ان غریبوں کی برہنگی کمال درجہ
موجب حیرت ہے۔

رقاصہ سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ جشن میرے اعزاز میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ جسے
ذوق و اکتساب دونوں حاصل ہیں یوں مجھ پر توجہ کر رہی ہے۔

آج شام کو وہ دور دراز سے یہاں آئی ہے۔ دکن کے کسی مندر میں وہ شیو بھگوان
کی داسی ہے۔ دور دور تک اس کا شہرہ ہے اور ایک ناچ کے لئے اسے بہت روپئے
دینے ہوتے ہیں۔

وہ آگے پیچھے جھوم رہی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کے برہنہ سیمیں بازو مچل رہے ہیں
اس کی انگلیاں طرح طرح سے مٹک رہی ہیں۔ انگشتِ پا جو بچپن سے اپنے کرتب
کی مشق کرتے آئے ہیں اور بھی اچرج دکھا رہے ہیں۔ انگوٹھا برابر الگ اور ادھر کھڑا
رہتا ہے۔

سنہرے کمربند اور اس سینہ بند کے بیچ جس میں اس کے جوبن جکڑے ہوئے ہیں۔
اس کے چینیئی بدن اور گٹھے ہوئے سڈول جسم کی ذرا سی جھلک نظر آ رہی ہے۔ سینوں کے
نچلے ابھار کی تھرکن کو بھی ہم صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا رقص مختلف اداؤں کے اظہار
کا ایک سلسلہ ہے۔ ایک قسم کی اداکارانہ یک شخصی تمثیل ہے۔ اس کا رہ رہ کر سامنے
آنا اور جھک کر پیچھے لوٹ جانا۔ تماشائیوں کے جمگھٹ کو چیر کر مجھ پر ٹکٹکی باندھے ہوئے
بہت قریب آ جانا اور پھر بجلی کی طرح اس تاریکی میں گھل مل جانا جو دیوان خانوں
کی پشت پر چھائی ہوئی ہے!

وہ شہوت اور ملامت کا ایک نظارہ پیش کر رہی ہے۔ پس منظر میں سازندے
طنبوروں اور بانسریوں سے اس نظارہ کو سرودی لباس پہنا رہے ہیں۔

اداکاری کے ساتھ وہ زیر لب گاتی بھی جاتی ہے۔ ہلکے دھیمے سروں میں جنہیں
اس کے سوا کوئی اور نہیں سن سکتا۔ اس سے اس کی یادداشت تازہ ہوتی جاتی ہے۔
اور اپنے کرتب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اسے مدد ملتی ہے۔

لو وہ دیوان خانے کے تاریک گوشے سے باہر نکلی، گھنگروؤں سے جگمگاتی
ہوئی! گلہ و شکوہ کی پُرعتاب اداؤں کے ساتھ وہ میری طرف لپکتی ہے۔ اور اس

انداز سے مجھ پر ملامت کرتی ہے گویا ظالم کو میرے گستاخی کی ہولناکی کا شاید پتا ہی ہے۔

یک بیک رقاصہ طنز سے کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے۔ اپنی بیہودہ حقارت سے وہ مجھ کو عرق کر دیتی ہے اور طعنہ زن مجمع کو انگلی اٹھا کر میری طرف متوجہ کرتی ہے یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی طعن و تشنیع بھی اسی طرح فرضی ہے جس طرح وہ پُر غضب بدھا لیکن اس اداکاری کے فطری ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔ اس کی کھلکھلاہٹ اور ادا اس ہنسی کی صدائے بازگشت اس کے سرجوش سینہ میں گونج رہی ہے۔ اور جب وہ ہنستی ہے تو اس کا منہ، آنکھیں، ابرو، نیز ہانپتی اور کانپتی ہوئی چھاتیاں بھی ہنسنے لگتی ہیں۔

جب وہ اس طرح ہنستی ہوئی پیچھے بھاگتی ہے تو بلا کا اثر ہوتا ہے۔ اور تماشائی اس کے ساتھ ہنسنے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ پوری طاقت سے پیچھے پلٹتی ہے۔ اپنے سر کو اس طرح موڑ کر کہ مجھے دوبارہ نہ دیکھ سکے لیکن اب وہ ہولے ہولے بڑی شان کے ساتھ ادھر آ رہی ہے وہ طعن چھیڑنے کے لئے ہی تھا۔ اس کی محبت امڈا ہے۔ اس الفت نے اسے پر شکستہ کرکے اس صورت میں بھیجا ہے کہ کبھی تو وہ معافی کی التجا میں دونوں ہاتھ پھیلاتی ہے اور کبھی خود سپردگی کا یقین دلاتی ہے۔ اور اب جو وہ اپنے سر کو پیچھے پھینک کر اور نیم کشودہ لبوں میں گوہر دنداں کی آب دکھلا کر، جو ہیرے کی کیل کے نیچے جھلک رہے ہیں، بازگشت کرتی ہے تو وہ مجھے دعوت ہم رکابی دیتی ہے۔ بلکہ وہ مجھے حکم دے رہی ہے۔ اس کے بازو، اس کے جوبن، اس کے متوالے نین مجھے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ اس کی زندگی کا ہر تار سراپا اذن بن گیا ہے۔ گویا وہ مجسم مقناطیس ہے۔ ذرا سی دیر میں بلا ارادہ کہیں میں اس کی دعوت پر لبیک نہ کہہ دوں۔

ان دلرُبائیوں نے مجھے گرفتار نظر کر لیا ہے۔ جھوٹے ہیں اس کی محبت کے دعوے! اس کی ہنسی کی طرح یہ بھی اس تماشے کے سیپارے ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا۔ اور پھر بھی اس احساس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ شاید اس عشوہ طرازی کا علم منظر میں ایک نئی اور شدید کشش پیدا کر دیتا ہے۔

جب وہ بھاؤ دکھاتی ہے تو دونوں سازندوں میں اور اس میں ایک مقناطیسی یا پوشیدہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بھی انسانوں کی قطار میں ہو کر آگے آتے اور پیچھے جاتے ہیں۔ آگے بڑھ کر پھر تین چار قدم پیچھے لوٹ جاتے ہیں۔ رقاصہ جب میرے پاس آتی ہے تو وہ بھی قریب آ جاتے ہیں لیکن اس کی واپسی کے پہلے ہی لوٹ جاتے ہیں۔ وہ کبھی نظروں سے اسے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور ان کی آتشیں نگاہیں اس پر جمی رہتی ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ منہ پھاڑ کر موقّن کی سی فلک سیر آواز میں گاتے جاتے ہیں۔ یہ اونچے پورے سازندے جھک کر اس کے پیچھے سے قد کا جائزہ لیا کرتے ہیں۔ ان کے وتیرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استاد ہیں۔ جو اس رقاصہ کی روح میں سمائے ہوئے ہیں۔ گویا وہ اپنی آواز سے اس کی رہبری کر رہے ہیں اور وہ اپنے سانس کی گرمی سے لے گرما رہے ہیں۔ یا یہ کہ وہ کوئی نازک اور فرخندہ تتلی ہے۔ جسے انھوں نے اپنی مرضی کا غلام بنا رکھا ہے اس پوری روش میں کوئی ایسی نامعلوم شے ہے جو غیر مرئی اور کنج فطرت معلوم ہوتی ہے۔

طائفہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں روشنی کچھ ہلکی ہلکی سی تھی۔ وہاں دو تین خوش لباس رقاصائیں بیٹھی ہوئی تھیں جن کا ناچ پہلے ہو چکا تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا کیونکہ وہ ایک زہریلے مگر حسین پھول سے ملتی جلتی تھی۔ دراز قامت اور چھریرا بدن جس کے اعضا بہت نازک معلوم ہوتے تھے اور آنکھیں کاجل کی لمبی لیک کے بغیر بھی بہت بڑی تھیں۔ گہرے کالے بال جن کے گچھے چوٹیوں میں گندھے ہوئے، گالوں پر لہرا رہے تھے۔ سیاہ لباس، سیاہ کمر بند اور ہلکی سی روپہلی کور کی کالی نقاب۔ اس کے گہنوں میں زمرد کے سوا کچھ نہ تھا۔ کلائی اور ہاتھوں میں بیش بہا لعل اور ناک میں عقیق کا بلاق جو لبوں پر یوں لٹکا ہوا تھا گویا موٹے موٹے ہونٹوں پر خون کا ایک قطرہ ٹپک پڑا ہے۔

لیکن میں ان سب کو بھول گیا جب میں نے اس رانی کو، اس ستارہ جبیں کو دیکھا جو لیکا یک سازندوں کی قطار کو چیر کر نمودار ہو گئی۔ وہی جو سونے روپے میں لدی ہوئی سب کے بعد سامانِ نظارہ مہیا کرنے آئی تھی۔

یہ رقص طویل تھا۔ بہت طویل حتیٰ کہ تکان سی محسوس ہونے لگی۔ تاہم اس لمحہ کے خوف سے میں ہراساں ہو رہا تھا جب وہ ختم ہو جائیگا اور میں پھر کبھی اسے نہ دیکھ سکوں گا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے ملامت اور مسکراہٹ کے نشتر لگائے۔ از سرِ نو اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کا تیر نظر میرے دل پر بیٹھ گیا اور لگاوٹ کے وہ اشارے تیر دل میں کھب گئے۔

بالآخر وہ خاموش ہو گئی اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں ہوش میں آتا ہوں اور اس مجمع کو دیکھ کر یاد کرتا ہوں کہ یہ جشن اور اس کی حقیقت کیا تھی۔ اب برخاست ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور میں اپنا ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی غرض سے رقاصہ کے پاس جاتا ہوں۔ وہ ایک جھینے بینے رومال سے منہ کا پسینہ پونچھ رہی ہے۔

گرمی کے مارے اس کی پیشانی سے پسینہ کی بوندیں موتیوں جیسے پر ڈھلک رہی ہیں۔ اب بالکل بے نیازی، بے پروائی اور تکلف کے ساتھ یہ تھکی ہاری بجاہل ملتا نگر مجھے سلام کرتی ہے۔ اس ہندوستانی سلام کے بھدے پن میں بھی تیکھا طنز پنہاں ہے۔ ہر سلام کے ساتھ وہ اپنے رُخِ زیبا کا پردہ دار ہاتھوں کو بنالیتی ہے۔ جن کے پور پور میں ہیرے دمک رہے ہیں۔

کسی رقاصہ کی رُوح نسل اور نجابت کی کیا پروا کرتی ہے؟ وہ خاندانی نرتکیوں کی اولاد ہے جسے سینکڑوں اور ہزاروں سال سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ محض عیش و عشرت کی بندی ہو کر زندگی گذار دے۔

بینظیر اور بدرِ منیر کی شادی کا جلسہ

کروں راگ اور ناچ کا کیا بیاں — قدیمی کسی وقت کا سماں
وہ اربابِ عشرت کا آپس میں مِل — جمانا کھڑے راگ کاٹے کے دل
وہ ایمن کی تانیں ادھر اور اُدھر — ملے سُر طنبوروں کے بایک دگر

اور اس صف سے اک چوکری کا نکل
اُٹھنا دوپٹے کا مدے کے تال
کبھی پر مو، میں دکھاتی ادا
کبھی گت سری، ناچنا ذوق سے
ادھر کی تو یہ گت اور اس کا یہ بھاؤ
کھڑی ہو کے دو گھونٹ حقہ کے لے
انگوٹھی کی لے سامنے آرسی
اُلٹ آستیں اور مہری کا چاک
بنا کنگھی اور کر کے ابرو درست
دوپٹے کو سر پر اُلٹ اور سنبھل
پکڑ کان اور گھنگھروؤں کو اُٹھا
ادھر اور اُدھر رکھ کے کاندھے پہ ہاتھ
فتح چند کے ہاتھ کی مورت ایک
کبھی ناچنا اور گانا کبھی

جتانا ہنر اپنا پہلے چپل
وہ بڑھا سا قد اور گھنگرو کی چال
کہ جوں لوٹ کر ہو گئے بجلی ہوا
کہ تیورا کے عاشق گرے شوق سے
اُدھر اوٹ میں نائیکہ کا بناؤ
چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ جمے
وہ صورت کو دیکھ اپنی گلزار سی
نئے سر سے انگیا کو کر ٹھیک ٹھاک
جھٹک دامن اور ہو کے چالاک چست
یکایک وہ صف چیر آ نکل
پہن پاؤں میں اور سر سے جھوا
چلے ناچتے آنا سنگت کے ساتھ
لجائی ہوئی چاند سی صورت ایک
رِجھانا کبھی اور بتانا کبھی

منظور حسین شور ایم اے

نوائے وقت

سینۂ وقت میں پوشیدہ ہیں لاکھوں خورشید — ہر شبِ تار سے اک تازہ سحر پیدا کر
خاک میں فطرتِ آدم کی جو مضمر ہیں ہنوز — اُنہیں ذرّات سے خورشید و قمر پیدا کر
ذرّے ذرّے میں یہاں ایک دھڑکتا دل ہے — جلوے محسوس ہیں پنہائے نظر پیدا کر
نکہت و نور کی ہر موج ہے طغیانِ نشاط — نفسِ غم میں بھی نغموں کا اثر پیدا کر
شعلے درکار ہیں ترکیبِ نشیمن کے لئے — اب گل و لالہ سے طوفانِ شرر پیدا کر
ذوقِ تقلید ہے افکار و نظر کی توہین — لغزشِ پا میں بھی اندازِ خضر پیدا کر
کارواں رختِ سفر کھول چکے منزل پر — شامِ منزل ہی سے اب صبحِ سفر پیدا کر
داستانِ مے و مینا تو بہت عام ہوئی — کوئی افسانہ بعنوانِ دگر پیدا کر

یوجین اونیل[1] اور فضل حق قریشی دہلوی

آرٹسٹ کی زندگی اور موت

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افراد

(۱) مسز رولینڈ

(۲) الفریڈ رولینڈ (اسٹیج کے باہر)

منظر:- امریکہ کا شہر نیویارک ایک مختصر مکان کا چھوٹا سا کمرہ جو بیک وقت باورچی خانے اور کمرۂ طعام کا کام دیتا ہے۔ عقب میں دائیں جانب ایک دروازہ جو ایک بیرونی وسیع ہال میں کھلتا ہے۔ دروازے کے بائیں جانب ہاتھ دھونے کا نل اور گیس کا چولہا چولہے سے ذرا ہٹ کر لکڑی کا گنجینہ جس میں طشتریاں وغیرہ رکھی ہیں۔ بائیں طرف دو کھڑکیاں جن کی دہلیزوں میں چند گملے غفلت ولاپروائی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کھڑکیوں کے سامنے ایک میز جس پر روغنی کپڑا ہے بید لگی ہوئی دو کرسیاں میز کے قریب رکھی ہیں۔ ایک تیسری کرسی عقبی دروازے کے دائیں جانب دیوار کے پاس پڑی ہے۔ داہنی دیوار کا ایک دروازہ خواب گاہ میں کھلتا ہے۔ جہاں مختلف قسم کے کپڑے کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے ہیں۔ کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک الگنی بھی بندھی ہوئی ہے

صبح کے تقریباً ساڑھے دس بجے ہیں۔ موسم خوشگوار ہے۔ دھوپ کھلی ہوئی ہے۔ مسز رولینڈ خواب گاہ سے جماہی لیتی ہوئی نکلتی ہے۔ اس کے ہاتھ چہرے مہرے کو درست کرنے میں مصروف ہیں۔ خصوصاً انگلیاں بڑی سرعت کیساتھ بالوں میں پن لگا رہی ہیں۔ بال گلہری کے گھونسلے سے نکلے ہوئے گوڈر کی طرح ایک گچھے کی شکل میں چندیا پر جمے ہوئے ہیں۔ اس کا قد میانہ ہے۔ جسم بے ڈول اور غیر جاذب نظر نیلگوں لباس جس کی تراش بغیر کسی اصول کے وضع کی ہے جسم پر بے زیب معلوم ہوتا ہے۔ ڈھیلا ڈھالا اور کہیں کہیں سے پھٹا چرا۔ خد و خال، نقش و نگار میں وہ سیدھی سادی با فاخصلگی ہے۔ جس میں کوئی حسن کاری نہ ہونے کے باعث جاذبیت نہیں ہوتی۔ عمر ۲۲ سال ہوگی۔ مگر چہرے سے بڑھاپن ظاہر ہونے لگا ہے۔

وہ کمرے کے وسط میں پہنچ کر پھر جماہی لیتی ہے۔ اور ایک طویل انگڑائی کے بعد ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ دیر تک سونے کے باوجود اس کی نیند نہیں بھری۔ اس کی خوابناک آنکھیں کمرے میں کسی چیز کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ چند لمحے کے بعد وہ مریل بیل کی طرح آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گیس کے چولہے کے پاس پہنچتی ہے۔ اور دیا سلائی کھینچ کر اسے روشن کر دیتی ہے۔ پھر نل کے پانی سے کیتلی بھر کر شعلوں پر رکھ دیتی ہے۔ اس کام سے گویا تھک کر وہ میز کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر دراز ہو جاتی ہے۔ اور پیشانی پر اس طرح انگلیاں پھیرتی ہے گویا سر میں درد ہو رہا ہے۔ اچانک اس کے چہرے پر ایک تازگی دوڑ جاتی ہے۔ گویا کوئی بھولی بسری رات یاد آ گئی ہے۔ گنجینے اور اس کے اندر رکھی ہوئی طشتریوں کا جائزہ لیتی ہوئی اس کی نظریں خواب گاہ کے دروازے کی طرف اٹھتی ہیں اور کان ایک ایسی آہٹ پر لگ جاتے ہیں جو خود اس کے اوہام خیالی نے پیدا کی ہیں۔

---

[1] یوجین اونیل امریکہ کا سب سے کامیاب تمثیل نگار ہے اور اسے نوبل پرائز مل چکا ہے

مسز رولینڈ (آہستہ لہجہ میں) الفریڈ ...... الفریڈ ...... دوسرے کمرے سے کوئی جواب سُنائی نہیں دیتا۔ مجبوراً وہ کسی قدر مشکوک مگر بآواز بلند کہتی ہے) بظاہر مت کرو کہ تم سو رہے ہو۔ (اس کا بھی کوئی جواب خواب گاہ سے نہیں ملتا۔ اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ کوئی جواب نہیں ملیگا۔ وہ کرسی سے اٹھتی ہے۔ اور پنجوں کے بل گنجینہ تک جاتی ہے۔ پھر پوری احتیاط کیساتھ کہ کہیں کوئی آواز نہ ہو جائے۔ وہ دروازہ کھول کر شراب کی بوتل اور گلاس نکالتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں دوسری اشیا کے پیچھے اس طرح چھپی ہوئی ہیں کہ پہلی جھلک میں کسی کو نظر نہ آئیں۔ حد درجہ احتیاط کے باوجود گلاس کا کنارہ ایک طشتری سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس آواز سے وہ خود اس طرح چونک پڑتی ہے گویا اس کا ضمیر مجرم ہے اور ملتجیانہ نظروں سے دروازہ کی طرف دیکھتی ہے گویا معافی کی خواستگار ہے)

(کپکپاتے ہوئے لہجہ میں) الفریڈ!

(ایک لمحہ وہ خاموش رہتی ہے۔ کہ شاید کوئی آواز سنائی دے۔ مگر مطمئن ہو کر شراب کے چند جرعے گلاس میں انڈیلتی ہے اور غٹ غٹ پی جاتی ہے۔ پھر انتہائی عجلت کیساتھ کہ کہیں آخر وقت میں راز فاش نہ ہو جائے وہ گلاس اور بوتل کو گنجینہ میں چھپا دیتی ہے۔ اور دروازہ کو اسی احتیاط کیساتھ جس طرح کھولا تھا آہستہ آہستہ بند کر دیتی ہے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر اور اطمینان کا سانس لینے کے بعد کرسی پر دوبارہ بیٹھ جاتی ہے۔ الکحل کے وہ نشہ آور گھونٹ اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو شراب بنا دیتے ہیں۔ جس کے باعث تمام جسم تمتما اٹھتا ہے۔ رخساروں پر سرخی دوڑ جاتی ہے اور معلوم ہونے لگتا ہے۔ کہ اس کے مردہ جسم میں زندگی کی تھوڑی سی رمق باقی ہے۔ تبسم کی ہلکی لہر اس کے لبوں پر نمودار ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر دروازہ کی طرف دیکھتی ہے لیکن وہاں زندگی کی کوئی لہر محسوس نہیں ہوتی۔ پھر ہٹ کر اس کی نظریں کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ اور صدری پر جم جاتی ہیں۔ وہ چوروں کی طرح کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور قریب پہنچ کر رک جاتی ہے۔ نظر کے سامنے تو نہیں سہی لیکن خواب گاہ میں کسی کی موجودگی کا اسے یقین ہے۔ وہ کان لگا کر سننے کی کوشش کرتی ہے)

(خفیف مدہم لہجہ میں) الفریڈ!!

(اس دفعہ بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔ جھپٹ کر وہ کھونٹی کے اوپر سے کوٹ اور صدری اتار لیتی ہے۔ اور ان کو لیکر بدستور کرسی پر آن بیٹھتی ہے۔ جیب تلاشی کرنے پر جیبیں بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ مطلب کی کوئی چیز نہیں ملتی مگر اچانک صدری کی اندرونی جیب سے ایک خط برآمد ہوتا ہے)

(طرز تحریر کو دیکھتے ہوئے) ہاں ہاں یہ تحریر میں پہچانتی ہوں۔

(وہ خط کھول کر پڑھنا شروع کرتی ہے۔ شروع میں چہرے پر نفرت اور غصّے کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں تبدیلی ہوتی ہے حتیٰ کہ فاتحانہ مسکراہٹ اپنا رنگ جما لیتی ہے۔ چند لمحے وہ کسی سوچ میں غرق رہتی ہے۔ اس طرح کہ ہاتھوں پر تھمے ہوئے خط پر نظریں جمی رہتی ہیں اور لبوں پر ایک ظالمانہ تبسم آجاتا ہے پھر وہ خط کو ملفوف کر کے صدری کی اسی جیب میں رکھ دیتی ہے اور اتنی احتیاط کیساتھ کہ سونیوالا بیدار نہ ہو جائے۔ دونوں چیزیں وہیں کھونٹی پر لٹکا دیتی ہے۔ وہ خوابگاہ پر ٹھٹھک کر ایک آخری نظر ڈالتی ہے)

(تند و تیز لہجہ میں) الفریڈ ــــ بلند تر لہجہ میں) الفریڈ

(گھٹی ہوئی کراہنے کی آواز جب کہ کوئی ساتھ ساتھ جماہی بھی لے رہا ہو۔ دوسرے کمرے سے سُنائی دیتی ہے)

تمہیں نہیں معلوم کہ اب اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے؟ کیا تم تمام دن پلنگ سوار رہنا چاہتے ہو؟ (پلٹ کر اپنی کرسی کی طرف آتے ہوئے) اس کا تو مجھے کامل یقین ہے کہ تم اس حد تک کاہل اور سُست ہو کہ تمام دن بستر پر پڑے رہو۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر بیچینی کے ساتھ کھڑکی کے باہر دیکھتی ہے۔ خدا جانے اس وقت کیا بجا ہوگا۔ جب سے تم نے اپنی اہمال پسندی کے باعث گھڑی رہن رکھی ہے۔ ہم وقت کا صحیح اندازہ لگانے کے لائق بھی نہیں رہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے پاس بس وہی آخری قیمتی چیز تھی۔ جس کو رہن رکھ کر تم نے خاک میں ملا دیا۔ ہر چیز ہمارے قبضہ سے نکل گئی۔ اسی امید موہوم میں کہ شاید کوئی روزگار مل جائے (وہ فرط جوش میں اپنا پاؤں فرش پر مارنے اور دانتوں سے لب چبانے لگتی ہے۔ ایک لمحہ خاموشی کے بعد) الفریڈ! اٹھو۔ فوراً اٹھ جاؤ۔ تم نے سُنا یا نہیں۔ میں باہر جانے سے پہلے بستر ٹھیک کر دینا چاہتی ہوں۔ میں تمہارے ہاتھوں اس جگہ بد دلی سے اکتا گئی ہوں۔ (بظاہر مطمئن انداز سے) یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ تم کو کسی قسم کا بھی روزگار مل جانے کے بعد ہم اسی جگہ نہیں پڑے رہیں گے۔ خدا جانتا ہے کہ میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں۔ اپنی ہمتوں سے زیادہ۔ صبح سے شام تک سینے پرونے میں مصروف رہتی ہوں۔ اور تم تمام دن دنیا کے چھنٹے ہوئے اوباش یعنی معتوروں شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ تضیع اوقات کرتے ہو چکلوں اور میخانوں میں۔

(ایک خفیف وقفہ۔ اس دوران میں وہ بہت چالاکی کیساتھ اس طرح

کھیلتی ہے۔ گویا اس کے اعصاب میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے)

اور تم روپیہ لاؤ گے کہاں سے۔ آخر مجھے بھی تو معلوم ہو؟ اس ہفتہ مکان کا کرایہ نہیں دیا گیا۔ اور تم مالک مکان کی ذہنیت سے واقف ہو۔ وہ اس کے بعد ہمیں ایک لمحہ قیام کا بھی روادار نہیں ہوگا۔ تم کہتے ہو کہ روزگار نہیں ملتا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔ تم نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ تمہارا تمام دن شاعری کی بھول بھلیاں میں بسر ہوتا ہے۔ بس لکھے جاؤ۔ بے معنی نظمیں جنہیں کوئی پھوٹی کوڑی کے عوض بھی نہیں خرید سکتا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان میں ہوتا ہی کیا ہے۔ ملک اور قوم کی خدمت تو کجا تم ان کے ذریعے اپنی خدمت بھی نہیں کر سکتے۔ میرا تجربہ ہے کہ مجھے روزگار جلدی مل جاتا ہے۔ اور صرف اسی طرح ہم اب تک فاقہ کی موت مرنے سے بچے ہوئے ہیں۔

(اٹھ کر چولھے کے قریب جاتی ہے اور کیتلی میں نظر ڈال کر دیکھتی ہے۔ یہ معلوم کرنے کیلئے کہ پانی کھولا یا نہیں۔ پھر واپس آ کر بدستور کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

خواہ کچھ بھی ہو آج تو تمہیں کچھ نہ کچھ رقم پیدا کرنی ہی پڑے گی۔ کیا ضروری ہے کہ میں ہی مصیبت جھیلوں۔ میں اس سے زیادہ اپنی جان نہیں کھپا سکتی۔ اب تمہیں اپنی آنکھیں کھولنی پڑیں گی۔ اپنے حواس درست کرنے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم۔ بھیک مانگو، قرض لو یا چوری کرو۔ لیکن روپیہ لاؤ۔ روپیہ (نفرت آمیز قہقہہ کے ساتھ) لیکن کہاں سے اور کس طرح؟ میں جاننا چاہتی ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ تم اس قدر مغرور ہو کہ بھیک نہیں مانگ سکتے۔ اور قرض اس قدر لے چکے ہو کہ اب دوست احباب اور عزیز و اقارب کو تم پر اعتماد نہیں رہا۔ چوری کرنے کیلئے اعلیٰ ہمت اور قوی دل کی ضرورت ہے۔ جس کی تمہارے پاس کمی ہے (ایک لمحہ کے بعد غصہ میں کھڑے ہو کر) کیا تم ابھی تک بیدار نہیں ہوئے؟ (خدا کی پناہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک بار اٹھ کر پھر سو گئے ہو۔ یا پڑے اینٹھ رہے ہو۔ (وہ خواب گاہ کے دروازے کے قریب جا کر اندر نظر ڈالتی ہے۔ غنیمت ہے تم اٹھ بیٹھے۔ وقت کا احساس تو ہوا۔ لیکن یہ کیا ہے میری طرف ان نظروں سے مت دیکھو۔ تمہارے یہ انداز مجھے زیادہ بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ میں تمہاری ذہنیت کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ اتنی اچھی طرح کہ تم میرے سمجھنے کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (دروازے کے پاس سے ایک معنی خیز انداز میں ہٹتے ہوئے) میرے عزیز شوہر! مجھے بہت کچھ معلوم ہے۔ اور حالانکہ جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کی فکر نہ کرنا۔ جاننے سے قبل تم کو سب کچھ بتا دوں گی۔ فی الحال کیوں پریشان ہو۔

(وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہو کر تیوری پر بل ڈالتی ہے۔ پھر زیادہ برہمی کے ساتھ) ہوں۔ شاید اب تک مجھے ناشتہ تیار کر لینا چاہیئے تھا۔ خواہ گھر میں کچھ موجود ہو بھی یا نہیں۔ تم کو روپے پیسے سے کیا غرض۔ ٹھیک ہے نا۔ (وہ منتظر رہتی ہے کہ شاید کوئی جواب ملے۔ مگر بے سود) میرا سوال ہی حماقت آمیز ہے۔ (مختصر مگر دلدوز قہقہہ کے بعد) اب ضرورت ہے کہ میں تمہیں اور زیادہ سمجھنے کی کوشش کروں۔ کل رات جب تم برہم ہو کر یہاں سے گئے تو میں جانتی تھی کہ اس کا نتیجہ کیا رہے گا۔ اب تم پر ایک لمحہ کیلئے بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تم کس قدر آن بان سے گھر واپس آئے۔ ہمارا باہمی جھگڑا گویا تمہارے لئے ایک معقول بہانا بن گیا کہ تم گھر سے دُور رہ کر اپنے آپ کو جانوروں سے بدتر کر لو۔ اور پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ گھڑی رہن رکھنے کی کیا خاص ضرورت تھی۔ سوائے اس کے کہ تھوڑی بہت شراب خرید کر تمام رقم برباد کر دی۔

(گنجینے کے قریب جا کر طشتریاں اور پیالیاں وغیرہ نکالتی ہے۔ لیکن سلسلۂ کلام جاری رہتا ہے)

جلدی کرو۔ آج کل ناشتہ تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ خدا تمہارا بھلا کرے تمہاری عنایتوں کے باعث ہمارے گھر میں معمولی روٹی مکھن اور کافی کے سوا اور رکھا کیا ہے۔ پھر بھی اسے غنیمت سمجھو۔ میں نے سی پرو کر چار پیسے کمائے ورنہ اس کے بھی لالے تھے۔

(وہ ایک دھماکے کیساتھ روٹی کو میز پر پٹکتی ہے)

روٹی باسی ہو کر سوکھ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اسے پسند کرو گے۔ تم کو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ملنی چاہیئے۔ لیکن میں تمہارے ساتھ کیوں مصیبت جھیلوں۔ (چولھے کے قریب جاتے ہوئے) ایک منٹ میں کافی تیار ہو جائیگی اور تمہیں یہ توقع رکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ (یکایک بہت غصہ کے ساتھ) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کر رہے ہو؟ (دروازے کے قریب جا کر نظر ڈالتی ہے)

بہر حال لباس تو تم نے تقریباً پہن ہی لیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تم دوبارہ پلنگ پر تو نہیں لیٹ گئے۔ کیونکہ یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ آج تم کس قدر بھیانک معلوم ہو رہے ہو۔ خدا کے لئے ڈاڑھی صاف کرو۔ تمہیں دیکھ کر طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔ تم آوارہ گرد معلوم ہو رہے ہو۔ ایسی حالت میں تمہیں روزگار نہ ملے تو تعجب کی بات نہیں۔ دوسروں کو الزام کیوں دیا جائے کہ

ایشیا مارچ ۱۹۵۳ء

ملازم نہیں رکھتے۔ خباست سے کسی وزن کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ (چولہے کے قریب جاتے ہوئے) یہ دیکھو گرم پانی کی کافی مقدار یہیں موجود ہے۔ اب کسی عذر کی گنجائش نہیں ہے۔ (ایک پیالی میں تھوڑا سا گرم پانی کیتلی کے اندر سے انڈیلتی ہے) لو یہ رہا پانی۔

ایک مردانہ ہاتھ خواب گاہ کے دروازے کے باہر نکلتا ہے۔ اس میں خفیف سا ارتعاش ہے۔ انگلیاں بھی کپکپا رہی ہیں۔ پیالی کو سنبھالنے کی کشمکش میں تھوڑا پانی چھلک کر فرش پر گر پڑتا ہے۔

(ملامت کرتے ہوئے ذرا ہاتھ کی لرزش ملاحظہ ہو۔ کہتی ہوں کہ تم شراب پینی چھوڑ دو۔ تم اسے برداشت نہیں کر سکتے لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ فرش کی طرف دیکھ کر) فرش کی حالت بھی قابل دید ہے سگرٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے۔ دیا سلائیاں اور راکھ۔ کونے کونے میں چپہ چپہ پر کیا تم نہیں راکھ دان میں نہیں ڈال سکتے تمہاری بلا سے۔ تمہیں میری مصیبتوں کا احساس ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تمہیں کمرے کے اندر جھاڑو دینی پڑے تو حقیقت معلوم ہو۔

(جھاڑو اٹھا کر کسی قدر شرارت کیساتھ صفائی شروع کر دیتی ہے اس طرح کہ خوب خاک اڑنے لگتی ہے دوسرے کمرے سے تمسخر آمیز کھانسی کی آواز سنائی دیتی ہے)

(جھاڑو دیتے ہوئے، جلدی کرو میری روانگی کا وقت قریب آگیا ہے۔ اگر مجھے دیر ہو گئی تو اندیشہ ہے۔ کہ ملازمت سے جواب نہ مل جائے۔) اور پھر ظاہر ہے کہ گذارا کیوں کر ہو سکے گا۔ (طنزاً) اور ہاں تمہیں بھی تو کام کی تلاش میں جانا ہے ورنہ بیکاری تمہیں زیادہ تباہ کر دے گی۔ (میز کے نیچے سے کوڑا نکالتے ہوئے) میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم آج روزگار کی تلاش میں جاؤ گے یا نہیں تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ دوسرے عزیز و اقارب ہماری مدد کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ وہ بھی تمہارا رنگ اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ (ایک لمحہ تک خاموشی کیساتھ جھاڑو دینے کے بعد) ~~میں ... تنگ آگئی ہوں~~۔ میں سوچ رہی ہوں۔ کہ اپنے میکے چلی جاؤں لیکن مشکل یہ آپڑی کہ سب میرے گھر والوں کو میری زبوں حالی کا علم ہو جائے گا۔ ابھی تک وہ جانتے ہیں کہ میں لکھ پتی رولینڈ کے اکلوتے بیٹے کی شریک حیات ہوں۔ رولینڈ جو گریجویٹ ہونے کے علاوہ ایک کہنہ مشق شاعر اور بے مثل افسانہ نویس بھی ہے۔ جو اس وقت شہر کی ناک ہے۔ ہوں! (حقارت آمیز لہجہ میں) لیکن دنیا کے بہت سے لوگ اس ممتاز ہستی سے حسد کرنا چھوڑ دیں گے۔ اگر حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ تمہارے لکھ پتی باپ مرنے سے قبل ہزاروں کے زیردار تھے۔ اور شادی کے بعد سے آج تک تم نے اپنی بیوی کیلئے کتنی رقم صرف کی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اور اس پر یہ غرور ہے کہ تمہاری شریک حیات بننا گویا میرے لئے باعث فخر ہے۔ کیا اس لئے کہ میں بے شمار مصیبتوں میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ تم اپنے دوستوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے شرم محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ میرا باپ بقال ہے۔ اور خود تم کیا ہو؟ میرا باپ کم سے کم ایماندار سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ افتخار تمہارے باپ کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔ تمہارے لکھ پتی باپ کو جو مرنے کے وقت ہزاروں کا قرضدار تھا۔

(وہ بڑی سرعت سے کوڑے کو دروازے کی طرف لے جا رہی ہے۔ ایک لمحہ کیلئے جھاڑو کا سہارا لیکر جھک جاتی ہے)

تم چاہتے تھے۔ ہر شخص یہ خیال کرے کہ تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے مجبور کئے گئے ہو۔ تمہیں میری حالت زار پر رحم آگیا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ شادی سے قبل تم بڑی دلیری کے ساتھ میری محبت کا راگ الاپتے رہے اور تم نے کوشش کی کہ میں تمہارے ہر فریب کو ایک صداقت سمجھوں لیکن اب میں اصلیت سے ناواقف نہیں رہی۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں نے بے حسی کی زندگی بسر نہیں کی ہے۔ (سنجیدگی سے) غنیمت ہے کہ ہمارا غریب بچہ مر کر پیدا ہوا۔ اچھا ہوا کہ تم اس کے باپ نہ بن سکے۔

ایک لمحہ کیلئے خاموشی کیساتھ جھاڑو دیتی رہتی ہے۔ پھر ایک وحشیانہ مسرت کے ساتھ سلسلۂ گفتگو کو جاری کرتی ہے) لیکن صرف میری ہی ذات اس امر کی شکریہ ادا کرتی ہے کہ تمہاری عنایتوں سے میری زندگی وبال جان بنی ہوئی ہے بلکہ ایک ہستی اور بھی ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ اور اب وہ تم سے شادی کرنے کی امید بھی ترک کر چکی ہے۔ اس کا بھی مجھے علم ہے۔ (دوسرے کمرے میں سر بڑھا کر) ہیلن کی بابت کیا رہا؟ وہ نیم خوفزدہ ہو کر الٹے قدموں ہٹ جاتی ہے) میری طرف اس طرح مت دیکھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے خط پڑھ لیا ہے۔ آخر اس میں کیا حرج ہے؟ یہ میرا حق تھا میں تمہاری شریک حیات ہوں اور میں اس سلسلہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ لہذا مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔ مجھے گھور کر مت دیکھو۔ تم اپنے جادو بھرے انداز سے میرے دل کو نہیں موہ سکتے۔ اگر میں چاہوں تو آج صبح بغیر ناشتے کے تم کو باہر بھیج سکتی ہوں۔ (وہ جھاڑو کو ایک کونے میں رکھ دیتی ہے) تم نے میری خدمات کے عوض شکریہ تک کبھی ادا نہیں کیا (وہ چولہے کے قریب آکر کیتلی میں کافی ڈال دیتی ہے) کافی تیار ہو گئی ہے۔ میں تمہارا انتظار نہیں کر سکتی (وہ دوبارہ اسی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) کچھ دیر بعد پیشانی پر ہاتھ رکھ کر غور و فکر میں)

آج صبح ہی صبح میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کس قدر شرمناک امر ہے۔ کہ اس حالت کے باوجود مجھے ایک گندے کمرے میں دن بھر کام کرنے کیلئے جانا پڑے گا۔ اور میں آج نہ جاتی۔ اگر تمہارے اندر ذرا بھی انسانیت ہوتی۔ میرا حق ہے۔ کہ بجائے تمہارے میں تمام دن آرام سے پلنگ پر پڑی رہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں گذشتہ سال کس قدر بیمار رہی ہوں۔ اور پھر بھی اگر میں ذاتی آسائش کے لئے کچھ خرچ کر کرادوں تو تم اعتراض کرتے ہو۔ تم اتنا بھی نہیں چاہتے کہ میں کوئی تقویت کی دوا استعمال کر لوں (بلند قہقہہ کے ساتھ) میں جانتی ہوں کہ میری موت تمہارے لئے باعث مسرت ہوگی۔ میں تمہارے راستے میں ایک کانٹا بنی ہوئی ہوں۔ میرے بعد تم کو آزادی ہوگی۔ تم اُن بیوقوف لڑکیوں پر آسانی سے ڈورے ڈال سکوگے۔ جو تمہارے اور تمہاری قابلیت کے متعلق زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جو تمہیں خدا جانے کیا سمجھتی ہیں۔ یہ ہیلن اور اسی قماش کی دوسری نوجوان لڑکیاں۔

(دوسرے کمرے سے ایک دردناک آہ سنائی دیتی ہے۔)

(اطمینان کے ساتھ) ٹھیک بالکل ٹھیک۔ میں جانتی تھی کہ تم استرے سے اپنے آپ کو زخمی کرلوگے۔ اس طرح شاید تمہیں کچھ سبق مل جائے۔ تم خود بھی جانتے ہو کہ تمہیں رات رات بھر آوارہ گردی کرتے ہوئے اور شراب پیتے ہوئے زندگی خراب نہیں کرنی چاہیئے۔

(وہ دروازے کے قریب جاکر اندر کی طرف دیکھتی ہے)

تم اس قدر زرد کیوں نظر آرہے ہو؟ تم آئینہ میں اپنے ہی عکس کو اس قدر گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ خدا کے لئے اپنے چہرے سے اس خون کو پونچھ ڈالو۔ (سہم کر) کس قدر خوفناک منظر ہے۔ (پُرسکون لہجہ میں) تاہم مناسب یہی ہے۔ میں خون کا نظارہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی (وہ جھجک کر پیچھے ہٹ جاتی ہے) میرا خیال ہے کہ تم کوشش کرو اور کسی حجام کی دوکان پر چلے جاؤ۔ تمہارے ہاتھ خوفناک طریقے پر کپکپا رہے ہیں۔ لیکن تم مجھے گھور کیوں رہے ہو؟ (وہ دروازے کے پاس پلٹ آتی ہے) کیا اس خط کی وجہ سے تم مجھ پر برہم ہو رہے ہو! آخر وجہ؟ اس کو پڑھ لینا میرا حق تھا۔ میں تمہاری شریک حیات ہوں۔

(واپس آکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک لمحہ خاموش رہتی ہے)

میں پہلے سے جانتی تھی کہ تم کسی نہ کسی پر ڈورے ڈال رہے ہو۔ میں تمہارے اس فریب میں نہیں آسکتی۔ کہ تم اپنا قیمتی وقت دارالمطالعہ میں بسر کرتے ہو۔ اچھا بتاؤ یہ ہیلن کون ہے؟ کیا کوئی مہوزہ ہے؟ یا اسے بھی شعروشاعری کا شوق ہے

اس کے خط سے کم سے کم یہی ظاہر ہوتا ہے۔ میں شرط لگاتی ہوں کہ اس نے تمہارے کلام کو ایک نوشتۂ قدرت سے زیادہ قابل تحسین بتایا۔ اور تم نے ایک بیوقوف کی طرح ان الفاظ کو صحیح سمجھا۔ کیا وہ نوجوان اور خوبصورت ہے؟ کبھی میں بھی جوان اور خوبصورت تھی۔ اس وقت تم مجھے اپنی شاعرانہ رنگین بیانی سے بیوقوف بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن تمہارے ساتھ رہ کر ہر عورت اپنی زندگی سے اکتانے لگے گی۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

(کھڑے ہوکر کافی کو چولھے کے اوپر سے اُتار لیتی ہے)

ناشتہ تیار ہے۔ (نفرت سے نظر ڈال کر) ناشتہ! (صرف اپنے لئے ایک پیالی میں کافی انڈیلتی ہے۔ اور چائے دانی کو میز پر رکھ دیتی ہے۔) تمہاری کافی ٹھنڈی ہوجائے گی۔ تم کیا کر رہے ہو؟ حجامت ختم نہیں ہوئی؟ خدا کے لئے بس کرو۔ ان دنوں کسی نہ کسی صبح کو تم کوئی گہرا زخم کھاؤگے۔

(روٹی میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر مکھن لگاتی ہے۔ بعد کی گفتگو کے دوران میں وہ توس کھاتی اور کافی کا گھونٹ لیتی جاتی ہے۔)

ناشتہ ختم کرتے ہی مجھے بھاگ جانا پڑے گا۔ ہم دونوں میں سے بہرحال ایک کو کام کرنا ہی پڑے گا۔ (ناراضگی کے ساتھ) بتاؤ۔ تم روزگار کی تلاش میں جاؤگے یا نہیں؟ مجھے یقین ہے کہ تمہارے مخلص دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی تمہاری مدد کرنے کے لئے تیار ہو جائیگا۔ بشرطیکہ وہ تمہیں کسی لائق سمجھتا ہو۔ لیکن میرا قیاس ہے کہ وہ سب تمہاری چرب زبانی کے شیدائی ہیں۔

(ایک لمحہ کیلئے خاموش بیٹھ جاتی ہے)

وہ ہیلن خواہ کوئی بھی ہو۔ مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ کیا تم دوسروں کے جذبات کو محسوس نہیں کرتے؟ اُس کے خاندان کے لوگ کیا کہیں گے؟ اپنے خط میں اس نے اس قسم کا ذکر کیا ہے۔ آخر اس نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ ایک بچے کی ماں بنے گی۔ یا کسی دائی وغیرہ کی مدد سے بدنامی کے داغ کو قبل از وقت مٹا دے گی۔؟ معاملہ ہے بہت پُرلطف۔ لیکن اس غریب کے پاس روپیہ کہاں سے آئیگا؟ کیا وہ کسی امیر گھرانے کی لڑکی ہے؟

(وہ رک جاتی ہے۔ کہ شاید ان سوالات کے طومار میں سے کسی ایک کا جواب مل جائے۔)

ہاں! میں جانتی ہوں۔ تم اس کی بابت مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے اس پر ضرورت سے زیادہ ترس آرہا ہے۔ اسے اپنے نیک و بد کا احساس ہونا چاہیئے تھا۔

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عرصہ میں پڑھنے والی کم فہم لڑکیوں میں سے
نہیں ہے۔ کیا اسے معلوم ہے کہ تم شادی شدہ ہو؟ یقیناً اُسے معلوم ہونا چاہئے
تمہارے سب دوستوں کو معلوم ہے کہ تم ایک دل سوز ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہو۔
مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انہیں تمہاری حالت پر ترس آتا ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ
اُن کی نگاہ کے سامنے نہیں ہے۔ اگر وہ مجھ سے گفتگو کریں تو اُن کے نظریے ہی
بدل جائیں۔

(کھانے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اور گفتگو ذرا رُک رُک کر کرتی ہے)

اگر ہیلن کو یہ معلوم ہے کہ تم شادی شدہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ وہ بہت ہی لائق لڑکی
ہے۔ پھر وہ کس بات کی منتظر ہے؟ بس یہی نا کہ میں تمہیں طلاق دوں اور وہ تم سے شادی
کرلے۔ کیا وہ سمجھتی ہے کہ میں اتنی بیوقوف ہوں؟ تم خود بھی جانتے ہو کہ مجھ سے طلاق
لے کر چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے۔ میں اس قسم کی غلطی نہیں کرسکتی۔

(کافی کی پیالی خالی کر دیتی ہے۔)

میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ وہ اس لائق ہے کہ اسے جس قدر بھی روحانی صدمے پہنچیں
کم ہیں۔ یہی میری رائے سو مرتبہ خیال ہے۔ کہ تمہاری ہیلن ایک بازاری عورت سے
کسی طرح کم نہیں ہے۔

(دوسرے کمرے سے تکلیف کی ایک مبہم سی آواز سنائی دیتی ہے)

کیا پھر کہیں سے کاٹ لیا۔ خوب ہوا۔ تمہارا یہی علاج ہے۔ اچھا اب مجھے دوڑ جانا چاہئے
میرے لئے اس قسم کی زندگی بسر کرنا بہت دلچسپ ہے۔ میں تمہاری ستم رانیاں زیادہ
عرصہ برداشت نہیں کرسکتی۔

(اسے ایک عجیب آواز سنائی دیتی ہے۔ اور وہ اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے کان
لگا کر کھڑی ہو جاتی ہے)

ہیں! یہ کیا؟ تم نے تمام پانی انڈیل دیا۔ تم انکار نہیں کرسکتے۔ فرش پر اس کے ٹپ ٹپ
گرنے کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی ہے۔ (ایک نامعلوم خوف کی مبہم سی کیفیت
اس کے چہرے پر نمودار ہوتی ہے۔) الفریڈ!۔ تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں
دیتے؟ (وہ آہستہ آہستہ کمرے کی طرف بڑھتی ہے۔ کرسی سے لڑھک کر گرنے کی آواز
سنائی دیتی ہے۔ اور فرش سے کسی چیز کا تصادم ہوتا ہے۔ وہ خوف سے تھرتھراتی
ہوئی کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے)

الفریڈ! ۔۔ الفریڈ! میری بات کا جواب دو۔ تم کس چیز سے ٹکرا کر گرے ہو۔ کیا
اس وقت بھی تم نشہ کی حالت میں ہو۔

الفریڈ!

(وہ دروازے کے قریب رُک جاتی ہے۔ اس کی نظریں اندرونی کمرے
کے فرش پر جم جاتی ہیں۔ شدید خوف اس کے تمام جسم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ
بے تحاشا چیخنے لگتی ہے۔ اور بیرونی دروازے کی طرف دوڑ کر اسے کھولتی ہے۔ اور
پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی بیرونی وسیع ہال کی طرف بھاگ جاتی ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

ہماری حقیقت

تن پر نہیں ہے چیتھڑا چولھے ہیں گھر میں ٹھنڈے
رکھتے ہیں پھر بھی اونچے ہم دوسروں کے جھنڈے

مرغی کی خاصیت ہے ہم ہندوستانیوں میں
کھاتے ہیں کوڑا اور دیتے ہیں انڈے

ڈاکٹر ابراہیم قدوائی

ایشیا مارچ ۱۹۳۲ء

[illegible] ان کا رہی قیمت رکھتے ہیں جو [illegible] [illegible] کی حالت ہے۔ آرٹ اسی صورت میں غیر ملک کے امتیازی فرق کے ساتھ ہے جبکہ ضروریات زندگی کی ضروریات میں شامل ہیں۔ آرٹ ضروریات زندگی میں لازماً شامل نہیں۔

ان الفاظ میں اُن لوگوں کی تقلید جھلکتی ہے جو سرمایہ داری کے پیدا کردہ جھیلوں احساس دور میں آرٹ کی مایوس کن حالت پر بے رحمانہ تنقید کرنے کا عادی رہا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر آگے چل کر کہتے ہیں :-

شیلے کا یہ کہنا کہ :-

" دن اور رات سے اک مسرت گم ہو گئی ہے "

اس کا ماتم نہیں ہے۔ یہ ذاتی گھٹن اور غصہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت اہم اور سنجیدہ چیز ہے، یہ ایک بنیادی چیز ہے جو غائب ہو گئی ہے" صفحہ ۱۴

سرمایہ دار سماج پر جو گروہ ترقی پسندانہ تنقید کرتا ہے تاثیر صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر آپ ولیم ہیڈلیٹ کے موید بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ :-

" یہ ممکن ہے کہ تمام قوم سے ترقی یافتہ طبقوں کی جدائی .... اور انسانی دماغوں کی دو جداگانہ طبقوں میں تقسیم (ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ) ایک تیاری ہو جسے میں آرٹ کی مختلف اصناف میں دیکھ رہا ہوں " ص۳۴ ولیم کے قول پر تاثیر صاحب کی رائے ہے کہ :-

" یہ ایک علم ہیئت کا سا انداز ہے لیکن ایک اُس دنیا میں جہاں وہ چیز جسے کبھی مستحکم اور حقیقی سمجھا جاتا تھا۔ غیر حقیقی اور .... معلوم ہوتی ہے کس چیز پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ؟ مستقبل پہلے کے مقابل اب کہیں زیادہ خداؤں کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے " ص۳۵

گویا آپ کے نزدیک سماج نامعلوم مدت تک دو تقسیم شدہ ٹکڑوں کے اُن جھگڑوں کو برداشت کرتا رہیگا جو انسانیت کی تمام تر تباہی کی اصل ہیں اور اگر آخر میں کوئی تبدیلی ہوئی تو وہ منطق کی راہ سے ہٹ کر خدائی رہنمائی کی تلاش کریگا۔ دونوں [illegible] نہیں ہیں۔ دوسرا [illegible] موجودہ نظام برقرار رہ سکتی ہے [illegible] غیر منطقی ہو سکتی ہے۔

[illegible]

[illegible]

عہد چہ سے شروع ہوتا ہے " ص۲۲

لیکن بہر حال ان چند جزئیات کو چھوڑ کر ادب اور سماج، اور خاص کر سرمایہ داری ادب کے ساتھ سماج کے سلوک کا تعلق ہے تاثیر صاحب نئے اسکول کے موئد ہیں :-

عہد سرمایہ داری میں جب عام پیداوار (Mass Production) میں عجلت کیساتھ ترقی ہو رہی ہے۔ یہ اُمید کرنا حقیقتوں سے مذاق کرنا ہوگا کہ سوسائٹی ان فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کو برداشت کر سکتی ہے جو غیر مادی قسم کے فلسفیانہ مسائل سے بحث کرتے ہیں اور جو اپنا مخاطب ایک محدود طبقۂ عقلاء (Intellectuals) کو فرض کئے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں اگر یہ ادیب سوسائٹی کو بُرا کہتے ہیں تو تعجب نہیں کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں سوسائٹی اسکو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے ظاہر ہے کہ ان حالات میں اُن کے لئے صرف دو راستے ہیں یا تو وہ تاثیر صاحب کے الفاظ میں :- رمبانڈ کا راستہ اختیار کریں اور بیسویں صدی کو اپنے پیچھے چھوڑ دیں اور غیر ترقی یافتہ مقامات میں رہن سہن اختیار کریں جس طرح رمبانڈ پیرس کو چھوڑ کر حبش چلا گیا تھا۔ اور یا ایلیٹ کی پیروی کریں، یعنی اپنے خیال میں مگن رہیں، ذاتی تصورات، جنون و خبط کی دُنیا میں گھومتے رہیں اور بالآخر حقیقتوں پر اپنے توہمات کو ترجیح دیں بلکہ خود انھیں کو حقائق سمجھنے لگیں " ص۲۲

بلاشک سرمایہ دار ادیبوں کا انجام یہی ہے اور یہی ادب برائے ادب کے نظریہ کی حقیقت ہے۔

یہ رسالہ محض ۳۹ صفحات کا ہے لیکن اس مختصر سے رسالہ میں تاثیر صاحب نے موضوعات زیر بحث پر عالمانہ بحث کی ہے۔ ادب اور عوام کے موضوع پر یہ کتاب مفید اور بلند مسائل کے بلند اور مفید تر پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ ادب اور اس کے جدید تقاضوں سے روشناس ہونے کیلئے ہر اُس شخص پر اس کا مطالعہ فرض ہے جو تنقید ادب کے نئے پہلوؤں سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ یقیناً اس کا مطالعہ ذہن کے لئے مفکر پیدا کرے گا۔

شیکسپئر ان سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ اُس نے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ شاعر Gives to airy nothing (بے حقیقت چیز کو) A local habitation and a name (اُس کی اصلی جائے قیام اور حقیقی نام) تک عطا کر دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پُرانے زمانہ کی طرح خیالی دنیا میں سرگرداں رہا جائے جسے وہ کبھی زندہ حقیقتیں کہتے ہیں۔ کبھی ادب کا اصلی مقصد بتاتے ہیں۔ انکا نقطۂ نظر ہے۔ زندگی جیسی کہ وہ ہے۔ لیکن ادب برائے زندگی۔ کا گروہ۔ زندگی جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے۔ والے خیالات پر مضبوطی سے اعتقاد رکھتا ہے۔ ٹالسٹائے نے کہا ہے:-

"ادب کا فرض ہے کہ وہ عوام کے زیادہ سے زیادہ حلقہ کو اپنا مخاطب بنائے۔"

اور میکسم گورکی کے خیال میں جو ادب عوام سے قریب نہیں اُسے ختم ہو جانا چاہیئے۔

"ادب برائے ادب" کے علمبرداروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ۔ افادی ادب تشہیری ادب کا نام ہے۔

52

بظاہر اُن کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اور ادب بہرحال پڑھنے دیکھنے یا سُننے والے پر اثر کرتا ہے۔ سماج کی موجودہ حالت میں اس کے دو اثر ہو سکتے ہیں۔ یا وہ ان واقعات کو بیان کرکے اثر ڈالیں جو ہماری زندگی سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے۔ تاثیر کی یہ نوعیت۔ سماج کی موجودہ حالت میں تبدیلی کا باعث نہیں۔ اس لئے یہ تاثیر زندگی جیسی کہ وہ ہے کا نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس سماج کے ان امراض سے بحث کی جائے جو واقعتاً اس میں پائی جاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے لازمی نہیں کہ اس طرح ادب پروپیگنڈہ کے فرائض انجام دے۔ بہرحال اُن کا بیان تاثیر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس صورت میں لازمی زندگی جیسی کہ وہ ہونا چاہیئے۔ کا نتیجہ پیدا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہاں بھی آرٹ محض تاثیری مقصد کیلئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن نتیجہ میں وہ ایک انقلابی فرض بھی ادا کر رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس نے تبدیلی و تغیر کی رُوح دوڑائی ہے۔ اسے تشہیری ادب کہدینا صحیح نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے احساسات کو حرکت میں لانے کیلئے اور فن کے دوسرے اہم اصولوں کے پیش نظر اس کا کیا درجہ ہے۔

ادب برائے زندگی کو تسلیم کرنے والے ادب سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ کسی متعینہ اصول کے پروپیگنڈہ کے ایک آرگن کی حیثیت اختیار کرلے۔ البتہ وہ یہ توقع کرتے ہیں کہ ادب جو ہر عہد میں سماجی احساسات کی نمائندگی کا فرض انجام دیتا رہا ہے۔ آج بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوگا۔ آج کا سماج مختلف طبقوں سے ملکر بنا ہے۔ اس لئے ادب کا فرض ہے کہ ان سب کی مجموعی نمائندگی کا فرض ادا کرے۔ اُن کا مطالبہ صرف اسقدر ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اس مطالبہ کی سنجیدگی سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہ چیز قطعی مختلف ہے، کہ اگر ادب ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے گا تو اسمیں انقلابی خیالات تیزی سے آجائیں گے۔ ان خیالات کی نمود سماج کے مختلف طبقوں کے متضاد احساسات کے اظہار کی صورت میں لازمی ہے۔ لیکن یہ سماج کی اپنی بناوٹ کی خامی ہے۔ اس کی وجہ سے ادب اپنی ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کرسکتا۔

نئے ادب کے تقاضے

زندگی آج نہایت گہری پیچیدہ اور دقیق ہوگئی ہے۔ نئے نئے مسئلے ہیں۔ نئی نئی باتیں، نئے مسافر ہیں نئے راستے دل و دماغ تبدیل ہوگئے ہیں۔ سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کے پیمانے بدل رہے ہیں۔ پرانی قدریں پیچھے ہٹ چکی ہیں۔ نئے اصُول و قوانین اُن کی جگہ آگئے ہیں۔ انسانی خیالات کیلئے نئی نئی الجھنیں اور تصوّرات کیلئے انوکھی کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔ سائنٹفک ایجادات اور نفسیاتی انکشافات نے فکر و نظر کو پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ ان سب حالات کا تقاضہ تھا کہ ادب بھی زیادہ سے زیادہ سائنٹفک دقیق اور بعض حالات میں مُبہم ہو جائے۔ اور ایسا ہی ہوا بھی۔ آج کا ادب پُرانے ادب کے مقابلہ میں کہیں مُبہم اور دقیق ہوگیا ہے۔ اسلوبِ اظہار اور طرزِ نگارش اس قدر سائنٹفک ہو چکے ہیں کہ پُرانے ادبیات کے طالب علم کیلئے جدید ادب بہت کچھ چیستان بنکر رہ گیا ہے۔

"ادب اور آرٹ میں اس عجیب تبدیلی نے انھیں عوام کی دسترس سے دور کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادب کی تقسیم عام فہم اور دقیق ادب میں کی جانے لگی ہے۔ اسی طرح کی تقسیم پہلے بھی تھی لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ پرانا ادب سوسائٹی کی بعض [illegible]

نیا راگ

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

پُجارن

حضرتِ ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری
مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے!

ہز ماسٹرس وائس

پجارن

ہمیں مسرت ہے کہ اس ماہ شائقین کرام کی خدمت میں ہمیں ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنیکا فخر حاصل ہو۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جسمیں ایک شاعر کے دلپذیر جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون ؟ جناب ساغر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے باعث ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنے جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں۔ سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

پجارن ۔ حصہ پہلا

اے مندر کا راز پجارن — اے فطرت کا ساز پجارن
پریم نگر کی رہنے والی — ہر کی بتیاں کہنے والی
گردن میں تلسی کی مالا — دل میں اک خاموش شوالہ
ہونٹوں پر پیمانے رقصاں — آنکھوں میں میخانے رقصاں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

پھینی پھینی بو ساری میں — ساری مدھ میں تو ساری میں
آنکھوں میں جمنا کی موجیں — بالوں میں گنگا کی لہریں
نور ترے رخسار حسیں پر — رنگیں ٹیکا پاک جبیں پر
جیسے فلک پر صبح کا تارا — روشن روشن پیارا پیارا
شرمیلی معصوم نگاہیں — گوری گوری نازک باہیں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

پھولوں کی اک ہاتھ میں تھالی — موہن مدھ ماتی متوالی
نیچی نظریں ترچھی چتون — مست پجارن ہر کی جوگن
چال ہے مستانہ متوالی — اور کمر پھولوں کی ڈالی
دل تیرا نیکی کی منزل — لاکھوں بتخانوں کا حاصل
ہستی تجھ میں جھوم رہی ہے — مستی آنکھیں چوم رہی ہے

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

حصہ دوسرا

آنکھ میں تیری ہے اک آنسو — جیسے ہو ندی میں جگنو
مالا میں کر اس کو شامل — یہ موتی ہے تیرے قابل
دھیان سے اپنے پران بساکر — پاؤں سے تیرے آنکھ ملاکر
پریم کا اپنے نیر بہا دوں — سب کچھ تجھ پر بھینٹ چڑھا دوں
پاپی دل میرا سکھ پائے — میری پوجا کیوں رہ جائے

اے دیوی کا روپ پجارن — تیرا روپ انوپ پجارن

تجھ کو دل کے گیت سناؤں — پھر چرنوں پر سیس نواؤں
ترلوک اور آکاش جھکا دوں — دھرتی کی شکتی لچکا دوں
تارے، چاند اور بھورے بادل — باغ، ندی، دریا اور جنگل!
پربت روکھ اور مسجد مندر — ساقی پیمانہ اور ساغر
دنیا ہو تیرے قدموں پر — قدموں کے نیچے میرا سر

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

ایک پجارن ایک پجاری — پریت کی ریتیں کردیں جاری
دیس میں پریت اور پیار کو بھر دیں — پریم سے کل سنسار کو بھر دیں
لوبھ اور موہ کے بت کو توڑیں — پاپ اور کرودھ کا نام نہ چھوڑیں
پریم کا رس دوڑے رگ رگ میں — ہو اک پریم کی پوجا جگ میں
دونوں اس دھن میں مر جائیں — تیرتھ اک عجیب بنائیں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن [illegible]

مطلوب

ع جہاں بیگم ادا (بدایونی)

تیری حضور چاہیے، تیری جناب چاہیے
حوصلۂ نگہ بھی ہے؟ کچھ تو جواب چاہیے

یہ وہ صدا نہیں جو ہو حرف و بیاں سے آشنا
نغمۂ عشق کے لئے دل کا رباب چاہیے

میری نگاہِ شوق نے اُن کو تلاش کر لیا
وعدۂ صبر آزما! اب تو حجاب چاہیے

رازِ طلب چھپا ہوا، راہ کی سختیوں میں ہے
رہروِ شوق کے لئے دشتِ سراب چاہیے

عشق کی بیخودی کو کیا بادۂ ناب سے غرض
کیف نگاہِ مست سے حالِ خراب چاہیے

سوزِ الم کے آبلے کس سے شمار ہو سکیں!
حالِ تبہ کی دید کو چشمِ پُر آب چاہیے

وعدہ کیا تھا آپ نے وعدہ وفا نہ کر سکے
مجھ سے حجاب کس لئے خود سے حجاب چاہیے

دیدۂ و دل کی ہے خطا دونوں گناہگار ہیں
کس پہ نگاہِ لطف ہو کس پہ عتاب چاہیے

زیست وہی ہے جو رہے درد سے لذّت آشنا
جامِ حیات میں مجھے تلخ شراب چاہیے

میری نگاہِ شوق ہے اور نظارۂ جمال
جلوۂ ماہتاب اب زیرِ سحاب چاہیے

ٹوٹے جو ایک آہ میں چُور ہو اک نگاہ میں
ساغرِ زندگی ادا رشکِ حباب چاہیے

دُور ہے تیری منزل!

"ابھی دور ہے تیری منزل مسافر"

سُناتا ہوا زندگی کا فسانہ
نگاہوں میں منزل لبوں پر ترانہ
ترے ساتھ ہو جائے گا خود زمانہ
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

پیامِ محبت سُناتا چلا جا
کدورت کے شعلے بجھاتا چلا جا
مسرت کے موتی لٹاتا چلا جا
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

یہ تاریک شب اور یہ لودِ باراں
یہ تیزی ہوا کی یہ اُمڈا سا طوفاں
کڑک بجلیوں کی ہے کیا حشر ساماں
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

برستے ہیں ہر لحظہ گولے فضا سے
بکھرتے ہیں شعلے سے موجِ ہوا سے
تمسخر کیا جا رہا ہے قضا سے
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

ترے جوش تک ہے یہ تزئینِ محفل
عمل ہے فقط زندگانی کا حاصل
سکوں سے بہت دور ہے تیری منزل
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

ترا راستہ سخت مشکل ہے لیکن
مصائب کی دیوار حائل ہے لیکن
بہت نرم و نازک ترا دل ہے لیکن
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

ہے بے نور شمعِ شبستاں ابھی تک
ہے تاریک صبحِ غریباں ابھی تک
بھکاری ہے انساں کا انساں ابھی تک
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

مدد لے مدد سوزِ قلب و نظر سے
گذرنا ہے تجھ کو بیم خیر و شر سے
سبق لے گی دنیا تری رہگذر سے
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

شفق کے نظارے ترے واسطے ہیں
گھٹا کے اشارے ترے واسطے ہیں
یہ چاند اور تارے ترے واسطے ہیں
اٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دور ہے تیری منزل مسافر!

ترا پائے سرگرم رکنے نہ پائے
خزانہ ارادوں کا لٹنے نہ پائے
دیا عزم راسخ کا بجھنے نہ پائے
اٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دور ہے تیری منزل مسافر!

شارق میرٹھی

تیرا تصور

مظہر حسین شمیم

پھر چاندنی راتوں میں سمندر کے کنارے — آتا ہے تصور ترا کرنوں کے سہارے
دامانِ تخیل میں لئے چاند ستارے

یہ نور کے دریا میں نہائی ہوئی لہریں — یہ چاند کے غازوں سے بہلائی ہوئی لہریں
مہتاب کی وادی میں نُہائی ہوئی لہریں

یہ خواب کی دنیا سے جگائے ہوئے تارے — دامن میں فلک کے یہ لگائے ہوئے تارے
نیلم کی زمیں پہ یہ اُگائے ہوئے تارے

پھر چاندنی راتوں میں سمندر کے کنارے
آتا ہے تصور ترا کرنوں کے سہارے

منوّر ظلمتیں

دُھندلی شاموں میں لپکتے ہوئے آنچل کی قسم
زندگی تجھ پہ ہے اترائی ہوئی

رفعتِ کوہ پہ پھیلے ہوئے بادل کی قسم
خلوتِ دل پہ ہے تو چھائی ہوئی

میں تجھے چھوڑ کے، پردیس چلا آیا ہوں
بات گو قابلِ اظہار نہیں

تیری امید کے محلوں کو گرا آیا ہوں
اس حقیقت سے بھی انکار نہیں

لیکن اے جان! یہ عالم کے قوانینِ کہن
عشق پر رحم نہیں کھا سکتے

یہ گھٹائیں، یہ صنوبر، یہ کھنڈر، یہ گلشن
قسمتوں سے نہیں ٹکرا سکتے

پیٹ بھرنے کے لئے حسن سے رشتہ توڑا
بیچ کر پھول خریدے کانٹے

زر کے دھارے میں محبت کا سفینہ چھوڑا
ذرّوں کے شوق میں تارے بانٹے

ہاں مجھے یاد ہیں ساون کی وہ بھیگی راتیں
بھوری بدلی میں وہ دُبکا ہوا ماہ
گنگناتی ہوئی کھیتوں میں حسیں برساتیں
اور وہ نیموں میں لپکتی ہوئی راہ

ہاں! مجھے یاد ہیں جنگل کے وہ مبہوت درخت
پر سمیٹے ہوئے پنچھی خاموش!
وہ درختوں میں نئی گھاس کے ترشے ہوئے تخت
یعنی فطرت کا وہ پیارا آغوش!

ہاں! مجھے یاد ہے وہ صبح کا بڑھتا ہوا نور
مسجدوں سے وہ اذانوں کی صدا
اور گجر دم کی ہواؤں سے فضائیں معمور
قصرِ مشرق کا وہ پٹ کھلتا ہوا

ہاں! مجھے یاد ہیں وہ زلف میں چھپتے ہوئے بال
پتلے ہونٹوں کا وہ حسنِ لرزاں
وہ جھپکتی ہوئی آنکھیں وہ بہکتی ہوئی چال
وہ حیاؤں میں تقاضے سے نہاں

چار بھیگی ہوئی آنکھوں کا وہ پیمانِ وفا
ہاتھ پہ ہاتھ۔ خموشی۔ مستی!
اُن دنوں روح میں ناپید تھا فکرِ فردا
اور آزاد تھی میری ہستی!
آہ لیکن یہ زمانہ تھا بس اک خوابِ حسیں
نیند کی ایک دلآویز اُڑان
بے خود و مست جوانی کا خیالِ شیریں،
بربطِ دل کی لرزتی ہوئی تان
مادہ روح پہ اک کوہِ گراں بن کے گرا
پنکھڑی عشق کی مرجھا سی گئی
نظر آنے لگا عالم میں غبار اُڑتا ہوا
روح مدہوش تھی گھبرا سی گئی
اور اب دھوپ سے تپتے ہوئے بازاروں میں
عشق دم توڑ رہا ہے کب کا
اہلِ ثروت کی اُٹھائی ہوئی دیواروں میں
تیرا آزاد ندیمؔ آدبکا!

یہ بزرگوں کا بنایا ہوا بے کیف نظام
ایک لعنت ہے جوانوں کے لئے
اُف یہ مجرے یہ خوشامد۔ یہ قصیدے۔ یہ سلام!
سب ہیں بارود چٹانوں کے لئے
پھر بھی جب روح پہ کھویا ہوا رنگ آ جائے
دل کا سب میل اچانک دُھل جائے
سطحِ احساس سے چھٹ جاتے ہیں گہرے سائے
عرش کا جیسے دریچہ کھل جائے
میرے پہلو میں تو چپ چاپ چلی آتی ہے،
زلف بردوش۔ سمٹتی۔ ہنستی!
میرے دفتر پہ لپکتی ہوئی چھا جاتی ہے،
دامنِ کوہ کی ننھی بستی!
اس لئے اے مری جاں! عشق سے بیزار نہ ہو
ان اندھیروں میں اُجالا ہوگا،
دیکھ! پیمانِ وفا کشتۂ انکار نہ ہو
بول ہم دونوں کا بالا ہوگا،

احمد ندیمؔ قاسمی

طلوع

آ کہ خورشید کے چہرے سے الٹ دی ہے نقاب — ہیں نمائش کے لئے حسن کے جلوے بیتاب

آ کہ اک نور کا سیلاب ہے آنے والا — آ کہ طوفانِ تجلّی میں ہے دنیا غرقاب

آ کہ پھولوں کے کٹوروں میں بھری ہے شبنم — آ کہ آئی ہے نسیمِ سحری لے کے شراب

آ کہ اٹھنے کو ہیں پھر حسنِ ازل کے پردے — نہ رہا جلوۂ فطرت کوئی پابندِ نقاب

آ کہ پھر دامنِ گردوں ہے شفق سے رنگیں — آ کہ اٹھّی ہے بڑی زور سے موجِ مئے ناب

آنکھ ملتی ہوئی آئی ہے چمن میں نرگس — ہے نگاہوں میں ابھی تک اثرِ مستیٔ خواب

آ کہ لبریز ہے نغموں سے فضائے گلشن — وقفِ آہنگ ہے پھر مطربِ فطرت کا رباب

آ کہ ہے قابلِ نظّارہ سحر کا منظر — لالہ ساماں ہیں فضائیں رخِ گلشن شاداب

آ کہ اک کعبۂ رنگیں کی بنا پڑتی ہے — سبزہ۔ سجّادہ لچکتی ہوئی شاخیں محراب

آ کہ اے جانِ تمنّا ترے جلووں کے بغیر
ہائے میرا دل بیتاب ہے اب بھی بیتاب

چشمِ میگوں پہ تری مستیٔ میخانہ نثار — لبِ رنگیں پہ تصدّق ترے پھولوں کا شباب

روح بیچین جگر خستہ ہے آنکھیں پُرنم — دل گرفتار خلش سینہ رہینِ تب و تاب

آ کہ یہ دلکشیٔ ارض و سما کچھ بھی نہیں
زندگی تیری حضوری کے سوا کچھ بھی نہیں

ظفر تاباں

رُکے رُکے سے آنسو!

نگاہِ یار نہیں تیری سادگی کی سہی — کہ رنگ لائیں گی باتیں تری کبھی نہ کبھی

نشاطِ عشق نے گھٹ بڑھ کے کیا کیا آخر — کرے گی کیا ترے غم کی زیادتی و کمی

وہیں ہے مرکزِ ہنگامۂ وجودِ جہاں — جز ایک حیرتِ ساکت کوئی خدا نہ خودی

جو واقعاتِ جہاں کا سبب کھلا بھی تو کیا — سبب تو خود ہے سراسر طلسمِ بے سببی

وصال میں بھی نظر سے مجھے نہ چھیڑ اے دوست — رگِ نشاطِ محبت مری بہت ہے دکھی

ترے جمال سے کیا شانِ عشق پیدا ہے — چمک ہے زلف کی یا برقِ آہِ نیم شبی

ارے یہ کیسی ادائیں ہیں حسن کافر کی — یہ بے نیاز نگاہیں ! یہ مدّعا طلبی

تمام بزم کہیں جس طرح اتر آئے — کچھ اس طرح سے سرِ بزم اُس کی آنکھ جھکی

مسرّتیں نہ سہی ہوش تو پلٹ آئے — غموں کی رات گئی بیخودی کی بات گئی

تمام شبنم و گُل ہے وہ سر سے تا بہ قدم — رُکے رُکے سے کچھ آنسو رُکی رُکی سی ہنسی

نکھار اُس کے بدن کا فراق کیا کہیے!

زفرق تا بہ قدم خندہ ہائے زیرلبی

فراق گورکھپوری ایم اے

۱۰ مارچ ۱۹۴۲

نئے ارادے

نہ وہ رقصِ ساغر نہ وہ دورِ بادہ
زمانے کا ہے اور ہی کچھ ارادہ

فریبِ نظر سے مفر اب ہے ممکن
محبت کا پھر کر رہے ہیں اعادہ

محبت نے گو لاکھ رنگیں بنایا
یہ پھیکا دل میرا اب تک ہے سادہ

بجز مسرتِ عصیاں کے دل نے
غمِ عشق سے کر لیا استفادہ

مسافر ہوں مجھ کو سفر سے غرض ہے
نہ کچھ ہوش منزل نہ کچھ فکرِ جادہ

مرا دل بھی رخصت ہوا مجھ سے کہہ کر
لبالب خانہ آباد دولت زیادہ

تری بزم میں اس طرح آئے شوکت
لب پہ دعا دست و دل کشادہ

شوکت تھانوی

١٠ اپریل سنہ ١٩٤٢ء

چار تصویریں

صومعہ نشیں

بیشتر صومعہ نشینوں کو — پا رہا ہوں حریصِ سطوتِ جاہ
بیشتر داڑھیوں کے سائے میں — دیکھتا ہوں ہوس کی روئے سیاہ
بیشتر خرقہ ہائے پیری سے — مجھ کو آتی ہے بوئے ذوقِ گناہ
کہیں پاتے نہیں جو تازہ شکار — کہیں ملتی نہیں جو حرص کو راہ

بیٹھ رہتے ہیں لے کے ہاتھ میں تسبیح
خانقاہوں میں ڈھونڈتے ہیں پناہ

ایک منزل

خواجگی کی ہوا کے یخ جھونکے — لوٹ لیتے ہیں جب چمن کا سہاگ
پست حالی کا برف زا طوفان — موڑتا ہے جب اختیار کی باگ
آہیں بھرتی ہے روحِ بیداری — سر اٹھاتا ہے حرص و آز کا ناگ
کہیں ہوتا ہے رقصِ زہرہ شمائل — کہیں اڑتا ہے جوگ اور بیراگ

بیٹھ کر عیش کے الاؤ کے گرد
تاپتا ہے بشر گناہ کی آگ

تہذیب

خود کلیساؤں کے در و دیوار — خونِ نوعِ بشر سے ہیں پُر داغ
خود سکوں پروری سے چلتا ہے — انتہائی شقاوتوں کا سراغ
آدمیت کا جن کو دعویٰ ہے — نہیں ان کو درندگی سے فراغ
رہنماؤں کا جن کو سودا ہے — مرکزِ شیطنت ہے ان کا دماغ

گویا تہذیب کے دریچے میں
بربریت کا جل رہا ہے چراغ

مدرسہ

رات اک مدرسے کے گوشے میں — بحث جاری تھی اک عریض و طویل
اک نیا مسئلہ تھا پیشِ نظر — اک نئے زاویے کی تھی تشکیل
اڑ رہے تھے شرارِ علم و ہنر — جل رہا تھا چراغِ رشد و دلیل
میری مستیوں نے کیا دیکھا — دل تھے بے ذوقِ فکر کے علیل

نظر آتے تھے زیرِ پردۂ علم
جہل کے خد و خال بالتفصیل

سراج الدین ظفر بی۔ اے

۱۰ مارچ ۱۹۴۲ء

ہوش و مستی

نہ غرورِ دردمندی نہ ہوائے خود پرستی
میں ترے خیال میں ہوں، نہ یہ ہوش ہے نہ مستی

مرے دل میں تیرا غم ہے تو غمِ حیات کیوں ہو
یہ حرم کی سرزمیں پر، ہے بنائے بُت پرستی

ترا مبتلا سمجھ کر مجھے پوجتی ہے دنیا،
یہ گناہ کا تقدّس یہ بلندیوں کی پستی

ترے عشق کا تصرّف، ترے درد کی کرامت
کہ ہوائے نیستی سے نہ بجھا چراغِ ہستی

غمِ عشق کھینچ لایا مجھے کیف بیخودی تک،
نہ یہاں ضیا نہ ظلمت، نہ بلندیاں، نہ پستی

بہت انقلاب آئے، مگر اب بھی دل وہی ہے
جسے تو بسا چکا تھا نہ اُجڑ سکی وہ بستی

وہ نظر اُٹھا رہے ہیں تو میں جان کیوں نہ دیدوں
کہیں پھر بدل نہ جائے یہ فضائے کیف و مستی

شاہد صدیقی

جنگل

کتنا مسرّت بخش تھا شاداب جنگل کا سماں
وہ صبح کی ٹھنڈی ہوائیں سنسناتی پتّیاں
وہ پیچ و خم کھاتا ہُوا دریا کا پانی جابجا
سبزے میں چکر کاٹتی ترشی ہوئی پگڈنڈیاں
کتنا مسرّت بخش تھا ــــ شاداب جنگل کا سماں

بہتے ہوئے تالاب میں موجوں کا پیہم جھومنا
انگڑائیاں لے لے کے وہ ساحل کا دامن چومنا
دریا کے پُل سے آسماں اپنی کمر ٹیکے ہوئے
اُڑ کر فضائے چرخ میں مرغابیوں کا گھومنا
کتنا مسرّت بخش تھا ــــ شاداب جنگل کا سماں

وہ فاصلے پر جابجا اونچے درختوں کا ہجوم!
خاموش ساکت وادیوں میں ہر طرف چڑیوں کی دھوم
پانی میں غوطے مارتی وہ بادلوں کی آندھیاں
وہ پردۂ ظلمت میں مُنہ ڈھانپے ہوئے ماہ و نجوم
کتنا مسرّت بخش تھا ــــ شاداب جنگل کا سماں

دامانِ صحنِ دشت میں مہکی ہوئی بُوئے شمیم!
اشجار نورِ صبح سے مدہوش مانندِ کلیم
پتّوں پہ تھراتے ہوئے شبنم کے موتی جابجا!
وہ گنگناتی کھیتیوں کو چومتی بادِ نسیم
کتنا مسرّت بخش تھا ــــ شاداب جنگل کا سماں

موجوں کے ہونٹوں پر وہ دھیمی گنگناہٹ بارہا
سوتے سے اُٹھ کر جس طرح کانوں میں گونج اُٹھے پپا
وہ گھنٹیاں سی بیل گاڑی کی کہیں بجتی ہوئی
پگڈنڈیوں سے دمبدم اُٹھتا ہُوا ہلکا غبار
کتنا مسرّت بخش تھا ــــ شاداب جنگل کا سماں

کاندھوں پہ ہل رکھے ہوئے آتا ہے کھیتوں میں کسان
بھیڑوں کے ریوڑ کو ہنکاتے لا رہے تھے گلہ بان
میدان پر سایہ کئے اونچے ببولوں کے درخت
کچھ دُور ٹیلوں سے لگے وہ پھونس کے ٹوٹے مکان
کتنا مسرّت بخش تھا ــــ شاداب جنگل کا سماں

پانی میں بھینسیں جابجا سر اپنا چمکاتی ہوئی!
کوّوں کو سر پر لیکے دریا کی ہوا کھاتی ہوئی!
پھیلے ہوئے تھے گھاس پر کپڑے کہیں دھوتے ہوئے
لٹکے سروں پر گاگریں کچھ لڑکیاں آتی ہوئی!
کتنا مسرّت بخش تھا ــــ شاداب جنگل کا سماں

دُوسرا رُخ

اب تک نگاہوں میں سمائی ہیں وہ گاگروالیاں
وہ جامنوں کے پیڑ اور دُور تک ہریالیاں
وہ نیلے نیلے آنچلوں پر اُلجھی اُلجھی سی چھاؤں
وہ جھومتا سبزہ وہ پیڑوں کی لچکتی ڈالیاں
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

کچھ فاصلے پر ہل چلاتے جا رہا تھا اک کسان
صورت کا بوڑھا دُھن کا پکّا اور ہمت کا جوان
رہ رہ کے تک لیتا تھا اپنی فاقہ کش بیٹی کی سمت
گاگر لئے سر پر چلی جاتی تھی دُکھیا بے زبان
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

۳۶

دہراتی جاتی تھی کوئی بے مانگی کی داستاں
کرتی تھی کوئی نازسے بیگانہ وار اٹھکیلیاں
سنجیدگی نظروں سے چہروں سے متانت آشکار
مخمور بوجھل انکھڑیاں، جھکی ہوئی پیشانیاں
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

ناگاہ رخصت ہو گئیں سب رہزنانِ عقل و ہوش!
آئی نظر مجھ کو پھر اک دوشیزۂ گیسو بدوش!
اُس سمت وہ معصوم و کمسن نو تراشیدہ صنم،
اور اِس طرف میں بھولا بھٹکا شاعرِ ایماں فروش
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

جس وقت آموں کے درختوں سے میں کچھ آگے بڑھا
نکلا گڈریا جھونپڑے سے اپنے غُل کرتا ہوا
یا شور ہستی جاگ اُٹھا بھیڑیں چرانے کے لئے
اٹھکھیلیاں کرتا بہت مسرور ہنستا کھیلتا،
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

دامن میں بچے بھر رہے تھے نیم کی نمکولیاں
بے انتہا روشن جبیں بے حد ضعیف و ناتواں
کچھ لوگ اکٹھی کر رہے تھے ٹوکری میں جامنیں
نزدیک و دُور آئیں نظر پنگھٹ پہ جانے والیاں
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

تالاب کے نزدیک سے جس دم ہوا میرا گذر
چھپّر کی اک ٹوٹی ہوئی سی جھونپڑی آئی نظر
آنچل ہلاتی آ رہی تھیں گاؤں کی شہزادیاں
دہرا رہی تھیں اگلی پچھلی داستانیں بیٹھ کر
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

بھُولا نہیں ہوں میں وہ جھیلوں کے کنارے آج تک
ہیں قلب میں پیوست موجوں کے اشارے آج تک
جی چاہتا ہے وہ سماں میں دیکھ لوں پھر ایک بار
محشر نگاہوں میں ہیں میری وہ نظارے آج تک
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

محشر بدایونی

ماہ اپریل ۱۹۴۲ء

اتنی فرصت کہاں؟!

یہ ہنستی ہوئی رات، یہ مست دریا　　یہ دریا، یہ انجم، یہ ساغر، یہ مینا
وہ اُمڈے شراروں کے طوفان دیکھو　　وہ برسے جہنم کے سامان دیکھو

سنو تو مگر اے مرے دل کی ملکہ!　　نہیں جاوداں یہ سنہری تماشا
سُلگتی ہوئی نسلِ انسان دیکھو　　نہ روکو، نہ روکو مری جان دیکھو

روا ابھی ہیں مدہوشیاں یہ تو سوچو
قیام اب ہے یکسر زیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

گُلوں سے مہکتا سفینا بھی برحق　　مے و ساغر و جام و مینا بھی برحق
رہِ زندگی پُرخطر ہے مسلسل　　کہ یہ عالمِ خیر و شر ہے مسلسل

پلانا بھی برحق ہے پینا بھی برحق　　محبت کی اک رات جینا بھی برحق
بظاہر حدوں میں مگر ہے مسلسل　　مسافر مسلسل سفر ہے مسلسل ۴۷

مگر میں نہیں شادماں یہ تو سوچو
نہ منزل نہ کوئی نشاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

یہ منظر سُلگتے ہوئے بام و در کا　　کلیجہ دہلتا ہے برق و شرر کا
تخیل میں ہیں لاکھ مبہم ارادے　　مچلتے ہیں دل میں یہ تخئیل زادے

دھڑکتا ہے دل وسعتِ بحر و بر کا　　مجھے ہو تصور نسیمِ سحر کا
ہے اک جسمِ کمزور لاکھوں لبادے　　مسافر ہوں تنہا ہزاروں ہیں جادے

جوانی ہو جنت نشاں یہ تو سوچو
سجاؤں نیا کارواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

اٹھائے نقاب اپنے رخِ جوانی نمایاں ہوں خال خطِ زندگانی
مبصر ہوں میں فطرتِ زندگی کا میں نباض ہوں حکمتِ زندگی کا

فسانہ محبت کا دل کی کہانی ادا ہوں یہ قصے جنوں کی زبانی
مغنی ہوں میں عشرتِ زندگی کا حُدی خواں ہوں میں عظمتِ زندگی کا

یہ ٹکڑے ہوں کھل کر بیاں یہ تو سوچو
خود اپنا بنوں نوحہ خواں یہ تو سوچو

مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

جو مردہ گویوں کی گائی ہوئی ہے جو اک عمر کی گنگنائی ہوئی ہے
کبھی خود ہوں صیاد اور خود ہوں گلشن کبھی خود ہوں بجلی کبھی خود ہوں خرمن

جو زہر و شکر میں بسائی ہوئی ہے جو گذرے ہوؤں کی سنائی ہوئی ہے
چھڑاؤں علائق سے کس طرح دامن کہ میں خود ہی رہبر ہوں اور خود ہی رہزن

سنوں پھر وہی داستاں یہ تو سوچو
کبھی آپ ہوں کارواں یہ تو سوچو

مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

چمکنا ہے مجھ کو اُبھرنا ہے مجھ کو سنورنا ہے مجھ کو نکھرنا ہے مجھ کو
ہنسے میری بے رنگیوں پر زمانہ مجھے ناگوارا ہوا اپنا ترانہ

حقیقی محبت پہ مرنا ہے مجھ کو محبت کو جاوید کرنا ہے مجھ کو
مری مستیاں ہوں بشکلِ فسانہ پلا کر مجھے وقت خود ہو روانہ

محبت میں ہوں رائیگاں یہ تو سوچو
ابد تک رہوں سرگراں یہ تو سوچو

مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

اسی آشیاں کو بچانا ہے مجھ کو
بچا کر گلستاں بنانا ہے مجھ کو
بنا کر یہ گلشن سجانا ہے مجھ کو
سجا کر جہاں کو دکھانا ہے مجھ کو

بناؤں نیا آشیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

ہما آغر نظامی

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

۱۰ مارچ ۱۹۴۲ء

روحِ ایثار کا ترانہ

میں قرن و سال کے ایواں میں سوتوں کو جگاتی آئی ہوں
میں جبر و غلامی کے نقشِ باطل کو مٹاتی آئی ہوں
پستی کو دائم رفعت کے پیغام سناتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں
تسلیم و رضا کا جادو ہوں "قربانی" مجھ کو کہتے ہیں
بے گنتی عزمِ براہیمی میرے سایہ میں رہتے ہیں

میں قرن و سال کے ایواں میں سوتوں کو جگاتی آئی ہوں
ہستی کو... اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

دائیدۂ خواب ہوں یا عکسِ احساسِ دلِ ابراہیمی
طوفان کا قاہر نغمہ ہوں، کہسار کی جابر خاموشی
میں نیستی کا سناٹا ہوں اور ہستی کی دائم مستی
سینے میں جو ابراہیم کے تھی ہوں میں وہ دہکتی چنگاری
اکسیر ہے میری چٹکی میں، تاریخ ہے میرے پہلو میں
گرتوں کو اٹھانے کی قوت موج ہے میرے بازو میں

سقراط و حسین و مسلم کی میں یاد دلاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

میں عزمِ الٰہی کا سایہ، آدم کا پرانا جذبہ ہوں
قوموں کے عروج و پستی کا اک نازک تر پیمانہ ہوں
تاریخ مری نیرنگی ہے، ہر رنگ سے لیکن پیدا ہوں
ہاں میں ہی ابد کے ماتھے پر عظمت کا چمکتا ٹیکا ہوں
جلووں سے مرے اس دنیا کی تعمیر منور ہوتی ہے
جو ذرہ تھا وہ ہیرا ہے جو قطرہ تھا وہ موتی ہے

تاریخ پہ چھا جانے کے لئے تاریخ بناتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

۱۰ مارچ ۱۹۴۳ء

میں قوت ہوں، میں دولت ہوں، میں عزت ہوں، میں عظمت ہوں
تاریک دریچہ میں غم کے میں مطلعِ امید کی بشارت ہوں

میں فطرتِ انساں کا جوہر آئینۂ بزمِ فطرت ہوں
میں پشت و پناہ قوم و وطن میں روحِ حمایت ملت ہوں

آزادی میرے قدموں میں آبادی میرے قدموں میں
خوش حالی میرے قدموں میں ہے شادی میرے قدموں میں

مجبوروں اور غلاموں کو یہ راز بتاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

ہاں لمعتِ ابراہیم نہیں مدت سے مرے دیوانوں میں
وہ روح نہیں دیوانوں میں وہ جان نہیں فرزانوں میں

وہ کیف نہیں وہ ذوق نہیں وہ جوش نہیں میخانوں میں
اور میں کہ چھلکتی ہوں اب بھی آدم کے نئے پیمانوں میں

سرشار ہوا ہے اک عالم ساغر وہ پلایا ہے میں نے
ہنس ہنس کے دہکتے سورج سے ذروں کو لڑایا ہے میں نے

اور اپنے سفینے کو اب بھی طوفاں سے لڑاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

بے تاب فضائے عالم پر پھر ظلم کے بادل چھائے ہیں
اک بار حیاتِ انساں پر پھر نازک لمحے آئے ہیں

مظلوم پھر انسانیت ہے، پھر امن و سکوں ٹھکرائے ہیں
آدم کی ٹوٹی کشتی سے پھر سو طوفاں ٹکرائے ہیں

آ میرے جلو میں آگے بڑھ گر تجھکو جہاں میں جینا ہے
پی میرے ہاتھ سے ساغر پی گر جامِ تمنا پینا ہے

لاکھوں کو بلاتی آئی ہوں، لاکھوں کو جلاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

طوفانِ بلا ٹکراتا ہے ساحل سے مرے ٹکرانے دو
سیلاب فنا بل کھاتا ہے وادی میں مری بل کھانے دو

جلتا ہے اگر گلشن میرا جل جانے دو پھنک جانے دو
آتی ہے تباہی میری طرف میں سینہ سپر ہوں آنے دو

ہنس ہنس کر میرے دیوانے ان طوفانوں کو روکیں گے
میدانِ عمل میں بڑھ بڑھ کر عفریتِ فنا کو ٹوکیں گے

یہ وار ہے کیا، میں ایسے لاکھوں وار بچاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

ساغر نظامی

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

۱۰ مارچ ۱۹۴۲ء

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

بابتہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

کسوٹی

(نئی کتابیں اور رسالے)

زندہ چین جدید چینی کہانیاں، مترجمہ "تمنائی" ناشر۔ نیا سنسار۔ کتاب گھر، بانکی پور پٹنہ

زندہ چین جیسی مفید اور اہم کتابیں اگر اردو زبان میں برابر منتقل ہوتی رہیں تو وہ دن دور نہیں، جب اردو کا تخلیقی ادب دوسری زبانوں کے ہم پایہ ہو جائے گا۔ ہمیں اپنی دنیا کی خصوصیتوں کا اندازہ نہیں، اپنے جوہر کی پرکھ نہیں۔ جس طرح سونے کو کسوٹی پر آسانی سے کسا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے پاس یونیورسل نئے ادب کی کسوٹیاں جمع ہو گئیں۔ تو ہم اپنے سونے کی پرکھ کر سکیں گے۔ زندہ چین، جدید چینی کہانیوں کا مجموعہ ہے : محض دس کہانیاں ہیں۔ اکثر ان میں سے بہت ہی مختصر، مگر ان میں سے ایک کہانی ایسی نہیں جس کو فنکارانہ نقطۂ نگاہ سے معمولی کہا جا سکے :

چین کے افسانہ نگاروں، لوہسون۔ شہ منگ۔ ٹنگ لنگ۔ چنگ تین یہ باچن، ماؤتون کے بارے میں مترجم نے ضروری معلومات، سوانح حیات اور سماجی وسیاسی پس منظر مختصر نوٹوں کے ذریعہ بتا دیا ہے۔ آخر میں چین کی جدید ادبی تحریک، کے عنوان سے نیم ویلز کا ایک تاریخی اور تنقیدی مضمون ہے، جس میں اختصار کیساتھ ان تمام ادبی تحریکات اور چینی انشا پردازوں کی تخلیق وارتقا کی تاریخ درج ہے۔ جو چین کے ادبی تحریک کے ہیرو تھے۔ یا اس سے تعلق رکھتے تو ساتھ ہی اُن عناصر کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ جو اس تحریک میں رجعت پسندی کا راگ گاتے رہے۔ نیم ویلز لکھتا ہے۔

"چین کی جدید ادبی تحریک دو الگ الگ دور میں نمایاں طور سے شروع ہوئی ہے اور سیاسی انقلابی تحریک کے آثار چڑھاؤ کے ساتھ اٹھی۔ یہ تحریک ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۶ء تک کے ادبی نوجوان سے شروع ہوتی ہے۔ یہ پورا دور بیرونی ملکوں سے واپس آئے ہوئے طلبا کے ہاتھوں مغربی ادب کے ترجموں کے جوش کے ماتحت تخم ریزی اور اثر پذیری کا دور تھا جس کا مختصر ابھار ۱۹۱۹ء کی چوتھی مئی کی تحریک میں ہوا؛

یہ دس برس کا دور جسے چینی "ادبی انقلاب سے انقلابی ادب کی طرف" کہتے ہیں، تمام کا تمام نئے چینی بورژوا کے آزادی، مساوات، اور اخوت کے مایوس اور پراگندہ خوابوں کے اظہار کے لئے وقف تھا۔ اور پرانے سماجی رواج کے خلاف اُن کی انقلابی لڑائی کو ظاہر کرتا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں کو منٹینگ کے دائیں بازو کی پالیسی کے ناگہانی تغیر کے ساتھ جہاں سے ادھورے بورژوا انقلاب کی موت اور کمیونسٹوں کی قیادت میں مزدور اور کسان انقلاب کی آزاد ترقی شروع ہوتی ہے۔ اس کا یکایک خاتمہ ہو گیا کو منٹنگ کی اس فوجی اور جنگی پالیسی کے ساتھ ہی ساتھ ادبی تحریک کی مرکزی اور اہم جماعت تیزی سے مخالف سمت کو بائیں جانب مڑ گئی اور متوسط طبقہ کی کمزوری اور رجعت پسندی پر سخت مایوسی اور جنتا کے انقلاب پر جو اندر ہی اندر دبے دبے ابل رہا تھا۔ یقین ظاہر کرنے لگی ۱۹۲۷ء سے آج تک میدان بائیں انقلابی ادب کے ساتھ رہا ہے۔"

یہ [illegible] کا یہ اہم مقالہ نہ صرف اُردو میں "چین کی جدید تحریک" کے متعلق
ایک اہم ترین دستاویز ہے۔ بلکہ انگریزی زبان میں بھی یہ اپنی نوعیت کی سب سے پہلی
چیز ہے۔ "زندہ چین" میں اگر یہ مقالہ نہ ہوتا، تو کتاب بے رُوح جسم بن کر رہ جاتی۔
آگے چل کر دیلز چین میں مختصر افسانہ کی کہانی اس طرح بیان کرتا ہے:

"جدید مختصر افسانہ چین کے لئے ایک نئی صنف ہے۔ جو
موجودہ یورپ کے نمونہ کی طرح روس سے آیا۔ دوسرا اہم
اثر فرانسیسی ادب کا ہے، انگریزی مصنف صرف دلچسپی کیلئے
پڑھے جاتے ہیں، لیکن چینی نفسیات، طریقہ اور عام مادی
پس منظر کیلئے اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں، ان عظیم الشان
رکاوٹوں کے باوجود جو اس تہذیبی رجحان کے راستے میں
سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے ڈالی گئی ہیں۔ جاپان اور چین
دونوں پر اس کا اثر وسیع اور گہرا ہے، روس کی طرف اس
نئے رجحان کی کئی وجہیں ہیں۔ لیکن بنیادی اور اصلی سبب
ایک ہی طرح کی انقلابی تحریکیں ہیں۔ جدید ادبی تحریک کے
شروع ہی سے روسیوں نے چینیوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا۔
چینی ادب پر روسی اثر زیادہ تر جاپانی ترجموں کے ذریعہ
ہوا، بلکہ وہ راستہ جس سے چین میں جدید آرٹ کی تحریکیں
اٹھیں اصل میں جاپان کا مغربی طرز و انداز اختیار کر لینا ہے"

چین میں کمیونسٹ تحریک نے کس درجہ کا انقلابی ادب پیدا کیا ہے۔ اس کی مثال
شہ منگ ایک اشتراکی باعظمت خاتون کے "ایک کھوئی ہوئی ڈائری کے کچھ ورق"
سے کیا جا سکتا ہے، یہ چند اوراق جس میں اس نے اپنی ڈائری پیش کی ہے۔
"زندہ چین" کی جان ہیں۔ یہ اوراق بتاتے ہیں کہ اصول اور مقصد، اخلاق سے بھی
بلند مرتبہ رکھتے ہیں، یہ اوراق ہم میں سب کچھ پا کر سب کچھ کھو دینے کی دقیق ترین
صلاحیتیں پیدا کرتے ہیں۔ شہ منگ اپنے احساسِ حمل کو اس طرح ایک جگہ بیان کرتی ہے۔
"چینگ اس کا ساتھی اُس کی پُرمعنی ملالت کا اندازہ کر کے آرام کرنے کیلئے
کہتا ہے۔ وہ جواب دیتی ہے:-

"بے معنی الفاظ! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کتنی تکلیف
میں ہوں، عورت کے بچہ دان (رحم) کو "تاریخی ضرورتوں"
کا کتنا کم خیال ہے، یہ خود اپنی تاریخ اور اپنی ضرورت ہے۔

یہ آسان بیان کی صورت میں لائی ہوئی منطق ہے۔ فطرت
کی کتنی ستم ظریفی ہے کہ اس وقت مجھے "امیروں کی بیماری"
کا تحفہ دیا گیا ہے:

"میرے اندر جو جان بن رہی ہے اس سے بھی زیادہ
ضروری ہے کہ ہماری تمام تدبیریں اور منصوبے اس وقت
بالکل یقینی اور درست ہوں" میرے ہی اندر یہ سب کچھ
ہو رہا ہے، اور میری خواہش کے خلاف،

عورت کی رُوح میں تخلیق کی فطری خواہش اک ابدی کارفرمائی ہے، وہ
اشتراکی ہو یا نازی، مجاہدہ ہو یا حجلہ نشین بیگم۔ جوان ہو یا پدمنی مگر اس کارفرمائی سے
گریز نہیں کر سکتی۔ شہ منگ اس کیفیت کو ذاتی تجربہ کے بعد لکھتی ہے:-

"میں بہت بے چین ہو رہی ہوں گی، کیونکہ مجھے یاد ہے کہ میں
اپنے پیٹ کو نوچتی، دباتی اور پیٹتی بھی تھی، میں کتنا چاہ
رہی تھی کہ وہ ننھی سی جان مر جائے۔ لیکن ساتھ ساتھ
میرا دل اپنی بچی ہوئی قوت سے میری اس خواہش پر اعتراض
کرتا ہے۔ ہر چوٹ جو میں اپنے پیٹ پر دیتی تھی اس کے
جواب میں میرا دل دُکھ کے تکلیف دیتا، مجھ پر دو کیفیتیں
تھیں ایک خود غرض تمنا اپنے بچے کو بچانے کی، دوسری
بے غرض، دوسروں کے لئے اپنے کو بچانے کی، اور تھوڑی
دیر کے لئے میں نے محسوس کیا کہ اس کا علاج دونوں ہی
کی موت سے ہو سکتا ہے۔
دغاباز خیال! پھر بھی اس ننھی سی جان سے مجھے محبت ہے۔
باوجود اس کی تکلیفوں کے میں اس عجیب واقعہ کے ہونے کی
تمنا کر رہی ہوں! جب ایک ننھی سی ہستی میرے بدن میں
سے نکل کر اس دنیا میں بہادری سے آئے گی مجھے اس کی ضرورت
ہے۔ جیسے ایک سچے شاعر کو ایک نئے ڈھنگ والی نظم پیدا کرنے کی
ضرورت ہوتی ہے" نہیں اس سے بھی زیادہ کیونکہ میرا
ننھا فطرت کو بدلنے کیلئے مادرِ فطرت کا آلہ ہوگا،
اس کا مجھے یقین ہے کہ [illegible]
بھی مجھے یقین ہے کہ وہ [illegible]

یہ ننھا انسان جو میرا جگر اور میری دیکھ بھال کا محتاج ہوگا، جس کی ننھی آنکھیں دھیرے دھیرے حیران کر دینے والے انداز سے کھلیں گی، یہ ننھا آدمی تھوڑے دنوں بعد کھڑا ہوگا۔ اور اپنے بے انتہا حسن اور بے انتہا طاقت سے آدمیوں اور فطرت کے بارے میں ایسی اچھی اور سچی باتوں کا دعویٰ کریگا۔ کہ تمام حاکموں کو زمین اور آسمان کے کل راج کرنیوالوں کو اس کی خواہش کے آگے سر جھکا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا؛

کس طرح ایک عورت ماں بننے سے پہلے سوچتی ہے۔ کس طرح غیر شعوری جنسی تقاضے اس کے فکر کو ایک لا بدی شکل دیتے ہیں، اور عورت ہو یا مرد، اصول انسان کے تفکّر کو کس طرح اپنے سانچے میں لا محدود کرکے محدود کرلیتا ہے؛ شہ منگ کی زبان سے سُنئے:۔

میری پہلی ماہواری رُکنے کے وقت سے، اس وقت سے جب میرے رحم میں پہلی دھڑکن ہوئی میرا دل اس عجیب چیز کے ہونے سے کچھ اس طرح دھڑک رہا ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتی، ساری دنیا میں یہ خبر پھیلا دینے کے لئے میری زبان پھڑک رہی ہے۔ باوجود اس کی پاکیزگی اور بڑائی کے یہ میں ہوں گی جس پر یہ نوجوان آدمی اپنی پہلی مسکراہٹ نچھاور کرے گا۔ یہ میں ہوں گی جسے وہ ماں کہہ کے پکاریگا۔

کہاں ہے کوئی اتنی مضبوط دل کی عورت جو ایسے خواب نہ دیکھتی ہو، نہیں کوئی بھی ایسی نہیں، اور کم از کم میں تو نہیں ہوں، ایک بھی نہیں، اور پھر بھی شاید بہت سی ہزاروں لاکھوں ہم لوگ ہیں، کیا ماتا کی اصلی رُوح بہت سی عورتوں کے اتحاد سے مضبوط ہو کے اپنے خودغرض چھوٹے ذاتی حقوق کو چھوڑ نہیں سکتی؛ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنی بے بہا تخلیقی قوت کے ذریعہ مادرِ فطرت کے کسی زبردست تخلیقی عمل کو نشو و نما پہونچائیں اور اپنے زمانے میں اس سے بھی [illegible] قسم کے انسان کی پرورش کریں؟ [illegible] سکتے ہیں، لیکن اس خیالی فلسفہ [illegible] اپنے پیٹ میں چھپ لیتا

دوسری بات ہے۔ یہ جذبات بار رُکے ہوئے [illegible] اسی سلسلے میں آگے چل کر کہتی ہے کہ:۔

"صرف اس وقت جب زندگی کی دھڑکن اس انتہا، اس تیزی اور اس خطرہ کو پہونچ جائے۔ جب تقدیر، میرے ساتھ تو صرف ایک من موجی اندھا کیڑا ہے جو عجیب و غریب کیمیاوی خاصیت لئے میرے اندر داخل ہوگیا ہے۔ لیکن پھر بھی تقدیر کی ایک شکل ہے، مخالف خواہشوں میں انتخاب کرنے کا سامنا کرا دے، جب فیصلہ کرنے میں آدمی کو ذاتی احساسات کو نظر انداز کرنا پڑے صرف اس وقت انقلابی بیداری کی بات آدمی کرسکتا ہے"

بہرکیف جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ لاکھوں مفلس انسانوں کا آج کل کے غیر منظّم سماج میں بچّے پیدا کرنا صرف دُکھ اٹھانے والوں کی تعداد بڑھانا ہے۔ ہر بچّہ جو بیمار بھوکی ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے ذلّت اور مصیبت ساتھ لاتا ہے۔ غریبی میں جنم لئے ہوئے بچّہ کے آگے بھوک، ذلّت جہالت، کنگالی، تلخی کے سوا کچھ نہیں، اس رُوحانی بلندی کا تو کوئی سوال ہی نہیں، جو انسان کو جنگل کے جانوروں سے الگ کرتا ہے۔ ہم لوگوں کے لئے نئی زندگی کا مسئلہ اس زندگی کا مسئلہ ہے جسے ہم خود جانتے ہیں اور اسے ہم بلا سوچے سمجھے پیدا ہونیوالوں پر نہیں لاد دینگے۔

ایک اپنی میزبان اور اس کے انقلابی شوہر کی مفلسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے:۔

اس کے پاس پیسے بھی اتنے کم ہوتے کہ اچھی طرح کھانے پینے کا سامان نہیں ہوسکتا، اس طرح سات بار اسے اپنے بچّے سے ہاتھ دھونا پڑا سات بار! کیا عورت کے لئے یہ وحشتناک صدمہ سات بار اٹھانا ممکن ہے؟ عورتیں اور انقلاب! دنیا کی تاریخ میں بہادری کے کیسے درد بھرے بن گائے گیت چپ چاپ پڑے ہیں"

اس کا ساتھی جنگ گرفتار ہو جاتا ہے۔ آخر اس کی ڈائری دو گولیاں کھا لینے پر ختم ہوتی ہے۔

میرا پیارا بدن جھن جھن، جلن، کھجلاہٹ سے پھٹا جا رہا ہے!
میرا سارا بدن اس طرح پھڑک رہا ہے جیسے اندر بجلی بھر دی
گئی ہے۔ میرے چاروں طرف ہر چیز مار ڈالنے والی ہے۔
زہر سے بھری ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔ کوئی دم میں ایک
گرم پتھر میرے اندر سے پھٹ پڑنے کو تیار ہے۔ اور دوسرا
میرے سر میں سے پھٹ پڑنے والا ہے!
(عورتیں اور انقلاب!؟)

سطحی سی بات ہو اگر مبارکباد دیجئے گر، نیا سنسار نے یہ مختصر سی کتاب شائع کر کے چین کی روحِ انقلاب، ہندوستان کے مُردہ پیکر میں منتقل کی ہے۔ تمنائی کو کیا داد دی جائے اور کیوں داد دی جائے، اُن کا فرض تھا، یقیناً یہ ایک نشانِ نور ہے۔ جو روشنی اور سرفرازی کی نئی راہیں بتانے میں ہماری امداد کریگا!

نِم ویلز نے ہندوستان کی دیسی زبانوں کے ادیب اور شعراء کے لئے گہرے سوچنے کی ایک گھڑی بھی دی ہے کہ چین کی جدید ادبی تحریک، کوئی دربار داری اور محفلِ رقص و سرود نہیں ہے، ہمارے وہ شاعر جو درباروں سے نکالے جانے کے بعد اب اپنی رجعت پسندیوں سے عوام کے کھلے جلسوں کو دربار بنانا چاہتے ہیں۔ جنھیں صرف گنگناہٹ سے مطلب ہے۔ آہوں سے نہیں، جو صرف تبسم کے پجاری ہیں۔ آنسوؤں کے نہیں، وہ ویلز کی یہ سطریں پڑھیں۔

"تاریخ میں پہلے کبھی شاید ہی کسی اور ملک کے ادبی عالموں نے چین کے آجکل کے انقلابی لکھنے والوں سے زیادہ سرفروشانہ جدوجہد کی ہوگی۔ بائیں تحریک کی سخت جانی حیرت خیز ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ماؤ تون کی تیار کی ہوئی فہرست کے مطابق بائیں مصنفوں کی لیگ کے مندرجۂ ذیل ممبروں کا یہ حشر ہوا:

۱۔ ۷ فروری ۱۹۳۱ء کو ایک ساتھ قتل کئے گئے:۔ جاؤ شہہ، ہو یہ پنگ، مس فنگ، لی وئی ثنگ اور ین فو۔
۲۔ دی ہوئی تاریخوں میں گرفتار ہوئے۔ معلوم نہیں کیا حشر ہوا۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ ابھی تک جیل میں زندہ ہیں۔ لی چوکی (۱۹۳۱ء)، کو منگ چوان (۱۹۳۲ء)، پان تزی نان (۱۹۳۳ء)، لاؤ شہ لی (۱۹۳۴ء)، ہواتی (۱۹۳۵ء)، ینگ تسان (۱۹۳۵ء)، ہو کینگ چن (۱۹۳۵ء) اور ینگ کینگ، انتہائی ترقی پسند (۱۹۳۲ء)

(۳) قید ہوئے اور تقریباً ایک ہی سال میں چھوڑ دئے گئے
آئی وو (فروری ۱۹۳۳-۳۴ء) مس تسامنگ (جون ۱۹۳۴ء) رہائی کی تاریخ نامعلوم) اور مس تینگ لینگ (مئی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک)

یان ہسون (یان ہسین) ۱۹۳۲ء میں گرفتار کیا گیا اور ۱۹۳۳ء میں تنسئین کے قیدخانہ میں لگاتار نو دنوں تک کھانا نہ دیکر بھوکوں مار ڈالا گیا۔

تنگ چیو تسی ۱۹۳۳ء میں تینگ لینگ کے ساتھ گرفتاری سے بچنے میں مارا گیا۔

بعد میں دوسرے ذرائع سے پتہ چلا کہ یان تزونئن چپ چاپ قتل کر ڈالا گیا۔ تائی چنگ تنگ کی ۱۹۳۳ء میں پیکنگ میں قتل کر دئے جانے کی خبر آئی ہنگ لنگ فئی تنسئین میں ۱۹۳۴ء میں قتل کیا گیا۔ اور (یاؤ) پنگ تزد تنسئین میں گرفتار کیا گیا اور کمیونسٹ کہہ کے فوراً قتل کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں چار ممتاز بائیں مصنف گرفتار ہوئے۔ تئن ہان، ہوا ہان، لنگ یا ئی شوئی اور ہسوتی ہنگ ان میں سے صرف تئن ہان رہا کیا گیا۔
آج کل وہ مس تینگ لینگ[1] کی طرح نینکنگ میں سخت نگرانی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔"
یہ ایک مختصر اور سرسری رپورٹ ہے۔

[1] مس تینگ لینگ نینکنگ کی نگرانی سے بھاگ نکلی اور آج کل شمالی چین کے سوویٹ علاقہ میں ہے۔ تمنائی

اسلوب اور تخیل مغرب کے رومانی انداز نگارش اور جمالیاتی طرز تفکر سے متاثر ہوا۔ نیاز ہوں، یلدرم احمد، سجاد حیدر یلدرم ہوں یا سلطان حیدر جوش، سب مغربی افسانہ نگاروں سے متاثر ہوئے۔ خاص کر آسکر وائلڈ سے، اردو ادب پر مغرب کی یہ سحر کار شخصیت اس وقت اثر انداز ہوئی جب مغربی ادب میں اس کے اثرات کا سورج ڈوب چکا تھا؛ نیاز نے آسکر وائلڈ کے اسلوب اور طرز تفکر کو اپنانے کی کوششیں کیں، وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے، مگر ادب جو اصل میں غیر شعوری طور پر بھی، سماج سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔ ماحول کی مخلوق ہوتا ہے کبھی ایک ماحول پیدا بھی کرتا ہے۔ مگر ہندوستان میں اعلیٰ طبقہ کا سماجی شعور، غدر کے بعد مبہم اور مفلوج ہو گیا تھا، پھر مشرق اور مغرب کا کلچری امتیاز، جمالیاتی احساس ایک سہی، مگر معیار مختلف تھے، جوڑ کچھ صحیح نہ لگ سکا؛ پھر بھی ہر کوشش کے کچھ نہ کچھ اثرات ہوتے ہی ہیں، نوجوان اردو داں طبقہ اس کوشش سے بڑی حد تک متاثر ہوا؛ ناتمام سہی مگر ایک جمالیاتی زاویۂ نگاہ وضع ہوا، اور زندگی اس زاویے سے دیکھی جانے لگی؛

اس پرتو کے اثرات دیرپا نہیں رہے، کیونکر رہ سکتے تھے، اقتصادی وسیاسی نظریوں اور عام سائنٹفک ارتقانے زندگی کا بند بند کھول دیا۔ زندگی کو قریب سے دیکھنے کی آرزوئیں دلوں میں مچلنے لگیں، نیاز اور ان کے معاصرین کے اسالیب میں پختگی تھی۔ وہ پختگی اور وسیع ہوتی، رومانی افسانہ نگاری کی ترقی اور تکمیل میں ابھی بڑی گنجائشیں تھیں، مگر ادب کے نئے تقاضوں اور ترقی کی پرواز نے اس کارواں کو یونہی چھوڑا۔ اور ایک ایسی چھلانگ لگائی جس نے ہمیں، تبدیلی کی نئی منزل پر پہونچا دیا۔ آسکر وائلڈ کے بعد ٹالسٹائی نے لی، پھر چیخوف نے پھر گورکی نے، اور اب اک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو تمام اردو ادب، روسی طرز تفکر اور اسلوب تحریر سے بڑی حد تک متاثر ہو رہا ہے؛

منفعل اور مفلوج قوم پرستی کی تحریک کے فروغ کیساتھ ساتھ جبیں روایاتی نیکیوں کی اقدار اجاگر ہو رہی تھیں، ٹالسٹائی کی کہانی کے اخلاقی عناصر روشن ہوئے؛ اہل نظر یہ بھی جانتے ہیں، کہ اپنے اعمال وکردار میں خود گاندھی جی، ٹالسٹائی سے کافی متاثر ہیں؛ تحریک عدم تعاون تو خیر، واضح طور پر ٹالسٹائی کی تحریک ( ) کا پرتو ہے۔

بہرحال، روسی ارتقا کا یہ کچھ عجیب کارنامہ نہیں، مگر کارنامہ ضرور ہے، اگر کسی چیز کو ہم نے مکمل نہیں کیا، اور نئی چیزوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتے

گئے۔ یہاں تک کہ اب کہانی میں دور دراز کار باتیں عیب خیال کی جاتی ہیں۔ زندگی کی دقیق اور واضح حقیقتوں پر ہماری نگاہ پڑنے لگی ہے۔ موتی ہاتھ نہیں لگے، مگر غواصی کا جذبہ تیزی سے کارفرما ہے؛

سید محمود مورخ بی اے نے جن کی حقیقی حیثیت ایک جرنلسٹ کی ہے، اپنے نئے بارہ افسانوں کو مجموعہ کی شکل میں شائع کیا ہے، اس سے پہلے بھی وہ ایک مجموعہ شائع کر چکے ہیں؛ جرنلزم اور افسانہ نگاری دو مختلف راہیں ہیں، جرنلزم اور پھر دیسی جرنلزم جس میں "ریاستی سیاست" پر رائے زنی بھی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جداگانہ فریضہ ہے، رہا افسانہ یہ ادب کی ایک مستقل صنف ہے، جسمیں کمال حاصل کرنے کیلئے عمر بھی بیت جائے تو کم ہے؛

سید محمود مورخ کو پُرسکون اوقات میں یہ سوچنے کے لئے بھی وقت نکالنا چاہیئے کہ انھیں افسانہ نگار بننا ہے یا جرنلسٹ، یہ بڑی خوفناک بات ہے کہ کہانیوں کی دنیا میں بھی ریاستوں کے بھوت گھس آئے ہیں، شاہی قیدی، میری محبت کا خوفناک انجام، یہ اور کئی افسانے والیانِ ریاست کی عیاشیوں، رنگ رلیوں اور استبداد کی ہولناک تصویریں ہیں؛

اس میں شک نہیں، ان کہانیوں کی ایک دنیا ہے؛ جسمیں پہونچکر ہمیں ریاستوں کی مظلوم اور بھوکی پرجا کے دکھ معلوم ہوتے ہیں۔ ان اعمال کے رُخ سے حجابات اٹھتے ہیں۔ جو دیسی راجا مہاراجہ یورپ میں جاکر اختیار کرتے ہیں۔ غریب اور ان پڑھ پرجا کی گاڑھی کمائی ویسٹ اینڈ کے شریک مالکان ہوٹل اور یورپی کنواری کی عشوہ طرازیوں کی نذر کر دی جاتی ہے، اور یہ کہ حکومت ہند ان تمام شرارتوں اور آدم آزاریوں کو برداشت ہی نہیں کرتی کبھی کبھی برابر کی مجرم بھی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن کہانی کے آرٹ سے اور اس اسلوب کو کوئی تعلق نہیں۔

مورخ برسوں سے لکھتے ہیں، ان کی نثر میں بڑی جان ہے۔ حالات کی نامساعدت کہئے، یا معذوریاں، وہ اپنی اہلیتوں سے وہ کام نہیں لے سکے جو انھیں لینا چاہیئے تھا؛ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیوں میں فنکاری کی وہ شان نہیں، جسے مورخ آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں؛

مورخ کے اکثر افسانے اپنی ترتیب کے لحاظ سے نادر ہوتے ہیں۔ "کیمیا" اچھا افسانہ ہے۔ مگر فنکاری اُس میں بھی مفقود ہے، پس منظر غیر حقیقی تصورات پر مبنی، یہ رجحان ترقی یافتہ زمانے میں افسوسناک ہے، موجودہ زمانہ اور رہبانیت! جب زندگی گریز و فرار کے باوجود مسلسل کشش کر رہی ہے۔

زندگی سے آنکھ بند کرلینے کی تعلیم! ترقی اور انسانیت کی بڑائی کی توہین نہیں تو کیا ہے؟

لیکن بہرحال، مؤرخ کے افسانے ایسے ضرور ہیں کہ وہ سوسائٹی کے ایک مخصوص حلقہ میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کامیابی بھی ایک افسانہ نگار کیلئے کم نہیں؛

نثرہ

مصنفہ مولانا محمد عزیز اللہ شاہ عزیز عرف منشی ولایت علی خاں ولایت۔ مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ قیمت ۸ر

نثرہ کی زبان کا اسلوب وہی ہے جو امام حریری کے بعد عام طور پر عربی اور فارسی ادب پر حاوی رہا۔ عربی ادب میں امام حریری کا ایک خاص مقام ہے۔ حریری نے اپنے عہد کے فن بلاغت اور صنائع بدائع کے انتہائی کمال کا ایک نادر نمونہ مقاماتِ حریری، کے نام سے پیش کیا، اور ثابت کردیا کہ عربی ادب موجودہ ترقی یافتہ ادبیات میں بھی ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ ان مقامات نے یہ بھی ثابت کیا کہ عربی ادب مترادف المعنیٰ، مترادف الصوت، مترادف اللفظ، کثیرالمعانی اور وسیع و دقیق مفاہیم ادا کرنیوالے الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ رکھتا ہے۔ یہ مقامات ہی کا اثر تھا کہ ان کی اشاعت کے ایک صدی بعد عربی ادبا کی کثیر تعداد مقامات کا جواب دینے کی دُھن میں قافیہ بندی اور لغت پیرائی میں مبتلا ہوگئی۔ عربی کے شستہ و شگفتہ ادب میں بھدّے بے ڈول اور غریب الفاظ کے استعمال کی کثرت ہوگئی۔ یہ حماقت سامانیاں جاری رہیں مگر مقاماتِ حریری کا جواب نہ ہوسکا۔ اور وہ بلاغت کے آخری، مکمل اور کامیاب شاہکار کی حیثیت سے آج تک باقی ہے۔

پچھلی چند صدیوں میں ایران کے عربی نواز حکمرانوں نے فارسی ادب کی قسمت عربی ادب کے ساتھ وابستہ کررکھی تھی، اس عربی رجحان کا فارسی ادب پر بھی اثر پڑا، فارسی انشا پردازوں نے بھی قافیہ پیمائی اور صنعت پروری کو ادبیات کی جان سمجھ لیا۔ بعض کو کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ مقاماتِ بدیعی جیسی اچھی کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔ لیکن بہرحال مجموعی طور پر ادب کی آزاد ترقی کے لئے یہ رجحان تباہ کن تھا، اور بالآخر تباہ کن ثابت ہوا؛

عربی ادب میں حریری اسٹائل کا اثر تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں ختم ہوگیا تھا۔ مگر فارسی ادب میں اس اسکول کے مقلدین جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) سے قبل تک موجود تھے۔

نثرہ بھی حریری اسکول کا ایک دلچسپ، مختصر، اور لطیف نمونہ ہے، جس میں مولانا عزیز نے الفاظ کی در و بست اور بلاغتی نثر کی مشون کاریوں میں خود کو محدود رکھا ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"دہر بخشی، بلفظِ جیدہ و بمعنی پیچیدہ، بلفظ فریدہ و بمعنی جریدہ، بلفظ و بمعنی فکر بکر۔ بلفظ گوہر آبدار و بمعنی جوہر تابدار"

اسی طرح صفحہ ۲ سطر ۱۳ سے لیکر صفحہ ۲ سطر ۵ گویا ۴۶ سطروں میں یہ بتایا گیا ہے کہ "حدائق نعت" (جس کتاب کی تقریظ کے سلسلے میں مذکورہ عبارت لکھی گئی ہے) کے الفاظ و معانی کا کن کن چیزوں کیساتھ استعارہ کیا جاسکتا ہے۔

اس ایک نمونہ سے مولانا عزیز کے طرزِ نگارش کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

فارسی میں یہ اسلوبِ انشا اب متروک ہے، لیکن اس کے مطالعہ سے ادب کی ایک خاص صنف یعنی لغات، پر دسترس ضرور ہوجاتی ہے۔ قدیم عربی آمیز فارسی لغت پر عبور حاصل کرنے کیلئے نثرہ یقیناً ایک مفید کتاب ہے۔

مصنف اس دُنیا میں نہیں، کتاب کے آخر میں ان کے حالات سید اشرف علی بی اے (علیگ) اصغی پوری ڈپٹی کلکٹر نے تحریر کیے ہیں؛

نگارشِ عاری

صوفی محمد عزیز اللہ شاہ عزیز

مطبوعہ ادبی پریس قیمت عہ

نثرہ کے مصنف کی دوسری تصنیف، یہ مختلف رقعات ہیں۔ عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کے نام، کتاب کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ عبارت صنائع و بدائع کی پابندیوں سے آزاد ہوگی۔ نثرہ کے مقابلے میں کچھ آزاد ہے بھی پھر بھی بلاغت آمیز طرز نگارش کی جھلک کہیں کہیں نمودار ہو ہی گئی ہے۔ رقعات کے آداب و القاب کے سلسلے میں لفظ شفیق (بمعنی ہمدرد مہربان) کے بجائے ہر جگہ مشفق استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ مشفق کے معنی ڈرانے والے کے ہیں؛ مجموعی طور پر یہ نثرہ کے مقابلہ میں واضح اور صاف اسلوبِ انشا رکھتی ہے؛

ساغر

ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن

چند سال سے اُردو زبان و ادب کے متعلق ملک میں خاص بیداری پیدا ہوئی ہے، اس بیداری کا دوسرا نام مدافعت اور حفاظت ہے، وقت کے وہ تقاضے جو نئی تبدیلیوں کی گود میں پل کر جوان ہو رہے ہیں، نئی لسانی ترقی اور تعمیر کی نیو ڈال چکے ہیں، ان کا اندازہ کرنے کے بعد نہ جاگنا موت کی نیند سو جانا ہے، کوئی شک نہیں کہ انفرادی کوششیں بھی کم قیمت نہیں لیکن ہر کام میں مرکزیت، مقاصد کی جامع و کامل ترقی کے لئے لازمی ہے۔ مل جل کر جو قدم اٹھائے جاتے ہیں وہ کبھی پسپا اور مغلوب نہیں ہوتے، اردو زبان و ادب کے سلسلے میں کام کرنیوالوں نے اس اصول کو کچھ سمجھا ہے۔ اور انفرادی کوششوں کے بجائے جمہوری و اجتماعی کوششیں شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

ایسے ہی جمہوری اداروں میں سے ایک "ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد دکن بھی ہے۔ جس نے محض ادبی کتابوں کی اشاعت ہی کو اپنا مقصد نہیں بنایا بلکہ اُردو کتابوں کے پڑھنے کا ذوق پیدا کرنے کے ذرائع کو وسیع کرنے پہ اپنے نظام میں زور دیا ہے؛ اس نے دوسرے شعبوں کے ساتھ ایک شعبۂ اردو امتحانات بھی قائم کیا ہے، جو مقررہ قواعد و ضوابط کے تحت امتحانات لیتا ہے اور کامیاب امیدواروں کو ادارے کی طرف سے صداقت نامے، سندیں اور امتیاز کے ساتھ کامیاب ہونیوالوں کو انعامات عطا کرتا ہے۔ دکن میں مختلف مدرسے قائم کرنے کی تجاویز بھی اس کے زیر غور ہیں۔ اس ادارہ میں مقررہ نصاب کے ماتحت عام فہم تقریروں کا بھی انتظام کیا جاتا ہے، جس سے عوام و خواص امیدوار مساوی طور پر استفادہ حاصل کر سکتے ہیں؛

"ادبیاتِ اردو" مجلسِ امتحاناتِ اُردو کے صدر مولوی سید علی اکبر ایم اے (کنٹب)، نائب ناظم تعلیمات ممالکِ محروسہ ہیں؛ نائب صدر مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے (کنٹب)، پرنسپل ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن اور معتمد مولوی عبدالقادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی اُردو لکچرار جامعہ عثمانیہ ہیں۔ اراکین میں حیدرآباد کی مختلف علمی و ادبی شخصیتوں کے علاوہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ بھی ہیں؛ ڈاکٹر زور نے اُردو زبان کی جتنی بنیادی خدمت کی ہے شاید اُسے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے اپنے طریقِ کار سے محدود (یا محدود) مقاصد کو اپنے دائرہ میں شریک کیا ہے جو مختلف موضوعات پر وہ علمی و ادبی تصنیفات شائع کر کے جملہ اُردو دنیا کی خدمت کر رہا ہے، اور جہاں تک دکن کے گوشہ گوشہ میں اُردو کو وسیع و مستحکم کرنے کا سوال ہے، وہ چاہتا ہے کہ ماہر سند یافتہ ادیب پیدا ہوں اور اُردو اسکولوں کا ایک گلشن تمام دکن میں کھلا دیا جائے جس سے اُردو ادب کی خوشبو پھوٹے اور بعید سے بعید علاقہ کو متاثر کرے۔ "اردو دانی، اردو عالم، اردو فاضل" کی ڈگریوں کا جو نصاب ترتیب دیا گیا ہے، وہ بہت آسان ہے، اور تمام اردو ادب کے انتخاب پر حاوی نہیں۔ میری تجویز ہے کہ اُردو عالم اور اُردو فاضل کے نصاب میں، موجودہ نئے ادب کی کتابیں اور نثر و نظم کے مجموعوں کو بھی شامل کیا جائے، خاص کر وہ تنقیدی کتابیں، جن میں نئے زاویہ ہائے نگاہ پیش کئے گئے ہیں؛ موجودہ زمانے کی تمام اُردو شاعری کو اقبال کی کتابوں میں محدود سمجھ لینا، ذرا زیادتی ہے، اسی طرح صرف مرحوم نثر نگاروں کی کتابوں ہی تک نثر کو محدود کر دینا، کوئی انصاف نہیں؛

لیکن یہ ایسے مسائل ہیں کہ اگر ادارہ تبدیلی و ارتقا کو فطرت کا اٹل قانون تسلیم کرے تو نصاب کی تبدیلی کے متعلق خود نصاب مقرر کرنیوالوں کے ذہن ہماری نمائندگی کر سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا شاندار اور یادگار کام ادارہ کا تازہ کارنامہ ایک اُردو انسائیکلوپیڈیا ترتیب دینے کا اہم فریضہ ہے؛ اس ذیل میں ادارہ کے خاص مقاصد یہ ہیں۔

(۱) جملہ علوم و فنون کی اہم اور ضروری معلومات یک جا فراہم کرنا (۲) مستند مواد کو ماہرین کے نقطۂ نظر سے ایسی زبان اور ایسے اسلوب میں مرتب کرنا جس سے عوام و خواص ہر دو کما حقہ استفادہ کر سکیں (۳) حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں، ضرورتوں، اور رجحانوں کی تقسیم اور اس کی نسبت معلومات کو منظم طریقہ پر پیش کرنا؛ اس کے سلسلہ میں ادارہ نے ۶ کمیٹیاں بنائی ہیں (۱) مجلسِ انتظامی، مجلسِ ادارت، مجلسِ نظرثانی زبان و بیان، مجلسِ ترجمہ، مجلسِ اشاعت، مجلسِ فروخت و تشہیر، مجلسِ انتظامی کے صدر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ ہیں۔ معتمدین۔ ابو المکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ (عثمانیہ)، سید بادشاہ حسین، اراکین میں تقریباً جامعہ عثمانیہ کے تمام اساتذہ، خاص کر عبدالقادر سروری ایم اے لکچرار اُردو، مجلسِ ادارت کے اراکین [illegible] دکن تک محدود نہیں، حیدرآباد کے علما و ادبا کے ساتھ ساتھ، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر [illegible] رام بابو سکسینہ، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال لاہوری، [illegible] رضوی، مسعود عالم ندوی، نجیب اشرف ندوی، وغیرہ بھی اس مجلس میں شامل ہیں؛

اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب اردو زبان میں ایک نئے عہد کا آغاز ثابت ہو سکتی ہے، اس لحاظ سے ادارۂ ادبیاتِ اردو کا یہ باجرأت اقدام کافی تاریخی حیثیت رکھتا ہے، نہایت [illegible]

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۲)

نہ صرف اونچے درجے کے افراد کو فائدہ پہونچا سکتا تھا۔ گویا اسوقت ادب کی رسائی عام ذہن تک نہ تھی لیکن آج عوام اُس تک پہونچنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ ادبی ارتقا عوام کی ذہنی ترقی سے کچھ قبل ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مشکل کے باوجود ادب کی سائنٹفک موشگافیوں کی ہمت شکنی نہیں کیجا سکتی بلاشبہ عوام کا ادب پر بہت بڑا حق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہیں اور فلسفیانہ خیالات کے بھی اس پر کچھ حقوق ہیں۔ اسلئے ادب یا آرٹ کو انقلابی جوش میں آکر کامل طور پر عوام کی خواہشوں کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لینا چاہیئے کہ ادب میں بھی مختلف طبقات قائم کر کے کچھ اور نئی مقدس ادبی قدریں پیدا کر لی جائیں۔ ضرورت ہے کہ ادب کو رُوح و پیکر، زبان و خیال کے لحاظ سے قنا سب اور لچکیلا بنایا جائے۔ خلاق اور معجز نما فنکار کے لئے عوام کے ذہنوں سے قریب ہونا ناممکن نہیں، یہی تو وہ مرحلہ ہے جہاں عوام کی لسانی اور نفسیاتی ضرورتوں کا انکشاف ہوتا ہے اور فنکار و عوام کے نئے تعلق کی بنیاد پڑتی ہے؛

عوام ذہناً روشن، زود فہم اور اپنی دنیا کی باتیں سننا پسند کرتے ہیں مگر انھیں دقیق و لطیف مسائل سے عدم دلچسپی اور بُعد کا اتہام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر سماج کے دماغی اور مدبر طبقے ان کا حق تسلیم کر لیتے تو وہ ہر بلندی اور گہرائی سے قریب تھے۔ آج بھی اُن کا حق تسلیم کر لیا جائے تو وہ دقیق اور لطیف مسائل حیات کو اسی طرح سمجھ سکتے ہیں جس طرح اعلیٰ دماغی طبقے۔

ادب کو ان کی مانگوں اور ہنگامی تقاضوں کو بھی پورا کرنا چاہیئے اور اُن کے علاوہ بھی کچھ دینا چاہیئے۔ اس طرح وہ ان طبقات کے مطالبوں کو بھی پورا کر سکتا ہے۔ جو گہرے نکات اور اُن نکات کو مجوبہ اور جدید اسالیب سے سُننے کا ذوق رکھتے ہیں؛

رومانیت اور ادب

بعض طبقوں خصوصاً اُن ادیبوں کا جو ذہناً تقشف زدہ ہیں۔ خیال ہے کہ رومانیت ادب کی اہم ذمہ داریوں کی راہ میں سدِّ راہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ اعتراض اُٹھانے والے چاہتے ہیں کہ ادب کو خشک۔ روکھی، تلخ، افادی اور منطقی بحثوں اور منطق میں محدود کر دیں۔ یہی نہیں اُن کی خواہش ہے کہ منفی ... وہ لیے اُن کو مکمل اور ابدی بنا سکے گا۔

رومان کی تشریح نفسیاتی حقائق کی روشنی میں کی جائے۔ یعنی رومان کو فلسفۂ محض بنا دیا جائے۔

فنونِ لطیفہ سوسائٹی پر اپنا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس لئے غیر منطقی رجحانات اور مابعد الطبیعیاتی خیالات کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیئے۔ جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے۔ اور اس خیال کو ماننے والوں کا اُن کا یہ اعتراض ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن محض رومان ہی کو انسانی ذہن کے غیر مادّی رجحان سے تعبیر کرنا ایک خطرناک غلطی ہے۔ بلاشبہ آپ رومان کو رجعت کا آلۂ کار نہ بننے دیجئے۔ تاہم اسکی اپنی لطافت کو اگر وہ سماج کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ بہرحال برقرار رکھنا چاہیئے۔ اس ضمن میں خود رومان کی اپنی منطقی اہمیت کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ یقیناً یہ ممکن ہے کہ اگر ہم سائنٹفک نقطۂ نظر سے تشریح کریں تو وہ ہمارے ذہن کی کسی نہ کسی کمزوری کا نتیجہ ثابت ہوگا اور اس کا بنیادی سبب ہمارے سماج کی طبقاتی تقسیم میں مل سکتا ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ سماج۔ ماحول یا خارجی ذرائع رومان پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ چیز اپنے مقام پر باقی رہتی ہے۔ انسانی ذہن کی صلاحیتیں ان خارجی اثرات سے متاثر ہو کر رومانی کیفیات پیدا کر دیتی ہیں۔ انسانی ذہن کی یہی وہ صلاحیتیں ہیں جو رومانی لٹریچر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ پھر یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ صنفی میلانات رومانیت کی بنیاد ہیں اور معلوم ہے کہ صنفی مطالبہ انسانی سیرت کا ایک فطری مطالبہ ہے۔ لہٰذا رومانیات کو ادب کے غیر منطقی رجحان سے تعبیر کرنا صحیح نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ادب ہماری سوسائٹی کی مختلف ذہنی تبدیلیوں کا پرتو ہے۔ وہ فقط کسی خاص طبقہ۔ جماعت یا گروہ کا نمائندہ نہیں۔ نہ سماج کے کسی خاص تقشف آمیز یا رومانیت نواز رجحان کی نمائندگی ہی تک اسکی ذمہ داریاں محدود ہیں اس لئے ہر وہ رُخ اور ہر وہ تبدیلی جو سوسائٹی میں نمودار ہوتی ہے۔ ادب میں اسکی جگہ ہونی چاہیئے۔ دقیق مضامین، افسانہ، ڈراما، شاعری، نظم، گیت تمام اسالیب اور طرائق ادب کی تکمیل میں اپنا اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ اسلئے ان میں کسی کو غیر ضروری غیر منطقی یا مضر نہیں بتایا جا سکتا۔

اب یہ نئے ادیب کا فرض ہو کہ وہ اس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب طرز میں پیش کرے وہ خیالات کی اُن اندرونی لہروں کا تجزیہ کرے جو ہماری تہذیب کو حرکت میں لا رہی ہیں اور جو ادیب جس قدر بہتر طور پر اس کام کو انجام دیگا۔ اسی قدر

روغن تاج گیسو دراز

ایجاد

بہ نسخہ خاص علامہ لقمان الملک

حضرت والد ماجد حکیم نابینا صاحب سابق طبیب خاص اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ (از فقیر دعاگو حکیم خسرو شاہ نظامی)

روغن تاج گیسو دراز

آج کل حشرات الارض کی طرح روغن اور ہیئر آئیل نکل آئے ہیں جو بڑے خوشنما رنگت کے نظر آتے ہیں، مگر جن میں ۹۰ فیصدی مٹی کے صاف شدہ تیل اور مضر صحت اجزاء کی وجہ سے، تجربہ سے بجائے فائدہ کے مضرت رساں ثابت ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بیشمار لوگوں کے بال اس قسم کے تیلوں کے استعمال کی وجہ سے قبل از وقت [illegible] ہو جاتے ہیں۔ روغن تاج کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ حضرت والد ماجد مجدد طب لقمان الملک حکیم نابینا صاحب قبلہ مد ظلہ العالی کے مجربات خاص میں سے ہے [illegible] چونکہ حضرت والد ماجد اعلیحضرت غفران مکان مرحوم کے طبیب خاص تھے اس لئے محلات مبارک میں بکثرت یہ روغن تاج استعمال ہوتا تھا۔ جو واقعی اپنے فوائد کے [illegible] سے روغنیات کا سرتاج ہے۔ اس کے اجزاء دماغ کیلئے اس حد تک تقویت بخش و مفید ہیں کہ اس کے کچھ دنوں استعمال سے دماغی چکر آنکھ کے سامنے اندھیرا آنا [illegible] کافور ہو جاتے ہیں۔ اس لئے دماغی کام کرنیوالوں کیلئے نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ بالوں کی جڑوں کو غذا بہم پہنچا کر اسقدر مضبوط کر دیتا ہے کہ اگر بال کمزوری کی وجہ سے گر رہے ہوں تو صرف چند روزہ استعمال سے ان کا گرنا بند ہو جاتا ہے۔ بالوں کو نہ صرف بیحد دراز کرتا ہے بلکہ گھنے اور کالے بھی کر دیتا ہے۔ سیاہ کرنیکے یہ معنی نہیں ہیں کہ تیل خضاب کا کام دے بلکہ اگر نزلہ وغیرہ کی وجہ سے قبل از وقت بال پکنے لگے ہوں تو پہلا عمل تیل کا یہ ہوتا ہے کہ دوسرے بال سفیدی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور چند روز میں تمام سفید بال خود بخود گر جاتے ہیں اور انکی بجائے سیاہ نکلتے ہیں۔ دماغی کام کرنیوالوں نفیس طبیعتوں اور بیگمات کیلئے نہایت اعلیٰ تحفہ ہے۔ چونکہ ساٹھ ستر سے زیادہ ادویات و [illegible] جڑی بوٹی سے یہ شاہی تیل سخت محنت سے بنایا جاتا ہے اسلئے اسکی قیمت مروجہ خوشنما مضر تیلوں سے بظاہر زیادہ مگر زور دہی ہے۔ قیمت فی تولہ [illegible]

پتہ: دواخانہ متعلقہ فقیر دعاگو حکیم خسرو شاہ نظامی خلف لقمان الملک حکیم نابینا صاحب شاہ گنج حیدرآباد دکن

روح الذہب

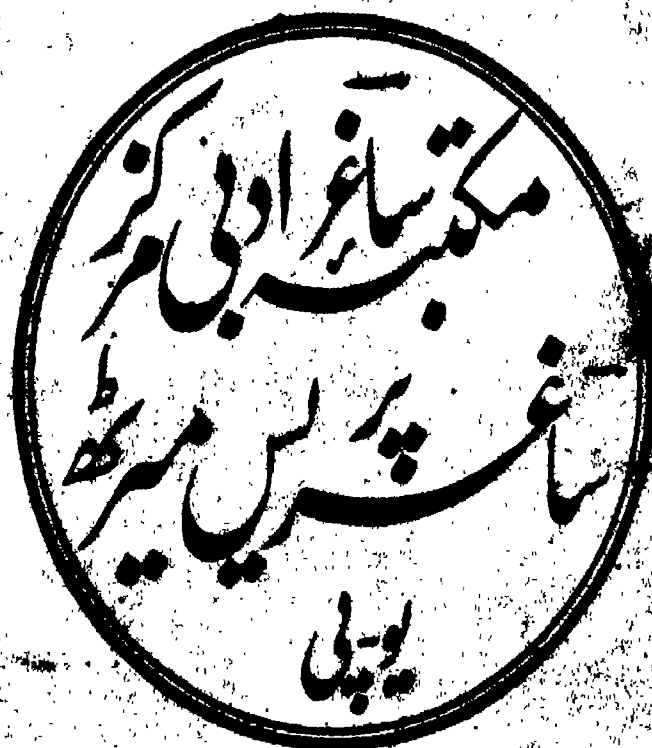
[illegible] قابل استعمال ہر امر ہے کے چاہے [illegible] اعتدال [illegible]

[illegible] لقمان الملک [illegible] حضرت جد امجد [illegible] حکیم نابینا صاحب قبلہ کے [illegible]

[illegible]

[illegible] روح الذہب

[illegible]


مکتبہ ساغر ادبی مرکز
ساغر پریس میرٹھ
یو پی


ایشیا

مفرح یاقوتی محمد شاہی

[illegible] جواہرات گرانمایہ صدف طلا و نقرہ مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ طب کیمیاوی کا اعجاز نا کرشمہ باوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی پہلا مفرح شہنشاہی [illegible]

خادم خلق اللہ

[illegible] عبد الشفیٰ انصاری مع برادران نبیرۂ لقمان الملک علامہ حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی منیر انصاری دواخانہ زیر نگرانی حکیم محمد عبد الغنی انصاری [illegible] شاہ نظامی

(دواخانہ شاہ گنج حیدرآباد دکن)

یاقوتی محمد شاہی

[illegible] شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمال دوا جس کا نسخہ قلمی راز میں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے خاندان عالیہ انصاریہ میں رہا جو عہد سلطنت مغلیہ میں علاوہ [illegible] شہنشاہی کے عہدۂ جلیلہ طبی ہفت ہزاری تک پر متمکن رہے چلا آرہا ہے یہ نسخہ صرف والیان ملک رؤسا و امرا کیلئے مخصوص طور سے بنایا جاتا رہا۔ اگر اسکو ہر اعتبار سے علاوہ [illegible] مفرح یکتا [illegible] شہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار مشاہدات کی بے لاگ کسوٹی پر ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ یوں تو یاقوتی اور مفرحات سے طب یونانی کی قرابادینیں پٹی پڑی ہیں اور بعض [illegible] [illegible] میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کرکے بدنام کنندہ نکونامے چند کے مصداق ہو رہے ہیں۔ مگر یہ شہنشاہ پسند مفرح یاقوتی جسکو [illegible] حکما و فضلا مصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا اس کے اجزاء ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گراں مایہ کا مجموعہ ہیں اسکو مجدد طب علامہ لقمان الملک حکیم نابینا صاحب [illegible] کیمیاوی کے طریقہ سے اب اس درجہ مکمل فرمادیا ہے کہ یہ مفرح بنہایت معتدل ہوگئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں کرتی۔ صدف طلا و نقرہ [illegible] ناسفتہ لعل بدخشانی۔ یاقوت رمانی و یاقوت اصفر وکبود زمرد تاباک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول اور بعید اللطف بنا کر اسمیں شامل کیا جاتا ہے۔ اسی [illegible] دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو حد سے تقویت پہنچاتی ہے اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو بہ صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے ہیں کہ تقویت [illegible] جسم و دماغ اور اعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اس درجہ تفریح اور ایسی ہیجان و فرحت کمال کا حال پیدا کرتی ہے کہ [illegible] کرنیوالوں کیلئے عجیب و غریب بلا مبالغہ غیر مترقبہ ہو۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب و غریب صفت ہے کہ یہ مثل جوہر الحواہر یا جواہر مہرہ کے پرانی سے پرانی عادت منشیات کو ترک [illegible] اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شراب نوشوں نے شراب ترک کردی افیونیوں نے افیون کو ترک کردیا۔ اور دوسرے منشیات کے استعمال کرنیوالوں نے اس یاقوتی کو [illegible] [illegible] تمام استعداد کو کمال درجہ تقویت بخشتی۔ نشاط پیدا کرتی معدہ اغذیہ کو جزو بدن بناتی ہے وہ لوگ جو گرم مقویات کھا کر پریشان ہوتے ہیں اور جن کو سودا موافق آتی ہو [illegible] مفرح یاقوتی واقعی آب حیات سے کم نہیں ہے۔ بلا کسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کیلئے بہترین مقوی ہے بہرحال یہ یاقوتی ہر اعتبار سے بہ صفت موصوف ہے۔ مگر [illegible] نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ صد ہا بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اس مفرح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی یکہ شاہی [illegible] [illegible] نوش جان فرماتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے اسکے دلدادہ شیفتہ ہوجاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گراں قیمت ہے اور یہ پہلے اسکی مقدار [illegible] [illegible] سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مفرح ہے ہر قسم کی منشیات کا متبادل کرنے والا قطعی پاک ہے۔

[illegible]

جولائی ۱۹۴۸ء سے جاری

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ



منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

حکومت صوبۂ بہار اور حکومت صوبۂ سی پی اینڈ برار

ایڈیٹر

ساغر

اسسٹنٹ ایڈیٹر

محمد تقی

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستانی)

قیمت فی نمبر ۸ آنے

قیمت سالانہ [illegible]

ایجنسیوں کو [illegible]

فہرست مضامین ایشیا فروری سنہ ۱۹۴۲ء

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	فہرست		۲
۲	جمندون حیدرآباد میں	ساغر	۳
۳	فانی بدایونی	احتشام حسین	۵
۴	عظیم بیگ چغتائی	"	۷
۵	حکیم آزاد انصاری	ساغر	۸
	نئی صبح		
۶	نئے ادبی رجحانات	احتشام حسین	۱۱
۷	جاپان کی داخلی اور خارجی سیاسیات کا پس منظر	سید محمد تقی امروہوی	۱۸
۸	دور عقلیت کے سیاسی افکار	اکرام قمر بی اے	۲۲
	دکھ سکھ		
۹	تہذیب کا پہلا سبق	للتا دیوی	۲۹
۱۰	بے زبان	ڈاکٹر رشید جہاں	۳۱
۱۱	بابوجی مزدور چاہیے	مالتی دیوی	۳۵
۱۲	مکھن گرج	سید فرید جعفری	۳۷
۱۳	ایک فیشنیل سوانگ	ل احمد اکبرآبادی	۴۰
۱۴	دل کا اندھیرا	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	۴۴
	نیا راگ		
۱۵	یاد ماضی کا پیغام	کنیز فاطمہ حیا	۵۱

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱۶	غلاموں کی دنیا	نہال سیوہاروی	۵۲
۱۷	بہار کی رات	آنند نرائن ملا	۵۴
۱۸	مراجعت	جاں نثار اختر ایم اے	۵۵
۱۹	ساقی مجھے بھیک دے سکو لکی	ظفر تاباں دہلوی	۵۶
۲۰	انقلاب	محمد علی خاں اثر رامپوری	۵۷
۲۱	زمزمے	فراق گورکھپوری	۵۸
۲۲	خیر مقدم	ع جہاں بیگم آدا بدایونی	۵۹
۲۳	موت	معین احسن جذبی بی اے	۶۰
۲۴	میری منزل	تاباں (رفع گڈہ)	۶۱
۲۵	بادل	سلام مچھلی شہری	۶۲
۲۶	ہدیۂ محبت	جاں نثار اختر (علیگ)	۶۳
۲۷	اجتماع ضدین	ذوقی بی اے (علیگ)	۶۴
۲۸	طلسمات	ساغر نظامی	۶۵
	(دو تازہ غزلیں)	"	۶۶
	کسوٹی		
۲۹	ذکر و فکر	ادارہ	۶۹
	سوانح غالب اور اُسکی	"	
	غزلیات		تا
	اور دوسری کتابیں	"	۷۶

ایشیا

جلد (۷) | فروری سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر (۱)

چند دن حیدرآباد میں

عجیب شے ہے انسانی فطرت بھی، ——— وہ دن مجھے خوب یاد ہیں جب ادبی اجتماعات، کانفرنسوں اور مشاعروں میں کشش ہی کشش اور مسرت ہی مسرت تھی۔ زندگی سے روح و دل کچھ ہم آہنگ نہ تھا، ایک فریبِ شوق تھا کہ حصار کئے ہوئے تھا: میں ہر بزم میں شمع کی طرح، روشن اور چاند کی طرح چمکنا چاہتا تھا ——— اور نہ میں شمع تھا نہ چاند!؟

عجیب شے ہے یہ انسانی فطرت، کامیابیوں اور ملک کی پذیرائیوں نے ان چیزوں کا ہجوم کر دیا، مگر ادنیٰ سی دلکشی محسوس نہیں ہوتی، زندگی کا لمس احساس لذت کو یکسر زہر بنا گیا۔ جیسے کوئی دشمن کے گلاس کو سم آلود کر دے!!

انسانی فطرت کا تجزیہ، زندگی کے مشاہدات، موجودہ سماج میں علم و ہنر کا وجود، معاشرتی نظام کے عناصر، شعر و ادب کا نام نہاد رابطہ!!!

اور اس تمام طوفان میں سبکساریٔ ساحل کی تمنا! ——— پھر فرقابی کا یقین!!؟ اک عالمِ حیرت ہے کہ حیرت فزا ہے

زندہ رہنا، زندگی کا ایک بت تراشنا، اک آئیڈیل کو وضع و مکمل کرنا، اور ——— . . . . . . اس آئیڈیل کے ماتحت راحت کا تصور!؟ عملی دنیا میں تخیل اور حقیقت کا تمام کارخانہ جھک سے اڑتا ہوا نظر آیا، یہ دنیا، یہ تضادوں کی بھیڑ، یہاں نہ تخیل کا پنپنا ممکن ہے نہ حقیقت کا، ——— یہ سب کچھ دیکھا اور مشاہدات کی تلخی زہریلے کیڑے کی طرح مس کر کے گذر گئی،

[illegible] ہے، اس سے کہ ہر رنگ میں شرکت ہو سکے،

مگر اپنے لئے کبھی ہوئی، چاند ضوبار ہے مگر اپنے لئے تاریک؛ تلخی کا یہ زہریلا مس، زندگی کی یہ خوفناک رونمائی، مشاہدات کی یہ بھیانک اور تجربوں کی یہ واقعیاتی مردم شناسی، انسانی فطرت کے توازن کو ہلا بھی سکتی ہے اور قوی بھی کر سکتی ہے؛ ——— یہ میں نے آج محسوس کیا۔ زندگی میں جان نہ سہی مگر یہ دیکھا، انسان سے زیادہ قابلِ رحم ہے!!

اس نے کچھ نہیں دیا؛ مگر ہاں خود سے نباہ کی قوت، مقابلہ کی طاقت، انسانی خدمت کا جذبہ، گویا اپنا آخری سہارا، اپنا اچھوتا راز، اپنی ان چھوئی حقیقت، یعنی خود سے نباہ کی قوت، مقابلہ کی طاقت۔

گذشتہ ۵ سال میں حیدرآباد نے کئی بار بلایا مگر میں نہ جا سکا۔ جنوری میں کلیۂ ورنگل نے دعوت دی، یہ اک علمی ادارہ کی دعوت تھی، اس پر مستزاد اختر کی (اختر حسین سوہانی ایم اے، اردو لکچرار کلیۂ عثمانیہ ورنگل) کچھ کشش، وہ کشش [illegible] دکن کی، میں اس طرح کھنچا چلا گیا، گویا کھنچ جانا میرا فرض تھا!

سر محمد یعقوب کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ پس پردہ ایک بڑی تعداد خواتین کی موجود تھی، ہزاروں انسانوں کا مجمع، تہذیب و سکوت کیساتھ تھا اور [illegible] شاعری سے کما سالہا سال سے لکھنؤ رہا تھا، حفیظ جالندھری بھی شریک تھے۔ دکن [illegible] میں مقیم شعرا بھی موجود تھے۔ مخدوم محی الدین، نظر حیدرآبادی، دہقانی [illegible] صمد شوی ساز، تسنیم مینائی، عبدالقادر دہلی، علامہ حیرت بدایونی [illegible]

[illegible] مجلس [illegible] ۱۹۴۵ء [illegible]

نے اپنا مضمون [illegible] سنایا۔ خاص سامعین بڑی تعداد میں حیدرآباد سے آئے تھے اور قاضی عبدالغفار بھی جن کی معروفیت مسلّم ہے۔ اس سے آپ اس با عظمت اجتماع کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ بالکل یو پی اور پنجاب کی کل ہند اجتماعات کی سی تکمیل اور ادبیت کی شان پائی جاتی تھی؛

جب کبھی احمد حسین خان صاحب پرنسپل کلیۂ ورنگل، اساتذہ، اور اس کے باذوق طلبہ کے اخلاص، ادبی ذوق [illegible] آرزوؤں اور سوز عمل کا پرتو تھا، کہ تھوڑی دیر کے لئے "امر سنگھ" شاعری کی دیوی مسکرا اٹھی ورنہ آج مسکرانے کی [illegible] کہاں۔!؟

ورنگل کے بعد ۲۲،۲۳ دن حیدرآباد میں مقیم رہا۔ یہ قیام عشرت یک نفس معلوم ہوا۔ دن رات کی مسلسل مہمان نوازی سے دو اندازے ہوئے۔ (۱) حیدرآبادیوں اور دکن میں جا بسنے والوں کی وسیع الاخلاقی غیر ضروری حد تک وسیع ہے۔ (۲) دوسرے اور شعر و ادب کا ذوق عام ہے۔ یہ اندازے انسانی کردار اور ادبی ترقی کے امکانات سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۱) پہلا اجتماعی زندگی کے لئے فال نیک ہے (۲) ممکن ہے اس جاگیردارانہ ماحول میں سرمایہ دارانہ عہد کی ادبیت ترقی کرکے نئے ادب کا لباس پہن سکے۔

حیدرآباد کی شاعری، تغزل اور نظم نگاری کے ان تمام نئے اور پرانے تقاضوں سے متاثر ہو رہی ہے جو ماحول اور وقت نے پیدا کئے ہیں، ترقی پسند ادیبوں اور شعراء کی ایک تعلیم یافتہ جماعت حیدرآباد میں ابھر رہی ہے۔ فضا ساز گار نہیں بعض خدا [illegible] راہ میں حائل ہیں، لیکن ابھرنے والی چیز ابھر کر رہیگی؛

قدیم و جدید میں کشمکش یہاں بھی ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل پر کھلی بحث و تنقید ناپسند کرنے والے یہاں بھی موجود ہیں؛ عوام و خواص میں شعر و ادب کا ذوق [illegible] ہے؛ لیکن اس ترقی کیساتھ کسی حد [illegible] ثقافت اور ادبیت کی تکمیل ابھی اس درجہ مکمل نہیں [illegible] جتنا کہ ہونا چاہیئے۔

شیخ احمد الہ آبادی

یہ ایک سرسری نگاہ ہے، مکمل کرکے لکھنے کا امکان نہیں، حیدرآباد سے واپسی پر [illegible] چھپ کر تیار ہو چکا تھا۔ بہرحال اس سفر میں مجھے خواص کے علاوہ حیدرآباد کے عوام سے بھی قریب ہونیکا فخر حاصل رہا۔ اگر الفاظ میں یہ طاقت ہے کہ وہ دل کی ترجمانی کر سکیں تو میں کمال اعتراف و احترام کیساتھ ان [illegible] احباب اور اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری قدر افزائی اور مہمان نوازی میں [illegible]

شکریہ خاص کر

(۱) جنرل والا شان نواب معظم جاہ بہادر (خلد اللہ دکن)

(۲) محترمہ مسز سروجنی نائیڈو (۳) سید عبدالعزیز صاحب صدر عدالت دانش [illegible] (۴) یٰسین صاحب نوری سابق وزیر بمبئی گورنمنٹ (۵) کرنل نظیر الاسلام صاحب (۶) میجر خواجہ محمد سعید۔ (۷) سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی نائب معتمد فوج و طبابت (۸) ڈاکٹر جعفر حسین صاحب (عثمانیہ) (۹) مرزا فرحت اللہ بیگ [illegible] (۱۰) خواجہ نصیر الدین صاحب جاگیردار (۱۱) سید احمد حسرت ترمذی (۱۲) علامہ حیرت بدایونی (۱۳) مخدوم محی الدین بی اے اور ان کے احباب (۱۴) ادارۂ شرقیہ حیدرآباد دکن (۱۵) تسنیم صاحب مینائی (۱۶) علی اختر صاحب حیدرآبادی (۱۷) اختر صدیقی (۱۸) محشر صاحب عابدی، پروفیسر شعبۂ حیاتیات عثمانیہ یونیورسٹی (۱۹) کپتان یحییٰ صاحب (۲۰) ماہر القادری صاحب (۲۱) محمد یونس سلیم بی اے وکیل لطیف الحسن برنی

اور ان تمام حیدرآبادی دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں؛ جنھوں نے میرا اس طرح خیر مقدم کیا۔ گویا میں انھیں میں سے ہوں؛

رہ گئے اختر سو ان تمام حضرات کو جن کا میں شکر گذار ہوں، اختر ہی کا ممنون ہونا چاہیئے۔ یہی وہ ذریعہ ہیں جس نے اس مرتبہ مجھے حیدرآباد اور حیدرآبادیوں سے قریب کیا۔

میرے لئے اُن کا شکر گذار ہونا گویا آئینہ سامنے رکھ کر اپنا شکریہ ادا کرنا ہے؛ خلوص و انسانیت کی وہ چنگاری جو اختر کے سینے میں دہک رہی ہے میرے شکریہ سے بے نیاز ہے؛

——— کیم مارچ کو ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کے لئے حیدرآباد پھر جانا ہے؛ مجھے یقین ہے کہ مارچ میں حیدرآباد کی ادبی جد و جہد اور شاعرانہ زندگی و ترقی کے بارے میں اس طرح لکھ سکوں گا جس طرح میں لکھنا چاہتا ہوں؛ حیدرآباد کے اس سفر میں میری آمد [illegible] تک ماہنامہ [illegible]

اس مرتبہ حیدرآباد میں میرا پتہ یہ ہوگا۔

کرنل نظیر الاسلام صاحب

اسلام [illegible]

حیدرآباد دکن

فانی بدایونی

احتشام حسین

۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کو فانی بدایونی نے حیدرآباد میں انتقال کیا انتقال
کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال کی تھی اور ان کی شاعری کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ یہ ۶۲ سال بھی ایک مرگِ مسلسل کی طرح گذرے، ہر لمحہ انھیں موت کا انتظار رہا
زندگی کی تلخیاں جو ایک انفرادیت پسند حساس شاعر کے یہاں بیماری بن جاتی
ہیں۔ فانی سے کسی لمحہ جدا نہیں ہوئیں۔ فانی ایک وارفتہ مزاج شاعر تھے۔ وکالت
ان کے لئے ایسی تھی جیسے کسی گول خانے میں چوکھنٹی چیز بٹھانے کی کوشش کی جائے
مگر ہمارا نظامِ تمدن اس کی کب فکر کرتا ہے، شخصیت فنا ہو جائے، ہڈیاں چٹخنے
لگیں۔ دماغ مسلسل احتجاج کرے لیکن یہ گرفت ڈھیلی نہیں پڑ سکتی۔ کون جانتا
ہے کہ فانی کو انھیں تجربات نے جبر کا قائل بنا دیا ہو۔ اسی سے چھوٹنے کے لئے موت
کا ہر وقت انتظار رہتا۔

آج روزِ وصالِ فانی ہے   موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

چمن سے رخصتِ فانی قریب ہے شاید   کچھ آج بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی   زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

اور اس طرح کے سیکڑوں شعر، فانی کا رنج دائم گہرا اور فلسفیانہ ہے
غم دو چار دن کا ہوتا تو اس میں رقت پسندی، جذباتیت اور [illegible]
کیفیت ہوتی لیکن جب غم زندگی بن جائے، جسے جینا کہنا معلوم ہو اس کے یہاں
موت دلہن بن کے آتی ہے۔ فانی کی موت ڈراؤنی اور خوفناک نہیں ہے۔
کیونکہ وہی زندگی کے عقدے کو حل کرتی ہے، وہی سکون لاتی ہے۔ قنوطیت جہاں
زندگی کا مقصد بن جائے فانی وہاں کھڑے ہیں۔ اسی لئے فانی کے یہاں مرگ
کی تکرار فلسفۂ حیات کے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ فانی
[illegible]

کائنات ان کے پیشِ نظر نہیں۔ شدت کے ساتھ وہ اپنی زندگی کے تجربات کو سمجھنا
چاہتے ہیں۔ زندگی اُن کے لئے دیوانے کا خواب ہے جو بیان نہیں ہو سکتا۔ یہی
نہیں بلکہ

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم   رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہاں پہونچ کے بہت سے سوچنے والے فانی کے ساتھ ہو جائیں گے
اور بہت سے ان کا ساتھ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیں گے۔ فانی لکھنؤ
اٹاوہ، بدایوں، آگرہ، حیدرآباد تمام جگہ پھرتے رہے لیکن ان کو کہیں اس کا جواب
نہ مل سکا کہ زندگی کسے کہتے ہیں، ہاں موت کے بارے میں البتہ انھوں نے ایک
فلسفہ بنا لیا تھا کیونکہ اس کا راز تو زیادہ تر تخئیل پر مبنی ہے۔ اور تخئیل کے لئے ایک
تصوراتی بات نکال لینا زیادہ مشکل نہیں۔

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر   موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

فانی کو موت کی تلاش تھی اور انھیں مل گئی۔ جو زندگی ڈھونڈ رہے ہیں
شاید انھیں زندگی مل جائے!

غزل گوئی فطری شاعری ہے یا نہیں؟ غزل گوئی فرسودگی کے سوا
اور کچھ بھی ہے یا نہیں، غزل ہمارے بڑھتے ہوئے خیالات کا ساتھ دے سکتی ہے
یا نہیں، مختصر یہ کہ اسے مٹنا چاہیے یا رہنا چاہیے۔ ان سوالوں کا جواب کسی تفصیلی
بحث میں دیا جا سکتا ہے۔ یہاں تو ایک غزل گو شاعر کی یاد میں یہ سطریں لکھی
جا رہی ہیں۔ اور انھیں حدود کے اندر سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ فانی کی غزل
گوئی ذرا دوسرے شعراء کی غزل گوئی سے مختلف ہے بھی۔ اس کا ایک [illegible]
اس کا ایک انداز بیان ہے اور وہ ملک کے غزل گو شعراء میں بہت بلند [illegible]
ہے۔ اگر کوئی غزل گو ہمارے سامنے زندگی کے مسائل، ان کی [illegible]
[illegible]

ابھی بہت سی الجھنیں تھیں۔ وہ عشق اور مشق کی کیفیات کو سمجھنا چاہتے ہیں،
انھیں زندگی اور موت کا بھید معلوم کرنے کی تمنا ہے۔ وہ انسانی طاقت اور اختیار
کے حدود دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسائل کسے پریشان نہیں کرتے، ایک اجتماعیت
پسند انھیں بھلا دیتا ہے، جواب کہیں اور ڈھونڈتا اور کہتا ہے کہ ؎

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں پھر مل کر تدبیریں سوچیں

لیکن انفرادیت پسند تنہا ہونے کی وجہ سے شکست کھا جاتا ہے اور یہ
جانتے ہوئے بھی کہ ؎

راس آنے میں شکوۂ آہ کسے — کر نہ آب و ہوائے غم سے ساز (فانی)

آب و ہوائے غم سے ساز کر لیتا ہے۔ اور اس مصالحت کو عاشقانہ
کیفیت کا رنگ دیتا ہے۔

کیا کروں نازک بہت ہے اُنکی مرضی کا سوال — ورنہ فانی اس بچے جانے سے کچھ حاصل نہیں

فانی بہت اچھے غزل گو شاعر تھے۔ اُن کی شاعری اتنی متحرک بھی ہو سکتی تھی۔

ہاں شبِ ہجر آج صبح نہ ہو — ہاں چلی جائے یادِ زلفِ دراز

کون با عزم، عمل پسند اپنے نصب العین کے حاصل کرنے میں اس جوش کا
پتہ نہ دے گا؟

آیئے فانی کے کچھ شعر پڑھ کر فانی کو یاد کریں۔

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا
آخر کوئی امید اثر بھی دعا کے بعد! — کچھ آپ بھی کہیں گے مری التجا کے بعد؟
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہونچی تری جوانی تک

نغمۂ ارباب محبت کی لرز جاتی ہے — تو پشیماں نہ ہو ہاں جفا یاد نہ کر
اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے — میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے
دشمن جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
نکل ہی جائیں گے نالے دہن سے خوں ہو کر — زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زباں صیاد
بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا — مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا
لبریز تو نرخ تھا اک اک خطِ پیمانہ — محفل سے جو وہ اٹھے پیتے ہوئے انگڑائی
محوِ تماشا ہوں میں یارب یا مدہوشِ تماشا ہوں — اس نے کب کا پھیر لیا منہ اب کس کا منہ تکتا ہوں

غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں نے فانی کو وہ کچھ بنا دیا جو باقیاتِ فانی
یا عرفانیاتِ فانی میں وہ نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری اور زندگی میں ایک طرح کی
ہم آہنگی ہے جو تجربے کی شاعرانہ صداقت کہی جا سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فانی میں
میر اور غالب کا امتزاج ہے۔ فانی میر اور غالب میں کسی سے قریب ہوں یا نہ
ہوں اپنی ذات سے بہت قریب تھے۔ اور اسی کی ترجمانی نے اُن کی شاعری میں
اثر پیدا کر دیا ہے۔

فانی کا ایک شعر اور یاد آتا ہے۔

ابسنئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز — میں ہی تھا ایک دُکھ بھری آواز

فانی کی انفرادیت پسندی اور غزل کی انفرادیت پسندی دونوں کی
منزل ختم ہے اور نئے سر سے پردۂ ساز چھیڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ شاید کوئی نیا
نغمہ نکلے۔ کوئی نیا گیت سُنائی دے۔ جو اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ زندگی
کے معمہ کو حل کرنے میں مدد دے۔

(باقی مضمون صفحہ ۸)

وہ قدیم تھے، اُن کی ہر ادا قدیم تھی، انسان تھے، ان میں کمزوریاں بھی
تھیں، مگر بنیادی اختلافات کے باوجود وہ نئے لوگوں کو سراہنے میں تنگدل نہ تھے۔
میں انھیں اور وہ مجھے ۱۸ برس سے جانتے تھے۔ اُن کے سامنے میں نے سب سے
پہلی غزل مشاعرہ میں پڑھی۔ کوئی پندرہ برس کے بعد (۳۸ ۱۹۳۹ء) میں دہلی میں ملے
اُن کی کسی بات میں کمی نہ تھی، وہی ۱۹۱۹ء کے آزاد تھے۔
جوش سے اُن کے گہرے دوستانہ روابط تھے، بلکہ آزاد کی محبت انھیں
جوانوں سے زیادہ پسند تھی۔ میرا خیال ہے جوش نرم دل انسان نہیں، مگر مجھے یقین ہے
کہ جس طرح وہ اقبال کے لئے روئے، آزاد کے حصے کے آنسو بھی ضبط کر چکے ہوں گے
سیماب صاحب نے ان کی موت پر خوب تاریخ نکالی ہے ؎

بارِ غم سے ہوئے آزاد آزاد

۱۳ ۔ ۶۰

زندگی بارِ غم نہیں تو اور ہے ہی کیا۔ بہر حال آزاد نے قیدِ غم سے ۲۰ جنوری ۱۹۴۲ء
کو حیدرآباد دکن میں نجات پائی، شاعری کی دنیا میں [illegible] ماتم ہوا مگر اُن کے
دوستوں کو ان کی موت سے جو کاری زخم پہنچا وہ جلد نہیں بھرے گا

ساغر

[illegible] ۱۹۴۲ء

عظیم بیگ چغتائی

۲۰ راگست ۱۹۴۱ء کو عظیم بیگ چغتائی کی ناوقت موت، ایک مدت سے حیات ومرگ میں کشمکش، لاتعداد تصانیف، مزاج، اپنی تصانیف میں اپنے ذاتی غم کا اظہار نہ ہونے دینا۔ یہ سب ایک تشبیہ کی طرف ذہن کو منتقل کرتے ہیں۔ کسی شخص کے مکان میں آگ لگ گئی ہو اور وہ اپنے سامان کے بچانے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ ایسی حالت میں کچھ سامان بچ جائیں گے، باہر وہ بکھرے ہوئے پڑے ہوں گے، اُن میں کوئی خاص ترتیب نہ ہوگی۔ چغتائی کا ذہن کہانیوں کے معاملے میں بیحد زرخیز تھا۔ وہ نہ جانے کتنی کہانیاں کہہ سکتے تھے۔ کہنا چاہتے تھے لیکن ادھر تھوڑے دنوں سے کہنے کی سکت بھی باقی نہ رہی تھی۔ انھیں کچھ نہ کچھ کہہ جانا تھا اس لئے زبان ومحاورہ میں وہ تراش خراش نہ پیدا ہوسکی۔ جو ادب کے لئے ضروری ہے۔ کہانیوں کے پلاٹ اس طرح گتھے ہوئے نہیں ہیں۔ اوّل درجہ کی کہانیوں میں جس کا ہونا ضروری ہے۔ موت سے مستقل مقابلہ کرتے ہوئے یہ سب کچھ چھوڑ جانا بھی بڑی باہمت روح کا پتہ دیتا ہے۔

عظیم بیگ کے یہاں علیگڈھ کی تعلیم اور مسلمانوں کے متوسط طبقے کے تمدن کو اُن کے درمیان میں رہ کر دیکھنے کی وجہ سے ایک ایسی بصیرت پیدا ہوگئی تھی جو ہر حساس ادیب کے یہاں پیدا ہونا ضروری ہے۔ چغتائی نے جرأت کرکے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کوئی اور نہ کہہ سکتا تھا۔

یہ کہنے کیلئے کہ اسلامی تہذیب کی ہندوستانی روایتوں اور شرع کی من مانی تفسیر اور ترجمانی نے متوسط طبقے کے مسلمانوں کی خاندانی زندگی میں بہت سی ہولناک اور گھناؤنی صورتیں پیدا کردی ہیں، چغتائی نے مزاحیہ افسانوں اور قصّوں کا پیرایہ اختیار کیا۔ "شریر بیوی" سے لیکر اپنی آخری کہانیوں تک ایک عظیم الشان مقصد اپنے سامنے رکھا۔ متوسط طبقے کے اخلاق میں رسم و رواج اور قدامت پسندی نے وہ جگہ حاصل کرلی تھی جو اصل مقاصد کو حاصل ہوتی ہے۔ چغتائی نے [illegible] سے اُن کا اپہل کرو۔ نکاح اور طلاق پردہ، رہنے سہنے [illegible] لڑکوں اور لڑکیوں [illegible]

کی زندگی کا اُبھار، سچی مسرت اور صحیح نشاط کی تلاش، پھر زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات جن کی تہ میں خوشی اور غم دونوں ہیں، انھیں سے اُن کی کہانیاں بھری پڑی ہیں۔ چغتائی نے عورتوں کے مسائل کو سمجھنے کی کافی کوشش کی تھی اور اس جنسی ہیجان کو جو متوسط طبقے کی لڑکیاں اپنی غیرت کے غرور میں ظاہر نہیں کرسکتیں بھیس بدل بدل کر چھوٹے چھوٹے ارادوں اور معمولی معمولی حرکتوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

چغتائی کا کام صرف ہنسنا ہنسانا نہ تھا، پلاٹ وہ ضرور ایسے بناتے تھے جو مزاح کا پہلو پیدا کریں، لیکن وہ کبھی اپنے مقصد کی تبلیغ سے غافل نہ رہے۔ بہت سی کہانیوں میں اسی وجہ سے مقصد بہت نمایاں ہوگیا ہے۔ یہی نہیں انھیں "قرآن اور پردہ"، "رقص وسرود" جیسی سنجیدہ کتابیں لکھ کر بھی اپنے خیال کو ظاہر کرنا پڑا۔ چغتائی نے عام طور پر مختصر افسانے لکھے لیکن انھیں بعد میں مربوط کرلیا۔ چنانچہ "شریر بیوی"، "خانم"، "کولتار"، وغیرہ ایسی ہی کتابیں ہیں جن کو الگ الگ کہانیوں کی شکل میں لکھ کر چغتائی نے کتابیں بنالیں۔ انھوں نے بعض ناول بھی لکھے اور کبھی سنجیدہ افسانوں اور ٹریجڈی کی بھی کوشش کی لیکن اُن کی اُفتادِ طبع حرکت تیزی اور تیز رفتاری چاہتی تھی۔ بیماری نے خود جو کمزوری پیدا کردی تھی اس کی کمی اُن کی کہانی کے کرداروں میں پیدا ہوتی تھی۔ سب زندہ دوڑنے اور بھاگنے والے، لڑنے جھگڑنے والے اور کسی طرح شکست نہ ماننے والے چغتائی کے کردار ہار جانے کے بعد بھی اپنی ہار نہیں مانتے۔

چغتائی جودھپور میں وکالت کرتے تھے۔ وہاں کی سرزمین سے واقف تھے۔ راجپوتانہ میں رومانوں کی کیا کمی ہے۔ چغتائی نے اُن میں سے کچھ پیش کئے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں "شریر بیوی" کی کہانیوں سے شروع کرکے تقریباً بارہ سال میں چغتائی نے تصانیف کا انبار لگادیا۔ اُن کے موضوعات کی [illegible] اور ہمہ گیری اور ان کی تیز نگاری نے لوگوں کو ہمیشہ اپنی طرف [illegible] زبان کی وسعت اور بلاغت کے مسئلہ پر بھی اُن کی تمام [illegible]

[illegible] میں مذاک نشاط وانی سے غزل گوئی اور خاص طور سے فانی کی غزل گوئی کے معنی بن الجھ رہے تھے۔ کون جانتا تھا کہ فانی اور ان کے ہم درد دونوں کو ایک ہی مہینے میں اور ایک ہی ہفتے کے وقفے سے یہ دنیا چھوڑ دینی پڑے گی۔ یورپ میں موت کی گرم بازاری نے موت کا خوف اور اس کا احساس مزید سبک اور ارزاں کر دیا ہے لیکن پھر بھی ہندوستان کے ان دو ادیبوں کی موت نے اُردو زبان اور ادب کو افسردہ کر دیا ہے۔

چغتائی کی عمر طبعی طور پر مرنے کی نہ تھی لیکن ناموافق حالات نے انہیں جینے نہ دیا۔ اس کے باوجود انھوں نے ہندوستانی ادب میں اپنے لئے ایک باوقار جگہ بنالی ہے۔ اُردو کے تخلیقی ادب میں جو اضافہ چغتائی کے قلم نے کیا ہے وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ انھوں نے بہت لکھا اس لئے اچھی اور بُری ہر طرح کی چیزیں اُن کے دماغ اور قلم سے نکلیں۔ الگ الگ دیکھنے سے اُن کی کہانیوں میں بہت گہرائی، بہت وسعت نظر اور بہت جدت نہیں معلوم ہوتی لیکن ان کا مجموعی اثر بڑا گہرا ہے۔

ان کی بعض کتابوں اور بعض افسانوں کے ترجمے ہندوستان کی صوبجاتی زبانوں میں ہوئے اور چغتائی صرف اُردو کے مصنف نہ رہے تھے بلکہ دوسری زبانوں کے پڑھنے والے بھی اُن سے واقف تھے۔ یقیناً اُن کی موت سے ہندوستانی ادب کو نقصان پہونچا۔ چغتائی کی ذکاوت اور اُن کے تصورات نے جو دنیا بنائی تھی اس کا جاننے والا اُردو مزاح نگاروں میں تو اب تک کوئی دکھائی نہیں دیتا یہ کمی کون پوری کرے گا!

احتشام حسین

حکیم آزاد انصاری

قدیم روایات اور شعر و ادب کی وہ شمع بجھ گئی جس کی روشنی میں ہم مثالی دوستی کی تصویر ابھرتی دیکھتے تھے، پرانوں کی زندگی سے سبق لیتے تھے۔ اور قدیم آب و رنگ، طرز و اسلوب، شعور و جدان اور مٹ جانیوالی دنیا کبھی کبھی اپنی جھلک دکھا جاتی تھی!

فانی کے بعد آزاد کی موت اردو شاعری کیلئے قدامت کی موت ہے، ادبی تعلقات اک طرف، ہماری ذاتی محبتوں کے رشتے اتنے قوی تھے کہ اُن کی صبر آزما ابدی جدائی کو "حادثہ" سے تعبیر کرنا۔ اظہار غم کی بے مائگی ہے۔

زندگی میں ہم ایک دوسرے سے دور تھے، لیکن پھر بھی قریب تھے۔ مرنے کے بعد ایک بھول ابدیت تاریک و عریض دیوار بن کر کھڑی ہوئی۔ کل مرنیوالوں کے ماتم میں ہم تو رو دینگے۔ پانے اور کھونے کا یہ لامتناہی سلسلہ، مسکراہٹوں اور آنسوؤں کا یہ نہ ختم ہونیوالا دور نہ جانے کب شروع ہوا، اور نہ جانے کب تک جاری رہیگا۔!

آزاد کیا تھے کیا نہ تھے،!! مگر قدامت کی مٹتی ہوئی یادگار تھے۔ انہیں شعر و ادب کی نئی کسوٹی پر کستا زیادتی ہے۔ وہ ایک وضعدار، زندہ دل اور بلند اخلاق انسان تھے، قدیم علمی و ادبی روایتوں کا نشان تھے۔ بحیثیت استاد شعر چند در چند خصوصیات کے مالک تھے اور غزل میں ایک مخصوص رنگ کے موجد تھے!

کلام کی اصلی ترتیب (۲) زبان کی سلاست و صفائی (۳) ندرت بیان (۴) خوبصورت الفاظ کی تکرار (۵) صنعت ترصیع و تقابل (۶) صنعت ترصیع جدید کی ایجاد، ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں!

ان کی زندگی ہی میں "معارف جمیل" کے نام سے اُن کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا تھا، یہ اُن کے تمام تر شاعرانہ محاسن اور مجددانہ تقاضوں سے روشناس کرا دیتا ہے،

آزاد بڑے دلچسپ اور بلند انسان تھے، دوست کی حیثیت میں اور بھی بلند، میں کبھی اس (مئی ۱۹۳۹ء) دہلی ہوئی شام کو نہیں بھول سکتا، جب جوش دہلی سے رخصت ہو رہے تھے، آزاد کے مکان پر جوش و مخمور گفتنی بیٹھے تھے، زندگی اور اس کی ہر تلخی سے بالکل محفوظ، ــــــ اور اس کے بعد وہ جوش و آزاد کی چھیڑ "!!

پھر دہلی سے رخصت ہونے کے کچھ گھنٹہ قبل [illegible] جوش کی آخری صبح و صفائی ــــــ ! وہ کل کی بات ہے، مگر آزاد کی موت نے اسکے آنسوؤں اور اخلاص کو اک حد تک تاریخ بنا دیا ہے!

(باقی صفحہ [illegible])

ایشیا نومبر ۱۹۴۲ء

نئی صبح

ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

بابتہ فروری ۱۹۴۲ء

ادبی رجحانات[1]

احتشام حسین

افراد کی زندگی میں وہ لمحے آتے ہیں جب اصل شاہراہ اور مرکز سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کر لینا اُن کے لئے بالکل ضروری ہو جاتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی ؎

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

خاندانوں کی حالت دو تین پشتوں کے بعد بدل جاتی ہے، زندگی کے نئے نظامِ عمل میں، حیاتِ اجتماعی کے نئے فلسفہ پر گامزن ہونے کے بعد یقین ہے کہ ایسا ہو گا لیکن اب تک تو یہی سلسلہ ہے کہ انیس کو یہ کہنا پڑا ؎

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

قوموں کی تاریخ ایسے ناگزیر موڑ پہ آ جاتی ہے جہاں سے اس میں زندگی کی نئی قدریں پیدا ہوتی ہیں اور پرانی روایات کا جنازہ نکلتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو دنیا کی تاریخ اتنی رنگین اور دلکش نہ ہوتی۔ ایک تصورِ حیات، تخیل کا ایک انداز، ذکر و فکر کا ایک طریقہ کچھ دنوں تک نیا رہنے کے بعد پرانا ہو جاتا ہے اور نئی چیزیں زندگی کی مادی کشمکش سے پیدا ہو کر انسانوں میں نئے تخیل، نئے اندازِ فکر اور نئے زاویۂ نظر کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ ویسے تو لمحے ہر وقت آیا کرتے ہیں جن کے بطن میں تغیرات اور تبدیلیوں کی بہت سی [illegible] پوشیدہ ہوتی ہیں۔ لیکن جب تبدیلی کا تقاضا شدید ہوتا ہے جب کوئی نظام اپنے بڑھنے اور پھیلنے کی طاقت کھو دیتا ہے اور نئے پیدا ہو[illegible] نہیں رکھتا اس وقت انقلاب آتے ہیں جن کی [illegible]

ادب اور موسیقی، رقص اور مصوری، تعمیر اور نقاشی کے تصورات بدلتے ہیں بعض چیزوں میں یہ تبدیلیاں بہت واضح، بہت روشن اور بہت گہری ہوتی ہیں جو نظر آ جاتی ہیں لیکن فنونِ لطیفہ کے بعض اقسام میں وہ اس طرح صورت اور معنی مادہ اور خیال کو ساتھ لیکر پیدا ہوتی ہیں کہ صرف تاریخ کی پیچ در پیچ رفتار کے جاننے والے اور حیات کے تضادی ارتقاء کو پوری طرح سے سمجھنے والے ہی ان تغیرات کی تحلیل اور ان تبدیلیوں کا تجزیہ کر کے یہ بتا سکتے ہیں کہ تمدن اور تاریخ کی اس خاص منزل پر یہی ہونا ممکن تھا۔ ادبیات کے نقاد کے لئے سب سے بڑی چیز یہی ہے کہ وہ ادب میں صورت اور معنی کی ہم آہنگی، مادہ اور خیال کے حسین امتزاج، اثر اور کیف کے بے پناہ جادو کے باوجود بھی اُن اصلیتوں کو تلاش کرے جنہوں نے تغیرات کی تشکیل کی ہے۔ ان تبدیلیوں کی رفتار خطِ مستقیم کی طرح سیدھی نہیں ہے بلکہ مادی وجود کے پیہم تضادات سے چیزیں نئی طرح صورت پذیر ہوتی ہیں اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن ان تمام باتوں میں عمل اور ردِ عمل میں یہ یاد رکھنا بیحد ضروری ہے کہ تمام تغیرات مادی ہوتے ہیں اور وہی تخیل پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے اگر ہم ادب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہیں تو سماجی نظام کی مادی تبدیلیوں پر غور کئے بغیر ہم ایک فلسفۂ جنت کے ماننے والے کی طرح صرف سطحی، مبہم اور نامعلوم جذبات کی رہنمائی میں آ سکیں

---

[1] [illegible]

پہنچیں گے۔ یہ تو ہم اس وقت بھی مان لیں گے کہ تغیرات ضروری ہیں لیکن کیسا کیوں ہوتا ہے اس پر غور نہ کریں گے۔ یہ نیا نقطۂ نظر جس کا تذکرہ میں نے کیا ہے تبدیلیوں کے فلسفہ کو بھی واضح کرتا ہے، "کیوں" کا جواب بھی دیتا ہے اور ہمارے خارجی اور داخلی تصورات میں یکسانیت اور ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ زندگی اپنے ہر شعبہ میں ایک مخصوص نظام کے ماتحت بڑھتی اور پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور خیال و عمل کے درمیان کوئی ایسی خلیج حائل نہیں رہ جاتی کہ دونوں کا سمجھنا اور سمجھانا ناممکن ہو جائے۔ مادّی وسائل کی مقدار اور خصوصیتیں تخیل کا ڈھانچہ بناتی ہیں اور فن کار انہیں کی عکاسی کرکے زندگی کی قدروں کی تخلیق اپنے طور پر کرتا ہے۔ یقیناً کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان تبدیلیوں میں کوئی ربط یا اضافیاتی تناسب نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ رفتار بہت تیز یا بہت آہستہ ہو جاتی ہے اور کبھی اچانک جست کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

تبدیلی کا یہ فلسفہ ادبیات کے تغیر پر بھی حاوی ہے دُنیا کے دوسرے ملکوں کے ادبیات کے مقابلہ میں اُردو ادب کی عمر یقیناً زیادہ نہیں ہے لیکن یہ زمانہ بھی کچھ ایسا کم نہیں رہا ہے کہ ہمیں ادب میں مختلف ادوار بنانے میں زیادہ دقت پیش آئے۔ رجحانات اور میلانات جن تاریخی اور مادّی حقیقتوں سے پنپتے ہیں ان کی کمی ہندوستان میں نہیں رہی۔ اُردو ادب نے مغلوں کے زوال کے زمانہ میں ہاتھ پاؤں نکالے، اودھ کا عروج و زوال دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھا، دکنی سلطنتیں اسی کی نگاہ کے سامنے مٹیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کا استحصال، انگریزی حکومت کے قیام و بقا کی کوششیں سب اسکے دیکھتے دیکھتے ہوئیں اور پھر ۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعہ نے تو ہندوستان کو تاریخِ عالم میں ایک ایسی جگہ دیدی جہاں سے کوئی ملک بھی تبدیلیوں اور اہم تغیرات کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ سب اُردو ادب نے دیکھا۔

غدر کا تذکرہ آگیا ہے تو اس سلسلہ میں ایک "سخن گسترانہ" بات کہہ دینے کو جی چاہتا ہے اور اس بات کا تعلق موضوع سے ہے بھی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے "تاریخ ہند کے ازمنۂ وسطیٰ میں معاشرتی اور اقتصادی حالات" پر تقریر کرتے ہوئے عہدِ جدید کو ازمنۂ وسطیٰ سے جُدا کرنے کی کوشش میں یہ کہا ہے کہ "زمانۂ جدید عہدِ مغلیہ اور عہدِ انگلشیہ ہر دو پر مشتمل ہوگا، جن کے درمیانی وقفے میں کوئی نیا انقلاب اچانک ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ بتدریج تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے"[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہتے وقت موصوف کے پیش نظر تبدیلی اور انقلاب کا وہ تصور تھا جس کی جڑیں معاشی اور اقتصادی نظام میں دور تک نہیں پھیلتیں بلکہ بادشاہوں کے خاندان بدل جانے اور اچانک پیدا ہو جانے کا نام انقلاب ہے ورنہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے ہندوستان کے تمدنی عروج و زوال میں بالکل نئی خصوصیتیں پیدا ہوتی ہیں جنہوں نے آج کے ہندوستانی دماغ کی تعمیر کی ہے۔ علامہ موصوف نے غدر کی اہمیت کا تذکرہ اپنی ایک دوسری کتاب[2] میں بہت تفصیل سے کیا ہے۔ (اور) ایک پورا باب اسکے لئے وقف کر دیا ہے۔ "انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن" میں انہوں نے غدر کو نئے تصورات کا پیش خیمہ قرار دیتے ہوئے اُس کی عمرانیاتی اہمیت کو بہت واضح طریقہ پر پیش کیا ہے لیکن ان کا انقلاب اور تغیر کا وہ تصور صحیح نہیں کہا جا سکتا جو انہوں نے اپنی اوّل الذکر تصنیف میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر فراق گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون میں ہندوستان کے دورِ بیداری کا تذکرہ کرتے ہوئے غدر کو نئے تصورات، نئے رجحانات، نئی زندگی اور نئے میلانات کا ہراول قرار دیا ہے اور صحیح تاریخی نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھ کر یہ الفاظ کہے ہیں "بدیشی حکومت قائم ہونے کا قدرتی نتیجہ ۱۸۵۷ء کا غدر تھا جو ہندوستانی تاریخ کے تضادی ارتقاء میں ایک ناگزیر منزل تھا۔ اس کا انجام صرف تخریبی نتائج اور نفی پر مشتمل نہ تھا"[3] جب تک غدر کو اس طرح نہ دیکھا جائیگا اس وقت تک جدید ہندوستان کی تحریکات کا پورا تجزیہ نہ ہو سکے گا۔ پھر غدر ایک دن کی بات نہ تھی پوری اٹھارویں صدی اور آدھی اُنیسویں صدی کے انحطاطی دور کی کشمکش اور باہر سے آنیوالی نئی طاقتوں سے معرکہ آرا ہونے کی آخری مسلح جدوجہد کے نتیجہ کے طور پر یہ انقلاب ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس معرکہ میں بہت سی روایتوں نے دم توڑ دیا اور بہت سی نئی چیزوں نے جنم لیا۔ کشمکش کا یہ دور پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ ایک دفعہ اُبال آیا تھا پھر کچھ دنوں کے لئے خاموشی اور مجہولیت نے اصلاح پسندی کے حربے ہاتھ میں دے دئے لیکن ہندوستان

---

[1] تاریخ ہند کے ازمنۂ وسطیٰ میں معاشرتی اور اقتصادی حالات۔ مطبوعہ ہندوستانی اکاڈیمی ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۸

[3] ہندوستان کا دورِ بیداری۔ فراق گورکھپوری۔ [illegible] ۱۹۴۰ء

اصل میں شاعری تبدیلی چاہتی ہے اس لئے کشمکش بڑھتی جاتی ہے۔ غدر کے
انقلابات نے متوسط طبقہ والوں، جاگیر سے ہاتھ دھونے والے جاگیرداروں
ان کے بہی خواہوں اور بیکار ہو جانے والے صناعوں کو بھی آسودہ اور مطمئن
نہیں کیا اور طاقت نئے پیدا ہونے والے زمینداروں، جاگیرداروں اور ابھرتے
ہوئے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ گئی جن کے لئے نئی روایتوں کی ضرورت تھی
اگر یہ سب کچھ ہمیں اپنے ادب میں نہیں ملتا تو ہمارا تاریخ کا تجزیہ غلط ہے یا ادبی
قدروں کی تحلیل صحیح بنیادوں پر نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے معمولی نظر ڈالنے پر
بھی ادب اردو اس دور کی خصوصیات، بے چینیوں، اصلاح پسندیوں اور جدید
رجحانات کا پتہ دے دیتا ہے۔ سلطنت اور دربار داری کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا
وظائف پر زندگی بسر کرنا آسان نہ تھا، قصائد لکھ کر خلعت اور گاؤں مل سکتے
تھے اس لئے حالی، آزاد، نذیر احمد، سرسید سب نئی حقیقتوں سے دوچار ہوئے
انہوں نے زندگی بسر کرنے کے دوسرے راستے نئے نظام میں تلاش کئے
پرانے ادب سے بیزاری کا اظہار کیا اور نئے تصورات کا خیر مقدم۔ حالی
مقدمۂ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں: —

"دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے
آج کل دنیا کا حال اس درخت کا نظر آتا ہے جس میں ہر آئی
کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی
ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں
اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو ان کے گرد و پیش
ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی
ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا
جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو
دریا برد کر کے رہ جائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے
جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ . . .
. . . . ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک
وقت ہوا کرتا ہے۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی
کے زمانہ میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا . . . .
. . . .
. . . . عیش و عشرت کی رات گذر گئی اور صبح
نمودار ہوئی اب کانگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا
اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے"[1]

دیکھئے اس میں ڈارون کی بہم کی ہوئی معلومات کا کتنا اثر ہے اور دور جدید کی
تبدیلیوں کا کتنا شدید احساس! آزاد لکھتے ہیں:

"ملک ہمارا عنقریب آفرینش جدید کے وجود میں قالب
تبدیل کیا چاہتا ہے، نئے نئے علوم ہیں، نئے فنون ہیں،
سب کے حال نئے ہیں، دل کے خیال نئے ہیں، ہمارے
نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں۔ رستے نئے ڈھالے ڈال
رہے ہیں۔ اس طلسمات کو دیکھ کر عقل حیران ہے مگر اسی
عالم حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا
ہے کہ تہذیب کی سواری شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص
اپنے اپنے ویرانہ کو جھاڑ بہار رہا ہے اور جس حال میں
ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے"[2]

ڈاکٹر نذیر احمد پرانے ادبی سرمایہ پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں: —

"میری مثال اس زمانہ کے شاعر کی سی ہے کہ بیچارہ کوئی
مضمون نہیں پاتا جس طرف ذہن کو دوڑاتا ہے دیکھتا ہے
کہ وصل و ہجر اور انتظار اور واسوخت اور سراپا اور بہار
اور خزاں اور استخفاف مذہب اور بندگان دین کے
ساتھ استہزا وغیرہ وغیرہ کوئی خیال نہیں جس میں
over and over again
سینکڑوں ہزاروں نے طبع آزمائی نہیں کی ناچار ذرا تنگ
کر بندش پر قناعت کرتا ہے وہ بھی ہر ایک کو نصیب
نہیں"[3]

سرسید ان سب کے سرگروہ تھے۔ ان کی بات بھی سن لیجئے: —

"زمانہ اور زمانہ کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج

---

[1] مقدمۂ شعر و شاعری۔ حالی۔ انوار المطابع لکھنؤ صفحہ ۱۲

[2] نیرنگ خیال حصہ اول آزاد ص ۳

[3] لکچر ۸ دسمبر ۱۸۸۸ء محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس لاہور

سب تبدیل ہو گئیں یعنی ان کی قدیم کتابیں اور
ان کا طرزِ بیان اور ان کے الفاظ مشتمل ہم کو آزادی اور
راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی
اصلیت تک پہنچنا ذرا بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ برخلاف
اسکے دھوکہ میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو
لون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلاف واقعہ
الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو
غلامی کی حالت میں رکھنا .... یہ تمام باتیں حال
کے زمانہ اور حال کے زمانہ کی طبیعت کے مناسب نہیں ہیں[1]

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی کبھی اتفاق بھی انسانی زندگی میں تغیرات کا سبب بنتا ہے لیکن یہ محض اتفاق نہ تھا کہ انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصہ میں ہر ایسے ادیب کی زبان پر جسے زندگی کی کشمکش سے دو چار ہونا پڑا تھا یہی بات آئی۔ اسی دور میں امیرؔ اور داغؔ بھی تھے جن کا تعلق لکھنؤ، رامپور اور حیدرآباد دکن کے درباروں سے تھا اور انہوں نے انہیں قدروں کو عزیز رکھا جو ان کے درباری پیشروؤں کو عزیز تھیں۔ ان کے یہاں تبدیلی کی خواہش نہیں معلوم ہوتی انداز شاعری میں جو فرق اگلے شعراء کے مقابلہ میں ان کے یہاں پایا جاتا ہے وہ دورِ انحطاط کی دوسری نشانیوں کا پتہ دیتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی نقاد ان چیزوں کو نظر انداز کر جائے لیکن رجحانات کا تجزیہ کرنے والا ان معاشی اور معاشرتی حالات پر ضرور نظر ڈالے گا جنھوں نے کہیں نئے تصورات پیدا کئے اور کہیں پرانے ہی تصورات کو برقرار رکھنے میں مدد دی۔

غدر کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں جو اہم واقعات رونما ہوئے تھے ان کے تفصیلی بیان کا موقع نہیں لیکن کچھ چیزیں تو ظاہر ہیں نئے سیاسی نظام نے نئے سماجی تصورات پیدا کر دئے، علم و تعلیم کا معیار بدلا، درس و تدریس کے طریقے بدلے، طرزِ معاشرت میں تبدیلی ہوئی، نئے آداب و قوانین آئے، پیشے اور پیشہ ور وہ نہ رہے، جاگیرداری نظام حکومت کے بل پر قائم رہا۔ صنعت و حرفت کی ترقی کچھ رکی رکی سی رہی۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکلی، ہندو تعلیم کی دوڑ میں آگے نکل گئے، نئے نظامِ حکومت میں بہت سی جگہوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ مسلمان چونکے تو انہیں [illegible] [illegible] زیادہ مجرم ٹھہرایا تھا اس لئے انہیں اپنی حالت سنبھالنے کا ہوش ہوا۔ حالیؔ، سرسیدؔ، نذیر احمد، آزادؔ سب گذشتہ عظمت کی واپسی پر غور کرنے لگے لیکن جس نظام نے انہیں جکڑ لیا تھا اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ان کے بس میں نہ تھا مادی طرح پر وہ شکست کھا گئے تھے اجتماعی احساس کی کمی تھی اس لئے انہوں نے انفرادی ترقیوں کو صحیح ترقی سمجھ کر نئے نظام کی مخالفت نہیں کی اور اصلاح پسندی میں انہوں [illegible] زندگی کے حقائق سے مقابلہ کی تاب نہیں پیدا کی بلکہ اسی محدود دائرہ میں اپنی حالت سنبھالنے کی دعوت دی، ہر شخص نے امید کو اپنا رہنما بنا لیا اور اپنے پیروں پر پھر آپ کھڑے ہونے کی تعلیم دی۔ چونکہ تغیر سے ملک کو آگاہ بھی کرنا چاہتے تھے اس لئے ایک طرح کی حقیقت نگاری کی بنیاد پڑی۔ نیچرل شاعری، سیدھی سادی زبان، پُرجوش اصلاحی تنقیدوں کا دور شروع ہوا۔ مذہب اور سائنس نے قدم قدم پر ایک دوسرے کو آنکھیں دکھائیں اور نئے قسم کے علم کلام اور نئی طرح کی تعقل پسندی کا رواج ہوا۔ ان لوگوں نے کشمکش میں حصہ لیا تھا۔ دین و دنیا دونوں کو سامنے رکھ کر ترقی کی تھی اس لئے انہیں دین اور دنیا دونوں عزیز تھے۔ اس وقت کے نظم و نثر کے تمام مجموعوں کا ماحصل یہی ہے کہ اپنی حالت سنبھالو، اخلاق درست کرو، کسی کے لہجہ میں ذرا زیادہ گرمی تھی، کوئی دبی ہوئی زبان سے کہتا تھا لیکن یہی آواز تھی جو مختلف سازوں سے نکل رہی تھی۔ شررؔ، سرشارؔ، اکبرؔ ذرا پیچھے آئے لیکن ان کے یہاں بھی انہیں تصورات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ایک طرح کی مجہولیت، انفعالیت اور انفرادی طور پر زندگی اور اخلاق کی درستگی کا سبق۔

آہستہ آہستہ اس میں بھی تبدیلی ہوئی۔ سیاسی نظام بدلتا چلا جاتا تھا سماجی نظام بھی بدلتا رہا۔ ایک طرف تو غدر کے بعد ہی سے وطن کے پوری طرح ہاتھ سے نکل جانے کی چوٹ کھا کر حب الوطنی کا ایک دھندلا سا تصور پیدا ہو چکا تھا۔ دوسری جانب جب کونسلوں اور اسمبلیوں میں کھڑے ہو کر کچھ کہنے کا موقع ملا تو ایک معمولی اور محدود پیمانے پر متوسط طبقہ کے پڑھے لکھے لوگوں نے جماعتی ترقی کا خواب بھی دیکھنا شروع کیا۔ سیاسی جماعتیں جنھوں نے اپنے مفاد کو پیشِ نظر رکھا۔ ہندوستان کی تعلیمی اوسط [illegible] سے زیادہ نہ تھی اور یہی متوسط طبقہ بناتے تھے۔ [illegible]

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۳ صفحہ ۱۶۴

طبقے سے الگ ہو کے حکومت کے تحفظ والے ہیں ان کے خیالات
محسوسات سب متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے مفاد ہی سے بنتے تھے۔ چکبست اور
اقبال نے بھی اس کے باہر نہیں سوچا۔ چکبست نے تو کھل کر متوسط طبقہ کے
جذبات کی ترجمانی کی لیکن اقبال نے مزدوروں اور غریبوں کو اٹھنے اور جاگنے
کی تلقین کرتے ہوئے بھی اپنے فلسفۂ خودی سے ہمیشہ سماج کی بنیادی حقیقتوں
کو پردہ میں چھپا دیا جس میں اجتماعی احساس ایک ثانوی چیز معلوم ہوتا ہے۔ ایک
طبقاتی مفاد کا جادو ایسا ہے کہ وہی مہاجن جو رقتِ قلب کی وجہ سے چیونٹیوں
کو خوراک بہم پہنچاتا ہوا چلتا ہے، سود دینے والے غریب پر ذرا بھی رحم
کھانے پر راضی نہیں دکھائی دیتا۔ وہی امیر جس کے دروازے سے
فقیروں کو روزانہ بھیک ملتی ہے افلاس کو جڑ سے مٹا دینے پر تیار نہیں کیا
جا سکتا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادیب اور فن کار کو بھی شعوری یا غیر شعوری
طور پر یا تو اپنے طبقہ کے مفاد کا ساتھ دینا پڑتا ہے یا باغی بن کر اپنے طبقہ سے
الگ ہو جانا پڑتا ہے۔ اور وہ جو بے دلی سے کسی تحریک کا ساتھ دیتے ہیں
یا کسی تبدیلی کے بارے میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتے۔ وہ کھل کر یا پوشیدہ
دوسری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی نظام کو برقرار رکھنے کے حامی
ہیں۔ ایک بات اس طرح ضرور نمایاں ہو جاتی ہے کہ ادب کو صرف تفریح اور
دلچسپی کی چیز ماننے والوں کو بھی وقت کے تقاضے کے سامنے سر جھکا دینا
پڑتا ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ادب کو تفریح سے آگے بھی قدم بڑھانا پڑتا
ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ان باتوں کا دار و مدار بہت سی خود پرستیوں اور نامعلوم خواہش پرستیوں پر
ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ادب کے اندر بہت سے ادیب ایسے دکھائی
دیتے ہیں جو سوچ سمجھ کر نئے ادبی رجحانات کو اپنے یہاں جگہ دے رہے ہیں
لیکن ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو سطحی طور پر چند سطحی لفظوں کے
استعمال پر خوش ہیں۔

فلسفہ کے قریب جدید ادب کی بنیاد میں انگریزی ادب سے استفادہ
اور نقالی کا بھی ہاتھ تھا۔ اب وہ بات نہیں رہی ہے۔ ہمارے سامنے خود
نئی حقیقتیں، نئے مسائل، نئے دکھ درد، نئی خواہشات، نئی امنگیں، نئی پابندیاں
اور نئے لوگ ادبی تحریروں کی حیثیت سے موجود ہیں اور اب ہم جو کچھ کر رہے
ہیں اس میں وہ حقیقت موجود ہے جو تخلیق کے لئے ضروری ہے چاہے وہ

آرٹ یا سائنس کے کسی شعبہ میں ہو۔

ہندوستانی سیاسیات میں آزادی کا جو مبہم مفہوم ۱۹۳۰ء تک
رہا اس کی جھلک ہمیں منشی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں، ٹیگور کی نظموں اور
کہانیوں میں، سروجنی نائیڈو کے گیتوں میں اور گاندھی جی کی تحریروں میں دکھائی
دیتی ہے لیکن ۱۹۳۰ء سے ہندوستان کی سیاست کا رخ بدلا، معاشی نظام میں
تبدیلی کا احساس پیدا ہوا اور صرف آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد پر قناعت
کرنا غلط تاریخی نظریہ معلوم ہوا کیونکہ جو ملک آزاد ہیں، جمہوریت پسندی کے
مدعی ہیں۔ ان کے یہاں بھی آزادی کا مفہوم اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی آزادی کے
سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کو معاشی اور
اقتصادی آزادی کا خیال پیدا ہوا اور پھر ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ وسیع ہو کر
تمام دنیا میں آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد کا ایک حصہ بن گیا۔ اس وقت جو
شاعر اور ادیب اپنے مضامین میں انسانی زندگی کی اس وسعت کا پتہ دے
رہے ہیں وہی درحقیقت ادب کی تخلیقی طاقت کا ساتھ دے رہے ہیں اور وہی
زندگی کی حقیقت سے آنکھیں چار کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں شاید یہ بات کہہ دینا
بھی ضروری ہو گا کہ ہندوستانیوں کے ارادے اور خواہشیں ابھی یہاں کے
سماجی حالات سے بے اطمینانی کی وجہ سے ظہور پذیر ہو رہی ہیں کوئی حقیقی
تبدیلی جو تعمیری بھی ہو طاقت کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی ہے
لیکن اس کے حصول کی جد و جہد، بے اطمینانی، تعمیر کا تصور یہ چیزیں ادب میں
پوری طرح آگئی ہیں۔ کہیں کہیں تو لفظوں کے پیچھے پورے سماجی عمل کا اثر
دکھائی دیتا ہے۔

ادب اور آرٹ کے ہر شعبے میں چند اہم تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور
ہوئی ہیں لیکن آرٹ کے بعض سانچے ان تبدیلیوں کو بہت جلد قبول کر کے ظاہر
کر دیتے ہیں اور بعض پوری طرح نمایاں نہیں کرتے۔ مختصر افسانے، نظمیں،
تنقیدی مضامین یہ چند اصناف ادب ایسے ہیں جو ہمارے ارادوں اور
خواہشوں کی ترجمانی کر رہے ہیں لیکن غزلوں میں یا دوسرے علمی مضامین
میں ابھی وہ صفائی نہیں آئی ہے جو انہیں ان سے متاثر کر سکے اگرچہ ان کی
روح بھی بدل چکی ہے۔ موجودہ دور کا افسانہ نویس اور نظم نگار انفرادی
زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور تکلیفوں، معمولی انسانی کمزوریوں، رسمی
اخلاقی تعلقات کو اول تو اپنی نظم اور افسانہ کا موضوع نہیں بناتا اور اگر کبھی

ایسا کرتا ہے تو اس انفرادی تصوف کے پس منظر میں کوئی گہرا سماجی تصور ہوتا ہے یہ بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی بادی النظر میں دکھائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ادیب یا شاعر کامیاب نہیں ہوتا اور فنی کمزوری کا اظہار کر دیتا ہے کبھی کبھی وہ خطیبانہ اور واعظانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے، کبھی کچھ لفظوں اور اصطلاحوں کے استعمال ہی کو کافی سمجھ لیتا ہے۔ کبھی اپنی بے مائگی کو نئی نئی اصطلاحوں کے پردہ میں چھپا دینا چاہتا ہے، کبھی معمولی اور بھدی چیزوں پر زور دیکر اسے جدت سے تعبیر کرتا ہے لیکن تجربہ کے دور میں یہ سب کچھ ممکن ہے اس لئے ہمیں اس مرکز، اس مستقل راہ پر نظر جانی چاہئے۔ نیا ادیب جس پر چلنے کا مدعی اور جہاں تک جانے کے لئے بے چین ہے۔

نئے علوم اور فنون نے، سائنس کی ترقی نے، آزادی کے نئے تصورات نے، اخلاقی معیار کی تبدیلی نے بہت سے نئے اخلاقی، جنسی، نفسیاتی اور سیاسی مسائل عریاں طور پر موجودہ ادیب کے سامنے پیش کر دئے ہیں، وہ ہر قدم پر قدیم توہم پرستیوں سے ٹکر لیتا ہے اور جب پرانی آہنی دیواروں کو توڑ نہیں سکتا تو اسکے یہاں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ جھنجھلاہٹ بھی بالکل وقتی چیز ہے

وہ ادیب جنہوں نے سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے لکھنا شروع کیا ہے اور جنہیں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی تاریخ پڑھنے کا موقع ملا ہے اُن کے یہاں داخلیت، رومان پرستی، خواہش پرستی اور انفرادیت کی کمی دکھائی دیگی اگرچہ ظاہر ہے کہ ان سے پوری طرح چھٹکارا ابھی ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

ہندوستان جن حالات سے گزر رہا ہے اس کی تہ میں کتنا کرب و اضطراب ہے اس کا اندازہ اوپر کی چند تحریکوں سے اتنا نہیں ہو سکتا جتنا کہ موجودہ ادبی رجحانات سے ہو رہا ہے۔ ہمارے ادیبوں نے ادب کو زندگی سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے، وہ فرضی اور تخیلی عشق و محبت، گناہ و ثواب، علم اور تصوف، روحانیت اور اخلاق کا تذکرہ نہیں کرتے بلکہ خود زندگی جن حقائق کو پیش کر رہی ہے انہیں سامنے لا رہے ہیں چاہے وہ حقائق کیسے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ ہمدردی اور رواداری کے کھوکھلے جذبے جو جد و جہد سے دور رہ کر پیدا ہوتے ہیں وہ ان کے موضوع نہیں لیکن جس بات کو بار بار دُہرا چکا ہوں اسے پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ابھی اس ادب کی ابتدا ہے، ابھی تو بہت کچھ سیکھنا ہے، بہت کچھ تبدیل کرنا ہے اور بہت سی گہری حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنا ہے اور اس سلسلہ میں انہیں ان کی لطیف ترکیبوں سے مدد لینا پڑیگا جو چیزیں رجحانات کے طور پر ظاہر ہو رہی ہیں انہیں ادب کا جزو بن جانا ہے اور آج کی وسیع انسانیت، بین الاقوامیت کی کوشش، ظلم و جور کا استیصال، عقل کی کارفرمائی، آزادی کی سچی لگن اور ایسے ہی دوسرے پائدار اور بلند جذبات سے ادبی سرمایہ کی تشکیل ہوگی۔

یہ بات جس طرح تمام فنون لطیفہ کے لئے صحیح ہے اسی طرح ادب کیلئے بھی ہے کہ ادب کچھ لوگوں کیلئے تو کسی مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور کچھ لوگوں کے لئے خود مقصد۔

یہ دو قسم کے فلسفۂ حیات کے ماننے والوں کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو ادب ... ہی کو مقصد سمجھتے ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ کام ادب سے لیتے رہتے ہیں۔ اس بحث کو آج کل تنقید میں خاص جگہ حاصل ہے کہ ادب میں افادیت اور مقصدیت یا پروپیگنڈے کا کیا مطلب ہے۔ جدید تنقید جب ادب کا تجزیہ کرتی ہے تو اُسے ہر ادب میں چاہے وہ کسی دور کا کیوں نہ ہو یہ بات صاف صاف دکھائی دیتی ہے کہ شاعر یا ادیب کے طبقاتی تعلق کی وجہ سے ادب میں مخصوص اثرات اور تجربات کا بیان ہوگا اور اس طرح زہرِ عشق اور میر کی غزلیں بھی ادب برائے ادب کا بیان ہو کر نہیں رہ جاتیں بلکہ اُن میں بھی زندگی کی مخصوص قدروں کا پتہ ملتا ہے۔ بے اطمینانی اور تغیرات، سکون اور تصوف یا حالات نے جن باتوں کو پسندیدہ اور عزیز بنا دیا تھا انہیں کے بیان سے ادب کا دامن بھرا ہوا ملتا ہے۔

موجودہ ادب میں یوں تو ہر پہلو سے تغیرات پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ لیکن ان سب کی تہ میں تنقیدی جائزہ کی وہ نئی طاقت ہے جس نے ادبیات کو نئے پر و بال عطا کر دئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب خود ادیب اپنے کارنامہ کا جائزہ لینے کے بعد اُسے پیش کرتا ہے۔ ہر کس و ناکس کا ذکر نہیں بلکہ ان کا ذکر ہے جن کی ادبی کاوشیں ادب کے سرمایہ میں کوئی اضافہ کرتی ہیں سائنٹفک اور غیر سائنٹفک طور پر لوگ اپنے دور کی ترجمانی، سماجی حقائق کے اظہار اور عقل پرستی کو رواج دینے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ توہمات کا پردہ علوم نے چاک کر دیا ہے اس لئے شاعر بھی نئے علوم کی مدد سے آگے بڑھ رہے ہیں، ادیب سائنس اور دوسرے علوم کی روشنی میں قدم اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ زندگی کی کشمکش دعوت مقابلہ دے رہی ہے اور ادیب اس سے

مقابلہ پر آمادہ دکھائی دیتے رہے ہیں اس میں یہ ہوتا ہے کہ ادیب کی زندگی حیاتِ اجتماعی سے اور دوسرے شعبوں سے وابستہ ہو جاتی ہے اور زندگی کے تجربے تخلیقی ادب کا موضوع بنتے ہیں۔ کچھ ادیب تو اس سلسلہ میں ایسے ملیں گے جن کا نقطۂ نظر جذباتی ہے جو بنیادی باتوں سے واقف نہیں ہیں لیکن موجودہ تمدن کے تضاد سے پریشان ہیں، بھٹک بھٹک کر اندھیرے میں راستہ ڈھونڈتے ہیں، کبھی راہ مل جاتی ہے کبھی قدم بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن ایک جماعت ایسے ادیبوں کی بھی ہے جنہوں نے راستہ پالیا ہے چاہے وہ تیز رو نہ ہوں سبک خرام نہ ہوں لیکن انہیں اپنی منزل کا نشان معلوم ہے۔ وہ ان راہوں سے واقف ہیں جدھر سے انہیں جانا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین باقاعدہ طور پر ایسے ہی شاعروں اور ادیبوں کو اپنی جانب بلاتی ہے۔ یہ بات کسی قدر یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انفرادی کوششوں کے علاوہ اگر موجودہ دور کے صحیح اور منضبط رجحانات نے کوئی پیکر اختیار کیا ہے تو وہ اس انجمن کی شکل میں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر ممبر کسی معیاری بصیرت اور علم کا حامل ہے۔ ممکن ہے کہ خود یہ انجمن منزل تک نہ پہنچ سکے لیکن اسکی نشان بردار ضرور ہے۔ اس نے ابتک چاہے زبان اور ادب کی کوئی اہم خدمت انجام نہ دی ہو لیکن کچھ نئے رجحانات کی تشکیل ضرور کردی ہے اور ادب کے بارے میں واضح تصوّرات پیش کئے ہیں اس کا ایک دوسرا نتیجہ اور ہوا، وہ یہ کہ ادب میں مستقل اور نا ممکن التغیّر قدروں کے ماننے والے ترقی پسند ادب کے خلاف صف آرا ہو گئے اور اس طرح بہت سی ایسی باتیں جو کبھی کھل کر نہیں کہی گئی تھیں کہی جانے لگی ہیں اور نئے ادبی رجحانات سے اختلاف رکھنے والے اپنے طبقاتی مفاد کو پشت پناہ بنا کر نئے ادب سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ بدلتی ہوئی قدروں نے ہر شعبہ میں اس وقت کے سماجی نظام کے پرانے اجارہ داروں کو چیخنے پر مجبور کر دیا ہے صرف ادب ہی نہیں ہے جس کی تبدیلیاں پراگندہ خاطر بنا رہی ہیں بلکہ سائنس کی بڑھتی ہوئی طاقت عمل کا جائزہ لے رہی ہے۔ انفرادیت کا علم اب بھی بلند کیا جاتا ہے لیکن اُسے اجتماعی احساس کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے، توہم پرستیاں اب بھی سر اُٹھا رہی ہیں اور ان کے اصولوں کو الہامی اور الٰہی ماننے والے سائنس کا مذاق اُڑانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ لیکن علم اور یقین کا مقابلہ جذبات اور ظنیات زیادہ دنوں تک نہیں کر سکتے اس لئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ پرانی قدروں کو آج نہیں تو کل محاذ سے ہٹنا ہے اور ان نئی قدروں کو جگہ دینا ہے جو وقت کے تقاضے سے پیدا ہو رہی ہیں، جن کی تخلیق میں تاریخی طاقتوں کا ہاتھ ہے اور جن کے زندہ رہنے کے لئے مخصوص حالات پیدا ہو چکے ہیں۔

"زندگی" اور "موت"

نفل حسین کیف

یہ جہاں استعارہ کسی بیکراں کا ہے
جہان آرزو پرتو کسی بیکراں کا ہے
نقیب دل ہے معبد خواب شبانہ
عمرِ زندگی ناموس کسی بیکراں کا ہے

قرار ہی ہے حیاتِ جاوداں کا
خبر کیا تجھ کو سرمدی زماں کا
نہیں ہے انتہا سفر کی اے موت
تیرا اس سے نقطہ یہ کارواں کا

جاپان کی داخلی اور خارجی سیاسیات کا پس منظر

مشرق بعید - بحرالکاہل اور جاپان و روس کے باہمی جھمیلوں اور انکی سیاسیات کو سمجھنے کے لئے پہلے خود جاپان کی اندرونی سیاست اور اُس سیاست کے مختلف رخوں کا جاننا اور جاپانی حکومت کے اقتصادی ڈھانچہ پر نظر رکھنا ضروری ہے اس لئے کہ مشرق بعید کی سیاست میں پیچیدگیاں جاپانی سامراج کے اقتصادی مفادوں ہی کی بہت کچھ پیدا کردہ ہیں -

آئندہ سطور میں جاپان کی اندرونی سیاست پر ایک چھپتی نظر ڈالی گئی ہے - اس سے جاپان کی سیاسی حالت کا سرسری اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی -

نئے جاپان کی تاریخ ۱۸۶۸ء سے شروع ہوتی ہے - اسی سال جدید اصلاحات کے ذریعہ قدیم جاگیرداروں سے اُن کے بڑھے ہوئے حقوق چھین لیے گئے -

اصلاحات کے اس انقلابی اثر کا جو نتیجہ ہونا تھا ہوا - جاگیرداروں کی وہ اولاد جو اپنی من مانی کارروائیوں کیلئے آزاد چھوڑ دی گئی تھی قانون کے آہنی شکنجہ میں جکڑ دی گئی - اس سیاسی اثر کے علاوہ ان اصلاحات کا اقتصادی اور معاشی اثر بھی پڑا جس کی وجہ سے امرا اور ڈسار کی اولاد صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف منہمک ہوگئی - ان لوگوں نے اس نئی دنیا میں تیزی سے ترقی کی اور آج جاپان کی معاشی زندگی پر انہی قدیم امرا کی اولاد کا قبضہ ہے اور چونکہ یہ امرا اور ڈسار اپنے خاندانی اثرات اور حکام سے تعلق کی بنا پر جاپانی سوسائٹی کا سب سے موثر عنصر تھے اس لئے انہوں نے تجارتی میدان میں بڑے بڑے ٹرسٹ قائم کرکے مشہور کاروباروں اور صنعتوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا -

ان سرمایہ دار خاندانوں میں دو مشہور خانوادے جاپان کی تاریخ میں خاص شہرت کے مالک ہیں - مٹسوئی (Mitsui) اور مٹسوبشی (Mitsubishi) -

مٹسوئی خاندان کے قبضہ میں بینکنگ - اسلحہ سازی - طیار شدہ مال اور بڑی بڑی صنعتوں کا کاروبار ہے اور مٹسوبشی خاندان - جہاز سازی انجنیرنگ اور دوسرے بحری سامان نیز گھریلو سامان کی تجارت پر اقتدار رکھتا ہے -

سیاسی پارٹیاں

یہ دونوں خاندان جاپان کی سیاسی پارٹیوں پر بھی درون پردہ اقتدار رکھتے ہیں لیکن چونکہ دونوں اپنی تقابلی فطرت Competitive nature کی بنا پر باہم دست و گریباں رہتے ہیں اس لئے وہ سیاسی جماعتیں بھی جنکی یہ علی التواتر متحرک روح ہیں باہم متصادم رہتی ہیں -

جاپان کی سیاسی پارٹیاں بھی دو ہیں - سی یوکائی Seiyukai اور منسیٹو (Minseito) پہلی جماعت انگلستان کی قدامت پسند پارٹی (Conservative party) سے بہت میل کھاتی ہے لیکن مٹسوبشی کا رجحان اعتدالیت (Moderates) کی طرف ہے

ان دو پارٹیوں کے علاوہ تیسری طاقتور جماعت جو ہر گروہ سیاسی پارٹیوں سے متصادم رہتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سیاسی جماعتوں کو ملک کی قومی ترقی سے دلچسپی نہیں بلکہ اس کے برعکس دونوں جماعتیں علی التواتر بری و بحری بیڑہ کی زیادتی کے لئے کوشاں رہتی ہیں -

امن پسندانہ پالیسی

جاپان کے وزیراعظم ویسکاؤنٹ کاٹو۔ کے دورانِ وزارت میں کچھ نئی اور دوررس اصلاحات کی گئیں اور ۱۹۲۳ء کے خوفناک زلزلہ سے جو ملک کی مالی حالت زبوں ہو چلی تھی اُس میں یک گونہ خوشحالی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس زمانہ میں حکومت کی پالیسی امن پسندانہ تھی حالانکہ امریکہ کی طرف سے متعدد بار اشتعال انگیز اقدامات کئے گئے چنانچہ ۱۹۲۴ء میں صوبہ جات متحدہ امریکہ میں قانون انتقال منظور کیا گیا جس سے جاپانیوں کو مستثنیٰ رکھا گیا۔ پھر امریکہ نے جاپان کا قانون۔ جنٹلمین اگریمنٹ ایکٹ جو ۱۹۰۸ء سے نافذ تھا ناپسند کیا اور جاپانیوں کے مکمل اخراج کا فیصلہ کر دیا اور اس طرح ایکٹ کی دھجیاں اُڑا دیں۔ ان تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود بھی جاپان کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا گیا گو کیمپ۔ نے حکومت کی اس پالیسی کو بزدلانہ خطرناک اور قابلِ ملامت بتایا۔ مگر بیرن شیڈیہارا۔ کی کابینہ وزارت جو اُس وقت حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھی۔ خارجی ممالک کے مسائل میں عدم مداخلت کی پالیسی پر سختی کے ساتھ عامل تھی۔ اس لئے اُس نے اس راہ میں کوئی اقدام نہ کیا۔ وزارت کی اس پالیسی سے کیمپ۔ بہت نالاں تھی چنانچہ جب ۱۹۲۷ء میں بینکنگ میں اقتصادی جمود کے دباؤ سے۔ شیڈیہارا۔ کی وزارت کو استعفیٰ دینا پڑا تو کیمپ۔ نے شانٹنگ پر قبضہ کرنے کے لئے افواج بھیج دیں اور وزارت کی عدم مداخلت کی پالیسی کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد بیرن شیڈیہارا۔ کی وزارت پھر لوٹ آئی اور شانٹنگ کے انخلا کا حکم پھر دیدیا گیا۔ کیمپ نے سختی کے ساتھ حکومت کی توجہ قومی چین کی بڑھتی ہوئی طاقت اور سوویٹ روس کی ترقی پذیر فوجی حالت کی طرف مبذول کرائی، جو مستقبل قریب میں جاپان کے جارحانہ مقاصد کے لئے خطرہ بننے والی تھی مگر حکومت نے کوئی توجہ نہ دی اور فوجی جماعت کو مایوس ہونا پڑا لیکن ۱۹۳۰ء میں عدم مداخلت کی پالیسی کی اشاعت ہو گئی اور فوجی جماعت کو اقتدار حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ برطانی وزیراعظم مسٹر ریمزے مکڈانلڈ نے لندن میں بحری کانفرنس بلائی تھی تاکہ وہ واشنگٹن کانفرنس کی عائد کردہ پابندیوں پر غور کرے۔ . . . . واشنگٹن کانفرنس میں جاپان۔ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان بحری طاقت کا تناسب ۳ - ۵ - ۵ رکھا گیا تھا۔

اس کانفرنس میں جاپانی بحری بیڑہ کے نمائندوں نے اپنے بحری پروگرام میں ہر ایک تحدیدی ترمیم کو نامنظور کر دیا۔ اس پر مسٹر میکڈانلڈ نے تمام سابقہ قواعد کے برخلاف براہِ راست ٹوکیو سے خط و کتابت شروع کر دی اور وزیراعظم کی تائید حاصل کر لی۔ چنانچہ معاہدۂ لندن کی اکتوبر ۱۹۳۰ء میں تصدیق کر دی گئی۔ وزیراعظم کے اس طرزِ عمل سے تمام فوجی حلقے بھڑک اُٹھے اور صرف دو ہی ہفتہ بعد وزیراعظم کو قتل کر دیا گیا۔

انقلابی نقطہ

۱۹۳۰ء کے عالمگیر اقتصادی جمود . . . . نے جاپان پر بُرا اثر ڈالا اُس کی خارجی تجارت ½ کم ہو گئی ظاہر ہے کہ یہ ایک تعجب انگیز حد تھی کہ جیسی دُنیا کے کسی بھی مقام پر دیکھنے میں نہیں آئی۔ اقتصادی جمود سے جاپانی کسان کو خاص نقصان پہنچا۔ کھانے کے تمام سامان کی قیمت خوفناک حد تک بڑھ چکی تھی۔ مچھلی کا حصول مشکل تھا چاول کے ملنے میں گو آسانی تھی لیکن وہ ناقابلِ فروخت ہونے کی بنا پر کسان کی مالی حالت میں کچھ مفید تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا تھا اور ریشم کے جراثیم کی پرورش جس سے جاپانی کسان کو عام حالات میں بہت کچھ اقتصادی منافع ہوتے تھے اس لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتی تھی کہ ریشم کی خارجی تجارت میں کمی کی وجہ سے اب وہ بھی کچھ فائدہ بخش نہیں رہی تھی اُس وقت کے جاپانی کسان کی بابت ایک ماہر اقتصادیات کا بیان ہے کہ :-

19

"اس جمود کے زمانہ میں جاپانی کسان کی صرف ½ آبادی نسبتاً خوشحالی کی زندگی بسر کرتی تھی"

امریکہ کے ایک ماہر مالیات نے مشرقِ بعید کی اقتصادی حالت پر بحث کرتے ہوئے جاپانی کسان کی حالت بیان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی :-

> "بین الاقوامی اقتصادی جمود کا قابلِ رحم شکار جاپانی کسان ہوا ہے۔ اُس کا ہر قسم کا مال بازار میں اچھی قیمت نہیں اُٹھتا۔ حکومت کی امداد اصل حالت میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ سرسری اندازہ کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ ۷۰ فی صدی کسان آبادی فاقہ کی حد تک پہنچ چکی ہے"

دیہات کے ساتھ شہر کی حالت بھی بے حد ناقص تھی اس لئے کہ جاپانی شہروں کی اقتصادی بہتری تو صنعتوں پر انحصار کرتی ہے۔ (۱) جاپانی

نومبر ۱۹۳۰ء

(۳) ریشم کی صنعت اور ان میں روئی کے سامان کے کارخانے لیکن اقتصادی
بدحالی نے ان صنعتوں ہی کی کمزوری تھی اس لئے کہ نو جہازوں
میں سامان جانے کی وہ کثرت تھی اور ریشم اور کپڑے وغیرہ کی وہ مانگ
جو سنہ ۱۹۳۰ء سے پہلے شہروں میں خوشحالی کا باعث بنی ہوئی تھی بدقسمتی بالا
بدقسمتی یہ ہوئی کہ چینیوں نے جاپانی مال کا بائیکاٹ کردیا اور برطانوی نوآبادیات
نے بھاری ڈیوٹی لگانی شروع کردی۔ غرض ان تمام حالات کے نتیجہ میں جاپان
کی دس سالہ اقتصادی ترقی تباہی کے دروازہ پر آ گئی۔ ایسی حالت میں عوام
یہ کہنے لگے کہ کیمپ ۔ نے جس پالیسی کو پیش کیا تھا صرف اسی پر چل کر ملک کی
مالی حالت بہتر ہوسکتی ہے اور آخرکار فوجی جماعت کا اثر ونفوذ حیرت انگیز تیزی
کے ساتھ بڑھنے لگا۔ یہ چیز افسوسناک تھی لیکن بہرحال اسکے علاوہ چارۂ کار ہی
کیا تھا۔ آخرکار مجبوراً ملک کی قسمت کو فوجی گروپ کے سپرد کردیا گیا جس نے
اس بدحالی کو دور کرنے کے لئے چین کے ساتھ جنگ شروع کردی اور ۱۸ ستمبر
سنہ ۱۹۳۱ء کو ایک تکلیف دہ حادثہ کے نتیجہ میں جاپان نے منچوریہ پر حملہ بول دیا
اور ایک سال کے قلیل عرصہ میں چینی فوجوں کو پسپا کردیا۔ آخر منچوریہ کا نام بدل کر
مانچوکو کا نیا صوبہ شہنشاہیت کے ماتحت قائم ہوگیا۔

پچھلے دس سال

پچھلے دس سال میں جاپانی سیاست کا عام رجحان فیسزم کی طرف
رہا جس کا بہت کچھ سبب سنہ ۲۹ء کے جمود کے تلخ اور گہرے اثرات اور پرانی
وزارتوں کی ناکام پالیسیوں کا احساس تھا۔ اس دوران میں زیادہ تر
حکومتیں جنگوں میں مبتلا رہیں جن سے اُن کی اقتصادی اور مالی حالت کو
سخت چوٹیں لگیں۔ چنانچہ سنہ ۳۰ء اور سنہ ۴۰ء کے عشرۂ سابقہ ......
کی سیاسی اور اقتصادی حالت پر بحث کرتے ہوئے ٹوکیو یونیورسٹی کے
پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے صدر اعلیٰ نے اپنی کتاب "جاپان۔ آج اور کل"
میں لکھا ہے کہ:—

"پچھلے دس سال میں جاپان کی بیرونی سیاست اوسطاً
۷۰ فی صدی جنگی مسائل کو حل کرنے میں اُلجھی رہی۔ عمومی
اندازے کی رو سے بجٹ کا ۷۰ فی صدی حصہ جنگ کی نذر ہوا
اور ۵ لاکھ آدمی مارے گئے۔"

یاد رہے کہ ان اعداد وشمار میں اُن اخراجات کا شمول نہیں ہے جو
روسی اور جاپانی سرحدی جھگڑوں یا شنگھائی میں جاپانی اور بین الاقوامی
مفادوں کی باہمی کشمکش کے نتیجہ میں حکومت جاپان کو برداشت کرنے پڑے
ان کی تعداد مشہور جاپانی اخبار "آشاہی شمبون" کے ایک مضمون نگار کے
اندازہ کے مطابق سنہ ۳۳ء سے لیکر سنہ ۳۹ء تک ۴۹۰۰ سالانہ ہے۔ ان پر
سالانہ ۳۴ لاکھ روپیہ تک خرچ ہوتے ہیں۔

اس جنگی حالت کا ملک کی سیاسیات میں جو اثر تھا ظاہر ہے
اعتدال پسند اور قدامت نواز عنصر— جہاں تک ان اصطلاحات کے
برطانوی مفہوم کا تعلق ہے— نہایت تیزی کے ساتھ سیاسیات سے غائب
ہونے لگا اور فوجی جماعت آہستہ آہستہ تمام حکومت پر چھاگئی۔ ہونے کو اب
بھی اعتدال پسند پارٹیاں جاپانی پارلیمنٹ میں موجود ہیں اور کبھی کبھی حکومت
کی ذمہ داریاں بھی سنبھالتی ہیں مگر ملک کے عام رجحان اور بیرونی سیاست
کے خاص اُلجھاؤ کی وجہ سے ان کی اعتدال پسندی کوئی خاص فرق نہیں
پیدا کرتی۔

جاپان اور بین الاقوامی جنگ

روس پر جرمن حملے کے بعد ہی سے بین الاقوامی سیاسی حلقوں میں
یہ پوچھا جارہا ہے کہ جاپان اس سلسلہ میں کیا طریقہ اختیار کریگا۔ اس لئے
کہ وہ روس اور محوری طاقتوں کے ساتھ غیر جانبداری اور امداد کے
معاہدے کئے ہوئے ہے۔ اس سوال کا جواب یقیناً ان سطور کے شائع ہونے
تک ناظرین ایشیا کو معلوم ہوجائیگا۔ لیکن یہ کہ اگر جاپان روس پر حملہ آور ہوتا
ہے۔ تو چونکہ اُسے امریکہ اور برطانیہ سے بھی مقابلہ کرنا پڑیگا اس لئے کہ
امریکی اور برطانی ارکانِ حکومت نے کھُل کر اعلان کردیا ہے کہ اگر مشرق بعید
میں جاپان نے کوئی بھی ایسا اقدام کیا جو اُن کے مصالح کے لئے خطرناک ثابت
ہوا یا مشرق بعید میں— مساوی طاقت— کی حیثیت میں کوئی تبدیلی ہوئی
کھُل کر میدان میں آجائیں گے اور ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں روس پر حملہ
ہونے کی صورت میں یہ تمام امکانات قوی ہوجائینگے اس لئے یہ سوال خاص
اہمیت رکھتا ہے کہ امریکہ وبرطانیہ اور جاپان کے درمیان جنگ کی صورت میں
کیا حالات رونما ہونگے۔

فوجی نقطۂ نظر سے جاپان اور امریکہ کی جنگ وہ صورت اختیار
نہیں کرسکتی جو یورپی جنگوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس لئے کہ دونوں ممالک کے

درمیان پانچ ہزار میل کا سمندر حائل ہے اس لئے نہ طیارے ہی آپس میں گھ سکتے ہیں اور نہ ٹینکوں ہی کا ٹکرانا ممکن ہے اور یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ بحری جنگی جہاز اس دور دراز کی مسافت کو طے کر کے مخالف ملک پر جا کر گولہ باری کریں۔ لہذا یہ جنگ صرف تجارتی ناکہ بندی تک محدود رہ جائے گی۔

انڈوچائنا کا معاملہ

جاپان نے وشی کی کمزور حکومت کو دبا کر انڈوچائنا کے جنوبی بندرگاہوں اور چند ہوائی مستقروں کے استعمال کا حق لے لیا ہے۔ یہ واقعہ فوجی نقطہ نظر سے نہایت اہم ہے اس لئے کہ اس سے پہلے ملایا۔ سنگاپور اور فلپائن کا ہر بحری مرکز جاپانی بحری مراکز سے ایک ہزار میل سے کم دور نہیں تھا لیکن اب ان میں سے ہر مقام مسافت میں آٹھ سو میل کے اندر ہے۔

تجارتی ناکہ بندی

جہاں تک موجودہ اطلاعات کا تعلق ہے انڈوچائنا کے مسئلہ میں برطانی اور امریکی حکومت نے تجارتی ناکہ بندی کرنے کا ارادہ کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جاپان کے اس اقدام کا مناسب جواب یہی تھا اس لئے کہ۔ جاپان کی صنعتیں امریکہ اور برطانی نوآبادیات کی خام پیداوار پر چلتی ہیں۔ جاپان امریکہ سے تیل۔ پٹرول مشینیں۔ اور برطانی مقبوضات سے روئی۔ شکر اور دوسرا ضروری سامان منگاتا ہے۔ جاپان کا یہاں تک امریکہ پر انحصار ہے کہ پروفیسر مارٹن کا اندازہ ہے کہ:-

"اگر امریکہ جاپان کیلئے اپنے سامان کی برآمد ممنوع کر دے تو تمام جاپانی صنعتیں اور کارخانے فوراً بند ہو جائیں"

یہی وجہ تھی کہ محور کے پیہم دباؤ کے باوجود بھی جاپان کو اعلان جنگ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی لیکن یہ ممکن ہے کہ مستقبل کے ان امکانات کے پیش نظر جاپانی حکومت نے تیل اور پٹرول وغیرہ کی کثیر تعداد محفوظ کر لی ہو۔ چنانچہ گزشتہ کئی سال سے جاپان امریکہ سے ضروری اشیاء عام مانگ اور عام حاجت سے کہیں زیادہ خرید رہا ہے اور دوسرے ممالک سے اسکی درآمدی تجارت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ مگر تجارتی ناکہ بندی کے نتیجہ میں نقصان پہنچنا ضروری ہے اس لئے کہ بعض اشیاء کا ذخیرہ کرنا ممکن نہ ہو سکا اور ان ممالک نے پہلے ہی سے دست کشی اختیار کر لی۔

حالات بتا رہے ہیں کہ جاپانی سامراج عنقریب میدان میں آنیوالا ہے وہ جنگی محاذوں کو تک رہا ہے لیکن اصلاً اس کی پالیسی کا فیصلہ روس اور جرمنی کی جنگ کی بابت مستقبل کے امکانات کریں گے۔

سید محمد تقی



دورِ عقلیت کے سیاسی افکار

اکرام قمر۔ بی۔ اے

(۱) آئین پسند

سنہ ۱۶۵۱ء میں ہوبز کی کتاب "عفریت" (Leviathan) شائع ہونے پر پیرس میں مقیم انگریزوں نے ہوبز کو وہ لعنت ملامت کی کہ وہ خوفزدہ ہو کر پیرس سے انگلستان واپس بھاگ آیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر کرامویل اور پیوریٹن (Puritans) فوج نے اس پر بہت تھوڑی مہربانی بھی کی تو بھی وہ گھاٹے میں نہیں رہے گا کیونکہ جلاوطن ساتھیوں کی لعنت ملامت زیادہ نقصان دہ تھی۔ شاہ پرست پادری اُس کی صرف اس بات پر مشتعل نہیں تھے کہ اُس نے بادشاہ کو نائبِ خدا ماننے سے انکار کر دیا ہے بلکہ وہ اُس کی عمومی کلبیت، مادیت، اور اس کے اس گستاخانہ نظریہ کے خلاف تھے کہ کلیسائی طاقت دُنیوی طاقت کے ماتحت ہے۔ جو شاہ پرست مذہبی شغف نہ رکھتے تھے وہ بھی ریاستی حاکمیت کے نظریہ سے پریشان تھے کیونکہ یہ نظریہ جمہوریت اور ملوکیت دونوں کے موافق تھا۔ یہ نظریہ جس طرح سٹوئرٹ خاندان کی مخالفت کی مذمت کرتا تھا اسی طرح کرامویل کی مخالفت کو بنظرِ حقارت دیکھتا تھا۔ یہ نظریہ ہر اُس بادشاہ کی حمایت کرتا تھا جس کا سکہ رواں ہو خواہ قانونی طور پر اُسے حکومت کا حق پہنچتا ہو یا نہ پہنچتا ہو۔ جب ہوبز انگلستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی تصنیف انگلستان کے جمہوریت پسندوں میں فرانس کے شاہ پرستوں سے کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ سیاسین اس بات کے سخت خلاف تھے کہ اس نے ان کا معاہدۂ عمرانی کا پسندیدہ نظریہ مطلق العنانی کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اُسکے حاکمیت اور قانون کے نظریات کی فقہا تردید کرتے تھے۔ مؤرخین اسکی بیان کردہ دورِ جاہلیت کی حالت کی صحت سے انکار کرتے تھے۔ فلسفی اسکی نفسیات کو جھٹلاتے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ ہر جگہ اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ اور اس صورتِ حال نے اُسے متفکر و پریشان کر دیا۔

ہوبز کی تردید کرنے کی نسبت اسکی مذمت کرنا آسان تھا۔ چند مفکر جو اُس سے زیادہ منطقی قابلیت رکھتے تھے اگر اسکے نظریات کی اساس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اسکے دلائل اتنے بے عیب ہیں جتنا انسانی استدلال بے عیب دلائل پیش کر سکتا ہے۔ جن مصنفوں نے اسکے دلائل کو موشگافیوں کی بحث کی، وہ دونوں صفِ اوّل کے فلسفیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انکے نام بینیڈکٹ سپائینوزا (سنہ ۱۶۳۲-۷۷ء) اور جان لوک (سنہ ۱۶۳۲-۱۷۰۴ء) ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی اُس کے اخذ کردہ نتائج پر اعتراض نہیں کرتا۔ مگر ان نظریات کو قبول کر کے وہ ان میں چند ترمیمیں پیش کرتے ہیں تاکہ انہیں عملی سیاسیات کے موافق بنایا جا سکے۔

سپائینوزا کو خاص طور پر ہوبز کا شاگرد تصور کیا جا سکتا ہے۔ اُس کی کتاب دینی سیاسی رسالہ (Tractatus Theologico Politicus) (سنہ ۱۶۷۰ء) اور اسکی تصنیف سیاسی رسالہ (Tractatus Politicus) (سنہ ۱۶۷۷ء) جو اسکی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ ان دونوں میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ "عفریت" کے دلائل کی تقلید کرتے ہیں۔ آدمی اور آدمی کی فطرت کے متعلق وہ ہوبز سے کم قنوطی نظریہ رکھتا ہے۔ اس طرح سپائینوزا منطقی بحث کی ہر منزل پر شرائط پیش کر کے آخرکار ایک ایسی ریاست پیش کرنے کے قابل ہو گیا ہے جو آئینی اور جمہوری ہے، مذہبی رواداری کی پابند اور انفرادی آزادی کے لئے موزوں ہے۔

جان لاک ۱۶۸۸ء کے انقلاب انگلستان کا مؤید تھا۔ اس کے خیالات ہوبز کی نسبت سپائینوزا کے خیالات سے زیادہ مختلف تھے۔ اس نے مشروط بادشاہت کا نظریہ پیش کیا جو اٹھارویں صدی میں رائج تھا۔ اسکے سیاسی خیالات کا قدیم و جدید دُنیا پر بہت گہرا اثر ہوا۔ لوک کے نظریات ہالمینیو، مانطسقیو، روسیو، بلیک سٹون اور امریکی وفاقیوں سے لے کر موجودہ زمانہ تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ امر نہ درست ہے اور نہ لوک نے اس کا دعویٰ کیا ہے کہ اسکے مختص خیالات اُسی کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ انگلستان میں اُس کے زمانہ سے قبل ہی آئینی نظریہ اور پارلیمانی نظام کی قدیم روایت موجود تھی اس نے معاملہ فہم ہوکر (۱۶۰۴-۱۵۵۴ء) اور خبیر دانشمند سڈنی (۱۶۸۳-۱۶۲۲ء) سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ ہم ان ہر دو اشخاص کی تعلیم کا مطالعہ اس مضمون میں عدم گنجائش کی بنا پر کرنے سے قاصر ہیں۔ لوک نے یہ مختلف مواد آئینی اصول کے عظیم الشان نظریہ کی صورت میں پیش کیا ہے مدنی حکومت پر اس نے دو رسالے لکھے ہیں (۱۶۹۰ء) پہلے رسالے میں اس نے فلمر کے خیالات کی وضاحت کی ہے اور ضمنی طور پر بادشاہ کے نائب خدا ہونے کے متروک نظریہ کی بھی تشریح کی ہے۔ دوسرے رسالے میں اُس نے ہوبز اور اس کے نظریۂ حاکمیت پر بحث کر کے حقیقی و سنجیدہ کام کیا ہے۔ یہ بات عجیب ہے کہ اس نے اپنی ایک طول طویل دلیل کے دوران میں نہ ہوبز کا خاص ذکر کیا ہے اور نہ حاکمیت کا۔ مگر اُس نے مؤثر پیرایہ میں ہوبز کے نظریہ میں اعتدال پیدا کیا ہے اور حاکمیت کی سختیوں کو کم کیا ہے۔ اُس نے قدیم انسان کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ہوبز اور سپائینوزا کے نظریات سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ وہ دورِ جاہلیت کو محبت و مسرت کا دور قرار دیتا ہے۔ اگرچہ یہ دور اسکے نزدیک غیر ترقی یافتہ اور نامکمل ہے۔ اُس نے وہ وجوہات پیش کی ہیں جن کی بنا پر ادارۂ ریاست کا قیام پسندیدہ ہو گیا تھا اُس کا خیال ہے کہ ریاست کی حقیقی بنیاد دورِ جاہلیت کے افراد کے درمیان معاہدۂ عمرانی ہے اور اس معاہدہ کے بعد ایک قابلِ تنسیخ حکومتی معاہدہ ہوا ہے جس میں ایک فریق تو تمام قوم کی ہیئت اجتماعی ہے اور دوسرا فریق وہ حاکم ہے جسے قوم اپنا سردار چنتی ہے۔ لوک کہتا ہے کہ قوم اپنے تمام قدرتی حقوق اپنی منتخبہ حکومت کے سپرد نہیں کرتی بلکہ صرف وہ حقوق اسکے سپرد کرتی ہے جو قومی وجود کے لئے لازمی ہیں۔ اور ریاست کا واحد مقصد فرد کے بقیہ قدرتی حقوق بالخصوص زندگی، آزادی اور ملکیت کے قدرتی حقوق کا تحفظ ہے چونکہ اُس نے حکومت کا دائرہ محدود کر دیا ہے اس لئے اُسے اپنے "رواداری پر مکتوبات" میں یہ ثابت کرنے کیلئے چنداں دقت پیش نہیں آئی کہ ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور اسے ہر اُس عقیدہ و عبادت کے ساتھ رواداری برتنی چاہئے جو مدنی معاشرہ کے لئے نقصان دہ نہیں۔

لوک اور اُسکے وہگ (Whig) شاگردوں کے زیر اثر انگلستان میں اٹھارویں صدی کے اوائل میں جو آئینی رسوم رائج ہو گئی تھیں اُن کا اور لوک کی تعلیمات کا نتیجہ بیرن ڈی مانطسقیو (۱۷۵۵-۱۶۸۹ء) کی مشہور کتاب "روح قانون" (Esprit des Lois) تھا۔

مانطسقیو ۱۷۳۰ء میں انگلستان گیا اور وہاں اٹھارہ ماہ مقیم رہا۔ اس قیام کے دوران میں وہ لوئی پانزدہم شاہ فرانس کی ظلمت پسند شخصی حکومت اور جارج دوم کی آرام طلب آئینی حکومت کے اختلاف سے بہت متاثر ہوا۔ اُس نے برطانی طرزِ حکومت کا غائرانہ مطالعہ کیا۔ تاریخ کے مکمل و جامع مطالعہ سے اپنی معلومات کو وسیع کیا اور آخرکار اُس نے ۱۷۴۸ء میں "کتاب عظیم" (Magnum Opus) لکھی۔ یہ کتاب اکتیس حصوں اور پانچ سو بیانوے ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ سیاست و قانون کے ایک وسیع دائرے کو محیط ہے۔ اگرچہ اس نے یہ مقصد ظاہر کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے مگر اس کا بین مقصد یہی ہے کہ حکومتِ فرانس کے جبر میں کمی کرنے کے لئے چند ترامیم پیش کرے اور اس مقصد کیلئے حکومتِ فرانس کو کہے کہ وہ رومائے قدیم، ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ اور موجودہ برطانیہ کے چند ایک آئینی دساتیر کو اختیار کرلے۔ سیاسی خیالات میں اُس نے جو سب سے زیادہ قابلِ قدر اضافہ کیا ہے وہ (انفرادی آزادی کے مفاد کی خاطر) تین حکومتی اختیارات — مقننہ، عاملہ اور عدالت — کو علیحدہ علیحدہ کرنے کی اہمیت پر اصرار ہے۔ اُس نے آئین میں ضبط و توازن کے پولی بیئن (Polybian) اصول کا احیاء کیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے آئین کے بنتے وقت (۱۷۸۹-۱۷۸۳ء) مانطسقیو کے نظریات امریکہ پر بہت اثر انداز ہوئے ہیں۔

(۲) انقلابی — لوک کی تعلیمات نے انگلستان کے

دل میں استقلال پسندانہ نیز اصلاح کے خیالات پیدا کر دئیے لیکن آگے چل کر ۱۷۵۰ء میں [illegible] کو مشہور مگر غیر متوازن قلب ان تعلیمات کے زیر اثر معاشرتی و سیاسی انقلاب کے خواب دیکھنے لگا۔ روسو جنیوا میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک مخبوط الحواس گھڑی ساز تھا۔ سولہ سال کی عمر میں روسو نے سیر و سیاحت اور غریب الوطنی کی زندگی اختیار کر لی اور یہ سیر و سیاحت اور غریب الوطنی کی زندگی ختم کر لی۔ .... تا حینِ حیات جاری رہی (صرف پیرس میں اقامت کے مسلسل بارہ برس ۱۷۴۴-۱۷۵۶ء اس سیر و سیاحت سے مستثنیٰ ہیں)۔ جب ۱۷۵۰ء میں اس نے "علم و ادب کے اخلاقی اثرات" پر ایک مضمون لکھ کر دیجون یونیورسٹی سے انعام حاصل کیا تو اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اچھا لکھ سکتا ہے۔ اس نے تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا جس سے اُس نے عام مقبولیت حاصل کر لی حتیٰ کہ ۱۷۶۲ء میں اس نے "معاہدۂ عمرانی" پر عدیم النظیر کتاب لکھ کر عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ روسو کے اس شاہکار میں وضاحتِ بیان، دلآویز پیرایہ اور معقول و قابلِ فہم دلائل کی خصوصیات موجود ہیں۔ یہ کتاب جذباتی ہے اور عوام کے جذبات کو متاثر کرتی ہے۔ اس میں دو نظریات پیش کئے گئے ہیں جو روسو کی اس تصنیف سے پہلے متضاد و متبائن خیال کئے جاتے تھے ایک طرف تو فلاطون کی طرح قومی احساس کو زبردست قرار دیا گیا اور دوسری طرف شخصی آزادی کا جذبہ لوک سے بھی زیادہ ظاہر کیا گیا۔ ریاستی حاکمیت اور آزادیٔ رعایا کو کس طرح اکٹھا کیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جسے حل کرنے کی روسو نے کوشش کی ہے۔ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یہ تصور کرتا ہے کہ دورِ جاہلیت کی آزادی کے مالک انسان رضاکارانہ طور پر ایک معاہدہ کرتے ہیں جس سے خود بخود ایک قوم وجود میں آ جاتی ہے۔ جس میں فرد جو قوم کا ایک جزو ہے قوم کے بالکل مترادف ہے اور فرد کی شخصی رائے اور قوم کی مشیت عامہ [illegible] میں اختلاف و تضاد نہیں۔ معاہدۂ عمرانی کی اس نے مندرجہ ذیل شرائط بیان کی ہیں:

"ہم میں سے ہر فرد اپنی ذات اور اپنی تمام مشترک طاقت کو مشیت عامہ کے سپرد کرتا ہے۔ اور ہم بحیثیت مجموعی ہر رکن کو ہیئت اجتماعی کا ایک غیر منفک جزو سمجھتے ہیں۔"

روسو کا "مشیت عامہ" کا نظریہ جو بڑا کا سر بریدہ معزز [illegible] ہے مقصود یہ سوال کرتا ہے کہ اگر انسانی فطرت کی خود سری کے ماتحت فرد اپنی مخصوص رائے کا مظاہرہ کرتا ہے جو مشیت عامہ کے برعکس یا اس سے مختلف ہے "تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟" روسو کہتا ہے کہ اس صورت میں اسے جبراً منایا جائیگا۔ مگر اس حالت میں فرد کی قدیم و غیر منفک آزادی کا کیا بنیگا؟ روسو لکھتا ہے کہ اس طرح آزادی میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ انسان کی خود سری صرف یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی حقیقی رائے سے ناآشنا ہے۔ جبر اسکی حقیقی رائے کے مطابق ہے۔ قوم اُس پر صرف اس لئے جبر کرتی ہے تا کہ اُسے آزاد ہونے پر مجبور کر دے! اس طرح سے روسو کا سر بریدہ عفریت ہوبز کے صحیح و سالم دیو کی مانند خوفناک و مہیب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کو آزاد ہونے پر مجبور کرنا اُسے اطاعت گزاری پر مجبور کرنا ہے۔ اس طرح سے روسو کا سوال لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔

اگرچہ روسو اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے مگر اپنی بحث و نظر کے دوران میں اُس نے علم السیاست میں مستقل اور گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سیاسی طاقت کی بنیاد عوام پر ہے مشترکہ مفاد حکومت کا اصلی مقصد ہے۔ اُسکے نزدیک ریاست ایک عمرانی تنظیم ہے اور ایک تنظیم ہونے کی حیثیت سے اس میں قومی احساس بھی ہے اور مشیت عامہ کا وجود بھی۔ وہ اس جمہوری نظریہ کا حامی ہے کہ سیاسی فریضہ کا حقیقی معیار رضامندی ہے۔ وہ آزادی اور حاکمیت کے اتحاد کو ممکن قرار دیتا ہے اگرچہ اپنی تحاریر میں وہ مہمل تناقض بھی کرتا ہے مگر اُسکے معقول اصولوں کی اہمیت اس قدر ہے کہ اُس نے سیاسی مفکروں میں ایک اعلیٰ حیثیت حاصل کر لی ہے۔

روسو کی فصاحت اور جوش کی وجہ سے اس کے بہت سے شاگرد ہو گئے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اسکے نظریات انقلاب فرانس میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ جس طرح مانٹسکیو نے بوربونز کے سیاسی استبداد کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا اور والٹیئر نے رجعت پسند و باطل کلیسائے گال کی طاقت کو کمزور کر دیا تھا، ٹھیک اُسی طرح روسو نے فرانس کے غیر منصفانہ معاشرتی نظام کی اخلاقی و ذہنی بنیادوں کو اُکھاڑ کر رکھ دیا جب ۱۷۸۹ء میں انقلاب ہوا تو سیاسی لسانی کے نشر میں بے شمار جیالوں نے "معاہدۂ عمرانی" کے اصولوں کا اعلان کیا۔ یعنی مساوات، عوام کی حاکمیت اور مشیت عامہ کی حاکمیت کے نظریات ہر گلی کوچے میں بحث ہونے لگیں۔ روسو کے نظریات صرف فرانس ہی میں نہیں اپنائے گئے بلکہ

بہت سی اقوام نے انہیں اختیار کیا۔ یہاں ان میں سے صرف دو اہم نمونوں کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں طامس پین (۱۷۳۷-۱۸۰۹ء) جنیوائی مسلک کا مبلغ اعظم بن گیا۔ وہ ایک کٹر انفرادی اور اپنی فطرت ہی سے ہنگامہ پسند تھا۔ انگلستان میں ہنگامہ خیز زندگی بسر کر کے وہ امریکہ چلا گیا۔ "عام فہم و فراست" (۱۷۷۶ء) اور دیگر تصانیف کے ذریعے اس نے امریکی آزادی پر باقی تمام انفرادیت پسند مصنفوں سے زیادہ زور دیا اور اسپر ان سب سے زیادہ اصرار کیا کہ امریکہ برطانیہ کا مقابلہ ضرور کرے۔ ۱۷۸۷ء میں اُس نے انگلستان واپس آ کر ۱۷۸۹ء سے لیکر ۱۷۹۲ء تک کے فرانس کے انقلابی دور کا نہایت بیتابی و دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ جب ۱۷۹۰ء میں اڈمنڈ برک نے اپنے مشہور "الزامات" میں انقلاب فرانس کی مذمت کی تو طامس پین نے اس کے جواب میں ایک آتشیں رسالہ لکھا جو سیاسی علم ادب میں ایک اصولی و اہم اضافہ ہے۔ اس رسالہ کا نام "آدمی کے حقوق" (۱۷۹۱-۹۲ء) ہے۔ اسکی اشاعت کے فوراً بعد اسے بغاوت کے الزام میں گرفتاری کا خطرہ ہو گیا۔ اس لئے وہ فرانس چلا گیا اور اس کی "جمہوری مجلس" کا رُکن منتخب ہو گیا۔ وہ دس سال تک فرانس میں رہا۔ اس دوران میں قسمت کے ہاتھوں اُسے کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بعدازاں وہ اپنی زندگی کے بقیہ دن نیو یارک میں بسر کرنے کے لئے بحر اوقیانوس کو دوبارہ عبور کر کے وہاں چلا گیا۔ اُسے روسو سے کم قومی احساس تھا۔ اس لئے اپنے اُستاد کی تعلیم کے اشتراکی پہلو کی بجائے اُس نے اُسکے انفرادی پہلو پر بہت زور دیا۔ لیکن روسو کے ان نظریات کی اس نے بہت نشر و اشاعت کی جو انسان کے قدرتی حقوق، معاشرتی مساوات، عوام کی غیر منفک حاکمیت اور شخصی آزادی میں بیجا حکومتی مداخلت کی لغویت کے متعلق تھے۔

جرمنی میں شہرہ آفاق فلسفی عمانوئل کانٹ (۱۷۲۴-۱۸۰۴ء) نے اپنے غیر محدود صبر و استقلال، ذہانت و میانہ روی سے روسو کی فصاحت و بلاغت کی وضاحت کی اور اس کی کتاب "معاہدۂ عمرانی" کے نظریات کو عام فہم اور مربوط پیرایہ میں پیش کیا۔ "روح قوانین" میں مانٹسکیو نے جو اصول بیان کئے تھے ان میں اور روسو کے نظریات میں تطابق و مماثلت پیدا کرنے کی اُس نے بہت کوشش کی۔ سیاسی نظریہ کے میدان میں

اُس کی اہم ترین کتاب "فلسفۂ قانون" (۱۷۹۷ء) ہے۔ "قانون اور آزادی" کی طرح کی اصطلاحات کی اُس نے جو تعریفیں اور تجزیے کئے ہیں وہ بے بہا ہیں۔

(۳) مصلحین

عمانوئل کانٹ کو انقلابیوں میں شمار کرنا ایک تعجب انگیز امر ہے۔ کوئی شخص اس سے زیادہ اعتدال پسند نہیں ہو سکتا اور نہ اسکے بلند فلسفہ یا پُرسکون زندگی سے زیادہ بے ضرر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے (اس نے اپنی تمام زندگی اپنے وطن کونیسبرگ میں بسر کر دی تھی) وہ قوائے حاضرہ کے خلاف جارحانہ اقدام کرنے سے گریزاں تھا۔ اس نے پروشیائی تعصبات کو کم کرنے کی خاطر یہاں تک کہہ دیا کہ حاکمیتِ عامہ ہوہنزولرن شہنشاہی کے متضاد نہیں ہے! لیکن انقلاب ہمیشہ تشدد ہی کی تعلیم نہیں دیتا۔ انقلابی خیالات غیر جذباتی الفاظ میں بھی بیان کئے جا سکتے ہیں (اگرچہ یہ شاذ ہے) اور یہ ناقابلِ تردید امر ہے کہ کانٹ کا اخلاقی قانون کو فوقیت دینا، اُسکی تخیل پرستی، اُس کا صلح کل مشرب، اُس کی انسان دوستی، اُس کی امن پسندی یہ سب امور اسکے زمانہ کی جنگی قوم پرستی کے قطعی متضاد تھے۔ اس نے ایک بلند تر سماجی نظام کے اصول وضع کئے اور اس نظام کیلئے اخلاقی انقلاب لابدی ہے۔

اسکے ہمعصروں کے خیالات اس کی برابر انقلابی نہ تھے۔ وہ مصلحین تھے اور سیاسی اداروں اور معاشرتی حالات میں اصلاح کو ناگزیر سمجھتے تھے لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ موجودہ نظام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ اصلاحات کی جا سکتی ہیں۔ وہ تقریباً تمام تر برطانی رعایا تھے اور برطانوی لوگ میانہ روی میں خاص طور پر ماہر ہیں اور اپنے اعتقادات کے منطقی نتائج سے بچنے کی اہلیت و قابلیت رکھتے ہیں۔ ان مصلحین میں سے تین کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ـــــ اڈمنڈ برک، ولیم گاڈون اور جیریمی بنتھم۔

اڈمنڈ برک (۱۷۲۹-۱۷۹۷ء) ایک آئرستانی پروٹسٹنٹ اور عالم تھا۔ اس نے شروع شروع میں قانون کی طرف توجہ دی مگر بعد ازیں ادب و سیاست پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ وہ پارلیمان کا رکن منتخب ہو گیا اور وِگ وزیراعظم کا سکریٹری بن گیا۔ اس نے اپنی جماعت اور اپنے ہم نواؤں کی نہایت قابلیت و فطانت کے ساتھ گرانقدر خدمات کیں۔ وہ سیاسی مفکر کی

تھے ایک عملی سیاستدان۔ جب کوئی اہم مسئلہ پیدا ہوتا وہ اُس پر فاضلانہ فرسائی کرتا۔ وہ مسائل کا سطحی مطالعہ کرنے کی بجائے عمیق مطالعہ کرتا اور سیاس کی عارضی مصلحتو اور عیارانہ دلائل کے نیچے چھپے ہوئے فلسفیانہ ابدی حقائق دیکھ لیتا۔ وہ اس وقت تک آرام نہ لیتا جب تک کہ وہ اُن بنیادی اصولوں کو معلوم نہ کر لیتا جن کے ذریعہ اُس کی جماعت کی مخصوص تجاویز صحیح ثابت کی جاسکتی تھیں۔ چنانچہ اس کی تصانیف عملی انسانوں کی کسی دوسرے سیاسی مفکر سے زیادہ عملی رہبری کرتی ہیں۔ جن مسائل کا اُسے سامنا کرنا پڑا اُن میں سے اہم ترین مسائل دو تھے۔ پہلا امریکی نوآبادیات کی بغاوت (۱۷۷۶-۱۷۷۷ء) کا مسئلہ تھا۔ دوسرا مسئلہ انقلاب فرانس (۱۷۸۹-۹۶ء) کا تھا۔ اُس نے امریکی باغیوں کی حمایت اور فرانسیسی انقلابیوں کی مذمت کی۔ اس واقعہ سے وہ لوگ بھی کچھ حیران و ششدر رہ گئے جو اسے اچھی طرح جانتے تھے مثلاً چارلس جیمز فاکس (جو اپنی فطرت ہی سے ہر قسم کی اور ہر جگہ کی بغاوت و انقلاب کا مؤید تھا) لیکن برک ایک مستقل مزاج انسان تھا۔ وہ اپنے اصول نہ بدلتا تھا۔ اُس نے ہمیشہ اس بات پر پختہ یقین رکھا ہے کہ ریاست ایک تنظیم اور ایک زندہ ہستی ہے جو ازمنۂ عتیق سے متواتر و مسلسل قائم چلی آ رہی ہے۔ یہ ترقی بھی کرتی تھی اور تنزلی بھی یہاں تک کہ فنا بھی ہو سکتی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت ایک طرف تو مسلسل و محتاط اصلاح لازمی تھی تاکہ کہیں یہ تنظیم فنا نہ ہو جائے۔ چنانچہ جہاں ۱۷۷۵ء میں اُس نے اس بات پر زور دیا کہ امریکہ کے جائز مطالبات تسلیم کر لئے جائیں تاکہ برطانی سلطنت میں انتشار پیدا نہ ہو اور یہ آئینی طور پر ترقی کرتی جائے۔ وہاں ۱۷۹۱ء میں اُس نے فرانس کے خیال پرستوں کی شدید مذمت کی۔ کیونکہ وہ روسو کے خیالی نظریات سے گمراہ ہو کر اپنی عظیم الشان شہنشاہی کو تباہ کر رہے تھے۔ پرانی یادگار امارت کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے۔ مقدس کلیسا کی تخریب پر آمادہ تھے اور ہر اُس چیز کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے جو اُن کا رشتہ ماضی سے باندھتی تھی۔

ولیم گاڈون (۱۸۳۶-۱۷۵۶ء) برک جتنا زیرک اور متوازن مصلح نہ تھا۔ اوائل زندگی میں وہ مختلف دلچسپ ادوار کے بعد ٹوری ازم اور کالونیت سے انارکیت اور دہریت کی طرف مائل ہو گیا۔ اُس نے دہریت ظاہری شروع کر دی مگر وہ اعتدال پسندی اور لاادریت (یہ اعتقاد کہ خدا اور دوسری غیر مادی اشیاء کی ہستی کے متعلق ہمیں تو کچھ علم ہے اور نہ ہو سکتا ہے) تک ہی پہنچا تھا کہ اسی سال کی عمر میں موت نے قبل از وقت ہی اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اُس کی حقیقی اہم سیاسی تصنیف "سیاسی انصاف کے متعلق تحقیق" اُس کی زندگی کے آثار کی دور (۱۷۹۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انفرادیت کی بنیاد اس جامع نظریہ پر رکھی ہے کہ انسان اپنی فطرت سے اچھا ہے اور اگر بیرونی قیود اس کے معاملات میں دخل انداز نہ ہوں تو وہ کاملیت کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس امر پر زور دیا کہ حکومت کو اپنی مداخلت ترک کر کے سماج کو اپنی دوبارہ تنظیم رضاکارانہ بنیادوں پر کرنے کی اجازت دینی چاہیئے۔ کلیسا کو ختم کر دینا چاہیئے۔ تعلیم کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ سزا کی جگہ ترغیب سے کام لیا جائے۔ شادی کی جگہ آزادانہ ملاپ ہو۔ حلف اور ٹھیکے ختم کر دئے جائیں۔ اور جائداد کی دوبارہ تنظیم اس انداز میں ہونی چاہیئے کہ ہر شخص اپنی ضروریات مہیا کر سکے۔ گاڈون نے انفرادیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ سیاسی ادب میں سب سے زیادہ انتہائی ہے۔

جیریمی بنتھم (۱۸۳۲-۱۷۴۸ء) ایک دوسرا سیاسی مصلح تھا۔ اسکی انتہا درجہ کی بے ضرر زندگی پر یہ قدیمی کہاوت پوری اُترتی ہے کہ "خدا کے پیارے جوانی ہی میں مر جاتے ہیں"۔ وہ مسلسل ساٹھ سال تک تصنیف میں مشغول رہا۔ اسکی اسی کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ایک سو چھپن کتابوں کے مسودے ابھی تک یونیورسٹی کالج لندن کے محرابی کمروں میں پڑے ہوئے اشاعت یا آتش کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کی دو اہم ترین سیاسی کتابیں "حکومت پر ایک اجمالی نظر" (۱۷۷۶ء) اور "نظریۂ اخلاق و قانون سازی" (۱۷۸۹ء) ہیں۔ اسکی شہرت کا پہلا سبب یہ ہے کہ اس نے متروک افادیت کو اخلاقیات میں جامع طور پر دوبارہ مرتب کیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے اس افادیت کے نظریہ کو بالکل غیر منطقی طور پر سیاسیات میں استعمال کرتے ہوئے یہ اصول وضع کیا ہے کہ حکومت کا منتہائے مقصود کثیر ترین تعداد کے لئے کثیر ترین مسرت کا حصول ہے۔ اگرچہ بنتھم کی انفرادی اخلاقیات کی "ہے" (is) اور اس کی قومی سیاست کی "چاہیئے" (ought to be) کے امتیاز کی خلیج کو کسی شخص منطق سے پاٹا نہیں جا سکتا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانی ترقی پسندوں کے لئے جو منطقی گہرائیوں کو انصاف سے عبور کر سکتے ہیں۔ بنتھم کا نظریہ اصلاح کارگر ہتھیار "کثیر ترین مسرت" کے اصول کے تجزیہ نے اٹھارویں صدی کے اواخر و کے فلسفیانہ [illegible] ترقی پسندوں کی اصلاحات کی ایک

ایشیا۔ نومبر ۱۹۴۳ء

دُکھ سُکھ

ایشیا

دوسرا باب

فسانے و ڈرامے

بابتہ فروری ۱۹۴۲ء

تہذیب کا پہلا سبق

(از للتا دیوی)

"ننھو، ننھو!! ارے او ننھو بولتا نہیں"، بھی آپا نے چلا کر کہا: "ہائے ہائے!! ارے کتنا گزرا ہے تو، بابو جی بلا رہے ہیں سریش بابو کے ساتھ کھیلنے کیلئے، ہاتھ منہ دھو کر جلدی سے آ۔" ننھو کا منہ مسرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا، وہ خوشی میں نل کی طرف پلٹا، ہاتھ دھو رہا تھا اور دل میں سوچتا جاتا تھا۔ میں بابو جی کے ساتھ کھیلوں گا۔ اچھے اچھے کھلونے ہوں گے۔ گیند۔ بلا۔ لکڑی کا گھوڑا۔ بڑی سی موٹر، پھر بی بی جی ٹوٹے ہوئے سب کھلونے مجھے دیدیا کریں گی۔...... وہ ایکدم چلا اٹھا: "اری چندرا دیکھ تو میں بابو جی کیساتھ کھیلنے جا رہا ہوں" چندرا کے جواب نہ دینے پر ننھو جھنجھلا گیا۔ "تو جل گئی ہوگی چڑیل نہیں تو کہیں کی" یہ کہتا ہوا وہ کوٹھی کی طرف بھاگ گیا۔

ننھو پرکاش جی کو پرنام کر کے کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے کہا "ننھو آج سے تو بابو کے ساتھ کھیلا کرے گا۔ اب جا ان کے ساتھ گھاس میں جا کر کھیل۔" آپا سریش جس کی عمر تین سال تھی اور ننھو جو سریش بابو سے دو تین سال بڑا تھا ان کی طرف چلے گئے۔ پرکاش نے سرلا سے کہا "جب گھر میں ایک ہی بچہ ہو اور کوئی دوسرا بچہ اس کے ساتھ کھانے کھیلنے کو نہ ہو تو بچے کے مزاج میں خود غرضی آجاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کوئی بچہ اس کے ساتھ ہر چیز اور ہر بات میں شریک رہے"، سرلا بولی "ہاں کہتے تو ٹھیک ہو اب میں بھی اس کا خیال رکھوں گی۔ سریش کو تو اب ایک دو سال میں اسکول بھی بھیجنا ہوگا۔ تم نے کوئی اچھا سا اسکول بھی اس کے لئے تلاش کیا؟" پرکاش "ابھی تو ایک دو سال اسکو گھر پر ہی تھوڑا بہت پڑھائیں گے، بھئی میرا تو دل اسکو دہرہ دون بھیجنے کو چاہتا ہے۔" سرلا "ارے اتنی دور!!؟" پرکاش "بہت دور کہاں ہے اور اگر ہو بھی تو کیا؟ بچے کی بھلائی کی خاطر دل پر جبر تو کرنا ہی پڑتا ہے"

ننھو اور سریش دونوں بہت خوش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے کی تلاش تھی اور اب ایکدوسرے کو پا کر پھولے نہیں سماتے۔ سریش کو دیکھ کر ننھو کی آنکھیں جوش مسرت سے چمک اٹھتیں اور ننھو کو دیکھ کر سریش کے معصوم چہرہ پر رونق آجاتی۔ گھنٹوں یہ دونوں اور بھی آپا گھاس پر درخت کے سایہ میں بیٹھے کھیلا کرتے۔ بھی کہانی کہتی دونوں بہت دل لگا کر سنتے کبھی کبھی شرارت سوجھتی تو کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ سوال کر کر کے بھی کو تنگ کرتے اور اپنی کامیابی پر دونوں مارے ہنسی کے لوٹ جاتے۔ کوئی چیز گھر میں آتی تو سریش ننھو کو ضرور دکھایا کرتا اور ننھو بھی اپنے گھر کی ساری داستان جب تک سریش سے نہ کہہ لیتا اس کا دل ہلکا نہ ہوتا وقت گزرتا گیا اور دیوالی آئی، ہولی آئی، کئی اور تہوار منائے گئے۔ سریش کی وجہ سے ننھو کا گھر بھی اب ان تہواروں پر بھر جاتا۔ وہ گودی بھر بھر کے کھیلیں اور کھانڈ کے کھلونے اور پھل لایا کرتا۔ ننھو کیلئے سریش بابو کسی دیوتا سے کم نہ تھے۔ لیکن وہ محبت کرنیوالے دل ہمیشہ ایک جگہ کیسے رہ سکتے تھے؟ وہ زمانہ بھی قریب آگیا جب سریش الہ آباد سے ڈیرہ دون ایک نئے اور بہت ہی مہذب اسکول میں عمدہ تعلیم بہتر تربیت کیلئے بھیجے جانیوالے تھے۔

ننھو نے یہ خبر سنی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ سریش بابو کے ساتھ اس کی خوشیوں کا خاتمہ ہونیوالا تھا۔ اس کے گھر میں بہار آنے کے بعد خزاں آنیوالی تھی اس کے دل کی کلی ابھی پوری طرح کھلی بھی نہ تھی کہ مرجھا گئی۔ وہ سوچا کرتا کہ سریش کے جانے کے بعد اسکو کوٹھی میں کون جانے دیگا۔؟ اور پھر یہ چیزیں اس کو کہاں میسر آئیں گی۔ یہ سب وہ برداشت کر لیتا لیکن سارے دن وہ اکیلا کیا کرے گا؟ کس کے ساتھ کھیلے گا؟ اور کس سے اپنی دل کی باتیں کہے گا۔!؟ آخر ایک دن سریش کو پرکاش لیکر چلے گئے۔ ننھو بہت رویا۔ کئی دن اس نے روٹی نہیں کھائی۔ اس کا دل سریش کے بغیر کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔

کچھ ہفتے وہ یونہی سہمہ رہا پھر اسکو خیال آیا کہ سریش بابو کی کوٹھی میں گھر [illegible]

اٹھنے لگے۔ ایک خوشی۔ ایک اُمید کی جھلک اُس کے دل میں پیدا ہوئی۔ ایک جھلک ہلکی سی پرچھائیوں کی طرح جو مدھم دھندلکے میں نمودار ہو کر کھو جائے۔

نتھو وہ سریش کے آنے کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ ایک دن اُس نے باغ کے ایک کونے میں مٹی کا ایک گھر بنایا۔ گھروندے کے پاس گملے سجائے اور دل میں کہنے لگا۔ بابو اس کو دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے اور جب میں کہوں گا آپ کے لئے بنایا ہے تو وہ مجھ سے لپٹ جائیں گے۔ اس کو پھر کچھ خیال آیا ایک مٹی کا پتلا بنا کر اُس نے دروازے پر لگا دیا۔ گویا نتھو سریش کے گھر کی دربانی کر رہا تھا۔ نتھو نے اپنے باپ سے کہہ کر کئی غلیلیں بنوائیں۔ بہت سی شیشے کی گولیاں جمع کیں۔ غرض جو چیز وہ اچھی سمجھتا سریش کیلئے رکھ دیتا۔ پڑوس کے بچوں سے کھلونے چھین لاتا اور کہیں کونے میں چھپا دیتا۔ جیسے جیسے سریش کے آنے کے دن قریب آتے گئے نتھو کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں اور اُس کے اضطراب میں ترقی ہوتی گئی۔

ایک دن اسکو خبر ہوئی کہ سریش بابو کل صبح کی گاڑی سے آرہے ہیں۔ نتھو نے ایک بار ساری چیزوں کو صاف کیا اور اُن کے استقبال کیلئے تیار ہو گیا۔ موٹر کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ نتھو ایک جھاڑی کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ اُس نے مالن سے پوچھا "اماں بابو جی آگئے میں جاؤں نہ !؟" "ارے ٹھہر ذرا، ٹھنڈے ہو لیں، بی بی جی کے پاس بیٹھیں تب جائیو" ۔ "اری اماں دیکھ تو بابو جی کتنے سُندر لگ رہے ہیں۔ میں بھی اُن سے ایک جانگیہ لیکر پہنوں گا" اُس نے چلا کر ماں سے کہا۔ نتھو کو وہ پانچ دس منٹ جو سریش کو آنے اور اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھنے میں لگے پہاڑ ہو گئے۔ آخر کو اُس سے نہ رہا گیا، وہ مسکراتا ہوا گھروندے کی طرف چلا——

سریش نتھو کو بھولا تو نہ تھا لیکن اب وہ اپنے اسکول کے لڑکوں سے زیادہ مانوس تھا۔ وہ صاف تھے، انگریزی بولتے تھے اور سریش کو بابو جی کی جگہ مسٹر پرکاش کہہ کر پکارتے تھے۔ نتھو نہ جانے کتنے ارمان اور اُمیدیں اپنے دل میں لئے پر نام کر کے سریش کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سریش نے نتھو کو دیکھا اور نظریں نیچی کر لیں۔ وہ کتنا میلا تھا۔! اُس کے ناخن، دانت، اور بال۔ سریش کو متلی محسوس ہوئی ہائجین کے ماسٹر کے فقرے اُس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ نتھو کا چہرہ اسوقت ایک مصور کیلئے بہترین موڈل تھا۔ ارمان! امیدیں! مسرت !!! اور حسرت۔ وہ منتظر تھا کہ سریش اس کا ہاتھ پکڑ کر باغ میں بھاگ جائیگا۔ اور نتھو اُس کو وہ سب چیزیں دکھائے گا جو اُس نے اتنی محبت اور محنت سے سریش کے لئے بنائیں یا جمع کی ہیں۔ لیکن سریش بہت سنجیدہ بنا اپنی ماں کے قریب بیٹھا رہا۔ اُس نے دوبارہ نتھو کی طرف دیکھا تک نہیں۔

سرلا نے ایک روپیہ نتھو کو دیتے ہوئے کہا "لے! بابو جی دے رہے ہیں مٹھائی کھانا۔" نتھو کھو سا گیا وہ کبھی پرکاش کو دیکھتا کبھی سرلا کو اور کبھی سریش کو۔ "لے نا !! بڑے دماغ ہو گئے ہیں تیرے تو۔" نتھو نے روپیہ لے لیا جیسے کسی نے ایک دہکتا انگارہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا ہو۔ "چل ہٹ یہاں سے اب کیا سر پہ کھڑا رہے گا۔ !؟" ممی نے کہا۔ سریش نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اتنی دیر تک نتھو کے میلے کپڑوں کی بو نہ جانے کیسے برداشت کر رہا تھا۔ اور نتھو بدبخت نامراد نتھو۔ گردن جھکائے آنسو پونچھتا ہوا اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔

بے زبان

ڈاکٹر رشید جہاں

صدیقہ بیگم کی شادی میں بہت دقتیں پیش آ رہی تھیں۔ اصل نسل کی سیدانی تھیں۔ باپ اچھے خاصے کھاتے پیتے خوشحال تھے۔ لیکن پھر بھی صدیقہ بیگم کی شادی ابھی تک نہ ہو سکی تھی تیئیس سال عمر ہو چکی تھی۔ ان کی اماں احمدی بیگم کی راتوں کی نیند تک اڑ گئی تھی۔ صدیقہ بیگم اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ دو بڑی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اُن کی شادیوں میں کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی۔ بڑی لڑکی کی شادی سترہ سال میں ہوئی۔ اور منجھلی تو صرف چودہ ہی سال کی تھی۔ یہ منجھلی بہن سے بارہ سال چھوٹی تھی اور بھائی سے دس سال۔ اب سب بہن بھائی شادی شدہ بچوں والے تھے۔ اور یہ تیئیس ۲۳ سال کی عمر میں ابتک کنواری تھیں۔ پیغاموں کی بھی کمی نہ تھی۔ قریب کے رشتہ میں اول تو کوئی لڑکا ہی نہ تھا۔ اور جو تھے یا تو وہ ملتے غریب تھے کہ ان کا خیال ہی ناممکن تھا یا جو ایک آدھ کھاتے پیتے تھے تو ان لڑکوں کے چال چلن ٹھیک نہیں تھے غیروں کے جو پیغام آتے تھے۔ کہیں تو حسب نسب نہیں ملتا تھا کہیں لڑکا عمر دار کہیں دوہاجو، کہیں بیوی بچوں والا۔ اور جو دو ایک پسند بھی آئے تو وہاں شرطیں اور تھیں۔ کہیں تو لڑکے والے کہتے تھے کہ ہم پہلے لڑکی کو دیکھ لیں پھر بات پکی کریں گے۔ کہیں پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈتے تھے۔ غرضکہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بات نکل آتی تھی۔ ہر طرف لڑکے لڑکیاں بیاہے جا رہے تھے۔ لیکن صدیقہ بیگم ابھی تک کنواری ہی بیٹھی تھیں۔

برسوں سے ایک نئی لہر ملک کے کونے کونے میں گھوم رہی ہے۔ لیکن پھر بھی بہت گھر ایسے مل جائیں گے۔ جہاں نہ کسی نئی ہوا کا گذر ہے اور نہ کسی نئے خیال کا اثر ہے۔ وہی وہ ... باہر کی بیٹھک وہی شام کا مجمع اندر ہی پرانا ... چل رہا ہے۔ اسکول کی تعلیم تو خیر حامد حسن کے یہاں کیا ہوتی۔ اُن کے ... خدا کے فضل سے ... علم دین ... تعلیم حاصل کی تھی ... حامد حسن نے اس کو قرآن [illegible]

اور اب وہی سارے گھر کی دیکھ بھال اور جائداد کا انتظام کرتا تھا۔ شادی بھی اُسکی شریف اور اچھے امیر گھرانے میں کر دی تھی۔ اور اب اللہ رکھے چار بچوں کا باپ تھا۔ حامد حسن صاحب کا نام بہت بڑا تھا۔ خاندان بھی ہزاروں میں ایک تھا۔ لیکن پھر بھی صدیقہ بیگم کی شادی ابھی تک نہ ہو سکی تھی۔

لڑکیوں کی تعلیم کے حامد حسن بہت خلاف تھے۔ قرآن شریف۔ نماز اور دو ایک دینیات کی کتابیں ان کو پڑھا دی گئی تھیں۔ اور حامد حسن اس سے زیادہ تعلیم کے حامی نہ تھے۔ باپ دادا کے نام پر جان دینے والے داداؤں کے چلائے ہوئے رسم ورواج کی پابندی اسی طرح کرتے تھے جس طرح، ڈپٹی کمشنر بہادر کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ کہاں مذہب ختم تھا اور کہاں رسم ورواج شروع ہوتا تھا۔ اُس کی چھان بین انھوں نے کبھی نہ کی تھی اور نہ کرنا چاہتے تھے۔ بس جو شرافت کا ایک معیار بزرگ بنا گئے تھے وہی ان کا پیمانہ تھا۔ اُسی سے ہر چیز کی ناپ تول کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی دنیا الگ بنائی تھی۔ جیسیں انھیں کے ہم خیال دو چار ساتھی اور شریک تھے۔ یہ لوگ آپس میں مل کر محفل جماتے۔ حقہ چلتا۔ ادھر اُدھر کی باتیں [illegible] ہی پرانے زمانے کی چمک اور آجکل کے زمانے کے اندھیرے پر [illegible] آنسو بہایا کرتے تھے۔ حامد حسن تھے بہت خوش قسمت۔ بیوی بھی بالکل ہم خیال ملی تھیں۔ بیوی بھی انیسویں صدی کا پورا نمونہ تھیں۔ ڈیوڑھی پر دربان بٹھا رکھی تھیں کہ کوئی غیر شخص اندر نہ گھس سکے۔ نو برس کا لڑکا اندر جا سکتا تھا۔ اندر تو ... اور ہر عورت کو بھی اندر گھر میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ ہر کسی کے یہاں آنا جانا بھی وہ بہت برا خیال کرتی تھیں۔

بھائی نے اس بات پر ... ہو گئی تھی کہ لڑکیوں کا [illegible]

[illegible]

بھی شوہر کی ہی گئی زندگی توڑ دی اور کہا کہ میں گھر میں بٹھوانا چاہتی ہوں۔ بھی صاحب نہیں۔ اپنی بات اور آن کی ایسی پکی تھیں کہ پندرہ سال سے زیادہ ہو گئے تھے اکلوتے بھائی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔

صدیقہ بیگم کو اُن کی والدہ احمدی بیگم نے بالکل بھونرے میں پالا تھا قریب قریب رشتہ داروں نے لڑکی کی صورت ٹھیک سے نہ دیکھی تھی۔ ہر اپنی ملنے جلنے والی سے صدیقہ کا پردہ کرواتی تھیں۔ جس طرح کہ خود اپنے کنوار پن میں رہی تھیں اُسی طرح صدیقہ کو بھی رکھتی تھیں۔ بے مانگ کی چوٹی کرواتی تھیں۔ جملہ مسندی حتیٰ کہ پھول چھونے تک کا حکم نہ تھا۔ ہر ممکن کوشش اُسکو بچہ اور انجان بنا کر رکھنے کی کرتی تھیں۔ نہ کوئی اُس کی سہیلی تھی نہ کسی سے ملنا تھا، نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ سارا دن بیکاری میں گذر جاتا تھا۔ کبھی کچھ سی لیا تو سی لیا ورنہ لیٹ کر سو گئی۔ اٹھ کر نماز پڑھ لی۔ کبھی کبھار کچھ پکا لیا۔ بس یہی اُس کا مشغلہ تھا۔ بہنیں تھیں تو وہ اوّل عمر میں اتنی بڑی اور پھر اتنی دور کہ کبھی کبھار اُن سے ملنا جلنا ہو جاتا تھا۔ لیکن اب اُن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اور اب وہ عورتوں میں برابر کی ہو کر بیٹھتی تھیں۔ صدیقہ کے خیال میں وہ آزاد تھیں۔ اور اُن کو دیکھ دیکھ کر یہ رشک کھاتی تھی۔ یہ پنجرے میں بند ہوئی ہوئی گھبرا اُٹھتی تھی۔ اکثر گھبرا گھبرا کر دعائیں مانگتی کہ اے خدا میری بیڑیاں بھی کاٹ دے۔

۳

اور جب کبھی رشتہ کی پھوپھی رضیہ بیگم آجاتیں تو اُن کی طرف دیکھ کر وہ اور ڈر جاتی تھی کہ کہیں اُس کی بھی یہی حالت نہ ہو۔ رضیہ بیگم کوئی ساٹھ سال کی کنواری عورت تھیں۔ اب تک اُن میں ایک جھجک تھی۔ اکثر جگہ ان کو دیکھ کر لڑکیاں اور اکثر شادی شدہ عورتیں آپس میں کانا پھوسی شروع کر دیتی تھیں کہ رضیہ بیگم کو اپنی اس کمی کا بہت احساس تھا۔ اور وہ بیچاری خود ہر جگہ کم آتی جاتی تھیں۔ اور جب کہیں جاتیں بھی تو کوشش کر کے ایسی جگہ بیٹھتیں کہ اُن پر لوگوں کی نگاہ کم پڑے۔ پھر وہ اپنی سگی پھوپھی ذکیہ خاتون کی طرف بھی دیکھتی تھی جو شادی کے مہینہ بھر بعد بیوہ ہو گئی تھیں۔ وہ نہایت دلیرانہ ہر جگہ آتی جاتیں۔ جو منہ میں آتا کہتیں۔ بدقسمت ضرور تھیں لیکن کسی سے کم تو نہ تھیں۔ صادقہ اپنے دل میں ان دونوں عورتوں کو ملاتی تھی اور ہر دفعہ اپنی بیوہ پھوپھی کی زندگی کو ترجیح دیتی تھی۔

جب کبھی وہ اپنی ماں کو گُن گُن کر کے بات سنتی یا اماں یا ابا جان کے کسی جذبہ سے بھر جاتی کہ سبھی ویسا ویسا ذکر ہے تو احمد کہتی اور پھر جب سب خاموش ہو جاتے تو پھر جاتی کہ پھر انکار کر دیا گیا۔ [illegible]

اس کی آنکھوں میں رضیہ پھوپھی کی سنگین اور شرمندہ صورت پھر جاتی اور وہ کہتی "آخر اماں اتنی شرطیں کیوں لگاتی ہیں۔ کہیں مہر کی شرط ہے تو کہیں خاندان پر جھگڑا ہے۔ کسی کے باپ دادا میں نقص ہے۔ تو کسی کی نانی میں۔" لیکن کہتی تو کس سے کہتی۔ ماں تو ماں تھی کوئی سہیلی نہ تھی۔ باپ تو اس کی رُندہ رو کا نپتی تھی۔ بھائی سے بھی جھجک تھی۔ بھاوج نا غیر تھی۔ گھر میں جو مامائیں تھیں وہ بھی پرانی نہ معلوم کس زمانے کی تھیں۔ عجیب مصیبت میں جان تھی!

آج صدیقہ بیگم پھر اپنے کمرے کا دروازہ بند کئے کواڑ سے کان لگائے اپنی اماں اور بی صغرا بیگم کی باتیں سُن رہی تھیں۔ صغرا بیگم ایک شریف گھرانے کی غریب بیوہ تھیں۔ غربت سے لاچار ہو کر رفتہ رفتہ مشاطہ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ چونکہ شریف عورت تھیں ہر گھر میں بے روک ٹوک آتی جاتی تھیں۔ تو رشتہ کروانے میں ان کو آسانی ہو جاتی تھی۔ صدیقہ بیگم جیسے جیسے ماں کی باتیں سُنتی جاتی تھیں تیوری چڑھتی جاتی تھی۔ احمدی بیگم جل بھُن کر کہہ رہی تھیں "اوئی بیوی یہ کہاں کا نیا طریقہ شریفوں میں نکلا ہے کہ لڑکی کو دیکھتے پھرو۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج نہیں۔ ہماری شادی ایسے ہی ہوئی۔ میری اللہ رکھے دونوں بڑی لڑکیاں بیاہی گئیں۔ بہو آئی۔ کیا سارے ملک کے شریف ہی اجڑ گئے جا کر لڑکے کی اماں سے کہنا کہ بیوی کیا ساری شرافت، شرم دھو کر پی گئیں۔ اپنی لڑکیوں کی شوق سے نمائش لگائیں، سودا کریں، ہماری لڑکی کا نی کھدری سب کچھ ہے لیکن ہے حامد حسن کی بیٹی اور محمد حسن کی پوتی۔ چودہ پشتیں اسی شہر میں گذر گئیں کوئی ہم ایسے گرے پڑے نہیں ہیں کہ ہم کو نہیں جانتا۔ ہمارے ہاں کی لڑکیاں ملتی کہاں ہیں۔ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جو یہاں کی چوکھٹ چڑھتے ہیں۔ ہم تو اپنے نام پر مرتے ہیں۔ لے ہاں میں سب کچھ جانتی ہوں۔ لڑکے ہی کی طرف تو دیکھ رہی ہوں۔ اکیلا لڑکا ہے۔ چار سو کا کرایہ اُس کا ہے۔ ڈھائی سو کا نوکر۔ خاندانی ہے۔ نیک۔ میں سب کچھ مانے لیتی ہوں لیکن یہ شرط کیسے گوارا کروں کہ وہ لڑکی کو دیکھ جائیں اور پھر پیغام دیں۔ جو وہ دیکھ کر گئیں اور کہہ گئے کہ ہمیں لڑکی نہیں پسند تو اُن کا تو لڑکا ہے۔ اُن کا کیا بگڑے گا۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گی۔ مجھے عمر بھر کنوارا رکھنا منظور لیکن یہ ذلت گوارا نہ ہوگا۔

[illegible]

[illegible] لڑکیاں دکھا دیں

ہیں۔ [illegible] لڑکی کو [illegible] کبھی [illegible] یا جب کبھی کسی سے جا کر [illegible]

[illegible] یہ نسبت ہو سکتا نہ میں لڑکے کی ماں کو دکھاؤں نہ اس کی بہنوں کو

• اتنے میں ایک ماما خبر لائی کہ رنگ محل سے سواریاں آئی ہیں۔ اور پردہ

مانگ رہی ہیں۔ جلدی سے دو چادریں پلنگ پر سے اٹھا کر ڈیوڑھی کی طرف چلی اور ادھر

احمدی بیگم بھی قرینے سے ہو کر بیٹھ گئیں۔ اور صغرا بیگم سے بولیں۔ اب ان کے سامنے

ساری بات کھول دینا۔

صغرا بیگم نے جواب دیا "لے بوا کیا میں نے چونڈا دھوپ میں سفید کیا ہے؟"

چار بیبیاں دو ادھیڑ عمر کی جو بہنیں معلوم ہوتی تھیں اور دو جوان عورتیں

صحن سے ہو کر قریب آئیں۔ سب ایک دوسرے سے گلے ملیں اور پھر فرش پر بیٹھ گئیں

بیٹھتے بیٹھتے ایک بولیں "واہ بہن جمعہ کو خوب میلاد میں آئیں؟"

دلہن کے چھوٹے بچے کا جی بہت ماندا تھا۔ اور پھر مغلانی بھی آج کل نہیں

ہیں ایسا بیاہ بھتیجے کا کرنے گئیں ہیں کہ مہینہ بھر ہو گیا شکل ہی نہیں دکھائی۔

صدیقہ کی طبیعت الگ ماندی ہے۔ سر میں درد ہے اور لیٹی ہے۔ لے حشمت تم کیوں

دبلی ہو رہی ہو۔ ابھی تو شادی ہوئی ہے خوشی کے دن ہیں۔

کیوں آپا صغرا یہاں کیا کر رہی ہو۔ صدیقہ بیگم کا کہیں سے پیغام لیکر آئی ہو؟

حشمت کی بڑی بہن مسرت نے پوچھا

• لے بیوی جہاں بیری ہو گی وہاں پتھر بھی آئیں گے۔ صغرا بیگم نے ترت

سے جواب دیا۔

• تو خالہ جان پھر کیا ارادہ ہے۔ صدیقہ کی شادی کا تو بہت ہی ارمان ہے"

مسرت بولیں

• بوا شادی کرنا مذاق ہے اور خاص کر آجکل۔ اول تو وہ گھرانے گھرانے

ہی نہیں رہے۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ میل ہوتا جاتا ہے۔ نہیں بُرا کسی خاص کا ذکر نہیں کرتی

ہوں۔ لیکن کیا بتاؤں دلی میں ایک نئی وبا اور نکلی ہے کہ لڑکی کو دکھا دو۔ آخر ہماری

بھی تو شادیاں ہوئی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں اور تو اور یہ [illegible] صغرا کہتی ہیں کہ [illegible]

[illegible] کیا ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ ہوتا ہی نہیں۔ جو یہ صدیوں سے

ہم خاندانی [illegible] بیٹھے ہیں تو وہ اسی دن کے لئے۔ آج کل [illegible]

[illegible] ہے۔ اور [illegible] ہے۔ اب ہماری بہن نے

[illegible] حشمت کو [illegible] کی [illegible]

• کہاں لائی [illegible] حشمت کے میاں ہیں۔ اب [illegible]

اپنا قصہ ہے۔ انہوں کس چیز کی کمی ہے۔ خاطر [illegible] اور

کیا چاہیئے۔ اور یہ کہتی ہیں کہ اماں آپ میرا تو ذکر نہ کیا کیجئے۔ آپ کو [illegible]

کر سکیں۔ آپ کیا جانیں سوکن کا ساتھ۔ میاں کہتے ہیں کہ میں اس بیوی کا منہ نہ

دیکھوں لیکن ان کو سوکن کا ڈر لگا رہتا ہے۔ کیوں بہن [illegible] ابھی [illegible]

مسرت کی اماں بولیں

• اماں تم میرا ذکر ہر جگہ کیوں لے بیٹھتی ہو۔ خالہ جان بتائیے صدیقہ کی

بات کہاں لگ رہی ہے؟

• ابھی تو کہیں ٹھیک نہیں ہوا۔ جہاں ایک آدھ لڑکا اچھا نظر آتا

ہے تو وہی دکھانے دکھانے کا جھگڑا اور پھر وہ ہے کہ کہتے ہیں کہ پہلے دیکھیں

پھر بات بھی کریں گے۔

لے بوا مجھے تو تم کہہ بیٹھ گئیں کہ حشمت کو دکھا دیا۔ میں نے تو عورتوں

ہی کو جھلک سے دکھایا تھا۔ لیکن ان کو تو لوگ مردوں کو بھی دکھا دیتی ہیں۔

• اری وہ کون ہوتی ہیں؟ احمدی بیگم نے حیرت ہو کر پوچھا۔ کون ہوتی

ہیں۔ صغرا جہاں کو تم نہیں جانتیں۔ انہوں نے تو بیٹی کو لڑکے کو دکھا دیا۔ [illegible]

کواڑوں میں سے جھلکا دیا۔

ہے ہے! اکبر کی احمدی بیگم نے سینے پر ہاتھ مارا اور پھر کر بولیں "اور [illegible]

نہ ہٹ گئی! میں تو بوا صدیقہ کو دو پیسے کی سمجھا کر شادی دوں لیکن یہ کام مجھ سے

نہ ہو۔ اسے کیا آنے سامنے بٹھا دیا تھا۔ شاباش ہے اس ماں پر [illegible]

میں بٹھا کر لڑکی کو کواڑوں سے جھلکا دیا۔ وہ لڑکا تو خیر راضی ہو گیا۔ اور اگر وہ

راضی نہ ہوتا تو پھر اسی طرح دوسرے کو تیسرے کو جھلکا دی جاتی۔ پھر تو ابھی ولی

گھن گرنتوں کا بچتا ہے۔ توبہ اللہ، تو یہ خاک چاٹ کر کیسی ہوئی

• لے ہے بیگم تم رہتی کس دنیا میں ہو۔ کس گھر میں [illegible] دکھائی

جا رہی۔ صغرا جہاں نے کیا جھونپڑا دھڑکا ہے ہیں۔ آج کل تو وہ [illegible]

کے جا رہے ہیں کہ شکر احسان خدا ہوتے ہیں۔ [illegible] کا [illegible]

[illegible]۔ [illegible] ہو کر دیکھ لیں گے۔ [illegible]

دکھا [illegible] انگریزی [illegible] کر کے دکھا دیا۔

صغرا [illegible] بولیں

[illegible]

بیگم ہیں۔ ہاں بوا ٹھیک ہے۔ جب اماں ہی کو شرم نہ آئی اور بیٹی کو دکان پر لیکر پہونچ گئیں تو وہ تو پھر پڑھی لکھی تھیں۔ ہاں بوا تو پھر سمجھو ہیں کیا بُرائی ہے۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال ٹہلتی ہیں۔ اب بوا یہاں بھی یہی ہو جائیگا۔"

"اے وہ تو خدا کے فضل سے آپ کی بھاوج نے سُنا ہے کہ شروع کر دیا ہے سنجھلی لڑکی کی شادی جس طرح کی ہے وہ تو بہت ہی شرمناک ہے۔

"ہاں وہ تو جو نہ کریں کم ہے۔ کنواری لڑکیوں کو گھر سے دُور مدرسوں میں لڑکوں کی طرح بھیجنا۔ سائیکلوں پر چڑھوانا۔ بھلا اُن کا گذر میرے گھر میں کہاں ہوتا اسی لئے تو میں نے بھائی بھاوج سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ شادی ہوئی کیسے؟"

"بالکل لڑکی کی پسند سے۔ لڑکی نے کہہ دیا کہ میں تو کردوں گی تو اب سے اماں باوا بھی خوش ہو گئے۔ وہ گھر میں سُنا ہے آتا جاتا رہتا تھا۔ سال بھر بعد جاکر کہیں شادی ہوئی۔"

"اور مجھ سے جو کوئی پوچھے تو ہونا یہی چاہیئے۔" حشمت بولیں "اوئی لڑکی اللہ اللہ کر۔ شرم نہیں آتی۔ کہیں میری صدیقہ کے سامنے ایسی باتیں نہ کر بیٹھنا۔ جب ہی بیاہی تیاہی لڑکیوں سے میں اس کا ملنا پسند نہیں کرتی۔ اور بوا میرا تو یہ سب سُن سُن کر دل دہل جاتا ہے۔ پوتی کے کرتوت دیکھ کر ہمارے ابا میاں کی رُوح کیا کہتی ہوگی۔ میں تو اپنی بھاوج کے ڈھنگ شروع ہی سے سمجھ گئی تھی۔ سولہا سال ہو گئے نہ میں نے اُن کی صورت دیکھی ہے۔ اور نہ خدا مجھ کو زندگی بھر دکھائے۔ اُن کی ذلیل باتیں سُن کر میں بس خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں۔ جو آج کہیں ابا میاں زندہ ہوتے تو ان لوگوں کی مجال ہوتی کہ ایسی باتیں کرتے۔ اب سُنتی ہوں کہ میری بھتیجیاں شہروں میں بے پردہ جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں۔ اللہ کا کیا قصہ ہے۔ جیسا بوئیں گے ویسے ہی اٹھیں گے۔ اب ہمارے بچے ہیں مجال ہے کہ کوئی بات کے سامنے بھی تو کر جائے۔ صدیقہ ہی کو لے لو۔ جہاں بٹھا دیا بیٹھ گئی۔ جیسا کھلا دیا کھا لیا"

احمدی بیگم نے کہا "اور اب تو جدھر دیکھتی ہوں یہی دیکھتی ہوں کہ لڑکیوں کو اس طرح نکال کر پھینکتے ہیں جیسے کوئی گندی نکال کر پھینکدے۔ ہمارے وقتوں میں برسوں ناک رگڑ والتے تھے۔ جب کہیں جاکر بیٹی دیتے تھے۔ اور بوا بیٹی دیں تو دیں ساتھ ہی روپیہ کا وعدہ بھی کرتے ہیں۔

"ہاں بہن ٹھیک کہتی ہو اب ہمارے گھر کے قریب حافظ جلال الدین کی بیوہ آ کر رہی ہیں کوئی بیس لڑکیاں تو دیکھ چکی ہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نکال دیتی ہیں۔"

"کون حافظ جلال الدین؟" صدیقہ بیگم کی اماں نے گھبرا کر بات کاٹی۔

"سید ہیں۔ خاندان اچھا ہے۔ لڑکا بھی بُرا نہیں۔ لیکن اماں غضب کی ہیں۔" مسرت جہاں نے کہا اور یہی آپا صغرا ہی اُن کو چھ سات لڑکیاں تو دکھا چکی ہیں۔" "اوئی بوا صغرا! تم ایسا پیغام میرے گھر میں لاتی ہو۔ شاباش ہے تمہیں" صدیقہ بیگم کی اماں نے کلمہ کی انگلی کو اوپر کے ہونٹ پر رکھ کر کچھ غصہ اور کچھ حسرت سے کہا "اے ہے بیگم تم بھی کن کی باتوں ——————

صدیقہ بیگم جو ابھی تک کان لگائے ایک ایک لفظ سُن رہی تھیں ماں کا لہجہ سُن کر سب سمجھ گئیں۔ وہاں سے اُٹھیں اور دوسرے جاکر اپنے پلنگ پر گر پڑیں اور سسکیوں سے رونے لگیں۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

بابوجی مزدور چاہیئے

(مالتی دیوی)

گھنے کُہرے کی دھندلی چھایا کو چیرتی ہوئی سردیلی اور اندھیری راتوں میں بھی جبکہ ساری ایسو ینا گرم ریشمی لحافوں میں پڑی اقطر نیند کی گود میں مست سویا کرتی ہے۔ سونی فضا کو گونجاتی ہوئی سچھوٹی چھوٹی گلیوں اور سڑکوں میں گاڑیوں تانگوں اور یکوں وغیرہ سواریوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے سائے انتہائی درد بھری اُمید اور دُکھ بھری آواز میں پکارا ٹھتے ہیں۔ بابوجی مزدور چاہیئے؟ دوڑتے ہوئے رامو کے قدم لیکا یک دھیمے پڑ گئے۔ اُس نے سُنا۔ گاڑی کے اندر سے آواز آئی نہیں چاہیئے۔ قدم دھیمے پڑتے پڑتے بھی نہ جانے کس لالچ سے اک ساتھ نہ رُکے۔ پھر ایک کرخت تیز آواز گونج اوٹھی "ایک بار کہہ دیا نہیں چاہیئے۔ الفاظ گونج اٹھے "نہیں چاہیئے" رامو لوٹ پڑا۔

اس کڑاکے کی سردی میں جبکہ سنسار کے عیش پرستوں نے ایک رضائی کے اوپر دوسری رضائی اوڑھ لی تب ہڈی اور گوشت کے بنے رامو نے لاپرواہی سے بدن پر لپٹا ہوا پھٹا سا انگوچھا بھی اُتار کر رکھ دیا۔ اب وہ مستعدی سے دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

یہی رامو کی زندگی تھی۔ یہی اس کی لگاتار رٹ تھی۔ "بابوجی مزدور چاہیئے" انھیں الفاظ کے دم پر وہ کماتا تھا۔ تھکا ہارا موجب ان الفاظ کو دُہراتا تو اسکی کمزور آنکھوں کے آگے اُمید بن کر تانبے کے کچھ ٹکڑے چمک اٹھتے۔ کچھ پیسے ہی اُسکی امید تھے۔ اور ممتحن کے مُنہ سے ہاں یا نہیں سُننا ہی اسکے امتحان کا نتیجہ تھا۔ چند پیسوں کیلئے کتنی کٹھن تپسیا اور کتنا کڑا امتحان تھا۔

اُمید اور نا اُمیدی کے اس طوفان کے ساتھ لڑتے لڑتے اس کے کتنے ہی برس بیت چکے تھے۔ رات کو جب گھپ اندھیرا پھیل جاتا تھا تب وہ چونکتا اور بڑی تدبیر سے کچھ پیسے کھوسے ڈنکے اور اُمید کیساتھ گھر کی طرف قدم بڑھاتا۔ لمبا راستہ گھنے کالے درخت اور پتھریلی تنگ پگڈنڈی۔ وہ اور زیادہ لمبے قدم بڑھاتا آگے پیچھے چاروں طرف اندھیرا۔ پر دُور اس گہرے اندھیرے میں اُس کے آگے مضبوط ہنستی ہوئی بیوی رودھیا آجاتی اور پیروں سے لپٹے ہوئے بچے پکار اُٹھتے دکالائے ہوئے گگوٗ "۔ رامو کے تھکے جسم میں بجلی کی طاقت دوڑ جاتی۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا گھر کی طرف بھاگتا۔ اسے دور سے ہی دیکھ کر بچے دوڑتے۔ وہ اُنھیں گودی میں اٹھا کر پیار کرتا اور پھر ہنستی ہوئی رودھیا اُسے حقہ بھر کر دیتی۔ اپنی تکلیفوں کو چھپاتا ہوا رامو اُسے اِدھر اُدھر کے کچھ قصے سناتا۔ رودھیا ہنستی اور دھیرے دھیرے اپنی بھی دن بھر کی بیتی سُناجاتی۔ اس طرح دو محنتیوں کا دل ہلکا ہوتا۔ رات کو رودھیا اُسے باجرہ کی موٹی روٹی دیتی۔ وہ خوشی سے کھا کر چل دیتا اور پھر دوستوں میں بیٹھ کر زور زور سے برہا اور ہولی گا۔ اتنا مست ہو جاتا کہ گھر بار سب بھول جاتا۔

رات کو رامو اپنے پھوس کے بستر پر پڑا خواب دیکھتا۔ وہ گاڑیوں کے پیچھے پیچھے چلا رہا ہے "بابوجی مزدور چاہیئے" پھر ملتے ہیں چار پیسے۔ ایکدم چار۔ رامو دُعائیں دیتے کو مُنہ کھولتا۔ اسکا خواب ٹوٹ جاتا اور وہ بستر چھوڑ کر اُٹھ بیٹھتا۔ جس وقت شریف کہلانیوالی دُنیا خواب کی خوبصورت بستی میں گھوما کرتی ہے۔ اُسوقت رامو کے قدم اپنی جانی پہچانی جگہ کی طرف بڑھتے اور روز کی طرح سواریوں کے پیچھے آواز گونج اٹھتی۔ "بابوجی مزدور چاہیئے" کیسی عجیب رٹ تھا۔

* * * * * *

"اُف بابو کیا دیکھ کر نہیں چلتے ہو" رامو درد سے کراہ اُٹھا۔ گاڑی میں سے ایک شاندار آدمی نے نکل کر ایک روپیہ رامو کے جلتے ہاتھ پر رکھ دیا۔ رامو مارے خوشی کے اپنا درد بھُول گیا "نہیں بابوجی زیادہ چوٹ نہیں لگی ہے بھگوان آپ کا بھلا کرے" رامو نے جلدی سے لوگوں کی نظر بچا کر وہ روپیہ کمر میں کس کر آنسو بھرے چٹیں دیکر باندھ لیا۔ خوشی سے پاگل رامو نے سوچا آج وہ غریب

بات سے پہچانا۔ رودھیا کتنی خوش ہوگی۔ نہیں نہیں تاڑی نہیں پیوں گا۔ یہ سارا پیسہ رودھیا کو لا کر اُن ساڑی خریدنے کو دوں گا۔ خوب کھلے گی۔ انہیں خیالوں میں غرق وہ گھر پہونچا۔ چمکتا ہوا روپیہ اُس نے جھٹ سے رودھیا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ رودھیا کھل پڑی اور جھٹ سے پوچھ ہی تو بیٹھی کہاں سے لائے۔ بات بنا کر رامو بولا ایک امیر بابو کا بوجھ اٹھایا تھا انھوں نے مہربانی کرکے دیا ہے۔" رامو پیٹ کے اوپر سے پہیئے نکل جانے کی بات بھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا پیر میں درد بڑھتا گیا۔ آخر رات میں درد اتنا بڑھا کہ رامو کو رودھیا سے اصلی حال کہنا ہی پڑا۔ پیر سوجکر بھیانک ہو رہا تھا۔ اور جسم جلکر انگارہ کی طرح دہک رہا تھا۔ ساری بات جان لینے پر رودھیا نے اُس روپیے کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اٹھا کر الگ رکھ دیا اور اس رحمدل بابو کو جسے کچھ گھنٹے پہلے اُس نے ان گنت دُعائیں دی تھیں کوسنے لگی۔

رامو کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ اُسے مزدوری پر گئے قریب ایک ہفتہ بیت گیا۔ بیماری میں گھر کا ایک ایک پیسہ لگ گیا۔ بڑا لڑکا بھوک سے گھبرایا سا رہنے لگا اور چھوٹا لڑکا دودھ کیلئے تڑپ گیا۔ رودھیا بے جان سی سب کچھ بھولی گاؤں کے دیوی دیوتاؤں کی ماتا مناتی۔ اور پھر رامو کی کھاٹ کا سہارا لے بیٹھ رہتی۔ جب رامو کو ہوش آتا تب وہ کہتا " کاہے رودھیا تو کاہے سانتہ مری ہو؟" رودھیا مُنہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔ " ناہیں ہمار کھاتر بچن کی کھاتر ایسی بات جبان سے کاہے نکالت ہو" کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے آنسو کی دو بڑی بڑی بوندیں ڈھلک پڑتیں۔ وہ کھاتے کیا جب گھر میں کچھ ہو بھی نہ۔ اڑوسی پڑوسی کچھ پیسوں سے رودھیا کی مدد کرتے پر وہ سب پیسے دوائیوں میں خرچ کر دیتی۔

* * * * * * * *

آج رامو کی حالت زیادہ خراب تھی۔ روتی روتی رودھیا دیوی کے مندر میں دوڑی: " دیوی مائی تو ہے چندری بھینون "

ادھر رودھیا ماتا کو منا رہی تھی ادھر بڑا لڑکا دوڑا آیا۔

" مائی گجب ہوئی گوا " رودھیا نے آگے کچھ بھی نہ سُنا اور سیدھی گھر کی طرف دوڑی۔ وہ اپنے سہاگ کیلئے گھبرا اُٹھی۔

جونہی اُس نے گھر میں قدم رکھا دیکھا کہ اُس کے نئے تیوہار سے پہلے کو لوگ باندھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ تعجب کھڑی رہ گئی۔ آنسو ایک بھی نہ چھلکا۔ کیا موت کا آنا اتنا آسان ہے؟ اس کی آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ وہ

یقین ہی نہ ہوا کہ یہ کیا ہو گیا۔ کس کی، کیسی لاش؟ ابھی کے ملی گئی وہ پیارا میرا ایک ایسی کیل آکر گڑ گئی جس کے گڑنے کی اُسے کبھی بھی اُمید نہ تھی۔ وہ رو اٹھی۔ لاش چلی گئی۔ پر وہ اسی طرح آنکھیں نکالے ٹک ٹک اسی طرف دیکھتی رہی۔ آخر یقین کی بھی حد ہوتی ہے۔

بیہوشی میں رامو بڑبڑایا: " رودھیا کاہے ٹھاڑی ہے " رودھیا رامو کی طرف بڑھی اور پتھر کی مورتی کی طرح اسکی کھاٹ پر آکر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

دو دن بیت گئے۔ تیسری رات کو رامو کا جسم بھٹی کی طرح دہکنے لگا وہ درد سے بیتاب ہو کر چیخ رہا تھا۔ رودھیا بھوکی پیاسی خاموش ایک ٹک رامو کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ تیز مشین کی طرح نکلنے لگے۔ " دیوی تو ہے چندری بھینون"

موت کا سایہ رامو کے چہرے پر پڑنے لگا وہ ہنسا۔ " کاہے رودھیا دیوی تو ہے چندری بھینون " ایک ایک لفظ قہقہے کیساتھ گونج اُٹھا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا

تو ہے چندری بھینون " رودھیا ڈر کر چارپائی چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اُس نے اپنے ہونٹوں کو کس کر بند کر لیا۔

* * * * * * *

رودھیا نے دیکھا۔ اُسی آنگن میں جہاں چند دن پہلے ایک ننھی سی لاش باندھی جا رہی تھی وہیں۔ ٹھیک اُسی جگہ آج ایک بڑی لاش باندھی جا رہی ہے رودھیا نے لاش کو پکڑ لیا " ہمار کھاتر بچن کی کھاتر " اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس دوسری نوکیلی کیل نے آکر اس کے دل کی دیوار کو ایک ساتھ چُور چُور کر دیا۔

* * * * * *

مکان والا کرایہ کے تقاضے کرنے لگا۔ اُس کے کُل چار روپیہ آتے تھے۔ رودھیا نے سامان بیچکر کسی طرح اُس کے دو روپیہ چکا دیئے۔ ایک رات گاؤں والوں اور پڑوسیوں کی نظر بچا کر وہ اپنے سات سالہ بچہ کا ہاتھ پکڑے آنسوؤں کو پلکوں سے ڈھکے گاؤں چھوڑ کر چل دی۔

ادھر دور بہت دور اُسی جگہ پہ سواریوں کے پیچھے اک خاموش آواز فضا میں گونج اُٹھتی تھی۔ " بابو جی مزدور چاہیئے " کیسی بجلی تھی اس آواز میں!!

گھن گرج

گولے بارود کی گھن گرج سے دور مت، گاؤں بیچی بیچی پہاڑیوں کے اُوپر گھنے درختوں کی چھاؤں میں آباد تھا۔ گاؤں کے درمیان میں سے ایک سڑک گذرتی تھی۔ جس کے دونوں طرف سایہ دار درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ درختوں کے سفید چکنے تنے یوں معلوم ہوتے تھے گویا خانہ بدوش کنواریوں کی جوانیاں انکی ننگی پنڈلیوں میں سرچی ہوئی دہک رہی ہوں۔ یہ جنوبی چین کی ایک بہت اچھی تفریح گاہ تھی۔ جہاں بوڑھے افیونی سرمایہ دار قناعت اور غفلت کے نشے میں مدہوش پڑے رہتے تھے۔

جب چیانگ کائی شیک جنوبِ بعید کی طرف بھاگا۔ جاپانی فوجیں بھی اُدھر مڑیں۔ اسوقت بمبار طیاروں اور فوجی ہلاکت سامانیوں نے گاؤں کے گاؤں کو تباہ کر دیا......... درختوں کی پتّیاں اس طرح جھڑیں جیسے بہار کی دیوی کا جوبن نوچ کھسوٹ ڈالا گیا ہو سینہ تانے نازک کمر، خو برو درخت اس طرح جھکے کھڑے تھے۔ جس طرح ایک اُنسٹھ برس کی راتیں گذارنے کے بعد ساٹھویں سال کی صبح کو بوڑھا اپنے مستقل بڑھاپے کی ٹھنڈی بجلی محسوس کرتا ہو۔ خوبصورت ہلکے پھلکے مکانات زمین سے لگ گئے۔ گھاس پھوس کی ہری بھری جھونپڑیوں کا نشان تک بھی نہ رہا۔ ہر چیز پر مُردنی چھا گئی۔ تمام آبادی ٹوٹے پھوٹے گھروں میں دبک بیٹھی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک دو منزلہ مکان تھا۔ یہ صوبے کے گورنر کی اقامت گاہ تھی۔ اور اس وقت اس میں چینی سپاہیوں کا ایک دستہ ٹھیرا ہوا تھا۔

جاپانی طیاروں نے اسے اچھی طرح چھلنی کر دیا تھا۔ اوپر کی منزل کا زیادہ حصہ نیچے آ رہا تھا۔ سارے کمروں کی چھتوں میں بڑے بڑے سوراخ پڑ گئے تھے اور پتھر کی دیواریں اور فرش اچھی طرح مسمار ہو گئے تھے۔ میلی میلی دیواروں پر ہر جگہ ملبے کے چھینٹے پڑے تھے۔ ساری فضا تھرائی ہوئی تھی۔ بھورے بھورے بادل آسمان پر اس طرح بپھرے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ جس طرح تازی کتے شکار کی دھن میں ہانپ رہے ہوں۔ تیز و تند ہوا رہی سہی خدائی کو تباہ کرنے لگی تھی۔

وانگ ایک سپاہی مکان کے دروازے پر کھڑا آسمان کیطرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی رائفل کاندھوں سے لٹکی ہوئی تھی۔ آہنی سرپوش نے اس کی پیشانی ڈھانپ رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھی تھیں۔ اور وہ قدرت کے تماشے کو محویت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی اور نظروں کے سامنے سے کوند جاتی تھی۔ بادل گرجتا تھا۔ اور کان کے پردے ہل جاتے تھے۔ سُرخ سُرخ بجلی کے پیچھے کئی سیاہ طیارے گزر جاتے تھے۔ سنسناتی ہوئی ہوا ایک رُخ سے بے رُخ ہو جاتی تھی۔ پھر وہی مزدوروں کا فاقہ، کسانوں کی محنت، یتیمی، مظلومیت ———
وانگ بلند آواز سے بڑبڑانے لگا۔

وطنِ مقدس کا بینک پھر خالی کیا جائیگا۔ مزدور پھر اسی طرح خون پسینہ ایک کرینگے۔ کسان پھر اسی طرح دھوپ میں جلے گا اور سردی میں کانپے گا۔ آہ! یہ لڑائی ——— یہ کمبخت لڑائی، یہ جنگ و جدال، یہ چند نفوس کی بازیگری ——— صرف دو آدمی شطرنج کی بساط لیکر بیٹھتے ہیں اور مہروں کو کھلاتے ہیں۔ اس طرح ان [illegible] آدمیوں نے دنیا کو لڑائی جھگڑے میں مبتلا کر رکھا ہے ——— آہ! بھوک ——— بھوک ——— کتنی شدت کی بھوک ہے دیکھوں، کچھ ہے بھی .....!

بھوک محسوس کر کے اُس نے تھیلا دیوار سے اتارا۔ ایک نان پاؤ اُس میں سے نکالی اور بھوکے کتے کی طرح اُسے چبانے لگا۔

نان پاؤ باسی تھا اسی تھی۔ کوشش سے بھی چبائی نہ گئی باوجودیکہ بھوک نے تلملا رکھا تھا۔ اور تازہ راشن کی بظاہر کوئی امید نہ تھی۔ پھر بھی اُس نے جھنجلا کر نان پاؤ کا باقی ٹکڑا دور پھینک دیا۔ جو کیچڑ میں گر پڑا، وہ پھر بڑبڑانے لگا.........
سپاہی کی زندگی ایک کھلونا ہے۔ وطن کی عزت اور وطن کی آزادی کے نام پر اس [illegible]

عورت اور اس کے پیدائشی حقوق پامال کرتے ہیں۔ ان بیچاروں کے خون میں جبلت کو اس لئے شعلوں کی نذر کر دیا جاتا ہے کہ چار پانچ انسانی تندوروں میں چاندی سونے کی آگ جلتی رہے۔ وطن اپنوں کے ہاتھ میں ہو یا غیروں کے ہاتھ میں، موجودہ معاشی نظام کے تحت خودی کو بلندی کمال حاصل ہو سکتی ہے۔ جب تک یہ نظام نہ بدلے، ملک خواہ کسی کے ہاتھ میں ہو ہم تو غلام ہی رہیں گے۔ چاہے وہ غلامی جاپانیوں کی ہو یا اپنے صاحبِ چیانگ چینگ کی۔ ہم ناحق لڑتے ہیں۔ آہ ہم کیوں لڑتے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے —— اپنا ایمان اور اپنی جان بیچتے ہیں —— پھر بھی بھوکے ہی رہتے ہیں۔ کمبختوں نے اپنے عیش و فراغت کیلئے یہ سارا جال بچھا رکھا ہے۔ اور ہماری جانوں کے معاوضہ میں ہمیں سوکھی روٹی دیتے ہیں۔ لذیذ و پُرلطف خوراک تو در کنار، سلونی گرم گرم نان پاؤ بھی ہمیں نہیں ملتی۔ جس طرح ہمارے سوکھے جسم خون کی ندیوں میں پھینکے جاتے ہیں اسی طرح یہ سوکھے نان پاؤ کیچڑوں ہی میں پھینکے جانے کے قابل ہیں۔"

اس نے قدموں کی آواز سُنی اور دیکھا کہ ایک سپاہی سامنے سے گذر رہا ہے وہ کیچڑ کے پاس پہنچ کر یکایک ٹھٹھک گیا، جھکا، نان پاؤ کا ٹکڑا کیچڑ سے نکالا۔ اسے اپنے کوٹ کی آستینوں سے پونچھا اور جلدی جلدی اُسے کھانے لگا۔

۴۲

وانگ کو بڑی شرم آئی۔ اُسے نان پاؤ نہیں پھینکنی چاہیئے تھی۔ دنیا میں ہر شخص تو فلسفی نہیں ہوتا۔ اُس نے نووارد سپاہی کی طرف ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا سپاہی سوکھی ہوئی اکڑی ہوئی نان پاؤ کو واقعی جھنجھوڑ رہا تھا۔ جس طرح ایک بازاری کتا چھیلی سے بٹی ہوئی پتلی سی ہڈی کو جھنجھوڑتا ہے۔

وہ لانبا تھا۔ پتلا تھا۔ کاندھے جھکے ہوئے۔ چہرہ نہایت دُبلا، ناک چینیوں کے برعکس کسی قدر لانبی، آنکھیں وحشی اور روسیوں جیسی بڑھی ہوئی ڈاڑھی۔

وانگ اس کی طرف بڑھا۔ اور نرم لہجے میں پوچھا۔ "تم بہت بھوکے معلوم ہوتے ہو۔ کامریڈ! مجھے معاف کر دو۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم اس نان پاؤ کو کھا سکو گے۔ تو میں اسے کبھی نہ پھینکتا!"

"کوئی بات نہیں! مجھے تم لوگوں کی طرح ان باتوں کی پروا ہوتی تو آج اسی کیچڑ کے نیچے میں بھی پڑا ہوتا!"

"مجھے افسوس ہے اور میں شرمندہ ہوں۔ تم میرے کامریڈ ہو۔ اور غالباً عالمگیر امن کی برادری سے تعلق رکھتے ہو —— آؤ چلو اس گرجتے ہوئے آسمان کے نیچے کہیں بیٹھ کر کچھ پئیں!" وانگ نے اپنے جھولے سے بیئر Beer کی بوتل نکالی اور پینی شروع کر دی۔

"میرا نام وانگ ہے، تمہارا کیا نام ہے؟"

"چارلی! میں ہسپتال سے بھاگ آیا ہوں۔ میں سے پنا کی لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا۔ ابھی مجھے پوری صحت تو نہیں ہوئی۔ پھر بھی ہسپتال میں رہتے رہتے گھبرا گیا تھا۔ اس لئے بھاگ آیا۔ میں ساری زندگی بھوکا رہا ہوں اور شاید بھوکا ہی مروں گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وقت مجھ پر اسقدر دہشت سوار رہتی ہے ......"

وانگ نے اسے عجیب و غریب آدمی پایا۔ اور اسکی گفتگو کا طریقہ عجیب تر۔

چارلی نے بات جاری رکھی: "مجھے اپنے متعلق زیادہ نہیں معلوم ہے جس طرح میں نے کیچڑ میں سے تمہاری پھینکی ہوئی نان پاؤ اٹھا کر کھالی ہے اسی طرح کسی نے مجھے بھی سڑک سے اٹھا کر پالا تھا۔ بچپن کی صرف ایک بات یاد آتی ہے۔ جب میں لاوارث بچوں کے ہسپتال میں تھا، ایک نوجوان نرس تھی۔ وہ مجھے نہ معلوم کیوں بہت چاہتی تھی۔ مجھے بھی اس سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ میں اسکی انگلیاں پکڑے ادھر اُدھر دوڑا کرتا تھا۔ اس دوران میں ایک بوڑھا سپاہی کبھی کبھی مجھے دیکھنے آجایا کرتا تھا۔ جب میں بارہ تیرہ برس کا ہوا۔ تو نحوست کے بادل میرے سر پر منڈلانے لگے۔ میں ایک عیسائی مشن کے سپرد کر دیا گیا۔ جہاں مجھے بید کی کرسیاں بنانے کے کارخانے میں لگا دیا گیا۔ پیسے تھوڑے ملتے تھے کیونکہ اس تجارت میں منافع بہت کم ہے۔ یہیں سب سے پہلی بار میں نے بھوک محسوس کی۔ کارخانہ ایک بوڑھے کے سپرد تھا۔ جس کی بیوی جتنی موٹی تھی۔ اتنی کنجوس بھی تھی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹتی تو سو طرح کے منہ بناتی۔ بھویں تن جاتیں، پیشانی پر شکنیں پڑ جاتیں اور جب تک کہ با حسرت و یاس ہم کام کرنیوالے معصوم لڑکے اپنے اپنے ٹکڑے کھا جاتے۔ وہ بڑبڑاتی ہی رہتی۔ کاش تم اسے اسوقت دیکھتے جب وہ ہمارے لئے شوربہ نکالتی تھی چمچہ دیگچی کے اندر گھومتا رہتا۔ جیسے کشتی سمندر میں ہو۔ کمبخت اس میں سے ذرا سا شوربا نکالتی۔ اور چھوٹے سے چمچے کو دیکھا کرتی —— نہ معلوم کتنی ٹھنڈی سانسیں بھرتی تب کہیں ذرا سا شوربا ملتا۔ کارخانے میں دو لڑکے اور بھی تھے۔ جو میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ وہ دونوں اندھے تھے۔ ان کے ساتھ بھی میرے ہی جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مگر وہ خوش تھے اور بظاہر انہیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس لئے کہ وہ عورت کی اُن حریص آنکھوں کو تو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میں نے اس جگہ تین برس کام کیا اور تین برس مستقل بھوکا رہا۔ ایک دن بھی بھوک پوری طرح نہ مٹی جس وقت میں نے روٹی کا ٹکڑا [illegible]

تو تم حیران ہوتے ہوگے۔ کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں —— میں اپنا گزارہ ہی اسی طرح کرتا چلا۔ اور اسی طرح کرتا رہا ہوں۔ بعض دفعہ مجھے اس سے بھی سخت ٹکیٹے ملے ہیں۔ اور ان کو مجھے رات بھر پانی میں ڈالنا پڑا ہے۔ بعض وقت اچھی چیزیں بھی ملیں۔ کیونکہ سکول جاتے ہوئے لڑکوں کی عادت ہوتی ہے۔ کہ کچھ نہ کچھ کھاتے جاتے ہیں۔ اور گراتے جاتے ہیں۔ میں نے مزدور —— قلی —— دوکاندار چوکیدار ہر حیثیت سے کام کیا ہے اور اب سپاہی ہوں۔ پہلے بھی دوسروں کے لئے کام کیا تھا۔ اور اب بھی دوسروں کیلئے لڑتا ہوں"

وانگ کے آنسو گر رہے تھے۔ اور وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کامریڈ یہ سچ ہے۔ اس نظام کے تحت ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ دوسروں ہی کے لئے ہے۔ اور یہ لڑائی بھی دوسروں ہی کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ تمہاری بھوک نہ آزاد چین مٹا سکے گا اور نہ غاصب جاپان ہی۔ تم پہلے بھی بھوکے رہے ہو اور آئندہ بھی بھوکے رہوگے۔ بھوک کے لئے دھرتی کے اس عالمگیر جاگیردارانہ نظام کو الٹ پلٹ کر دینا ہوگا۔ بغیر اس کے بھوک نہیں مٹ سکتی۔ اور لڑائی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

چارلی نے وانگ کا ہاتھ محبت سے بے اختیار ہو کر دبایا اور بولا میں بھوکا رہا ہوں اور بھوکا ہی مروں گا۔ زندگی کے تیس سال میں ایک دن کے لئے بھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا"

دونوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اور چارلی مکان کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب ڈیوٹی بدلی۔ اور دروازے کے سامنے پہرا دینے کے لئے دوسرا سپاہی آیا۔ تو وانگ بھی اندر گیا۔ اس نے چارلی کو بے خبر سوتے پایا۔ وہ بھی اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ اور ذرا سی دیر میں خراٹے بھرنے لگا۔

بارہ بجے رات کو چارلی جاگا۔ غالباً بھوک سے بے تاب ہو کر، بادلوں کو

ہوا کے جھونکوں نے جگا دیا تھا۔ اور چاندنی کی کرنیں سوتے ہوئے چینیوں پر چھت کے سوراخوں کے ذریعہ بھی پڑتی تھیں۔ چندرماں کی ان کنواریوں کی زیادہ تر کرنیں اندازی وانگ ہی کے مکھڑے پر تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ چمک رہا تھا۔ اتنے میں سارجنٹ نے دروازہ کھولا۔ اور ان پانچ سپاہیوں کے نام پکارے جن کو اسوقت گشت پر جانا تھا۔

وانگ کا نام بھی ان میں تھا۔ مگر وہ اسوقت نیند میں گم تھا۔ اور کسی طرح نہ جاگا۔ باقی چار اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جن کی ڈیوٹی نہیں تھی وہ کروٹیں لینے لگے۔ مگر وانگ نہ اٹھا وہ سوتا رہا۔ چارلی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سارجنٹ کو فوجی سلام دیتے ہوئے کہا "وانگ صبح سے بہت بیمار ہے اسے بخار ہو رہا ہے وہ ابھی ابھی سویا ہے۔ میں شام ہی کو ہسپتال سے آیا ہوں۔ تازہ دم ہوں اور گشت پر جانے کیلئے تیار ہوں۔ میں بھی کامریڈ ہو ننگ کی کمیونسٹ فوج کا سپاہی ہوں"

سارجنٹ نے پوری چاندنی وانگ کے چہرہ پر چھٹکی ہوئی دیکھی پھر چارلی کی طرف دیکھا۔ مسکرایا اور اجازت دیدی۔ پانچوں آدمی گشت پر چلے گئے۔

آدھ ہی گھنٹہ ہوا تھا۔ کہ کہیں قریب سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ آوازیں تیز اور کرخت تھیں۔ سب جاگ اٹھے اور تفتیش کیلئے باہر نکل آئے۔

"وقت کیا ہے؟" وانگ نے پوچھا "مجھے آج رات گشت پر جانا تھا"

کسی نے جواب دیا تمہاری جگہ پر چارلی چلا گیا۔

اسی وقت ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ ہر ایک نے اسے گھیر لیا اور گھبرا گھبرا کر اس سے پوچھنے لگے کیا ہوا؟ "ہم پر جاپانیوں کے ایک بھاری دستے نے حملہ کر دیا ہے ہمیں جنوب کی طرف فوراً بھاگنا چاہیئے۔" "باقی چار سپاہیوں کا کیا ہوا جو تمہارے ساتھ گشت پر گئے تھے۔ کسی نے پوچھا

"چارلی کو کیا ہوا۔ وہ کہاں ہے؟" وانگ نے گھبرا کر پوچھا۔

"بیچارہ مر گیا۔ گولی سر میں لگی۔ ایک لفظ بھی نہ بولا"

سید فرید جعفری

ل۔ احمد اکبرآبادی

ایک فیشنیبل سوانگ

جولائی ۱۹۵۰ء کی چوتھی تاریخ ہے۔ فلاڈلفیا کانگریس کے اجلاس کو آج پورے ڈیڑھ سو سال ہوئے ہیں! امریکائی کونسل خانے میں شنگھائی کی ساری یورپی آبادی کے تمام قابل ذکر لوگ اس لئے جمع ہیں کہ سرزمین ترقی اور آزادی کی جنم بھومی امریکا ــــ امریکا نہیں بلکہ تنہا فاتح بیتے ڈالر کے سامنے اپنے احترام اور پرستش کے جذبات کا نذرانہ پیش کریں!

ہال کی دیواروں پر سیج گرمی کی فضا میں واشنگٹن اور لنکن کی بڑی بڑی تصویریں سنہرے اور دمکتے ہوئے چوکھٹوں میں لٹک رہی ہیں۔ امریکائی نیلے پرچم کی آڑی ترچھی لکیریں اور ستارے لہرا رہے ہیں۔

یکایک بیتلی بینڈ باجے کے سُر بلند ہونے لگتے ہیں۔ امریکا کا چینی کونسل تیز قدمی سے بڑھتا اور بیچ ہال میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اعلان آزادی کا کاغذ کھولنے لگتا ہے۔ اسے کھانسی اٹھتی ہے ...... سب کے سب سانس روکے انتظار کی تصویر بن گئے ہیں۔ اس مجمع کے کانوں میں آج وہ لفظ پھر گونجنے والے ہیں۔ جو ڈیڑھ سو برس سے ہر سال بجلی اور گرج کی طرح گونجتے رہے ہیں! آج یہ سب لوگ پھر آزادی اور مساوات کا فخر انگیز نغمہ سننے والے ہیں!

میں بھی اس مجمع میں ہوں۔ میں اپنے دائیں بائیں نظر ڈالتا ہوں۔ امریکائی بیوپاری! انگ سکسن دوست، انگریزی اور فرانسیسی، سب کے سب سنجیدہ لباس پہنے، سروں کو جھکائے، اس طرح بیٹھے ہیں جیسے کہ گرجے کے اندر ہوں!

کونسل پھر کھانستا ہے، اور ادھر اُدھر ایک نظر ڈالتا ہے۔ آدھا منٹ سخت قسم کے تعطل میں گذرتا ہے۔ اس آدھے منٹ کی فرصت میں محسوس ہوتا ہے کہ اس غیر مہذب ملک اور استبداد کی سرزمین یعنی چین، پر اس پُرعظمت اعلان کی اہمیت کیا ہے!

فلاڈلفیا کانگریس کی روشنی میں اگر پچھلے چند سالوں کے واقعات یعنے واشنگٹن کانگریس کے بعد جو کچھ ہوا اسے دیکھا جائے تو اس کا مطلب اور مفہوم دوسرا ہی ہو جاتا ہے! لیکن شاید میں تنگ نظر ہوں، اس لیے کہ آدھے منٹ کی اس مہلت میں میرے خیال کے اندر انقلاب امریکا کے ہیرو نہیں آتے۔ بلکہ ان کی جگہ شنگھائی کے رکشا قلی چھین لیتے ہیں!

شنگھائی کی یورپی آبادی میں ایک رکشا والا صبح سات بجے سے رات کے ایک بجے تک جبکہ تھیٹر اور سینما ختم ہوں، بھاگتا رہتا ہے، تب کہیں اس کے ہاتھ میں ایک ڈالر آتا ہے۔ اس ڈالر کا اسّی فیصدی حصہ تو رکشا کا مالک ہتھیا لیتا ہے اور دس فیصدی شہر کی میونسپلٹی ٹیکسوں میں لے لیتی ہے۔ رکشا والے کے پاس اس کی اٹھارہ گھنٹے کی محنت کا دسواں حصہ بچتا ہے، وہ اس قلیل حصے میں بھی گذر کر لیتا ہے۔ اس لئے کہ کپڑا اگر وہ پہنتا ہے تو نام کیلئے! اس کے سونے کیلئے سڑک اور رکشا کا سہارا بہت ہے! اور گھر کنبے کے نام سے تو وہ واقف بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ضرورت بس ابلے ہوئے چاولوں کی ایک رکابی ہے یا کبھی کبھار افیون کے دو کش!

اس رکشا والے کے ڈالر کی کہانی ابھی ختم نہ سمجھئے۔ اُسے ابھی ایک اور شخص سے معاملہ کرنا ہے، اور یہ شخص امریکہ کا مہاجن یعنی بنک کا مالک ہے۔ جو ہنڈی کے بٹّے اور چاندی کے بھاؤ کا سٹّہ کھیلتا رہتا ہے۔ امریکہ کے کسی بلند محل میں بیٹھا ہوا منٹ منٹ کے بازار بھاؤ مشین پر پڑھتا رہتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے اپنے شنگھائی کے ایجنٹ کو تار دیکر بھاؤ اونچا نیچا کر دیتا ہے۔ امریکائی دلال، چینی مترجم اور بمبئی کے یہودی، چین میں اس کے گرگے ہیں۔ پرچے بدلے جاتے ہیں، رجسٹروں میں اندراج ہوتا ہے۔ اور غریب رکشا والے کے بچے ہوئے دس فیصدی پانچ ہی فیصدی رہ جاتے ہیں! باقی پانچ امریکائی بنک اپنے حصہ داروں کو بانٹتا ہے، اور حصوں کا یہ نفع اسّی فیصدی ہوتا ہے ــــ نوآبادی کے کسی بنک کیلئے اس سے کم نفع تقسیم کرنا ذلت کی بات ہے!

پہلے نہاں رکشا قلی اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کو [illegible] ہو جا[illegible]

دیکھتا ہے تو زناشاش کے پاؤں توڑ دیتی ہے۔ جو اس آدم گھوڑے کو پانچ چھ برس سے زیادہ نہیں چلنے دیتی۔ اس پانچ چھ برس کے اندر اسے ایک رکابی بھات تو ضرور ہی چاہیئے مگر جب اس کے پانچ فیصدی بھات کی رکابی نہیں خرید سکتے تو وہ ان کا وزن ہتیلی پر جا پٹختا ہوا چانڈو خانے میں داخل ہو جاتا ہے۔

میں اس عظیم الشان ہال میں بیٹھا جب رکشا والے کے دھیان سے چونکتا ہوں تو اپنے نیدسے ہات والیکو دیکھتا ہوں۔ یہ ایک امریکائی بنک کا ڈائریکٹر ہے جو سر جھکائے اعلان آزادی کا منتظر ہے!

کونسل نے اپنا چشمہ لگا لیا ہے۔ اسے پھر کھانسی اٹھتی ہے۔ بہت ہلکی اور ضابطے کی کھانسی! جیپوں کے وہ لڑکے بھی کھانستے ہیں جو امریکا اور انگلستان کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ لڑکے میل اور گندگی کے اندھیرے میں گلا گھونٹنے والی گرمی کے اندر کپڑے کے بدیسی ملوں میں کام کرتے ہیں۔ اور روئی کے ریشے ان کے حلق اور ناک سے اندر پہونچتے رہتے ہیں۔ روئی کی یہ گرد اُن کے پھیپڑوں پر جم جاتی ہے! ہاں یہ لڑکے بھی کھانستے ہیں۔ اُن کے سینوں میں ہنڈیا سی پکتی رہتی ہے۔ کھدکتی ہوئی سُنائی دیتی ہے! اُن کے گالوں پر ایک تپتی ہوئی سی دمک ہوتی ہے۔ ان کے دیدے باہر نکل پڑنا چاہتے ہیں۔ اور اُن کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ٹھیری رہتی ہیں۔ وہ جب کھانستے ہیں تو کھکار میں روئی کے ریشے نکلتے ہیں! اور بالآخر ان پر کھانسی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک دن بے حال ہو کر گر جاتے ہیں!

کپڑے کے مل میں کام کرنیوالا یہ لڑکا شام کے چھ بجے سے صبح کے آٹھ بجے تک روئی صاف کرتا ہے اور اُس کے بدلے میں نو فیصدی گھر لیجاتا ہے۔ اس رقم سے پاؤ بھر چاول خریدے جاسکتے ہیں۔ یہ پاؤ بھر چاول تو اس کے چھوٹے بھائی بہن کے پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں!

مگر اس لڑکے کی کہانی یہی یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ نیویارک کے بہت اونچے دفتر میں بیٹھا ہوا ایک بیوپاری ایک تار بھیجکر چین کا سارا چاول خرید کر ساور لاد دیتا ہے۔ اور پھر سب گاؤں سے گھٹیا قسم کا چاول شنگھائی لاتا اور اچھے چاول سے چار فیصدی فی پونڈ مہنگا بیچتا ہے۔ سنیچر کی صبح کو جب ایک لڑکا چاول خریدنے آتا ہے تو معمول سے آدھا پونڈ چاول کم پاتا ہے۔ وہ بقال کی صورت دیکھتا اور سُنتا ہے کہ بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ لڑکا یہ سُنتا اور صبر کر لیتا ہے کہ چھوٹے بھائی بہن نکل ہی تو [illegible]

میں پھر اپنے بائیں ہاتھ والوں کو دیکھتا ہوں۔ ایک جلیبی گھوڑی کے مل مالک اور ایک دساور لادنے والی کمپنی کے ایجنٹ پر میری نظر پڑتی ہے! یہ دونوں یانکی ( ) فراکوٹ پہنے، سر جھکائے نہایت عقیدت سے آزادی کا اعلان سُن رہے ہیں! کونسل اونچی اور صاف آواز میں پڑھ رہا ہے:۔

"انسانی معاملات کی دنیا میں ایک قوم کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اُن سیاسی بندھنوں کو توڑ کر جو اُسے دوسری قوم کا پابند بنائے ہوں، دنیا کی دوسری طاقتوں کی طرح برابر کا درجہ اور مرتبہ حاصل کرے۔ جو خدا اور فطرت کے قانون کے مطابق اس کا حق ہے!"

اس کے بعد وہ کونسل ان بنیادی حقوق کی فہرست پڑھتا ہے جسے سُنکر انسانی آزادی کے سپاہیوں کی کئی نسلوں کے دلوں کی حرکت تیز ہو ہو گئی ہے! مگر اس کونسل کے لہجے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی ہے جس سے معلوم ہو کہ اسکے جذبات بھی متاثر ہیں۔ یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ اسے کسی قسم کی غیرت کا احساس ہے۔ وہ بس اس طرح پڑھے جا رہا ہے۔ جیسے کھانوں کی فہرست یا شیر بازار کا بلیٹن یا ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھ رہا ہے! وہ آگے پڑھتا ہے:۔

۱۴

"ہم اس صداقت کو مانتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو برابر کا پیدا کیا ہے اور ان کو مساوی طور پر بعض حقوق دئے ہیں جو ان سے چھینے نہیں جاسکتے۔ کیونکہ یہ بنیادی حقوق ہی انسانی زندگی کے ہم معنی ہیں! آزادی اور مسرت کی تلاش انسان کا حق ہے۔ اور انسانی جماعتوں میں ان حقوق کو ہی حاصل کرنے کیلئے حکومت قائم کی جاتی ہے، اور ایسی حکومت کے جائز اختیارات کا منبع یا سوتا اُن لوگوں کی رضامندی ہے جن پر کہ حکومت کی جائے! مگر جب کوئی حکومت ان حقوق کے حاصل کرنے میں سدِّراہ ہو یا ان حقوق کو پامال کرے تو اس ملک والوں کو حق حاصل ہوتا ہے کہ ایسی حکومت کو ختم کرکے دوسری حکومت قائم کرلیں، اور اس حکومت کی بناء ایسے اصول پر رکھیں اور اس کے اختیارات کو اس صورت میں قرار دیں جن لوگوں کی حفاظت اور مسرت کیلئے مناسب ترین معلوم ہوں!"

"جو لوگوں کی حفاظت اور مسرت کیلئے مناسب ترین معلوم ہوں"!

اس فقرے کو سُن کر میری نظر سامنے ایک شخص پر پڑتی ہے جو چست خاکی وردی پہنے اور براؤن چمڑے کی چوڑی پیٹی لگائے "اٹینشن" کھڑا ہے۔ اس کا نام کپتان [illegible] ہے۔ اور یہ شنگھائی کی پولیس [illegible] کا کپتان ہے۔ [illegible]

یہ جس دوکت کھڑا ہے۔ جیسے اعلان آزادی نے اس پر جادو کردیا ہے! یہ کپتان انھیں لوگوں کی اولاد ہے۔ جنھوں نے ماسوشیٹ ملیشیا کے نام سے لکسنگٹن میں انگریزوں سے آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔

"اس ملک کے رہنے والوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ ایسی حکومت کو ختم کرکے دوسری حکومت بنالیں!"

سنہ ۱۹۲۰ کی ۰ ہر مئی کو انسپکٹر ایوانسن کے تھانے کے چاروں طرف اسی کپتان رائٹ نے پہرہ لگایا تھا۔ ایوانسن نے حکم دیا اور رائٹ نے تعمیل کی! نہتے مزدوروں کا قتل عام ہوا ــــ نوجوان طلبا کو بے دریغ قتل کیا گیا! اور یہ اس لئے ہوا کہ امریکائی ڈالر چین میں داخلہ چاہتا تھا اور داخل ہونے کیلئے اسے سنگینوں کی مدد کی ضرورت تھی!

کپتان رائٹ ان لوگوں میں سے ہے جو چین میں "کھلا دروازہ" یعنے بے روک ٹوک داخلے کی پالیسی چاہتے ہیں۔ اور یقیناً کپتان رائٹ "خاص رعایتوں" کے بھی خلاف ہے۔ مگر ڈالر! ڈالر کا مطالبہ ہے کہ اس کا راستہ صاف رہے! اسی لئے کپتان رائٹ نے پہلے دن چھیالیس چینی مزدوروں کو شنگھائی کی سڑکوں پر سلایا اور دوسرے دن بینیٹو کو کھیت رکھا اور ڈھائی سو کو زخمی کرکے ڈالر کا راستہ صاف کردیا!

تحقیقاتی کمیٹی بیٹھی اور ایوانسن سے سوال کیا گیا:۔

"تمہارے خیال میں دو ہزار آدمیوں کی بھیڑ کو منتشر ہو جانے کے لئے دس سیکنڈ کا وقت کافی تھا؟"

"نہیں ــ میں سمجھتا ہوں یہ بات ناممکن تھی!"

"پھر بھی تم نے گولی چلانے کا حکم دیدیا؟"

"ہاں!"

اس تحقیقات کے بعد ایوانسن کو "بہادری" کا تمغہ دیئے جانے کی سفارش ہوئی اور ایکو گیارہ بھاگتے ہوئے چینیوں کی پیٹھوں اور پہلوؤں نے اس "بہادری" پر ٹھٹھا مارا! کپتان رائٹ کو اچھے لفظوں میں ذکر کئے جانے پر قناعت کرلینا پڑی۔ کیونکہ اس سے زیادہ پر شہرت ہوجاتی اور محتاط امریکائی کو یہ بات بھاتی نہیں ہے!

میں حیرانی میں مبتلا ہوں کہ کپتان رائٹ جو اسوقت آزادی کا اعلان سُن رہا ہے۔ کیا اس کے خیال میں سنہ ۱۹۲۰ کا یہ قتل عام بھی سچ ہو کونسل آگے پڑھتا ہے:۔

"اس لئے ہم متحدہ ریاستہائے امریکا کے نمائندے جو مل کر کانگریس میں یہاں جمع ہیں۔ "دنیا کے سب سے بڑے جج" سے اپنے نظام کی کامیابی کیلئے دعا کرتے ہیں اور نئی ریاستوں کے باشندوں کے نام پر اعلان کرتے ہیں کہ یہ متحدہ ریاستیں آزاد و خودمختار ریاستیں ہیں اور آزاد و خودمختار رہنا ان کا حق ہے! یہ ریاستیں آجکی تاریخ سے ان تمام معاہدوں سے بری ہیں جو تاج برطانیہ کیلئے گئے تھے۔ اور برطانیہ عظمیٰ سے اب ان ریاستوں کا کوئی سیاسی رشتہ باقی نہیں رہا!"

اعلان کے آخری الفاظ پیتلی بینڈ باجے کی بلند آوازوں میں گم ہوجاتے ہیں۔ ہر آدمی اطمینان کی سانس لیتا ہے اور سب برآمدے میں آجاتے ہیں۔ میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا منگولیا کے درختوں کی پتیوں کو ہوا سے اٹھکیلیاں کرتے دیکھنے لگتا ہوں۔ ان درختوں کے پرے خلیج کے زمردیں پانی کے کنارے، فرانسیسی کونسل خانے کی عمارت نظر آرہی ہے۔ عمارت کے اوپر فرانسیسی ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ جو اصل میں تو فرانسیسی نیشنل گارڈ کا پرچم تھا۔ مگر اب شیر بازار کے دلالوں کی جمہوریت کا نشان ہے!

جھنڈے کے سُرخ اور نیلے رنگ ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ شاید ان رنگوں میں کوئی کشش ہے کہ ایک چیل منڈلاتی اور پھر باڈے کی لکڑی کے سرے پر بیٹھ جاتی ہے۔ خموش اور شاہانہ انداز سے بیٹھی ہوئی ہے!

میں اس تماشے میں کھویا ہوا ہوں کہ کوئی شخص میرے شانے کو تھپ تھپاتا ہے۔ یہ موسیو رینو ایک فرانسیسی اخبار نویس ہے۔ اس کا چہرہ تمتایا ہوا ہے۔ ہال کے سوانگ نے اسے متاثر کردیا ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگتا ہے۔

"امریکا کا اعلان آزادی ہمارے اعلان حقوق کا باپ ہے۔ سب انسان برابر ہیں اور آزاد رہنے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ سماجی مرتبے کا فرق عام بہبود کے سوا کسی دوسری وجہ سے جائز نہیں ہوسکتا!"

موسیو رینو شاید تعطیل کی فرصت برقرار رکھنے کیلئے مجھ سے بے تکلفی کا برتاؤ اور خوش کن باتیں کرنا چاہتا ہے مگر میں اس حال میں نہیں ہوں۔ میں اسے انگلی کے اشارے سے فرانسیسی جھنڈا دکھاتا ہوں۔

"وہ دیکھو، موسیو رینو، تمہارے جھنڈے پر چیل نے کس طرح قبضہ جمالیا ہے[1]"

---

[1] یہ امن شکوں کا نتیجہ نکلنے میں چودہ سال لگے اور سنہ ... میں ... نے

وہ بجھے سگار پیل کرتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

"محسیو، آپ غلطی پر ہیں، آپ کو شاید معلوم نہیں۔ ــــ فرانس کے پرچم کی علامت آزگالی (Gallic) مرغا ہے!

میں سگار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر کہتا ہوں۔

لیکن موسیو رینو گالی مرغا کا زمانہ تو بیت گیا۔ تاریخ میں ایک ایسا وقت ضرور آیا جب فرانس نے دنیا کو تخلیقی محنت کا سبق دیا، دنیا کو جدو جہد کیلئے بیدار کیا اور لُٹے ڈراؤنے خوابوں سے نجات دلائی۔ مگر اب تو فرانس ایک شکار ہو جانیوالی چڑیاسے زیادہ نہیں ہے۔ اب وہ اس بیرحم جنگل اور ظالم..... کاشکار ہے جو غریبوں کو پکڑ کر چیر پھاڑ ڈالتا ہے!"

میرے اس کہنے سے موسیو رینو بہت سنجیدہ بنجاتا اور کہتا ہے۔

"مساوات، موسیو برابر والوں ہی میں قائم ہو سکتی ہے۔ شاید آپ نے نوآبادیوں میں بڑی جمہوریتوں کے فرزندوں کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی ہے۔ مگر یہ نہ بھولئے موسیو کہ جمہوریتوں کے یہ فرزند دیسی وحشیوں کی نفرت کا موضوع ہوتے اور اپنے بچاؤ پر مجبور ہو کر یہ رویّہ اختیار کرتے ہیں! امریکا یا فرانس میں رہ کر آپکی رائے دوسری ہوگی، موسیو!"

میں اس کے جواب میں اسے بتاتا ہوں۔

"موسیو، میں امریکا گیا تو نہیں مگر وہاں کے کاشتکاروں کا حال میں نے سُنا ہے۔ جلوس اور مظاہروں پر زہریلی گیس چھوڑی جانے کا بھی حال سُنا ہے۔ ووٹوں کی خرید وفروخت کا بھی حال سُنا ہے۔ تیل کے معاملے میں جنگل اور غریب کا حال بھی سُنا ہے۔ سرراہ حبشیوں کو درّے مارے جانے سے بھی واقف ہوں اور بجلی کی کرسی کا بھی علم ہے! اور موسیو، بندر کی عدالت، بھی جانتا ہوں۔ اور یہ بھی خبر ہے کہ اناج کا کباڑا (ایک شخص سارا غلّہ خرید لیتا ہے، ہو سکتا ہے! میں موسیو، (KU - KLU - KLAN) کا نام اور کام بھی جانتا ہوں اور میں نے یہ بھی پڑھا ہے۔ کہ رین بسیرے (Night Lodging) کے سامنے بیروزگاروں اور بےگھروں کی کتنی لمبی قطاریں کھڑی رہتی ہیں!

"میرا خیال تو موسیو یہ ہے کہ جتنا فاصلہ دشنگھائی کی مزدور آبادی، شاپی اور ہوٹل بلنگ میں ہے اتنا ہی فاصلہ ایونیو (نیویارک کے کروڑ پتیوں کا محلہ) اور غریب کوارٹروں میں ہے! اسلئے موسیو، جو قوم کسی دوسری قوم پر ظلم ڈھاتی اور اسے غلام بناتی ہے وہ آزاد رہ ہی نہیں سکتی!"

یہ بتانے کے لئے کہ زیادہ گفتگو بیکار ہے، موسیو رینو میرے پاس سے چل دیتے ہیں۔ مگر سامنے، فرانسیسی باؤنٹے پر وہ چیل اسی طرح قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ اس پر میرا خیال یونانی دیومالا کی اس کہانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں میٹور کی زبان سے چڑیوں کے اڑ جانے کو اُوڈی سِنّس کی موت کا شگون بتایا گیا ہے! ۳

(ماخوذ)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

دل کا اندھیرا

تنقیدِ حیات آرٹ، انسانیت اور ادیب کے موجودہ خون ریز و ماتمیش ماحول کی کامل و موثر تصویر کشی "دل کے اندھیرے" کی روشنی میں ثبات و حرکت کیساتھ نظر آتی ہے۔

یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے، اختر کا تخلیقی کارنامہ ہے، وہ دلّی اور رائے پور کے برابر نہ سہی مگر پیرس کو بہت کچھ جانتا ہے۔ سیاسی اور سماجی ارتقا کے گہوارہ میں اس کے شعور و وجدان، اور احساس و مشاہدہ نے کئی سال گذارے ہیں۔ وہ پیرس کے باشندوں، اسکے تہذیب و تمدن، اسکی گلیوں، سڑکوں ندیوں ـــ کل ماحول سے اتنا ہی گہرا خلوص رکھتا ہے جتنا ایک نسل و رنگ، اور وطن و قوم کے بندھنوں سے آزاد مخلص آرٹسٹ کو انسانیت کیساتھ ہو سکتا ہے۔ خاص کر انسانی اور تمدنی جمال کے مرکز فرانس کے ساتھ!

آپ دیکھیں گے، اس مختصری کہانی میں اخلاص و تاثر کی وہ روح پائی جاتی ہے جو فرانس سے تعلق رکھنے والے فرانسیسی ادیب ہی میں ہو سکتی ہے۔

کہانی کا مرکزی خیال، یورپ کی جنگ، اور اس کے بنیادی اقتصادی و سماجی اسباب ہیں، ان اسباب پر حکیمانہ تنقید کہانی کی جان ہے۔ اس کہانی میں ترقی پسند ادب کے تمام عناصر پورے توازن اور سلیقے کیساتھ اجاگر ہوئے ہیں، یہ گویا موجودہ ترقی پسند کہانی کا ایک آئیڈیل ہے جس میں خیالات اور ان کے اظہار و بیان کا کھوکھلا پن نہیں پایا جاتا۔ ساغر

جب ریل کی رفتار یک بیک سست پڑگئی اور کسی نے ہوا میں ایک نیلی قندیل کو جنبش دے کر زور سے "گار دلیت ـــ باری" کی صدا لگائی۔ تو آندرے چونک پڑا۔ کھڑکی سے اُس نے سر نکال کر دیکھا کہ ہر طرف اندھیرا گھُپ ہے۔ اور اُجالے کے نام پر بس برف کے وہ گالے ہیں جو لگاتار آسمان سے ٹپک رہے ہیں۔

آندرے کو یقین نہ آیا کہ یہ اس نورستان کا اسٹیشن ہے جسے پیرس کہتے ہیں مانا کہ جنگ کا زمانہ ہے۔ اسے یہ یاد دلانیکی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ وہ خود لڑائی کے میدان سے ہفتہ بھر کی چھٹی پر آرہا تھا۔ لیکن یہ سدا روشن شہر مسلسل تاریکی میں کس طرح زندہ تھا پھر آپ ہی آپ آندرے کو اپنی اس پڑوسی کا خیال آیا جو محبت کی طرح حسین تھی لیکن کئی سال بعد جب وہ اس سے دوچار ہوا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی جوانی ڈھل چکی تھی حسن پامال ہو چکا تھا۔ جھریاں چہرے پر زوال کی جھنڈی لہلہا رہی تھی۔ اپنے شہر کی خاموشی اور تاریکی کو دیکھ کر آندرے کو ویسا ہی جھٹکا لگا۔ اور وہ دیر تک دم بخود کھڑکی کا سہارا لئے کھڑا رہا ـــ مہینوں بندوق چھپائے دشمن کے مقابل کھڑے کھڑے بھی جو حقیقت اس پر عیاں نہ ہوئی تھی وہ اس اندھے اور اندھیرے شہر پر نگاہ پڑتے ہی واضح ہو گئی۔

ہاں یہ دراصل لڑائی تھی ـــ انسانوں کے دو قبیلوں کے درمیان جو ایک کھنچی ہوئی لکیر کے آرپار کھڑے اس گھڑی کے منتظر تھے جب انھیں ایک دوسرے کو قتل کرنیکا حکم ملیگا۔ اور ان میں سب سے زیادہ فرض شناس وہ ہوگا جو سب سے زیادہ آدمیوں کو مار ڈالے۔

آندرے کے ذہن میں پیرس کی تصویر کسی نفیس اور نازک یونانی مجسمہ کی صورت میں محفوظ تھی اور اب اسے محسوس ہوا کہ اس مجسمہ پر کسی نے سیاہ چادر ڈال دی ہے۔

ریل آہستہ آہستہ چلتی اور رکتی ہوئی دیر کے بعد پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہوئی۔ اسٹیشن پر اگر اندھیرا نہیں تو خاصا دھندلکا تھا۔ ادھر اُدھر بجلی کے چند قمقمے گہرے نیلے سرپوشوں میں منہ لپیٹے پڑے تھے۔ آنے جانے والی گاڑیوں کا کوئی وقت معین نہ تھا۔ جسے جب فرصت ملتی آجاتی۔ پھر بھی بڑے دن آرہے تھے، اور تھوڑے سے خوش نصیب سپاہیوں کو اس موقع پر گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ اُن کے عزیز یہ تو نہ جانتے تھے کہ وہ کب آئیں گے۔ اور اگر آئے بھی تو اندھیرے میں کس طرح پہچانے جائیں گے۔ پھر بھی وہ آس باندھے ہر گاڑی کی

[illegible] باہر جانے والے مسافروں کو تارے کی روشنی میں نہلا رہے تھے۔

آندرے اس بھیڑ میں گھس بیٹھ کر بمشکل باہر نکلا۔ مغلوج درختوں اور سپاٹ چھتوں پر برف تہ بہ تہ جم گئی تھی۔ سڑکوں کو صاف کرنے کا اس سال کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے برف کے تودے ہر طرف جمے تھے اور آنکھ چوکتے ہی راہگیر پھسل کر منہ کے بل گر پڑتے تھے۔

برف باری کا سلسلہ جاری تھا اور اسٹیشن کے علاقہ سے ہٹ کر ہر سو سناٹا سا تھا۔ پہلے تو اس کے جی میں آیا کہ کوئی سواری لے اور اپنے محلّے کی راہ پکڑے لیکن قریب سے سین ندی کی سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ وہ زیر لب اس کے بچپن کا فسانہ گنگنا رہی تھی۔ جب وہ کنارے دریا کے ایک گاؤں میں رہتا اور اسمیں بسر کرتا تھا۔ آندرے اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے اور کمبل کاندھے پر ڈالے ہوئے اس طرف چلا اور ریلنگ کی ایک بنچ پہ بیٹھ گیا۔

ندی کا پانی بے رنگ تھا اور اس پر برف کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ صدیوں کی داستان اس کے جگر پر مرقوم تھی اور آس پاس کے اندھیرے کو دیکھ کر اس پہ حیرانی اور اداسی کی کیفیت طاری تھی۔ ابھی کچھ مہینوں پہلے کی بات ہے جب سڑکوں اور عمارتوں سے رنگ برنگی کرنیں اسکی موجوں پہ تیرا کرتی تھیں۔

چاندنی راتوں میں بادبانی کشتیاں اسکی گود میں ناچتیں اور اسکے کنارے بے گھروں یا چاہنے والوں کا ہجوم سکون کی تلاش میں آ تا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو گیا۔ پھر بھی یہ لازوال دریا نیل دنیا سے واقف تھا۔ جس قوم کے قلب سے ہو کر اس کی راہ گذرتی تھی اُسے وہ روز اوّل سے جانتا تھا۔ اور بہتے بہتے جب اسکی تہ سے وہ خون کی بوندیں اوپر چھلک آئیں جو یہاں کے رہنے والوں کی تلواروں سے ٹپکی تھیں۔ تو دریا جوش میں آتا اور اس کا دھارا تیز ہو جاتا۔

آندرے بہتے ہوئے پانی کے تاثرات کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے بلے جسم کی مہک اسکی اپنی آواز کی لہک اسمیں سربستہ تھی۔ اور طبیعت کے بھاری پن کو جھٹک کر اس کے دل نے کہا۔ نہیں یہ شہر ابد الآباد تک قائم رہیگا۔ اسکی میر جوب دنگ سے ہوئی ہو لیکن اسکی بنیاد ایک خیال اور ایک خواب پہ رکھی گئی۔ اگر وہ آج بکھر کر ٹوٹ رہا ہے تو [illegible]۔

جب اسکی آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں تو آس پاس اور لوگ [illegible] ندی سے باتیں کرتے گئے تھے۔ وہ سب ٹن کے [illegible] اور ان کی بے زبانی میں ایک جہان غم

پنہاں تھا۔ دفعتاً آندرے کو اس مقدس ورثہ کی یاد آئی جس کی تکمیل کیلئے وہ یہاں آیا تھا۔ پیڑوں کے جھرمٹ میں اُس کے قدموں کے پاس ایک نیم جاں لاش پڑی ہے۔ اپنی ٹولی کے ساتھ وہ دشمن کی ٹوہ لینے نکلا تھا۔ جھاڑیوں میں کھلی ہوئی چاندنی کھربی پھیلی ہوئی۔ بہت دور افق کے پاس دشمن تاک لگائے بیٹھا ہے۔ دونوں چاہتے ہیں کہ موقع ملتے ہی ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں اور زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو کم سے کم عرصہ میں مار ڈالیں۔ ان کی ساری صلاحیتیں ہلاکت کے حربوں کے استعمال میں صرف ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو یہ اپنے ناخنوں کو بڑھا لیں اپنے دانتوں کو تیز کر لیں اور درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں۔ آندرے کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بندوق پر اس کی انگلی جنبش کرتی ہے۔ ایک گولی فضا کو چیر کر کسی نامعلوم انسان کے جسم میں بیٹھ جاتی ہے۔ وہ مر جاتا ہے۔ اسکے عزیزوں کے نام جنگ کے دیوتا کی طرف سے شکریہ کا پروانہ آتا ہے اور محلہ والے ان ننگے بھوکوں کو دیکھ کر ہمدردی سے سر ہلاتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ ملک و قوم کے لئے مصائب برداشت کر رہے ہیں۔

یہ نیم جاں لاش جس کی ہے اُسے وہ جانتا پہچانتا نہیں۔ وہ ابھی نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ارمانوں اور آرزوؤں کی دنیا بسی ہوئی امید اسکی ہونٹوں پر مسکراتی ہوئی۔ جب رات کو وہ گشت لگانے نکلے تو وہ چپکے چپکے اپنی باتیں سنانے لگا۔ پیرس میں فلاں مقام پر اسکی دوکان ہے۔ اندر وہ گھر والوں کے ساتھ رہتا ہے۔ گھر میں بوڑھی ماں اور نئی دولہن کے سوا کوئی نہیں۔ بڑے دنوں میں لمبے گھر جانیکی چھٹی ملے گی۔ کپتان نے اس کی درخواست پر سفارش کر دی ہے۔

اتنے میں ایک گولی اس کے سر پر لگتی ہے اور وہ گھڑی بھر تڑپ کر مر جاتا ہے اور مرتے مرتے وہ پُر حسرت نگاہوں سے اپنے نامعلوم ساتھی کو دیکھتا ہے اور وہ اُنکے پیغام کو سمجھ جاتا ہے۔ مرنے والے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے آندرے یہ سوچنے سے اپنے کو باز نہیں رکھ سکتا کہ موت جیسی قادر مطلق شے کیسی حقیر چیزوں میں رہتی ہے ۔ لوہے کے ذرّوں میں، زہریلے جراثیم میں اور زندگی کہاں رہتی ہے ایک ہچکی میں، سانس کے ایک جھٹکے میں۔

رات بھیگ رہی تھی ہوا سرد تر ہو گئی تھی آندرے اٹھ کر آگے چلنے لگا۔ اب بھی کئی درماندہ ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے ماضی کی روشنی اور حال کی تاریکی کو گھور رہے تھے۔ جب صبح ہو گی تو ان میں سے کئی اس ندی کی تہ میں سو رہے ہوں گے زندگی کے افکار و مصائب سے انھیں ہمیشہ کیلئے نجات مل جائیگی۔ ان کا گوشت [illegible]

کھا جائیں گی ۔۔۔ حیوان چھلیوں کو انسان کھا جائیگا۔

گرجوں اور عبادتگاہوں کے دروازے بند ــــــ صرف کھانے پینے اور ناچنے گانے کے ٹھکانے کھلے ہوئے ۔ ان کے اندر سے ہنسنے بولنے کی آواز آتی ہوئی ، لیکن آوازمیں ہذیان کی سی کیفیت ۔ لوگوں کی ہنسی میں وحشت کا انداز ہے۔ آندرے ایک کیفے میں داخل ہوا اور کونے کی ایک میز پر بیٹھ گیا ۔

یہ عورتیں اور یہ مرد سرسام کے مریضوں کی طرح کہرام مچا رہے ہیں۔ گویا یہ سب ایک پُرآشوب سیلاب سے بچنے کیلئے نوح کی کشتی پر بیٹھیں گے ۔ انھیں نہیں معلوم کہ اس کشتی کو کبھی کوئی ساحل ملے گا یا نہیں ۔ اور وہ سوچتے ہیں کہ آؤ کچھ ایسا کریں کہ زندگی اور موت کی یاد بھول جائے ــــــ

آندرے کو ہنگری کے اُس گاؤں کی یاد آئی جس کے چاروں طرف دشمنوں نے آگ لگا دی اور جب لوگوں کیلئے بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا تو وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے ۔ شراب کے گیلن کھول دئے گئے

باجوں نے موت کے رقص کا نغمہ چھیڑا ۔ سب مرد عورت متوالے ہوگئے۔ مرد و ایک دوسرے سے لپٹ کر پڑ گئے اور جب آگ انھیں جلانے آئی تو کسی کو اُس کی پرواہ نہ ہوئی ۔

۴۴

تہذیب و تمدن کے باوجود انسان وہی وحشی ہے ۔ جو ابتدائی عہد میں عورت اور چارے کی فراوانی سے خوش اور ان کی محرومی سے دکھی رہتا تھا ۔ آدم اور آدمی میں زبان اور ہاتھوں کی چند جنبشوں کا امتیاز ہے اور بس ۔

آندرے کے آگے لڑائی کے میدان کا نقشہ کھنچ گیا ۔ سپاہی وہاں کیچڑ سے لت پت خندق میں جیتے مرتے ہیں ۔ یہی ان کا گھر اور یہی ان کی قبر ہے ۔ جب شہروں کے رہنے والے سردی میں کوئلے اور رضائیوں کیلئے واویلا مچاتے ہیں ۔ چائے اور گوشت کی کمی کا رونا روتے ہیں تو یہ سپاہی کھلے ہوئے آسمان تلے برف کے بارے دبے ہوئے اس تار پہ کھڑے رہتے ہیں جو زندگی اور موت کے مابین سرحد قائم کرتا ہے ۔ وہ مذہب ، ملک ، قوم یا ملک کی خاطر لڑنے بھیجے جاتے ہیں اور ان بلند بانگ الفاظ کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ تھوڑے سے آدمیوں کے لئے شہنشاہیت تک بہت سی خوبصورت عورتوں اور طرح طرح کے کھانوں کے وسائل مہیا کئے جائیں ۔

آندرے کے ہونٹوں پر ایک تلخ تبسم آیا ۔ اور اس نے بیئر ورموتھ کے چوتھے گلاس کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا ۔ اور جب ان ملکوں کے پیشوا مر جاتے ہیں تو ان کا جسم شرک کھا جاتا ہے اور اس کو سے اندازہ لگتا ہے جیسے حیوان اور انسان سب ہی کھانے کے ہیں ۔

بیزاری اور تلخی کا طوفان سہتے ہوئے وہ باہر نکلا ۔ اس کے بے گناہ دوست نے اس لئے اپنی جان دی تھی اور وہ آئندہ چل کر خود بھی ایسے مارا جائیگا کہ کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی خواہشوں کی تکمیل کی جائے ۔ اور ان خواہشوں کا ماحصل اچھے کھانے کے بعد کی ایک پُرسکون ڈکار اور کسی عورت کے آغوش میں پُراطمینان خراٹوں کے سوا کیا ہے ۔

(۲)

دن چڑھ چکا تھا جب آندرے کی آنکھ کھلی ۔ مہینوں بعد وہ اپنی گہری نیند سویا تھا ۔ کھڑکی کا پردہ کھینچ کر اس نے زمین و آسمان کو دیکھا ۔ نیلے آکاش پر سورج جگمگا رہا تھا اور دھوپ جمی ہوئی برف پر چاندی لٹا رہی تھی ۔

آندرے تیار ہو کر اس پتہ پر چلا جہاں ایک بوڑھی ماں اور ایک دولھن اپنے پیارے کا انتظار کر رہی تھیں ۔ اور اُن جیسی کتنی عورتیں اپنے عزیزوں کی راہ شب و روز تکا کرتی ہیں ۔

آندرے اُس گھر سے جس قدر قریب ہوتا گیا اُس کے دل کی دھڑکن اتنی ہی تیز ہوتی گئی ۔ لڑائی کے میدان میں کئی بار رُک رُک کر بکٹ سے بکٹ مہم پر جانا پڑا تھا ۔ لیکن اب تک وہ کسی مہم میں اتنا ہراساں نہ ہوا تھا ۔ شدید سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا اور وہ اپنے رعشہ رعشہ میں کپکپی محسوس کرنے لگا ۔ راستہ میں ایک جگہ ٹھہر کر اُس نے شراب پی اور سوچنے لگا کہ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ وہ خط یا تار کے ذریعہ یہ خبر بھیجکر اپنی گلو خلاصی کرے ۔ لیکن اس کی جیب میں شادی کی وہ انگوٹھی ہے جو مرنے والے نے اپنی دولھن کو لوٹائی ہے ۔ اور چاندی کے ننھے سے چوکھٹے میں جڑی ہوئی حسین لڑکی کی تصویر جو ماں نے اپنے بیٹے کیساتھ کر دی تھی ۔ ان یادگاروں کو بھی تو ان سوگوار عورتوں کے سپرد کرنا ہے ۔ آندرے نے اپنے بٹوے کو کھول کر دیکھا اور دیکھتے ہی ایک اُس کی نگاہ اس لوہے کی زنجیر پر پڑی جو ہر سپاہی کی کلائی سے بندھی ہوتی تھی ۔ اس میں اس کا نام اور اس کی فوج کا نشان کھدا ہوا تھا ۔ جب کوئی مر جاتا تو یہ زنجیر اُس کے گھر بھیجدی جاتی ۔ آندرے کی جیب میں مرنے والے کی زنجیر بھی ہوئی تھی ۔ تینوں چیزوں کو دوہاں چھوڑ کے وہ سوچنے لگا کہ اپنی موت سے زیادہ اندوہناک اور کسی دوسرے کی موت کی اطلاع

اُس کے قریب ٹھہر کر بچا تا ہے۔ اور اُسے ان لڑکوں کی بیباکی پر حیرت ہوتی جو اشتوں کے پاس بیٹھ کر اطمینان سے پڑھا کرتے اور بیاپر چھتے ہیں۔ اپنی حالت دیکھ کر آندرے کو ایسے لوگوں پر نیچی کا شبہ ہونے لگا۔ کیونکہ موت کا پیچھا کرنا سکون صرف اطلاع کا طلبگار ہے۔

اسے اپنی قسمت پر بھروسہ نہیں رہا۔ اسکی بیزاری اور تلخی ہم جن کر گھل گئی۔ ان عورتوں نے تو زندگی سے کچھ زیادہ نہیں مانگا تھا۔ دونوں کو سہارا ایک ہو تھا۔ جس نے دانستہ کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ ایک چھوٹی سی دوکان میں وہ تینوں اخبار اور کتابیں بیچا کرتے تھے۔ اتنے میں ایک روز ان کے ملک پر ایک دوسرا ملک حملہ کر دیتا ہے۔ وہاں کا ایک ویسا ہی دو کا نردار دور بیٹھ کر ہوا میں بندوق چلاتا ہے۔ اور اس کی گولی کسی کو مار ڈالتی ہے۔ اور اب یہ بوڑھی ماں کس کے برتے پر جئے گی۔ یہ پریم پیاسی عورت کس کا سہارا لے گی۔

آندرے اپنی قسمت کو سراہتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں وہ کسی کو نہیں چاہتا۔ اور کوئی اسکی پرواہ نہیں کرتا۔ جب ہر طرف امن تھا تو یہ بے معنی زندگی اس کے لئے وبال تھی لیکن آج یہ سب سے بڑی برکت ہے۔ کوئی اسکا انتظار نہیں کرے گا۔ کوئی اس کے مرجانے پر آنسو نہیں بہائیگا — اور یہ صورتِ حال عین موت کے مطابق سکون پرور ہے۔

وہ دوکان میں داخل ہوتا ہے۔ کونے میں کرسی پر ایک بوڑھی اونی مفلر بُن رہی ہے۔ اندر کمرے سے برتن دھلنے کی آواز آ رہی ہے۔ وہاں شاید اُسکی بہو ہے۔ آندرے اندر جاکر ٹھٹک جاتا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے وہ الماری سے کتابیں نکال کر دیکھنے لگتا ہے۔

بوڑھی اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور گاہک کو سلام کرتی ہے۔ کیسی سہانی صبح ہے لیکن میلی کی شہادت کے دن موسم بہت اداس تھا۔ ...... آپ کو کیسی کتابوں کی ضرورت ہے۔ — اگر میں غلطی نہیں کرتی ہوں تو آپ محاذ سے چھٹی پر آئے ہیں۔ جی! میرا قیاس ٹھیک ہے نا! تو پھر آپ ایسی کتابیں پڑھئے جن سے امید اور تسکین ملے۔ جیسی کی زندگی یا سال فرانسس کے پھول؟

مجھے خوشی ہے۔ اسے اتفاق ہے کہ اس کا بیٹا بھی آجکل میں آتا ہو گا [illegible] [illegible] ہوتی ہے۔ وہ گاہک بہت منا[illegible] [illegible] [illegible] — [illegible]

لیکن ایک دن بوڑھی کا پھر خود بخود سے کمال اختلاف ہے۔ جب یہ لڑائی ختم ہو جائیگی تو وہ سب کام سنبھال لے گا۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ کاش آپ جانتے ہوتے کہ وہ کتنا محنتی اور سعادت مند ہے۔ آپ نے کہاں دیکھا ہو گا۔ اونچا قد، بھوری نیلی آنکھیں، سنہرے بال۔ وہ بھی آج کل میں وطن کی چھٹی پر آنیوالا ہے۔ میں تو اُس کے لئے مفلر کے سوا کچھ نہ بُن سکی۔ لیکن اُس کی بہو نے اوہ، اگر آپ اُس کے بنائے ہوئے سوئٹر اور موزوں کو دیکھیں —۔

آندرے کا دل بھر آیا۔ مدت کے بعد اُس کی آنکھوں کو آنسوؤں کی تری محسوس ہوئی۔ وہ چپ یہ سب سنتا رہا اور پھر پیٹھ پھیر کر کسی الماری سے کتابیں نکالنے لگا۔ بھرائے ہوئے گلے سے وہ صرف یہ کہہ سکا۔

ان کی قیمت؟

جب بڑھیا نوٹ کا نمبر یہ دیکھنے میں مصروف تھی کی طرف گئی۔ آندرے نے فوراً جیب سے وہ تینوں چیزیں نکال کر میز کے کونے پر رکھ دیں۔ آنکھیں پھیر کر اُس نے الوداع۔ گویا ایک گھبراہٹ ہوئی اور فوراً دوکان کے باہر نکل گیا۔ وہیں لپکتا ہوا پاس کی گلی میں گھس گیا۔ گویا کسی جرم کا خطاوار ہو۔ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے وہ اندھا دھند بھاگتا گیا۔ اور اس کا دل ڈرا کہ اگر وہ بے کس عورتیں اُس کا دامن تھام کر زندگی کی بھیک مانگ بیٹھیں تو وہ کیا دیگا۔

آسمان کا نیلاپن اور نکھر گیا تھا۔ سورج کی تابانی زیادہ کھل گئی تھی۔ لیکن دلوں میں اندھیرا تھا۔ اور اندھیرے میں مایوسی تھی۔ ہر مکان کے در و دالان سے ایک خاموش دُعا۔ ایک بے زبان التجا اٹھتی اور اُس طرف دیکھتی جہاں انسانوں کے غول زندگی کے حکم پر مرنے اور مارنے کیلئے جمع تھے۔

بچے آندرے کی طرف انگلی اٹھا کر آپس میں کچھ کہنے لگتے۔ شاید ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کے باپ یا بھائی اسی سپاہی کی طرح لڑ رہے ہیں۔ سپاہی اور لڑائی کے کھیل وہ آپس میں رچاتے ہیں اور حسرت سے سوچتے ہیں کہ کاش ہم بڑے ہوتے اور سپاہی بن کر لڑتے۔ اور آندرے یہ سوچ کر کانپ جاتا ہے کہ ایک نئی نسل وجود میں آ رہی ہے جس کی سب سے بڑی تمنا قتل و غارتگری ہے۔ لیکن مائیں اسے دیکھ کر پسیج جاتی ہیں اور سہم کر آپس میں کہتی ہیں کہ بہت دور اسی جوان سال کی طرح ان کے بیٹے بھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ جوان عورتیں اسے [illegible] نظروں سے گھورتی ہیں۔ اور انہیں اپنی جدائی یاد آتا ہے [illegible] — گلیوں کا سلسلہ ایک پارک پر جاکر ختم ہوتا ہے۔

آندرے جھک کر ایک بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ دو چار دن میں وہ اپنی فوج کے ساتھ ہوگا۔ اور پھر اُسے شاید کبھی اتنی فرصت نہ ملے کہ یوں تنہا بیٹھ کر آسمان و زمین کو اس نگاہ سے دیکھ سکے۔

یہ کائنات کتنی عجیب ہے! اور کس قدر پُر اسرار۔ انسان اس طلسم کے دروازہ پر کھڑا ہو کر قیامت تک دستک دیتا رہیگا۔ اور قیامت کے دن جب یہ دروازہ ٹوٹے گا تو یہ نظر آئیگا کہ خون کا ایک دریا ہے جس کے بیچ و بیچ ہڈیوں کا محل بنا ہوا ہے اور اسمیں وہ معبود رہتا ہے جس کی پرستش فریب خوردہ انسانیت ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔

بھری دوپہر میں کلیسہ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ بس ایسے بج رہا ہو کہ ہمیشہ سے بجتا آیا ہے۔ بجانیوالوں اور سننے والوں کو کچھ نہیں معلوم کہ اس آواز میں خوشی ہے یا غم امید ہے یا مایوسی۔

آندرے دیر کے بعد اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ اسے کہیں نہیں جانا ہے۔ اُسے کچھ نہیں کرنا ہے۔ اُسے سب کچھ بھول جانا ہے۔ جب زندگی کا مقصد موت کے سوا کچھ نہیں تو اُس کے مرحلوں پر کیوں سر کھپایا جائے۔ چلتے چلتے وہ کلیسہ کے سامنے پہنچتا ہے۔ اور بلا ارادہ اُس کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ ہلکا ہلکا سا اندھیرا گہری گہری سی خاموشی۔ آرگن ایک متین لیکن دل سوز نغمہ بجا رہا ہے۔ یہاں وہاں سوگوار عبادت گذار گھٹنے ٹیکے اور ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ جگہ جگہ عیسیٰ اور مریم کی شبیہوں کے آگے موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ اگر اور عود کی خوشبو سے ہوا بوجھل تھی۔

تھوڑی دیر اس فضا میں بیٹھ کر آندرے کو محسوس ہوا کہ انسان کے میدان جنگ عبادت گاہ و زیارت گاہ ہے۔ کیونکہ یہاں آدمی اپنے مصائب کو بھول جانیکا۔ درس لیتا ہے۔ ان سے لڑنے کا نہیں۔ عبادت کا گلو رو غلام سنگھا کر ظلم انسانیت پر نشتر زنی کیا کرتا ہے۔

آندرے کو ان انسانوں پر رحم آیا۔ یہ پیاسے ہیں اور زندگی کے صحرا میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اگر سراب میں پانی کی جھلک دیکھ کر یہ فریب کھا جائیں تو کیا عجب۔

اتنے میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہی بوڑھی لاٹھی ٹیکتے ہوئے اندر آ رہی ہے انکی بہو سیاہ نقاب اور سیاہ لبادہ میں ملبوس اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے۔ دونوں کے سر جھکے ہوئے ہیں۔ دو کمزور درخت جنہیں پالا مار گیا ہے۔ دونوں کونہ کے ایک شہ نشیں کے مقابل جا کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

آندرے دم بخود ہے۔ وہ مجرم کی طرح اُن دکھیاریوں کو دیکھ رہا ہے۔ کیوں کر وہ یہ منحوس خبر انھیں لایا۔ کون زیادہ قابلِ ملامت ہے — موت کا فرشتہ یا موت کی خبر دینے والا؟

یک بیک کئی لوگ چیخ پڑتے ہیں اور قبل اسکے کہ آندرے کی سمجھ میں کچھ آئے وہ اپنے کو اُس بوڑھی کے پاس پاتا ہے۔ بوڑھی نہ دُعا مانگ رہی ہے، نہ رو رہی ہے نہ اُس نے سجدہ کیا ہے، نہ فریاد کی ہے۔ اُس نے مریم کے بُت کے مُنہ پر تھوک دیا ہے، اور یہ تھوک خدا کی ماں کے گالوں پر بہہ رہا ہے۔

آندرے بوڑھی کو ایک ہاتھ سے لپیٹ لیتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں رومال لیکر بُت کا مُنہ صاف کرنے لگتا ہے۔

نیاگل

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

بابتہ فروری ۱۹۴۲ء

یادِ ماضی کا پیغام

وہ کہتے ہیں کہ میری لغزشوں کو بھول جاؤ تم　　کتابِ عاشقی کا باب اک نیا سناؤ تم
بہار کی دھنوں میں دُکھ کا ایک نیا راگ گاؤ تم　　سرشکِ درد بادلوں کے ساتھ پھر بہاؤ تم
غبارِ قلب دھو کے کیفِ عشق ساتھ لاؤ تم
وہ کہتے ہیں کہ میری لغزشوں کو بھول جاؤ تم

افق پہ تیرتی ہیں مست و مشکبار بدلیاں　　بنی ہوئی ہیں موجِ نکہتِ بہار بدلیاں
شراب ریز بدلیاں، شباب کار بدلیاں　　بُری طرح سے کر رہی ہیں بیقرار بدلیاں
سکونِ دل کی بدلیوں کو اپنے ساتھ لاؤ تم

پیام دے رہے ہیں گل مہک مہک کے عشق کا　　سُنا رہی ہے نغمہ شاخِ گل مہک کے عشق کا
طیور گیت گا رہے ہیں پھر چہک کے عشق کا　　بجا رہا ہے ساز میکدہ بہک کے عشق کا
شرابِ عیش ایک بار آ کے پھر لنڈھاؤ تم

بہار کی لطافتوں میں کھو گئی ہیں ہستیاں　　ہر اک طرف ہواؤں میں گھلی ہوئی ہیں مستیاں
مسرتوں میں جذب ہو گئی ہیں دل کی پستیاں　　مصیبتوں کی محو ہو گئی ہیں چیرہ دستیاں
بُرے دنوں کی یاد دل میں بھول کر نہ لاؤ تم

جواں ہے نو بہار و لالہ زار و جوئے بار بھی　　جواں ہے گلستاں بھی دشت اور کوہسار بھی
جواں ہیں پست ہمتیں جواں ہے قلبِ زار بھی　　جواں ہیں حسرتیں جواں ہے عشقِ بیقرار بھی
جوانی ہنس رہی ہے اس سمے میں کیوں نہ آؤ تم

زمردیں چمن کی رنگتوں کے ساتھ آؤ تم　　بہار کی لطیف نزہتوں کے ساتھ آؤ تم
شفق کی ارغوانی طلعتوں کے ساتھ آؤ تم　　گھٹا کی مشکبو لطافتوں کے ساتھ آؤ تم
گلوں کی نشہ ریز نکہتوں کے ساتھ آؤ تم

پپیہے کی پکار پھر نہ قلب کو رجھائے گی　　نہ کوئلوں کی کوک دل میں ہوک سی اٹھائیگی
سنا نہ دل کی ہوک پھر یہ لطف ساتھ لائیگی　　دلوں کی چھیڑ چھاڑ پھر نہ یہ سماں دکھائے گی
بہار کی پھبن ہے محوِ رقص و نغمہ آؤ تم

[illegible] رہے گا پھر نہ یہ گلشن [illegible]　　نہ [illegible] مشکبار یہ فضا [illegible]

حیا

[illegible]

غلاموں کی دنیا

بے عمل، بے آب و تاب زندگی، بے ننگ و نام
آہ وہ دنیا جہاں کے رہنے والے ہوں غلام

جس کے انسانوں کو ننگِ عالمِ انساں کہیں
کہنے والے زندگی کا جس کو گورستاں کہیں

دیکھ ہے کیا صفحۂ عبرت غلاموں کا جہاں
سر بسر اک عالمِ ظلمت غلاموں کا جہاں

یہ وہ عالم ہے جہاں عشرت کی ارزانی نہ ڈھونڈ
عیش کوشی، عیش رانی، عیش سامانی نہ ڈھونڈ

رہنے والے اس زمیں کے مرکزِ آلام ہیں
یہ وہ صہبا نوش ہیں، جن کے شکستہ جام ہیں

کارگاہِ دہر میں تقدیر کے ہیٹے ہیں یہ
جن کی جنت چھن چلی آدم کے وہ بیٹے ہیں یہ

ان کو کیا معلوم کس صورت سے جینا چاہیئے
کس طرح بے منتِ اغیار جینا چاہیئے

ان کو کیا معلوم ہے ہستی کا نصب العین کیا
یہ جہاں کہتا ہے آزادی کسے، ہے چین کیا

ان کو کیا معلوم کیا ہے شیوۂ مردانِ کار
آدمی کیونکر بدل دیتے ہیں رنگِ روزگار

ان کو کیا معلوم کیا ہے عظمتِ خاکِ وطن
چاہتی ہے کیا فغانِ سینۂ چاکِ وطن

ان کو کیا معلوم کیا ہے منزلت انسان کی
یہ غلامی کو سمجھتے ہیں صفت انسان کی

ان کو کیا معلوم کیا ہوتا ہے احساسِ خودی
آدمیت کے لئے لازم ہے کیوں پاسِ خودی

ان کو کیا معلوم اس عالم کی آقائی ہے کیا
یہ سمجھتے ہی نہیں ہیبت ہے کیا رائی ہے کیا

ان کو کیا معلوم کیا ہیں پرچم و تخت و کلاہ
زندگانی ہے غلاموں کے تخیل میں گناہ

ان کو کیا معلوم یہ عالم بہارِ عیش ہے
ان کی دنیا ئے غلامی سوگوارِ عیش ہے

ان کو کیا معلوم کیا ہے رزم طوفانوں کے ساتھ
ان کو دیکھا ہی نہیں پرجوش طوفانوں کے ساتھ

زندگی ہے جس کی شکلِ موت اس عالم کو دیکھ
دیکھنے والے غلاموں کے جہانِ غم کو دیکھ

ہے بظاہر عالمِ زندہ مگر زندہ نہیں
اس کے سینے میں شرارِ زیست تابندہ نہیں

انتہائے خواب کے سانچے میں ہے ڈھالی ہوئی
ہے یہ دنیا موت کے آغوش میں پالی ہوئی

ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا نشانِ انقلاب
دور ہے اس سرزمیں سے کاروانِ انقلاب

گردشِ ایام کا کچھ زور چلتا ہی نہیں
حشر بھی آ جائے تو یہ عالم بدلتا ہی نہیں

[illegible] سنہ ۱۹۴۲ء

شام کی ظلمت کو اندازِ سحر آتا نہیں
آدمی اس سرزمیں پر ہے ہلاکِ بندگی
خواجگی کا تابعِ احکامِ انساں ہے یہاں
جانتا ہے بندگی کو نیک نامی الاماں
واہ ذہنیت یہ دُنیائے جہالت خیز کی
اس جہاں کے کاخ و کو میں شاہراہوں میں غلام
لب پہ خواب آور ترانے ہیں ارادے پست ہیں
جن کے آبا فخر تھے اس عالمِ ایجاد کے
ایک ہی عالم میں شیخ و برہمن پاتا ہوں میں
وہ غلامی جس سے ہو بے نورہستی کا چراغ
وہ غلامی خودشناسی سے جو بیگانہ کرے
وہ غلامی ننگِ انساں کا عدو جس کو کہیں
وہ غلامی واہ ہو تبدیل جس سے آہ میں
وہ غلامی جس سے ہو ہر نشۂ ہستی ہرن
وہ غلامی جو مٹا دے ہر نمایاں شان کو
وہ غلامی جو نشاطِ زندگانی چھین لے
وہ غلامی جس سے بہرِ منزلت روکنا پڑے
شہریارِ دہر کا اندازِ خواری ہائے ہائے
خاک میں غلطاں ہو فرقِ آدمیت کی کلاہ

یہ وہ دُنیا ہے جسے کوئی ہُنر آتا نہیں
یعنی فرضِ زندگی ہے انہماکِ زندگی
بندگی کہتے ہیں جس کو اصلِ ایماں ہے یہاں
الاماں اے جہل دنیائے غلامی الاماں
کوہکن کو فکر ہے خوشنودیٔ پرویز کی
مسجدوں میں، مندروں میں، خانقاہوں میں غلام
اس جہاں کے نغمہ پیراؤ سخن ور مست ہیں
اُن کے بچوں کی گذر ٹکڑوں پہ ہے صیّاد کے
کوئی ملّت ہو غلامی کا چلن پاتا ہوں میں
ہوش جس کے نام سے رخصت ہو مختل ہو دماغ
آپ کو کھو کر طوافِ شمع پروانہ کرے
دشمنِ ناموسِ انساں کا عدو جس کو کہیں
فرق جو باقی نہ رکھے ضیغم و روباہ میں
گُل سے ہو نکہت گریزاں روح سے خالی ہو تن
قوم کا تکیہ بنا دے قوم کے ایوان کو
ملّتِ محکوم سے ہمّت، جوانی چھین لے
حکمراں کے سامنے محکوم کو جُھکنا پڑے
ابنِ آدم اور یہ خدمت شعاری ہائے ہائے
اے زمیں تاریک ہو، اے آسماں ہو جا سیاہ

نہال سیوہاروی

بہاری رات

آ مری جان جلد آ بس یہی رُت ہے پیار کی
دل میں کھلی ہے چاندنی رات بھی ہے بہار کی

(۱)

چشمۂ عشق بھی اگر — موج زناں رہے مدام
پہنچے نہ کچھ اسے ضرر — از گذرِ صباح و شام
پھر تو ضرور ہر بشر — بن کے رہے غلامِ عشق
اپنی حیات و جاہ و زر — وقف کرے بہ نامِ عشق
ایک ہی رنگ پہ گر — سوزشِ اندروں نہیں
تاب و تپِ غمِ جگر — بے خبرِ سکوں نہیں

اس لئے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ بس یہی رُت ہے پیار کی

(۲)

جب ہوئے یار دو جدا — نالہ کناں و اشکبار
سمجھے کہ زخم وہ لگا — اب نہ بچے گی جانِ زار
جب گئے چند دن گزر — آپ قرار آگیا
جس پہ فدا تھی جاں۔ نظر — گر وہی یار آگیا
اب نہ وہ کیفِ جوش ہے — اب نہ وہ لب پہ آہ ہے
آتشِ دل خموش ہے — شوق بھی کم نگاہ ہے

اس لئے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ بس یہی رُت ہے پیار کی

(۳)

مل گئے دو حبیب جب — پڑھنے لگے وہ بابِ عشق
صبح و مسا و روز و شب — حفظ ہوئی کتابِ عشق
ہو گئی سیر جب ہوس — کرنے لگے وہ خونِ عشق
بن گیا آشیاں قفس — ختم ہوا جنونِ عشق
زیست کے سانحات میں — رہ نہ سکا خمارِ عشق
کشمکشِ حیات میں — خاک ہوئی بہارِ عشق

اس لئے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ بس یہی رت ہے پیار کی

(۴)

بنتے ہیں جو وفا شعار — کہتا ہوں اُن سے صاف صاف
قول کا اُن کے اعتبار — مجھ کو نہیں خطا معاف
ایک سے تا بہ زندگی — عشق بشر کی خو نہیں
ایک خدا کی بندگی — مذہب آرزو نہیں
شوق ہیں جب ہوس نہیں — پھر وہ نہیں عیارِ عشق
تاب کن قفس نہیں — طائرِ بے قرارِ عشق

اس لئے اے مری حیات — مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات — ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ بس یہی رُت ہے پیار کی
دل میں کھلی ہے چاندنی رات بھی ہے بہار کی

آنند نرائن مُلّا

مراجعت

ہو چکا دامنِ دل تار چلا آنے دے
اس قدر بھی نہ ہو بیزار چلا آنے دے

اپنی محفل میں پھر اکبار چلا آنے دے

تیری محفل کی بہاروں کو نہیں چھیڑوں گا
اپنے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہیں چھیڑونگا

اک کلی بھی مری نظروں سے نہیں ہانپے گی
مری آہوں سے تری شمع نہیں کانپے گی

کوئی آنسو مری پلکوں سے نہیں ٹوٹے گا
تیرے پھولوں کا حسیں رنگ نہیں چھوٹے گا

آئینہ تک بھی تو حیران نہ ہوگا مجھ سے
کوئی جلوہ بھی پریشان نہ ہوگا مجھ سے

بے ارادہ بھی پریشاں کروں تو کہنا
چاک اب اپنا گریبان کروں تو کہنا

بے سکوں رہ کے بھی آرام نہ مانگوں گا کبھی
اب بہ اصرار کوئی جام نہ مانگوں گا کبھی

جو گزر جائے شکایت نہ کروں گا تجھ سے
تو کہے گی تو محبت نہ کروں گا تجھ سے

مدتوں بے سروساماں پھرا ہوں انجم
آج لے کر یہی ارمان چلا [illegible]

جاں نثار اختر ایم اے

ساقی مجھے بھیک دے سکون کی!

اُٹھا وہ جھوم کے ابرِ بہار اے ساقی
بدل گئی روشِ روزگار اے ساقی

فضا میں دوڑ رہی ہیں شراب کی موجیں
برس رہی ہے مئے خوشگوار اے ساقی

ہر ایک چیز پہ مستی ہر ایک شے میں جمال
جہاں ہے جلوہ گہ حُسنِ یار اے ساقی

گلوں سے روئے زمیں پر شفق کی رنگینی
شفق سے رنگِ فضا لالہ کار اے ساقی

کہیں بنفشہ کہیں یاسمن کہیں سنبل
چمن ہے صفحۂ نقش و نگار اے ساقی

بنا ہوا ہے "خراباتِ نو بہار" چمن
ہر ایک شے ہے یہاں بادہ خوار اے ساقی

ہر اک کلی ہے صُراحی شرابِ رنگیں کی
ہر ایک گل قدحِ زر نگار اے ساقی

ہر ایک شاخ میں ہے پائے رند کی لغزش
ہر ایک برگ کفِ رعشہ دار اے ساقی

فضائے باغ جواہر فروش و گوہر ریز
ہوائے صحنِ چمن مشکبار اے ساقی

چمن ہے کانِ گہر اشکہائے شبنم سے
اِن آنسوؤں پہ ستارے نثار اے ساقی

تیرے حضور میں لایا ہوں کچھ تمنائیں
تیرے کرم کا ہوں امیدوار اے ساقی

،، کو تو نے سکون و قرار بخشا ہے
مجھے بھی بخش سکون و قرار اے ساقی

ظفر تاباں دہلوی

انقلاب

ساقیا دور میں اب لا عوضِ جام کچھ اور
کہہ رہی ہے روشِ گردشِ ایام کچھ اور

تا بکے حظِّ دل و چشم کی سعیِ ناکام
تجھ سے لینا ہے محبّت مجھے اب کام کچھ اور

یاد پھر آئی ہیں آغازِ جنوں کی راتیں
اور پیچھے کو پلٹ گردشِ ایام کچھ اور

حُسن کا مرتبہ حیرت نے سمجھنے نہ دیا
جتنا دیکھا انہیں بڑھتا گیا ابہام کچھ اور

حُسن پر قیدِ تعیّن سے اُدھر حرف آیا
اور ادھر حدِّ نظر نے کیا بدنام کچھ اور

جو نہ دیکھا نہ سُنا تھا وہ سُنا اور دیکھا
جو نہ ہونا تھا ہوا - اے دلِ ناکام کچھ اور

ان کے وعدے ہی بدلتے نہیں دن رات اثرؔ
حالِ عالم کا یہ ہے صبح کچھ اور شام کچھ اور

محمد علی خاں اثرؔ رامپوری

زمزمے

زمیں کانپ اُٹھی آسمان تھرّا یا
غمِ جہاں کو غمِ عشق نے جب اپنایا

بتائیں کیا دلِ مضطر اُداس کتنا تھا
کہ آج تو نگہِ ناز نے بھی سمجھایا

نگاہِ شوق نے کچھ انجمن نے کچھ سمجھا
کوئی نہ جان سکا اس طرح وہ شرمایا

تو عشق ہی کی پشیمانیوں کے پھیر میں ہے
تجھے خبر بھی ہے کچھ حُسن بھی تو پچھتایا

پڑی تھی دولتِ کونین جلوہ گہ میں تری
کہاں سے عشق بھی یارب یہ دل اُٹھا لایا

مٹا دیا مرے دل نے نشانِ جورِ بُتاں
میں ڈر رہا تھا کہ پتھر سے شیشہ ٹکرایا

تری نگاہ ہوئی جب تو زندگی پائی
کہ آج تک تو مجھے موت نے بھی ترسایا

نہ ہجر ہجر ہے تیرا نہ وصل وصل ترا
اگر یہی ہے محبّت تری تو باز آیا

نگاہِ ہوش رُبا تک تو ہوش قائم تھے
میں کھو گیا ہوں ان آنکھوں کا جب پتہ پایا

نگاہِ چشمِ سیہ کار سے کوئی پوچھے
یہ کس نے دہر کی تاریکیوں کو چمکایا

ابھی تو جو رو کرم سے ترے گزرنا ہے
ابھی کہاں تجھے کھو یا ابھی کہاں پایا

عجیب شے ہے یہ چونکی ہوئی سی بے خبری
نگاہِ یار تجھے آج کیا خیال آیا

ہمیں سے عشق کی گہرائیوں کی لاج رہی
ہر اک نے تیری محبّت کا جام چھلکایا

رہیں گی یاد رسا کاریاں تری اے عشق
کہاں سے تو نے کہاں اہلِ دل کو پہنچایا

یہ زندگی کے کڑے کوس — یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایا

تری نظر سے بھی جس کو چھپا کے رکھّا تھا
وہی تو دردِ محبّت میں آج کام آیا

کبھی سُنے نہ تقاضائے فطرتِ ازلی
اسی نے خُلد سے انسان کو نکلوایا

ہے آج خود مجھے حیرت سی اپنی وحشت پر
قسم ہے زلف کی ابتک تو میں نہ گھبرایا

نہ کر سکی تھی تری چاہ کس مپرسیٔ عشق
تری نگاہ نے پوچھا تو دل بھی للچایا

مناسبت بھی ہے کچھ غم سے مجھ کو - اور اے دوست
بہت دنوں سے تجھے مہرباں نہیں پایا

بیانِ غم میں بھی کچھ احتیاط لازم ہے
اُداس حُسن کو کر کے فراقؔ کیا پایا

خیر مقدم

ہر ایک حرفِ آرزو کو داستاں کئے ہوئے
زمانہ ہوگیا ہے اُن کو میہماں کئے ہوئے

سرودِ عیش تلخیٔ حیات نے بھلا دیا
دلِ حزیں ہے بے کسی کو حرزِ جاں کئے ہوئے

بہارِ حُسن و دلبری کا خواب پھر سے دیکھ لوں
خیالِ حُسن و دلبری کو جاوداں کئے ہوئے

کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے وہ آئیں گے
وہ آئیں گے کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے

سکونِ دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں
سکونِ دل کی راحتوں کو بیکراں کئے ہوئے

حدیثِ آہِ نیم شب سُناؤں گی سُناؤں گی
زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کئے ہوئے

وہ آرزوئے دل کی ہمتیں بڑھائیں شوق سے
غرورِ عشقِ بے نوا کو کامراں کئے ہوئے

وفورِ شوق و بے خودی ٹھہر ٹھہر دلِ حزیں!
نگاہِ شوق و بے خودی کا امتحاں کئے ہوئے

تجلیاں لئے ہوئے وہ آرہے ہیں سوئے دل
نگاہ و دل کی وسعتوں کو لامکاں کئے ہوئے

وہ آئیں گے تو آئیں گے جنونِ شوق اُبھارنے
وہ جائیں گے تو جائیں گے تباہیاں کئے ہوئے

متاعِ صبر و ہوش کو لُٹاؤں ان کی راہ میں
وداعِ صبر و ہوش کو متاعِ جاں کئے ہوئے

میں اُن کی بھی نگاہ سے چھپا کے ان کو دیکھ لوں
کہ اُن سے بھی ہے آج رشک بدگماں کئے ہوئے

وقارِ عشق تو سہی کریں وہ اعترافِ غم
نظر کو دل کی دھڑکنوں کا رازداں کئے ہوئے

سرِ نیاز و پائے ناز ابتدا تھی عشق کی
اب انتہائے بے خودی ہے سرگراں کئے ہوئے

یہ کیفِ انتظار ہے کہ ساری عمر کاٹ دوں
نظر کو وقفِ انتظارِ داستاں کئے ہوئے

ع جہاں بیگم ادا (بدایونی)

موت

اپنی سوئی ہوئی دُنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غمخانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جامِ مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں، ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی، ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دُھندلا دُھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں، دُنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں، ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں

وہ مرا سحر وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا، اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین پُراسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانہ میں نہیں جس کا چلن!!
آنسوؤ!! تم نے تو بیکار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

معین احسن جذبی بی اے

میری منزل

طاقتِ رفتارِ تاباںؔ آزمانا ہے مجھے — مشکلاتِ راہ کو آساں بنانا ہے مجھے
کچھ بھی ہو لیکن قدم آگے بڑھانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

میری منزل رفعتِ افلاک سے بھی دور ہے — میری منزل سرحدِ ادراک سے بھی دور ہے
ہر قدم لیکن سوئے منزل اُٹھانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

وسعتِ دوراں سے بھی آگے نکل جاؤں گا میں — عالمِ امکاں سے بھی آگے نکل جاؤں گا میں
ذرّۂ ثابت کو سیّارہ بنانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

گرمیٔ رفتارِ عہدِ نوجوانی کی قسم — برق گامی کی قسم طوفاں خرامی کی قسم
امتیازِ دوری و قربت مٹانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

اُٹھ چکا ہے جو قدم پیچھے وہ ہٹ سکتا نہیں — چاہے کچھ ہو جائے لیکن میں پلٹ سکتا نہیں
اب تو بڑھنا ہے مجھے بڑھتے ہی جانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

لڑکھڑاتا - ڈگمگاتا - ٹھوکریں کھاتا ہوا — میں چلا جاؤں گا قربِ دور پر چھاتا ہوا
ذہن سے قصدِ تمکّن اب بھلانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

راستہ میں خشمگیں طوفان حائل ہی سہی — ایک اک ذرّہ جفا کوشی پہ مائل ہی سہی
ہمنفس پھر بھی قدم آگے بڑھانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

خار کیا تلوار سدِّ راہ بن سکتی نہیں — آہنی دیوار سدِّ راہ بن سکتی نہیں
انقلابی عزمِ مستحکم دکھانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

راہ کی دشواریوں سے کھیلتا جاؤں گا میں — سخت ناہمواریوں سے کھیلتا جاؤں گا میں
آبلہ پائی پہ تاباںؔ مسکرانا ہے مجھے — دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

تاباں (علی گڑھ)

بادل

(۱)

ایک شاعر کے پراگندہ خیالوں کا ہجوم
اپنے ہی رنگ کی گہرائی میں اُڑتے اُڑتے
اُجڑے اُجڑے سے گلستانوں میں ہے سیر کناں
جیسے رُک جائے فضاؤں میں مرے پائپ کا دھواں

قصرِ ذی شان پُر ہیبت کی سیہ دیواریں
یا سمندر کی اک اُبھری سی حسیں دوشیزہ
جیسے ہر ایک جگہ چھوڑ دیں اپنی صیقل
بس یوں ہی بھولے سے کپڑوں میں لگا لے کاجل

سرد موسم میں سرِ چرخ کوئی دوشیزہ
آسماں والوں کی رنگیں شرارت کے سبب
رات کی سیر کو نیلی سی دُلائی میں آئے
جیسے ہر ایک جگہ نرم دُلائی پھٹ جائے

ایک آوارہ نے جنگل کی اُدھ بستی میں
یا اُڑاتے ہیں ہر سمت ہزاروں مے خوار
ابھی کچھ دیر ہوئی جیسے لگائی تھی آگ
ساغرِ چرخ میں صہبائے تر و تازہ کے جھاگ

سادے سادے سے حسیں پھول ہوائیں پاکر
اور سورج کی شعاعوں کے حسیں جھرمٹ میں
گلشنِ بحر میں ہر چار طرف لہرائیں
آسمانوں کے سمندر کے کنول کھل جائیں

آرٹسٹ اک نئی تصویر بنانے کے لئے
اور پھر تختۂ تصویر کو برہم ہو کر
جائزہ جیسے ہر اک سمت نظاروں کا لے
مختلف رنگ کو اک ساتھ ملا کر بھر دے

دور مغرور ارادوں سے مرے دور سلام
جس طرح میری حسیں اور نئی نظم کے گرد
بکھرے بکھرے سے یہ موضوع یہ آوارہ خیال
چاند تاروں نے کہیں چھپ کے لگائے ہیں جال

سلام (مچھلی شہری)

ہدیہ

(انجم کے نام)

سکوں ہو فضاؤں میں یا اضطراب
محبت تو چھیڑے گی اپنا رباب

اُٹھیں آندھیاں خاک و خاشاک کی
نہ کھوئے گا یہ آئینہ آب و تاب

زمانہ میں ہو خشک سالی تو ہو
برستی رہے گی سدا یہ شراب

شریعت جہنم سی آنکھیں دکھائے
یہ جنت نہ ہوگی کسی کو عذاب

کھُلیں عقل و حکمت کے دفتر کھُلیں
جنوں کا نہ ہوگا کبھی سدِّ باب

محبت ہوس کی ہے بیٹی تو کیا!
وہ بدکار عورت یہ عصمت مآب

محبت ہے اک مریمِ پاک دل
ہوس اک زلیخائے رنگیں شباب

محبت کی دیوی کے آغوش میں
سکوں بن کے رہتا ہے ہر اضطراب

امیدوں کی ضو ریز قندیل سے
جھلکتا ہے قصرِ محبت کا باب

قسم اپنی غربت کی تیرے لئے
بہت میں نے دیکھے ہیں محلوں کے خواب

مگر وہ محل میری انجم نہیں
جہاں سیکڑوں عصمتیں ہوں خراب

جہاں حکمِ مستی ہو گلبانگ نے
جہاں اذنِ لغزش ہو دورِ شراب

ہوس مقصدِ مے پرستی نہیں
بہت دن سے پیتا ہوں میں بھی شراب

وہ ہر دم ترے ساتھ دنیا کی سیر
وہ ہر لمحہ رنگیں ترا ایک خواب

کبھی وہ فضائیں پہلگام کی
مچلتی ترے رُخ پہ موجِ شباب

کبھی سیرِ رنگین گلمرگ کی
ترے سُرخ عارض سے ملتے گلاب

مہِ نو کا سنگم پہ منظر کبھی
تری چشم و ابرو کا مبہم جواب

کبھی وہ شبِ ماہ میں سیرِ تاج
نظر میں محبت کی روشن کتاب

وہ گنگا کے دھارے کا منظر کبھی
کہ جیسے مچلتا ہو تیرا شباب

وہ راوی کے ساحل پہ تو سرو قد
کہ اُلٹی ہو نورِ جہاں نے نقاب

وہ میرے لئے تیرا ذوقِ وفا
کہ جس کی کوئی حد نہ کوئی حساب

ہے گرچہ محرومِ تعبیر آہ
مری جاگتی چشمِ حسرت کے خواب

مگر اس سے تو آہ یہ مت سمجھ
کہ ہے زندگی دل کی ناکامیاب

[illegible] حسرتِ وصل!
محبت بہر کیف ہے کامیاب

جاں نثار اختر (علیگ)

[illegible]

اجتماعِ ضدّین

حُسن کی فطرت میں نرمی عشق کی فطرت میں خروش
اُس کی فطرت میں لطافت اس کی فطرت میں خروش

عشق کی آنکھیں درخشاں شعلۂ نمناک سے
حُسن کا چہرہ مزیّن نورِ ہفت افلاک سے

حُسن میں شانِ تغافل عشق میں آمادگی
اُس میں شانِ دلربائی اس میں رنگِ سادگی

اُس کی خو میں لوچ ہے مثلِ خرامِ جوئبار
اس کے حصّے میں پڑا ہے کوہساروں کا وقار

چاند کی سی اُس میں خُنکی شاخِ گل کی سی لچک
اس میں شعلوں کی حرارت بجلیوں کی سی لپک

وقف ہے وہ کجکلاہوں خوش جمالوں کے لئے
اور یہ وجداں پرست آشفتہ حالوں کے لئے

ذوقی

ایشیا فروری ۱۹۴۲ء

طلسمات

(دو تازہ غزلیں)

ہجومِ خیالات ہے اور کیا ہے — وہی بارِ آفات ہے اور کیا ہے

وہی ہم ہیں اور آرزوئے تلاطم — وہی شورِ جذبات ہے اور کیا ہے

وہی ہم وہی تم وہی سوزِ قربت — ابھی تک ملاقات ہے اور کیا ہے

ابھی تک کھنچے جا رہے ہیں دل و جاں — یہ جذبِ مدارات ہے اور کیا ہے

وہی انتظارِ مسلسل کا عالم — جنونِ ملاقات ہے اور کیا ہے

کہاں ہم کہاں تم کہاں یہ ستارے — یہ دل کی کرامات ہے اور کیا ہے

فغانِ شبی نغمۂ صبحگاہی — فریبِ مناجات ہے اور کیا ہے

جنونِ محبت، جنونِ محبت!! — فسونِ روایات ہے اور کیا ہے

نہ پوچھو مرے ذوقِ عصیاں کا حاصل — جوانی کی اک رات ہے اور کیا ہے

مرے من کی دُنیا ترے من کی دُنیا — جہانِ طلسمات ہے اور کیا ہے

مری اشک ریزی پہ اتنی نہ کانپو! — کہ یہ عیشِ جذبات ہے اور کیا ہے

دلوں میں بہ شکلِ شرارِ تمنا — مرا سوزِ نغمات ہے اور کیا ہے

ازل میرا سایہ ابد میرا پرتو — مری ذات ہی ذات ہے اور کیا ہے

ہے ساغر کو مٹنے کی خواہش ابھی تک
یہ سحرِ خرابات ہے اور کیا ہے

ساغر (نظامی)

بلند از وفا و جفا ہو گئے ہم — محبت سے بھی ماورا ہو گئے ہم
اشاروں، اشاروں میں کیا کہہ گئے وہ — نگاہوں، نگاہوں میں کیا ہو گئے ہم
ترے دل میں رہ کر نظر میں سما کر — تمنائے ارض و سما ہو گئے ہم
نہ دیکھے گئے اُس نظر کے تقاضے — زسرتا بہ پا مدعا ہو گئے ہم
جسے دیکھئے تک رہا ہے ہمیں کو — تری بزم کا آئینا ہو گئے ہم
سمجھنا ترا کوئی آسان ہے ظالم — یہ کیا کم ہے خود آشنا ہو گئے ہم
محبت کی کچھ تلخیوں کی بدولت — مغنیِ شیریں نوا ہو گئے ہم
حقیقت نہ تھی دل لگانے کے قابل — حقیقت سے کیوں آشنا ہو گئے ہم
پڑا رہ گیا سازِ ہستی اکیلا — برنگِ ترنم رہا ہو گئے ہم
تباہی بھی ہے اک نشانِ ہدایت — لٹے اس قدر رہنما ہو گئے ہم
جو اُبھرے تو طوفان و سیلاب بنکر — جو ڈوبے تو رازِ بقا ہو گئے ہم
مشیت کو خاموش دیکھا تو بڑھ کر — بنامِ خودی ناخدا ہو گئے ہم
صدا دو محبت کے تاریخ داں کو — کہ پھر سے اسیرِ بلا ہو گئے ہم

نہیں کم یہ ہستی کی معراج ساغر
کہ خاکسترِ میکدا ہو گئے ہم

ساغر (نظامی)

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

بابتہ فروری ۱۹۴۳ء

کسوٹی

(نئی کتابیں)

ذکر و فکر مقصود زاہدی صاحب کے مضامین اور افسانوں کے اس مجموعہ پر ہندوستان کے تقریباً ہر رسالہ اور اخبار نے اپنی رائے کا اظہار کیا یعنی ذکر و فکر کی یہ حیثیت تو طے شدہ ثابت ہوئی کہ لوگ اس پر اظہار رائے کرنے کیلئے مجبور ہو گئے۔ یہ تمام رائیں میری نظر سے گذریں اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ لوگ مقصود صاحب کی نیم خوابیدہ قوتوں کے قائل ہیں۔ اور ہر شخص اس خیال سے متفق ہے کہ مقصود کی شخصیت میں ایک جدید مصنف بیدار ہو سکتا ہے۔ جہاں تک میری رائے ہے میں نے ذکر و فکر کے دیباچہ ہی میں ان بنیادی خیالات سے بحث کی تھی جو آج حاشیہ کی صورت میں ظاہر کئے گئے ہیں۔

ہر اس شخص کو جو نئے ادب کی راہ پر گامزن ہونا چاہتا ہے آج شدید طور پر خود انتقاد اور خود اعتماد ہونے کی ضرورت ہے۔ محض تقلیدی طور پر نچلے طبقہ کی نمائندگی اور طبقاتی خوش آئند انقلابی تصورات، آنیوالے ایک پرولتاری انقلاب کا خواب، چند تمام نہاد مسگراہ کن الفاظ، مزدور، انقلاب، خون، امیر، غریب انسان سب کی نہایت بے جان اور رسمی نمائندگی کا نام نیا ادب ہرگز نہیں ہے۔ اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ادب محض ایک خاص اقتصادی نظریہ کے ماتحت پیدا ہونا چاہیے تب بھی مباحث اور مسائل میں جو لطیف ترین تضاد گوشہ میں مخفی ہیں آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آج نئے ادیب کیلئے اعلیٰ درجہ کا مفکر ہونا لازم ہو گیا ہے۔ میرے خیال سے آج وہ گروہ رجعت پسندی کے قریب ہو گیا ہے جس نے نام نہاد ...... حدود تک ترقی پسندی کو محدود کر دیا ہے۔

ترقی پسند ادب میں بہت سے عناصر ایسے ہیں جن کو ہم اس محدود ی حد [illegible] سب سے پہلے "زندگی جیسی کہ آج ہے" [illegible] کا فرض [illegible] نقطہ [illegible]

ترین فریضہ ہے۔ اس کے بعد "زندگی جیسی کہ ہونی چاہیئے" کی منزل آتی ہے جہاں نظریاتی اور صحیح انقلابی بنیادوں پر تدریجی ترقی کے امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے ادب کے ناخداؤں کو آگے بڑھنا ہوگا۔

مقصود کو مشاہدہ کا شوق ہے۔ سوچنے کا ذوق ہے۔ وہ انسانی دکھ سکھ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کا انداز تحریر شگفتہ، سادہ اور دلکش ہے۔ یہ تمام خصوصیتیں ایسی ہیں کہ مقصود کی ذات میں کچھ اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ بہر حال یہ شاندار کامیابی ہے کہ شاندار پسپائی کے وزن پر) ذکر و فکر کو دیکھ کر لوگوں نے ان کی صحیح طاقتوں کا اندازہ کیا اور کھلے دل سے ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیں۔ یہ کتاب ادبی مرکز میرٹھ سے مل سکتی ہے، قیمت علاوہ محصول آٹھ آنے ۸ر

The Life and Odes of Ghalib مؤلفہ و مترجمہ عبد اللہ انور بیگ۔ ایم اے، ایم او ایل، ایل۔ بی ایڈوکیٹ۔ لاہور

سوانح غالب اور اس کی غزلیات ناشر اردو اکاڈمی لاہور ٹری گیٹ لاہور قیمت للعہ

اردو اکاڈمی لاہور نے گذشتہ سال میں کئی کتابیں بہت اچھی شائع کیں۔ علاوہ تخلیقی ادب کے اس کی توجہ ترجمہ شائع کرنے کی طرف بھی مبذول ہوئی۔ ترجمہ بظاہر بہت آسان کام معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تخلیقی ادب سے زیادہ اہم اور مشکل کام ہے۔ ترجمہ کے ذریعہ خوفناک غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں اور بنیادی تعمیری خدمت کا فرض بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔

انور صاحب نے اس سے پہلے اقبال کے کلام کو انگریزی میں پیش کیا تھا۔ ان کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرقی علوم کے علاوہ جرمن، فرانسیسی زبان و ادب سے بھی واقف ہیں۔ نہایت خاموشی سے کام کرنے والے ہیں۔ ان کی صلاحیت و جرأت تو اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ غالب جیسے بلند مرتبہ شاعر کے کلام کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کی [illegible]

[illegible] زبان کی شاعری کو دوسری زبان میں منتقل کرنا نہایت [illegible] [illegible] کا کام ہے۔ اس فریضہ کو ادا کرنے کیلئے مترجم کیلئے لسانی نزاکتوں، اور شاعرانہ گہرائیوں کا ماہر ہونے کی ضرورت ہے۔ اول تو اُسے شاعر کی اصل زبان سے کامل واقفیت کی ضرورت ہے اور پھر ان زبانوں پر کامل درک کی بھی جن سے ترجمہ کیا اور جن میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، ترجمہ نہایت مایوس کُن ہے۔ یہ مایوسی کوئی انور صاحب کی عدم قابلیت کا نتیجہ نہیں۔ شعر کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا بجائے خود نہایت خطرناک فریضہ ہے۔ وہ لذت اور وہ رُوحانی وسعت جو کسی زبان کے الفاظ کے سوادسے تعلق رکھتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ میں منتقل ہی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً غالب کے اس شعر کا ترجمہ میں کہ ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
"موئے آتش دیدہ" ہے حلقہ مری زنجیر کا

انور صاحب نے "موئے آتش دیدہ" کا ترجمہ (A hair That hath seen fire) وہ بال جس نے آگ کو دیکھا ہے کیا ہے۔ حالانکہ "آتش دیدہ" کا ترجمہ "آگ کو دیکھا" ہے نہیں ہے۔ "آتش دیدہ" بال کی صفت ہے فعل نہیں ہے۔ اس لئے "موئے آتش دیدہ" کے معنی ہیں۔ وہ بال جسے آگ دکھائی گئی۔ لہٰذا اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیئے۔ (Fire - Shown hair) نہ کہ (That hath seen fire).

اسی طرح غالب کے اس شعر کا ترجمہ کہ ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا

"گم کیا ہوا پایا" کا ترجمہ (Having lost it find [illegible]) کیا گیا ہے۔ گویا "گم کیا ہوا پایا" کا ترجمہ انور صاحب کے نزدیک "دل کو گم کر دیا اور پا لیا" ہے۔ مگر شعر کا صحیح ترجمہ یہ نہیں ہے۔ غالب کے شعر کا نثری ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ "بہار کی آمد سے جو کلی کھلی ہے اور اُس میں جو رنگ نمایاں ہوا ہے وہ میرے خون آلود دل کی تصویر ہے۔" یہ حادثہ غالب کے دل کے ساتھ ہو چکا ہے، وہ غنچہ و رنگین سے دلِ خون آلودہ کا استعارہ کرتا ہے۔ غنچہ کے کھلنے کو خون ہونے سے تعبیر کرتا ہے اور پایا کو مل جانے سے (Regained) اس مقام پر نظیری اور غالب دونوں تناسخ کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ نظیری کہتا ہے کہ ؎

یادگار جگر سوختہ مجنون است
لالہ چند کہ از دامنِ صحرا برخاست

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انور صاحب نے اردو [illegible] [illegible] نہیں کی، اور اپنی توجہ محض ترجمہ کر دینے کی طرف مبذول رکھی۔

اسی طرح الفاظ کے ترجموں میں بھی محض ڈکشنری کا سا فرض ادا کیا گیا ہے۔ "محبوب قاتل" کا ترجمہ (Assassin) یا "گور غریباں" کا ترجمہ (Strangers' grave) کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ غور کرتے تو ان میں اس سے زیادہ صحیح اور موزوں ترجمہ کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ یہ اور اس قسم کی کمزوریاں غالب کو انگریزی میں غلط متعارف کرا سکتی ہیں، اور یہ غالب کیساتھ کافی ظلم ہے۔ کلام غالب کے انتخاب میں بھی پوری توجہ صرف نہیں کی گئی۔ بعض دلدوز اشعار نظر انداز کر دئے گئے ہیں، اکثر معمولی اشعار چن لئے گئے ہیں! ممکن ہے انور صاحب کا مذاقی ذوق اس انتخاب میں کار فرما ہو۔

بہرحال، اقبال کے بعد غالب کو انگریزی میں لانا، ایک بہت اہم خدمت ہے۔ جو نقائص موجودہ ایڈیشن میں رہ گئے ہیں اُن نقائص کو انور صاحب دوسرے ایڈیشن میں نظرِ ثانی کے بعد نکال سکتے ہیں۔ اُردو اکیڈیمی کی یہ خدمت یقیناً داد کی مستحق ہے۔ کتاب اپنے ظاہری حسن و جمال کے لحاظ سے کافی شاندار ہے۔

Expression and Communication مصنفہ ڈاکٹر دین محمد تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی (کینٹب)

قیمت ۱۰ آنے ملنے کا پتہ بشیر بی سی۔ تاثیر۔ تاثیر ہاؤس امرتسر (پنجاب)

یہ مختصر لیکن جامع، اہم اور مفید رسالہ "فنون لطیفہ اور ان کی ادائیگی" کے موضوع پر سوسائٹی فار دی پروموشن آف آرٹ اینڈ کلچر کی تحریک پر تاثیر صاحب نے مرتب کیا ہے۔ فنونِ لطیفہ اور سماج کی پیچیدگیوں اور ان سے تعلق رکھنے والے نئے پیدا شدہ مسئلوں پر بحث کی ہے خاص کر آرٹ اور ادائیگی کے متنازعہ مسئلہ پر۔

تاثیر صاحب نے فرانس کے مشہور مصور، گلیئرز اور کرسٹوفر کاڈول کے حوالہ سے موجودہ سرمایہ دار سماج پر تقریباً انہیں الفاظ میں روشنی ڈالی ہے جن الفاظ میں مارکس اور اینگلز گذشتہ صدی میں بحث کر چکے ہیں۔ تاثیر لکھتے ہیں۔

آرٹسٹ کے لئے اس دیوانی دنیا کو کیا بنانا ضروری ہے ... بنیادی تضادوں والی دُنیا کو، اس دنیا کو جس میں [illegible] اور منافع کی آگ میں جھلس رہی ہے۔ اس چیز کو [illegible] کر بھی کیا سکتا ہے جبکہ اس کے مادی [illegible]

[illegible] کی کتابوں کی ضخامت میں اس جمالیاتی ترقی و تہذیب کی جھلک پائی جاتی ہے جو ہمارے زمانے سے تعلق رکھتی ہے؛

کلیات میر تقی اس نئے تغیر اور تبدیلی کا مظہر ہے۔ میر کے کلام کے مختلف مجموعے شائع کئے جا چکے ہیں، لیکن ہر بار ان کی تکمیل اور تصحیح کے سلسلہ میں شبہات ظاہر کئے جاتے رہے۔ نولکشور بکڈپو نے اس مطالبہ کو محسوس کر کے گیارہ سو صفحات کے اس ضخیم مجموعہ کو مولوی عبدالباری آسی اور سید جعفر علی صاحب کے زیر نگرانی ترتیب و جمع کر کے شائع کیا ہے۔

شروع میں آسی صاحب کا دیباچہ ہے جس میں، میر صاحب کے کلام، ان کے حالات، قومیت، وطن، اور دوسرے متعلقہ حالات سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن ان تمام متعلقات کے بتانے میں صرف انھیں واقعات پر اکتفا کیا گیا ہے جو شعراء کے عام تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان حالات میں نہ میر کے عہد کے اس بحرانی دور کو بتایا گیا ہے جس سے میر کی شاعری کا پس منظر بن رہا تھا۔ نہ ان سماجی، اقتصادی اور معاشی حقیقتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جو میر کی شاعری یا اس زمانے کے تمام تر شعر و ادب پر اثر انداز تھیں۔

کسی شاعر کے حالات بیان کرنے میں صرف اس کی نسبت، خاندان وطن اور اس کی شاعری کے مختلف اصناف، غزل قصیدہ، رباعی مثنوی وغیرہ اور کسب معاش کے لئے اس کی کاوشوں کی تاریخ دہرا دینا ہی آج کافی نہیں ہے۔ آج یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ کس سماج کا نمائندہ تھا، اس کا ماحول کیا تھا۔ ماحول کے کیا تقاضے تھے؛ ماحول نے شاعر کی ذہنیت کا کیا سانچہ بنایا۔ اس کی شاعری کا وہ رخ کیوں رہا جو ہم دیکھتے ہیں؛ غرض اس سلسلے میں ان تمام اقتصادی، معاشی، سیاسی، اور مجلسی عناصر کی تشریح لازمی ہے جن سے کسی عہد کی شاعری اور شاعر پیدا ہوتا ہے۔

اس تذکرہ میں ان مسائل کی طرف کوئی اشارہ نہیں؛ پرانے طرز کی تذکرہ نویسی ہی کی اقتدا کی گئی ہے۔ لیکن بعض پہلوؤں سے اس تذکرہ کی بہت بڑی اہمیت ہے (۱) کوشش کی گئی ہے کہ اس مجموعہ میں میر کے تمام مجموعۂ کلام کو جمع کر دیا جائے۔ قدیم نسخوں، پرانی کتابوں اور دوسرے ذرائع سے جس قدر کلام مہیا ہو سکا۔ اس مجموعہ میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ جو حضرات میر کو کامل طور پر پڑھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس مجموعہ کو ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔

کلام میر کے علاوہ اس کلیات کا دفاعی پہلو بھی زبردست ہے [illegible] میں ایک فرہنگ الفاظ بھی دی گئی ہے۔ اس فرہنگ [illegible] غریب اردو و فارسی الفاظ اور محاورات کے سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ یہ دو کام بجائے خود نہایت مشکل اور اہم تھے؛ کلیات میر تقی کے مرتبین نے اس باب میں اپنے فرض کو کامل طور پر ادا کیا ہے۔ نولکشور پریس اردو داں طبقے کے شکریہ کا مستحق ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسی خدمت ہے جو تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

جہاں تک اس کے جمالیاتی رخ کا تعلق ہے، یہ کلیات قدیم معیار طباعت سے بہت بلند ہے۔ مگر لمحۂ حاضر کا جمالیاتی احساس کچھ اور بلندی چاہتا ہے پھر بھی اس کی ضخامت اور تکمیل کو دیکھتے ہوئے موجودہ صورت کو کسی طرح کم تر درجے کے حسن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا؛

نغماتِ نور

مجموعۂ کلام نور لودھیانوی قیمت مجلد ۲ روپے، غیر مجلد ۱ روپے ملنے کا پتہ: جعفریہ بک ایجنسی رجسٹرڈ نمبر ۲۲۲۶ فیض باغ لاہور

گذشتہ ۲۵، ۳۰ سال میں پنجاب کے شعراء پر دو اثر پڑتے رہے ہیں۔ ایک تو عام تغزل کا عکس، دوسرے اقبال کی شاعری کا پرتو، غزل میں بعض، مرزا داغ اور بعض حسرت سے متاثر ہیں، عابد علی عابد حسرت موہانی کے کامیاب مقلد ہیں، اور حفیظ جالندھری مرزا داغ کی شوخی کو شرما شرما کر اختیار کرتے ہیں۔ اقبال کے تمام تر کلام سے کوئی ایک پنجابی شاعر کامل طور پر اسقدر متاثر نہیں ہوا، کہ ہم اسے اقبال کی یادگار کہہ سکیں، امین حزیں بھی جن کے یہاں فلسفۂ خودی کا اعادہ، اقبال کے اسلوب کی پھیکی تقلید اور فارسی تراکیب کی بہتات ہے، نمونہ نہیں ہیں، وہ اقبال سے متاثر ضرور ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آتشکدہ کے محض پڑوسی ہیں، خود ان کے خرمن میں وہ چنگاری براہ راست آ کر نہیں آئی جس سے اقبال کا دل روشن تھا؛

دوسروں کا کیا ذکر، لیکن اتنا ضرور ہے کہ پنجاب کے شعراء نے اقبال کے اسلوب اور خیالات کو عام طور پر اختیار کرنا چاہا۔ اور ان خطوط پر دوڑے جو اقبال نے اپنے لئے پسند کی تھیں؛ یہ حضرات کافی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی شاعری کے پس منظر کیلئے سخت قسم کی تصوف زدہ ذہنیت، خودی اور بیخودی کی غیر ملتوی بحث اور ناممکن الحصول وحدت اسلامی کا تصور مہیا کر [illegible] کوشش کرتے ہیں کہ طرز تفکر کا وہی سانچہ بنائیں جو علامہ اقبال کا عطا کیا ہوا تھا [illegible]

[illegible] صاحب کی انہیں مقتدر شعروں سے ایک ہیں جنہیں اقبال کا طرزِ تفکر، اسلوبِ بیان اور طرزِ خطاب پسند ہے۔ کہیں کہیں اُن کے کلام میں اقبال کے علاوہ دوسرے شعراء کے اسالیبِ بیان کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

اس مجموعہ میں غزل، نظم، گیت، سلام، نعت، منقبت غرض تمام اصنافِ سخن کے نمونے موجود ہیں، اور اُن کا ایک درجہ ہے کتاب کے آخر میں ادبِ لطیف کا ایک حصّہ ہے جس میں کچھ ٹیگوری نثر کے نمونے ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں ان تقلیدی عناصر کی کوئی قیمت نہیں، نور صاحب کو چاہیئے کہ وہ ایک راہ اپنے لئے طے کریں، اور اُسی کے مسافر بنیں۔ شاعری موجودہ زمانہ میں ایک منطقی پس منظر چاہتی ہے۔ اگر غور و فکر اور شعری عناصر کے میل سے شاعر کوئی تخلیق کر سکے تو واقعی اس تخلیق کو درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہر سعی لاحاصل ہے، شعر و ادب کو اب اپنی موجودہ منزلوں سے بھی آگے جانا ہے۔

پستک بھنڈار کا سلسلۂ کتب

ناشر پستک بھنڈار لہریا سرائے دربھنگہ (صوبۂ بہار)

دنیا کے دس بڑے آدمی

یہ سلسلہ گیارہ چھوٹی چھوٹی کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ رسالے بچوں کیلئے ہیں مگر ان میں سے چند عمر رسیدہ اور تعلیمیافتہ افراد کیلئے بھی مفید ہو سکتے ہیں۔ رسالوں کے نام یہ ہیں۔

دنیا کی کہانیاں، شیطانی بوتل، ننھوں کے دیس میں، ایجاد او موجد خدا بخش، جادو کا راگ، تیر انداز، ہیرامن طوطا، گیدڑ پانڈے اور خالہ بلی

دنیا کے دس بڑے آدمی

قیمت آٹھ آنے

بہار کے ذہین انشا پرداز اور قومی کارکن انیس الرحمٰن صاحب نے اسکو تالیف کیا ہے۔ اس رسالہ میں گوتم بدھ، ارسطو، جولیس سیزر، عیسیٰ، محمدؐ، شیکسپیئر، والٹیر، نپولین، ڈارون اور کارل مارکس کے حالاتِ زندگی سہل اور پسندیدہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں، حالات کے ساتھ ان بزرگوں [illegible] عظیم شخصیتوں کے اصول اور نظریوں کو بھی وضاحت اور تشریح [illegible] ارسطو کے حال میں سلسلۂ عمرانیات انیس صاحب نے [illegible] انسان جنگلوں میں رہتا [illegible]

[illegible] اب فکر بیان پڑی کہ اہل اسباب کی حفاظت کی جائے اس لئے یہ شری کہ ایک سردار مقرر کیا جائے۔

اس طرح انیس صاحب نے نظریۂ سرداری قبیلیت کو خود اختیاری انتخاب کے نظریہ کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ جو عمرانیات کے ذمہ دار مصنفین کے نزدیک صحیح نہیں ہے!؟

اب رہی ترتیب و انتخاب، مشہور ہستیوں میں ڈارون اور مارکس کے اسماء کی شرکت قابلِ تعریف ہے۔ مگر جولیس سیزر کی شمولیت کے وہ تاریخی اور اقتصادی اسباب کیا ہیں، جو سیزر کو دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں کی صف میں کھڑے کر سکتے ہیں؟ ڈارون اور مارکس کو جو عہدِ نو کی علمی اور انقلابی شخصیتیں ہیں درس و تدریس کی کتابوں میں عام طور پر نظرانداز کیا جاتا ہے۔ مگر ان کا جاننا اس نسل کے لئے ضروری ہے۔ جو ان کے پیدا کردہ سائنٹفک ماحول میں آنکھ کھول رہی ہے۔ جولیس سیزر کا جاننا کوئی بات نہیں، اس بہادر جرنیل نے شخصی ترقی و تکمیل کا ضرور ثبوت دیا۔ لیکن تاریخ کے عام بہاؤ پر اس کا کوئی خاص احسان نہیں، سیزر کے بجائے روس کے مشہور انقلابی رہنما لینن کے حالات کا اضافہ بچوں کیلئے نہایت ضروری چیز تھا!

یہ وہ نکات ہیں جنہیں نظرانداز کر دینے کے باوجود ان رسالوں کی افادیت اور اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا؛ یقیناً یہ اتنی مفید کتابیں ہیں کہ انہیں ابتدائی کلاسوں کے کورس میں داخل کر لینے کی سفارش کرنا ایک ضروری سفارش [illegible]

ناشر پستک بھنڈار لہریا سرائے دربھنگہ۔ لکھائی چھپائی بہترین، قیمت ۱۰ روپئے

پٹنہ کے مشہور ترقی پسند شاعر رضی نے ان کہانیوں کو مرتب کیا ہے، دُنیا کی مختلف دس زبانوں کی ۲۲ شاہکار کہانیاں ایک جگہ مرتب کر کے شائع کرنا پہلی کوشش ہے اور نہایت مستحسن ہے۔ واشنگٹن ارون، ٹالسٹائے، چیخوف، ٹیگور، ایچ جی ویلز، خالدہ ادیب خانم۔ لاہسان۔ الفانسے ڈوڈے، آئی کر ناسے۔ اور مصطفیٰ لطفی کے دلچسپ اور شاہکار افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

ٹیگور کا کابلی والا اور ٹالسٹائے کا مرنے کے اٹھنے کے برابر [illegible] شاہکار افسانے بھی اس میں شریک کر دئے گئے ہیں۔ ان [illegible]

[illegible]

[illegible] ریاستوں

میں جمہوری طرز پر کام نہیں، اس کی پہلی وجہ شخصی حکومت کا ہونا اور شخص واحد کی اجارہ داری ہے۔ برطانوی ہند میں جمہوریت کی نام نہاد صورت موجود ہے۔ مگر ریاستوں میں یہ بھی نہیں۔ یہ تمام دیسی ریاستیں حکومت ہند کی ایک پالیسی پالیسی کے تحت چل رہی ہیں، جب تک برطانوی ہند میں مرکزی حکومت کا قیام نہیں ہوتا اور اس سے ریاستی نظام حکومت کا رشتہ نہیں جڑتا، ریاستوں کے عوام کی بھلائی ممکن نہیں۔

یہ ریاستوں اور ان کے عوام کی ترقی سے تعلق رکھنے والا بنیادی سوال ہے اور اس کے کئی گوشے ہیں، (۱) مرکز میں ایک قومی حکومت کا قیام، (۲) ہندوستان کی ایک اجتماعی سیاسی وحدت کا معاہدہ اور اس پر والیانِ ریاست کا ایمان (۳) ریاستوں میں عوام کی نمائندہ حکومتوں کا قیام (۴) مرکز میں دیسی ریاستوں کی نمائندگی اور ان کا تناسب۔

ان گوشوں کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب ایک عظیم الشان اجتماعی وحدتِ سیاسی کو عالم شہود میں لایا جائے۔ یہ بڑی قومی حکومت یقیناً والیانِ ریاست کے ذاتی و خاندانی مفادات کے قطعی منافی ہوگی۔ اور بظاہر یہ امید نہیں کہ وہ اپنے اثرات اپنی موروثی ریاستوں پر سے ہٹالینا بہ آسانی قبول کرلیں گے۔ خود حکومتِ ہند برطانوی ہند میں کسی تغیر اور انقلاب کی قائل نہیں تو بہ...... والیانِ ریاست کیوں کر اس تبدیلی کے لئے تیار ہوسکتے ہیں، اگر کچھ کارگر ہوسکتے ہیں تو داخلی اثرات ہی کارگر ہوسکتے ہیں۔ بعض ریاستیں، اپنے فرماں رواؤں کی قدرتی اور حقیقی حاکمانہ دلچسپی حاصل کئے ہوئے ہیں، ان ریاستوں میں حیدرآباد، اور میسور نمایاں ریاستیں ہیں۔ بعض ریاستیں اپنے فرمانرواؤں کی شدید لاپرواہی کا نشانہ بنی ہوئی تھیں، ان میں سے ریاست چرکھاری بھی ایک ریاست تھی۔ جس کے حالات آغا سید حسین صاحب نے ایک رسالہ کی صورت میں شائع کئے ہیں، اس کے مطالعہ سے ریاست کے حالات، جائے وقوع، آبادی، مختصر تاریخ، اور اس کی قدیم وجدید حیثیت سمجھ میں آجاتی ہے، خان بہادر سید عین الدین صاحب موجودہ دیوان ریاست نے قبل چرکھاری کے غریبوں اور تیسرے طبقہ کی بری حالت [illegible] اور تعمیری [illegible] ریاست کے نظم ونسق پر غاصب اور ظالم عناصر چھائے ہوئے تھے۔

اور کوئی کمی کا فریاد رس نہ تھا لیکن سید صاحب نے [illegible] پیدا کیا ہے۔ ریاست کے تمام شعبوں میں نظم وعدل قائم کیا اور ریاست کے مردہ جسم میں ایک نئی زندگی دوڑا دی۔

یہ نئی زندگی کسی بنیادی حیات کی ضامن نہ سہی، مگر ایک چھوٹی ریاست میں اتنی ترقی قطعی ناممکن تھی۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات میں اس ترقی کو ممکن بنایا گیا وہ نہایت شنیع اور خطرناک تھے۔

آغا صاحب کی تصنیف چرکھاری کے ارتقا اور ضابطہ ونظم کی ایک مختصری تاریخ ہے جو ذاتی مدح سرائی سے بلند ہوکر لکھی گئی ہے۔

آیات ونغمات

از جوش ملیح آبادی، ناشر مکتبہ اردو لاہور
قیمت تین روپیہ ۸ آنے۔

حجم ۲۴۴ صفحات، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ (ستمبر ۱۹۴۱ء)

حضرت جوش ملیح آبادی کی تازہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں مرتب یا ناشر نے یہ بھی بتانے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ یہ نظمیں کس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں!!؟

بہر حال چند نظموں کو چھوڑ کر یہ تمام کلام ۱۹۳۸ء سے لیکر ۱۹۴۱ء تک کا ہے۔ اس مجموعہ کی اعلیٰ ترین نظموں "باغی روحوں کا کورس" وغیرہ سے جوش کی تبدیلی وارتقا کے نئے اندازے ہوتے ہیں۔

شاعر کا مشاہدہ تجربہ اور تفکر کے بلند ونازک مقام پر لیجا کر کس طرح اسے تنہا چھوڑ دیتا ہے اس کتاب میں دیکھئے رومانیت اور حسن فطرت کی پُرفریب دلکشی و دلاویزی بھی اسکے مشاہدات وتجربات کی تلخی مٹانے میں کامیاب نہیں ہوتی

جیسے جیسے زندگی کے مشاہدات اور مطالعۂ فطرت نے جوش کو فکر ونظر کی قوتیں بخشیں، اسکے حکیمانہ مزاج کو جلا ہوتی گئی، لیکن وہ زندگی کا مثبت نقطۂ نگاہ پیدا نہ کرسکا۔ اس کے فلسفہ کا نمایاں منفی پہلو، اُسے شوپنہار، قنوطی حکما کی صف میں بٹھا دیتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا اثباتی پہلو، اسے رومی وعطار اور برگساں کے پہلو میں جگہ دیتا ہے۔

یہاں سب سے بڑا سوال خود نفی واثبات کے متعلق پیدا ہوتا ہے، یہ اثبات ویقین کوئی ذہنی واضافی چیزیں ہیں، یا محض اثبات ویقین ہی ہیں!!؟

[illegible] ایک [illegible] ہے یکدی بستن ہیں منظر
[illegible] انسان و قدرت کے درمیان ایک دھندلا اور نازک ترین
رشتہ ہے جسے کمال احتیاط کے ساتھ ٹوٹنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ لیکن
زندگی کا منفی پہلو رکھنے والے زندگی اور قدرت انکار میں روحانی کیفیت کو
بالکل ہی مٹا دیتے ہیں۔ وہ توہم کا رشتہ بھی باقی نہیں رکھتے۔ جس طرح اقبال
کی آخری تصنیفات میں "مرد مومن" کے رُخ سے آخری نقاب اٹھ گیا تھا۔
جوش کی نئی تصنیف میں ان کے "حکیم" کے بت سے بھی حجابات اٹھ رہے ہیں، ؎

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا
کہ قلبِ آدم خاکی سدا فگار رہے

آخر میں کہتا ہے ؎

مگر حکیم وہی ہے جوان شدائد میں
ہمیشہ فاتحِ غم ہائے روزگار رہے

اقبال "یقین" کے سہارے روحِ آدم کو زندگی اور حوادثِ زندگی
کے مقابلے کیلئے تیار کرتا ہے۔
جوش بے یقینی اور تشکیک کے بل پر حیات و قدرت سے مقابلہ کیلئے
کہتا ہے اور انسانی افضلیت و بلندی کی مبادیات وضع کرنے کی سعی کرتا ہے
یہ نفی و اثبات کی روح ہے جو اردو کے دو شاعروں میں رنگا رنگ طریقوں
سے پائی جاتی ہے۔
جن تفکرات، اور حکیمانہ استفہام و تفہیم اور جذباتی کشمکش کے ناتمام
خاکے آیات و نغمات میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی تکمیل "حرفِ آخر"
میں ہو گئی ہے۔ یہ جوش کی نئی غیر مطبوعہ تصنیف ہے جس میں مسائلِ حیات
انسان و خدا، دین و دنیا، مرگ و حیات اور فلسفۂ ارتقا پر شاعر نے
ڈرامائی اسلوب میں بحث کی ہے۔
یہ سوال بالکل علیحدہ ہے کہ زندگی کے لئے توہم کی ضرورت ہے
یا حقیقت کی، زہر کی ضرورت ہے یا شکر کی۔!!
لیکن بہر حال یہاں دو فرد ہیں، ایک کے ہاتھ میں جامِ شکر ہے
دوسرے کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ، دیکھیں انسانیت کے لئے کس کا نسخہ
آبِ حیات ثابت ہوتا ہے۔

انوار

مصنفہ علی اختر صاحب حیدرآبادی، [illegible]

کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد قیمت [illegible]

انوار۔ حیدرآباد (دکن) کے کہنہ مشق اور مشہور شاعر علی اختر صاحب
حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں حمد بھی ہے نعت بھی ہے،
غزلیں بھی ہیں .... رباعی نظمیں بھی
مختصر نظمیں بھی اور رباعیات بھی۔ تمام اصنافِ کلام میں پختگی صحت مند
خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔
سید علی اختر حیدرآبادی جن کی زندگی دکن کے دور دراز گوشہ گیرانہ
ماحول میں گذری اور گذر رہی ہے۔ اپنے فکر و نظر اسلوب اور روایات کے
لحاظ سے اردو شعر کے جدید اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جدید جو
اب قدیم ہو رہا ہے۔ ان کے کلام کی رنگینی، دل آویزی الفاظ کی نزاکت
فارسی الفاظ کی بندش، ربط اور شعریت کا پورا رچاؤ اپنے اندر
رکھتی ہے، محاکات، منظر نگاری اور زندگی کے مسائل پر اپنے زاویہ
نگاہ سے تنقید ان کے کلام کا نمایاں عنصر ہے۔
زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ روحانی اور رومانی
ہے۔ ان کا طرزِ فکر، قدیم صوفیانہ طرزِ فکر ہے۔ فارسی غزل سے لے کر اردو
غزل تک جو "یاسیت" اب تک چھائی رہی، وہ ان پر بھی چھائی ہوئی ہے
زندگی اور حیاتِ بعد الممات کی یہ بھی وہی تعبیر کرتے ہیں جو اگلوں نے
کی۔ حیدرآباد میں ان کی ذات بلند اخلاق اور ارفع شاعری کا سرچشمہ
ہے، چند شعر سنئے ؎

وہ خود بھی اس "شوق" پر متحیر ہیں کیا ہے جب انتخاب میرا
ابھی زمانے کو یاد ہوگا سوال ان کا جواب میرا

خرد ہے آئینِ خامکاری، نہ آگہی ہے نہ ہوشیاری
یہ عالمِ ہوش بھی ہے شاید کوئی پریشان خواب میرا

اللہ ری کامجبوری کہ دل اک وہم سا ہے آزادی کا
اک حسرت ہے آبادی کی اک عالم ہے بربادی کا

ھوسودن

جذباتی کیڑے

صبح جب وہ اٹھا تو دن چڑھ آیا تھا۔ اور دھوپ کی زرد کرنیں
ڑکی کے شیشوں سے آکر اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ پیپل کی نوزائیدہ
ی کھڑکی پر جھکی ہوئی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہل رہی ہے اور شکنتلا
ے جھکی ہوئی اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اچانک اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ اور
سنے اپنی آنکھیں کھولدیں۔ سردی آج پھر زیادہ تھی۔ برابر کے مکان
ں رہنے والے پنڈت جی۔ جو پنڈت بھی تھے اور کلرک بھی اپنی پوجا ختم
چکے تھے اور اب وہ گھنٹی بجا بجا کر آرتی کر رہے تھے۔ اور اُن کا بڑا لڑکا
ل خانے میں "پیا ملن کو جانا" گا رہا تھا۔ اس کے اونچے اونچے بے ہنگم
نڈت جی کی گھنٹی کی آواز کو مغلوب کئے جاتے تھے۔ اسے گانا بھی
یں آتا۔ نریندر نے سوچا، لیکن یہ پنڈت جی پیا ملن کو جانا کیوں نہیں
ے، کیا پنڈت جی ——— لیکن وہ آگے نہ سوچ سکا۔ پنڈت جی کی
ختم ہو چکی تھی۔ اور اب وہ اپنے بیٹے پر برس رہے تھے ———
اش، آوارہ، پیا ملن کو جانے کا بچہ، بے شرم، شرم نہیں آتی تجھے، ماں
، بہن، سب کے سامنے الاپنے لگتا ہے، بیہودہ، بدتمیز.....

پنڈت جی بہت دیر تک کچھ کچھ کہتے رہے اور نریندر کی سمجھ میں آگیا
ت جی پیا ملن کو جانا کیوں نہیں گاتے۔ اس نے سوچا کہ شاید پنڈت
گنانا نہیں چاہتے اور پیا ملن کو جانا اونچی آواز میں نہیں گایا جا سکتا
محبوب سے ملنے تو چُھپ کر جایا جاتا ہے جیسے چوری کرتے ہوں اور
کے ارادہ کا اعلان اتنے زور سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے۔ اُس نے
پنڈت جی اپنے لڑکے کو ٹھیک ہی ڈانٹ رہے ہیں ورنہ خواہ مخواہ
دن کسی پیا کے ساتھ پکڑا جائیگا اور پیا کے بھائی، رشتہ دار اور
لے جوتے مار مار کر اس کا بھُرکس نکال دیں گے لیکن پیا ملن کو جانا
۔ اور اُسے پھر شکنتلا کا خیال آگیا۔

شکنتلا کو کل اُس نے اُس چوک کے اوپر کھڑکی میں دیکھا تھا یہ چوک
ست بڑے مکان کا عقبی صحن تھا جس کی کھڑکیاں ادھر کھلتی تھیں۔
ے سے پیپل کے درخت نے اس صحن پر سایہ کر رکھا تھا اور اُس کی
اخ کل اس کھڑکی پر جھکی ہوئی تھی۔ شکنتلا کل اسی کھڑکی میں اُسے
ی۔ یوں تو وہ شکنتلا کو مدتوں سے دیکھتا چلا آیا تھا لیکن کل وہ
اپنے چند ہم عمر دوستوں کے ساتھ جو اسی محلہ کے باشندے تھے صحن میں
کھڑا ہوا بچّوں کو کھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں جب اس نے
اپنے ایک ساتھی کو کئی بار چھُپی چھُپی نظروں سے اوپر دیکھتے ہوئے دیکھا
تو اس کی نظر آپ ہی آپ اوپر چلی گئی ——— پیپل کی نوزائیدہ شاخ
کھڑکی پر جھکی ہوئی تھی۔ اب وہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہل رہی
تھی کھڑکی میں سے جھکی ہوئی چند لڑکیاں نیچے جھانک رہی تھیں، اور اُن
کے درمیان اُس نے شکنتلا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔

نریندر کو اُوپر دیکھتا ہوا دیکھ کر شکنتلا نے مُنہ پھیر لیا تھا لیکن اتنی
سی بات نے کہ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی، اس کے جذبات میں ایک
شدید حرکت پیدا کر دی، خوشی، تجسس، اور ایک بے نام سے جذبہ کی
عجیب سی لہر اور ایک اجنبی سا احساس برتری، غیر شعوری، غیر محسوس۔

جنسی فاقہ پرستی کرتے کرتے اُس کی حس اب بہت نازک ہو گئی
تھی۔ ذرا ذرا سی بات اس کے جذبات کو بھڑکا دیتی تھی۔ کوئی عورت یونہی
سرسری نظر سے بھی دیکھ لیتی تو اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ خصوصاً اس سے
متوجہ ہے۔ وہ محبت کرنا چاہتا تھا لیکن اُسے کسی ایسی لڑکی سے محبت نہ
ہوتی تھی جو التفات نہ کرے۔ اس کا تخیل بار بار اُسے فریب دیتا تھا کسی
بھی لڑکی کے ایک سرسری طور سے دیکھ لینے پر وہ سوچتا تھا کہ یہ مجھے پسند کرتی
ہے اور صرف یہ احساس ہی اُس کے دل میں اس لڑکی کے لئے محبت پیدا
کر دیتا۔ شدید جذباتی محبت، لیکن لمحاتی۔ کیونکہ اس کے تخیل کا فریب
زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہتا تھا۔ اور اُسے جلدی ہی اپنی غلطی کا احساس
ہو جاتا۔ اور وہ سوچتا کہ کیا لڑکیاں محبت کرنا نہیں چاہتیں۔

شکنتلا اس وقت اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس نے غیر شعوری
طور پر اپنے ہاتھ پتلون کی جیب سے نکال کر اپنے سینہ سے باندھ لئے
اور واضح حرکتوں کے ساتھ بلند آواز میں اپنے دوستوں سے باتیں کرنے لگا
اسے بات بات میں ہنسی آنے لگی اور اُس نے اپنے دوستوں کو چھیڑنا شروع
کر دیا۔ اُس نے اُن پر بلند آواز میں فقرے بھی کسے تھے۔ شاید شکنتلا نے
اُنھیں سُنا ہو۔ ان سب باتوں کے دوران میں اُسے صرف یہی احساس
رہا کہ وہ میری باتوں کو سُن رہی ہے، مجھے دیکھ رہی ہے۔ کئی بار اُسے

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۰)

بلاشبہ وہ حقیقتیں ہیں۔ اور اُن کا اظہار ہمارے عجوبہ پسند جذبہ کو متحرک کر سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہمارے رومانی جذبات اور عجوبہ پسند احساسات کو حرکت دینے کے لئے کیوں نہ اُن واقعات کی صحیح اور کامل تصویر کشی کی جائے۔ جو اس دنیا میں عام طور پر پیش آتے ہیں۔ اور جن سے زندگی کو ہر گھڑی دوچار ہونا پڑتا ہے۔

بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ، واقعات، واردات اور خیالات کا ٹھیک ٹھیک اظہارِ بیان فن کاری کا کمال ہے۔ لہذا یہ ماننا پڑیگا کہ کسی خیالی واقعہ کی تصویر کشی اس لئے فنکاری نہیں ہے کہ وہ اس خیالی واقعہ کی تصویر ہے۔ بلکہ اس کی فنیت محض یہی ہے کہ فنکار نے واقعہ کو صحیح اور نفسیاتی جزئیات کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ گویا فنکاری عبارت ہے۔ بہتر، نادر اور فطری تصویر کشی ہے۔

اور جب یہ صحیح ہے تو بہتر فنکار اس کو قرار دیا جائیگا جو زندگی کی حقیقتوں پر بحث کرتے جو عام تجربہ میں آتی ہیں۔ اُن کی تصویر کشی اس لئے زیادہ مشکل ہے کہ عوام اُن کی جزئیات سے بہ نسبت اس واقعہ سے زیادہ واقف ہیں جو عام طور پر کم پیش آتا ہے۔ ایسی مثال میں فنکار کیلئے یہ لازمی ہوتا ہے کہ وہ واقعہ کی جزئیات سے تعلق رکھنے والی تمام پیچیدگیوں کو بالکل اسی طرح بیان کرے جیسی کہ وہ ہیں ورنہ وہ اپنے فن میں ناکام رہے گا۔ لیکن اس کے برعکس ایک اُس واقعہ کی منظر کشی ضرور آسان ہے جسکی جزئیات عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

یہی بنا ہے کہ عام طور پر نئے ادیب اُن رومانی حادثات کی تشریح سے پرہیز کرتے ہیں۔ جو گو واقعہ تو ہو سکتے ہیں لیکن جن کا وقوع بسیط انسانی آبادی میں اس شکل میں نہیں ہے۔ جس شکل میں کہ وہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں میں محدود پایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے شعر و ادب کی بنیاد روزمرّہ کی زندگی کی واضح حقیقتوں ہی پر رکھتے ہیں۔

ادب اور اُس کی افادیت

زندگی جیسی کہ وہ ہے، اور زندگی جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے۔ کے دو متضاد نظریوں پر ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو متخالف نظریوں کو ماننے والوں کے قضیہ کی بنیاد ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ادب کی یہ تقسیم جہاں تک ادب کے حقیقی مفہوم کا تعلق ہے۔ صحیح نہیں لیکن اگر ہم کسی اعتبار سے بھی اس تقسیم کو صحیح مان لیں۔ اور بہر حال اس حیثیت سے تو اسے ضرور صحیح ماننا پڑیگا کہ ادیبوں۔ شاعروں اور فنکاروں کے گروہ میں اس وقت دو ممتاز گروپ ہیں جن میں سے ایک ماضی کی طرف نظر جمائے کھڑا ہے۔ اور دوسرا مستقبل اور اسکی رنگینیوں اور آفت کوشیوں کو اپنا مقصد بناتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ادب کی تقسیم بھی ٹھیک مان لی جائے تو ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ دونوں گروہ۔ زندگی جیسی کہ وہ ہے اور زندگی جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے کے نظریوں پر جھگڑتے ہیں۔

"زندگی جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے" والے نظریہ کو ماننے والا طبقہ — جیسی کہ وہ ہے۔ کو اوّل تسلیم کرتا ہے۔ لیکن پہلا گروہ: جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے" کو بالکل تسلیم نہیں کرتا۔

ادب برائے ادب پر اعتقاد رکھنے والوں کا خیال ہے کہ۔ ادب۔ کو زندگی کی حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں اس لئے ادب میں افادیت کی تلاش بالکل بے معنی ہے۔ سوسائٹی اسی طرح چلی آرہی ہے جیسی کہ وہ ہے اور ہمیشہ اسی طرح جاری رہیگی۔ اسلئے ادب میں بھی افادیت اور انقلاب کی ضرورت نہیں۔ ادب ہمارے سماج سے اونچی دنیا کی کچھ اونچی حقیقتوں سے تعلق رکھتا ہے اور بس۔ اسی خیال کے ماتحت ادب برائے ادب۔ کے سب سے بڑے رہنما۔ آسکر وائلڈ نے کہا تھا کہ "میں نے اپنے آپ سے یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ ادب کو میری شخصیت میں خود۔ اپنے ہی سے اور اپنے ہی لئے قائم رہنا چاہیئے"۔ اسی چیز کو دوسرے الفاظ میں۔ چارلس کیمب نے کہا: "وہ ادب کو سماج کی عام سطح سے بلند رکھنا چاہتا ہے۔ اس بلند سطح کو ادب برائے ادب والے۔ ابدی حقیقتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیمب کہتا ہے کہ "میں اب ابدیت کے لئے شعر کہتا ہوں"۔

یہ لوگ اس خیال میں یہاں تک بڑھے ہیں کہ ان کے نزدیک جو ادب ابدیت حاصل کر سکتا ہے محض ایک اتفاق ہے۔

یعنی ادب نام ہے اس تخیلی حادثہ کا جسے۔ الہام۔ کہا جاتا ہے۔

ظاہر ہے جب ادب ابدی حقیقتوں پر بحث کرتا ہے تو نہ نئے ادب اور پرانے ادب کی تقسیم صحیح ہے اور نہ افادی ادب کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ لوگ افادیت سے اس قدر چڑھتے ہیں کہ ان کے ایک نقّاد کے خیال میں ادب میں زبان اور مواد بے معنی الفاظ ہیں۔ جو کچھ ہے اشاعتی ہے۔ لیکن